جلد ۹۰ ماہ صفر المظفر ۱۳۸۲ھ مطابق ماہ جولائی سنہ ۱۹۶۲ء عدد ۱

مضامین

مقالات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجزائر کی آزادی پوری دنیائے اسلام کے لیے نوید مسرت ہے، الجزائر کے مجاہدوں نے آزادی کے لیے جتنی قربانیاں کی ہیں وہ جنگ آزادی کی تاریخ میں بے مثال ہیں لیکن اسی کے ساتھ یہ افسوسناک پہلو بھی ہے کہ آزادی ملنے کے ساتھ اندرونی اختلافات شروع ہوگئے، گو آزادی بہت بڑی نعمت ہے لیکن اس کو سنبھالنے اور ملک کے استحکام و ترقی کے مراحل بھی آزادی سے کم اہم نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ صبر آزما ہیں، یہ اسلامی ملکوں کی بدقسمتی ہے کہ ان میں وحدت خیال نہیں، اس لیے آئے دن انقلابات ہوتے رہتے ہیں، اسلامی ملکوں میں بھی باہم اتحاد و اتفاق نہیں، انکی جغرافی پوزیشن یہ ہے کہ ٹرکی سے لیکر شمالی افریقہ تک اسلامی ملکوں کا ایک سلسلہ چلا گیا ہے، وہ مغربی اور وسط ایشیا و افریقہ کے بڑے اہم حصوں اور یورپ کے بعض اہم ناکوں پر قابض ہیں، انکی سرزمین معدنی ذخائر سے مالامال ہے، اسکے باوجود سیاسی دنیا میں انکی کوئی آواز نہیں، اگر ان میں اتحاد و اتفاق ہوتا اور وہ کسی ایک سلسلہ میں منسلک اور اقتصادی حیثیت سے مضبوط ہوتے تو بین الاقوامی دنیا میں ان کا ایک وزن ہوتا، انکی آواز بھی موثر ہوتی، لیکن یہ وہ خواب ہے جس کی تعبیر کی مستقبل قریب میں کوئی امید نہیں ہے، یہی غنیمت ہے کہ جو ملک مغربی قوموں کی غلامی میں اسیر تھے وہ رفتہ رفتہ آزاد ہوتے جاتے ہیں، اور ادھر چند برسوں کے اندر کئی مسلمان حکومتیں قائم ہوگئیں، آزادی اور حکومت اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا عطیہ ہے، جو اسی وقت تک قائم رہتی ہے جب تک اس کا حق ادا کیا جائے، ورنہ یہ دولت کسی دوسری اہل قوم کیجانب منتقل ہو جاتی ہے جس کا تجربہ صدیوں سے مسلمانوں کو ہو رہا ہے، اسکے باوجود انکو سبق حاصل نہیں ہوتا۔

گپتا منسٹری سے اردو کے بارہ میں جو توقعات خوش فہموں نے قائم کی تھیں وہ تعلیم کے سہ لسانی فارمولے نے بالکل ختم کردیں، اس کے متعلق جو بیان حال میں اخبارات میں شائع ہوا ہے اس میں یہ صراحت ہے کہ اگر طلبہ کو اردو بحیثیت تیسری زبان کے اختیار کرنے کا حق دیا گیا تو ان کی ایک بڑی تعداد اردو ہی کو تیسری زبان بنا لے گی،

کیونکہ جنوبی ہند کی زبان کے مقابلہ میں ان کے لیے اس زبان کا سیکھنا آسان ہوگا، اس طرح سہ لسانی فارمولے کا مقصد ہی فوت ہوجائیگا یعنی شمالی اور جنوبی ہندوستان میں ہم آہنگی پیدا کرنا، اس لیے خیال کیا جارہا ہو کہ جو طلبہ اردو کے اپنی مادری زبان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ان کو اردو کو بحیثیت تیسری زبان کے لینے کی اجازت دینا منصفانہ نہ ہوگا۔"

یعنی ہندی اور انگریزی تو لازمی ہوگی اور تیسری زبان جنوبی ہند کی کوئی زبان ہوگی، اس طرح اردو کا قصہ خود بخود ختم ہوجائیگا، یہ ہم آہنگی کی بالکل نئی قسم ہے کہ جو زبان صدیوں سے ہم آہنگی کا ذریعہ چلی آرہی ہو اسکو تو ختم کرکے ایک ہی صوبے کے باشندوں میں ہم آہنگی کا جنازہ نکال دیا جائے اور جنوبی ہند کی زبانوں کے ذریعہ شمال و جنوب کے دور دراز علاقوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کیجائے، یہ ہم آہنگی پیدا کرنے کا مخلصانہ جذبہ نہیں بلکہ صرف طاقت کا خوف ہے، ورنہ جس صوبے میں ہندی کی اتنی شدید مخالفت بلکہ اس سے نفرت کیجاتی ہو کہ اس کے حروف کو چھیل کر مٹایا جاتا ہو، ہندوؤں کی مقدس کتابوں کو نذر آتش کیا جاتا ہو، اور دوسرا ملک قائم کرنے کی دھمکی دیجاتی ہو اس کی زبان کی تعلیم تو اترپردیش میں لازمی قرار دیجائے اور جو درحقیقت اس صوبہ کی عام یا کم سے کم ثانوی زبان ہے، اس کی تعلیم کی گنجایش ہی نہ رکھی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کی پشت پر قوت اور اس کو منوانے کے لیے قربانی کا حوصلہ نہ ہو وہ محض دوسروں کے رحم و کرم پر زندہ نہیں رہ سکتی، اگر اردو کے حامیوں میں بھی قوت ہوتی اور وہ اس کے لیے قربانی کرسکتے تو اسکا یہ انجام نہ ہوتا، مگر وہ تو مجبور محض ہیں، یہ محض خوش فہمی ہو کہ مسلسل کوشش سے جمہوریت ایک نہ ایک دن حقدار کا حق ماننے پر مجبور ہوتی ہے، اس کا تجربہ ۱۴ سال سے ہو رہا ہے کہ اردو والوں کی مسلسل کوشش کے باوجود آج تک کوئی شنوائی نہیں ہوئی، اگر کبھی اردو کی حق شناسی کے کچھ آثار بھی نظر آتے ہیں تو ایسی صورتیں پیدا کردیجاتی ہیں کہ اس کا قدم اور پیچھے ہٹ جاتا ہے، یہ صحیح ہے کہ جمہوریت جمہور کے مطالبہ کو زیادہ دنوں تک نظرانداز نہیں کرسکتی لیکن اردو کو تو فرقہ وارانہ مسئلہ بنادیا گیا ہے، وہ جمہوری کارہ کہاں گیا، اور اب کسی اقدام

کے بغیر آسانی سے اردو کا حق ملنے کی بظاہر کوئی امید نہیں۔

مسلمانوں کو آئے دن جن نئی نئی آزمایشوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کی تازہ مثال یہ ہے کہ آیندہ بیسک سکولوں کے طلبہ کو ہندو تہواروں کے مناسک کی عملی تعلیم دی جائے گی، اور ان میں جو مشرکانہ رسوم ادا کی جاتی ہیں وہ مسلمان بچوں کو بھی ادا کرنا پڑیں گی، اس کے متعلق قاضی عدیل صاحب عباسی کا مفصل مضمون اردو اخبارات میں شائع ہو چکا ہے، اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو یہ مسلمانوں کے لیے ایک نئی آزمایش ہے، بیسک ریڈروں کے خرافات ہی کیا کم تھے کہ یہ ایک نیا شاخسانہ پیدا ہو گیا، جو ان خرافات سے بھی زیادہ قابل اعتراض ہے، تفہیم ہی کی غرض سے سہی، ہر چیز کی عملی تعلیم کیا ضروری ہے، تفہیم زبانی بھی ہو سکتی ہے، اس سے قطع نظر کیا کوئی ہندو یہ گوارا کرے گا کہ مسلمانوں کے تہوار، عید و بقرعید کو سمجھانے کے لیے ہندو بچوں سے عید کی نماز پڑھوائی اور قربانی کرائی جائے، اگر ایسا نہیں ہے تو پھر مسلمان بچوں کو ہندو تہواروں کی عملی تعلیم پر کیوں مجبور کیا جائے، ہم کو امید ہے کہ شعبۂ تعلیم کے ذمہ دار اس لغو تجویز کو خارج یا مسلمان بچوں کو اس سے مستثنیٰ کر دیں گے۔

کشمیر دوسری ترقیوں کے ساتھ علمی میدان میں بھی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے، وہاں متعدد علمی و ادبی مجالس قائم ہیں اور ہر سال اصحاب علم و ادب کا اجتماع ہوتا رہتا ہے، ابھی حال میں کشمیری ثقافت اور کشمیر میں بولی جانے والی زبانوں کے فروغ و ترقی کے لیے "جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹس کلچر اینڈ لینگویجز" کے نام سے ایک ادارہ قائم ہوا ہے، اس کی جانب سے اردو میں ایک دو ماہی رسالہ بھی "شیرازہ" کے نام سے نکلا ہے، اس کے نگراں سید علی جواد زیدی اور اڈیٹر محمد یوسف ٹینگ ہیں، زیدی صاحب علم و ادب کا بڑا صحیح اور سنجیدہ مذاق رکھتے ہیں، اس لیے توقع ہے کہ ان کی نگرانی میں یہ رسالہ مفید علمی و ادبی خدمت انجام دے گا۔

مقالات

ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

از
جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب ایم اے

(۴)

توختم کرک

ش

علماء اور امراء | شاہان مغلیہ کے عہد میں بھی بعض بہت ہی اچھے امراء تھے، عبدالرحیم خانخاناں کے دربار سے شیعی اور سنی دونوں علماء وابستہ رہے، ان میں مولانا میاں وجیہ الدین، مولانا غازی خاں بدخشی، قاضی نصیر الدین برہانپوری، ملا خیر الدین رومی، مولانا جلال الدین حسن نیشاپوری، مولانا شیخ ...اللہ، مولانا شیخ ابراہیم، مولانا شیخ علم اللہ، مولانا صوفی، ملا محمد علی کشمیری، مولانا میر دوستی سمرقندی، میر عبدالباقی تبریزی، میر فیض اللہ ترخورانی، ملا خوشحال تاشکندی، مرزا محمد قاسم گیلانی، آقا جلال قزوینی، قاضی عبدالعزیز ہمدانی، مولانا محمد تقی کاشانی، مولانا مقصود علی تبریزی، مولانا محمد رضائی تاج مشہدی اور حکیم کمال الدین حسین شیرازی قابل ذکر ہیں، عبدالرحیم خانخاناں کی خط وکتابت حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ سے بھی رہی، جس کے مطالعہ

سے اندازہ ہوتا ہے کہ امارت کے باوجود اس کا دینی شعور بیدار تھا، اور وہ شیعہ سنی کے جھگڑوں سے بالاتر ہوکر دینی حمیت کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔

جہانگیری امرا میں شیخ فرید مرتضی خاں بخاری کو بھی علما اور مشائخ سے بڑا گہرا تعلق تھا، حضرت باقی باللہ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ دونوں اس کی گوناگوں خوبیوں کے معترف تھے، اکبری عہد میں بخشی کے عہدے پر مامور تھا، جہانگیر کی جانشینی میں اس کا بڑا دخل تھا، اسی لیے جہانگیر نے اس کو میر بخشی کا عہدہ عطا کیا، پھر گجرات اور پنجاب کا صوبہ دار بھی مقرر ہوا، وہ اپنے گھر سے نکلتا تو راستہ میں سکینوں کو کمل، چادر، اور کپڑے تقسیم کرتا جاتا، کسی کو نقد روپیہ اور کسی کو اشرفی دیتا، بیواؤں اور حاجتمندوں کے لیے اس کے یہاں سے یومیہ، ماہانہ اور سالانہ وظیفہ مقرر تھے، غریب لڑکیوں کی شادی کے جہیز کا سامان بھی کرتا، اس کے دسترخوان پر روزانہ پانچ سو سے ایک ہزار تک آدمی کھانا کھاتے تھے، اس میں بڑی دینی غیرت و حمیت تھی، اور وہ مذہبی شعار کو رواج دینے کے لیے بے چین رہتا، اکبر کے دین الٰہی کی مذہبی گمراہیوں کو دور کرنے میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جو تجدیدی اور اصلاحی اقدام اٹھائے، ان میں وہ بڑا معاون ہوا، اسی کے اصرار پر جہانگیر نے اپنی جانشینی کے بعد حکم دیا کہ ملکی نظم ونسق میں کوئی بات خلاف شرع نہ ہونے پائے، حضرت مجددؒ، شیخ فرید کے ان مساعی جمیلہ کے ممنون رہے، اس کی شان میں یہ شعر لکھتے ہیں:

گر برتن من زباں شود ہر موئے | یک شکر تو از ہزار نتواں کرد

ایک دوسرے مکتوب میں اس کو لکھتے ہیں کہ ہم فقیروں پر آپ کے احسانوں کا شکر لازم ہے، کیونکہ ہمارے حضرت خواجہ قدس سرہٗ کی ظاہری جمعیت کا سبب آپ ہی ہوئے تھے، اور اس جمعیت کی حالت میں آپ کی طفیل میں ہم نے حق سبحانہٗ کی طلب کی اور بہت فائدے حاصل کیے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی بھی اس کو احیائے سنت و شریعت کے لیے برابر خطوط لکھتے رہے، ماثر الامراء کے مصنف نے

اس کی بہت سی خوبیوں کا ذکر کرکے لکھا ہے کہ اس کے ایسا آدمی پھر زمانہ نے ہندوستان میں پیدا نہیں کیا،

حضرت مجددؒ نے جہانگیر کے ایک دوسرے جلیل القدر امیر خان اعظم کی دینی حمیت سے بھی فائدہ اٹھانا چاہا، اس کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ مسلمان اسلام کے احکام جاری کرنے سے رکے ہوئے ہیں اور ان احکام کے بجالانے پر مطعون ہیں، شرع شریف کی رونق بادشاہوں پر منحصر ہے، لیکن اب قصہ برعکس ہوگیا ہے اور معاملہ بدل گیا ہے، ہائے افسوس! صد افسوس! ہم ایسے نازک وقت میں آپ کے وجود مبارک کو غنیمت جانتے ہیں، اس معرکۂ ضعیف میں آپکے سوا کسی اور کو بہادر نہیں جانتے، آپکے مسلمان ہونے کی عزت ہمسروں کی نظروں میں ظاہر ہے، کوشش فرمائیں کہ زیادہ نہ سہی تو اتنا تو ہو کہ اہل اسلام بیہودہ عملی باتوں سے محفوظ رہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے، پہلی حکومت میں دین مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دشمنی مفہوم ہوتی تھی، اس حکومت میں ظاہری طور پر وہ عناد نہیں ہے، اگر ہے تو بے عملی کے باعث ہے، ایسا نہ ہو عناد و دشمنی تک نوبت پہنچ جائے، اور مسلمانوں پر معاملہ اس سے بھی زیادہ تنگ ہوجائے، حق تعالیٰ آپ کو اور ہم کو سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متابعت پر ثابت قدم رکھے،

جہانگیر کے امراء میں خانجہاں لودی بھی بڑا مذہبی واقع ہوا تھا، شیخ فضل اللہ برہان پوری کے حلقۂ ارادت میں داخل تھا، رات اکثر علماء اور صوفیہ کی صحبت میں گذارتا تھا، اس کی سرکار میں کسی قسم کی بدعت کا رواج نہ تھا،

مہابت خاں کے لڑکے خان زماں بہادر مرزا امان اللہ کے بارہ میں مآثر الامراء کے مصنف کا بیان ہے کہ "بجز بہادر امثال و اقران سر برتری می افراخت"

شاہجہانی عہد کے امراء میں افضل خاں، علامی شکر اللہ شیرازی، علامی سعد اللہ خاں اور دانشمند خاں میر بخشی کا ذکر ہم پہلے بھی کر چکے ہیں، یہ تینوں معقولات و منقولات کے عالم تھے،

شاہجہاں کے عہد میں افضل خاں، علامی شکر اللہ شیرازی دیوان کل کے عہدے پر فائز ہوئے تو کسی نے تاریخ کہی ع

شد فلاطون وزیر اسکندر

علامی سعد اللہ کی تقریر کی بلاغت اور تحریر کی فصاحت مشہور تھی، ان کے مذہبی معلومات، علمی لیاقت، حسن اخلاق، تواضع اور دیانتداری سے عہدۂ وزارت کو وقار حاصل تھا۔

عالمگیر اپنے میر بخشی دانشمند خاں اور ملا شفیعائی یزدی کو ان کے علم و فضل اور نیک نفسی کی وجہ سے بہت عزیز رکھتا تھا، مآثر الامراء کے مصنف نے لکھا ہے۔

"پس از دتا حال از نونیاں لبنہ مقدار کسے کہ فضیلت را با امارت جمع کردہ باشد در عرصۂ روزگار نیامدہ"

مغل بادشاہوں کے آخری دور میں نجیب الدولہ کے یہاں نو سو علماء تھے، جو پانچ سے پانچ سو روپئے تک وظائف پاتے تھے، اس نے نجیب آباد میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا، جو شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک کا ایک زبردست مرکز تھا، شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کی حکومت کو سنبھالنے کی کوشش میں اس سے بڑی مدد حاصل کی۔

ان کے علاوہ بہت سے امراء ایسے بھی تھے جن کی سپہگری، جانبازی اور پامردی سے ہر زمانہ میں حکومت کو بڑی تقویت پہنچتی رہی، ان کے تدبر اور ہوشمندی سے حکومت کا وقار بڑھتا گیا، اسی لیے علماء ضرورت کے وقت ان سے مدد لیتے رہے۔

لیکن مجموعی حیثیت سے امراء کا اخلاق اور کردار بہت زیادہ قابل تعریف نہیں رہا، اس میں شک نہیں کہ سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ کے عروج کے زمانے میں زیادہ تر امراء ایسے تھے، جن کی فوجی اور حربی قیادت سے حکومت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی، وہ حصار اور میدان

کی لڑائیاں جس طرح لڑتے رہے، ہندوستان کی جنگی تاریخ کا غیر معمولی کارنامہ ہے، سندھ میں برہمن آباد کے قلعہ کا دور چار میل تھا، جو سد سکندری سے زیادہ مضبوط سمجھا جاتا تھا، گوالیار کے قلعہ کے بارہ میں تاج المآثر کے مصنف کا بیان ہے کہ یہ اتنا اونچا تھا کہ تیز او رتند ہوا بھی اس کی اونچائی تک نہیں پہنچ سکتی تھی، ارنگل کے قلعہ کے بارہ میں امیر خسرو لکھتے ہیں کہ اس کی دیوار اتنی سنگین تھی کہ لوہے کی اینٹ بھی اس سے زیادہ مضبوط نہیں بنائی جا سکتی تھی، سنگ مغربی اس سے ٹکرا کر واپس آجاتا تھا، رن تھنبور کی اونچائی اور مضبوطی کو دیکھ کر ابو الفضل متحیر ہوگیا تھا، لکھتا ہے کہ خیال کی منجنیق بھی اس کی اونچائی تک نہیں پہنچ سکتی تھی، چتوڑ کے پہاڑی قلعہ کا دور آٹھ میل کا تھا، آسام کے قلعوں میں سری گھاٹ، ناندو اور سملا گڈھ کا ذکر کرتے وقت عالمگیر نامہ کا مصنف بے حد متحیر ہوگیا تھا، ان سب قلعوں کو فوجی امراء نے اپنی پامردی اور جانبازی سے فتح کیا اور ہندوستان کا شاید ہی کوئی قلعہ ایسا رہ گیا تھا جس کو انھوں نے تسخیر نہ کیا ہو، اسی طرح میدان کی لڑائیوں میں اختیار الدین محمد بن بختیار خلجی، ظفر خاں، الپ خاں، ملک کافور، خان عالم، منعم خاں خانخاناں، عبد الرحیم خان خاناں، خان زماں، بہادر خاں، ابراہیم خاں، سید عبد الوہاب، ذوالفقار خاں، امیر الامراء سید حسین خاں اور قطب الملک سید عبد اللہ خاں وغیرہ جس جوش وخروش شجاعت اور تہور سے لڑتے رہے، ان پر آج بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے، لیکن وہ اپنی سپاہیانہ خدمات کا صلہ حاصل کرنے کیلیے دربار کے اندر جس اخلاق وکردار کا نمونہ پیش کرتے رہے وہ بہت زیادہ قابل تعریف نہیں، اور ان فوجی قائدین میں سے کسی میں بھی حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح، حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت سعد بن وقاصؓ اور حضرت سعید بن عامرؓ کا ہلکا پرتو بھی نہیں پایا جاتا ہے۔ ایسا کیوں تھا؟ کیا وہ صرف حصول جاہ ومنصب کے مرض سے مغلوب رہے، اور کیا ان میں مذہبی غیرت وحمیت نہیں رہی؟ سلاطین وقت جنگ کے موقع پر برابر ان کا مذہبی جذبہ ابھارتے رہے، شہاب الدین غوری

دوسری بار پرتھوی راج سے لڑنے کے لیے آیا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام اور ہندو مذہب کی جنگ ہے، دکن میں جب جب فوجی امرا اپنی فوجیں لیکر گئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جہاد کرنے جا رہے ہیں۔ کنواہہ کی جنگ شروع ہونے سے پہلے بابر نے اپنے فوجی امراء کے سامنے جو تقریر کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجاہدوں ہی سے مخاطب تھا، اس نے کہا کہ ہم قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا منہ دکھائیں گے، اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس کا موقع دیا ہے کہ اگر ہم غنیم پر غالب آئے تو غازی کہلائے اور مرے تو شہید ہوئے، دونوں حال میں ہم کو بڑا درجہ اور بلند مرتبہ ملتا ہے، اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ تمام سرداروں نے کلام پاک کو ہاتھوں میں لیکر قسمیں کھائیں کہ وہ میدان جنگ سے کسی حال میں بھی منہ نہ موڑیں گے، اورنگ زیب داراسے اپنے امراء کے ساتھ یہ کہکر سموگڈھ کی طرف روانہ ہوا کہ وہ شرعی اور اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے، اور امراء اس سے متاثر ہوکر اس کے ساتھ ہو گئے۔

ان امرا کے مذہبی جذبات کو علماء بھی دین کی خدمت کے لیے ابھارتے رہتے تو شاید وہ مجموعی حیثیت سے اتنے بُرے نہ ہوتے جتنے کہ تاریخ کے صفحات پر دکھائی دیتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ ان کی امارت اور جاہ پسندی کی وجہ سے ان میں برائیاں پیدا ہوتی رہیں، پھر بھی وہ ایک بڑی قوت تھے، اسی لیے اچھے سلاطین ان کی برائیوں کو نظرانداز کرکے ان کے اچھے اوصاف سے برابر فائدہ اٹھاتے اور ان کو بڑی سی بڑی طاقت کے خلاف ٹکراتے رہے، علماء ان کی برائیوں کے نکتہ چیں تو ضرور تھے، لیکن ان کے عیش و عشرت کے قلعوں اور غفلت و بے عملی بلکہ دینی بے راہ روی کے حصاروں پر حملہ آور نہیں ہوئے، اور صرف وعظ و تلقین اور پند و نصائح کے ذریعہ ان کی اصلاح کی کوشش پر اکتفا کیا، اچھے سلاطین کی طرح ان کی قوت سے فائدہ نہیں اٹھایا، ان میں کوئی امیر مسجد بنا دیتا، مدرسے قائم کر دیتا، بیواؤں اور مسکینوں کو خیرات دیکر

فیاضی کا ثبوت دیتا، عالموں کو اپنے دربار میں رکھ لیتا تو اسی کو غنیمت جانتے اور کبھی اجتماعی طور پر ان کی مذہبی غیرت و حمیت کو دین کے فروغ اور اسلام کی صحت مندانہ ترقی میں استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی، اگر حضرت مجدد الف ثانی کی خدمات سے قطع نظر کر لیا جائے تو مسلمانوں کی حکومت کے دور عروج میں علماء نے قائدانہ صلاحیت اور زعیمانہ قوت و نفوذ کا ثبوت نہیں دیا، اس لیے سلاطین کے بعد امراء ہی معاشرت کے قائد بنے رہے، اور چونکہ ان کی مذہبی حمیت صحیح طور پر ابھار نہیں گئی، اس لیے ان کی امارت ان کی مذہبیت پر غالب ہوتی چلی گئی، اور اسی امارت کی خاطر ان میں باہمی بڑی کشمکش رہی جس سے پوری تاریخ بھری پڑی ہے، سلاطین دہلی کے عہد میں مملوک اور غیر مملوک، خلجی اور غیر خلجی، قرونہ ترک اور غیر قرونہ ترک، لودی اور غیر لودی امراء آپس میں لڑ کر خونریزی کرتے رہے، مغلوں کے عہد میں افغان اور غیر افغان، ایرانی اور غیر ایرانی، ہندوستانی اور غیر ہندوستانی اور راجپوت اور غیر راجپوت امراء لڑے، اور امراء کا با اقتدار گروہ جس کا ساتھ دیدیتا وہی تخت و تاج کا مالک ہو جاتا، طاقتور حکمراں کے عہد میں امراء کی یہ آویزش دبی رہتی لیکن کمزور حکمرانوں کے آجانے سے پھر ابھر جاتی، ان کی اس آویزش سے مسلمانوں کی تاریخ کو بڑا نقصان پہنچا،

شیعہ سنی امراء کا تنازعہ مغلوں کے آخری دور میں شیعہ اور سنی امراء کے جھگڑے بھی تکلیف دہ رہے، لیکن شیعہ اور سنی علماء ان جھگڑوں کو جس رنگ میں اب تک پیش کر رہے ہیں، اس سے ایک مورخ متفق نہیں ہو سکتا، یہ صحیح ہے کہ قطب الملک سید عبد اللہ اور امیر الامراء سید حسین علی خاں، برہان الملک اور صفدر جنگ کی سرگرمیوں سے مغل حکومت کو نقصان پہنچا، لیکن اس کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ بیرم خاں خانخاناں، امیر الامراء شریف خاں، منعم خاں خانخاناں عبد الرحیم خانخاناں، اعتماد الدولہ مرزا غیاث بیگ طہرانی، یمین الدولہ، آصف خاں

ابوالحسن مشہور بہ آصف جاہی، جملۃ الملک اسد خاں، شایستہ خاں اور میر جملہ وغیرہ کی جاں بازی اور شمشیر زنی سے مغلوں کی حکومت کو غیر معمولی سربلندی بھی حاصل ہوئی، یہ صحیح ہے کہ سادات بارہ نے فرخ سیر، رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ کے ساتھ بہت ناروا سلوک کیا، لیکن ان ہی کے بعد احمد شاہ کی آنکھیں نکلوائی گئیں، عماد الملک کے ذریعہ عالمگیر ثانی کا قتل ہوا، اور ایک سنی امیر غلام قادر روہیلہ نے قلعہ معلی کے اندر داخل ہو کر نازنینان حرم کے پھول سے رخساروں کو طمانچوں سے سرخ کیا، اور نوک خنجر سے شاہ عالم کی آنکھیں نکالیں، یہ پہلو بڑا ہی دردناک ہے کہ بنگال میں میر جعفر اور دکن میں میر صادق پیدا ہوئے، لیکن حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور سید احمد شہیدؒ بریلوی کی اسلامی تحریک کو بالاکوٹ میں دفن کرنے والے آخر کون تھے؟ اس کا جواب موجودہ دور کے ایک دیدہ ور عالم اور مورخ کے الفاظ میں یہ ہے کہ ان مجاہدوں کی تاریخ بتائے گی کہ ان کی تحریک کا یہ انجام کیوں ہوا، واقعہ چھپا اور اسباب نامعلوم نہیں، وہی جماعتوں کا نفاق اور امراء کا اختلاف ان کی ناکامی کا سبب ہوا، جو ہمیشہ سے ناکاموں کی ناکامی کا سبب بنا رہا ہے، پشاور کے پٹھان امراء اگر وفاداری سے کام لیتے تو آج ہندوستان کا نقشہ دوسرا ہوتا،

شیعہ امراء سنی امراء ہی کی طرح اپنے اقتدار کی خاطر تخت و تاج سے الجھتے رہے، ان کی بادشاہ گری سنی امراء ہی کی طرح تھی، مملوک امراء نے بادشاہ گر بن کر التتمش کو تخت پر بٹھایا، خلجی امراء نے جلال الدین خلجی کے سر پر تاج رکھا، قرونہ ترک امراء نے غیاث الدین تغلق کو اپنا بادشاہ بنایا، لودی امراء نے خاندان سادات کو ختم کر کے بہلول لودی کو بادشاہ تسلیم کیا، مغلوں کے دور میں جنگ جانشینی کی لڑائی امراء ہی کے سہارے لڑی جاتی تھی، اسی طرح آخری دور میں سادات بارہہ بادشاہ گر ہو گئے تھے تو یہ محض ان کی اقتدار پسندی تھی لیکن اس اقتدار پسندی میں بھی تیموری خاندان کے احترام میں سنی بادشاہ ہی کو تخت پر بٹھاتے رہے، اور انھوں نے ان بادشاہوں کے ساتھ جو

ناروا سلوک کیا، وہ محض انکی سیاسی بازی گری تھی۔ اس کا تعلق ان کے مذہبی عقائد سے جوڑنا صحیح اور مؤرخانہ
تجزیہ نہیں ہوگا۔ قطب الملک سید عبد اللہ خاں اور امیر الامرا سید حسین علی خان کے متعلق مآثر الامرا
کے مصنف کا بیان ہے کہ

> "ایشاں از اعاظم سادات بارہہ اند، و اکابر شرفائے ہند۔ ہر دو برادر فرقدین فلک سیادت
> و نیرین سپہر امارت بودند، متحلی باکثر شمائل سنیہ، و خصائل رضیہ، خصوص سخاوت و شجاعت
> کہ ازیں دو صفت والا آثار غرا بظہور رسانند و نقشہائے کہ طراز صفحۂ دولت باشد
> بر لوح روزگار نشانند و از مبادی ایام عروج تا منتہی بخوبی و نیکنامی بسر بردند، و
> از آبیاری عدل و احسان عرصۂ ہند را رشک فردوس بریں بودند لیکن در اواخر ایام
> دولت راہ غلط پیمودند تا روز قیامت داغ بدنامی باخود بردند"

ایک گروہ ایسا بھی ہے جو سادات بارہہ اور ان کے ہم خیال امرا کی سرگرمیوں کو مبالغہ آمیز
طریقہ پر بیان کرکے مسلمانوں میں خواہ مخواہ مذہبی اور ذہنی انتشار پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن
ہندوستان کی تاریخ پر نظر رکھنے والے اس ذہنی انتشار میں مبتلا نہیں ہوسکتے۔ غوریوں نے پنجاب
میں غزنویوں کو ختم کیا، تیمور نے دہلی میں آکر خاندان تغلق کی حکومت پر ایک زبردست ضرب
لگائی، سکندر لودی نے شرقی خاندان کو ختم کیا، بابر نے ابراہیم لودی کو پانی پت کی جنگ میں شکست
دیکر بے شمار مسلمانوں کی لاشوں کا ڈھیر کردیا، شیر شاہ سوری نے ہمایوں کو ہندوستان چھوڑ کر
جلا وطن ہونے پر مجبور کیا، اکبر مظفر گجراتی اور چاند سلطانہ کے خلاف برابر یلغار کرتا رہا،
نادرشاہ اور احمد شاہ ابدالی نے دہلی آکر جو خونریزی کی، اسکی تفصیل پڑھکر اب بھی رونگٹے کھڑے ہوجاتے
ہیں، ان میں فریقین سنی ہی تھے، اگر ان میں کوئی فریق شیعہ ہوتا تو سنی شیعہ کا سوال پیدا ہوجاتا،
جیسا کہ عالمگیر کے زمانے میں گولکنڈہ اور بیجاپور کی فوج کشی کو بنا دیا گیا ہے، اورنگزیب کے

تمام ننہالی رشتہ دار شیعہ تھے۔ اس کی بیوی دلرس بانو کے تمام اعزہ و اقربا بھی شیعہ ہی تھے، وہ دربار اور محل کے اندر زیادہ تر شیعی عقائد رکھنے والوں ہی سے گھرا رہتا تھا، اگر ان سب کو محض شیعہ ہونے کی وجہ سے ناپسند کرتا تو شاید اس کا ایک لمحہ بھی سکون و چین سے نہیں گذر سکتا تھا،

سنیوں اور شیعوں میں مذہبی عقائد کے سلسلہ میں جو اختلافات اور لڑائیاں ہوئیں وہ اسلامی تاریخ کا بہت ہی المناک پہلو ہے، اس سے اسلام کو بڑا نقصان پہنچا، لیکن ان کی نوعیت شیعہ اور سنی امراء کے جھگڑوں سے بالکل الگ ہے، امراء کی آویزش کا مقصد اقتدار، جاہ اور منصب کے علاوہ کچھ اور نہ تھا،

مسلمان عوام | علماء ان جھگڑوں کو بے بسی سے دیکھتے رہتے، حالانکہ وہ سلاطین اور امراء کو چھوڑ کر عوام کے دلوں کو تسخیر کرتے، تو سلاطین اور امراء دونوں کو اپنے سامنے جھکا سکتے تھے، اور مسلمانوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ان کا اعلیٰ اور اونچا طبقہ ہر زمانہ میں اچھا نہیں رہا، بلکہ بعض زمانے میں بہت برا ہو گیا جس سے ان کی تاریخ ہی بدل گئی لیکن مسلمان عوام ہر زمانے میں اچھے رہتے ہیں، ان کا ظرف توحید و رسالت کی اعلیٰ تعلیم اور اسلام کی برتری کے احساس کی بدولت ہمیشہ سونے کا رہتا ہے، جس پر زمانہ کبھی زنگ لگا دیتا ہے لیکن جب کبھی اچھے سنار کے ہاتھوں میں آجاتا ہے تو پھر کندن کی طرح دمکنے لگتا ہے، اسی لیے یہی عوام لشکری بن کر اچھے سلاطین اور اچھے امراء کی قیادت میں بڑے بڑے جنگی اور حربی کارنامے انجام دیتے رہے، کبھی کوئی رن کے ہلاکت خیز صحرا میں پہنچے، کبھی اراکان کے دشوار گذار علاقوں میں داخل ہو کر دریائی جنگلوں سے گذرے، کبھی وندھیاچل کے پر پیچ اور تنگ راستوں کو طے کیا، کبھی تبت و ترکستان کی سرحد تک پہنچ کر اپنی شجاعت و مردانگی کے جوہر دکھائے، کبھی تورجیل کے ہولناک دروں میں موت اور ہلاکت سے سینہ سپر ہوئے، کبھی ان کا دل یا دل دریائے سرخاب اور کوہ ہندوکش کے برفستانی

علاقوں سے گذرا، اور ان ہی کی نبرد آزمائی اور سپہگری سے نہ صرف کشمیر سے راس کماری تک ہندوستان کو جغرافیائی وحدت حاصل ہوئی، بلکہ ان کی وجہ سے ہندوستان کا پرچم کابل، قندھار، بست، بلخ اور بدخشاں پر بھی لہرایا، ان جنگی کارناموں پر کسی قوم کو بھی ناز اور فخر ہو سکتا ہے،

پھر بھی مسلمان اپنے سلاطین کے جا مقلد بھی نہیں رہے، اچھے علماء کی قیادت میں کیا کچھ نہیں کیا، علماء ہی کے اثر سے اکبر جیسا وسیع المشرب اور روادار حکمراں ان میں مقبول نہ ہو سکا، انھوں نے حضرت احمد سرہندی کو مجدد وقت تسلیم کرکے اپنا سرتاج بنایا، تو جہانگیر جیسے تاجدار کو بھی ان کے سامنے جھکنا پڑا، محمد شاہ رنگیلے کے جانشین احمد شاہ اور اس کی ماں کو اندھا کیا گیا، تو وہ خوش تھے، آگے چل کر تیموری خاندان کے فرمانروا کو نظرانداز کرکے وہ حضرت سید احمد شہید بریلوی اور حضرت اسمٰعیل شہید کے پیچھے جس طرح امڈے اس پر ان کی نسلوں کو آج بھی فخر ہے،

عالمگیر کے بعد اس کے نااہل جانشینوں کے عہد میں مسلمانوں پر سخت وقت آیا، تو وہ التتمش کی دینداری اولوالعزمی، بلبن کی فرکیخسروی، علاء الدین خلجی کے عہد کی اقتصادی خوشحالی اور رعیت پروری، محمد تغلق کی فیاضی اور عدل گستری، فیروز تغلق کی شریعت نوازی، بابر کا سپاہیانہ جوش و خروش اور آہنی عزم، ہمایوں کا استقلال و ہمت، شاہجہاں کی شان و شوکت اور عالمگیر کی نبرد آزمائی اور بیدارمغزی پھر سے دیکھنا چاہتے تھے جو میسر نہ ہوئی، اس کے بجائے انھوں نے جہاندار شاہ کی طوائف لال کنور کی رنگ رلیاں دیکھیں، جو اپنی تمام بدعنوانیوں کے ساتھ جہاندار شاہ کی جگہ حکومت کرنے لگی تھی، اور جس کو چاہتی اعزاز و منصب عطا کرتی، دربار اور حرم کی اس اخلاقی پستی کو دیکھ کر مسلمان خون کے آنسو روتے رہے، مسلمانوں میں اس وقت تک اجتماعی اور تنظیمی شعور پیدا نہیں ہوا تھا، ان کی قوت یا سلاطین تھے یا امراء، جب ان دونوں سے ان کو مدد نہ ملتی تو علماء کی طرف نظر اٹھاتے، اکبر کے زمانہ کی بے راہ روی کو جہانگیری عہد میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جس طرح

روکا تھا، اس سے لذت آشنا ہونے کے بعد ہر زمانے میں بادشاہ وقت کی کج روی کے سد باب کے لیے
علماء ہی کی طرف ان کی نظر اٹھتی تھی لیکن عالمگیر کے بعد سلاطین کی بے راہ روی کو روکنے میں
علماء کی طرف سے کوئی صحیح رہنمائی نہیں ہوئی، اور جہاندار شاہ پر وہ مطلق اثر انداز نہ ہو سکے،
فرخ سیر کی وفات کے بعد اجیت سنگھ راٹھور اپنی لڑکی کو شاہی محل سے چھڑوا لے جانے لگا تو
یہ راجپوت شاہزادی اپنا اسلامی لباس اتار تی گئی یعنی اسلام ترک کر کے ہندو بن کر باپ کے گھر گئی،
خافی خاں نے لکھا ہے کہ مسلمانوں میں اس سے بڑی ہلچل پیدا ہوئی کہ ایک مسلمان عورت پھر ہندو ہو جائے،
یہ بات شریعت اسلام اور ناموس سلطنت کے خلاف سمجھی گئی، کیونکہ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ
راجاؤں کی لڑکیاں مشرف بہ اسلام ہو کر بادشاہوں کی زوجیت میں رہنے کے بعد پھر ہندو بن کر
اپنے گھروں کو جائیں، علماء نے اس موقع پر احتجاج تو کیا لیکن وہ موثر نہ بن سکے اور اس عہد کے
بادشاہ گر قطب الملک سید عبد اللہ خاں نے راجپوت شاہزادی کو محل سے جانے کی اجازت دیدی
اور ایک کروڑ روپئے کا مجوزہ سامان بھی اس کے ساتھ واپس کر دیا

محمد شاہ کے لڑکے احمد شاہ کے عہد میں تو حکومت کا نقشہ اور بھی بدل گیا، اس کی ماں اودھم بائی
ایک نومسلم طوائف تھی، وہ اودھم بائی سے نواب قدسیہ صاحب زمانی حضرت قبلہ عالم ہوگئی اور
پنج لاکھ سوار کے منصب سے سرفراز کی گئی، اسی کی ڈیوڑھی میں دربار لگتا، اور سلطنت کے تمام اہم کام
انجام پاتے، اس کا بھائی مان خان اونی درجہ کا گویا اور نچیا تھا لیکن شش ہزاری منصب دار بنا کر
معتقد الدولہ بہادر کے خطاب سے سرفراز کیا گیا، پھر محل کا ایک خواجہ سرا جاوید خاں وزارت عظمیٰ
پر فائز کیا گیا، اور اس کو نواب بہادر کے خطاب پانے کے ساتھ ہی مراتب علم اور نقارہ
کے استعمال کی بھی اجازت دی گئی، اس پر علماء کی غیرت وحمیت ابھری تو احمد شاہ کی معزولی
کا فتویٰ صادر کیا، اور محمد شاہ محبوس کر دیا گیا، پھر اس کی اور اس کی شوخ دیدہ ماں دونوں کی

آنکھیں نکلوا دی گئیں، عام مسلمان اس سے آزردہ خاطر ہونے کے بجائے خوش ہوئے، لیکن مسلمانوں کی حکومت کی گرتی ہوئی عمارت صرف فتویٰ کے سہارے نہیں رک سکتی تھی، مسلمان سلاطین قطب مینار، لال قلعہ اور تاج محل بنا کر مسلمانوں کی سیاسی اور تمدنی زندگی کا رعب و جلال دکھا چکے تھے، اس لیے ضرورت اس کی تھی کہ علما و صلحا اپنے دل بے تاب اور نگاہ مردمومن سے مسلمانوں کے اخلاق و کردار کے قطب مینار اور تاج محل بنا کر ان کی تقدیر بدل دیتے لیکن وہ ایسا نہ کر سکے اور جب اس کی کوشش کی تو اس وقت بہت تاخیر ہو چکی تھی، جس وقت جانباز، سرفروش اور کفن بردوش علماء کے پیدا ہونے کی ضرورت تھی، اس وقت ان کا فقدان ہو گیا تھا،

لایق سلاطین کے عہد میں لایق علماء اور تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اچھے سلاطین ہی کے عہد میں اچھے علماء بکثرت پیدا ہوتے رہے، اور نالایق سلاطین کے دور میں اچھے علماء پیدا نہ ہو سکے، ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں اس قدر ارباب فضل و کمال جمع ہو گئے تھے کہ ربع مسکون میں اس کی کوئی مثال نہ تھی، اور اس کا دربار محمود و سنجر کا دربار معلوم ہوتا تھا، بلبن کے عہد میں مولانا برہان الدین محمود بلخی، مولانا نجم الدین، عبد العزیز دمشقی، مولانا شیخ سراج الدین سنجری، مولانا شرف الدین ولوالجی، قاضی رکن سامانوی، مولانا کمال الدین زاہد، مولانا شمس الدین خوارزمی، مولانا فخر الدین ناقلہ، قاضی رفیع الدین گازرونی، قاضی جلال الدین کاشانی، قاضی ظہیر الدین، شیخ الاسلام سید قطب الدین، مولانا سید منتخب الدین، مولانا سید معین الدین سامانہ کے علم و فضل سے اس عہد میں فیوض و برکات کا بڑا چشمہ بہتا رہا،

علاء الدین خلجی کا شمار دیندار اور متقی سلاطین میں نہیں کیا جاتا ہے، لیکن وہ ایک لایق اور کامیاب حکمراں ضرور تھا، اور اس کی حکومت میں مختلف شعبہ ہائے زندگی میں ترقی ہوتی رہی، اور اسی کے ساتھ اس کے عہد میں علماء بکثرت جمع ہو گئے تھے، ضیاء الدین برنی نے قاضی

فخر الدین ناقلہ، قاضی مشرف سرا ہی، مولانا نصیر الدین غنی، مولانا تاج الدین مقدم، مولانا رکن الدین سنامی، مولانا تاج کلاہی، مولانا ظہیر الدین بھکری، قاضی محی الدین کاشانی، مولانا وجیہ الدین پائلی، مولانا شہاب الدین ملتانی، وغیرہ جیسے چھیالیس علما، کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر ان میں سے ہر ایک کے علمی کمالات کا ذکر کیا جائے تو ایک ایک کتاب تیار ہو جائے، پہلے ذکر آ چکا ہے کہ ان میں سے بعض علما، امام غزالی، امام رازی، امام ابو یوسف اور امام محمد کے پایہ کے تھے، سلطان محمد تغلق کے دور میں مولانا ضیاء الدین بخشی، مولانا معین الدین عمرانی، مولانا عفیف الدین کاشانی، مولانا ناصر الدین واعظ ترمذی، مولانا عبد العزیز اردبیلی، شیخ ابو بکر بن خلال وغیرہ جیسے علماء سے خواص و عوام فائدہ اٹھاتے رہے، یہ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ دو سو فقہا اس کے دسترخوان پر موجود ہوتے تھے،

فیروز شاہی عہد میں مولانا صدر الدین یعقوب مظفر کرمانی، مولانا جلال الدین، مولانا علیم الدین بہتی، مولانا خواجگی تھانیسری، قاضی عبد المقتدر شریحی، مولانا عالم بن علا (مؤلف فتاویٰ تاتارخانیہ) مولانا شرف الدین محمد العطائی (صاحب فوائد فیروز شاہی) جیسے علماء موجود تھے، ان میں سے بعض علماء سے خود فیروز شاہ استفادہ کرتا رہا، سلطان سکندر لودی کے عہد میں مولانا شیخ سعد اللہ، مولانا شیخ رزق شتاقی، مولانا اللہ داد، مولانا شیخ عبد الوہاب بخاری، مولانا شاہ جلال تبریزی، مولانا شیخ عبد اللہ تلنبی، مولانا میاں طٰہٰ، مولانا میاں خواجگی، مولانا سید رفیع الدین صفوی، مولانا جلال الدین دوانی، مولانا شیخ حسام الدین المعروف بہ اجہر، مولانا میاں لکھوہ، ممتاز علماء تھے، جو محراب و منبر اور مسند درس و تدریس کی زینت بنکر عوام و خواص کو اپنے علم و فضل سے سیراب کرتے رہے، عہد اکبری میں ابو الفضل نے شیخ مبارک ناگوری، شیخ نظام نارنولی، شیخ ادہن، امن اللہ، میاں وجیہ الدین، شیخ رکن الدین، شیخ عبد العزیز، شیخ الہدیہ، شیخ

عبدالغفور کو خدیو نشاتین کہا ہے، میر فتح اللہ شیرازی، میر مرتضیٰ، مولانا سید ترکستانی، حافظ تاشکندی، مولانا شاہ محمد، مولانا علاء الدین، حکیم مصری، اور مولانا صادق کو دانندۂ معقول و منقول لکھا ہے؛ مولانا پیر محمد، مولانا عبدالباقی، مرزا مفلس، مولانا محمد، مولانا نورالدین ترخان کو شناسائے عقلی کلام بتایا ہے، اور میاں حاتم، مولانا عبدالقادر، مخدوم الملک، میر عبداللطیف، میر نور اللہ، شیخ عبدالنبی وغیرہ کو "حواناتی نقلی مقال" کہا ہے، ان کے علاوہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، حاجی ابراہیم محدث، شیخ جلال الدین تھانیسری، شیخ نظام الدین امیٹھوی، شیخ داؤدی جہنی وغیرہ کے فیوض و برکات سے عوام و خواص متمتع ہوتے رہے،

جہانگیر نے اپنے عہد میں میران صدر جہانی، مولانا مرزا شکراللہ شیرازی، مولانا نقیائے شوستری، مولانا مرزا محمد قاسم گیلانی کو ہر طرح نوازا، اور اس عہد میں اور جو دوسرے علما، تھے ان کے نام ملا روزبہان شیرازی، اعمیٰ اعمری، ملا باقر کشمیری، ملا باقر ٹھٹھی، ملا مقصود علی تبریزی، قاضی نور اللہ، ملا فاضل کابلی، ملا عبداللطیف سہارنپوری، ملا عبدالرحمٰن بوہرہ گجراتی، ملا حسن فرائی گجراتی، خواجہ عثمان حصاری اور ملا محمد جونپوری تھے،

شاہجہانی عہد میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، ملا محمد فاضل بدخشانی، قاضی محمد اسلم ہروی، قاضی محمد سعید کرہرودی، ملا میرک شیخ ہروی، ملا عبداللطیف سلطانپوری، میر محمد ہاشم گیلانی، ملا فرید دہلوی، ملا یوسف، ملا عبدالسلام لاہوری، مولانا محب علی، مولانا سید محمد قنوجی، ملا محمود جونپوری وغیرہ اسلام کی عزت و ناموس کے محافظ رہے،

عالمگیر نے مولانا عبداللطیف سلطانپوری، مولانا ہاشم گیلانی، علامی سعد اللہ، ملا موہن بہاری، مولانا سید محمد قنوجی، ملا شیخ احمد معروف بہ ملا جیون، شیخ عبدالقوی، ملا شفیعائی دانشمند خاں جیسے علماء سے تعلیم پائی، پھر فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب و تدوین میں شیخ نظام برہانپوری

ملا محمد جمیل جونپوری، قاضی محمد حسین جونپوری، ملا حامد جونپوری، شیخ وجیہ الدین گوپامئوی، شیخ رضی الدین بھاگلپوری جیسے علماء اور فقہاء نے پوری اعانت کی، پھر اسی عہد میں ملا محمد معقوم شیخ سلیمان منیری، ملا قطب ہانسوی، ملا عبد اللہ سیالکوٹی، شیخ قطب برہانپوری، ملا عوض وجیہ قاضی عبد الوہاب، مولانا سید محمد بیجاپوری، حاجی احمد سعید بہاری، سید علی اکبر سعد اللہ خانی، ملا محمد اکرم لاہوری، حافظ ابراہیم، ملا شرف الدین لاہوری، ملا عبد الباقی جونپوری، قاضی سید عنایت اللہ مونگیری، قاضی ملک محب اللہ بہاری، سید سعد اللہ سلونی وغیرہ اپنے علم و فضل، ذہانت و ذکاوت اور فطرت عالی کی وجہ سے عزت و وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے،

اچھے علماء کا فقدان | عالمگیر کے بعد نالائق حکمرانوں کی ایک طویل فہرست ہے، اور یہ دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ اس زوال اور ادبار کے زمانے میں شاہ ولی اللہ کے عہد شباب تک اچھے علماء اور صلحاء کا فقدان ہوگیا، شاہ ولی اللہ کی ولادت ۱۷۰۳ء میں ہوئی اور ۱۷۱۹ء میں وہ اپنے والد بزرگوار کی مسند تدریس پر جلوہ افروز ہوئے، بارہ برس تک درس و تدریس دیتے رہے، پھر حجاز تشریف لے گئے اور وہاں سے علم حدیث کی تحصیل و تکمیل کرکے دو سال کے بعد واپس ہوئے، تو انھوں نے تجدید و اصلاح کا کام شروع کیا، اس اثنا میں جانشینی کی سات لڑائیوں سے تخت و تاج کی بنیاد ہل گئی تھی، ان لڑائیوں میں بڑے بڑے جانباز، آزمودہ کار، اور لائق فوجی سردار مارے گئے اور جو مارے نہیں گئے وہ دربار سے منسلک ہونے کے بعد میدان جنگ کی کدورت دیوان عام اور دیوان خاص میں بیٹھکر نکالتے رہے، جس سے دربار سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا مرکز بن گیا، اور جہاندار شاہ سے بہادر شاہ ظفر تک دربار کی تاریخ نفاق پرور ریشہ دوانیوں اور ہلاکت خیز فتنہ انگیزیوں سے معمور ہے، اور جب حکومت شام غریباں بن کر رہ گئی تو مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی قوت اور بڑھی، سکھوں نے پنجاب میں اپنا تسلط قائم کرلیا، جاٹوں اور انگریزوں نے بھی حکومت

کی پاسبانی لگائی، اس طوائف الملوکی میں اچھے علما کی پیدا وار بھی بند ہوگئی، درس و تدریس کی مسند تو خالی نہیں ہوئی، محراب و منبر کی زینت بھی نہیں گئی لیکن ان علماء سے مسلمانوں کو خاطر خواہ فائدہ نہیں پہنچا، شاہ ولی اللہ اپنے عہد کے علماء کو مخاطب کرتے ہوئے بڑے دکھ اور درد سے فرماتے ہیں،

"اے بے عقلو! جنھوں نے اپنا نام علماء رکھ چھوڑا ہے، تم یونانیوں کے علوم میں ڈوبے ہوئے ہو اور صرف، نحو اور معانی میں غرق ہو، اور سمجھتے ہو کہ یہی علم ہے، یاد رکھو علم یا تو قرآن کی کسی آیت محکم کا نام ہے یا سنت ثابتہ قائمہ کا، چاہیے کہ قرآن سیکھو..... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری روش کی پیروی، اور آپ کی سنت پر عمل کرو.... تم نے اپنے حالات سے عام مسلمانوں کو یہ باور کرایا ہے کہ علماء کی بڑی کثرت ہو چکی ہے، حالانکہ ابھی کتنے بڑے بڑے علاقے ہیں جو علماء سے خالی ہیں، اور جہاں علماء پائے بھی جاتے ہیں وہاں بھی دینی شعار کو غلبہ حاصل نہیں ہے...... دین میں خشکی اور سختی کی راہ اختیار کرنے والوں سے میں پوچھتا ہوں.... کہ تمھارا کیا حال ہے، ہر بری بھلی بات، ہر رطب و یابس پر تمھارا ایمان ہے، لوگوں کو تم جعلی اور گھڑی ہوئی حدیثوں کا وعظ سناتے ہو، اللہ کی مخلوق پر تم نے زندگی تنگ کر چھوڑی ہے، حالانکہ تم اس لیے پیدا ہوئے تھے کہ لوگوں کو آسانیاں بہم پہنچاؤگے، نہ کہ ان کو دشواریوں میں مبتلا کر دگے"۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ اسی طرح سلاطین کی زبوں حالی پر حزن کے آنسو روتے ہیں اور وہ ایک خط میں گذشتہ زمانہ کو یاد کرکے لکھتے ہیں کہ بادشاہانِ اسلام کا وجود اللہ تعالیٰ کی ایک زبردست نعمت ہے، قدیم اسلامی بادشاہوں نے بڑی مدت میں بڑی جد وجہد کے بعد اس ولایت کو فتح کیا، دہلی کے علاوہ جو صاحب اقتدار بادشاہوں کا مستقر رہی ہے، ہر علاقہ میں علیحدہ علیحدہ فرمانروا تھے، گجرات، ٹھٹھہ، بنگالہ، برہانپور، برار، اورنگ آباد، حیدر آباد، بیجاپور، مالوہ میں صاحب فوج

اور صاحب خزانہ بادشاہ ہوتا تھا. ہر ایک بادشاہ نے اپنی اپنی مملکت میں مسجدیں تعمیر کرائیں مدرسے قائم کیے، عرب وعجم کے مسلمان اپنے اپنے وطنوں سے منتقل ہوکر ان علاقوں میں آگئے، اور یہاں اسلام کی ترویج واشاعت کا سبب بنے، اس وقت تک ان لوگوں کی اولاد اسلام کے طور طریقہ پر قائم ہے، لیکن آگے چل کر اپنے زمانے کے سلاطین کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انکی ناعاقبت اندیشی، غفلت اور اختلاف فکر کی وجہ سے طوائف الملوکی شروع ہوگئی، مرہٹوں اور جاٹوں کو غلبہ حاصل ہوگیا، بادشاہوں کی نااہلی پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ بیت المال کا صحیح انتظام نہیں کرتے اور خزانہ کی قلت کے باوجود ایسے لوگوں کو وظائف دیتے ہیں جو محنت نہیں کرتے لیکن وظایف پاکر خزانے پر بوجھ بنے ہوئے ہیں، خزانے کو بھرنے کے لیے کاشتکاروں، بیوپاریوں اور پیشہ وروں پر بھاری محصول لگایا جاتا ہے، پھر بھی فوج کو وقت پر تنخواہ نہیں ملتی، جاگیرداروں کی کثرت ہوگئی ہے، اور ان کے مسموم اثرات معاشرت میں پھیلے ہوئے ہیں،

امرا کی جو اخلاقی حالت بگڑ گئی تھی، اس کا ذکر پہلے آچکا ہے. شاہ ولی اللہؒ کو اس کا رنج تھا کہ وہ دنیا کی فانی لذتوں میں ڈوب کر اپنا سارا وقار کھو چکے ہیں بلکہ ان کو اس کا بھی دکھ تھا کہ بنگال اور اودھ میں انھوں نے اپنی اپنی سلطنت قائم کرکے دہلی کی مرکزیت کو ختم کر دیا ہے،

بگڑی معاشرت اور جب اچھے سلاطین، اچھے امرا اور اچھے علما نہیں رہے جو حکومت اور معاشرت کو سنوارنے والے تھے، تو عام مسلمانوں کی بھی معاشرت بگڑی. شاہ ولی اللہؒ ان پر آنسو بہاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کے اخلاق خراب ہو چکے ہیں، ان پر حرص وآز سوار ہو گیا ہے. ان پر شیطان نے قابو پالیا ہے. انھوں نے حرام کو حلال اور حلال کو حرام بنا دیا ہے، روزی کمانے کے بجائے دوسروں کے سینوں کے بوجھ بنے ہوئے ہیں، دنیا کمانے اور دھندوں میں اتنے پھنس گئے ہیں کہ نماز، روزہ اور زکوٰۃ کا مطلق خیال نہیں کرتے، انھوں نے ایسے بگڑے ہوئے رسوم اختیار کرلیے ہیں جن سے دین کی اصلی صورت بھی بگڑ گئی ہے اور انکی زندگی بھی انکے لیے تنگ ہوگئی ہے، مسلمانوں

میں جو پیشہ ور ہیں ان میں امانت کا جذبہ بالکل مفقود ہوگیا ہے، وہ فرضی معبودوں پر قربانیاں چڑھاتے ہیں، مدار اور سالار کا حج کرتے ہیں، ان میں سے بعض لوگوں نے فال بازی، گنڈے اور ٹونکے وغیرہ کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے، وہ اپنی عورتوں اور بچوں کے حقوق کی پروا نہیں کرتے وغیرہ وغیرہ۔

شاہ ولی اللہؒ کا احسان | اس سقوط و تنزل کے زمانے میں شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کے انحطاط کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد قلمی جہاد کیا اور قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ اور اس کے تشریحی فوائد لکھکر عام مسلمانوں کے ذہن کو اس کی تعلیمات سے قریب تر کیا، اسی طرح حدیث کی اہم ترین کتاب موطا کی فارسی اور عربی میں مجتہدانہ شرحیں لکھیں، صحیح بخاری کے تراجم کی شرح کی اور مدارس میں فقہ و منطق کے بجائے حدیث کے درس و تدریس پر زور دیا جس کو ان کے تلامذہ نے تمام ملک میں پھیلایا، تقلیدی فقہ کی جگہ تحقیقی فقہ کی اہمیت بتا کر فقہی جمود کو توڑا، اور حنفی، شافعی، حنبلی اور مالکی کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے کی کوشش کی، اسی طرح ازالۃ الخفا لکھکر شیعوں اور سنیوں کا ذہن صاف کیا، تفہیمات میں اصلاح معاشرت اور اصلاح رسوم پر زور دیا۔ اور حجۃ اللہ البالغہ تو آج تک علماء کے لیے شمع ہدایت ہے، اور بقول مولانا شبلی اس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی، رازی اور ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے۔ اور انھوں نے اپنے والد بزرگوار کے مدرسہ رحیمیہ میں درس دینا شروع کیا تو اس کے طلبہ یہاں کے اصلاحی نصاب کو سندھ سے بنگال تک سیکڑوں مدارس میں رواج دیتے رہے جس سے اسلام کی ایک نئی لہر ہندوستان میں پھیلی، اس موقع پر اس کا اظہار غیر مناسب ہوگا کہ اس مدرسہ کے لیے ایک عالی شان مکان محمد شاہ رنگیلے نے عطا کیا تھا، موجودہ دور کے ایک بڑے عالم نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس رنگیلے نے مسلمانوں کے ساتھ وہ رنگیں سلوک کیا کہ اگر مسلمان اس غریب کو اس خدمت کی بنیاد پر بخشش بیا دیں تو وہ اس کا مستحق قرار دیا جا سکتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے دردمند دل کی سیاسی پکار ان کے ان خطوط میں سنائی دیتی ہے جو انھوں نے احمد شاہ ابدالی کے علاوہ نجیب الدولہ اور نظام الملک کو لکھے، ان امراء میں اسلامی حمیت اور غیرت باقی رہ گئی تھی،

اس سے شاہ صاحب نے فائدہ اٹھانا چاہا، نجیب الدولہ کو وہ رئیس المجاہدین، امیر الغزات اور منبع الحسنات کے لقب سے یاد کرتے رہے، اور نجیب الدولہ کی تائید سے احمد شاہ ابدالی کو مدعو کیا، اس دعوت پر احمد شاہ ابدالی ۱۷۶۱ء میں ہندوستان آیا اور پانی پت کی مشہور تیسری لڑائی ہوئی، اس کا نتیجہ اتنا تو ضرور ہوا کہ مغل بادشاہوں کی حکومت کی مدت کچھ اور بڑھ گئی، لیکن ان کی بنیادی کمزوریوں میں کوئی مضبوطی پیدا نہ ہوسکی، کیونکہ ان میں انکے اسلاف کی طرح شاہین کا جگر اور عقابی قوتِ پرواز باقی نہ رہ گئی تھی، انکی تلوار صیقل زدہ اور برندہ ہونے کے بجائے کند ہو چکی تھی، اور ان میں لہو ترنگ کے بجائے صرف نااہلی کا جل ترنگ رہ گیا تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ولادت اورنگزیب کے آخری زمانے میں ہوئی، اور بہادر شاہ اول سے لیکر شاہ عالم تک کا زمانہ دیکھا، ان میں جہاندار شاہ اور احمد شاہ کی زندگی تو رنگینی اور بدمستی میں گذری، عالمگیر ثانی ایک مذہبی حکمران تھا، غیر مسلم مورخوں کا بیان ہے کہ وہ عالمگیر اول کا مقلد بن کر حکومت کرنا چاہتا تھا، اور اس نے اپنے وزیر عماد الملک کی مدد سے بہت سی بدعتوں کو روک کر مذہب کو بھی فروغ دینا چاہا، شاہ عالم میں بھی دینداری تھی، وہ تو خواجہ میر درد کی مجلس سماع میں ذوق شوق سے شریک ہوتا تھا، اکبر ثانی کے تعلقات حضرت شاہ ولی اللہؒ کے گھر والوں سے بہت اچھے تھے حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں جامع مسجد دہلی میں رسول اللہ صلعم کے کچھ تبرکات رکھے رہتے تھے، جن کو نکالتے وقت لوگ زور شور سے نعت پڑھتے تھے اور ان کو شاہی محل زیارت کے لیے لیجاتے تھے، ایک روز شاہ اسمٰعیلؒ مسجد میں وعظ کہہ رہے تھے کہ یہ تبرکات نکالے گئے لیکن انھوں نے انکا احترام نہیں کیا، لوگوں کو ناگوار ہوا اور بادشاہ اکبر شاہ ثانی سے انکی شکایت کی، بادشاہ نے ان کو بلوا کر واقعہ دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا، یہ تبرکات مصنوعی ہیں، انکی تعظیم ضروری نہیں، بادشاہ نے متعجب ہو کر پوچھا یہ کیسے؟ شاہ صاحب نے جواب دیا کہ اس کو تو آپ بھی مصنوعی سمجھتے ہیں، اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ تبرکات آپ کی زیارت کے لیے آتے ہیں، آپ کبھی انکی زیارت کے لیے تشریف نہیں لیجاتے، یہ سنکر بادشاہ چپ ہو گیا، پھر شاہ صاحب نے کلام مجید اور بخاری لانے کو کہا، اور ان کو ہاتھ میں لیکر واپس کر دیا، اس کے بعد بادشاہ سے فرمایا

کلام اللہ اور کلام رسول دونوں بڑے تبرکات ہیں، یہ دونوں چیزیں آپکے سامنے آئیں لیکن آپنے کوئی تعظیم نہ کی، اس سے معلوم ہوتا ہو کہ آپ تبرکات کی تعظیم ان کے شرف کی وجہ سے نہیں کرتے بلکہ محض ایک رسم پرستی ہے، یہ سنکر بادشاہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، اس کے ہاتھوں اور پاؤں میں سونے کے کڑے تھے، شاہ صاحب نے اس کو بھی حرام بتایا، بادشاہ نے فوراً اتار دیے، ایک شہزادہ بیٹھا ہوا تھا، اسکی داڑھی منڈی ہوئی تھی، اس کو داڑھی رکھنے کی تلقین کی اور اس نے ان کے حکم کی تعمیل کی،

بہادر شاہ ظفر میں بھی بڑی مذہبیت تھی، اسکی حمد و نعت میں جو کیفیت ہو، اس سے اس کا پورا اندازہ ہوتا ہے، وہ بادشاہ کے لباس میں ایک صوفی منش درویش تھا، اس کو مولانا فخرالدین سے شرف بیعت بھی حاصل تھا، جیسا کہ آگے ذکر آئیگا، تصوف میں اس کو اس قدر انہماک ہوگیا تھا کہ سعدی کی گلستاں کی شرح صوفیانہ نقطۂ نظر سے خود لکھی، اور اشغال واذکار میں ایک کتاب سراج المعرفت لکھوائی،

لیکن کسی حکمراں کی مذہبیت اسی وقت موثر ہوسکتی ہو جب اس میں صدیقیت، فاروقیت اور اسد اللہیت کا پرتو ہو، یہ درجہ تو بہت بلند ہے، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں میں شاید ہی کسی کو حاصل رہا ہو، اس لیے دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہبیت کے ساتھ اگر بلبنیت، بابریت اور عالمگیریت بھی ہو تو وہ موثر ہوسکتی ہے، مغلوں کے آخری چند سلاطین مذہبی تو تھے، مگر ان میں مذہب کی اصلی روح نہ تھی، اور تاریخ کو مڑکر دیکھنے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ سلطان علاء الدین خلجی اگرچہ سنگ دل اور بظاہر مذہب سے بیگانہ وشی کا الزام عائد کیا جاتا ہے، پھر بھی اس کا دور اس لحاظ سے غنیمت ہے کہ اس کے زمانہ میں دہلی قبۂ اسلام بن گئی تھی، اسی طرح بلانوش اور پیالہ کش جہانگیر کا عہد حکومت اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ اس دور میں حضرت مجدد الف ثانی کی کوششوں سے دین کا احیاء ہوا،

اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی مذہبیت سے ان کا ذاتی وقار تو کچھ ضرور قائم رہا، لیکن انکی نااہلی کی وجہ سے ان کی حکومت سنبھل نہ سکی، اسی لیے اس زمانے میں علماء نے جو تحریک اٹھائی، اس میں

انھوں نے خود بھی ان بادشاہوں کو نظر انداز کر دیا۔

علماء کی دست گیری اور یہ مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ جب حکمران وقت ان کے لیے بیکار ہو گئے، تو علماء نے آگے بڑھ کر ان کی دست گیری کی، شاہ ولی اللہؒ نے اپنی تصانیف سے جو ذہنی اور فکری انقلاب پیدا کیا، اس کو ان کی اولادوں اور شاگردوں نے اپنی غیر معمولی سرگرمیوں سے برقرار رکھا،

شاہ عبد العزیزؒ ان کے صاحبزادے شاہ عبد العزیزؒ نے تو اپنے زمانہ میں یہ فتویٰ دیدیا کہ ہندوستان کے جس قدر حصے غیر مسلم طاقتوں کے قبضے میں جا چکے ہیں، ان میں برائے نام سلطان کا دخل مانا بھی جاتا ہو تو وہ سب کے سب دار الحرب ہیں،

شاہ اسمٰعیل شہید اور پھر حضرت شاہ ولی اللہ کے پوتے اور حضرت شاہ عبد العزیز کے بھتیجے حضرت شاہ اسماعیل شہید کی عملی سرگرمیوں نے یہ ظاہر کر دیا کہ اب اس کا وقت نہیں رہا کہ علماء ارباب رخصت بن کر مدرسوں میں درس دیتے رہیں اور محراب و منبر کی زینت بن کر صحیح عقائد کے اعلان پر قناعت کر لیں، بلکہ اس کا وقت آگیا ہے کہ ارباب عزیمت بن کر اسلام کی عزت و ناموس کی پاسبانی کریں، مسلمان خواص و عوام دونوں کی بگڑی ہوئی معاشرت کو سنواریں، اور کانٹوں کی راہ پر چل کر سر بکف اور کفن بر دوش ہو جائیں۔

انھوں نے تجدید اصلاح کی خاطر پہلے بدعتوں کا استیصال کرنے کی کوشش کی، مسجدوں، عرسوں اور مجلسوں میں جہاں مسلمان جمع ہو جاتے، وعظ کہنے لگتے، اور ان کو توحید و تقویٰ کی طرف پکار پکار کر بلاتے، معصیت کے اڈوں پر بھی پہنچ کر اللہ کا پیام سناتے اور معصیت کی زندگی چھوڑ کر صالح زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتے۔

انھوں نے تقویت الایمان لکھ کر یہ بتایا کہ وہی زندگی تہذیب اور معاشرت اسلامی ہے جو قرآن اور سنت کے مطابق ہو، اس کے علاوہ کوئی زندگی یا تہذیب یا معاشرت خواہ

کیسے ہی شاندار اور دل آویز ہو، اسلامی نہیں کہی جاسکتی، اس کتاب کے متعلق موجودہ دور کے ایک بڑے عالم کی رائے ہے کہ اگر یہ کتاب پانچ سو سال پہلے لکھی جاتی تو ہندوستانی مسلمان دنیا کے مسلمانوں سے بہت آگے بڑھ جاتے لیکن پھر بھی اس کتاب نے مسلمانوں میں ایک بڑا ذہنی انقلاب پیدا کیا۔

حضرت احمد شہید بریلویؒ حضرت اسمٰعیل شہیدؒ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ حضرت احمد شہید بریلویؒ کے ہاتھ پر بیعت کر لی، جوان سے عمر میں آٹھ سال چھوٹے تھے، اور ان کے چچا شاہ عبد العزیزؒ کے شاگرد اور مرید تھے۔ ان کی ذات میں حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہؒ کے فضل و کمال اور مجاہدہ و حال کے دو آتشہ سے ایک سہ آتشہ تیار ہوا تھا، دونوں کی کوششوں سے تجدید دین کی ایک نئی تحریک شروع ہوئی جس کو ہندوستان میں سب سے پہلی اسلامی تحریک سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے اور دونوں نے مل کر مسلمانوں کی ایک ایسی مخلص جماعت پیدا کی جو خدا اور نبی کی وفادار اور مئے حق کے نشہ میں سرشار ہو کر جہاد کے لیے آمادہ ہوگئی لیکن ترائین، کنواہا اور پانی پت کے فاتحوں اور اراکان بلخ اور قندھار پر پرچم لہرانے والوں کے جانشینوں سے اس کو کوئی مدد نہیں ملی، کیونکہ وہ مدد دینے کی لائق ہی نہیں رہ گئے تھے، اس جماعت کو کامیابی نصیب نہیں ہوئی، اور بالاکوٹ میں حضرت اسمٰعیلؒ اور حضرت احمد شہیدؒ بریلوی دونوں شہید ہوئے، انکی ناکامی کے اسباب پر اب تک تحقیقات جاری ہیں لیکن جس طرح کربلا کے بعد اسلام زندہ ہوا، اسی طرح اس تحریک کے کربلا کے بعد ہندوستان میں اسلام پھر سے زندہ ہوا، کیونکہ ان دونوں بزرگوں کے پیرووں نے ان کی تعلیمات کو پنجاب سے لیکر بنگال کی سرحد تک جاری رکھا، اس میں شک نہیں کہ وہ مسلمانوں کی سلطنت کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو تو نہ بچا سکے، لیکن انھوں نے دین و مذہب اور ایمان و یقین کی ایک نئی روح پھونک کر ہندوستان میں اسلام کو بچا لیا جس کو مسلمان اپنی زندگی کا اساس بنا کر انگریزوں کے دور حکومت

میں ہر قسم کے حوادث کا مقابلہ کرتے رہے، اور آج ہندوستان میں جہاں بھی قال اللہ اور قال رسول اللہ کی آواز سنائی دیتی ہے، وہ ولی اللّٰہی خیالات سے متاثر ہونے والے ہی بزرگوں کی صدائے بازگشت ہے، علماء کے اس احسان کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے،

البتہ اخلاص نیت کی بنا پر جس طرح یہ کہا گیا ہے کہ تقویت الایمان پانچسو برس پہلے لکھی گئی ہوتی تو ہندوستان کا مسلمان دنیا کے مسلمانوں سے بہت آگے بڑھ جاتا، اسی طرح ایک بہت بڑا گروہ زبان حال سے یہ کہہ رہا ہے، کہ عالمگیر کے بعد ہی کوئی شہید احمد بریلوی یا اسمٰعیل شہید پیدا ہو گیا ہوتا تو آج مسلمانوں کی تاریخ کچھ اور ہوتی اور یہ مسلمانوں کی بدقسمتی رہی کہ جب حضرت مجدد الف ثانی رح اور شاہ ولی اللہ جیسے عالی دماغ علما پیدا ہوئے تو ان کے زمانے میں تخت پر عالمگیر جیسا بادشاہ نہیں رہا، یا عالمگیر جیسے حکمراں کو حضرت مجدد الف ثانی رح، شاہ ولی اللہ رح، حضرت اسمٰعیل شہید رح اور حضرت احمد شہید بریلوی رح جیسے مجاہد، مفکر، سر بکف اور کفن بردوش علما نہیں ملے، اسی لیے مسلمانوں کے عروج و کمال اور سقوط و زوال کی تاریخ ان کے سلاطین ہی سے وابستہ ہو کر رہ گئی، جب تک تخت و تاج کو ہوشمند اور بیدار مغز حکمراں ملتے رہے، مسلمانوں کو اپنی سیاسی اور تمدنی زندگی پر ناز رہا، اور جیسے ہی حکمراں طبقہ کی ہوشمندی اور عالی دماغی جاتی رہی، مسلمان اپنی شوکت و حشمت سے محروم ہو گئے، عام مسلمانوں نے سلاطین اور علما دونوں کے سامنے جھکنے میں تامل نہیں کیا، کیونکہ دونوں اپنے کو اسلام کا محافظ اور پاسبان کہتے رہے، لیکن دونوں کی ہم آہنگی اور تعاون کی تاریخ زیادہ روشن نہیں، ایک دوسرے سے مشکوک اور آزردہ خاطر ہونے کے بجائے دونوں انجام بینی، مآل اندیشی اور مصلحت کوشی سے کام لے کر اپنی عملی اور ایمانی قوتوں کو ایک دوسرے کا سہارا بناتی رہتیں، تو مسلمانوں کی تاریخ کا رخ کچھ اور ہوتا،

(باقی)

شاہ محمد غوث گوالیاریؒ

۹۰۶ھ/۱۵۰۰ء — ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء

از

جناب پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب

نسب شاہ محمد غوث گوالیاریؒ (متوفی ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء) کا سلسلۂ نسب خواجہ فریدالدین عطار (متوفی ۶۲۷ھ/۱۲۳۰ء)؟[1] سے ملتا ہے، موصوف اپنی مشہور تصنیف جواہر خمسہ (۹۲۹ھ/۱۵۲۲ء) کے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں:۔

" فقال الفقیر الراجی الی اللہ ملک القدوس السلام المومن المھیمن العزیز الجبار محمد بن خطیرالدین بن عبداللطیف بن معین الدین قتال بن خطیرالدین بن بایزید بن خواجہ فریدالدین عطار......"[2]

یوسف الیاد سرکیس نے یہ غلطی کی ہے اور تین واسطوں کو چھوڑ کر لکھا ہے:۔

" محمد بن خطیرالدین بن بایزید ابن فریدالدین العطار۔"[3]

تھامس ولیم بیل (T. W. Beale) نے لکھا ہے کہ آپ کا شجرۂ نسب ساتویں پشت

---

[1] Levy = Persian Literature, London, 1948. P-48

[2] شاہ محمد غوث = جواہر خمسہ (اردو) مترجمہ مرزا محمد بیگ مطبوعہ دہلی، ۱۳۲۵ھ

[3] یوسف الیاد سرکیس = المطبوعات العربیہ والمعربہ، مطبوعہ مصر ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۸ء

میں خواجہ فریدالدین عطار سے ملتا ہے۔[1] مگر اس نے بھی یہ غلطی کی ہے کہ شاہ محمد غوث کے دادا کا نام معین الدین قتال لکھا ہے جو ان کے پردادا کا نام ہے، دوسری غلطی یہ ہے کہ والد کا نام قیام الدین لکھا ہے، حالانکہ خطیرالدین تھا،

مقالہ نگار دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے قول کے مطابق شاہ محمد غوثؒ (متوفی ۹۷۰ھ؍۱۵۶۲ء) کے پردادا معین الدین قتال سب سے پہلے ہندوستان تشریف لائے، اور جونپور میں انتقال فرمایا۔[2] مفتی غلام سرور لاہوری نے بھی لکھا ہے:-

"وجدّ مرحوم وے از سادات عظام نیشاپور بود و بعد ازاں در ہندوستان تشریف آورد و قیام پذیر گشت۔"[3]

صاحب مناقب غوثیہ (۹۴۱ھ؍۱۵۳۴ء) نے بھی لکھا ہے:-

"آپ کے جد امجد (پردادا) سید معین الدین قتال جونپور میں مدفون ہیں اور والد ماجد سید خطیرالدین کھیڑہ میں مدفون ہیں۔ یہ غازیپور کے علاقے میں ہے، آپ کا قیام بھی کھیڑہ میں تھا۔"[4]

ولادت | شاہ محمد غوثؒ نے اپنی تصنیف اوراد غوثیہ (۹۲۹ھ) میں اپنی تاریخ ولادت ۳ رجب المرجب روز جمعہ وقت نماز پیشیں ۹۰۷ھ تحریر فرمائی ہے، لیکن مقالہ نگار دائرۃ المعارف الاسلامیہ نے خود شاہ محمد غوثؒ کے حوالے سے تاریخ ولادت ۹۰۶ھ تحریر کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:-

---

۱۔ T. W. Beale - Oriental Biographical Dictionary Calcutta, 1881, P. 166.
۲۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ (الہند) ایڈیشن ۱۹۱۳ء ص ۹۸۰-۹۸۱
۳۔ مفتی غلام سرور لاہوری: خزینۃ الاصفیاء، مطبوعہ لکھنؤ ۱۳۱۲ھ
۴۔ شاہ فضل اللہ شطاری: مناقب غوثیہ (اردو) مترجمہ ظہیر الحق احمد آبادی، مطبوعہ آگرہ ۱۳۳۲ھ۔

"اپنے بیان کے مطابق محمد غوثؒ کی ولادت ۹۰۶ھ (۱۵۰۰ء) میں ہوئی۔" (دائرۃ المعارف الاسلامیہ)

معلوم نہیں اس کا ماخذ کیا ہے، ورنہ اوراد غوثیہ (۹۴۹ھ / ۱۵۴۲ء) میں خود شاہ محمد غوث نے تحریر فرمایا ہے:-

"وتولد این فقیر ہفتم ماہ رجب روز جمعہ وقت نماز پیشین سنہ سبع وتسعمائۃ شدہ بود۔"[1]

حالات زندگی شاہ محمد غوثؒ نے اوراد غوثیہ میں سات سال کی عمر سے ۴۳ سال کی عمر تک کے حالات زندگی نہایت اختصار سے تحریر فرمائے ہیں، یہاں موصوف کا بیان نقل کیا جاتا ہے، اس میں سنین کا تعین، سنہ ولادت ۹۰۷ھ کی روشنی میں راقم نے کیا ہے:-

"این درویش ہفت سالہ بود (۹۱۴ھ / ۱۵۰۸ء) کہ دریں راہ آمد و نہ سالہ بود (۹۱۶ھ / ۱۵۱۰ء) کہ معرفت حاصل شد۔ و پانزدہ ۱۵ سالہ بود (۹۲۲ھ / ۱۵۱۶ء) کہ رہنمونی می کرد۔ و بیست و دو سالہ بود (۹۲۹ھ / ۱۵۲۲ء) کہ معراج شد و بیست و پنج سالہ بود (۹۳۲ھ / ۱۵۲۵ء) کہ طالبان راہم چوں خود می کرد۔ وسی و سہ ۳۳ سالہ بود (۹۴۰ھ / ۱۵۳۳ء) کہ مرجع خاص وعام شد، صورت اقتدائیت و امامیت روئے نمود۔ چہل ۴۰ سالہ بود (۹۴۷ھ / ۱۵۴۰ء) کہ از بادشاہان تفاوت پیدا شد، سفر اختیار کرد، بہ ولایت گجرات آمد۔ این اوراد در قلعہ چاپانیر بہ قلم آمد .... در وقت انشاء مذکور عمر این درویش چہل و سہ سالہ بود (۹۴۹ھ / ۱۵۴۲ء)۔ و تولد این فقیر ہفتم ماہ رجب روز جمعہ وقت نماز پیشین سنہ سبع و تسعمائۃ شدہ بود و املائے مذکور در ماہ جمادی الاول سنہ تسع و اربعین ۹۴۹ و تسعمائۃ است۔"[2]

اس بیان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی روحانی زندگی کا آغاز سات برس کی عمر میں (۹۱۴ھ / ۱۵۰۸ء) میں ہوا تھا لیکن صاحب مناقب غوثیہ (۹۴۱ھ / ۱۵۳۴ء) شاہ فضل اللہ شطاری نے لکھا ہے:

---

[1] شاہ محمد غوث: اوراد غوثیہ (فارسی) مطبوعہ مطبع صبغۃ اللّٰہی ۱۳۱۳ھ ص ۴۵ [2] ایضاً ص ۴۵

"جب ۱۰ سال کی عمر ہوئی تو طلب خدا میں سرگرداں ہوتے ہوئے جونپور تشریف لائے اور قاضی صدر جہاں کے مکان پر قیام کیا، قیام کے دوران علمی تحصیل میں مصروف رہے، کافیہ وغیرہ تک عبور حاصل کرلیا، پھر اسی کو کافی سمجھ کر علم باطنی کی تلاش میں مصروف ہوگئے" (ملخصاً)[1]

روحانی زندگی کے آغاز کے سلسلے میں شاہ محمد غوث کا بیان ہی مستند سمجھا جائے گا، محمد غوثی کے بیان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت آپ کی عمر سات سال کی تھی[2]۔

شاہ فضل اللہ شطاری کے مندرجۂ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ محمد غوث کی عربی تعلیم صرف کافیہ تک محدود تھی، مگر آپ کی متعدد تصانیف کی داخلی شہادت ہے کہ آپ کو علوم منقول میں کافی دسترس حاصل تھی، اور آپ کے خلفاء میں شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی (متوفی ۹۹۸ھ/۱۵۸۹ء) جیسے جلیل القدر اور متبحر علماء بھی شامل تھے، جس سے بھی آپ کی علمیت اور روحانیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

طلب و شوق | بقول صاحب مناقب غوثیہ، شاہ محمد غوث روزانہ اپنے پردادا سید معین الدین قتال کے مزار مبارک پر جایا کرتے تھے، ایک مرتبہ غلبۂ شوق میں رات وہیں بسر کی، صبح کو بشارت ہوئی:۔

> بابا محمد! جاؤ صدیقی کی کفش برداری کرو اور ان کی خدمت بجالاؤ کہ جو انواع و اقسام کے انعام جمع ہوچکے ہیں ان کا ظہور ہو[3]۔

یہ بشارت لیکر جونپور سے گور پہنچے، اور حضرت شاہ ابوالفتح ہدایت اللہ سرمست (متوفی ۹۳۶ھ/۱۵۲۹ء) کی خدمت میں حاضر اور آپ کی صحبت سے مستفیض ہوئے، یہاں سے فیضیاب ہوکر کالونور گئے، یہاں سے پھرتے پھراتے ایک دوسرے شہر میں پہنچے، اس شہر کے قریب ایک پہاڑ تھا جس پر ایک بزرگ رہا کرتے تھے، ان کے حالات سن کر شاہ محمد غوث کو ان سے ملاقات

---

[1] مناقب غوثیہ (اردو) مطبوعہ آگرہ، ۱۹۲۳ء [2] محمد غوثی: گلزار ابرار (اردو) مترجمہ فضل احمد مطبوعہ ۱۳۲۶ھ ص ۲۲۲ [3] مناقب غوثیہ (اردو) ص ۶

کا اشتیاق پیدا ہوا اور پہاڑ پر جا کر ان کی زیارت کی، ان بزرگ نے شاہ صاحب کو اپنے قریب بٹھایا اور فرمایا:

"خوش آمدید! خوب آئے اور بر وقت آئے کہ میں بھی آپکے انتظار میں تھا کیونکہ مجھے خدائے برتر نے مقام غوث بخشا ہے اور اب میری دنیاوی عمر تمام ہو چکی ہے، حکم ہوا تھا کہ فلاں وقت اس شکل و شمائل کا ایک مرد آنے والا ہے، تم ان کو یہ درجہ غوثیت سونپ کر دنیا سے عالم بقا کی طرف آجاؤ، بحمد اللہ کہ حق تعالیٰ نے آپ کو پہنچایا، اب آپ اس وقت تشریف لیجایئے۔"[1]

ان سے مل کر شاہ محمد غوث پہاڑ سے اتر آئے، دوسرے روز جب پہنچے تو دیکھا کہ درویش بزرگ نماز سے فارغ ہو کر سجدہ میں گئے اور جان، جاں آفریں کے سپرد کر دی اور حق، حق دار کو سونپ دیا۔

یہ بیان شاہ فضل اللہ شطاری کی تصنیف مناقب غوثیہ سے نقل کیا گیا ہے، یہ کتاب شاہ محمد غوث کی حیات ہی میں ان کے انتقال سے ۲۹ سال قبل تصنیف ہو چکی تھی، اس لیے اس کے بیانات سب سے زیادہ مستند ہیں،

اسی قسم کا ایک واقعہ محمد غوثی نے گلزار ابرار (۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳ء) میں شیخ پھول (متوفی ۹۴۵ھ/۱۵۳۸ء) برادر بزرگ شیخ محمد غوث گوالیاری (متوفی ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء) کی زبانی نقل کیا ہے، آپ فرماتے ہیں:-

"شیخ فضل اللہ بنگالی، میرے بھائی شیخ محمد اور فقیر پھول ہم تین آدمی چنار کے کوہستان میں ریاضت کے ارادہ سے آئے تھے، وہاں کے باشندوں نے بیان کیا کہ دو سو برس ہوئے ہم اپنے بزرگوں سے مسلسل سنتے چلے آتے ہیں، اس غار میں ایک درویش گوشہ گزیں ہیں اور مشغول بخدا ہیں، ہم میں سے کسی کو اندر جانے کی طاقت نہیں جو ان کے ہونے یا نہ ہونے کی خبر لائے، یہ سن کر ہم تینوں آدمیوں نے تلاش کے واسطے اس غار میں

---

[1] مناقب غوثیہ (اردو) ص ۸

قدم رکھا، جب ہم دو منزل کے برابر راہ چل لیے تو وہاں پر ہم نے ایک پیر کو مراقب دیکھا کہ اس نے اپنی نورانی پیشانی سجادہ پر رکھ چھوڑی ہے۔ وہ پیر ہمارے پہنچنے سے آگاہ ہوا، اٹھا اور نہایت ترحم کے ساتھ آگے بڑھا، بہت کچھ مرحبا اور التفات کے ساتھ پیش آیا۔ اور ہر ایک کو ایک جداگانہ خطاب سے سرفراز کیا، مجھکو جہانگیر، بھائی کو غوث اور فضل اللہ کو اہل اللہ کہا، اسرار و حقایق اپنی تقریر میں ظاہر کرکے آنے والوں کو آگاہ کیا، اور اصل حقیقت پر اطلاع بخشی، اس کے بعد جلدی سے خلوت میں گھس گیا، تھوڑی دیر بعد ہم لوگوں نے واپس آنے کی اجازت مانگی، جواب کہاں سے آتا، وہ تو واصل حق ہو چکا تھا، اس سفر کا سامان اس غار میں مہیا کر رکھا تھا، ہم نے اس سامان کو کام میں لاکر نعش سپرد خاک کی[۱۵]

اس درویش کو سپرد خاک کرکے شاہ محمد غوث دوبارہ گور تشریف لائے، اور پھر شاہ ابوالفتح ہدایت اللہ سرمست کی خدمت میں حاضر ہوکر مرید ہونے کی خواہش ظاہر کی، آپ نے فرمایا:۔

"تمھاری ارادت حضرت حاجی حمیدالدین کے دست خاص پر مقرر ہے، اب سارنپور جاؤ"[۱۶]

اس حکم پر شاہ محمد غوث گوالیاری (متوفی سنہ ۹۷۰ھ / ۱۵۹۲ء) سارنپور پہنچے اور حاجی حمیدالدین حصور (متوفی سنہ ۹۳۰ھ / ۱۵۲۳ء) کی شرف پابوسی سے مشرف ہوئے۔

حاجی حمیدالدین حصور، مولانا ظہیرالدین غزنوی کے فرزند رشید ہیں، آپ کی ولادت سنہ ۸۳۵ھ / ۱۴۳۱-۲ء میں ہوئی، بچپن ہی میں والد کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا، سن شعور کو پہنچے تو طلب علم کی فکر دامن گیر ہوئی، اور گوالیار آکر قیام فرمایا، خداشناسی کی لو لگی تو توفیق الٰہی سے شیخ محمد علا المعروف بہ قاضن کی خدمت میں حاضر ہوکر بیعت سے مشرف ہوئے، شیخ طریقت کے انتقال کے بعد ان کے فرزند رشید حضرت ابوالفتح ہدایت اللہ سرمست (متوفی بعد سنہ ۹۴۶ھ / ۱۵۳۹ء) کی صحبت میں مقامات سلوک طے کیے۔

۱۵؎ ترجمہ گلزار ابرار (اردو) ص ۲۴۲-۵ ۱۶؎ مناقب غوثیہ اردو ص ۸

چالیس برس کی عمر میں تقریباً ۸۸۵ھ/۱۴۸۰ء میں سفر حجاز اختیار کیا، اور شاہ ابو الفتح نے مختلف سلاسل طریقت کا خرقہ عطا فرما کر رخصت کیا،

مکہ معظمہ میں پہنچے اور حج و عمرہ سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے، اور یہاں چالیس سال تک جاروب کشی کی (تقریباً ۹۱۵ھ/۱۵۰۹ء تک)

کافی ضعیف ہو چکے تھے، اولاد تھی نہیں، یہ فکر دامن گیر ہوا کہ روحانی دولت کا ورثہ کس کے سپرد کیا جائے گا، ادھر خیال آتا تھا ادھر خواب میں دو بچوں کی مثالی صورتیں دکھائی گئیں اور یہ بشارت دی گئی،

"یہ فرشتہ نما صورتیں جن اطفال کی ہیں وہ تمھارے باطنی خزانوں کی خزانچی گری کے واسطے ازل سے نامزد ہیں اور ان کا دیدار ہند میں تم کو فکر تلاش سے رہائی بخشے گا،"[1]

اس کے بعد آپ حجاز سے ہندوستان روانہ ہو گئے اور گوالیار پہنچے، یہاں شیخ پھول (متوفی ۹۴۵ھ/۱۵۳۸ء) اور شاہ محمد غوث (متوفی ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء) کو دیکھا تو وہ دونوں صورتیں جو عالم مثال میں دکھائی گئی تھیں، یاد آگئیں، شکر بجالائے، اس وقت شاہ محمد غوث کی عمر، سال کی تھی،

بیعت و ریاضت | حاجی حمید الدین حضور نے دونوں بھائیوں کی تعلیم و تلقین کی اور شیخ پھول کو اپنے ہمراہ لے کر صوبہ بہار کی طرف روانہ ہو گئے اور شیخ محمد غوث کو کوہستان چنار میں ریاضت کے لیے چھوڑ دیا، پھر چند دنوں بعد شیخ پھول کو بھی حصولِ فیض کے لیے شیخ محمد غوث کے پاس بھیج دیا،

شاہ محمد غوث تیرہ سال چند مہینے عبادت و ریاضت میں مشغول رہے، اس کے بعد جب حاجی حمید الدین حضور واپس ہوئے تو مرید کو بامراد پایا، شاہ محمد غوث نے اس عرصہ میں جواہر خمسہ (۹۲۹ھ/۱۵۲۲ء) تصنیف کی تھی، وہ شیخ کے سامنے پیش کی، وہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا:

---

[1] محمد غوثی، گلزار ابرار (اردو) مترجمہ فضل احمد مطبوعہ ۱۳۲۶ھ ص ۲۲۲

"اسرار و اعمال کے جواہرات جو میرے تصرف اور قوت میں تھے، وہ قبل ازیں تم کو حوالہ کر چکا ہوں اور میں نے اپنے پاس نام کے سوا کچھ نہیں رکھا تھا۔ اب نام کو بھی کتابچے صلے میں جو متکلم افعال ہے، تمہارے اوپر تصدق کرتا ہوں۔"[1]

چنانچہ بقول شاہ فضل اللہ شطاری اسی دن سے حضرت حمید الدین حضور کا اسم گرامی شیخ ظہور الحق والدین ہوگیا اور شاہ محمد غوث کا اسم گرامی حمید الدین عرف محمد غوث ہوگیا، اسی لیے ہرمن ایتھے (Hermann The) نے شیخ حمید الدین حضور کو شیخ ظہور الدین حاجی حضور لکھا ہے۔[2]

شاہ محمد غوث نے جواہر خمسہ کے دیباچے میں اپنی طلب سعی، شیخ کی خدمت میں حاضری کوہستان چنار میں ریاضت و عبادت اور شیخ کی نوازش و عنایت کا ذکر ہے۔ فرماتے ہیں:-

"ابتداء حال میں جب کہ مجھ کو کمال درجہ عشق و محبت کا ولولہ تھا، تو میں بموجب حکم وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا کے نہایت کوشش و محنت کرتا تھا۔ لیکن اپنی ہمت کی انتہا کو نہ پہنچتا تھا، یہاں تک کہ بمقتضائے ان سعید سوین جو کچھ کہ واقعہ اول میں میں نے دیکھا تھا، مجھ پر کھلا کہ موافق مضمون اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ کے بارگاہ حضرت سلطان الموحدین شیخ ظہور حاجی حضور متع اللہ بطول بقائہ میں حاضر ہوتا کہ اپنے مقصد کو پہنچے، اور مطلب حاصل ہو، چنانچہ میں نے قصد کیا اور طلب مقصود میں متعد ہوا۔ یہاں تک کہ آنحضرت کے سایہ عرش پایہ سے مشرف ہوا، بعد ملاقات کے آپ نے فرمایا کہ خواجہ احمد کہاں ہیں؟ جب خواجہ احمد حاضر ہوئے تو ارشاد کیا کہ "حق سبحانہ وتعالیٰ

---

[1] محمد غوثی، گلزار ابرار اردو ترجمہ فضل احمد مطبوعہ ۱۳۲۶ھ ص ۲۲۲ = [2] Hermann The

Catalogue of The Persian Manus Crepts in The Library of The India office, Vol I P. 1042—3, Oxford, 1903.

نے مجھ سے وعدہ فرزند کا فرمایا تھا، وہ یہی ہے، جس نے توفیق اِنّ الذین یبایعونک
انما یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیھم کی پائی ہے، اور آپ کا سن شریف
زیادہ تھا، چنانچہ مشہور ہے، بعد ایک مدت مدید کے شرف خدمت سے میں مشرف
ہوا اور آپ نے جواہر علم باطنی کے دریائے ولا یحیطون بشیٔ من علمہ الا بما شآء
سے اور زواہر افضال ظاہری بوستان سرائے دیؤت کل ذی فضل فضلہ
سے اس فقیر کو عطا کیے۔ اس کے بعد کوہستان چنار میں جا کے تیرہ برس اور کئی مہینے خلوت
میں رہا اور جو کچھ حضرت نے ارشاد کیا تھا، اس پر عمل کیا، اور حالات گذشتہ لکھ لکھ کے
جمع کیے، چند برس کے بعد آنحضرت نے مثل ہما کے اپنا سایہ بلند پایہ اس فقیر کے سر پر ڈالا
اور اس نے جملہ حالات عرض کیے، آپ خوش ہوئے اور دعا فرمائی اور اپنا پیراہن خاص مجھ کو
عطا کیا جس سے میں نے بشارت القاہ علی وجھہ فارتد بصیرا کی پائی اور یہ کتاب
جس کا نام جواہر خمسہ ہے، حضرت ممدوح کے دست مبارک میں دی، جب یہ پانچوں
جوہر نظر کیمیا اثر حضرت سے مشرف ہوئے، فرمایا کہ "تو نے اپنا کام خوب انجام دیا،
اور خلق اللہ کو ہدایت وافر کی، یہ ہمیشہ اولیاء اللہ کے لیے حجت ہوگی اور کوئی ولی ایسا
نہ ہوگا کہ ان بھیدوں سے خبردار نہ ہو، اس وقت اس درویش کی عمر بائیس برس کی تھی"[1]۔

یہ ترجمہ جواہر خمسہ مترجمہ محمد عبد الحکیم مطبوعہ فخر المطابع لکھنؤ ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء ص ۵ سے نقل
کیا گیا ہے۔ بقول مترجم اس نسخہ کی اصل کا ایک فارسی قلمی نسخہ تھا، جو سید شاہ رجب علی نے لکھا تھا،
اور ان کا نسخہ حضرت میر سید محمود محقق الاکبر کنتوری نیشاپوری (م۔ ۹۸۳ھ/۱۵۷۵ء) سے نقل کیا گیا تھا۔
جواہر خمسہ کا ایک اور مستند ترجمہ مرزا محمد بیگ دہلوی نے کیا تھا جو ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں مطبع مجتبائی دہلی

[1] جواہر خمسہ (اردو) مترجمہ محمد عبد الحکیم، مطبوعہ لکھنؤ۔

میں طبع ہوا تھا، اس ترجمہ میں اصل فارسی دیباچہ بھی نقل کر دیا گیا ہے، جو مذکورۂ بالا ترجمے کے بالکل مطابق ہے، یہ ترجمہ جواہر خمسہ کے ایک قدیم نسخہ کو سامنے رکھ کر کیا گیا تھا، جو ۱۰۳۲ھ/۱۶۲۳ء یا ۱۰۴۰ھ/۱۶۳۰ء کے لگ بھگ لکھا گیا تھا،

گلزار ابرار (۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳ء) کا جو مطبوعہ اردو نسخہ ہمارے سامنے ہے، اس میں محمد غوثیؒ نے جواہر خمسہ کا جو دیباچہ نقل کیا ہے اس کا اسلوب قدرے مختلف ہے، مگر حقایق قریب قریب ایک ہی ہیں، اور چند باتوں میں توضیح سے کام لیا گیا ہے، مثلاً

(۱) حاجی حمید الدین حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے شرف بیعت سے مشرف کیا، (۲) تیرہ سال اور چند ماہ کے لیے کوہستان چنار میں عزلت گزینی کی اجازت دی۔ (۳) ریاضت و مجاہدے میں جب بائیس سال کی عمر ہوئی تو حضرت حاجی حمید الدین حضور خود تشریف لائے اور خرقۂ خلافت سے نوازا۔

اس معمولی اختلاف کا سبب یا تو امتداد زمانہ کا تصرف ہے، یا پھر ممکن ہے کہ دونوں میں سے ایک اُس جواہر خمسہ کا دیباچہ ہو جو ۹۲۹ھ/۱۵۲۲ء میں کوہستان چنار میں مرتب کیا گیا تھا، اور دوسرا اس جواہر خمسہ کا دیباچہ ہو جس کو خود مصنف نے ترمیم و اضافے کے بعد ۹۵۶ھ/۱۵۴۹ء میں گجرات کے زمانہ قیام میں لکھا تھا، جو صورت بھی ہو ہماری غرض ان واقعات اور حالات سے ہے جن کا تعلق شاہ محمد غوثؒ سے ہے، اور یہ حالات مستند ماخذوں میں قریب قریب ایک ہی ہیں،

حاجی حمید الدین حضور نے شاہ محمد غوثؒ کو سلسلۂ شطاریہ میں بیعت فرمایا تھا، صاحب مرأت سکندری نے اس کی تصریح کی ہے، وہ لکھتے ہیں :۔

"ہدایت پناہی، حقایق دستگاہی، مخترع بدیع الاسلوب فی الکشف والکرامات حضرت شیخ محمد غوث، طریقہ ایشاں شطاری ست، یعنی سلسلۂ ارادت و خلافت

ایشاں بحضرت سلطان العارفین، قطب المحققین، شیخ بایزید بسطامی قدس سرہ منتہی می شود۔[۱]

ہندوستان میں شیخ عبد اللہ شطاری (م ۸۹۰ھ ؍ ۱۴۸۵ء) نے شطاریہ سلسلے کی اشاعت کی، آپ کا سلسلۂ نسب شیخ شہاب الدین سہروردی سے ملتا ہے، جو نویں صدی ہجری میں ایران سے ہندوستان تشریف لائے تھے، آپ کی خواب گاہ (مانڈو) میں ہے، بقول محمد غوثی:

"تمام مشائخ شطار کو ہند میں شاہ عبد اللہ شطاری کی خدمت سے اس مشرب کا حصہ ملا ہے۔"[۲]

شاہ عبد اللہ شطاری کے چند سال اور چند ماہ بعد خرقۂ خلافت شاہ محمد غوث کو پہنچا،[۳] جس کی ترتیب اوپر سے نیچے یہ ہے، شیخ عبد اللہ شطاری، شیخ محمد علا قاضن، شیخ ابو الفتح ہدایت اللہ، شیخ حاجی حمید حضور، شیخ محمد غوث۔

سلسلۂ شطاریہ کے علاوہ شاہ محمد غوث دوسرے سلاسل میں مجاز تھے، بقول مفتی غلام سرور لاہوری:-

"... گویند کہ شیخ محمد غوث قدس سرہٗ مقتدائے چہاردہ سلاسل بود، و سیاحت بسیار کردہ و از مشائخ عظام ہر یک خانوادہ فیض باطنی حاصل نمودہ بہ خرقۂ خلافت ممتاز گشتہ"۔[۴]

شاہ محمد غوث نے اپنی تصنیف اوراد غوثیہ میں خود ان سلاسل سے استفادہ کا ذکر کیا ہے:

"چشتیہ، فردوسیہ، سہروردیہ، قادریہ، طیفوریہ، خلوتیہ، رہانیہ، مداریہ وغیرہ"[۵]

مقام شاہ محمد غوث | ملا عبد القادر بدایونی (متوفی ۱۰۰۴ھ ؍ ۱۵۹۵ء) جو شاہ محمد غوث کی زیارت سے مشرف ہوئے تھے، تحریر کرتے ہیں:-

"در علوم دعوت اسماء مقتدائے و صاحب تصرف و جذب کامل بود و اجازت ایں

۱۔ سکندر بن محمد ۔ مرآت سکندری مطبوعہ بمبئی ۱۳۴۶ھ ؍ ۱۸۳۱ء، ۲۔ گلزار ابرار ۔ ترجمہ اردو ص ۴-۲۸۶
۳۔ ایضاً ص ۲۸۶، ۴۔ خزینۃ الاصفیاء جلد دوم ۵۔ اوراد غوثیہ مطبوعہ ۱۳۱۱ھ (ص ۳۳۲-۳۳۴)

علم از برادر بزرگ خویش شیخ پھول کہ صاحب کرامات وخوارق بود حاصل کرد۔"[1]

مفتی غلام سرور لاہوری تحریر فرماتے ہیں:۔

از اعاظم مشائخ وکبرائے اولیاء متاخرین ہندوستان ست، در طریقت سلسلہ ارادت بخدمت شیخ حاجی حمید کہ از اعاظم خلفائے شاہ قاذن (کذا) بود درست کردہ وشاہ قاذن نعمت خلافت از شیخ عبد اللہ شطاری داشت وسوائے سلسلۂ ظاہری تربیت باطنی از روح پرفتوح حضرت غوث الاعظم محی الدین عبد القادر جیلانی قدس اللہ اسرارہ السامی ہم یافت۔ وبہ کمال مراتب اقطاب واغواث رسید۔"[2]

موصوف، شاہ عبد الحق محدث دہلوی (متوفی ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء) کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

وصاحب اخبار الاخیار می فرماید کہ شیخ محمد غوث چوں بروز اول بقصد ارادت بخدمت شیخ حمید رفت، شیخ حمید بر خاست واورا درکنار گرفت وگفت "بیا شیخ محمد غوث"! حاضرین پرسیدند کہ ایں شخص را بے آں کہ بایں مرتبہ رسیدہ باشد "غوث" خواند چہ معنی دارد؟۔۔۔ فرمود۔ فال نیک است کہ پدر نام پسر خود "شاہ عالم" می نہد اگرچہ او دراں وقت شاہ عالم نمی باشد۔"[3]

مفتی غلام سرور لاہوری نے ایک اور روایت نقل کی ہے:۔

"نقل است کہ در اوائل شیخ محمد غوث از اہل دعوت بود ودر قلعہ کلچر ریاضت دعوت آشنائے الٰہی نمودہ آں کار را چناں بکمال رسانید کہ در ہند ثانی خود نداشت آخر کار آں کار را بیکار تصور نمودہ بکار صفائے باطن پرداخت ودریں کار ہم چناں

---

[1] عبد القادر بدایونی: منتخب التواریخ، جلد سوم مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء ص ۴ [2] مفتی غلام سرور لاہوری: خزینۃ الاصفیاء مطبوعہ لکھنؤ ۱۲۹۰ھ جلد دوم ص ۳۴۲ [3] ایضاً ص ۳۴۳

سعی وجہد نمود کرے از اقطاب وقت شدہ"[1]

ٹی. ڈبلیو. بیل (T. W. Beal) لکھتا ہے:-

"ہندوستان کے اعاظم صوفیا میں آپ کا شمار تھا، کہا جاتا ہے کہ آپ کوہستان چنار کے دامن میں جنگل کے اندر بارہ برس تک ترک نفس کی مشق کرتے رہے، آپ کی غذا جنگل کے پھل اور پتوں کے سوا اور کچھ نہ تھی"[2]

موصوف نے کوہستان چنار پر مدت ریاضت ۱۲ سال لکھی ہے، حالانکہ خود شاہ محمد غوث نے جواہر خمسہ میں تیرہ سال چند ماہ تحریر فرمائی ہے،

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار نے لکھا ہے:-

"آپ شیخ ظہور الدین حاجی حضور کے شاگرد تھے، سلسلہ شطاریہ سے آپ کا تعلق تھا، آپ اور آپ کے آٹھ بھائی شیخ حاجی حمید کے مرید تھے"[3]

مقالہ نگار نے پہلے تو شاہ محمد غوث کو شیخ ظہور الدین حاجی حضور کا شاگرد بتایا ہے، پھر لکھا ہے کہ شاہ محمد غوث اور ان کے آٹھ بھائی شیخ حاجی حمید سے بیعت تھے، اس لیے بادی النظر میں پڑھنے والے کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ ظہور الدین حاجی حضور اور شیخ حاجی حمید دو شخصیتیں ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے، حاجی حمید الدین حضور ہی کو بعد میں ظہور الدین حضور کہا جانے لگا۔

مقالہ نگار نے دوسری غلطی یہ کی ہے کہ حاجی حمید کے ساتھ لفظ "حضور" لکھا ہے، حالانکہ اصل میں "حصور" ہے، اس کے معنی بے اولاد کے ہیں، چونکہ شاہ حمید الدین کے کوئی اولاد

---

[1] خزینۃ الاصفیاء ج دوم ص ۳۰۳

[2] T. W. Beale = Oriental Biographical Dictionary, Calcutta 1881. P.186

[3] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مطبوعہ لیڈن (ہالینڈ) ۱۹۱۳ء ج ۳ ص ۱۸۰

(ملتی، اس لیے "حصور" کہا کرتے تھے، جو بعد میں کاتب کی ستم ظریفی سے "حضور" بن گیا، ایتھے نے بھی "حضور" لکھا ہے[1]

مقالہ نگار نے یہ بھی لکھا ہے کہ شاہ محمد غوث (متوفی ۹۷۰ھ / ۱۵۶۲ء) مع آٹھ بھائیوں کے حاجی حمید الدین حصور سے بیعت تھے، مگر ہمعصر تذکروں میں سے کسی میں یہ بات نہیں دیکھی اور نہ شاہ محمد غوث نے خود لکھی، معلوم نہیں مقالہ نگار کا ماخذ کیا ہے،

"تذکروں اور خود شاہ محمد غوث کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے صرف ایک بھائی شیخ پھول. حاجی حمید الدین حصور سے بیعت تھے، چنانچہ محمد غوثی نے لکھا ہے،

"آپ کا لقب فرید الدین احمد اور خطاب جہانگیر، غوث الاولیاء کے بڑے بھائی اور شیخ ظہور حاجی حمید حصور کے خلیفہ ہیں، بے نہایت لوگوں کے دل آپ کے پنجۂ تصرف میں تھے. شاہ سے درویش تک اور بڑے سے چھوٹے تک ایک زمانہ آپ کی خدمت میں مریدانہ زانو تہہ کرتا تھا"[2]

ہمایوں بادشاہ (متوفی ۹۶۳ھ / ۱۵۵۶ء) کو شیخ پھول سے خاص تعلق تھا، اور شاہ محمد غوث سے شرف بیعت حاصل تھا، اور وہ ملکی معاملات میں شیخ پھول سے مشورہ کیا کرتا تھا، اسی لیے مرزا ہندال نے بغاوت کے زمانے میں آپ کو شہید کر دیا تھا، آپ کا مزار قلعہ بیانہ کے قریب ایک پہاڑ پر ہے،[3]

مفتی غلام سرور لاہوری نے بھی لکھا ہے:-

"و شیخ را برادرے بود شیخ پھول نام کہ بسبب اعتقاد ہمایوں بادشاہ

---

[1] ہرمن ایتھے: کیٹلاگ فارسی مخطوطات، انڈیا آفس لائبریری لندن ج اول مطبوعہ ۱۹۰۳ء ص ۱۰۴۲

[2] محمد غوثی: گلزار ابرار (اردو) ص ۲۴۴ [3] ٹی، ڈبلیو بیل: اورینٹل بایوگرافیکل ڈکشنری: مطبوعہ کلکتہ ۱۸۸۱ء ص ۱۸۶

نسبت شیخ بمراتب اعلیٰ رسیدہ بود ہو آخر بدست مرزا ہندال شہید شد[1]

نورالدین جہانگیر بادشاہ (متوفی ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء) نے لکھا ہے:۔

"انھیں اللہ تعالیٰ کے مختلف ناموں کے مختلف اثرات کے علم میں مہارت حاصل تھی، جنت آشیانی (ہمایوں) ان سے نہایت درجے کا ربط ضابطہ اور انتہائی عقیدت رکھتے تھے۔"[2]

کیمبرج ہسٹری میں بھی لکھا ہے:۔

"شیخ (پھول) اپنے مشہور و معروف بھائی محمد غوث کی طرح ایک مشہور مذہبی عالم تھے، اور خود ہمایوں کے روحانی مشیر و صلاح کار تھے۔"[3]

(باقی)

---

[1] خزینۃ الاصفیا، ج ۲ ص ۳۳۳ [2] نورالدین جہانگیر: تزک جہانگیری (اردو) مطبوعہ لاہور ۱۹۶۰ء ص ۵۳۵ [3] Lt - Colonel Sir Wolseley Haig: The Cambridge History of India Vol. IV Delhi 1957 P 32

بزمِ صوفیہ

یعنی تیموری عہد سے پہلے کے صوفیہ کرام حضرت شیخ ابوالحسن ہجویریؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ بختیار کاکیؒ، قاضی حمید الدین ناگوریؒ، خواجہ نظام الدین اولیاؒ، بوعلی قلندر پانی پتیؒ، شیخ فرید الدین عراقیؒ، خواجہ گیسو درازؒ وغیرہ کے مستند حالات و تعلیمات

مرتبہ: سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے

ضخامت: ۵۸۸ صفحے　　قیمت: ۲۵ روپے

منیجر

علامہ اقبال اور مسئلہ زمان

از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے

(۲)

(۳) نیاز صاحب نے لکھا ہے:۔

"وقت در اصل نہ جوہر ہے نہ عرض نہ کوئی واقعہ ہے نہ کوئی حادثہ اور وجود کے لیے جن صفات کا پایا جانا ضروری ہے ان میں سے کوئی صفت اس میں نہیں پائی جاتی۔"

بالفاظ دیگر ع ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا[1]

سوال یہ ہے کہ ایک ایسے امر موہوم کی جو جملہ صفات وجود سے عاری ہے "نکات طرازی" کیا معنی: "العدم لایوصف ولایوصف بہ" منطق ہی کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ عقل سلیم اور "Common sense" کا بھی تقاضا ہے۔ لہذا معدوم محض کو اہم قرار دینا توہم پرستی نہیں تو پھر کیا ہے۔ جب زمانہ معدوم و موہوم ٹھہرا تو پھر یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ کب اور کیونکر پیدا ہوا،

[1] چنانچہ اوپر مولانا عبدالحق خیرآبادی کا قول مذکور ہوا کہ زمانہ ضعیف ترین نحو وجود سے متصف ہے، ان سے پہلے ملا محمود جونپوری نے منکرین زمانہ کا جواب دینے کے بعد شمس بازغہ میں اعتراف کیا ہے:۔ "فلا جرم یجب ان یکون موجوداً فی الاعیان ومع ذٰلک فاعلم ان الزمان اضعف الاشیاء وجوداً"۔ ملا محمود نے خود شیخ بو علی سینا کا اعتراف نقل کیا ہے کہ:۔ "قال الشیخ یشبہ ان یکون الزمان اضعف وجوداً من الحرکۃ وجانساً لوجود امور بالقیاس الی امور"

بایں ہمہ معاشرتی زندگی کی عملی ضرورتوں کے لیے زمانہ کا حوالہ ناگزیر ہے۔ اس لیے اسے "بھوتوں کی کچلیوں" کی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے اشاعرہ نے اسے ایک پیمانہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ "شرح المواقف" میں زمانہ کے مذاہب خمسہ کے ضمن میں مذکور ہے:

خامس المذاهب فی حقیقة	حقیقت زمان کے سلسلے میں پانچواں مذہب
الزمان مذهب الاشاعرة	اشاعرہ کا ہے۔ اس کی رو سے زمانہ
وهو انه متجدد معلوم	ایک تجدد پذیر امر ہے جس سے دوسرے
يقدر به متجدد	تجدد پذیر امور کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔

مگر علامہ نے معاشرتی زندگی کے اس اہم عامل کو "زناروشی، باطل فروشی" سے تعبیر کیا ہے

اے اسیر دوش و فردا در نگر — در دل خود عالم دیگر نگر
در گل خود تخم ظلمت کاشتی — وقت را مثل خطے پنداشتی
باز با پیمانۂ لیل و نہار — فکر تو پیمود طول روزگار
ساختی ایں رشتہ از زنار دوش — گشتۂ مثل بتاں باطل فروش[1]

حالانکہ زمانہ کی اس افادی حقیقت کا احساس ہی مغربی ثقافت کا آغاز تھا، اشپنگلر کہتا ہے کہ کلاسیکی (یونانی) عہد کا انسان گھڑیوں کے استعمال سے مستغنی تھا، اور اس کی یہ بے نیازی بالقصد والارادہ تھی، وہ صرف "آن حاضر" ہی میں رہتا تھا، ماضی و مستقبل سے بالکل بے پروا:

Classical man managed to do without the clock, and his abstention was more or less

---

[1] اسرار خودی: اسی کے لیے نیاز صاحب نے لکھا تھا کہ "اقبال نے اسرار خودی میں مسئلۂ زمان و مکان کے متعلق بڑے بصیرت افروز نکات پیش کیے ہیں"۔

deliberate........Classical man's existence .... was wholly contained in the instant. Nothing must remind him of past of furture. (Spengler: Decline of the west Vol 1, P. 132

[کلاسکی عہد کا انسان بغیر گھڑی کے گزارا کر لیا تھا۔ اور اس کی یہ قناعت کم و بیش ارادی تھی.... کلاسیکی عہد کے انسان کی زندگی تمام تر آن حاضر میں منحصر تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی شے اسے ماضی یا مستقبل کی یاد دلائے]

اسی طرح قدیم ہندوستانی ثقافت زمانہ کی اس افادی حیثیت سے ناآشنا تھی،

"The indians also have no sort of Time-reckoning (the absense of it in Their case expressing Their Nirwan) and no clock and Therefore no history, no life memorres, no care." (ibid, Vol 1 P. 33

[اہل ہند بھی وقت شماری کا کوئی نظام نہیں رکھتے تھے، (اس کا فقدان ان کے یہاں نرواں کا مظہر ہے) نہ ان کے یہاں گھڑی تھی اور اس لیے ان کے یہاں کوئی تاریخ تھی، نہ زندگی سے متعلق یادیں اور نہ کوئی فکر و پروا]

بہر حال اس کلاسیکل غنودگی سے بیداری کا آغاز قیصر جولین کے زمانہ میں ہوا، اس نے وقت تقویم کی اصلاح کی اور اس کا عمل "مدت بیزاری" کے اجتماعی احساس کا آخری احتجاج تھا۔

Caesar's reform of The calendor may almost Be regarded as a deed of emancipation

from The classical life feeling............ His assassination seems to us a last out-break of The antiduration feeling That was incarnate in The polis and The Urbs Roma." (ibid Vol I P. 133)

[قیصر نے جو تقویم کی اصلاح کی تھی اسے کلاسیکی احساس زندگی سے چھٹکارا سمجھا جا سکتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا قتل اس مدت بیزاری کے جذبے کا آخری احتجاج تھا جس کی روح "محدود شہروں" اور رومۃ الکبریٰ میں حلول کیے ہوئے تھی]

لیکن زمانہ کی اس افادی حقیقت کا صحیح اندازہ یورپی ثقافت ہی نے لگایا (بقول اسپنگلر) کیونکہ جرمنوں نے (جنھیں اسپنگلر مغربی کلچر کا ممثل اعظم سمجھتا ہے) دیوار گھڑی کو دریافت کیا، وہ لکھتا ہے:-

Among The western peoples, it was The Germans who discovered The mechanical clock, The dread symbol of The flow of time.
(ibid, Vol I P. 14)

[مغربی اقوام میں یہ شرف اولیت جرمن قوم ہی کو حاصل ہے کہ اس نے مشین سے چلنے والی گھڑیاں دریافت کیں جو زمانہ کے مرور و انقضاء کی مہیب علامت ہے] (زوال المغرب ج ۱ ص ۱۴)

اور زمانہ کی اسی افادی حیثیت کے شدید احساس میں یورپی ثقافت کا خصوصی امتیاز مضمر ہے جیسا کہ اسپنگلر لکھتا ہے:-

"Man has never...... been so awake and, aware so deeply sensible of time...

as he has been in the west. (ibid, Vol I P. 133

[انسان کبھی اتنا بیدار و متیقظ نہیں رہا۔ اسے کبھی زمانہ کے وجود کا اتنا گہرا احساس تھا جتنا کہ مغرب (یورپی کلچر) میں رہا ہے۔] (اظلال الغرب ج ا ص ۱۳۳)

اور غالباً اسپنگلر کے اسی قول کی صدائے بازگشت تھی جس نے علامہ اقبال سے "زمانہ کے حقیقی ہونے کے شدید احساس کو قرآن کی بنیادی تعلیمات کا اصل ومبنیٰ علیہ" قرار دلوایا، لیکن یہاں وہ "قرآن کی بنیادی تعلیمات کے اس اصل ومبنیٰ علیہ کو" زنار بردوشی و باطل فروشی سے تعبیر فرمانے لگے۔ فیا للعجب۔

بہرحال اگر زمانہ کی افادی حیثیت کے احساس اور اس سے معاشرتی زندگی میں استفادے کی ترقی سے کسی تہذیب وثقافت کی بلندی وبرتری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے تو یقیناً اسلامی ثقافت کا درجہ دنیا کی ثقافتوں میں بہت بلند وبرتر ہے، اسلام اصولی طور پر وقت کی افادی حیثیت کی قدر سکھاتا ہے، اس کی یہ تعلیم عبادات سے لیکر معاملات تک ہے، نماز کے اوقات اور روزے کی مدت کا، زکوٰۃ کے وجوب اور حج کے تعین کا اسی پر مدار ہے، مرد نمازی صرف طلوع فجر اور طلوع آفتاب ہی میں امتیاز نہیں برتتا، وہ فجر کے اندر غلس اور اسفار کی بھی تدقیق کرتا ہے، سحر صادق کو سحر کاذب سے ممتاز کرتا ہے اور اسی طرح دیگر اوقات میں۔ معاملات کے امد بہ "اجل مسمّٰی" کا تعین اسی احساس پر مبنی ہے، اور اسی احساس کی شدت نے مسلمان ذہانت سے دقیق پیما گھڑیاں ایجاد کرائیں۔ اسپنگلر کہتا ہے کہ ۱۰۰۰ء کے قریب گربرٹ (پوپ سلوسٹر دوم) نے پہیہ کنی سے چلنے والی گھڑی ایجاد کی، جرمنی میں کلاک ۱۲۰۰ء کے قریب وجود میں آئے، اور جیب گھڑیاں اس کے بعد۔ لیکن اس سے چار سو سال پہلے گھڑیاں اسلامی دنیا میں عام تھیں، اور ہارون الرشید نے جو شارلمین کو تحفہ میں گھڑی بھیجی تھی وہ پہلا "وقت پیما" تھی۔

جو سرزمین یورپ میں پہنچا۔ "الوقت سیف قاطع" کے اصول کے ماتحت مسلمانوں نے غیر معمولی صحت کے ساتھ وقت کی پیمایش پر زور دیا، انھوں نے منٹ اور سکنڈ (دقائق و ثوانی) تک ہی اجزاء زمان کی تقسیم کو محدود نہ رکھا بلکہ ثوالث و روابع حتی کہ عواشر تک اسے ضبط کیا۔

لیکن علامہ اقبال اسلامی ذہن کی اس کاوش کو جس میں وہ متمدن دنیا کی "وقت پیمائی" کے طریقوں کا استاد ہے، زنار بردوشی و باطل فروشی سے تعبیر فرماتے ہیں، صرف اتنے سے تصور پر کہ "Pure Duration" کے واہمہ تراشی کی داد نہ دے سکا جس نے قدیم ہنجا منشی دور میں بندگانِ خدا کا سر "زروان" کے سامنے جھکوا دیا تھا۔

(۴) نیاز صاحب نے لکھا ہے:۔

"(زمانہ کے متعلق) بہت سے سوالات اقبال کے سامنے بھی تھے، اور ان پر انھوں نے بہت غائر نگاہ ڈالی تھی"

علامہ اقبال نے مغربی فلسفہ کا بڑا غائر مطالعہ کیا تھا، جیسا کہ خود فرماتے ہیں:۔

ہے فلسفہ میرے آب و گل میں پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں

اس وجہ سے ان کے سامنے زمانہ سے متعلق بہت سے پیچیدہ سوالات تھے، اس کا بڑا سبب اسپنگلر کی تقلید تھی، اسی زمانہ میں اسپنگلر کی "Decline of west" شائع ہوئی تھی اور علامہ اس سے بہت متاثر ہوئے تھے، اور چونکہ اسپنگلر نے یورپی ثقافت کے اصولی ممیزات "یونان بیزاری" اور "احساس زمانہ" بتائے تھے، اس لیے علامہ نے بھی ان دونوں ممیزات کو اسلامی ثقافت کا اصل الاصول قرار دیا،

غرض مغربی فلسفہ کی عقیدت میں زمانہ کے متعلق اقبال کے ذہن میں پیچیدہ سوالات کا پیدا ہوجانا فطری تھا، مگر مغربی فلاسفہ خود انھیں حل نہیں کرسکتے تھے، لہذا ان کی رہنمائی سے مایوس

ہو کر علامہ کی نظریں متفکرین اسلام کی جانب اٹھیں، جیسا کہ خود کہتے ہیں ؎

پھر یہ غوغا ہے کہ لا ساقی شراب خانہ ساز ۔۔۔ دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خموش

اس ذہنی کشمکش کا نتیجہ وہ لیکچر تھے جو علامہ نے ۱۹۲۸ء میں حیدرآباد وغیرہ میں "الٰہیات اسلامی کی تشکیل جدید" کے عنوان سے دیئے، مگر اسلام اور اسلامی ثقافت کو صحیح طور پر سمجھنے کی تڑپ ان میں کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو وہ ذہنی پس منظر جو متفکرین اسلام کی کاوشوں کے صحیح طور پر سمجھنے کے لیے درکار تھا، ان کے پاس بہت کم تھا، چنانچہ علامہ کی اس زمانہ کی زندگی اس بات کی شاہد ہو کہ زمانہ کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر سے واقف ہونے کی مخلصانہ کوشش کے باوجود وہ اپنی اس خواہش میں ناکام ہی رہے،

صورتِ حال یہ تھی کہ جس وقت انھوں نے یہ لیکچر دیئے اس وقت تک انھیں امام رازی کی "المباحث المشرقیہ" جس کی جلد اول کا آخری حصہ زمانہ کی بحثوں پر مشتمل ہے، دیکھنے کو بھی نہیں ملی، انھوں نے سید سلیمان ندوی مرحوم کو اپنے مکتوب مورخہ ۱۸ر مارچ ۱۹۲۸ء میں لکھا:

"ایک زحمت دینا چاہتا ہوں معاف فرمائیے گا، مباحث مشرقیہ لاہور میں دستیاب نہیں ہو سکتی، کیا یہ ممکن ہو کہ آپ ان کے متعلق امام رازی کے خیالات کا خلاصہ قلمبند فرما کر مجھے ارسال فرما دیں، میں اس کا ترجمہ نہیں چاہتا صرف خلاصہ چاہتا ہوں"[۱]

معلوم نہیں سید صاحب نے مطلوبہ خلاصہ بھیجا یا نہیں، لیکن اگر بھیجا بھی ہو تو علامہ نے خطبات کی تیاری میں اس سے کچھ زیادہ مدد نہیں لی، کیونکہ اس کی کوئی تفصیل نہیں ملتی[۲]، بہرحال اواخر ۱۹۳۶ء سے قبل علامہ کو "المباحث المشرقیہ" کے مطالعہ کا موقع نہیں ملا اور اس وقت تک انھیں دو سر

[۱] معارف (اکتوبر ۱۹۵۲ء) ص ۳۰۹ [۲] اگرچہ خطبات میں انھوں نے اس کا حوالہ دیا ہو کہ یہ کتاب حال ہی دائرۃ المعارف حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے، مگر محتویات کتاب کا کوئی حوالہ نہیں ہے،

متکلمین و متصوفین کے افکار متعلقہ زمان کا بھی کوئی علم نہ تھا، چنانچہ سید صاحب کے نام دوسرے مکتوب مورخہ ۸ اگست ۱۹۳۳ء میں فرماتے ہیں :-

"۱- حضرت محی الدین ابن عربی کی فتوحات یا کسی اور کتاب میں حقیقت زمان کی بحث کس جگہ ہے، حوالے مطلوب ہیں،

۲- حضرات صوفیہ میں اگر کسی اور بزرگ نے بھی اس مضمون پر بحث کی ہو تو اس کے حوالے سے بھی آگاہ فرمائیے،

۳- متکلمین کے نقطۂ خیال سے حقیقت زمان یا آن سیال پر مختصر اور مدلل بحث کونسی کتاب میں ملے گی امام رازی کی مباحث مشرقیہ میں آج کل دیکھ رہا ہوں۔"[1]

غالباً سید صاحب نے اس خط کا طمانیت بخش جواب دیا تھا، اور پہلے استفسار کے جواب میں انھوں نے ابن عربی کے خیالات متعلقہ زمان کا خلاصہ خود کرنے اور بھیجنے کی کوشش کی تھی، تیسرے سوال کے جواب میں مولانا برکات احمد صاحب کے رسالہ "اتقان العرفان فی ماہیۃ الزمان" سے استفادہ کرنے کے لیے لکھا تھا، چنانچہ علامہ نے یہ رسالہ جلد ہی منگا لیا مگر اور کتابیں دستیاب نہ ہو سکیں۔ مکتوب مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۳۳ء میں لکھا ہے :-

"والا نامہ ابھی ملا ہے جس کے لیے سراپا سپاس ہوں، رسالہ اتقان فی ماہیۃ الزمان آج مل گیا، میں نے اس کے لیے ایک دوست کو ٹونک لکھا تھا، آج مولوی برکات احمد کو ایک اور رسالہ کے لیے جو ادویں لکھا ہے، ہندی فلسفی ساکن پھلواری مصنف تسویلات فلسفہ کا نام کیا ہے..... شرح مواقف دیکھ رہا ہوں، فتوحات کا مطالعہ آپ کا تلخص آنے کے بعد دیکھوں گا۔

..... علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندوی کے اور کون ہے۔"[2]

---

[1] معارف اکتوبر ۱۹۵۸ء ص ۱۳۰ [2] ایضاً ص ۳۱۴

لیکن علامہ نے مولانا برکات احمد کے رسالے کو کہاں تک سمجھا، اس کا اندازہ ان کے مکتوب بنام سید سلیمان ندوی مورخہ ۷/ستمبر ۱۹۳۳ء سے ہو سکتا ہے:۔

"حضرت ابن عربی کے خیالات و افکار بھیجنے کا جو وعدہ آپ نے فرمایا ہے اس کے لیے بے حد شکر گزار ہوں، مولوی سید برکات احمد صاحب کا رسالہ میں نے دیکھا ہے، انشاءاللہ اسے سبقاً سبقاً پڑھوں گا، مسئلہ آن کے متعلق ابھی مشکلات باقی ہیں ... مولوی سید برکات احمد مرحوم نے دہر اور زمان میں امتیاز کر کے کسی قدر مشکلات کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ مسئلہ نہایت مشکل ہے۔"[1]

خط کشیدہ الفاظ سے اس بات کی بخوبی تصدیق ہو سکتی ہے کہ زمانہ کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر سے واقف ہونے کی مخلصانہ کوشش کے باوجود علامہ اپنی اس خواہش میں ناکام ہی رہے۔ "دہر" اور "زمان" کا امتیاز مولوی برکات احمد صاحب کا اختراع نہیں ہے، ان سے سات سو سال پہلے امام رازی کی "المحصل"[2] میں اور تقریباً ایک ہزار سال پہلے شیخ بو علی سینا کے یہاں یہ امتیاز ملتا ہے[3]، اور حالانکہ امام رازی نے اس تدقیق کو شیخ بو علی سینا کی طرف منسوب کیا ہے[6]، لیکن یہ شیخ سے بھی پہلے کی ہے کیونکہ ابو حیان التوحیدی نے "کتاب المقابسات" میں ابو سلیمان سجستانی کی ایک تقریر متعلقہ زمان کے اندر اس کا حوالہ دیا ہے[4]، نیز البیرونی نے کتاب الہند میں محمد بن زکریا الرازی طبیب مشہور کی جانب اس قسم کی ایک تدقیق منسوب کی ہے[5]۔

اس سے زیادہ حیرت خیز امر یہ ہے کہ مولانا برکات احمد صاحب اپنے اکابر کی تبعیت میں خود اس تدقیق کے منکر، اس سے بیزار اور اس کے درپئے انہدام ہیں، وہ مسئلۂ زمان کی مشکلات

---

۱ معارف نومبر ۱۹۵۳ء ص ۳۰۳ ۲ المحصل للرازی ص ۶۲ ۳ عیون المسائل مشمولہ رسائل تسع لابن سینا ص ۱۷۱۰ ۴ المقابسات ص ۲۶۴ ۵ کتاب الہند ص ۱۶۳-۱۶۴ ۶ المباحث المشرقیہ جلد اول ص ۶۴۵

کو کم کیا کریں گے، وہ تو اس تدقیق کا بار بار حوالہ دے کر ان مشکلات کو اور بڑھاتے ہیں، معلوم نہیں رسالہ "اتقان العرفان فی ماہیۃ الزمان" [جو کوئی پچاس صفحہ کا ایک چھوٹی تقطیع کا رسالہ ہے] کی کس عبارت سے علامہ نے یہ مطلب نکالا ہے کہ مولوی برکات احمد صاحبؒ "دہر اور زمان میں امتیاز کرکے کسی قدر مشکلات کو کم کرنے کی کوشش کی ہے"۔

اس سے زیادہ مضحکہ خیز ایک اور واقعہ ہے، علامہ اقبال نے میر غلام بھیک نیرنگ کی معرفت مولانا معین الدین اجمیری سے زمان یا دہر پر مضمون لکھایا تھا[1]، مولانا اجمیری خاتم المتکلمین مولانا فضل حق خیرآبادیؒ کے سلسلۂ تلمذ کے ممتاز علماء میں سے تھے، اس مکتب فکر میں فلاسفہ کے نظریات متعلقہ دہر و زمان کے مختلف پہلوؤں کا تنقیدی حیثیت سے جائزہ لیا جاتا تھا، مولانا فضل حق خیرآبادی نے میر باقر داماد کی "افق المبین" پر بھی حاشیہ لکھا تھا، میر باقر داماد کا نام اسلام کی تفکیر متعلقۂ زمان میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، وہ خود "حدوث دہری" کے نظریے کے مخترع تھے، اس لیے خیرآبادی خاندان میں اس نظریہ پر خصوصیت سے تبصرہ کیا جاتا تھا، خود مولانا اجمیری کے استاد مولانا برکات احمد صاحب نے "الحجۃ الباذغۃ فی شرح حکمۃ البالغۃ" میں "حدوث دہری" کے ابطال میں متعدد دلیلیں دی ہیں، اس لیے قدرتی امر ہے کہ مولانا اجمیری نے اپنے محولۂ بالا مضمون میں "میر باقر داماد" اور ان کی آراء و افکار کا خلاصہ دیا ہوگا، لیکن علامہ اس فکری پس منظر سے خالی الذہن تھے، جو اسلامی فکر کے ان مغلق مباحث کو کما حقہ سمجھنے کے لیے درکار ہے، اس لیے وہ اسے جہاں تک سمجھ سکے ہوں گے ظاہر ہے اور انگریزی ترجمہ کے بعد اس کا جو حشر ہوا ہوگا وہ کسی مزید توضیح کا محتاج نہیں ہے۔

مگر ان سب باتوں کے لیے معذرت کی جا سکتی ہے، سوائے ایک بات کے: علامہ نے اسلامی فکر کی تاریخ اور اس کے مشاہیر سے بھی خود کو آشنا بنانے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی،

---

[1] باغی ہندوستان" مصنفہ مولانا عبدالشاہد خان شروانی

انھوں نے ان "میر باقر داماد" کے نام جو نظریۂ "حدوث دہری" کی مخترع کی حیثیت سے اسلامی فکر کے اندر نظریۂ زمان کی تاریخ میں سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں، ایک کا دو بنا دیا۔ چنانچہ خطبات (ص ۱۰۹) میں فرماتے ہیں:۔

"This is what Mir Damad and Mulla Baqir Mean when They say That Time is born with The act of Creation."

ظاہر ہے جب علامہ سے مفکر کی شخصیت کے سمجھنے میں یہ تسامح ہو سکتا ہے تو اس کے فکری وثائق کی صحیح ترجمانی کی ان سے کہاں تک توقع کی جا سکتی ہے۔

غرض مغربی فلسفہ کی نارسائی سے مایوس ہو کر انھوں نے مشرقی تفکیر کے دامن میں پناہ ڈھونڈی لیکن وہاں اگر مسائل کے حل کرنے کی دقت تھی، تو یہاں مسائل کو سمجھنے ہی میں اشکال تھا، وہاں نارسائی کا اعتراف تھا، یہاں حقیقت رسی کا مغالطہ۔

(۵) نیاز صاحب نے لکھا ہے:۔

"وہ وقت و زمانہ کی اہمیت کے اس درجہ قائل تھے کہ اسے انسان کی موت و حیات کا مسئلہ سمجھتے تھے۔"

یہاں نیاز صاحب نے اپنی طرف سے تصرف فرمایا ہے۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے "اقبال کا تصور زمان و مکان" میں لکھا ہے:

"ان کا (علامہ کا) خیال ہے کہ زمان و مکان کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔"

خود علامہ خطبات میں فرماتے ہیں:۔

"دوسری طرف اسلامی تہذیب کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خالص ذہنی مسائل ہوں یا مذہبی نفسیات یعنی اعلیٰ تصوف کے مسائل ہوں، سب کا نصب العین اور مقصود یہی ہے کہ لامحدود کو محدود کے اندر سمو لیا جائے۔ ظاہر ہے جس تہذیب کا مطمح نظر یہ ہو اس میں زمان و مکان کا سوال درحقیقت زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

(الہیات اسلامی کی تشکیل جدید)

لیکن علامہ سے اسلامی تہذیب کی تاریخ کے سمجھنے میں تسامح ہوا ہے۔ زمانہ (یا زمان و مکان) کا مسئلہ اسلامی فکر میں صرف اتنی حیثیت رکھتا ہے کہ غیر اسلامی فکر کے نمایندے ان اصنامِ خیالی کے آبگینے تراشتے رہیں اور توحید کے دیوانے اس کارگر شیشہ گری کو پاش پاش کرتے رہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ اسلامی فکر میں جب پہلی مرتبہ ژولیدگی وہم و تخیل کے ان ڈھکوسلے کا نام آیا تو فوراً اسے بندگانِ ظن و تخمین کی اختراع سے تعبیر کیا گیا، چنانچہ جس وقت زنادقۂ قریش نے کہا

وَمَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا	اور کچھ نہیں بس یہی ہے ہمارا جینا دنیا
نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا	کا، ہم جیتے اور مرتے ہیں اور نہیں ہلاک
إِلَّا الدَّهْرُ	کرتا ہم کو مگر زمانہ۔

تو فوراً وحی نازل ہوئی

وَمَا لَهُمْ بِذَلِكَ مِنْ عِلْمٍ	اور ان کو کچھ خبر نہیں اس کی وہ محض
إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ	اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔

اس برجستہ گرفت نے اس باب میں اسلامی فکر کے موقف کو ہمیشہ کے لیے متعین کر دیا۔

اسی طرح جب مہبطِ وحی کو معلوم ہوا کہ مقاصد زندگی میں ناکام افراد کی زبان پر

"تباً للدہر" اور "یوساً للدہر" کی مغلظات اور ملاحیاں جاری ہیں تو "معلم کتاب و حکمت" نے بتادیا کہ زمانہ کو سب و شتم نہ کرو کیونکہ ان مصائب و نوائب کا نازل کرنے والا وہ ہے جس کے قبضۂ قدرت میں زمانہ یا دہر ایک آلہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے (مزید تفصیل آگے آرہی ہے)۔ چوتھی صدی ہجری تک مفکرین اسلام کی تمام جماعتوں مفسرین و محدثین اور فقہا و متکلمین کا اس پر اتفاق رہا، پانچویں صدی سے غیر اسلامی (یونانی و ایرانی) افکار کے عقیدتمندوں نے زمانہ پرستی کو نئی نئی شکلوں میں پیش کیا، مگر متکلمین نے

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش   من انداز قدت را می شناسم

کے مصداق اسے پہچانا اور اس معرکۂ حق و باطل میں اپنا فرض منصبی پورا کیا۔

غرض اسلامی فکر کی تیرہ سو سال کی تاریخ شاہد ہے کہ اسلامی تہذیب میں زمان و مکان کے مسئلے کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی، زندگی اور موت کا سوال بنانے کا تو ذکر ہی کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ مسئلہ زمان کے ساتھ علامہ کا یہ غیر معمولی شغف ان کے میلان تجدد پسندی کا نتیجہ تھا، یورپی کلچر "سائنس اور طبعیات کا کلچر" ہے۔ طبعیاتی تفکیر کے نتیجے میں مغرب کے فلاسفہ اور سائنس دانوں کو زمان و مکان کی حقیقت پر غور کرنا پڑا اور یہ مسائل ان کی فکری کاوش کے ناگزیر موضوع بن گئے، چنانچہ ایک جرمن فلسفی سائنسدان موریتس شلک لکھتا ہے:۔

The most fundamental conception in physics are those of space and time ..... The effort of physicists had always been directed sloey to all the substraatm which occupied space and time .... space and

time were regared, so to speak as vessels containing this substratum and furnished fixed systems of refence." (Moritz Schellick: Space and Time in Contemporary Physics, P.2)

[طبیعات کے سب سے زیادہ بنیادی تصورات زمان و مکان کے ہیں۔ ماہرین طبیعات کی کوشش ہمیشہ خاص طور سے ان چیزوں کی طرف مبذول رہی ہے، جو زمان و مکان پر مشتمل ہیں ...... ایسا سمجھا جانا چاہیے کہ زمان و مکان ایک طرح کے ظروف ہیں جو ان چیزوں پر مشتمل ہیں اور جو تعین وضع کے لیے ثابت و مستقر حوالجات مہیا کرتے ہیں]

ایسا خیال ہوتا ہے کہ علامہ کو جو یورپی انداز فکر سے بیحد متاثر تھے، اندیشہ تھا کہ یہ "اہمیت مفرط" مشرق میں جہاں سائنس اور طبیعات نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی، کچھ زیادہ درخور اعتنا نہ سمجھی جائے گی، اس لیے انھوں نے بغیر کسی معقول وجہ کے اس کے لیے ایک تاریخی توجیہ تراش لی، حالانکہ اسلام کی فکری و ثقافتی تاریخ کا مطالعہ اس اختراعی توجیہ کی کسی طور پر تائید نہیں کرتا، مگر علامہ کو "طبع مشرق" کا پورا پورا اندازہ تھا، اسی لیے انھوں نے طبیعات کے بجائے "مسائل تصوف" کا سہارا لیا۔

(۶) نیاز صاحب نے لکھا ہے:۔

"زمانہ ان کے یہاں رات دن کا نام نہیں تھا، بلکہ اس کا تعلق ارتقائے تھا اس عینیت سے تھا جس میں وجود اور وجوب خلق کا فرق و امتیاز کوئی معنی نہیں رکھتا۔"

جس طرح ایک بگڑا مفکر اپنی ژولیدگی تخیل کے لیے عرفانیات کے دامن میں پناہ ڈھونڈتا ہے اسی طرح ایک بگڑا ادیب اپنی پریشاں گفتاری کے لیے خوشنما اور مہیب الفاظ

کے طلسم کا سہارا لیتا ہے ، مسئلہ ارتقا ہو یا دیگر مسائل علمیہ ان کی تعبیر و توجیہ خالص منطقی بنیادوں پر ہونی چاہیے ، سائنٹفک استدلال کے بجائے ادراکِ حقائق کو عرفانی تجارب کے سپرد کرنا کوئی علمی خدمت تو نہیں ہے ۔

زمانہ کا ارتقائی تصور برگساں کا مذہب ہے جس کی تقلید علامہ کی نظروں میں فقدانِ خودی کے مترادف ہے

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا زناریٔ برگساں نہ ہوتا

زمانہ کے باب میں بڑے مذاہب پانچ ہیں ، جن میں سے تین فلسفہ سے تعلق رکھتے ہیں ، اور دو طبیعیات سے

(۱) مذہب طبیعی : اس میں مرکزی شخصیت ارسطو کی ہے ، کانٹ سے پیشتر یہ تمام فلسفی مدارس کا مسلک تھا ۔
۲ ۔ مذہب انتقادی : اس کا واضع کانٹ ہے ۔ ۳ ۔ مذہب حیاتی یا ارتقائی : اسے برگساں نے پیش کیا ۔
۴ ۔ مذہب مطلق : اس کا ممثل نیوٹن ہے ۔ اور ۵ ۔ مذہب نسبی : اس کا علمبردار آئینسٹائن ہے ۔

ان مذاہب خمسہ میں سے برگساں کا مذہب یہ تھا کہ زمانہ "مدت بحت Pure Duration ہے جس میں تعاقب (Succession) ہے ، مگر تغیر (Change) نہیں ہے ۔ اقبال نے بھی اسی مسلک کی تصویب کی ہے ، اور زمانہ کے اس تصور کو انائے باطنی کا وظیفہ بتایا ہے جسے وہ " Appreciative self " سے تعبیر کرتے ہیں اس طرح "اس انا سے مدرک" کا زمانہ ایک واحد اب (Single Now) ہے جس میں ماضی ، حال اور مستقبل کا کوئی امتیاز نہیں ہے لیکن یہ کوئی تصور نہیں ہے ، حکمائے اسلام اس سے زیادہ منطقی انداز میں اس تدقیق کو پیش کر چکے ہیں ۔ "دہر" اور "سرمد" کے تصورات کو برگساں اور اقبال کی "Pure Duration" سے کہیں زیادہ منطقی بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی گئی تھی ، مگر نتیجہ "ہذا التھویل خال عن التحصیل"[۱] سے زیادہ وقیع ثابت نہ ہوا ۔

---

[۱] المحصل للرازی ص ۹۲

نیاز صاحب کہتے ہیں کہ اقبال کے نزدیک زمانہ رات دن کا نام نہیں ہے معلوم نہیں انھوں نے اقبال کے کس قول سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے، ایجابی طور پر بقول مصنف روح اقبال زمانہ ہی کا دوسرا نام تقدیر ہے، ویسے گردش لیل و نہار اور سلسلۂ روز و شب ہی اقبال کے نزدیک نقش گر حادثات" اور "اصل حیات و ممات" ہیں۔

اسی طرح نیاز صاحب کی یہ انشا پردازی کہ زمانہ اس "عینیت سے مراد ہے جس میں وجود اور وجوب خلق کا فرق و امتیاز کوئی معنی نہیں رکھتا" محض مہیب الفاظ کا ایک طلسم ہے جس میں کوئی معنوی نظم اور منطقی ربط نہیں ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ وہ ان ثقیل فلسفیانہ مصطلحات کے استعمال میں اتنا اسراف نہ فرماتے۔

(۷) نیاز صاحب نے اس ہیبت ناک "عینیت" کی مثال میں لکھا ہے:

"زمانہ کا تعلق اس عینیت سے تھا جس میں وجود اور وجوب خلق کا فرق و امتیاز کوئی معنی نہیں رکھتا اور جس کو صوفیانہ لب و لہجہ میں یوں ظاہر کیا ہے:۔

نہ ہے زماں نہ مکاں ــــ لا الہ الا اللہ" ع

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

"نہ ہے زماں نہ مکاں لا الہ الا اللہ" ذہن اقبال کا اس وقت کا کارنامہ ہے جب ان پر توحید الوہیت کا غلبہ تھا، عینیۃ" وجود اور وجوب خلق کے فرق و امتیاز" کی سرحدیں مٹانے سے اس کا کوئی تعلق نہیں، توحید [نفی غیر اللہ] وحدت الوجود [تا لہ غیر اللہ] سے بنیادی طور پر مختلف ہیں دشتان بنیہا۔ پس اگر "صوفیانہ لب و لہجہ" سے توحید الوہیت کے علمبردار کا لہجہ مراد ہے تو یہ بات صحیح ہے لیکن اگر عجمی نام نہاد "توحید وجودی" کے مبلغین کا لہجہ مراد ہے تو یقیناً غلط ہے۔

(باقی)

نارجیل سے نخیل تک

از

مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

(۵)

عرب میں ہندوستانیوں کی آبادیاں

ہندوستان کے شمال و مغرب کے ساحلی مقامات، اور عرب کے شمال و مشرق کے ساحلی مقامات ایک دوسرے کے سامنے واقع ہیں، درمیان میں بحرِ ہند (جسے بحرِ عرب اور بحرِ فارس بھی کہتے ہیں) حائل ہے، اسی سمندر کے ذریعہ دونوں ممالک میں تاریخ کے قدیم دور سے تعلقات چلے آرہے ہیں، اور دونوں کے ساحلی علاقے ایک ملک کے دو علاقے کی حیثیت سے رہے ہیں۔ عرب و ہند کے قدیم تعلقات ابتدا میں صرف تجارتی اور معاشی تھے، مگر بعد میں فکری، تمدنی، اور ثقافتی تعلقات بھی پیدا ہوگئے، بلکہ تجارتی و اقتصادی تعلق کو فکری اور ثقافتی تعلق نے اور زیادہ مضبوط کر دیا۔ اس کے باوجود قدیم تاریخ میں ہندوستان کے کسی ساحلی یا غیر ساحلی مقام پر عربوں کی آبادی کا پتہ نہیں چلتا جو یہاں آکر مستقل طور سے آباد ہوگئے ہوں، حالانکہ عرب کے مقابلہ میں ہندوستان ہر اعتبار سے ترقی یافتہ ملک تھا اور عربی زندگی کے مقابلہ میں یہاں کی زندگی میں رنگینی اور دلکشی بھی زیادہ تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرب تاجر ہندوستان آتے اور تجارتی مقصد پورا کرکے واپس

چلے جاتے تھے، اور اپنی آزاد عربی زندگی پر کسی دوسری زندگی کو ترجیح نہیں دیتے تھے، عربی زندگی ان کے لیے بہت ہی دلفریب اور خوشگوار تھی، ہندوستان میں سب کچھ ہونے کے باوجود ان کو یہاں وہ کھلی ہوا اور آزاد فضا میسر نہیں تھی، جو عرب میں حاصل تھی، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں ہمیں کسی قدیم عرب آبادی کا پتہ نہیں چلتا ہے، اور نہ یہاں پر عربوں کے بہت زیادہ دنوں تک ٹھہرنے کا ثبوت ملتا ہے، اس کے مقابلہ میں ہندوستان کے ایسے باشندے عرب میں کثرت سے ملتے ہیں جو وہاں جاکر مستقل طور پر وہ بس گئے، اور ہندوستان کی قومیت و وطنیت چھوڑ کر عرب کے باشندے ہو گئے، اور ان کو عربوں نے عربی زندگی میں اس طرح ضم کر لیا کہ وہ بالکل عرب بن گئے، ہندوستانیوں کے ساتھ عربوں کے اس حسن سلوک اور رواداری کی وجہ ان کی فطری وسعت قلب اور مہمان نوازی تھی جو دور جاہلیت میں بھی ان کی امتیازی صفت تھی، اس کے ساتھ ہی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ عربوں کو گھر بیٹھے ان ہندوستانیوں کے ذریعہ ضروریات زندگی کی چیزیں مل جاتی تھیں اور ان کو ان کے لیے ہندوستان کا بحری سفر نہیں کرنا پڑتا تھا، ابتدا میں بہت سے ایسے ہندوستانی باشندے عرب میں جاکر آباد ہو گئے جو تاجر تھے، اور عربوں کی ضرورت کا سامان ان کے میلوں اور بازاروں میں لیجاکر فروخت کرتے تھے۔ ان تاجروں کو عرب بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور نہ صرف یہ کہ ان کو لوٹتے مارتے نہیں تھے، بلکہ ان کی حفاظت کر کے حق جوار کا پورا لحاظ کرتے تھے، چنانچہ عرب کے کئی بڑے قبائل نے ایسے ہندوستانی باشندوں کو اپنی "ولاء" میں لے لیا تھا، اور ان کو وہ اپنے قبیلہ کا فرد شمار کرتے تھے، پھر چونکہ ہندوستان کے لوگ بت پرستی میں جاہلی عرب کے تقریباً ہم مشرب تھے، اس لیے اور بھی دونوں ملکوں میں تعلقات استوار ہوئے، چنانچہ عرب کے یہود و نصاریٰ کے علاوہ مشرک، مجوسی، صابی وغیرہ ہندوستانیوں کو اپنا ہم مشرب گردانتے تھے، اور بت پرستی اور دوسرے عقائد و اعمال بڑی حد تک ہم رنگ تھے۔ اس لیے آپس میں

مذہبی اختلافات بھی نہیں تھا، اسی طرح بہت سے عادات و خصائل اور رسوم و رواج میں عرب اور ہندوستانی تقریباً متفق و متحد تھے، اس لیے ہندوستان کے باشندے عرب میں بڑی آسانی سے کھپ گئے۔

عربوں اور ہندوستانیوں کے تعلقات کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ ایران کے بادشاہ بلوچستان سندھ اور سرندیپ وغیرہ پر قابض تھے، اور ان علاقوں کے ہندوستانی باشندے جاٹ اور مید وغیرہ ایرانی فوج اور حکومت میں شامل تھے، اور کسرائیوں کی مخصوص شاہی فوج اسوار میں شامل ہو کر عرب کے ایرانی مقبوضات میں آباد ہو گئے تھے، اس طرح عراق کے اہم ایرانی مقبوضہ ابلہ (بصرہ) سے لیکر یمن تک ایرانی فوجوں کی طرح یہ بھی پھیلے ہوئے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے پہلے عرب کے جنوبی اور مشرقی سواحل پر ہندوستانی باشندوں کی بہت بڑی تعداد جمع ہو گئی تھی، اور وہاں کی ملکی اور قومی زندگی میں ان سے شدید خطرات محسوس ہونے لگے تھے، چنانچہ یمن پر جب حبشیوں نے قبضہ کیا تو وہاں ہندوستان کے باشندوں کی بہت بڑی تعداد موجود تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب یمن کے سابق عرب حکمران سیف بن ذی یزن نے ایران کے بادشاہ کسریٰ انوشیرواں کے دربار میں پہنچکر اپنا حال بیان کیا اور اجنبی لوگوں کے غلبہ کا واقعہ سنایا تو کسریٰ انوشیرواں نے سیف بن ذی یزن سے پوچھا کہ تمھارے ملک پر کن اجنبی لوگوں نے قبضہ کیا ہے؟ وہ حبشی ہیں یا سندھی،

فقال ایھا الملک غلبتنا	سیف نے کہا اے بادشاہ! ہمارے ملک پر اجنبی
علیٰ بلادنا الاغربة، فقال	لوگ غالب آگئے ہیں، کسریٰ نے پوچھا کون اجنبی
له کسریٰ ای الاغربة الحبشة[1]	حبشی یا سندی؟ تو یوسف نے کہا سندی نہیں،
ام السند، فقال بل الحبشة	بلکہ حبشی غالب آگئے ہیں،

[1] سیرت ابن ہشام طبع جدید مصطفےٰ محمد مصر ج ۱ ص ۴۴ و کتاب التیجان کلبی طبع حیدرآباد ص ۳۰۴ و تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۴۶ مطبع حسینیہ مصر،

تاریخ طبری کی ایک روایت میں ہے :-

قال ایھا الملک ان السودان	سیف نے کہا اے بادشاہ! کالے لوگوں نے ہمارے
قد غلبونا علی بلادنا و رکبوا	ملک پر غالب آکر ہمارے ساتھ نہایت برا
منا امورا شنعۃ ، اجل الملک	برتاؤ کیا ہے جن کا تذکرہ بادشاہ کے سامنے
عن ذکرھا الخ (ص ۱۰۱)	مناسب نہیں ہے ،
قال قد علمت ان بلادکم کما	یہ سنکر کسری نے کہا ہاں تمھارا ملک بہت ہی
وصفت فای السودان غلبوا	زرخیز اور اچھا ہے، بتاؤ کن کالے لوگوں نے
علیھا الحبشۃ ام السند[1]	اس پر غلبہ حاصل کرلیا ہے؟ حبشی یا سندھی؟

اس گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے بعد عرب کے مشرقی اور جنوبی علاقوں میں کس قدر ہندوستانی موجود تھے، اور ان کو کتنی شوکت و قوت حاصل تھی، یہ واقعہ آپ کی ولادت کے بعد کا ہے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دو سال بعد کا ہے، پروفیسر فلپ حتی نے تاریخ العرب میں لکھا ہے کہ ولادت نبوی کے بعد ۵۷۵ء میں یمن پر ایران کا قبضہ ہوا،[2] اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ۵۷۱ء میں ہوئی ہے، یمن پر مسروق بن ابرہہ نے چڑھائی کی تھی، جس کے باپ ابرہہ نے اپنے دور حکومت میں کعبہ پر فوج کشی کی تھی، اور اس واقعہ کے ۵۵ دن بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے،[3] سیف بن ذی یزن کی فریاد پر کسری انوشیروان نے یمن پر اپنی فوج بھیجکر قبضہ کیا اور عراق سے لیکر یمن تک کا علاقہ اپنے قلمرو میں شامل کرلیا،

---

[1] تاریخ طبری مطبعہ حسینیہ مصر ج ۲ ص ۱۰۸ [2] تاریخ العرب حتی، طبع مصر ص ۸۶
[3] رحمۃ للعالمین ج ۱ حاشیہ ۔

جیسا کہ معلوم ہوا یمن اور اس کے اطراف میں پہلے ہی سے سندھیوں کی بڑی جمعیت موجود تھی، اور ان کو قوت و شوکت حاصل تھی، انوشیروان کے یمن پر قبضہ کے بعد عرب میں ہندوستانیوں کی اور بھی کثرت ہوگئی اور اساورہ (شہسواران ایران) میں شامل ہونے کی وجہ سے انھوں نے وہاں کے ملکی اور سیاسی معاملات میں حصہ بھی لیا۔

امام ذہبی نے تجرید اسماء والصحابہ میں یمن کے آخری ایرانی حکمراں کا نام جو حیات نبوی ہی میں مسلمان ہوگئے تھے، باذان ملک الہند لکھا ہے[۱]، مگر حافظ ابن حجرؒ نے الاصابہ میں اس کی تضعیف کی ہے اور اس کی جگہ ملک الیمن کو صحیح قرار دیا ہے[۲]، اس پر مفصل بحث اپنے مقام پر آئے گی، اسی طرح یمن میں کسریٰ کے زمانہ سے ایک ہندوستانی بزرگ بیرزطن ہندی موجود تھے، جو عہد رسالت میں مسلمان ہوئے تھے، انھوں نے یمن کے اطراف میں حشیش القنب (بھنگ) کو بطور دوا متعارف کرایا تھا اور علاج و معالجہ میں اس کو رواج دیا تھا[۳]، غالباً یہ طبیب تھے، ان کے حالات اپنے مقام پر آئیں گے۔

یمن قدیم زمانہ سے ہندوستانی مال کی بہت بڑی منڈی تھا اور یہاں ہندوستان کے تاجر ہمیشہ آتے جاتے رہتے تھے، فجر الاسلام کے مصنف نے لکھا ہے:۔

وکان لسکان الیمن قدیما	قدیم زمانہ سے یمن کے باشندوں کے تعلقات
علاقات بالھند والشرق	ہندوستان اور مشرق ادنیٰ سے
الادنیٰ[۴]	قائم تھے،

اسی کتاب میں دوسرے مقام پر ہے:۔

وکانت التجارۃ قدیمانی	قدیم زمانہ سے تجارت اہل یمن کے

---

[۱] تجرید اسماء الصحابہ ج ۱ ص ۵۰ طبع حیدرآباد [۲] الاصابہ فی تمییز الصحابہ ج ۱ ص ۹، [۳] الاصابہ ج ۱ ص ۱۴۵
[۴] فجر الاسلام ج ۱ ص ۳

يد اليمنيين وكانوا هم العنصر	ہاتھ میں تھی اور اس میں یہی لوگ غالب نظر
الظاهر فيها فعلى يدهم كانت	آتے تھے، ان ہی کے ہاتھوں حضرموت
تنقل غلات حضرموت	ظفار کی پیداوار اور ہندوستان
وظفار وواردات الهند	کی اشیاء شام اور مصر جاتی
الى الشام ومصر [1]	تھیں،

ان تصریحات کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ یمن کا پورا علاقہ ہندوستان کے تاجروں سے آباد تھا، اور ان کی بڑی تعداد وہاں تجارت میں مشغول تھی،

جس طرح یمن کے حدود میں ہندوستانیوں کی کثرت تھی، اسی طرح عرب کے شمال مشرق اور عراق میں قدیم زمانہ سے ہندوستان کے جاٹ اور سیابجہ رہتے تھے، عراق کا مرکزی شہر ابلہ چین، ہندوستان اور ایران وغیرہ کے تجارتی جہازوں کی بہت بڑی بندرگاہ تھا، اور اسے ہندوستان سے بہت پرانا اور بہت گہرا تعلق تھا جس کی وجہ سے عرب اسے ارض الہند اور فرج السند والہند کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے، شاہان ایران ابلہ پر قبضہ کرکے ایک طرف خشکی کے راستہ سے عرب پر حملہ آور ہوتے تھے اور دوسری طرف بحری راستہ سے ہندوستان پر حملہ کرتے تھے، تاریخ طبری واقعات سنہ ۱۲ھ میں ہے:-

وكان فرج الهند اعظم	اور فرج الہند (ابلہ) ایرانیوں کے بڑے
فروج فارس شأنا واشدها	اہم مرکزوں میں تھا، یہاں ان کو بڑی
شوكة وكان صاحبه يحارب العرب	شان و شوکت حاصل تھی، یہاں کا حاکم خشکی
فى البر والهند فى البحر [2]	میں عرب سے اور سمندر میں ہندوستان سے جنگ

[1] فجر الاسلام ج ۱ ص ۱۳ [2] تاریخ طبری ج ۴ ص ۵ و نیز کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۱۷۱

ظاہر ہے کہ ان بری اور بحری حملوں میں ہندوستان کے وہ جاٹ اور مید ضرور شامل ہوتے ہوں گے، جو شاہان ایران کی فوج میں قدیم زمانہ سے موجود تھے، خاص طور سے ہندوستان پر حملہ کی صورت میں ان کو اپنی خدمات پیش کرنے کا بہترین موقع ملتا رہا ہوگا،

عراق سے ہندوستان پر ایرانیوں کے بحری حملہ کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد طفولیت تک جاری رہا، چنانچہ کسریٰ انوشیروان نے یمن پر قبضہ کرنے کے بعد ہی ہندوستان پر بڑا زبردست حملہ کیا، اور سرندیپ کو تہ و بالا کرکے یہاں سے بے شمار دولت حاصل کی، امام طبری نے اس حملہ کی تفصیل یہ بیان کی ہے :-

فلما دانت لکسری بلاد الیمن	جب بلاد یمن کسریٰ کے مطیع ہو گئے تو
وجه الی سرندیب من بلاد	اس نے ہندوستان کے شہر سرندیپ پر
الھند، وھی ارض الجواھر	(جو جواہرات کا ملک ہے) اپنے ایک فوجی
قائداً من قواده فی جند کثیف	افسر کو بھاری لشکر کے ساتھ بھیجا جس نے
فقاتل ملکھا فقتله واستولی	راجہ کو قتل کرکے ملک پر قبضہ کر لیا
علیھا، وحمل الی کسری منھا	اور وہاں سے کسریٰ کی خدمت میں
اموالا عظیمة وجواھر کثیراً[1]	زر و جواہر اور مال و دولت بھاری مقدار میں

ہندوستان کے جاٹ اور مید ایرانیوں کی ان مہمات میں اپنی خدمات پیش کرتے تھے۔

علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں :-

" عربوں اور ہندوؤں کے درمیان تعلقات کا ایک اور ذریعہ بھی تھا، اسکی صورت یہ تھی کہ شہنشاہ ایران کا قبضہ بلوچستان اور سندھ پر اکثر رہا، اس قبضہ کے تعلق سے

---

[1] تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۲۴، اور تاریخ ابن خلدون ج ۲ ص ۱۷۱ طبع مصر،

بعض جنگجو قبیلوں کے فوجی دستے ایرانی فوج میں داخل تھے، ان جنگجو قبیلوں میں سے دو کا ذکر عربوں نے کیا ہے اور وہ جاٹ اور سیدھی ہیں، یہ دونوں سندھ کی مشہور قومیں تھیں[1]"

ابلہ کے علاوہ بھی عراق میں ہندوستانیوں کی بہت بڑی تعداد رہتی تھی، اور قدیم زمانہ سے اس کو اپنا وطن بنا چکی تھی، اس کا ثبوت بلاذری کے اس بیان سے ملتا ہے:

فانضموا الی الاساورۃ السیابجۃ	سیابجہ ان اساورہ کے ساتھ مل گئے
وکانوا قبل الاسلام بالسواحل	جو اسلام سے پہلے سواحل میں موجود تھے،
وکذلک الزط، وکانوا بالطفوف	اسی طرح جاٹ بھی عراق کے سواحل میں تھے اور
یتبعون الکلاء[2]	یہ سب چارے کی تلاش میں کناروں کا چکر لگاتے[2]

یہ عہد فاروقی کا واقعہ ہے کہ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے سامنے ایرانی فوج نے پیش کش کی کہ ہم مسلمان ہو کر بصرہ میں آباد ہونا چاہتے ہیں اور اسلامی جہاد میں مسلمانوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں،

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے سیابجہ اور جاٹ عراق کے سواحل اور طفوف میں رہا کرتے تھے، جو عام طور سے مویشی پالتے تھے، اور چارہ کی تلاش میں سواحل کا چکر لگاتے رہتے تھے، اور عرب کی بدوی زندگی اختیار کر کے ان اطراف میں خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے تھے، یہ ہندوستانی ان ہندوستانیوں کے علاوہ تھے، جو ایرانیوں کی فوج میں شامل تھے۔

یہ لوگ خلیج عربی کے پورے عرب ساحل میں پھیلے ہوئے تھے، جس میں عمان، مسقط، قطیف، بحرین، قطر، کویت اور بصرہ سب ہی شامل تھے۔

خلیج عربی کے سواحل اور طفوف میں ہندوستانیوں کی کثرت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے

[1] عرب و ہند کے تعلقات ص ۱۱ [2] فتوح البلدان ص ۳۷۰ مطبع مصریہ ازہر

کہ دورِ جاہلیت میں ان کے دونوں سرے ان سے اس قدر آباد تھے کہ ایک طرف عرب لوگ ابلہ (بصرہ) کو ارض الہند اور فرج الہند کے نام سے یاد کرتے تھے[1]، اور دوسری طرف عمان اور بحرین کے عرب باشندے ہندوستانیوں کی زبان و تہذیب اور حالات سے اس قدر باخبر اور متاثر تھے کہ عام عربوں کو ہندوستانیوں کے حالات ان قبائل کے ذریعہ معلوم ہوتے تھے، اور ہندوستانیوں کے میل جول سے ان عرب قبیلوں کی زبان اتنی بگڑ گئی تھی کہ عربیت میں اس کا درجہ اس قدر گر گیا تھا کہ فصاحت و بلاغت اور استعمال و محاورہ میں سند نہیں مانی جاتی تھی۔

چنانچہ مشہور عرب مورخ ہمدانی صاحب الاکلیل کا یہ قول علامہ قاضی ابن صاعد اندلسی نے طبقات الامم میں نقل کیا ہے،

ومن وقع من نصر من الازد بعمان	اور قبیلہ نصر کا قبیلہ ازد جو عمان میں تھا
فعنہ اتی کثیر من اخبار السند	اس سے سندھ اور ہندوستان کی بہت
والھند، وشیٔ من اخبار فارس[2]	سی خبریں اور کچھ ایران کی خبریں معلوم ہوئیں۔

مصطفی صادق الرافعی تاریخ آداب العرب میں "الرحلۃ الی البادیۃ" کے ماتحت لکھتے ہیں کہ عربی زبان و لغت کو زیادہ تر اعراب اور بدویوں خاص طور سے قیس اور تمیم سے لیا گیا ہے، مگر جن اعراب اور اہل بوادی کی زبان عجمیوں کے اختلاط کی وجہ سے خالص عربی نہیں رہ گئی، ان سے استناد و استشہاد نہیں کیا گیا،

وخاصۃ الذین کانوا یسکنون	خاص طور سے وہ عرب جو ایسے علاقوں
اطراف بلادھم المجاورۃ	میں تھے جو پڑوس کی قوموں سے ملے ہوئے
لمن حولھم من الامم فانہ	تھے، اسی لیے لخم اور جذام سے عربی

[1] کتاب الخراج امام ابو یوسف ص ۱۸۵، طبقات ابن سعد ج ۶ ق ۱ ص ۲ تاریخ طبری اور کامل ابن اثیر ۳۶۴ھ
[2] طبقات الامم ص ۹۵ طبع قدیم۔

لا يؤخذ الا من لخم ولا من
جذام لمجاورتهم اهل
مصر والقبط ..... ولا
من عبد القيس وازد عمان
لانهم كانوا بالبحرين
مخالطين للهند والفرس
ولا من اهل اليمن لمخالطتهم
للهند والحبشة[1]

زبان نہیں لی گئی کیونکہ وہ مصر اور قبط
کے پڑوسی تھے، اور نہ عبد القیس اور
ازدعمان سے لی گئی کیونکہ یہ لوگ بحرین
میں تھے اور ہندوستانیوں اور ایرانیوں
سے ان کا اختلاط تھا، یہی حال
اہل یمن کا ہے، وہ بھی ہندوستانیوں
اور حبشیوں سے میل جول رکھتے
تھے،

بحرین کے قبیلہ عبد القیس کو ہندوستان کے باشندوں سے خاص تعلق تھا اور اسے کبھی کبھی ہندوستان کے لوگوں سے سابقہ پڑتا تھا، ایک تغلبی شاعر اخنس ابن شہاب اپنے قبیلہ لکیز بن عبد القیس کی مدح میں لکھتا ہے:

لكيز لها البحران والسيف كله وإن يأتها بأس من الهند كارب[2]

بحرین اور عمان اور ان کے ساحلی مقامات میں ہندوستانیوں کے کثیر تعداد میں آباد ہونے کا ثبوت اس واقعہ سے بھی ملتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے فوراً بعد جب ان اطراف میں ارتداد کا طوفان اٹھا اور مختلف قبائل نے اسلام کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو اس شورش میں ان علاقوں میں آباد ہندوستانیوں کو بھی جو اب تک اسلام نہیں لائے تھے شریک کیا گیا، خاص طور سے قطیف، ہجر، خط وارین، اجداثا وغیرہ میں آباد جاٹ[3] اور سیابجہ کو قبیلہ بنی عبد القیس کا ساتھ دینا پڑا،

[1] تاریخ آداب العرب ج ۱ ص ۲۴۲ [2] صفۃ جزیرۃ العرب ہمدانی ج ۱ ص ۲۱۵ بحوالہ عربوں کی جہازرانی ص ۳۰

امام طبری نے ۱۱ھ کے واقعات میں اہل بحرین کے ارتداد کے ذکر میں لکھا ہے

فلما مات النبي صلى الله عليه وسلم	جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا
خرج الحطم بن ضبيعة	تو حطم بن ضبیعہ بکر بن وائل کے مرتدوں
أخو بني قيس بن ثعلبة	اور دوسرے قبائل کے ان غیر مرتد کافروں
فيمن اتبعه من بكر بن وائل	کو جو ابتک اپنے مذہب پر قائم تھے
على الردة، ومن تأشب	ساتھ لیکر نکلا، اور قطیف، و ہجر
إليه من غير المرتدين	میں پہنچا اور خط کے پورے علاقہ کو
ممن لم يزل كافرا حتى نزل	اور وہاں پر آباد جاٹ اور سیابجہ
القطيف، وهجر واستغوى	کو گمراہ کرکے اپنے ساتھ لے لیا
الخط ومن فيها من الزط	اور دارین کی طرف بھی فوج بھیجی
والسيابجة وبعث إلى	
دارين[1]	

ان مرتدوں اور باغیوں نے جاٹوں اور سیابجہ کو لے کر ان اطراف میں بڑی شورش برپا کی اور مسلمانوں کا محاصرہ کرکے ہر طرف سے ان کی معاشی اور غذائی ناکہ بندی کر دی، حضرت علاء بن حضرمیؓ کو اس کی خبر ملی تو انھوں نے حضرت جارودؓ کو بنو عبد القیس اور حطم کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا اور ایک سخت معرکہ آرائی کے بعد کامیاب ہوئے۔ اور حطم کی فوج کا ایک بڑا حصہ شکست کھاکر دارین کی طرف بھاگ نکلا، پھر وہاں سے بحری راستوں سے یہ سب اپنے اپنے ملک اور وطن کی طرف بھاگ گئے۔ ابن اثیر کا بیان ہے:

---

[1] تاریخ طبری ج ۳ ص ۲۵۵ و ۲۵۶، اور کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۱۴۱

وقصد عظم الفلال الی	شکست خوردہ فوج کا بڑا حصہ کشتیوں کے
دارین فرکبوا الیھا السفن و	ذریعہ دارین کی طرف گیا اور باقی پر ہزیمت خوردہ
لحق الباقون ببلاد قومھم[1]	اپنے اپنے مقامات پر چلے گئے۔

طبری کے الفاظ یہ ہیں:

وقصد العظم الفلال	ہزیمت خوردہ فوج کے بڑے حصہ نے
للدارین فرکبوا فیھا السفن	دارین کا رخ کیا اور وہاں سے کشتیوں
ورجع الآخرون الی بلاد	میں سوار ہو کر اپنی راہ لی اور دوسرے
قومھم[2]	سپاہی اپنے اپنے وطن چلے گئے،

ان دونوں مورخوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ باغیوں اور مرتدوں کی شکست خوردہ فوج بھاری تعداد میں بھاگ کر دارین کی بندرگاہ پر آئی اور یہاں سے برّی اور بحری راستوں سے اپنے اپنے ملک کی طرف بھاگی، ظاہر ہے کہ اس میں ہندوستان کے جوجاٹ اور سیابجہ شریک تھے وہ بھاگ کر ہندوستان آئے ہوں گے،

(باقی)

---

[1] کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۲۴۴، [2] تاریخ طبری ج ۳ ص ۲۵۹

عربوں کی جہاز رانی

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے عربوں کی جہاز رانی کے موضوع پر بمبئی میں لکچر دیے تھے، اسی کو اس میں جمع کر دیا گیا ہے، یہ سید صاحبؒ کی بہترین تاریخی کتابوں میں ہے جس میں انھوں نے اس موضوع سے متعلق تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ قیمت:- ۷ ر

ضن

دیوانِ ظہیر اور اس کا مصنّف

از

جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب، صدر شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی

اس عنوان سے میرے مضمون کے متعلق محترم خواجہ عبدالرشید صاحب نے معارف (جون ۱۹۶۲ء) میں جو اظہار خیال فرمایا ہے اس کے لیے میں ان کا ممنون ہوں، چند باتیں اب بھی غور طلب معلوم ہوتی ہیں۔

(۱) میں نے ظہیر فاریابی کا سال وفات پروفیسر براؤن (جلد دوم، ص ۴۱۳) کے قول کے مطابق عرض کیا تھا، خواجہ صاحب نے مطبع نول کشور کے ایک نوٹ کے مطابق دیا ہے، پھر میں نے کہیں یہ عرض نہیں کیا کہ نول کشور نے صرف ایک بار ۱۹۱۷ء میں دیوان ظہیر شائع کیا تھا۔ میں نے اپنے حوالہ کے لیے ضرور اس سنہ کے اڈیشن کا ذکر کیا ہے۔

(۲) کیمیائے سعادت (جس کے مصنف کا سال وفات بھی میں نے دیا تھا) یقیناً ظہیر فاریابی سے پہلے کی ہے، وہ کتابیں جو ظہیر اصفہانی کے اشعار میں استعارۃً مذکور ہیں، ان میں کیمیائے سعادت بھی شامل ہے، یہی میرا مقصد تھا۔ اس جملے میں "کے علاوہ" رہ گیا ہے، یعنی اسے اس طرح پڑھا جائے:" کیمیائے سعادت (غزالی م ۵۰۵ھ / ۱۱۱۱ء) مخزن اسرار (نظامی گنجوی، م ۵۹۹ھ / ۱۲۰۲ء) کے علاوہ گلشن راز .... (لخ)"

اسی طرح حافظ شیرازی کا ایک مصرع جو ظہیر اصفہانی نے تضمین کیا ہے ،
وہ ظہیر فاریابی کے شعر میں نہیں ہو سکتا، اس بات پر پھر غور فرالیں۔

(۳) تخلص کے متعلق میں نے بھی وہی عرض کیا تھا جو خواجہ صاحب فرما رہے ہیں، یعنی میں نے یہی کہا تھا کہ چھٹی صدی ہجری میں تخلص شاذ ملتا ہے۔ لیکن التزام نہیں۔ میں نے چند شعراء کا ذکر کیا تھا کہ ان کے یہاں تخلص کا التزام نہیں، یعنی ان کی ہر غزل میں تخلص نہیں ملتا۔ ان شعراء میں انوری کو بھی شامل کیا تھا، خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ

"انوری وغیرہ کے ہاں بھی (تخلص) ملتا ہے، اور کمال اصفہانی نے بھی استعمال کیا ہے، میرے پاس جو انوری کی کلیات ہے اس میں ہر تیسرے مقطع میں تخلص مل جاتا ہے۔"

یعنی خواجہ صاحب بھی اعتراف کرتے ہیں کہ ہر غزل میں تخلص نہیں ہے، انھوں نے انوری کے ساتھ "وغیرہ" بھی ارشاد فرمایا ہے۔ لیکن اس کی وضاحت نہیں فرمائی۔ کمال اصفہانی کا حوالہ میں نے عرض کیا تھا کہ اس کے یہاں تخلص کا التزام نہیں۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس کے یہاں تخلص موجود ہے۔ چنانچہ میں نے کمال اصفہانی کا دیوان (مطبوعہ بمبئی) پھر اٹھا کر دیکھا۔ اس میں صفحہ ۱۸۱ سے صفحہ ۱۹۸ تک غزلیات بھی ہیں ان میں مجھے تخلص نظر نہیں آیا۔

(۴) خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ "ہو سکتا ہے کہ ظہیر فاریابی نے مخزن اسرار، گلشن راز شرح مطول وغیرہ تراکیب کا مناسب استعمال اپنے کلام میں پہلے کر لیا ہو، اور بعد میں لکھنے والوں نے ان تراکیب کو مستعار لے کر اپنی اپنی کتابوں کا نام رکھ لیا ہو، مثال کے طور پر حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے الفوز الکبیر وغیرہ کا نام قرآنی تراکیب ہی سے تو لیا ہے،

میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا اور اب بھی عرض ہے کہ وہ اشعار جن میں ان کتابوں یا ترکیبوں کا ذکر ہے وہ ظہیر فاریابی کے نہیں ہو سکتے، بلکہ زبان سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بعد کے ہیں اور ظہیر اصفہانی ہی کے ہوں گے، اگر خواجہ صاحب کے خیال کے مطابق وہ اشعار ظہیر فاریابی کے سمجھ لیے جائیں تو پھر اس شاعر کے ایسی مقبولیت کا ثبوت چاہیے جس کی وجہ سے ان کتابوں کے مقدس مصنفین نے ظہیر فاریابی جیسے درباری قصیدہ نگار کی تراکیب اپنی کتابوں کے نام کے لیے پسند کی ہوں۔ شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ نے الفوز الکبیر (حجۃ اللہ البالغہ بھی) کا نام یا ڈپٹی نذیر احمد مرحوم نے اپنی بعض کتابوں کے نام قرآن پاک کی تراکیب کے مطابق رکھے ہیں، تو یہ سعادت ان کے لیے زیبا تھی، آج کل ضرور غالب یا اقبال کی تراکیب کے مطابق نام رکھے جاتے ہیں، لیکن یہاں چھٹی صدی ہجری کا ذکر ہے۔

بہر حال بڑی خوشی کی بات ہے کہ خواجہ صاحب نے میرا مضمون دلچسپی سے پڑھا اور متانت کے ساتھ اظہار خیال فرما کر اسے سراہا۔

دو نایاب تحریریں

(استدراک)

از جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی

مخدوم مکرم و محترم السّلام علیکم

جون کا "معارف" ابھی شام کو ملا، ص ۴۶۵-۴۶۶ میں "تحریر شبلی" کے تعارف کے طور پر جو سطریں دیکھیں ان میں تصحیح کی ضرورت کئی جگہ ہے :-

سفرنامۂ ابن بطوطہ کا ترجمہ اردو میں مولوی محمد حیات الحسن رضوی موہانی نے کیا تھا، سفرنامے کی دوسری جلد کا ترجمہ پیرزادہ محمد حسین صاحب ایم اے ڈسٹرکٹ جج پنجاب نے کیا تھا، جو لاہور میں چھپ کر تقریباً ۱۸۹۸ء میں شائع ہو چکا تھا، چونکہ دوسری جلد ہندوستان کی سیاحت پر مشتمل تھی، جج صاحب نے پہلی جلد کی طرف توجہ نہیں کی۔ اسی زمانے کے گرد و پیش میں ایک بہت مختصر خلاصہ (اردو میں) ایک صاحب نوازش علی نام نے لاہور میں شائع کیا تھا اور ۸/ قیمت پر ملتا تھا۔ اسی کے بعد جج صاحب نے دوسری جلد بڑی آب و تاب سے لاہور میں شائع کی اور بہت جلد سارے ملک میں ابن بطوطہ کا نام مشہور ہو گیا تھا، حیات الحسن صاحب موہانی نے جو اس وقت ہنوز طالب علمی سے فارغ نہیں ہوئے تھے لیکن عربی کی قابلیت اچھی رکھتے تھے، اپنے والد مولانا حکیم احمد سعید صاحب موہانی کی امداد اور نگرانی میں پوری کتاب کا ترجمہ کیا، حکیم صاحب علاوہ ماہر طبیب ہونے کے عربی کے اچھے ادیب تھے، ان کے بڑے بھائی

مولوی لطف حسن صاحب مختلف اضلاع حیدر آباد میں جج کے عہدے پر فائز رہے تھے۔ سب سے چھوٹے بھائی شرف الحسن صاحب عدالت عالیہ سرکار عالی کے جج تھے، جنھوں نے ۱۹۵۳ء کے قریب انتقال کیا، اور یہ تینوں صاحب سید الاحرار مولانا حسرت موہانی کے حقیقی ماموں تھے، حیات الحسن صاحب کے ترجمے کی پہلی جلد منشی انشاء اللہ مدیر وکیل امرتسر نے غالباً ۱۹۰۱ء میں یا کچھ بعد شائع کردی تھی لیکن دوسری جلد کو شائع کرنا انھوں نے اس لیے نہیں چاہا، کہ محمد حسین صاحب جج پنجاب کا ترجمہ شائع ہو چکا تھا، ۱۹۲۱ء میں مجھے پروفیسر مارگولیتھ نے اوکسفورڈ سے لکھا کہ ہندوستان میں ابن بطوطہ کے سفرنامے کا ترجمہ اردو میں ہوا ہے، اس کی ضرورت ہے، میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ پہلی اور دوسری دونوں نایاب ہیں، حیات الحسن صاحب نے ایک نسخہ مجھے پہلی جلد کا دیا اور بتایا کہ دوسری جلد شائع نہیں ہوئی، پہلی جلد کا ترجمہ میں نے مارگولیتھ کو بھیجدیا،

حیات الحسن صاحب مرحوم کے ایک بھائی حمایت الحسن صاحب محکمۂ تعلیمات صوبۂ متحدہ میں ملازم تھے، اور بنارس میں کئی خدمتوں پر رہ کر وظیفہ یاب ہوئے، تیسرے بھائی ہدایت الحسن جوانی ہی میں انتقال کر گئے تھے، مجھے ان سب صاحبوں کی خدمت میں نیاز حاصل تھا، "نعانی" ظاہراً "موہانی" کی تصحیف ہے۔

مقالات شبلی حصہ پنجم

یہ مولانا شبلی کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو اکابر اسلام کے سوانح و حالات سے متعلق ہیں، اس میں علامہ ابن تیمیہ، ابن رشد اور زیب النسا، اور مولانا آزاد بلگرامی کی سوانح عمری وغیرہ جیسے اہم اور مفید مضامین ہیں۔ قیمت :- عہ/ (طبع سوم)

"مینجر"

مطبوعات جدیدہ

فضل اللہ الصمد توضیح الادب فی المفرد از مولانا فضل اللہ الجیلانی، استاذ جامعہ عثمانیہ جلد اول صفحات ۸۰۴ جلد دوم صفحات ۷۳۰، عمدہ عربی ٹائپ

ناشر الحاج یوسف زینل حجاز، پتہ اور قیمت درج نہیں،

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری کے علاوہ جو علمی و دینی تصانیف چھوڑی ہیں، ان میں ایک اہم کتاب الادب المفرد بھی ہے، یہ کتاب ہر زمانہ اور ہر دور میں مقبول اور متداول رہی ہے، لیکن بقول صاحب کشف الظنون یہ افسوس ہے کہ اس کتاب کی شرح تو کیا اس کا کوئی مفصل حاشیہ بھی نہیں لکھا گیا، امام سیوطی نے اس کا خلاصہ کیا تھا مگر وہ بھی ناپید ہے، ہندوستان کے علماء نے حدیث نبوی کے سلسلہ میں جو امتیازی اور غیر مفرع عنہا کام کیا ہے اس کی ایک تازہ مثال مولانا فضل اللہ صاحب رحمانی کی شرح ادب المفرد ہے، یہ کتاب ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کئی بار طبع ہو چکی ہے، مگر اس کی تصحیح کا پورا اہتمام کبھی نہیں کیا گیا، مصنف نے کتاب کی شرح کے ساتھ اس کے متن کی صحت کا بھی پورا اہتمام کیا ہے، ان کو جتنے متداول مطبوعہ اور قلمی نسخے مل سکتے تھے وہ سب انھوں نے اپنے سامنے رکھکر اس کی تصحیح کی ہے، اور جہاں ضرورت ہوئی ہے دوسری کتابوں سے بھی مدد لی ہے، اس کتاب کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ (۱) اس کتاب کی نصف حدیثیں صحیح بخاری اور نصف صحیح مسلم کے معیار کی ہیں (۲) بعض

احادیث جن کو صحیح میں انھوں نے تعلیقاً نقل کیا ہے، اس میں متصل سند سے اس کا ذکر کیا ہے، (۳) آداب اسلامی کے سلسلہ کی احادیث میں جہاں محدثین سے سند یا متن میں ذہول ہو گیا ہے اس کی نشاندہی بھی کرتے گئے ہیں (۴) آداب اسلامی اور اخلاق نبوی کا جتنا اچھا ذخیرہ اس کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے کسی دوسری کتاب میں نہیں ہے،

شارح نے ان تمام خصوصیات کو پیش نظر رکھکر مختصر مگر بہت جامع شرح لکھی ہے، اس میں حدیث کے غریب الفاظ کی تشریح بھی ہے اور مفہوم و معانی کی تعیین بھی، سند و متن پر محدثانہ انداز میں کلام بھی کیا ہے اور رواۃ کے مختصر حالات بھی لکھے ہیں، فقہا کے اختلاف مسلک کا بھی ذکر کیا ہے، مگر ساتھ ہی اس اختلاف کو رفع کرنے اور اس میں تطبیق دینے کی کوشش بھی کی ہے، اور ان سب سے بڑھ کر حدیث نبوی کے اخلاقی و عملی پہلوؤں پر کمیت و کیفیت دونوں لحاظ سے بڑے لطیف انداز میں روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

مولانا فضل اللہ صاحب نے یہ شرح لکھکر شروح حدیث کے ذخیرہ میں ایک نیا اور عمدہ اضافہ کیا ہے، جس کے لیے وہ تمام علماء و طلبائے علم حدیث کی طرف سے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

تاریخ سلسلۂ فردوسیہ۔

از معین الدین دردائی، صفحات ۲۰۰، کتابت و طباعت عمدہ، پتہ محمد مظفر الدین صاحب محلہ خانقاہ بہار شریف، قیمت چھ روپئے۔

جن سلاسل صوفیا کے ذریعہ اسلام کا روحانی و اخلاقی فیض ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پہنچا، ان میں ایک سلسلۂ فردوسیہ بھی ہے، جس کے گل سرسبد مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ ہیں، اس سلسلہ کا فیض یوں تو پورے ہندوستان میں پہنچا، مگر خاص طور پر سرزمین بہار کا تو چپہ چپہ اس سے مستفیز ہوا، اس کتاب میں محمد معین الدین دردائی صاحب اسی پرسعادت سلسلہ کے ۱۳ بزرگوں کے حالات و کارناموں کی تفصیل کی ہے، کتاب کا تعارف سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب

تعارف پیش لفظ اور دیباچہ مصنف نے لکھا ہے، سلسلۂ فردوسیہ کے بزرگوں کے حالات عام تذکروں میں بہت کم ملتے ہیں، مصنف نے ۵۰ سے زیادہ مطبوعہ اور قلمی کتابوں کی مدد سے ان کے مفصل حالات لکھے ہیں، خاص طور پر مخدوم الملک احمد یحییٰ منیر رحمۃ اللہ علیہ کے حالات انھوں نے جس تفصیل سے لکھے ہیں اتنی تفصیل سے ابتک کسی نے نہیں لکھے ہیں پھر مصنف نے خرق عادت باتوں اور خواب و منام کے قصوں کے ذکر میں بھی اعتدال سے کام لیا ہے اور جو بات لکھی ہے پوری تحقیق و تفتیش سے لکھی ہے، خاص طور پر کتاب کا تعارف پیش لفظ اور دیباچہ کے پڑھنے سے معلومات میں قابل قدر اضافہ ہوتا ہے، زبان و بیان کے لحاظ سے بھی کتاب اچھی ہے، اگر مصنف نے عرس و سماع کے ذکر میں ذرا اور احتیاط سے کام لیا ہوتا تو اس کی افادیت اور بڑھ جاتی۔ امید ہے کہ کتاب دینی حلقہ میں ذوق و شوق سے پڑھی جائے گی،

معرفت الٰہیہ ۔ از مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری، صفحات ۴۴، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر خانقاہ اشرفیہ، سب بلاک جی ناظم آباد ۲۳ کراچی ۱۸

مولانا عبدالغنی صاحب پھولپوری، مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز خلفاء میں ہیں، مدتوں وہ اعظم گڈھ میں رشد و ہدایت کا کام کرتے رہے، ادھر کچھ دن سے وہ پاکستان منتقل ہوگئے ہیں، مولانا اپنی مجالس میں حکمت و معرفت کی جو باتیں ارشاد فرماتے رہتے ہیں، ان کو ان کے بعض مسترشدین جمع کرتے رہتے ہیں اور مرتب کرکے کتابی شکل میں شائع کر رہے ہیں، اس مجموعہ میں مولانا نے معرفت الٰہیہ کی حقیقت، اس کے حصول کی صورت اور اس کے مظاہر وغیرہ پر بڑی لطیف و دل گداز بحثیں کی ہیں، کتاب کے ایک ایک جملے سے للہیت اور خدا ترسی ٹپکتی ہے، اس کے پڑھنے سے قلب میں طمانیت اور آخرت طلبی پیدا ہوتی ہے، مرتب نے مولانا کے جو حالات لکھے ہیں ان میں بعض باتوں کا علم شاید ان کے بہت قریبی لوگوں کو بھی نہ ہو،

کتاب بار بار پڑھنے کے لائق ہے، مولانا گو جسمانی لحاظ سے ہم سے دور ہو گئے ہیں، مگر اس کتاب کے ذریعہ انشاء اللہ ان کے روحانی فیض سے ہمیں برابر مستفیض ہونے کا موقع ملتا رہے گا۔

عبدالرحمٰن ابن خلدون صفحات ۳۲۵ از ڈاکٹر عبدالواحد دافی

جابر بن حیان صفحات ۳۰۲ از ڈاکٹر زکی نجیب محمود

المعتمد ابن عباد صفحات ۳۴۵ از علی ادہم

ناشر مکتبہ مصر ۳۰ شارع کامل صدقی الفجالہ۔

یہ تینوں کتابیں جمہوریہ عربیہ کے شعبۂ ثقافتی معاملات کی طرف سے شائع ہوئی ہیں، پہلی کتاب میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، ابن خلدون کے حالات و علمی ادبی کارناموں کی تفصیل ہے، دوسری کتاب میں مشہور فلسفی اور کیمسٹ جابر بن حیان کے حالات اور اس کے علمی کارناموں کا ذکر ہے، اور تیسری کتاب میں مغرب کے معروف شاعر و ادیب المعتمد ابن عباد کے ادبی و شاعرانہ کاموں اور خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے دائرہ میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، ان پر اس سے بھی زیادہ مفصل کتابیں لکھنے کی ضرورت تھی، پھر بھی عرب جمہوریہ کا شعبۂ ثقافت قابل مبارک باد ہے کہ اس نے ان پر کام کی ابتدا کر دی ہے، یورپ نے اپنے زور قلم سے معمولی معمولی آدمیوں کی دلوں میں غیر معمولی اہمیت بٹھا دی ہے، مگر بدقسمتی ہے کہ تاریخ اسلام کی بعض بڑی بڑی شخصیتوں سے بھی دنیا ناواقف ہے، اس لحاظ سے یہ بڑا قابل قدر کام ہے۔

'ع - م'
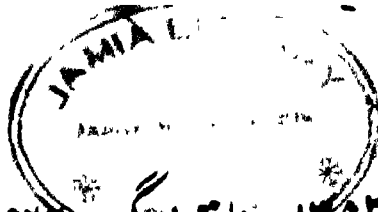
جلد ۹۰ ۔ ماہ ربیع الاول ۱۳۸۲ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۶۲ء ۔ عدد ۲

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

آہ مجاہد ملت

(جمعیۃ علمائے ہند کی آخری شمع بجھ گئی)

جس حادثہ کا دھڑکا عرصہ سے لگا ہوا تھا، بالآخر وہ پیش آہی گیا، اور مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن صاحب ۲ر اگست ۱۹۶۲ء کو صبح صادق کے وقت اپنے رب کے حضور میں حاضر ہوگئے، موت کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں، ہر وقت اسکا بازار گرم ہے، روزانہ ہزاروں لاکھوں انسان مرتے رہتے ہیں، مگر کسی کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا، لیکن بعض موتیں وہ ہوتی ہیں جن سے ایک قوم اور ایک ملت کی پوری عمارت متزلزل جاتی ہے، مولانا حفظ الرحمن صاحب کی وفات بھی انہی میں ہے۔

فما کان قیس ھلکہ ھلک واحد ولکنہ بنیان قوم تھدما

انکی موت سے ہماری قومی و ملی عمارت کا بہت بڑا ستون گر گیا، مولانا کی پوری زندگی اور زندگی کا ہر لمحہ ملک و ملت کی خدمت میں گذرا حتی کہ مرض الموت میں بھی اس سے غافل نہ رہے اور اپنی ان تھک محنت سے اس راہ میں جان تک دیدی، اسلیے اگر زندگی میں وہ مجاہد ملت تھے تو موت کے بعد شہید ملت ہیں۔

انکی پوری زندگی ایک سعی پیہم اور جہد مسلسل تھی جس سے ان کو ہندوستان کی آزادی کے بعد بھی نجات نہیں ملی۔ آزادی نے جنگ آزادی سے بھی زیادہ مشکل اور پیچیدہ مسائل پیدا کر دیے تھے، ایک طرف فرقہ پروری کا سیلاب تھا جو آزادی کے اصل مقصد ہی کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لیے جا رہا تھا، دوسری طرف مسلمانوں کے سنگین مسائل تھے، تیسری جانب ملکی و وطنی مصالح اور صحیح جمہوری اور سیکولر بنیادوں پر آزاد ہندوستان کی تعمیر تھی، اس بحرانی دور میں ان سب سے عہدہ برآ ہونا آسان نہ تھا، فرقہ پروری نے بڑے بڑے قوم پروروں کے قدم اکھاڑ دیے تھے، مگر اسوقت بھی مولانا صحیح قومی اصولوں پر قائم رہے

- اور ان سارے فرائض کو اس خوش اسلوبی سے ادا کرتے رہے کہ ان کا کوئی مخالف بھی حرف گیری نہیں کر سکتا۔

مسلمانوں کی اس بے بسی کے دور میں مولانا کی ذات بہت بڑا سہارا تھی، اور اس راہ میں ان کے کارنامے بے نظیر ہیں، ان کے بعد کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آتی جو مسلمانوں کی مظلومیت اور حق تلفی پر اس جرأت و بے باکی کے ساتھ آواز بلند کر سکے اور وہ مؤثر بھی ہو، یوں تو زبانی شور و غوغا کرنے والے بہت ہیں لیکن اس کی حیثیت صدا بصحرا سے زیادہ نہیں ہے، مولانا ہندوستان کی جنگ آزادی کے ممتاز سپاہیوں میں تھے، انھوں نے چوٹی کے لیڈروں کے دوش بدوش کام کیا تھا، ان کا دامن فرقہ پرستی کے داغ سے بالکل پاک تھا، ان کی پشت پر خدمات اور قربانیوں کی ایک پوری تاریخ تھی، اس لیے ان کی آواز میں قوت بھی تھی اور ایک حد تک اثر بھی تھا، ان کے بعد کوئی ایسی شخصیت باقی نہیں ہے، ہر طرف سناٹا نظر آتا ہے۔ ع

ع افسوس کز قبیلۂ مجنوں کسے نماند

اس لیے ان کی موت ملک و ملت خصوصاً مسلمانوں کا ایسا نقصان عظیم ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی، اللہ تعالیٰ اس مجاہد ملت کے خدمات کو قبول اور عالم آخرت کی سربلندیوں سے سرفراز فرمائے۔ اللّٰھم صبب علیہ شآبیب رحمتہ و رضوانہ۔

مسلمانوں کے معاملات میں حکومت کو کبھی کبھی اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے، اور وہ اس کی تلافی کے لیے آمادہ ہو جاتی ہے، چنانچہ پرائمری تعلیم کے نصاب میں ہندو تہواروں کی عملی تعلیم اور اس کی رسومات کو ادا کرنے کا جو حصہ تھا جس میں مسلمان بچوں کو بھی شریک ہونا پڑتا، انجمن تعلیمات دین اور جمعیۃ العلماء کی کوشش سے نصاب سے خارج کر دیا گیا، حکومت نے یہ ایک دانشمندانہ کام کیا ہے جس کا مسلمانوں کو اعتراف کرنا چاہیے، مگر پرائمری ریڈروں میں مسلمانوں کے عقائد و تصورات کے خلاف جو چیزیں ہیں، ان کے نکالنے کا مرحلہ ابھی باقی ہے، ہم کو توقع ہے کہ اس میں بھی حکومت اسی دانشمندی کا ثبوت دیگی، یہ مسلمانوں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں ہے، بلکہ اس سے خود حکومت کی جمہوریت اور سیکولرزم کا وقار قائم ہوتا ہے، اور مسلمانوں کو بھی

اس کا احساس ہوتا ہے کہ حکومت ان کے جذبات کا بھی لحاظ رکھتی اور ان کو اپنا شہری سمجھتی ہے۔

مگر اردو کے بارہ میں اسکی روش میں کوئی فرق نہیں آیا ہے، زبانی وعدے تو برابر ہوتے چلے آرہے ہیں کبھی کبھی اردو کے بارہ میں کوئی سرکلر بھی جاری ہو جاتا ہے، مگر جب تک اردو کے حقوق کو قانونی حیثیت نہ دیجائیگی اور اسکی بنیادی تعلیم کا مکمل انتظام نہ کیا جائیگا محض زبانی وعدے اور تحریری ہدایات بالکل بے نتیجہ ہیں، ان کی پابندی پر عمال حکومت کو مجبور نہیں کیا جا سکتا، اسکا نتیجہ یہ ہو کہ اردو روز بروز ختم ہوتی جاتی ہے، اردو کی حیثیت اتنی گرادی گئی ہو کہ اس سے مستقبل میں کسی فائدے کی امید نہیں ہوتی، اسلیے طلبہ کے لیے اس میں کوئی کشش باقی نہیں رہ گئی ہے، دوسرے پرائمری اسکولوں سے اردو بالکل ختم کر دیگئی ہے، ان سے پڑھکر جو طلبہ نکلتے ہیں ان کو آیندہ اردو لینے میں دشواری پیش آتی ہے، اسلیے مسلمانوں کے کالجوں اور اسکولوں میں بھی جہاں اردو کی تعلیم کا انتظام ہے، اردو کے طلبہ کی تعداد برابر گھٹتی جاتی ہے، اس میں ایک حد تک ان طلبہ اور ان کے سرپرستوں کا بھی قصور ہے جو اردو کی تعلیم کو بھی ذاتی فائدے کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، کچھ چیزیں ذاتی فائدے سے بلند ہو کر قومی نقطۂ نظر سے دیکھی جاتی ہیں، اردو کی تعلیم کا یہی فائدہ کیا کم ہے کہ اس سے اردو زبان زندہ رہے گی۔

اس بارہ میں ہم کو حیدرآباد کے اردو دوستوں سے سبق حاصل کرنا چاہیے، گو عثمانیہ یونیورسٹی سے اردو کا خاتمہ ایک بڑا سانحہ ہے لیکن اس سے وہاں کے حامیانِ اردو ہمت نہیں ہارے اور اس کے لیے برابر جد و جہد کرتے رہے اور اردو دنیا کو یہ سنکر مسرت بھی ہوگی اور حیرت بھی کہ انکی کوششوں سے حیدرآباد میں ایک اردو کالج قائم ہوگیا ہے، جس کا ذریعہ تعلیم اردو ہوگی، عثمانیہ یونیورسٹی نے بھی اس کالج کو تسلیم کر لیا ہے اور اس کے نصاب کی کتابیں مرتب ہو رہی ہیں، انجمن ترقی اردو حیدرآباد اور عثمانیہ یونیورسٹی دونوں اس کارنامے پر مبارکباد کی مستحق ہیں، ہمارے صوبے کے اردو کے کالجوں اور یہاں کی یونیورسٹیوں کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔

مقالات

ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

از جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب ایم اے

(۵)

مشائخ اور سلاطین | سلاطین صوفیۂ کرام[1] کے آستانوں پر برابر جھکتے رہے، مشہور ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ہی کی دعوت پر شہاب الدین غوری ہندوستان آیا، التمش حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کا مرید تھا، اور رات کو ان کے پاؤں بھی دابتا تھا، حضرت جلال الدین تبریزیؒ دہلی تشریف لائے تو اس نے خدم و حشم کے ساتھ دہلی سے باہر جاکر ان کا استقبال کیا، قاضی قطب الدین کاشانیؒ اس کے دربار میں آئے تو ان کو اپنے پہلو میں بٹھایا، اسی طرح دربار میں قاضی حمید الدین ناگوریؒ کا خیر مقدم تخت سے اتر کر کیا، اور ایک موقع پر ان کے قدموں پر بھی گر پڑا، بلبن اپنی شاہانہ شوکت و عظمت کے باوجود مشائخ کی بیحد تعظیم کرتا، اور حصول برکت کے لیے ان کے گھروں پر بے تکلف جاتا، وہ شیخ علی چشت کا بڑا گرویدہ تھا، ان کو لینے کے لیے چشت سے کچھ لوگ آئے،

---

[1] اس مقالہ کا یہ حصہ مئی اور جون ۱۹۶۲ء کے رسالہ جامعہ میں بھی شائع ہوا ہے لیکن مزید اضافہ کے ساتھ معارف میں شائع کیا جا رہا ہے،

تو اس نے ان کے قدموں پر گر کر ان کو چشت جانے سے روکا، ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس نے اپنی لڑکی بی بی ہزیرہ کو حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے حبالۂ عقد میں دیا تھا، اس لحاظ سے سلطان ناصر الدین محمود ان کا بہنوئی تھا، جلال الدین خلجی حضرت بو علی قلندر پانی پتیؒ کا مرید تھا، علاء الدین خلجی بعض اسباب کی بناء پر خواجہ نظام الدین اولیاءؒ سے مل تو نہ سکا لیکن اس نے اپنے دونوں لڑکوں خضر خاں اور شادی خاں کو ان کے حلقۂ ارادت میں دے دیا اور جب حضرت خواجہ کی مجلس سماع کے اشعار اس کے سامنے دہرائے جاتے تو وہ ان کو آنکھوں سے لگاتا اور بار بار پڑھتا، قطب الدین مبارک خلجی سہروردیہ سلسلہ کے ایک بزرگ شیخ ضیاء الدین رومی کا مرید تھا، سلطان محمد تغلق حضرت شیخ فریدالدین گنج شکرؒ کے پوتے حضرت شیخ علاء الدین کا مرید تھا، اس نے حضرت خواجہ نظام الدینؒ اولیاء کے جنازے کو کاندھا دیا اور ان کے روضۂ مبارک کی عمارت بنوائی، حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ اور حضرت شیخ رکن الدین ملتانیؒ کی خانقاہیں بھی اسی نے تعمیر کرائیں، سلطان فیروز شاہ تغلق بھی حضرت شیخ علاء الدینؒ اجودھنی کا مرید تھا، وہ مشائخ کی تعظیم و تکریم میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا تھا، حضرت جلال الدین بخاری جہانیاں جہاں گشتؒ اس کے دربار میں تشریف لاتے تو تخت پر ساتھ بیٹھتے، سلطان سکندر لودی حضرت سماء الدین کا مرید تھا، بابر حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کے آستانہ پر خود حاضر ہوا تھا، اور حضرت گنگوہی نے بھی اپنے ایک مکتوب کے ذریعہ سے اس کو نصیحت کی کہ وہ عدل قائم کرے، اوامر و نواہی کی پابندی کرے، نماز با جماعت ادا کرے اور علماء کو دوست بنائے، ہمایوں حضرت غوث گوالیاری کے حلقۂ ارادت میں داخل تھا، اکبر کو شیخ سلیم چشتیؒ سے جو عقیدت رہی وہ اس کی زندگی کا اہم جزء ہے، ان ہی کی خاطر اس نے فتح پور سیکری کو تمام شہروں کا سرتاج بنا دیا، اس کو جب کبھی ملکی اور فوجی کاموں سے فرصت مل جاتی تو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے آستانہ پر حاضر ہوتا، میدان جنگ میں حضرت خواجہ سے حصول برکت کے لیے یا معین کا نعرہ بھی لگاتا، شہزادہ سلیم کی پیدائش کی خوشی میں حضرت خواجہ کے مزار پر حاضری دینے کے لیے آگرہ سے اجمیر تک

پا پیادہ گیا، جہانگیر تو حضرت شیخ سلیمؒ کے سایۂ عاطفت میں پلا، اس لیے وہ بزرگوں، درویشوں، حتیٰ کہ سنیاسیوں سے بھی بڑی عقیدت رکھتا تھا، کچھ دنوں اس کو حضرت مجدد الف ثانی سے اختلاف ضرور رہا لیکن جب اس کی غلط فہمی دور ہوئی تو وہ حضرت مجددؒ کا بہت گرویدہ ہوگیا، ایک مشہور روایت ہے کہ وہ کہا کرتا تھا کہ میرے پاس ایک دستاویز نجات ہے، اور وہ حضرت مجددؒ کا یہ ارشاد مبارک ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھکو جنت میں لیجائے گا تو تیرے بغیر نہ جاؤں گا، شاہ جہاں بچپن ہی میں حضرت مجددؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگیا تھا، عالمگیر نے سلوک و طریقت کی تعلیم حضرت مجددؒ کے صاحبزادے حضرت محمد معصومؒ سے پائی، فرخ سیر نے حضرت سید شاہ سلام اللہ سے بیعت کی، محمد شاہ رنگیلے کو شاہ مبارک، شاہ بدا، اور شاہ رمز سے بڑی عقیدت تھی، عالمگیر ثانی کا قتل تو درویشوں سے اس کی غیر معمولی عقیدت مندی ہی کے سلسلہ میں ہوا، شاہ عالم کو حضرت شاہ فخرالدینؒ دہلوی سے بیعت تھی، بہادر شاہ ظفر بھی ان ہی کا مرید تھا، اور جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے صاحبزادے مولانا قطب الدین سے بیعت کی، ان کا وصال ہوا تو ان کے خورد سال صاحبزادے غلام نصیرالدین عرف کالے صاحبؒ سے وہی عقیدت قائم رکھی،

صوفیہ سے عقیدت کے اسباب

سلاطین کا صوفیہ کے آستانے پر جھکنے کے کئی اسباب تھے، ہندوستان میں مسلمانوں کے ابتدائی دور حکومت میں اتنے جلیل القدر صوفیہ گذرے کہ وہ خواص و عوام دونوں کے دلوں پر چھائے رہے، ان کی درویشی میں شاہنشاہی تھی، ان کی قلندری میں شان سکندری تھی، سلاطین کے دربار میں عجم کا حسن طبیعت دکھائی دیتا تو ان بوریہ نشینوں کی خانقاہوں میں عرب کا سوز دروں ملتا تھا، ان کی حکمت ملکوتی اور علم لاہوتی سے لوگوں کے درد کا درماں ہوتا رہتا تھا، وہ شبنم بن کر جگر لالہ میں ٹھنڈک پیدا کر سکتے تھے، تو طوفان بنکر دلوں کو دہلا بھی سکتے تھے، اسی لیے وہ عوام و خواص کے مرجع بن گئے تھے، سلاطین بھی ان کا دامن پکڑنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے،

اس کے علاوہ بعض سلاطین علماء کی سخت گیریوں سے گھبرا جاتے تو ان کو صوفیائے کرام کے

روحانی دامن میں پناہ ملتی تھی، صوفیۂ کرام ظواہر کی پابندی میں سختی کرنے کے بجائے سلاطین میں اسلام کی اخلاقی اور باطنی روح پیدا کرنے کی کوشش کرتے، اس سے کبھی کبھی شریعت کی گرفت تھوڑی ڈھیلی ضرور ہو جاتی، لیکن اسلام کے باطنی مزاج کا استیلاء ان پر قائم رہتا، جس سے غیر شعوری طور پر حکومت و سلطنت کو فائدہ پہنچتا، التمش جیسے دیندار بادشاہ کے دربار میں مولانا سید نورالدین مبارک غزنوی نے یہ وعظ کہنے میں تامل نہیں کیا کہ بادشاہوں کی زندگی کے جو لوازم ہیں، جس طرح سے وہ کھاتے ہیں، جو کپڑے پہنتے ہیں، جس طرح ؤ اٹھتے بیٹھتے اور سواری کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ وہ تمام چیزیں دین مصطفےٰ کے خلاف ہیں، لیکن حضرت بختیار کاکیؒ اپنے مرید سلطان التمش کو شاہانہ شوکت و حشمت ترک کرنے کی تلقین کے بجائے اس کو خدا ترسی، پارسائی، تزکیۂ نفس، غمخواری دین، عدل پروری اور خدمت خلق کی تعلیم دیتے رہے۔ سلطان غیاث الدین بلبن کے دربار کی نمایش، خود پرستی اور فرکیسروری کو علما، رسوم جبابرہ کہتے رہے، وہ دربار کی ظاہری نمود و نمایش میں عجمی فرمانرواؤں کی تقلید کرتا تھا جس کا رنگ مشرکانہ تھا، لیکن وہ اپنے عہد کے تمام اکابر بزرگان دین سے فیوض و برکات حاصل کرتا رہا، اس کی درباری زندگی خواہ کیسی ہی رہی ہو لیکن اس کو حمیت اسلام اور شعار اسلام کا بڑا خیال رہا، اسی لیے صوفیہ بھی اس کا احترام کرتے۔ اس کے مرنے کے بعد حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ، اور دوسرے مشائخ جب اس کا نام لیتے تو اس کے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ، طاب اللہ ثراہ اور انار اللہ برہانہ بھی کہتے۔ جو عموماً صلحا، اور اخیار کے نام کے ساتھ استعمال کیے جاتے ہیں، اس کے دربار کے بعض مشرکانہ رسوم کے باوجود خواجہ نظام الدین اولیا نے اس کے مذہبی عقائد کی تعریف کی ہے،

حضرت سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ اپنے ملفوظات میں فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں شب برات کی جو تقریبات منائی جاتی ہیں وہ غزنیں، خراسان اور عرب میں دیکھنے میں نہیں آئیں، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کا کوئی تعلق مسلمانوں سے نہیں ہے، بلکہ ہندوستان کے عوام سے ہے جو دین سے بے خبر ہیں، اور وہ اس رات غیر شرعی چیزوں میں مشغول رہ کر اپنے اعمال کو سیاہ کرتے ہیں،

وہ فیروز شاہ تغلق سے برابر ملتے رہے، جس نے ان سے مذہبی اور روحانی فیوض حاصل کیے، لیکن اس کے دربار میں شب برات کی تقریب بہت دھوم دھام سے منائی جاتی، بے شمار مشعلیں روشن کی جاتیں طبل بجتے، آتش بازی کے طرح طرح کے تماشے ہوتے، مگر حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ سلطان کی اس شاہانہ تقریب کو ختم کر دینے پر مصر نہیں ہوئے،

سلاطین پر صوفیہ کے اثرات صوفیہ کرام اور سلاطین کی پیری مریدی محض رسمی اور روایتی نہیں رہی، سلاطین کے مذہبی خیالات و جذبات کے نشو و نما میں ان بزرگوں کے فیوض و برکات کا بڑا دخل رہا، شمس الدین التتمش حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کا مرید ہو کر ویسا ہی فرمانروا ہوا جیسا کہ ہونا چاہیے تھا، تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ وہ راتوں کو جاگتا، کسی نے اس کو سوتے نہیں دیکھا، وہ بیدار ہو کر عالم تحیر میں کھڑا رہتا، اور اگر سو جاتا تو بیدار ہو جاتا، اٹھکر وضو کرتا اور مصلے پر جا بیٹھتا، وہ ہمیشہ نماز باجماعت میں تکبیر اولی سے شریک ہوتا، عصر کی سنتیں کبھی قضا نہیں کیں، انہی خوبیوں کی وجہ سے اس کو حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے جنازہ کی نماز پڑھانے کی سعادت حاصل ہوئی، عصامی نے فتوح السلاطین میں اس کو صاحب ولایت، پارسا، صاحب شرع فرمانروا، غمخوار دین، خسرو دیں پناہ، خسرو پاک دین اور خوش نفس وغیرہ جیسے القاب سے یاد کیا ہے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے بھی اپنے ملفوظات میں اس کا ذکر جا بجا عزت و احترام اور لطف و محبت سے کیا ہے، بلکہ اس کے بعض قول اور فعل کو بطور نصیحت اپنے مریدوں کے سامنے نقل بھی کیا ہے،

سلطان ناصر الدین محمود پر اپنے باپ سلطان شمس الدین التتمش کا بڑا اثر تھا، اسی لیے اس کو نہ صرف علماء سے محبت بلکہ شائخ سے بھی مودت تھی، تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ اس کو حضرت بابا گنج شکرؒ سے بڑی عقیدت تھی، اور اگر یہ روایت تسلیم کر لی جائے کہ وہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کا ہمزلف تھا تو ظاہر ہے کہ ان سے اس نے بڑا استفادہ کیا ہوگا، اس کے حب رسول، للہیت، مروت اور دوسرے اوصاف حمیدہ کے قصے بہت مشہور ہیں، مورخوں نے لکھا ہے کہ اس سلطان کے عجیب و غریب قصے خلفائے راشدین کے حالات زندگی سے ملتے جلتے ہیں،

اس نے گو بائیس برس تک حکومت کی لیکن اس کی زندگی میں وہ درویشانہ شان برابر قائم رہی، دربار عام میں آتا تو شاہانہ لباس میں ملبوس رہتا لیکن دربار ختم کرنے کے بعد پھٹے پرانے کپڑے پہن لیتا، اس کا زیادہ تر وقت عبادت، ریاضت، تلاوت کلام پاک، شب بیداری اور ذکر اللہ میں گذرتا، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے اس کے نام کے ساتھ بھی انار اللہ برہانہ اور رحمۃ اللہ علیہ کے تعظیمی الفاظ استعمال کیے ہیں۔

غیاث الدین بلبن پر حضرت شیخ علی چشت، حضرت شیخ فرید الدین گنج شکرؒ حضرت خواجہ شمس الدین ترک پانی پتیؒ اور دوسرے مشائخ کا بڑا اثر رہا، اور ان ہی کی صحبت کا اثر تھا کہ مولانا ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں کہ وہ عبادت، ریاضت، روزے نفل اور شب بیداری میں غیر معمولی اہتمام رکھتا، نماز باجماعت پڑھتا، جمعہ کی نماز مسجد میں ادا کرتا، اشراق و چاشت، اوابین اور تہجد کی بھی پابندی کرتا، خواہ کوئی موسم ہو رات کو جاگتا، سفر و حضر میں اوراد و وظائف کو نہ چھوڑتا، کبھی بے وضو نہ رہتا، مشائخ کی بیحد تعظیم کرتا، ان میں سے کسی کا انتقال ہو جاتا تو ان کے جنازہ میں شریک ہوتا، پھر ان کے سوئم میں شرکت کرتا،

جلال الدین خلجی کو نہ صرف حضرت بو علی قلندرؒ بلکہ تمام مشائخ سے بھی بڑی عقیدت رہی، اور اس میں غیر معمولی حلم، خدا ترسی، لینت و نرمی ان ہی کے اثرات سے پیدا ہوئی، مولانا ضیاء الدین کا بیان ہے کہ ایسا حلیم، کریم اور خدا ترس بادشاہ کوئی اور نہیں ہوا،

علاء الدین خلجی کسی کا مرید تو نہ تھا لیکن ایک بار حضرت بو علی قلندرؒ نے اس کو شحنۂ دہلی لکھ کر دیا تو وہ خوش ہوا، پھر دوسری بار انھوں نے اس کو فوط دار دہلی لکھا تو اس نے کہا کہ اس کے لیے میں شکر ادا کرتا ہوں، وہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی زیارت سے تو محروم رہا لیکن ان کی دعاؤں کا برابر طلب گار رہا، مورخین اس کی تصویر اچھی نہیں پیش کرتے لیکن حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ اس کے متعلق بری رائے نہیں رکھتے، ان کے ملفوظات کے کاتب شیخ حمید شاعر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ علاء الدین خلجی کے مرنے کے بعد اس کی قبر لوگوں کے لیے زیارت گاہ بن گئی تھی، اور لوگوں کا عام عقیدہ تھا،

جو کوئی اپنی مراد کی ڈوری اس کے مزار پر باندھے گا، اللہ تعالیٰ حاجتیں بر لائے گا، حضرت امیر خسرو تو یہاں لکھ گئے ہیں کہ علاء الدین نے رحمت خداوندی کی نشانیوں کو مصحف وجود کی جلد میں جمع کر دیا تھا، امیر حسن سجزی تو اس کو اپنے اشعار میں دین پرور، دین پناہ اور اسلام پرور وغیرہ کے القاب سے یاد کرتے تھے، عصامی نے بھی اس کو شاہ دین پرور لکھا ہے، عام طور سے علاء الدین خلجی سے متعلق جو واقعات مشہور ہیں ان کی تاریخی شہادتوں کے بعد علاء الدین کی مذکورہ بالا تعریف و توصیف بظاہر مبالغہ آمیز معلوم ہوگی، لیکن علاء الدین کے معاصروں کے ان بیانات کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا،

مولانا ضیاء الدین برنی سلطان محمد تغلق کے بہت بڑے ناقد تھے لیکن وہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ سلطان کے کردار میں دو خاص باتیں تھیں، خدا کی بندگی اور بڑوں کی نیازمندی، نیازمندی سے مراد ہے کہ وہ درویشوں اور بزرگوں کی صحبت کا بڑا گرویدہ رہا، اور ان کی برابر سرپرستی کی، ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ اس کی بعض باتیں ایسی تھیں جن کو سننے کے بعد عجائبات معلوم ہوتی ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ شریعت کا پابند تھا، نماز کی بڑی تاکید کرتا تھا، جو نہیں پڑھتا اس کو سزا دیتا، وہ منجملہ ان بادشاہوں کے ہے جن کی نیک بختی اور مبارک نفسی حد سے بڑھی ہوئی تھیں، اس کی بے حد خواہش رہی کہ مشائخ اور صلحا اس سے تعاون کر کے حکومت کو سنوارنے میں امداد کریں، اسی لیے اپنے مرشد شیخ علاء الدین اجودھنی کے ایک صاحبزادہ شیخ معز الدین کو گجرات کا ایک معزز عہدیدار بنا کر وہاں روانہ کیا، جہاں وہ شہید ہوئے، حضرت علاء الدین کے دوسرے صاحبزادے شیخ علم الدین کو ہندوستان کا شیخ الاسلام بنایا، خواجہ کریم سمرقندی (بابا فرید الدین کی نواسی کے شوہر) کو شیخ الاسلام بنا کر ستگاؤں بھیجا، اس نے سہروردیہ سلسلہ کے مشہور بزرگ شیخ رکن الدین کو سو گاؤں جاگیر کے طور پر دیے،

شمس سراج عفیف نے لکھا ہے کہ فیروز شاہ تغلق اپنے پورے عہد حکومت میں اولیاء کرام کی متابعت کرتا رہا، ہر وقت مشائخ کی محبت میں ان کی پیروی کی، اور آخر زمانے میں مجاور بھی ہو گیا تھا،

علماء و مشائخ ہر وقت اس کے پاس رہتے۔ اس لیے اس کو ہمیشہ مکروہ و حرام اشیاء کا علم رہتا تھا، اور ان ہی کے فیوض سے اس میں شریعت اور سنت کی پیروی کا جذبہ پیدا ہوتا رہا، وہ پانچوں وقت کی نماز باجماعت ادا کرتا، روزانہ کلام پاک کی تلاوت کرتا، جمعہ کے دن سورۂ کہف اور جمعہ کی رات میں سورۂ طہٰ بلاناغہ پڑھتا تھا،

لودی سلاطین میں سکندر لودی حضرت سماء الدینؒ کا مرید تھا، اور ان کے مرید شیخ جمالی کی صحبت سے برابر فیضیاب رہا، اور ان بزرگوں کے اثر سے پانچوں وقت کی نماز باجماعت ادا کرتا، نفلیں بہت پڑھا کرتا تھا، صبح ہونے سے تین گھنٹے پہلے وہ جاگتا، غسل کرتا، تہجد کی نماز پڑھتا، اور پھر قرآن کے تین پارے ہاتھ باندھ کر اور کھڑے ہو کر پڑھتا تھا،

پہلے ذکر آچکا ہے کہ ہمایوں صوم و صلوٰۃ کا بہت پابند تھا، اور حسن ادب کا یہاں تک لحاظ رکھتا کہ بے وضو اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیتا،

حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کا شمار اکابر صوفیہ میں نہیں ہوتا، لیکن یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے کہ جب تک وہ زندہ رہے اکبر کو اپنے سایۂ عاطفت میں لیکر دیندار اور اسلامی عزت و ناموس کا نگہبان بنائے رکھا، اور اب یہ الزام کے طور پر کہا جاتا ہے کہ ایک صوفی نے تو اس کو صحیح راستہ پر لگائے رکھا لیکن علماء کے ایک گروہ نے اس کو اسلام سے بدظن کر کے ایک غلط راستہ پر لگا دیا، جہانگیر کو حضرت سلیم چشتیؒ سے مستفیض ہونے کا موقع نہیں ملا کیونکہ اس کے بچپن ہی میں ان کا وصال ہو گیا تھا، لیکن وہ ان کی صاحبزادی کی گود میں پلا جنھوں نے اس کو دودھ بھی پلایا، اور وہ ان ہی کو اپنی ماں تصور کرتا رہا، اسی لیے اس کو اپنی ماں مریم زمانی سے کم لگاؤ رہا، اس کی رضاعی ماں کا انتقال اس کے آٹھویں سال جلوس میں ہوا تو ان کے جنازے کو اپنے کاندھے پر اٹھا کر کچھ دور لے گیا، اور خود اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ کئی روز تک ان کی جدائی کے غم میں کھانے پینے اور کپڑے بدلنے کی خواہش نہیں ہوئی، اس کے بچپن کا ماحول

مذہبی تھا، اس لیے اکبر کی بے راہ روی کے باوجود اس میں اسلامی غیرت و حمیت کا بڑا جذبہ رہا، اسی لئے آخر میں وہ حضرت مجدد الف ثانی کا بھی معتقد ہو گیا، اور ان کی ایمانی حرارت اور جہانگیر کی مذہبی غیرت کے تعاون سے اسلام کی شمع جو اکبر کے دور میں زرد پڑ چکی تھی، پھر سے منور ہو گئی، خود شاہ جہاں کی مذہبیت حضرت مجدد الف ثانی کے فیوض کا نتیجہ تھی، کیونکہ وہ بچپن ہی میں ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گیا تھا، اور عالمگیر تو مجددی تحریک کا سب سے بڑا علمبردار ہی بن گیا تھا،

صوفیۂ کرام کی تلقین کسی بادشاہ وقت کا محض مذہبی ہونا اس کے اچھے حکمراں ہونے کی دلیل نہیں، مذہبی ہونے کے ساتھ اس میں حکمرانی کے تمام اوصاف بھی موجود ہوں، تو وہ پھر ایک قابل قدر حکمراں ہے، اسی لیے صوفیہ کرام نے سلاطین کی تعلیم و تربیت اپنے عام مریدوں سے مختلف انداز میں کی، اور خلق اللہ کی حاجت برآری اور عام عدل پروری پر زیادہ زور دیا، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی عام تعلیم تھی کہ حاجتمندوں کی مدد کرنے والا اللہ کا دوست ہے، اگر کوئی شخص اوراد و وظائف میں مشغول ہو، اور کوئی حاجت مند آجائے تو لازم ہے کہ وہ اوراد و وظائف کو چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو، اور اپنے مقدور کے مطابق اس کی حاجت پوری کرے، حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ سلطان التمش کو برابر رعایا، فقیروں، غریبوں اور درویشوں کے ساتھ دوستی کی تلقین فرماتے رہے، حضرت فرید الدین گنج شکرؒ بھی مظلوموں کی حمایت کی تلقین کرتے رہے، اجودھن کے ایک عامل کو شکایت تھی کہ وہاں کا والی اس پر مہربان نہیں ہے، حضرت فرید الدین گنج شکرؒ نے اس کی سفارش والی سے کی، لیکن والی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی، حضرت گنج شکر نے عامل سے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح میں نے تمھاری سفارش والی سے کی اور اس نے نہ سنی، اسی طرح تم سے بھی کسی نے کسی مظلوم کی سفارش کی ہو گی اور تم نے نہ سنی ہو گی، یہ سن کر عامل متاثر ہوا، اور ظلم کرنے سے توبہ کی، حضرت نظام الدین اولیاءؒ صوم دہر کے باوجود افطار میں کوئی چیز چکھ لیتے، اس کے بعد سحری میں کچھ کھاتے اور

اکثر ایسا بھی ہوتا کہ اس وقت کچھ نہ کھاتے، خادم عرض کرتا کہ اگر آپ اس وقت میں کچھ نہ تناول فرمائیں گے تو کمزوری آجائے گی، قوت برقرار نہ رہے گی، یہ سن کر روتے اور فرماتے کہ بھوکوں مسکینوں اور درویشوں کے فاقہ کو سوچتا ہوں تو حلق سے کھانا نیچے نہیں اترتا، پھر ایک اور موقع پر فرمایا کہ جو شخص اپنا غم والم بیان کرتا ہے تو اس کو سنکر میرا رنج وغم دو چند ہو جاتا ہے۔ معلوم نہیں وہ لوگ کیسے ہیں جو دوسروں کے غم والم کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور آہ نہ کریں۔ ان پر بڑا تعجب ہے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے کسی سلطان وقت سے تعلق تو نہیں رکھا، لیکن خلق اللہ کے ساتھ ان کی غمخواری کا اثر خواص وعوام دونوں پر رہا،

شمس سراج عفیف نے تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ سلطان فیروز شاہ تغلق جب تخت نشین ہوا تو حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ نے سلطان کو پیغام دیا کہ آپ وعدہ کریں کہ خلق اللہ کے ساتھ عدل وانصاف کریں گے، ورنہ ان بیکس بندوں کے لیے اللہ تبارک تعالیٰ سے دوسرا فرمانروا طلب کیا جائے۔ سلطان نے جواب میں کہلا بھیجا کہ میں خداوند تعالیٰ کے بندوں سے حلم وبردباری کے ساتھ پیش آؤں گا، اور ان پر انصاف ومحبت سے حکومت کروں گا، حضرت شیخ نے یہ جواب سنا تو کہلایا کہ اگر آپ خلق اللہ کے ساتھ خلق ومروت سے پیش آئیں گے تو ہم بھی اللہ تبارک وتعالیٰ سے آپ کے لیے چالیس سال کی حکومت کے لیے دعا کریں گے، اور آخر کار وہی ہوا جو شیخ نے فرمایا تھا۔

حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے بھی فیروز شاہ تغلق کو اپنے مکتوب میں عدل وانصاف کی تلقین کی، اور اس کو ایک حدیث لکھ کر بھیجی کہ جو کوئی مظلوم کی مدد کرتا ہے، خدائے تعالیٰ قیامت کے روز پل صراط کو عبور کرنے میں اس کی مدد کرے گا اور بہشت میں جگہ دے گا، اور جو کوئی مظلوم کو دیکھتا ہے اور وہ مظلوم اس سے فریاد کرتا ہے، لیکن وہ فریاد نہیں سنتا تو قبر کے اندر اس کو آگ کے سو کوڑے مارے جائیں گے، پھر ایک دوسری حدیث یہ بھی تحریر فرمائی کہ جو کوئی مظلوم کی مدد کرتا

اس کے لیے ستر مغفرت لکھی جاتی ہے، ان میں سے ایک تو اس کو دنیا میں مل جاتی ہے، اس سے اس کا
سدھر تا ہے اور بقیہ ہتر عقبیٰ میں ملتی ہے، ایک تیسری حدیث اس کو یہ بھی لکھی کہ پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا:
ساعت کا عدل ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے، ان کے ایک دوسرے مکتوب میں ہے کہ امرا
اصحاب منصب اور ارباب قدر و منزلت کے لیے اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچنے کا سب سے نزدیک راہ
یہ ہے کہ وہ عاجزوں کی دست گیری، اور حاجتمندوں کی حاجت روائی کریں، چنانچہ ایک بزرگ
فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں پہنچنے کی راہیں تو بہت ہیں لیکن سب سے نزدیک راہ دلوں کو راحت پہنچانا
ہے، ان بزرگ سے یہ کہا گیا کہ جس شہر کے وہ رہنے والے ہیں اس کا بادشاہ شب بیدار ہے، نفل
نمازیں بہت پڑھتا ہے، نفل روزے بھی رکھتا ہے، فرمایا بے چارے نے اپنے کام کو تو کھو دیا ہے
لیکن دوسروں کے کام میں لگا ہوا ہے، لوگوں نے ان بزرگ سے پوچھا کہ آخر اس بادشاہ کا اپنا
کام کیا ہے، تو فرمایا کہ اس کا کام تو یہ ہے کہ طرح طرح کے کھانے پکوائے اور بھوکوں کو پیٹ بھر کر کھلائے
طرح طرح کے کپڑے سلوائے، اور ننگوں کو پہنوائے، اجڑے ہوئے دلوں کو آباد کرے، حاجتمندوں
کی دست گیری کرے نفل نمازیں پڑھنا اور نفل روزے رکھنا تو درویشوں کا کام ہے،

حضرت اشرف جہانگیر سمنانی خود ایک مملکت کے حکمراں رہ چکے تھے اس لیے اپنی درویشی کے
زمانے میں حکمراں طبقہ کو برابر نصیحتوں سے مستفید کرتے رہے، ایک ملفوظ میں تو فرمایا کہ جہانداری
اور شہریاری کو چار چیزوں سے نقصان پہنچتا ہے (۱) سلاطین کا لذائذ دنیا میں مستغرق ہو جانا (۲)
مقربین کے ساتھ بدخلقی سے پیش آنا (۳) سزا دینے میں زیادتی کرنا (۴) رعیت پر ظلم کرنا، اور پھر دوسرے
ملفوظات میں بتایا کہ بادشاہ اپنے وقت کو اس طرح ترتیب دیں کہ صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد اشراق
تک وظیفہ پڑھیں، پھر علماء و صلحاء کے ساتھ صحبت رکھیں، اور چاشت کے وقت تک ان سے عدل
انصاف کے متعلق قرآنی آیتوں کے مطالب پوچھیں، اسی جگہ وزیروں اور ندیموں کو بلائیں اور ان

فوجوں کے جو معروضات پیش کریں ان کا مناسب جواب دیں۔ ہر شخص کے مدعا کو پورا کریں۔ اس کے عہد میں بار عام ہو جس میں رعایا اور مسلمانوں کے قضایا اور دعاوی پیش ہوں، اور شریعت کے مطابق انصاف کے ساتھ فیصلہ ہو۔ ..... عدل و انصاف کے اصول میں ایک نقطہ سے بھی انحراف نہ کریں، تاکہ سلطنت میں خلل واقع نہ ہو،

حضرت خواجہ گیسو درازؒ اپنی تصنیف خاتمہ میں فرماتے ہیں کہ اگر کوئی بادشاہ راہ سلوک میں گامزن ہو تو سلطان ابراہیم ادہم، معاویہ ثانی اور عبد اللہ ابن زبیرؓ بن سکتا ہے لیکن اگر کوئی بادشاہی کے لیے موزوں ہو تو پھر اسی فرض کو انجام دے، سلوک کی طرف مائل نہ ہو، اور حکومت میں ایسے متدین اور صالح لوگوں کو عہدہ دار مقرر کرے کہ جو شرعی احکام کو نافذ کر سکیں اور فقیروں، کمزوروں، یتیموں، عاجزوں، لنگڑوں، گونگوں، بیواؤں کی پوری خبر گیری کریں، ان کو برباد ہونے سے بچا لینے سے زیادہ کوئی مشکل کام نہیں،

حضرت عبد القدوس گنگوہیؒ نے سکندر لودی کو ایک مکتوب میں یہ لکھ بھیجا کہ ایک ساعت کا عدل ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر اور افضل تر ہے، اور پھر اس کو ایک حدیث بھی لکھ بھیجی کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے محبوب شخص انصاف پسند امام ہوگا، اس لیے کہ اس کے عدل کی منفعت اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق کے لیے تھی، پس وہ شخص ان سات آدمیوں میں سے ایک آدمی ہوگا جن کو اللہ تعالیٰ اپنے عرش کے سایہ میں رکھے گا، اس دن اس سایہ کے علاوہ کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا، بابر کی حکومت قائم ہوئی تو حضرت عبد القدوس گنگوہیؒ نے اس کو بھی ایک مکتوب میں تحریر فرمایا کہ عالی ظرف لوگ دنیا کو آخرت کی ایک کھیتی سمجھتے ہیں، اور جو کچھ دنیا میں کرتے ہیں خدا ہی کے لیے کرتے ہیں، اللہ کے حکم کی تعظیم خلق اللہ کی شفقت سے وابستہ ہے، اور اسی پر عمل کرنے سے ابدی فلاح حاصل ہوتی ہے۔ آپ کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کرنے کی خاطر لوگوں کے سروں پر عدل کا سایہ اس طرح

قائم کریں کہ کوئی شخص بھی کسی پر ظلم نہ کرے، حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ نے ہمایوں کو بھی اسی قسم کی تلقین کی۔

عدل پرور سلاطین | خدمت خلق اللہ اور عدل پروری کی موثر تعلیم اسلام نے دے رکھی ہے، مملوک سلاطین کی حکومت دہلی میں قائم ہوئی تو ان کے سامنے غزنوی اور غوری دربار کی عدل پروری کی روایات پہلے سے موجود تھیں، ہندوستان کے صوفیۂ کرام کی مزید تعلیم و تلقین نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا، اور شاید ہی کوئی فرمانروا ایسا گزرا ہو جو عدل پرور نہ رہا ہو، فخر مدبر کا بیان ہے کہ قطب الدین ایبک نے سخاوت میں حضرت ابوبکرؓ کی اور عدل میں حضرت عمرؓ کی تقلید کرنے کی کوشش کی، حضرت بختیار کاکی کے ملفوظات فوائد السالکین میں ہے کہ التمش کی طرف سے عام اجازت تھی کہ جو لوگ بھی فاقہ کرتے ہوں اس کے پاس لائے جائیں، اور جب وہ آتے تو ان میں سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ دیتا، اور ان کو قسمیں دیکر تلقین کرتا کہ جب ان کے پاس کھانے پینے کو کچھ نہ رہے یا ان پر کوئی ظلم کرے تو وہ یہاں آکر عدل و انصاف کی زنجیر جو باہر لٹکی ہوئی ہے، ہلائیں تاکہ وہ ان کے ساتھ انصاف کر سکے، ورنہ قیامت کے روز ان کی فریاد کا بار اس کی طاقت برداشت نہ کر سکے گی، غیاث الدین بلبن کے بارہ میں مولانا ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ وہ داد دہی اور انصاف پروری میں بھائیوں، لڑکوں اور مقربوں کا مطلق لحاظ نہ کرتا، اور جب تک مظلوم کے ساتھ انصاف نہ کر لیتا اس کے دل کو آرام نہ پہنچتا، انصاف کرتے وقت اس کی نظر اس پر نہ ہوتی کہ ظلم کرنے والا اس کا حامی و مددگار ہے، اس کے لڑکے، اعزہ مخصوصین، والی، اور مقطع اس کی عدل پروری سے واقف تھے، اس لیے کسی کی بھی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ کسی کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی کریں، اس کے عدل و انصاف کے قصے بہت مشہور ہیں، خود اس زمانہ کے ہندوؤں نے اس کی حکومت کو دل کھول کر سراہا ہے، ۱۳۳۳ء بکرمی مطابق ۱۲۷۶ء کا ایک سنسکرت کتبہ پالم میں ملا ہے جس میں لکھا ہے کہ بلبن کی سلطنت میں آسودہ حالی ہے، اس کی بڑی اور اچھی حکومت میں غور سے غزنہ اور ڈراوڑ سے راشیوردم تک ہر جگہ زمین پر بہار ہی بہار کی دل آویزی ہے، اس کی فوجوں نے ایسا امن و امان قائم کیا ہے جو ہر شخص کو

حاصل ہے، سلطان اپنی رعایا کی خبرگیری ایسی اچھی کرتا ہے کہ خود دشمن دنیا کی فکر میں آزاد ہو کر دوہ کے سمندر میں جاکر سو رہے ہیں، امیر خسرو علاء الدین خلجی کے بارہ میں خزائن الفتوح میں لکھتے ہیں کہ اس نے حضرت عمرؓ کے ایسا عدل قائم کر رکھا ہے اور عوام کے معاملات میں وہ المتنصر باللہ اور المستعصم بنا ہوا ہے، محمد بن تغلق کے بارہ میں سلاطین دہلی اور مغل بادشاہ کے دور کے مورخین لکھتے ہیں کہ وہ عدل فرازی کے سلسلہ میں مشائخ اور علماء کی بھی رورعایت نہ کرتا، وہ اگر مجرم ہوتے تو ان کو بھی بلا تامل سزائیں دیتا، مسالک الابصار میں ہے کہ سلطان ہفتہ میں ہر شنبہ کو دربار عام منعقد کرتا، اور اس کے افتتاح کے موقع پر ایک نقیب بلند آواز سے پکارتا کہ مظلومین اپنی فریاد سنائیں، اہل حاجت اپنی ضرورتیں پیش کریں، جس کو کوئی شکایت ہو یا جو حاجت مند ہو، وہ حاضر حضور ہو جائے، نقیب کے خاموش ہوتے ہی اہل غرض بلا تکلف سامنے آجاتے اور سامنے کھڑے ہو کر نہایت صفائی سے حالات بیان کرتے، اثنائے بیان میں کسی کو کسی کے روکنے کی مجال نہ تھی، تاریخ مبارک شاہی اور ملا عبد القادر بدایونی کی منتخب التواریخ دونوں میں ہے کہ سلطان نے اپنے شاہی محل کے اندر چار مفتی مامور کر رکھے تھے، جب کوئی فریادی آتا تو سلطان ان مفتیوں سے مشورے کرتا، اور ان کو تنبیہ کر رکھی تھی کہ اگر کوئی معصوم ان کے فیصلہ کی بدولت تہ تیغ ہوا تو اس کا خون ناحق ان کی گردن پر ہوگا، اس لیے مفتیوں سے کوئی فروگذاشت نہ ہوتی، موجودہ دور کے ہندو مورخین بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ فیروز شاہ کی حکومت عدل و انصاف کی حکومت تھی کسی شخص کو بھی دوسرے پر ظلم و تعدی کرنے کا حق نہ تھا، تمام ملک میں مکمل امن و سکون تھا، چیزوں کی فراوانی تھی، اعلیٰ و ادنیٰ ہر طبقہ کے لوگ مطمئن تھے، عام رعایا قانع اور دولت مند ہو گئی تھی،

سلاطین دہلی کی حکومت میں عدل پروری کی جو روایت قائم ہوئی، اس کو مغل بادشاہوں نے اور بھی شاندار طریقہ پر برقرار رکھا، بابر نے اپنی تزک میں خود لکھا ہے کہ اس کی فوج بھیرہ

سے گذر رہی تھی، تو اس کو معلوم ہوا کہ سپاہیوں نے بھیرہ والوں کو ستایا ہے، اور ان پر ہاتھ ڈالا ہے، تو فوراً ان سپاہیوں کو گرفتار کرکے بعض کو سزائے موت کا حکم دیا، اور بعض کی ناکیں کٹوا کر تشہیر کرایا۔

ابوالفضل کا بیان ہے کہ اکبر نے روزانہ ڈیڑھ پہر عدل و انصاف کے لیے مقرر کر رکھا تھا، جہانگیر اور بھی سخت تھا، وہ دو گھنٹے روزانہ عوام کی شکایتیں سنتا، اس نے تو اپنے محل میں ایک زنجیر لگا رکھی تھی، تاکہ ہر شخص کسی روک ٹوک کے بغیر براہ راست اس سے فریاد کر سکے۔ وہ سفر میں بھی ہوتا تو روزانہ تین گھنٹے بیٹھکر فریاد سنتا اور ظالموں کو سزا دیتا تھا، علالت کے زمانہ میں بھی اس کا یہ معمول جاری رہتا، اس نے اپنی تزک میں لکھا ہے:

ہر نگہبانی خلق خدا شب نکنم دیدہ بخواب آشنا
از پئے آسودگی جملہ تن رنج بستدم بہ تن خویشتن

وہ تو نورجہاں کو بھی ایک عورت کے شوہر کو ہلاک کرنے پر موت کی سزا دینے کے لیے تیار ہو گیا تھا، جیسا کہ مولانا شبلی کی نظم "عدل جہانگیری" سے ظاہر ہوگا۔

مغل بادشاہوں کا یہ دستور تھا کہ وہ دیوان عام میں عوام کی شکایتیں سنتے؛ جہاں ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی ان کے پاس آسانی سے پہنچ سکتا تھا، جو بھی چاہتا دربار عام کے سامنے حاضر ہو کر خود اپنا استغاثہ پیش کر دیتا، دربار کے عہدیدار اس کو لے کر بادشاہ کے سامنے پیش کر دیتے۔ بادشاہ اس کو پڑھوا کر سنتا، مدعی سے جرح کرتا اور پھر مناسب کارروائی کے لیے فیصلہ صادر کر دیتا، اگر مجرم کوئی بڑا عہدیدار یا شاہی خاندان کا بھی ہوتا تو اس کو سزائیں دینے میں تامل نہ کیا جاتا، شاہ جہاں نے گجرات کے ناظم حافظ محمد نصیر کو حبس دوام کی سزا اس لیے دی کہ وہاں کے تاجروں کے ساتھ وہ ظالمانہ طریقہ پر پیش آتا تھا۔ اسی طرح ایک بار بنگال کے ناظم فدائی خاں کو اس کے عہدہ سے برطرف محض اس لیے کر دیا کہ عوام اس کے شاکی تھے، اورنگ زیب کے ناقدین بھی اس پر یہ الزام نہیں رکھ سکتے کہ

وہ عدل پرور نہیں تھا، اس نے شاہ جہاں کو اس کی معزولی کے بعد ایک رقعہ میں لکھا کہ خداوند تعالی اسی کو کچھ عطا کرتا ہے جس میں رعایا کی حالت سدھارنے اور ان کی حفاظت کی صلاحیت ہوتی ہے، حکمرانی کے معنی لوگوں کی نگہبانی ہے، نہ کہ تن پروری اور عیاشی،

اور اسی عدل پروری کا نتیجہ تھا کہ جو سلاطین مذہبی ہوتے، انھوں نے جزیہ یا نئے مندر کے بننے اور نہ بننے کا سوال تو اٹھایا، لیکن یہاں کے غیر مسلموں پر اپنا مذہب زبردستی لادنے کی کوشش نہیں کی، وہ خود تو اسلام کے محافظ اور نگہبان ضرور رہے، اور مسلمانوں کو بھی اوامر ونواہی کی پابندی کرانے کی کوشش کی لیکن کبھی اپنی غیر مسلم رعایا کے مذہبی عقائد میں مداخلت نہیں کی، اور ان کی معاشرتی زندگی کو درہم برہم نہیں کیا، اکبر نے انسان دوستی کے جذبہ سے ستی کے رسم کو روکنے کی کوشش کی، کمسن بیواؤں کے رواج کو بھی ختم کر دینا چاہا، بچپن کی شادی کے خلاف بھی کچھ عملی کارروائی کی، لیکن اپنی ہمدردانہ خواہشوں کو کبھی تلوار کی نوک سے عمل میں نہیں لایا، بعض فرمانرواؤں پر جبری تبلیغ کا الزام عائد کیا جاتا ہے لیکن نئی تحقیقات سے یہ الزامات زیادہ تر بے بنیاد ثابت ہوئے ہیں، ہندو مورخین لکھتے ہیں کہ یو، پی چھ سو سال تک مسلمانوں کے زیرنگین رہا، لیکن یہاں مسلمان صرف چودہ فیصدی ہیں، اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندو مذہب محفوظ رہا، اور جبری اشاعت اسلام نہیں ہوئی، اور ہندوؤں کو زبوں حال نہیں بنایا گیا، تمام سلاطین اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ ان کا سیاسی مفاد اسی میں ہے کہ یہاں کے لوگوں کے مذہبی اور معاشرتی نظام میں مداخلت نہ کریں، اسی رواداری کے بغیر ان کی حکومت زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتی تھی، صوفیۂ کرام نے خدمت خلق اللہ اور عدل پروری کی جو تعلیم دی، اور خود یہاں کے غیر مسلموں کے ساتھ ان کا جو کریمانہ اور روادارانہ اخلاق رہا، اس سے سلاطین کو مزید تقویت پہنچی،

سلاطین کی مدح سرائی | اب تک سلاطین کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے، وہ ممکن ہے کہ محض جانبدارانہ

مدح سرائی سمجھی جائے اور انگریزوں اور ان کے ہمنوا مورخوں کی تاریخ پڑھنے والوں پر یہ گراں گذرے لیکن یہ لمحوظ رکھنا چاہیے کہ جن سلاطین کا ذکر اوپر کی سطروں میں کیا گیا ہے، وہ مسلمانوں کے دورِ عروج کے اچھے حکمراں تھے، اگر ان میں واقعی یہ خوبیاں نہ ہوتیں تو خون سے ہولی کھیلنے والے، ہتھیلی پر سر رکھ کر لڑنے والے، اپنے سینوں کو نوک شمشیر اور نوک سنان سے چھلنی کرنے والے راجپوتوں کی سرزمین میں ان کا اور ان کے ہم مذہبوں کا قدم جمنا آسان نہ تھا، اس لیے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلمانوں کی حکومت کے دورِ عروج میں زیادہ تر اچھے حکمراں گذرے۔

مملوک سلاطین میں آرام شاہ، رکن الدین فیروز شاہ، معزالدین بہرام شاہ، علاء الدین مسعود شاہ اور کیقباد جیسے بے جان حکمراں بھی گذرے لیکن اسی خاندان میں التمش کی نیک نفسی اور انتظامی کارکردگی، بلبن کے جاہ وجلال اور عدل گستری کی بدولت حکومت کو غیر معمولی قوت حاصل ہوئی، خلجی سلاطین کے عہد میں قطب الدین مبارک شاہ جیسا رند اور ناصر الدین خسرو جیسا مفسد حکمراں بھی ہوا لیکن ان کے عہد کی بےعنوانیاں اور کمزوریاں ان کے پیشرو سلطان علاء الدین خلجی کی نبرد آزمائی اور رعایا پروری سے دب کر رہ گئیں، انکے خاندان کو تو ان سے نقصان پہنچا لیکن حکومت برقرار رہی، غیاث الدین کی مردانگی اور فرزانگی، محمد بن تغلق کی بلند حوصلگی اور اولوالعزمی اور فیروز شاہ کی غیر معمولی رحمدلی اور رعیت نوازی سے جو قوت بنی اس کے سہارے ان کے کمزور جانشین کچھ عرصہ تک حکومت کرتے رہے، ابراہیم لودی کو اپنی کمزوریوں کا نتیجہ بھگتنا پڑا، ان میں سے اچھے سلاطین کی اچھائیوں کا ذکر کرنے میں جس طرح منہاج سراج (مولف طبقات ناصری) مولانا ضیاء الدین برنی (صاحب تاریخ فیروز شاہی) اور شمس سراج عفیف (کاتب تاریخ فیروز شاہی) نے فیاضی سے کام لیا ہے، اسی طرح موجودہ دور کے ہندو مورخین میں کے، ایس لعل نے اپنی تاریخ ہسٹری آف دی خلجیز، ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے ہسٹری آف قرونہ ٹرکس، اور ڈاکٹر ایشور ٹوپا نے پولٹکس ان پری مغل ٹائمس میں قابلِ قدر

سلاطین کی خوبیاں بیان کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا ہے،

مغل خاندان کے پہلے چھ بادشاہوں کے حربی، سیاسی، اقتصادی اور تمدنی کارنامے اتنے شاندار ہیں کہ اس خاندان کے آخری ۱۳ نااہل اور نالائق حکمراں ان ہی شاندار کارناموں کی بدولت ڈیڑھ سو برس تک تخت و تاج کے مالک بنے رہے، اور جس طرح نظام الدین بخشی نے طبقات اکبری، ابوالفضل نے اکبر نامہ، مستعد خاں نے اقبال نامہ جہانگیری، ملا عبدالحمید لاہوری نے بادشاہ نامہ لکھ کر مغل بادشاہوں کے قابل قدر حکمرانوں کی مدح سرائی کی ہے، اسی طرح موجودہ دور کے ہندو مورخوں میں ڈاکٹر رام پرشاد ترپاٹھی نے رائیز آف دی مغل امپائر، ڈاکٹر بینی پرشاد نے ہسٹری آف جہانگیر اور بنارسی پرشاد نے ہسٹری آف شاہ جہاں لکھ کر اپنے اپنے نقطۂ نظر سے ان حکمرانوں کو خراج تحسین ادا کیا ہے، البتہ عالمگیر کی تعریف و توصیف میں جس طرح عالمگیر نامہ کے مصنف کاظم شیرازی کا قلم چلا ہے، اس طرح سرجدو ناتھ سرکار کا نہیں چل سکا ہے، لیکن اس بادشاہ کے عظیم المرتبت ہونے کی یہ دلیل کافی ہے کہ سرجدو ناتھ سرکار جیسے ذہین مورخ نے اس بادشاہ کی تاریخ لکھنے میں بیس برس کی مدت گذاری اور بڑی کد و کاوش کے بعد اس کی تاریخ پانچ جلدوں میں مرتب کی، آج تک کسی "نااہل بادشاہ" کی تاریخ اتنی جلدوں میں نہیں لکھی گئی۔

مغل خاندان کے پہلے چھ حکمرانوں کی تاریخ لکھنے میں مورخین کے قلم میں جو رنگینی اور توانائی پائی جاتی ہے، وہ ان کے جانشینوں کے عہد کے مورخوں میں نہیں پائی جاتی ہے۔ اس لیے اچھے سلاطین کا مطالعہ خواہ کتنے ہی تعصب کے ساتھ کیا جائے، اچھے ہی رہیں گے، اس لیے ان کی اچھائیوں کے ذکر میں قلم خواہ مخواہ رقص کرنے لگتا ہے۔

اچھی معاشرت اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کے دور عروج میں بھی سلاطین جانشینی کی لڑائیوں میں ایک دوسرے کا خون بہاتے رہے، بعض شہزادے قتل کیے گئے، بعض کی آنکھوں

میں سلائیاں پھیری گئیں، بعض قید خانے میں ایڑیاں رگڑتے رہے، اسی طرح امراء میں بھی باہمی رقابت رہی، سازشوں کے ذریعہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہے، ان کی وجہ سے جا بجا بغاوتیں بھی ہوتی رہیں، جن سے کبھی حکومت کی مرکزیت خطرے میں پڑ جاتی، لیکن ان بدعنوانیوں کے باوجود مجموعی حیثیت سے مسلمانوں کی معاشرت کا سانچہ اور ڈھانچہ بہت زیادہ بگڑنے کے بجائے بنیادی طور پر مضبوط اور مستحکم رہا، اسی لیے اچھی معاشرت کی بدولت اچھے سلاطین پیدا ہوتے رہے، جو برے حکمرانوں کی لائی ہوئی برائیوں کا کفارہ بن جاتے۔

اچھی معاشرت کے معمار صوفیۂ کرام اور یہ حقیقت ہے کہ اچھی معاشرت اچھے صلحاء اور صوفیہ کے طفیل میں ہی بنتی رہی۔

اکابر صوفیہ انابت، عبادت اور ریاضت شاقہ کے بعد تمکین و تلوین، مجاہدہ و مشاہدہ کی منزلیں طے کرکے اور عالم ملکوت و جبروت و لاہوت کی دولت سمیٹ کر کے خانقاہوں میں رشد و ہدایت کے لیے بیٹھ جاتے تو ان کی ذات تجلی ربانی و روحانی کی ایک شمع بن جاتی، اور لوگ پروانہ وار ان کے ارد گرد جمع ہو جاتے، اور وہ لوگوں کے اخلاق و سیرت کو اپنے اعلیٰ کردار کے عملی نمونے سے سنوارنے کی کوشش کرتے، اور یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلمانوں کے اعلیٰ اخلاق کی تعلیم کا مرکز علماء کا حلقۂ درس و تدریس یا ان کا مسکن نہیں رہا اور نہ سلاطین کے درباروں میں اس کے جلوے دکھائی دیے، بلکہ مسلمانوں کے اخلاق حمیدہ کی تعلیم صوفیۂ کرام کی خانقاہوں ہی میں ہوئی، اور جب یہاں کے غیر مسلم باشندے مسلمان حکمرانوں کی تلوار کو اسلام کی تلوار سمجھ کر اسلام سے آزردہ اور خوف زدہ ہو رہے تھے تو ان فقر و فاقہ والے بزرگوں کے تزکیۂ باطن اور تہذیب نفس کو دیکھ کر ان کے دلوں پر اسلام کی سچی عظمت اور شوکت قائم ہوئی،

کرامات ان بزرگان دین کے حالات زندگی ایسے لکھے نہیں گئے جیسے ہونے چاہئیں، اور جو حالات ان کے معاصر تذکروں میں لکھے گئے ان کو پڑھ کر آجکل کے کچھ لوگوں کو ان کی زندگی صرف کرامتوں میں گھری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان سے کرامتیں صادر ہوتی رہیں، ہندوستان کے سریع الاعتقاد لوگ سادھوؤں، رشیوں اور منیوں کے خوارق عادات سے کچھ ایسے متاثر تھے کہ ان بزرگوں کو بھی کرامتوں کے ذریعہ سے تسخیر قلوب کرنا پڑا لیکن ان کے یہاں اظہار کرامت کوئی اہم چیز نہیں، چشتیہ سلسلہ میں راہ سلوک کے پندرہ درجے مقرر ہیں، ان میں پانچواں درجہ کشف و کرامات کا ہے، اس درجے کے حاصل ہونے کے بعد سالک کشف و کرامت کے ذریعہ سے اپنی ذات کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے، تو اس کے اظہار سے وہ بقیہ درجات سے محروم ہو جاتا ہے، اسی لیے حضرت بابا گنج شکر نے خواجگان چشت کے مسلک کے مطابق صوفی کو کشف و کرامت کے اظہار سے منع کیا ہے، اور فرماتے ہیں کہ اس کا اظہار کرنا پست حوصلہ والوں کا کام ہے، اس سے نفس میں تکبر پیدا ہوتا ہے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیا نے بھی کرامت کے اظہار کی ممانعت سختی سے کی ہے، اور اپنے ملفوظات میں یہ بیان کیا ہے کہ ایک بار خواجہ ابو الحسن نوائی دجلہ کے کنارے پہنچے، تو دیکھا کہ ایک ماہی گیر دریا میں جال ڈال رہا ہے، خواجہ ابو الحسن نوائی نے ماہی گیر کو مخاطب کرکے فرمایا کہ اگر میں صاحب ولایت و کرامت ہوں گا تو تمھارے جال میں میرے کہنے سے ڈھائی من وزن کی ایک مچھلی پھنسے گی اور مچھلی ٹھیک اسی وزن کی ہوگی، نہ کم نہ زیادہ، ان کے کہنے کے مطابق واقعی اس وزن کی مچھلی پھنس گئی، اس کی خبر شیخ جنید قدس سرہ کو ہوئی تو انھوں نے فرمایا، کاش اس جال میں ایک مارسیاہ پھنستا اور ابو الحسن کو کاٹ لیتا کہ وہ ہلاک ہو جاتے، لوگوں نے پوچھا کہ آپ ایسا کیوں فرماتے ہیں، جواب دیا کہ اگر سانپ ان کو کاٹ لیتا تو وہ شہید ہو جاتے، لیکن

اپنی کرامت کے بعد زندہ رہے تو یہ دیکھنا پڑے گا کہ ان کا خاتمہ کس طرح ہوا،

اصلی کرامت | ان بزرگانِ دین کی اصلی کرامت ان کی نفس کشی تھی، ان کا قول تھا کہ دریا کی سطح پر چلنا، آگ میں کود کر زندہ نکل آنا، پہاڑ کو ناخن سے کھود کھود کر گرا دینا آسان ہے لیکن نفس کو قابو میں رکھنا آسان نہیں، اسی لیے وہ نفس کشی کے لیے ہر قسم کا مجاہدہ کرتے، حضرت خواجہ معین الدینؒ رات کو کم سوتے اور بالعموم عشاء کے وضوء سے فجر کی نماز ادا کرتے، عبرت حاصل کرنے کے لیے قبرستان میں قیام فرماتے، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ بیس برس تک رات کو اطمینان سے نہ سوئے اور نہ زمین سے پیٹھ لگائی، حضرت بابا گنج شکرؒ عالم تفکر میں ایک عرصۂ دراز تک کھڑے رہے مطلق نہ بیٹھے، ان کے پاؤں سوج گئے تھے، اور ان سے خون بہتا تھا، اس درمیان میں ان کو یاد نہیں کہ انھوں نے کچھ کھایا ہو، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ صائم الدہر رہے، صرف افطار اور سحری کے وقت آدھی یا زیادہ سے زیادہ ایک روٹی سبزی یا تلخ کریلہ کے ساتھ کھاتے، لیکن کبھی کسی لقمہ میں لذت محسوس ہوتی تو اس کو منہ سے نکال کر دسترخوان پر ڈال دیتے، تاکہ کام و دہن لذت آشنا نہ ہونے پائیں، اسی لیے ان کے دسترخوان سے ادھ چبے نوالے بھی پائے جاتے، وہ تمام رات عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے، اور ان پر غیر معمولی کیف و مستی اور بیخودی و وارفتگی طاری رہتی، صبح ہوتی تو شغل باطن سے آنکھیں سرخ رہتیں، حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ اپنی ابتدائی ریاضت کے زمانے میں کھانے پینے سے پرہیز کرتے، جب کبھی ان پر اشتہا کا غلبہ ہوتا تو درخت کی پتیاں کھا کر بھوک کی شدت رفع کر لیتے، حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ اپنے مجاہدے میں دس دس روز تک کچھ نہ کھاتے، اور جب خواہشات کا غلبہ ہوتا تو لیموں کا عرق پی لیتے،

ان بزرگوں کے یہاں فقر و فاقہ کی بڑی اہمیت تھی، ان کا خیال تھا کہ فقر و فاقہ سے نفس

میں فتادگی اور دل میں عاجزی پیدا ہوتی ہے۔ اگرچہ بھوک سے جسم بلا میں مبتلا ہو جاتا ہے لیکن دل کو روشنی اور جان کو صفائی حاصل ہوتی ہے۔ کھانے سے گناہوں کا مادہ بڑھتا ہے، اور فاقہ سے سب اطاعتوں کی اصل ملتی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر اسی سے نفس کشی ہوتی ہے،

اس نفس کشی کے ذریعہ سے صوفیہ کوشش کرتے کہ ان میں حضرت آدمؑ کی توبہ، حضرت ادریسؑ کی عبادت، حضرت عیسیٰؑ کا زہد، حضرت ایوبؑ کی رضا، حضرت یعقوبؑ کی قناعت، حضرت یونسؑ کا مجاہدہ، حضرت یوسفؑ کا صدق، حضرت شعیبؑ کا تفکر، حضرت نوحؑ کا اخلاص، حضرت ابراہیمؑ کا شکر، اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پیدا ہو جائے،

اور جب ان کو یہ چیزیں حاصل ہو جاتیں تو وہ رشد و ہدایت کی مسند پر جلوہ افروز ہوتے، اور ایک طرف سلاطین کا تخت و تاج ہوتا تو دوسری طرف ان کی فقیری کے جلوہ ہائے صد رنگ ہوتے۔ بادشاہوں کے درباروں میں جاہ و حشمت، دولت، ثروت اور رتبہ ملتا لیکن ان فقیروں کے درباروں میں توحید، ایمان، طہارت، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، تواضع، اخلاص، قناعت، صدق و صفا، محبت رسول، خدمت خلق اللہ، حلم و عفو، حقوق ہمسایہ، محبت و مودت وغیرہ کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم ملتی رہی،

سلاطین اور صوفیہ کی زندگی کا تفاوت دونوں اپنے اپنے حلقے کے حکمراں تھے لیکن ان دنیاوی اور روحانی حکمرانوں کی زندگی میں بڑا تفاوت تھا، سلاطین کے لباس و پوشاک میں بڑی نمائش ہوتی، ان کے تاج، قبا اور پٹکے میں موتی اس طرح آویزاں ہوتے کہ پٹکے کی چمک کمر تک، قبا کی گلے تک اور تاج کی سر تک ہوتی، ان کی بعض پوشاک میں جو ٹرے جوڑے زردوزی کا کام ہوتا، گلے پر جو کام کیا جاتا وہ جواہرات سے سجایا جاتا اور اس میں یاقوت اور ہیرے ٹانکے جاتے، اور بعض لباس میں اس قدر جواہرات ٹکے ہوتے تھے کہ کپڑے کا رنگ نظر نہیں آتا تھا۔

سلطان غیاث الدین بلبن کے دربار میں منقش فرش بچھایا جاتا، زربفت کے پردے لٹکائے جاتے، چاندی اور سونے کے برتن رکھے جاتے، جن میں میوے، شربت اور پان رکھ کر اہل مجلس کی تواضع کی جاتی تھی، سلطان معزالدین کیقباد نے ایک سال جشن نوروز منایا تو اس موقع پر زربفت، اطلس، یاقوت، زری کے کام اور دوسرے قیمتی کپڑوں کی نمایش سے دربار کو جنت بنادیا، جمنا کے بیچ میں زروجواہر سے ایک مصنوعی چمن بنایا گیا تھا، محل کے درودیوار اور فرش وفروش سونے اور موتیوں سے ایسے آراستہ کیے گئے تھے کہ فردوس بریں کا دھوکا ہوتا تھا، مسالک الابصار کے مصنف کا بیان ہے کہ جو شان وشوکت، جاہ وجلال اور کروفر سکندر ذوالقرنین اور ملک شاہ بن الپ ارسلان کے دربار میں تھا، وہی محمد بن تغلق کے دربار میں نظر آتا تھا،

لیکن ان بادشاہوں کے اسی دارالسلطنت میں اکابر صوفیہ کی خانقاہوں میں بوریا کے سوا کچھ نہ تھا، ان کے کپڑے پھٹ جاتے تو پیوند لگادیتے، بعض اوقات ناداری کی وجہ سے پیوند بھی نہیں لگا سکتے تھے، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے فقیرانہ لباس میں دوہرا بخیہ ہوتا تھا، اگر وہ پھٹ جاتا تو جس رنگ کا کپڑا مل جاتا اسی کا پیوند لگالیا کرتے تھے، اسی پر ان کے سلسلہ کے تمام بزرگوں کا عمل رہا، حضرت فریدالدین گنج شکرؒ کے کپڑے پھٹ جاتے تو بھی علیٰحدہ نہ کرتے تھے، ایک بار کرتہ بہت ہی بوسیدہ ہوگیا تھا، ایک شخص نے نیا کرتہ نذر کیا، کرتہ پہن تو لیا، لیکن فرمایا جو ذوق مجھکو اس پرانے کرتہ میں حاصل تھا، اس نئے کرتہ میں نہیں ہے، جس کمبل پر دن کو بیٹھتے، اسی کو رات کے وقت اپنا بستر استراحت بناتے، حضرت نصیرالدین چراغ دہلویؒ کے ملفوظات میں ہے کہ کوئی دنیادار ان سے ملنے آتا تو وہ شیخ کا جبہ پہنکر بیٹھ جاتے، اور جب وہ چلا جاتا تو گھاڑے کا لباس پہن لیتے، شیخ کا جبہ پہنکر لوگوں سے اپنے فقر کو پوشیدہ رکھتے تھے،

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے مشہور خلیفہ حضرت برہان الدین غریبؒ بڑے نحیف و نحنی تھے، مرشد سے تعلیم و تربیت پانے کے زمانے میں ایک بار انکے دونوں زانوؤں میں درد رہنے لگا تھا، اسلئے کمبل کو دوتہ کرکے اس پر بیٹھتے تھے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کو اس کی خبر ہوئی تو ان کی یہ تن آسانی ان کو پسند نہ آئی، اور جب حضرت برہان الدین غریبؒ حضرت خواجہ کی خانقاہ میں آکر جماعت خانہ میں آئے تو حضرت خواجہ نے کہلا بھیجا کہ وہ جماعت خانہ میں نہ بیٹھیں، حضرت برہان الدینؒ غریبؒ گھر جاکر سوگ میں بیٹھ گئے، اور برابر روتے رہتے، ان کی تعزیت کے لیے لوگ آتے تو ان کے ساتھ وہ بھی روتے، بالآخر حضرت امیر خسرو بیچ میں پڑے، اور وہ حضرت برہان الدین غریبؒ کو ان کی دستار ان کی گردن میں ڈال کر حضرت خواجہ کے پاس لے گئے تو انھوں نے تقصیر معاف کی اور تجدید بیعت سے مشرف کیا،

اس زمانہ میں محل میں کوئی دعوت ہوتی تو دسترخوان پر ایک ہزار سے زیادہ قسموں کے کھانے ہوتے، شربت قند کے سینکڑوں پیالے رکھے رہتے، منہ کا مزہ بدلنے کے لیے شربت گلاب بھی ہوتا، انواع و اقسام کے حلوے ہوتے، روٹیوں میں نان تنک، کاک اور سنبوسے وغیرہ کی کئی قسمیں ہوتیں، پلاؤ کے بھی کئی اقسام ہوتے، کسی میں گوشت، کسی میں خرمہ اور کسی میں انگور پڑا ہوتا، بکرے، دنبے، بٹیر، تیتر، تیہو اور چرزے کے قورمے اور کباب ہوتے، کھانے کے بعد نبیذ کا بھی دور چلتا، لیکن معاصر اکابر صوفیہ کے گھروں اور خانقاہوں میں ان مادی آلائشوں کے بجائے فقر و فاقہ، تنگی، عسرت اور ناداری کے سوا کچھ نہ ہوتا، سلطان شمس الدین التمش کے مرشد حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے گھر میں برابر فاقہ رہتا، جب کئی فاقوں کی نوبت آجاتی تو انکی حرم محترم پڑوس کے بقال کی بیوی سے ایک ٹنکہ یا ایک بہلول قرض لیکر خورد و نوش کا انتظام کرتیں جب کہیں سے کچھ میسر ہوتا تھا تو قرض ادا کردیا جاتا تھا،

(باقی)

شاہ محمد غوث گوالیاریؒ

از جناب پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب ایم اے

(۲)

قیام گوالیار شاہ محمد غوث گوالیاری نے اپنے شیخ طریقت حاجی حمید الدین حضور (متوفی ۹۳۰ھ / ۱۵۲۲ء) سے مستقل قیام کے لیے استفسار کیا تو موصوف نے فرمایا: "کل جہاں تمھارا ہے، جہاں مزاج چاہے رہو، اس میں تم کو اختیار دیا گیا ہے[۱]۔"

سید فضل علی شاہ نے کلیات گوالیار میں لکھا ہے:-

"در آں وقت حضرت شیخ محمد غوث قدس اللہ سرہ العزیز کہ از اکابر و عظام بزرگار بودند در قلعہ بر قلوب تصرفے تمام داشت و از غازی پور پٹنہ کہ متوطن و مسکن حضرت شیخ مذکور بود بمقتضائے حکم مرشد حضرت بابا حضور شاہ ظہور الحق و الدین قدس اللہ سرہ العزیز مفارقت گرفتند و بگوالیار رسیدند[۲]۔"

لیکن جواہر خمسہ (۹۲۹ھ) کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوہستان چنار میں زمانۂ ریاضت ہی میں قلعۂ گوالیار میں قیام کا اشارہ ہو گیا تھا، چنانچہ شاہ محمد غوث تحریر فرماتے ہیں:

"این درویش سیزدہ سال و ہفت ماہ در کوہستان چنار بعنوان مسطور ریاضت کشید

---

۱ فضل اللہ شطاری: مناقب غوثیہ (اردو) مطبوعہ آگرہ، ۱۹۳۳ء ص ۳۲

۲ قاضی معراج الدین وصول پوری: مضمون مطبوعہ روزنامہ نوروز، کراچی، ۲۴ دسمبر ۱۹۶۱ء ص ۲

بعد ذالک از پردۂ غیب لاریب ندائے رسید کہ ازیں کوہستان بدر شو و در قلعۂ گوالیار برو...... آن حکم بجا آوردیم[۱]"

قلعۂ گوالیار میں قیام کے یہ تو باطنی اسباب تھے لیکن چند ظاہری اسباب بھی تھے، جن پر قاضی معراج الدین دھولپوری نے روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ممدوح کے قلعۂ گوالیار پر قیام فرمانے کا سبب یہ تھا کہ اس زمانہ میں سادات اور شرفاء کے قدیم خاندان قلعہ پر ہی رہا کرتے تھے، باہر جس جگہ اب گوالیار کی بستی ہے وہاں مسلمانوں کی آبادی نہیں تھی، رفتہ رفتہ ان کا قبضہ قلعۂ گوالیار پر ہوا تھا، اور جیسے جیسے اقتدار بڑھتا جارہا تھا ویسے ویسے مسلمان فضلاء، وکملاء اور روحانی بزرگ باہر سے آآکر یہاں آباد ہوتے جارہے تھے، یہ وہ وقت تھا جب حضرت شاہ محمد غوث قدس سرہٗ کو نہ کوئی جاگیر ملی تھی اور نہ آپ کی جانب سے انتظام مہمانداری کوئی تھا[۲]"

بہرحال شاہ محمد غوث گوالیار تشریف لائے اور یہاں رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری کیا، صاحب مناقب غوثیہ لکھتے ہیں:۔

"الغرض جب حضرت غوث اللہ، حضرت پیر جہاں (حاجی حمید الدین حضور) کی درگاہ سے رخصت ہوکر گوالیر پہنچے اور وہاں اقامت کی تو بانگ درویشی وصدائے عظمت ولایت موروثی عالم میں پھیلی، عالم عالمیاں، ملوک وسلاطین وقت مطیع و منقاد ہوئے، مگر آپ کا یہ حال تھا کہ کوئی شخص مجلس عالی میں دنیا کا نام نہ لے سکتا تھا[۳]"

گوالیار میں کچھ عرصہ قیام کیا تھا کہ مرض خیارک میں مبتلا ہو گئے، اور چھ مہینہ تک صاحب فراش

---

[۱] محمد غوث گوالیاری: جواہر خمسہ فارسی (قلمی) ۸ صفر المظفر ۱۱۳۰ھ، مکتوبہ محمد واصل بیگ قادری
[۲] قاضی معراج الدین دھولپوری، مضمون مطبوعہ روزنامہ "نوروز" کراچی ۱۴ دسمبر ۱۹۶۱ء [۳] مناقب غوثیہ (اردو) ص ۴۴

رہے، جب اس مرض سے صحت پائی تو قاضی رکن الدین اور قاضی خدا بخش کی وساطت سے اپنے شیخ طریقت حضرت حاجی حمید الدین حضور کی خدمت میں عریضہ ارسال کیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ادھر یہ حضرات پیام لے کر چلے اور ادھر حاجی حمید الدین نے شیخ سکندر سے فرمایا:

"آج مجھ کو اطلاع ہوئی ہے کہ اس عالم دون سفلی سے عالم عقبیٰ میں آؤں اور دار فنا سے دار بقا کا سفر اختیار کروں، میں نے جواب دیا کہ چار روز کے بعد آؤں گا، کیونکہ بندگی میاں غوث کے آدمی راستے میں ہیں، جب وہ آجائیں گے تو صاحب مقام کو دستار عطا کرکے اس عالم سے اس عالم میں آؤں گا۔" (مناقب غوثیہ اردو ص ۶۵)

اس لیے جب قاضی رکن الدین اور قاضی خدا بخش، حاجی حمید الدین حضور کی خدمت میں پہنچے تو آپ بہت مسرور ہوئے اور اسی وقت جبہ و دستار طلب کرکے اپنے دست مبارک سے دونوں حضرات کے سپرد کیا، اور اپنی جانب سے شاہ محمد غوث (متوفی ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء) کے نام ایک فرمان لکھوا کر دستخط فرما کر قاضی رکن الدین کے حوالے کیا، صاحب مناقب غوثیہ نے فرمان مذکور کا یہ مضمون لکھا ہے:

"صحیح فی الدنیا والآخرہ بندگی حضرت شیخ المشائخ میاں محمد غوث متع اللہ المسلمین بطول بقائہ از ظہور شمس القضاری المقدسی مطالعہ فرمایند تمام احوال قابل شکر ہے قل الحمد للہ دائماً معلوم و روشن ہو کہ اس درویش کو بھی میں رمضان سے ران کا درد ہوا تھا، اور جو کچھ حال و احوال اور اقوال اس فقیر کا ظاہر و باطن تھا آں فرزند کو سونپ کر اپنا قائم مقام کیا، بلکہ قالب کا حکم بھی تم شیخ المشائخ کے ہاتھ میں دیا، چنانچہ اپنی موجودگی میں صندوق طیار کرا کر حاضران مجلس کو (ہمارے) آدمیوں کی موجودگی میں نصیحت کردی ہے کہ ہم کو امانت رکھو، قالب کا اختیار بھی فرزندم میاں محمد غوث کو دیا،

جس جگہ وہ قابل سمجھیں لیجائیں، دوسرے یہ کہ آں فرزند کو اپنا قائم مقام کرکے جملہ خلفاء و مریدین کو حوالہ کیا جس کو آں فرزند مقبول کہے، مقبول ــــ اور جس کو مردود کرے، مردود اور جبہ و دستار اپنے حضور تمھارے آدمیوں کے سپرد کر دیا، یقین کر لو کہ جو کچھ رنج و مشقت اس فقیر نے اٹھایا اور درگاہ حق میں توکل پر ثابت رہا وہ سب اُن فرزند کے واسطے تھا ــــ یہ فقیر درخت کے سایہ میں مرقد کرے گا انشاء اللہ تعالیٰ اور جو اس فقیر کے سفر کے بعد ہوگا وہ شیخ سکندر کی کتابت سے معلوم ہوگا۔" (مناقب غوثیہ اردو ص ۵۳-۵۴)

حاجی حمید الدین حضور کی وفات کے بعد شیخ سکندر نے جو مکتوب شاہ محمد غوث کے نام ارسال کیا تھا اور اس میں جو چشم دید واقعات بیان کیے تھے اس کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ حاجی حمید الدین نے اپنی وفات کے بارہ میں جو کچھ فرمایا تھا حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوا ــــ مکتوب مذکور کے آخر میں شیخ سکندر تحریر فرماتے ہیں۔

"اکیس ذی الحجہ کو ایک پاس شب باقی تھی کہ یکایک فرمایا" یارو اٹھو، رحمت کا وقت ہے، اس درویش کو پھر حکم ہوا ہے کہ آج جو تمھارا روز ہے کہ تمام انبیاء و اولیاء تمھاری ملاقات کے منتظر ہیں، شتاب آؤ" ــــ اور اس وقت چوڈول پر سوار ہو کر باہر آئے اور اپنے حضور میں قبر درست کرائی، بعدہٗ اس چوڈول کو درخت کے سایہ کے نیچے لائے جو کوئی اپنا حال عرض کرتا فرماتے "فرزندم میاں محمد غوث کے حوالہ کیا، یہاں تک کہ صبح صادق چمکی اور آپ سر سے پاؤں تک چادر اوڑھ کر شغل مع اللہ کے ساتھ دار الفنا سے دار البقاء کو رحلت فرما گئے،

دیگر معروض کہ اس خاک روب آستانہ کو خاک روبی آستانہ کی خدمت پر نوازکر جامۂ خلافت عطا فرمایا ہے لیکن ثابت جب ہی ہوسکے گا جب آنحضرت قبول فرمائیں گے۔"
(ایضاً ص ۵۵)

غرض حضرت حاجی حمید الدین حضور کی وفات کے بعد شاہ محمد غوث گوالیاری مسند خلافت پر متمکن ہوئے، اور گوالیار میں قیام کرکے دور و نزدیک فیض رسانی کا سلسلہ شروع ہوا،

شاہ محمد غوث گوالیاری کے زمانے میں گوالیار میں ایک اور بزرگ بھی قیام پذیر تھے، جن کو خواجہ خانوں کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، بعض تذکرہ نگاروں نے شیخ خانو بھی لکھا ہے، خواجہ خانوںؒ اور شاہ محمد غوث کے درمیان غائبانہ ربط باطنی تھا، اس لیے ان کے تعلقات پر بھی روشنی ڈالتے چلیں، اور ساتھ ہی ان بے بنیاد باتوں کی تصحیح بھی کردی جائے جو ان دونوں حضرات کی طرف منسوب کردی گئی ہیں،

خواجہ خانوںؒ اور شاہ محمد غوثؒ | شاہ محمد غوث کے زمانے میں خواجہ خانوں (متوفی ۹۴۰ھ/۱۵۳۴ء) بھی گوالیار میں تشریف رکھتے تھے، موصوف کی ولادت ۸۵۳ھ میں ہوئی، ناگور کے رہنے والے تھے، وہاں سے ترک وطن کرکے گوالیار تشریف لے آئے تھے[1]، خواجہ حسین ناگوری سے بیعت تھے، اور شیخ حسین سرمست کے فرزند شیخ اسماعیل سے خرقۂ خلافت ملا تھا، جو جنید یری میں رہا کرتے تھے[2]،

خواجہ خانوں کی درگاہ کے موجودہ سجادہ نشین کا یہ خیال ہے کہ جب خواجہ خانوںؒ گوالیار تشریف لائے تو اس وقت شاہ محمد غوث گوالیار میں سلسلۂ رشد و ہدایت میں مصروف تھے، موصوف نے ایک عجیب و غریب حکایت نقل کی جس کی اصلاح ضروری ہے، اپنی تالیف فیضان ولایت میں لکھتے ہیں:

"جب آپ (خواجہ خانوں) گوالیار میں تشریف لائے تو اس وقت حضرت محمد غوثؒ رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ہر فرد اور مسافرین یوم مہمان رہا کرتا تھا، مگر آپ ان کے دسترخوان پر

---

[1] محمد غوثی: گلزار ابرار (اردو) مطبوعہ ۱۳۲۶ھ ص ۲۳۲
[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی: اخبار الاخیار، مطبوعہ دہلی ۱۳۳۲ھ

نہ پہنچے۔ محمد غوثؒ نے آپ کی خدمت میں اپنے خادم کو بلانے کے لیے بھیجا، آپ غسل فرماکر بحالت سکون ایک پتھر پر بیٹھے تھے۔ خادم کے عرض کرنے پر آپ نے جواباً فرمایا کہ فقیر آمد ورفت کے لیے نہیں ہے اور نہ یہ فقیر کے مناسب حال ہے، پس اسے معذور رکھو۔ محمد غوثؒ کو اس تعارض سے ناگواری ہوئی اور اپنے خدام "اجنہ" کو حکم دیا کہ جس پتھر پر وہ بیٹھے ہیں مع اس پتھر کے ان کو اٹھالاؤ۔ چار "جن" تعمیل حکم کے لیے آئے لیکن وہ پتھر نہ اٹھا سکے، اور لاچار ہوگئے۔ حضرت خواجہ خانوں نے ان "اجنا" سے کہا کہ فقیر کو کیوں تنگ کرتے ہو جنوں نے ادب سے عرض کیا کہ ہم تو تابعدار ہیں جو حکم دیا گیا تھا تعمیل کر رہے تھے، اب جو حکم دیا جائے گا اس کی تعمیل کریں گے، حضرت خواجہ نے متبسم ہوکر فرمایا "جاؤ غوث کو مع اس تخت کے اٹھالاؤ جس پر وہ بیٹھے ہوئے ہیں"۔ جن گئے اور آن واحد میں حضرت محمد غوث کو مع تخت کے حضرت خواجہ کے سامنے لاکر رکھ دیا، حضرت محمد غوث بہت حیران ہوئے اور سلام شوق کے بعد اس طرح معذرت کی:

"اے شیخ محترم مجھے قطعی علم نہ تھا کہ آپ شاہ ولایت ہیں، ورنہ مجھ سے ہرگز یہ عمل نہ ہوتا"

حضرت خواجہ نے مسکراکر کہا، کوئی حرج نہیں، دوستوں کی ملاقات چھیڑ چھاڑ سے ہی ہوا کرتی ہے۔ حضرت محمد غوث کے تخت پر بہت سے اسباب عملیات، تجربات وغیرہ رکھے تھے، اور ایک بیاض بھی رکھی تھی، جسے حضرت خواجہ نے اٹھاکر دریافت کیا "محمد غوث یہ کیا ہے"؟ حضرت غوث کی زبان کی لغزش سے اتفاقاً نکل گیا "حضور کچھ نہیں"۔ پس حضرت خواجہ نے بیاض یہ کہتے ہوئے رکھ دی "اچھا کچھ نہیں"۔ تھوڑے وقفہ کے بعد کسی ضرورت سے محمد غوث نے اس بیاض کو کھولا تو اس کے سب اوراق سفید تھے، بہت سراسیمہ ہوئے اور حضرت خواجہ کی جانب رحم طلب نظروں سے دیکھا، حضرت خواجہ علیہ الرحمہ نے

مسکرا کر فرمایا. محمد غوث اس میں کچھ نہیں، تجھ میں سب کچھ ہے، تین مرتبہ زبان فیض ترجمان سے اس جملہ کا ادا ہونا ہی تھا کہ حضرت غوث رحمۃ اللہ علیہ کامل ہو گئے، بخورات وغیرہ سب اٹھا کر پھینک دیں اور غلبۂ ترک سے مغلوب ہو کر نظارۂ جمال وحدت میں مستغرق ہو گئے، کیف و سرور اور معراج معرفت یاب حضرت غوث رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت خواجہ خانونؒ سے وقت رخصت گاہ بگاہ حاضر ہوتے رہنے کی اجازت چاہی، مگر حضرت خواجہؒ نے فرمادیا اور کہا کہ ایک کام وقت پر موقوف ہے، اس کی ادائیگی تم کروگے، اسی وقت ملاقات ہوگی۔[1]"

اس حکایت میں جتنی صداقت ہے وہ خود اس کے انداز بیان سے ظاہر ہے، صاحب فیضان ولایت کے قول کی روشنی ہی میں اس واقعہ کی تردید ہو جاتی ہے، موصوف نے لکھا ہے کہ حضرت خواجہ خانونؒ تقریباً سنہ ۹۰۰ھ میں گوالیار تشریف لائے تھے،[2] اور شاہ محمد غوثؒ کوہ چنار کی ریاضت کے بعد گوالیار تشریف لائے، جواہر خمسہ ایام ریاضت کی تصنیف ہے اور اس کا سنہ تصنیف سنہ ۹۲۹ھ ہے،[3] اس سے ظاہر ہے کہ شاہ محمد غوث، خواجہ خانونؒ کے تقریباً ۲۹ برس بعد گوالیار تشریف لائے، حکایت مذکور کی بنیاد اسی پر قائم تھی کہ خواجہ خانونؒ بعد میں تشریف لائے، جب بنیاد ہی قائم نہ رہی تو حکایت کی صحت و عدم صحت کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے، یہ بھی واضح رہے کہ شاہ محمد غوث کی ولادت سنہ ۹۰۶ھ میں ہوئی تھی، یعنی جس وقت خواجہ خانونؒ گوالیار تشریف لائے ہیں اس وقت شاہ محمد غوث پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

صاحب فیضان ولایت کی ایک تحریر سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ خانونؒ اور شاہ محمد غوثؒ زندگی میں نہیں مل سکے، موصوف نے لکھا ہے:

---

[1] غلام محی الدین: فیضان ولایت، مطبوعہ علوی پریس، گوالیار، ص ۱۴۔ [2] ۱۵ [3] ایضاً ص ۱۸

"سنہ ۱۱۴۲ھ میں مورخہ یکم جمادی الاول کو آپ نے اپنے بڑے فرزند حضرت خواجہ بندگی قدس اللہ سرہم سے ارشاد فرمایا کہ میں اب تم سب سے رخصت ہوتا ہوں، بعد وفات میری تجہیز و تکفین حضرت محمد غوث گوالیاری کریں گے، میں نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ ملاقات ان کی ہماری اس وقت پر منحصر ہے"[1]

آخری جملے سے صاف ظاہر ہے کہ زندگی میں دونوں بزرگوں کی ملاقات نہیں ہوئی، اور مذکورہ بالا قصہ محض گڑھا ہوا ہے،

معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ خانونؒ کے فرزند اکبر حضرت خواجہ بندگی احمد (متوفی ۱۰۱۵ھ ابعد ۱۹۱۶ء) نے جو واقعہ بیان کیا ہے۔ صاحب فیضان ولایت نے اسی میں مبالغے سے کام لے کر رائی کا پہاڑ بنایا ہے، اصل واقعہ یہ ہے جو بڑی حد تک مستند سمجھا جاسکتا ہے:۔

"ایک روز حضرت قبلہ گاہی طہارت فرما رہے تھے، اور کچھ افاقہ بھی تھا، اچانک شیخ محمد غوث کے ہاں سے دو خادم آئے، سلام پیش کیا، حضرت نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا کہ کہاں سے اور کس لیے آئے ہو؟ مقیم ہو یا مسافر؟ انھوں نے کہا کہ ہم تو شیخ محمد غوث کے خادموں میں سے ہیں، شیخ نے پیام دے کر آپ کے پاس بھیجا ہے اور دعائے شوق کے بعد کہا ہے کہ آپ کے دیدار کا بیحد اشتیاق ہے، اور باہمی ملاقات کا شوق مرتبۂ کمال پر پہنچا ہوا ہے، اگر غریب خانے پر تشریف لے آئیں تو آپ کا گھر ہے، ورنہ مجھے اجازت مرحمت فرمائیں کہ حاضر ہو کر دیدار سے مشرف ہوں اور وصال باہمی سے لطف اندوز ہوں، حضرت قبلہ گاہی کو علم اولین و آخرین تھا، ان دونوں کی باتیں سنکر مسکرائے اور جواباً فرمایا کہ فقیر خانون کو ان دونوں باتوں سے معذور رکھیے،

---

[1] فیضان ولایت ص ۱۸

کیونکہ یہ فقیر کہیں جانے کے لیے مامور نہیں، اور کسی کے لیے تعظیماً قیام سے بھی معذور ہے، شفقت
دوستی کا یہی تقاضا ہے کہ فقیر کو ان دونوں تکالیف سے معذور رکھیں، ہماری ملاقات ایک
وقت پر موقوف ہے، اس وقت کے منتظر رہیں، انشاء اللہ تعالیٰ اگر ہونی ہے تو ضرور ہوگی"[۱]
فیضان ولایت کا جو اقتباس پہلے نقل کیا جا چکا ہے اس کا اول و آخر اسی مذکورہ بالا اقتباس
سے معلوم ہوتا ہے، باقی جو کچھ ہے وہ اختراع ذہنی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔
خواجہ خانونؒ کے فرزند اکبر خواجہ احمد نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ
کی روشنی میں بھی صحیح معلوم ہوتا ہے، حضرت شیخؒ فرماتے ہیں:

"از جہت کبر سن و ضعف بنیہ بہ تعظیم مردم قیام نمودے، خدمت والا بصحبت شریفش
رسیدہ بودند از ترک تعظیم و قیام کہ ازوے در مردم شہرت یافتہ بود پرسیدہ، فرمود کہ من
پیر شدہ ام وضعیف گشتہ از برائے تعظیم ہر داخل خارج قیام نتوانم کرد، مخصوص ساختن
بعضے دون بعضے لائق بہ حال فقرا نباشد، مرا معذور دارید"[۲]

ہر کیف یہ بات متحقق ہے کہ خواجہ خانونؒ اور شاہ محمد غوث بیک وقت گوالیار میں موجود تھے،
ملاقات نہیں ہوئی، چنانچہ خواجہ خانونؒ کے خلیفہ نے کلیات گوالیار میں لکھا ہے:-

"با وصفیکہ ہر دو شیخ در یک عصر بودند لیکن ہر دو صاحبان را ملاقات نہ شد"[۳]

خواجہ خانونؒ کے وصال کے بعد ان کی وصیت کے مطابق شاہ محمد غوث گوالیاریؒ
لائے اور خواجہ مرحوم کے صاحبزادگان کے ساتھ غسل دیا، تجہیز و تکفین فرمائی، اس کے
جنازہ بھی آپ ہی نے پڑھائی، ۹۴۰ھ دوم جمادی الاول وقت چاشت تدفین سے فارغ ہوئے،[۴]

---

[۱] ... علی شاہ، کلیات گوالیار بحوالہ مضمون قاضی معراج صاحب دھولپوری مطبوعہ نوائے کراچی دسمبر ۱۹۶۱ء
[۲] ... الحق محدث دہلوی: اخبار الاخیار مطبوعہ دہلی ۱۳۳۲ھ ص ۲۴۳ [۳] سید فضل علی شاہ: کلیات گوالیار
... محی الدین: فیضان ولایت ص ۸۱

مغربی پاکستان کے مشہور اردو اخبار جنگ مورخہ ۱۳ ر اکتوبر ۱۹۶۱ء ص ۸۰ کالم ۲ و ۳ پر ایک مضمون "فیض غانوں" کے عنوان سے شائع ہوا تھا جس کو ایک مجہول الاسم شخص ع، ع، خانونی نے لکھا تھا، اس مضمون کے تمام مندرجات فیضان ولایت کا سرقہ ہیں، اور مضمون نگار نے اپنی طرف سے تحریف و ترمیم سے بھی کام لیا ہے، اس کو دیکھکر بیساختہ زبان سے نکلتا ہے ع

چہ دلاورست دزدے کہ بکف چراغ دارد!

شاہان ہند سے تعلقات فقرا کے دربار ہمیشہ سے شاہان عالم کے ملجا، و ماویٰ رہے ہیں، چنانچہ شیخ محمد غوث کے دربار سے بھی شاہوں کی وابستگی رہی، صاحبِ مناقب غوثیہ (۹۴۹ھ) شاہ فضل اللہ نے تحریر فرمایا ہے :-

"حضرت غوث العالم کی باطنی استقامت اور قلبی استعانت عالم میں مشہور و معروف ہے، تصرف کو زمین انکے ہاتھ میں ہے اگر چاہیں تو تخت پر بٹھائیں اور شاہ کو گدا بنائیں، چنانچہ سلطان ابراہیم افغان اور بابر بادشاہ و ہمایوں بادشاہ کے قصے عالم صورت مشہور ہیں، اسی طرح سلطان صوفی سے باطنی نعمت لے کر شیخ مبارک مجذوب عامی کو دنیا عالم معنی میں اظہر من الشمس ہیں"[1]

تاتار خاں والی گوالیار کو جب اطراف کے زمینداروں نے پریشان کرنا شروع کیا اور اسکو ان شرپسندوں کے حملہ کا خطرہ پیدا ہوا تو اس نے بابر بادشاہ سے کمک مانگی، اس نے کمک بھیجی، اس زمانہ میں شاہ محمد غوث گوالیار ہی میں تشریف فرما تھے، ایک اطلاع کے مطابق بابر بادشاہ نے حاضر خدمت ہو کر شرف قدم بوسی حاصل کیا تھا۔

تاریخ فرشتہ نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے[2]، جس کو محمد حسین آزاد نے دربار اکبری میں نقل کیا ہے

---

[1] مناقب غوثیہ (اردو) ص ۴۴ [2] محمد قاسم ہندو شاہ استرآبادی معروف بہ فرشتہ: تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۲۰۵، مطبوعہ بمبئی ۱۲۴۷ھ / ۱۸۳۲ء

وہ لکھتے ہیں :-

"خاص و عام ہندوستان کے شیخ (محمد غوثؒ) کے ساتھ دلی ارادت اور اعتقاد رکھتے تھے، اور ایک وقت ایسا ہوتا تھا کہ خود بادشاہوں کو اپنے دنیا کے کاموں میں بھی ان کی طرف رجوع کرنی پڑتی تھی، گجرات، بنگالہ اور دلی میں نامی مشائخ ان کے دامن وسیع کو کپڑے رہے، جبکہ بابر بادشاہ آگرہ تک پہنچکر ملک گیری کر رہے تھے، اس وقت تاتار خاں والی گوالیار کو اپنی اطراف کے بعض سرداروں کی طرف سے خطرہ معلوم ہوا، اس نے بابر کو عرضی بھیجکر اطاعت ظاہر کی، بابر نے خواجہ رحیم داد اور شیخ گھورن کو فوج دے کر بھیجا کہ قلعہ پر قبضہ کرلیں، جب یہ فوج لیکر پہنچے تو تاتار خاں اپنے قول سے پھر گیا۔۔۔۔۔۔۔ شیخ محمد غوث ان دنوں قلعے میں رہتے تھے، انھوں نے ایک بااقبال بادشاہ کی آمد آمد دیکھکر اندر سے تدبیر بتائی، اس کے بموجب انھوں نے تاتار خاں کو کہلا بھیجا کہ ہم جو یہاں آئے تو فقط اس لیے کہ تمھیں تمھارے دشمنوں سے بچائیں اور آئے تو تمھارے بلانے سے آئے، اب کف دست میدان میں پڑے ہیں ۔۔۔۔۔ اتنی اجازت دو کہ ہم چند خدمت گاروں کے ساتھ رات کو قلعہ میں آجائیں، لشکر باہر رہے گا۔۔ تاتار خاں ۔۔۔۔۔ نے اجازت دیدی ۔۔۔۔۔ سرداران مذکور نے راتوں رات اپنے بہت سے آدمی قلعہ میں پہنچا دیے ۔۔۔۔۔۔ دروازے پر پہرہ دار شیخ (محمد غوث) کے مرید تھے، انھیں بھی مرشد کا حکم پہنچ چکا تھا، غرض تاتار خاں کو اس وقت خبر ہوئی کہ فوج بابری کی جماعت کثیر اندر پہنچ گئی اور کام ہاتھ سے نکل چکا تھا، چار و ناچار قلعہ حوالہ کرنا پڑا ۔۔۔۔۔ اور آپ دربار میں حاضر ہوا[1]۔"

تاتار خاں کے زوال کا یہی سبب تھا کہ اس نے شاہ محمد غوث کی ہدایات و نصائح پر عمل

---

[1] محمد حسین آزاد = دربار اکبری ص ۹ - ۵۵، مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۱۰ء

نہیں کیا، اور تمرد و سرکشی اختیار کی، اور بابر بادشاہ کی سرفرازی اور قلعۂ گوالیار پر فتح بھی شاہ محمد غوث کی عنایات کا نتیجہ تھی،

رسالہ عالمگیری میں بھی اس واقعہ کو نقل کیا گیا ہے جس کی تلخیص مناقب غوثیہ کے مترجم نے تتمہ کی صورت میں آخر میں منسلک کر دی ہے، اس کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بابر بادشاہ نے تاتار خاں سے شاہ محمد غوث سے ملاقات کی اجازت چاہی تھی، چنانچہ بابر نے قلعہ گوالیار میں پہنچکر شرف قدمبوسی حاصل کیا،[1]

ہمایوں بادشاہ (متوفی ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء) کو بھی شاہ محمد غوث سے بڑی عقیدت تھی، ملا عبد القادر بدایونی نے لکھا ہے:-

"وہمایوں بادشاہ مغفرت پناہ را ہر دو ایں بزرگوار (شیخ پھول و شیخ محمد غوث) نسبت عقیدت و اخلاص بکمال بود چنانچہ بر کم کسے دیگر آں جہت داشتہ باشد و طریق دعوت اسماء ازیں اعزہ یاد می گرفتند"[2]

مفتی غلام سرور لاہوری نے بھی لکھا ہے:-

"نصیر الدین ہمایوں بادشاہ از معتقدان وے گشت"[3]

پیٹر ہارڈی نے جہاں سلاسل طریقت کا ذکر کیا ہے وہاں تذکرۃً لکھا ہے کہ ہمایوں بادشاہ شاہ محمد غوث کا مرید تھا، وہ لکھتا ہے:-

"ایران سے نئے سلاسل آئے ... شطاری ... شیخ محمد غوث، جو اسی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے، ہمایوں کے روحانی پیشوا تھے"[4]

---

[1] محمد ظہیر الحق احمد آبادی: تتمہ مناقب غوثیہ (اردو) مطبوعہ آگرہ ۱۳۲۳ھ ص ۲۱۶ [2] عبد القادر بدایونی: منتخب التواریخ مطبوعہ کلکتہ .... ۱۸۶۹ء جلد سوم ص ۴ [3] مفتی غلام سرور لاہوری: خزینۃ الاصفیاء، مطبوعہ لکھنؤ، ۱۸۷۳ء ص ۲۳۳ [4] سعید ڈی بیری: سورسز آف انڈین ٹریڈیشن، مطبوعہ نیویارک ۱۹۵۹ء ص ۴۳۸

ڈاکٹر تارا چند[1] اور دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگار نے بھی یہی لکھا ہے[2]، اس لیے یہ مسلّم ہے
ں کو شاہ محمد غوث سے بے حد عقیدت تھی، اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ جب ۱۵۴۰ء میں افغانان سور
ہوگیا اور ہمایوں بادشاہ نے صوبہ دہلی سے یک سوئی اختیار کرلی تو اس وقت شاہ محمد غوثؒ
الیار سے ہجرت کرکے گجرات چلے آئے، یہاں ہمایوں بادشاہ کی طرف سے شاہ محمد غوثؒ کو یہ
موصول ہوا:-

"بعد از عرض آداب دست بوس معروض آنکہ عنایت قدیرلم یزل از کربود شواری
تقدیر بہ برکت توجہ و دعائے ایشاں وجمیع درویشاں بہ آسانی برآوردہ واز سوانح روزگار
فتنہ انگیز آنچہ پیش آمد بجز محرومی ملازمت باعث آزاری خاطر وسبب تیرگی دل نہ گردید، و
در ہر نفس و ہر گام خیال درگرد ایں اندیشہ بود کہ آں دیو سرشت مردم بہ آں ذات ملکوت
صفات چہ سلوک کردہ باشند، چوں شنید کہ درہماں نزدیکی ایشاں نیز ہجرت بہ دیار گجرات
فرمودند، دل ازاں اندوہ گرفتاری بقدرے رہائی یافت، وپیوستہ از صدق عقیدت امیدوار
کہ فیض فضل کردگار رحیم چناں کہ از تنگنائے آفت بیروں آوردہ از بند اندوہ ناکی مذکور
آزاد ساخت از محنت مفارقت صوری نیز خلاصی بخشد۔
سبحان اللہ چہ گونہ سپاس وشکر گزاری تلقین باطن نشیں آں رہنمائے حقیقی بتقدیم رساند کہ
باکثرت اسباب پریشانی کہ بہ ظاہر قالب فرد پیچیدہ ست در جمعیت و وحدت سر سودائے
قلب باندازہ یک ذرہ قصورے راہ و فتورے نیافتہ۔ راہ آمد و رفت قافلۂ دعائے خیر
پیوستہ مسلوک باد۔" (محمد غوثی: گلزار ابرار، مطبوعہ ۱۳۲۶ھ، ص ۳-۲۹۲)

---

[1] ڈاکٹر تارا چند: انفلوئنس آف اسلام آن انڈین کلچر، مطبوعہ الہ آباد
[2] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام: مطبوعہ لیڈن (ہالینڈ)، ۱۹۱۳ء، ص ۸-۶۸۷

شاہ محمد غوثؒ نے مذکورہ بالا مکتوب شاہی کے جواب میں جو یہ صحیفہ ارسال فرمایا:-

"وصول نامۂ نامی سلطانی و مطالعۂ صحیفہ گرامی ہمایونی مبارک باد زندگانی بہ مخلصان این حدود رسانید و نوید سعادت صحت و عافیت ملازمان رکاب دولت بردا و — آن چہ بکلک وقائع نگار قلمی بود مطابق نفس الامرست ہیچ گونہ تکلفے دراں واقع نیست ۔ مصرع

سخن کز دل بروں آید نشیند لاجرم در دل

المرام سر خدا و ندا خراز اندوہ ناکی سرگزشت شوریدہ مباد! مصرع

در طریقت ہر چہ پیش سالک آید خیر اوست

ہر گاہ حق سبحانہ و تعالیٰ بندہ سعادت مند خود را می خواہد بدرجہ کمال رساند بہ ورش باسمائے جمال و جلال بر وہ می فرماید۔ یک دور جمالی گزشت ۔ اکنوں روز نوبت جلالی ست بحکم فان مع العسر یسرا ان مع العسر یسرا ۔ بزودی باز نوبت جمال خواہد رسید زیرا کہ بقانون عربیہ یک "عسر" بیان دو "یسر" واقع شدہ وزود بہ جہت آنکہ سطح محا حاجب مسافت کمتر از دائرہ محیط ست پس عنقریب عروس مراد بر منصۂ ظہور جلوہ گر خواہد شد۔ انشاء اللہ تعالیٰ" (گلزار ابرار، ص ۴-۲۹۳)

ملا عبد القادر بدایونیؒ نے لکھا ہے کہ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ صغر سن ہی میں شاہ محمد غوث کا معتقد ہو گیا تھا،

"و بادشاہ را در صغر سن بتحریص و ترغیب تمام بوسائل و وسایط در سلک ارادت خود آورد" (منتخب التواریخ، جلد سوم ص ۵ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء)

معتمد خاں نے اقبال نامہ میں بھی اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، جس کو محمد حسین آزادؔ نے دربار اکبری میں اپنے انداز سے اس طرح بیان کیا ہے:-

"سنہ ۹۶۶ھ میں کہ ابھی اکبر کو سلطنت سے تعلق نہ تھا، شکار کھیلتے ہوئے گوالیار کی طرف جا نکلا۔ گجرات میں گئے بیل بہت خوب ہوتے ہیں، اثنائے شکار میں پلنگ بانوں اور آہو بانوں نے کہا کہ شیخ انہی دنوں میں گجرات سے آئے ہیں، ان کے قافلے میں بہت اچھے اچھے بیل ہیں اور شکار میں کار آمد ہیں، بادشاہ نے کہا کہ سوداگروں کو بلواؤ، کوئی بول اٹھا کہ شیخ اور ان کے بھائی بند خود بھی لائے ہیں، سوداگروں کے پاس ویسے نہیں ہیں، گوالیار کا قلعہ بہت مشہور تھا، ایک دن بادشاہ شکار کو اٹھے تو قلعہ دیکھا اور پھرتے ہوئے شیخ موصوف کے گھر چلے گئے۔۔۔۔۔ انھوں نے جس طرح کے تحفے کہ پیر ان اہل طریقت دیا کرتے ہیں پیش کیے۔۔۔۔ اور چونکہ انھیں بھی پتہ لگ گیا تھا، اس لیے تحائف گجرات ودکن کے ساتھ عمدہ عمدہ گائیں اور بیل بھی نذر کیے، دسترخوان بھی چنا، مٹھائیاں کھلائیں، عطر لگائے، خاتمۂ صحبت میں کہا کہ آپ کسی کے مرید بھی ہیں؟ اکبر نے کہا، نہیں، خود بڑھ کر دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔۔۔ اور مہمان کو مریدی کی رسی میں باندھ لیا۔" (دربار اکبری، ص ۷۷۹)

غرض اپنے والد نصیر الدین محمد ہمایوں اور دادا ظہیر الدین محمد بابر کی طرح جلال الدین محمد اکبر بھی شاہ محمد غوثؒ سے خاص ربط خاطر رکھتا تھا، چنانچہ جب شاہ محمد غوثؒ اکبر آباد تشریف لائے اور بیرم خاں و شیخ گدائی کے ناروا سلوک سے خاطر برداشتہ ہو کر واپس گوالیار گئے تو اکبر بادشاہ بیرم خاں سے آزردہ ہوگیا، اس ربطِ خاص کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بیرم خاں کی شہادت کے بعد آپ پھر اکبر آباد تشریف لے آئے، اور یہیں انتقال فرمایا، اور گوالیار میں دفن کیے گئے،

صاحب فیضان ولایت نے بھی سنہ ۹۶۶ھ میں اکبر کا گوالیار آنا لکھا ہے، مگر شاہ محمد غوثؒ سے متعلق مذکورہ واقعہ کی طرف اشارہ تک نہیں کیا، اور اس کے بجائے اپنے جد امجد شیخ خانون گوالیاری (متوفی سنہ ۹۴۲ھ) سے اکبر کی ملاقات کا ذکر کیا ہے، حالانکہ کسی مستند تذکرہ میں اس واقعہ کا ذکر نہیں ملتا،

معلوم نہیں ان کا ماخذ کیا ہے، انھوں نے ایک عجیب و غریب حکایت لکھی ہے کہ

"۹۶۶ھ میں اکبر بادشاہ والی تخت ہندوستان، گوالیار آئے اور آپکے (شیخ خانون) پاس حاضری چاہی تو آپنے ملاقات سے انکار فرما دیا، اس زمانہ میں "تان سین" روزانہ صبح کاذب کے وقت مزار پُر انوار حضرت غریب نواز، شاہ ولایت پر حاضری دیا کرتے تھے، جب اکبر کو یارائے زیارت نظر نہ آیا تو ایک دن وہ حضرت تان سین کا لباس پہنکر ان کی حاضری کے وقت مزار مبارک شاہ ولایت پر حاضر ہوئے، اور نادیر غنا و نغمہ سازی میں مصروف رہے حضرت بندگی احمد صاحبؒ نے دوشت بظاہر جوا مکے وانے اکبر کی گود میں ڈال دیے، اور باطناً انعام خاص سایۂ رحمت پروردگار سے مالامال فرمادیا، اکبر سلام و قدم بوسی اور آستانہ پر جبیں سائی کے بعد رخصت ہوئے، اکبر نے بہت زر و جاگیر نذر گزرانی چاہی، مگر آپ نے کہا فقیر کو نمک کی کنکری اور سوکھی روٹی بہت کافی ہے" (فیضان ولایت ص ۲۲)

فاضل مؤلف نے اکبر کو جس انداز سے شیخ احمد کے سامنے پیش کیا ہے وہ قرین عقل نہیں، ظاہر ہے کہ اکبر و تان سین میں کسی قسم کی مماثلت نہ تھی، اس لیے اشتباہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، پھر اکبر تان سین جیسا مطرب بھی نہیں تھا، کہ شیخ احمد فرق تک محسوس نہ کر سکے اور دھوکے میں آگئے، یہ حکایت آپ اپنی تردید کرتی ہے۔

جلال الدین محمد اکبر نے از راہِ نوازش و عنایت اور عقیدت و محبت، شاہ محمد غوث کے لیے خزانۂ شاہی سے وظیفہ بھی مقرر کیا تھا، صاحب مآثر الامرا نے لکھا ہے :۔

"گویند کہ از جناب عرش آشیانی یک کرور درہم وظیفہ برد" (بحوالہ شیخ محمد اکرام : رود کوثر مطبوعہ لاہور ۱۹۵۸ء)

اسی طرح صاحب ذخیرۃ الخوانین نے لکھا ہے :۔

"شیخ نہ لک روپیہ در جاگیر داشت و چہل خیل در فوج او می رفت" (رو

صحیح ص ۱۲۰ کے
تسحیر دیکھیں

لیکن خط یاقوت یاقوت مستعصمی کا خط ہے، جو مستعصم باللہ (۶۴۰ھ - ۶۵۶ھ) کے دور کا خطاط ہے اور جس کی تاریخ وفات ۶۹۸ھ[1] بتائی جاتی ہے، ظاہر ہے کہ جب یاقوت ظہیر فاریابی کا معاصر نہیں تو جس دیوان میں خط یاقوت کا ذکر موجود ہو وہ ظہیر فاریابی کا دیوان نہیں ہو سکتا، خط غبار بھی بعد کا ہے، لیکن فی الحال اس کی کوئی تاریخ پیش نہیں کی جا سکتی۔

۲۔ ظہیر نے متعدد غزلیں حافظ کے جواب میں لکھی ہیں، جن سے ایک طرف تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ حافظ کا پیرو ہے[2]، دوسری طرف اس کا تاخر زمانی بھی واضح ہو جاتا ہے، بعض لوگوں کو یہ دھوکا ہو سکتا ہے کہ حافظ نے ظہیر فاریابی کی پیروی کی ہو گی لیکن یہ محض وہم ہے، اس لیے کہ زبان اور انداز بیان دونوں سے حافظ کا تقدم زمانی ثابت ہے، دوسری بات یہ ہے کہ حافظ کے لیے ایک ایسے شاعر کا تتبع جس کا غزل میں کوئی مرتبہ نہ ہو (اور جس کا ذکر کہیں بھی نہ ہو) مستبعد معلوم ہوتا ہے، ذیل میں حافظ اور ظہیر کی بعض موازی غزلیں پیش کی جاتی ہیں، تاکہ قارئین کو حقیقت حال کا اندازہ ہو جائے۔

حافظ	ظہیر (نمبر ۱)
اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل ما را	ندانم از چہ دستی می کشد زلف سمن سا را
بخال ہندویش بخشم سمرقند و بخارا را	عجب نبود کہ می خواہد بدست آرد دل ما را
اگر دشنام فرمائی وگر نفرین دعا گویم	لب آں جام می بوسم وہانم می شود شیریں
جواب تلخ میزیبد از آں لعل شکر خوارا	حلاوت ہیں کہ بوسیدہ است آں لعل شکر خوارا

[1] تاریخ وفات کا قطعہ یہ ہے :- یاقوت جمال دین شہ اہل ہنر ۔ در صبح خمیس سادس شہر صفر
در سبعہ و ستین بدو ستہ مائۃ ۔ گزدار فنا بآخرت کرد سفر
مگر تذکرۂ خوشنویساں میں ۶۹۸ھ درج ہے (ص ۲۴) [2] ڈاکٹر غلام مصطفٰے نے لکھا ہے کہ ظہیر کے ایک قلمی نسخہ

حافظ	ظهیر (نمبر ۳)
الا یا ایها الساقی ادر کاساً و ناولها	من از باد صبا یادی ندادم حل مشکلها
که عشق آسان نمود اول ولی افتاد مشکلها	چه حاصل عقده از زلفت گشود و بست بر دلها
شب تاریک و بیم موج و گردابی چنین هایل	ظهیر از موج این دریای بی پایان نمیندیشد
کجا دانند حال ما سبکباران ساحلها	خبر از دی بر نزدیک بیداران ساحلها
حاصل کارگه کون و مکان این همه نیست	با غم من نفس مرده دلان این همه نیست (م ۱۴۵)
باده پیش آر که اسباب جهان این همه نیست	مستی مرگ بدین خواب گران این همه نیست
از دل و جان شرف صحبت جانان غرض است	تا تو در شیشه و خم باده کنی عید آمد
غرض اینست وگرنه دل و جان این همه نیست	باده پیش آر که ماه رمضان این همه نیست
توئی که بر سر خوبان کشوری چون تاج	زهی به تیر غمت صد هزار دل آماج (م ۴)
سزد اگر همه دلبران دهندت باج	گرفته باز تو از حسن ملک خوبان باج
همای اوج سعادت بدام ما افتد	شبی اگر گذرت بر مقام ما افتد (م ۹۹)
اگر ترا گذری بر مقام ما افتد	نزول زهره ز گردون ببام ما افتد
حباب وار براندازم از نشاط کلاه	زمان مستی ما آن زمان بود ای ماه
اگر ز روی تو عکسی بجام ما افتد	که از عذار تو عکسی بجام ما افتد
شبی که ماه مراد از افق شود طالع	هزار عاشق بیدل که رو به رو دارند
بود که پرتو نوری ببام ما افتد	کجا بفکر جواب سلام ما افتد
ببارگاه تو چون باد را نباشد بار	هزار نامه فرستادم و نشد که یکی
کی اتفاق مجال سلام ما افتد	بدست دلبر عالی مقام ما افتد

حافظ	نظیر (نمبر ۱۴۴)
حسب حالی ننوشتیم و شد ایامی چند	با صبا میروم امشب بگلستانی چند
محرمی کو که فرستم بتو پیغامی چند	تا کشایم گره از سنبل و ریحانی چند
نصیحتی کنمت بشنو و بهانه مگیر	مده فریب من ای دل ز آب رنگ حریر (ص ۱۶۲)
هر آنچه ناصح مشفق بگویدت بپذیر	بشوی لوح ضمیر مرا ز موج حصیر
دل رمیدهٔ ما را که پیش میگیرد	ز قید زلف رهاند این دل پریشان را
خبر دهید بمجنون خسته از زنجیر	دریغ داشت ز دیوانه منصب زنجیر
منم که دیده بدیدار دوست کردم باز	نیاز جلوه رود همعنان جلوهٔ ناز (ص ۱۵۱)
چه شکر گویمت ای کارساز بنده نواز	چو سرو رقص کند قمری آورد آواز
نیم بوسه دعائی بخر ز اهل نیاز	بشهد آرزوی بوسه گیری لب تو
که کید دشمنت از جسم و جان دارد باز	دهان ساغر از آن ماند تا قیامت باز
بر نیامد از تمنای لبت کامم هنوز	ساکن بتخانه و در قید اسلامم هنوز (ص ۲۴۹)
بر امید جام لعلت دردی آشامم هنوز	خاکروب دیر و در و در بیت احرامم هنوز
روز اول رفت دینم در سر زلفین تو	من که سودای فراغ از نکهت آن شامم
تا چه خواهد شد درین سودا سر انجامم هنوز	تا چه باشد ز زلف او سر انجامم هنوز
گلعذاری ز گلستان جهان ما را بس	جلوه از قدت ای سرو روان ما را بس
زین چمن سایهٔ آن سرو روان ما را بس	موی از زلف تو سر رشتهٔ جان ما را بس
ای صبا گر گذری بر ساحل رود ارس	تا بشهد آرزو محکم بود پای مگس
بوسه زن بر خاک آن وادی و مشکین کن نفس	کم مبادا تا ابد عشق مجاز از بوالهوس

حافظ	ظہیر
منزل سلمی که بادش هر دم از ما صد سلام	وحشیان نجد را هم آن شب از آرام برد
بصدای ساربانان بینی و بانگ جرس	کاشکی با محمل لیلی نمی بودی جرس
عشرت شبگیر کن می نوش کاندر راه عشق	زلف او رهزن شود چشمش چو گردد مست خواب
شبروان را آشنائی‌هاست با میر عسس	شبرو طرار خیزد چون بیارامد عسس
ببرد از من قرار و طاقت و هوش	قدش از جلوه غارت میکند هوش (غ ۱۹۱)
بت سنگین دل سیمین بناگوش	بلا باشد اگر بینم در آغوش
چو پیراهن شوم آسوده خاطر	مگر بیهوده ای رضوان که فردوس
گرش همچو قبا گیرم در آغوش	ندارد نزهت خلد بناگوش
اگر رفیق شفیقی درست پیمان باش	دلا چو غنچه خس پوش و و پاکدامان باش (غ ۱۸۹)
حریف خانه و گرمابه و گلستان باش	بناله همنفس بلبلان مستان باش
قسم بحشمت و جاه و جلال شاه شجاع	قسم بتاج سلیمان و آفتاب شعاع (غ ۲۵)
که نیست با کسم از بهر مال و جاه نزاع	که خسروان همه او را مطیع هست و مطاع
ببین که رقص کنان میرود بناله چنگ	خوشا شرارهٔ عشقی بدل که همچو سپند
کسی که رخصه نفرمودی استماع سماع	کنم ترانهٔ سوزندگی برقص و سماع
شراب خانگیم بس می مغانه بیار	نشسته منتظر پیک کاروان رحیل
حریف باده رسید ای رفیق توبه وداع	گسسته رابطه از دوستان کرده وداع
سحر ببوی گلستان دمی شدم در باغ	بپیراهن نتوانم نهفت شعله داغ (غ ۳۰)
که تا چو بلبل بیدل کنم علاج دماغ	توان میانهٔ فانوس اگر نهفت چراغ

حافظ	ظہیر
بجلوۂ گل سوری نگاہ میکردم	پیالہ چند ز خون جگر کنم لبریز
کہ بود در شب تیرہ بروشنی چو چراغ	دلا تو ہم جگرے کن بریز می بایاغ
مقام امن و می بیغش و رفیق شفیق	کسیکہ خوردہ می از جام ساقی تحقیق (۲۱۸)
گرت مدام میسر شود زہی توفیق	ز دست حور نمی نوشد از شراب خلیق
جہان و کار جہان جملہ ہیچ بر ہیچ است	کجا ز عشق گران سنگ زنگ بردارد
ہزار بار من این نکتہ کردہ ام تحقیق	کسیکہ کوہ نشینی نمی کند چو عقیق
حلاوتی کہ ترا در چہ زنخدان است	بکنہ معرفتی شبنم خرد نرسد
بکنہ آن نرسد صد ہزار فکر عمیق	چگونہ سر بدر آرد ز قعر بحر عمیق
اگر شراب خوری جرعۂ فشان بر خاک	سپہر پیر ز خونریزیش نباشد باک (۲۱۹)
از آن گناہ کہ نفعی رسد بغیر چہ باک	سر بریدہ خورشید بستہ بر فتراک
ز جیب دختر رز طرفہ میزند رہ عقل	میانہ من و قمری جز این تفاوت نیست
مباد تا بقیامت خراب طارم تاک	کہ او بپایۂ سرو است و من بپایۂ تاک
ہزار دشمنم ار میکنند قصد ہلاک	نگر بمرغ چمن از نتیجہ گل و تاک (۲۲۰)
گرم تو دوستی از دشمنان ندارم باک	گلاب از تو و از من شراب آتشناک
ای رخت چون خلد و لعلت سلسبیل	قائد شوقی از وقت رحیل (۲۲۱)
سلسبیلت کردہ جان و دل سبیل	میروم تا باشدم در رہ دلیل
یارب این آتش کہ در جان منست	بی تو بر من زانگہ گلشن آتش است
سرد کن زانسان کہ کردی بر خلیل	کہ چہ آتش شد گلستان بر خلیل

حافظ	ظہیر
بعزم توبہ سحر گفتم استخارہ کنم	چو غنچہ مردہ دل تا بکی نظارہ کنم (۲۴۳)
بہار توبہ شکن میرسد چہ چارہ کنم	نسیم وصل تو کو تا کہ جامہ پارہ کنم
سخن درست بگویم نمی توانم دید	شباب رفت ز دست و نساختم کاری
کہ می خورند حریفان و من نظارہ کنم	گذشت قافلۂ فیض و من چہ چارہ کنم
ای آفتاب آینہ دار جمال تو	گاہم بدیدہ چہرہ کشاید خیال تو (۲۸۹)
مشک سیاہ مجمرہ گردان خال تو	یکبارہ ناامید نیم از وصال تو

ان اشعار کے مقابلے و موازنے سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ ظہیر نے حافظ کی نقل کی ہے اور وہ یقیناً بہت بعد کا شاعر ہے۔

(۳) دیوان ظہیر فاریابی کے کسی قدیم نسخے میں یہ غزلیں شامل نہیں ہیں، جدید نسخوں میں ان کا شمول الحاق کو بین طور پر ثابت کرتا ہے اور اسی سے ظہیر کے زمانی تاخر کا بھی اثبات ہوتا ہے۔

(۴) تذکرہ نویسوں نے ظہیر فاریابی کی غزلیات کے نمونے نہیں درج کیے ہیں، جدید تذکرہ نویسوں میں صرف احمد علی سندیلوی نے مخزن الغرائب (تالیف ۱۲۱۸ھ) میں زیر نظر دیوان کی ایک غزل (نمبر ۱۰۲) ظہیر فاریابی کے نام سے منسوب کی ہے۔ اگر فاریابی غزل گوئی میں کوئی خاص مرتبہ رکھتا تو تذکروں میں اس کا ذکر ہوتا۔

(۵) ظہیر کے افکار و خیالات جدید ہیں، اور جدید الفاظ و فقرات بھی اس کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ شاعر چھٹی صدی ہجری کے ظہیر فاریابی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، ذیل کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں، الفاظ و فقرات جدید:۔

فرنگ، حسن افرنگ و کلیساے فرنگ:۔

جز حسن فرنگ تو کہ ز اہل کتاب است (ص ۱۹۲)

زلف او چین ست و خالش ہند و رخسارش فرنگ (")

کلیسای فرنگ آن دلی کہ عشق ندارد دلیکہ عشق ندارد کلیسای فرنگ است (ص ۱۹۳)

ز غیرت آتش غم در فرنگ میگیرد (ص ۲۰۶)

فرنگیان بہ بت آزرچہ متہم کردند (ص ۲۳۴)

مسا دمی است برنگ کلیسای فرنگ (ص ۲۵۴)

دارم بت فرنگی و بتخانہ زادہ (ص ۲۶۵)

بتی دارم فرنگی زادہ حسنش کافرستانی (ص ۲۷۹)

فرنگی زادہ شوخی کافری زنّار گیسوی (ص ۲۸۰)

برہمن :-

زیارت کن دلم را ای برہمن (ص ۱۹۶)

کہ غیر برہمنان از بتان چہ میداند (ص ۲۳۰)

تا شیوۂ بتان ز برہمن کنم سوال (ص ۲۶۹)

کہ پرسد رسم آن بت از برہمن (ص ۲۶۴)

دار الشفا :-

ز بو علیم عجب دار الشفائی بر سر کوئی (ص ۲۳۱)

مسیح بردہ دار الشفای اوست علیل (ص ۲۵۵)

کوتوالی :-

در حصار غم بعزم کوتوالی میبردم (ص ۲۶۰)

گاؤتکیہ :-

فارغ چو گاؤتکیہ بدیوار دادہ ام (ص۲۶۶)

افکار و خیالات جدیدہ :-

ہر چند چشم آینہ باریک بین بود ما محو موشگافی مژگان شانہ ایم (ص۲۶۶)
خدنگ قامت من در شباب شد چو کمان چرا کشاکش دوران نکرد راست مرا (ص۱۷۹)
بسکہ گشتم در غم عشقش ز مو باریک تر می تواند داشت چشمش در صف مژگان مرا (ص۱۸۱)
بر سر شاخ شود مرغ چمن سیخ و کباب شوق اگر گرم کند شعلہ آواز ترا (ص۱۸۱)
چشم آہو گر ببیند چشم زہ گیر ترا میدہد چون مغز ما در استخوان تیر ترا
پیکرت آزردہ گردد از لطافت گر کشد بر حریر برگ گل نقاش تصویر ترا
از شہیدان نگاہت ہر گرا فغان بر نخاست دادہ اند از سرمہ گویا آب شمشیر ترا
می شود در جان سنبل رشتہ اش پر پیچ و تاب گر ببیند حلقۂ زلف گرہ گیر ترا (ص۱۸۲)
رسیدہ گوشہ ابرو بہ چشم سرمہ سای او تو پنداری کمانداریست در دنبال آہوئی
دو پستانش ز چاک پیرہن دیدم بدل گفتم تماشا کن کہ سرو ناز بار آوردہ لیموئی
بہ آہو نسبت چشمش چو کردم چین بابرو زد کہ چشم شیر گیر ما ندارد ہیچ آہوئی (ص۲۵۰)

شاید ہی کوئی غزل ایسی ہو جن میں اس طرح کے اشعار نہ پائے جاتے ہوں، جو متاخرین شعرائے فارسی کا انداز ہے، اور متقدمین کے یہاں سرے سے ناپید ہے، اس لیے یہ طرز ظہیر فاریابی کا نہیں ہو سکتا، اور یہی اس کی شہادت خود آقاے رضی دانش کے اس بیان سے ہوتی ہے،

" بعضی از غزلیات ظہیر کہ البتہ بیش از سہ یا چہار غزل نیست در مدح نصرۃ الدین سرودہ شدہ در ہیچ رو با غزلہای دیگر او شبیہ نیست " (مقدمہ ص ۴۵)

غرض ہمعصر بادشاہوں اور حکمرانوں کو شاہ محمد غوثؒ سے خاص عقیدت و محبت تھی، ابوالفضل نے آئین اکبری میں آپ کو اس عہد کے اجلہ مشائخ میں شمار کیا ہے[1]، تھامس ولیم بیل کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ:۔

"آپ مستجاب الدعوات تھے، جو پیشین گوئی فرماتے تھے، پوری ہو جاتی تھی، اس وجہ آپ کافی مشہور و معروف تھے، اور اولو العزم بادشاہ بھی آپکے دربار میں حاضر ہوکر آداب بجالاتے تھے"[2]

نورالدین جہانگیر بادشاہ بھی شاہ محمد غوث گوالیاریؒ کے علوے مرتبت کا قائل تھا، بارہویں جشن نوروز کے ذیل میں جو حالات لکھے ہیں اس میں شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی (متوفی ۹۹۸ھ/۱۵۸۹ء) کے روضہ کی زیارت کے تاثرات کا بیان ہے۔ اسی ضمن میں شاہ محمد غوث گوالیاریؒ کا بھی ذکر آگیا ہے، لکھتا ہے:۔

"شیخ وجیہ الدین، شیخ محمد غوث کے ایسے بلند مرتبہ خلیفہ تھے جن پر خود مرشد کو فخر ہوتا ہے۔ شیخ محمد غوث سے شیخ وجیہ الدین کی ارادت و عقیدت سے خود شیخ محمد غوث کے بزرگ و برتر مرتبے کا پتہ چلتا ہے"[3] (ص ۴۵۰)

---

[1] ابوالفضل = آئین اکبری، جلد اول ص ۴۰۹ مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۹۳۸ء

[2] تھامس ولیم بیل = اورنٹیل بائیوگرافیکل ڈکشنری ص ۱۰۶، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۸۱ء

[3] جہانگیر بادشاہ = تزک جہانگیری (اردو) ص ۴۵۰ مطبوعہ لاہور ۱۹۶۰ء

غزلیاتِ ظہیر اور انکا مصنف

از جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

ظہیر فاریابی (م ۵۹۸ھ[1]) فارسی کے نہایت مشہور و مقبول شاعروں میں ہے، اس کا دیوان متعدد بار زیورِ طبع سے آراستہ ہوا لیکن بدقسمتی سے رطب و یابس سے کبھی پاک نہیں ہوا، ایران میں جو نسخہ لیتھو میں چھپا تھا، اس میں شمس طبسی اور ظہیر اصفہانی کا کلام شامل تھا، اس سلسلے میں ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا تاریخ ادبیات (ج ۲ ص ۷۵۰) میں لکھتے ہیں :-

"اس مطبوعہ نسخے میں ظہیر فاریابی اور شمس طبسی کے کلام شامل ہیں، یہاں تک کہ بعض قصیدوں کے آخر میں شمس تخلص بھی درج ہے، جس سے ناشر نے اپنی علمی کم مایگی سے یہ نتیجہ نکالا کہ ظہیر فاریابی جوانی میں شمس تخلص اختیار کرتا تھا۔ اس نسخے میں بہت سی غزلیں جو ظہیر فاریابی کے نام سے شامل ہیں وہ دراصل ظہیر اصفہانی کی ہیں جو دورِ صفویہ کا شاعر ہے"

نولکشور کے مطبوعہ نسخے میں بھی ظہیر اصفہانی کی غزلیں شامل ہیں چنانچہ حال ہی میں ڈاکٹر غلام مصطفی صدر شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی نے اس طرف توجہ کی اور اپریل ۱۹۶۲ء کے معارف میں ایک فکر انگیز

---

[1] خواجہ عبدالرشید صاحب نے معارف جون ۶۲ء کے شمارے میں اس تاریخ پر ایراد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس غلط تاریخ کے لکھنے سے ڈاکٹر غلام مصطفی کے مضمون کا زور ختم ہو جاتا ہے، خواجہ صاحب نے نولکشور کے چھپے ہوئے نسخے کے خاتمۃ الطبع کی دی ہوئی تاریخ ۵۸۲ھ کو ظہیر کی صحیح تاریخ وفات سمجھا ہے، حالانکہ اس صورت میں ظہیر کا بہت سا کلام دوسرے کا ماننا پڑیگا، دیوان میں ۵۸۲ھ میں ہونے والے طوفان کی پیشین گوئی کے متعلق دو قطعے ہیں، متعدد نظمیں طغرل بن ارسلان (۵۷۳ھ - ۵۹۰ھ) قزل ارسلان (۵۸۱ھ - ۵۸۷ھ)، اتابک نصرۃ الدین (۵۸۷ھ بعد) کی مدح میں ہیں، اس سے صاف ظاہر ہے کہ خواجہ صاحب کا اعتراض بے سود و بے محل

نوٹ شائع کیا ہو کیونکہ اس نوٹ میں ایران کے حال کے چھپے ہوئے نسخے کا حوالہ تھا، اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید ابھی یہ نسخہ ان کے مطالعے سے نہیں گذرا، اس ایرانی مطبوعہ نسخے کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوا کہ اس کے مرتب آقائے ہاشم رضی نے شمس طبسی سے متعلق الحاق کی طرف تو توجہ کی لیکن ظہیر اصفہانی کا کلام اس دیوان میں جوں کا توں رہنے دیا، اور یہ بات بڑی افسوس ناک ہے کہ انھیں اس بات کا علم تھا کہ ظہیر فاریابی اور ظہیر اصفہانی کا کلام گڈمڈ ہو چکا ہے، اس کے باوجود انھوں نے اس کی طرف کسی طرح کا اشارہ کیا اور نہ دونوں کے کلام میں فرق کرنے کی کوشش کی، ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کے مذکورۂ بالا بیان میں ظہیر فاریابی کے کلام میں ظہیر اصفہانی کے اشعار کے ملنے کا صراحۃً ذکر ہے، اور ساتھ ہی ظہیر فاریابی کی غزلیات کی خصوصیات بھی درج کی ہیں، آقائے رضی نے ڈاکٹر صفا کے اس بیان کو تو لے لیا جو خصوصیات سے متعلق تھا لیکن الحاق کے مسئلہ کو یکسر نظر انداز کر دیا، حالانکہ ڈاکٹر صفا نے اس الحاق کی وجہ سے دیوان ظہیر فاریابی کی طباعت پر اس طرح زور دیا تھا:

"بہمین سبب طبع مجددی از دیوان ظہیر لازم بنظر می آید"

ظہیر فاریابی کی طرف منسوب دیوان کے نسخے دو طرح کے ملتے ہیں، ایک وہ جن میں غزل کا حصہ کم وبیش صرف اسی قدر ہے جتنا مطبوعہ دیوان (نول کشور) میں ہے، اس طرح کا ایک نسخہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے کتاب خانے میں موجود ہے جس کی کتابت ۱۲۹۵ھ میں ہوئی ہے، دوسری قسم ان نسخوں کی ہے جن میں غزل کا حصہ بہت ہی کم ہے، بلکہ بعض میں بالکل نہیں ہے، اس قسم کا بھی ایک نسخہ مسلم یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے، اس میں غزلیات کے تحت حسب ذیل غزلیں درج ہیں۔

۱- اقبل الساقی بریحان و روا ح

۲- یامن جوالمعالی یا صارم المہندی،

۳- گر گل رخسار تو عزم گلستاں نمیکند

۴۔ باز شہ بر جانم فراقت پادشاہی میکند

۵۔ یارب سببی ساز کہ آں سرو رواں را

۶۔ ای ہمایوں نظر از من نظری باز مگیر

۷۔ ہنگہ ہر شب در خیالت دیدہ دُر خون کشیم

۸۔ یا رمی خوارۂ من دی قدح بادہ بدست

ان میں پہلی دو کے علاوہ جو قطعات کے ذیل میں تہرانی اڈیشن (ص ۱۶۱، ۱۶۵) میں موجود ہیں بقیہ چھ غزلیں جو اگرچہ تہرانی اڈیشن میں (ص ۲۲۳، ۲۴۴، ۱۸۶، ۲۳۸، ۲۷۱، ۲۰۱) موجود ہیں مگر لکھنؤ اڈیشن میں شامل نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ ایک مزید غزل تہرانی نسخے میں پائی جاتی ہے، جو لکھنؤ اڈیشن کے علاوہ مسلم یونیورسٹی کے نسخے سے بھی خارج ہے، وہ غزل یہ ہے :-

سوز عشقت نشان جان ببرد طاقت از دل ز تن توان ببرد

ان میں تین غزلوں یعنی یہ آخری اور نمبر ۳، ۴ کے پیش نظر ہاشم رضی مرتب نسخہ فرماتے ہیں:

"بعضی از غزلیات ظہیر کہ البتہ بیش از سہ یا چہار غزل نیست در مدح نصرۃ الدین مردو شدہ و بہیچ روی با غزلہای دیگر او شبیہ نیست" (مقدمہ ص ۵۴)

مختصر یہ کہ تہرانی اڈیشن میں ظہیر فاریابی کی بعض اصل غزلیں بھی شامل ہیں جنکی تعداد بہت کم ہے اور جو لکھنؤ اڈیشن میں شامل نہیں لیکن یہ مسلم ہے کہ یہ دیوان ظہیر فاریابی کی تمام غزلوں پر ہرگز حاوی نہیں، سید عبد الرحیم خلخالی نے دیباچہ دیوان حافظ (ص لج) میں ظہیر کی غزل کا ایک مطلع درج کیا ہے، جو مطبوعہ دیوان میں نہیں ہے، وہ مطلع یہ ہے :-

ز خواب خوش چو برانگیخت عزم میدانش مہ دو ہفتہ پدید آمد از گریبانش

۱؎ ڈاکٹر صفا نے ایک یہی غزل نقل کی ہے (تاریخ ادبیات ۲، ص ۷۴۳)

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ نے الحاق کے سلسلہ میں پانچ دلیلیں پیش کی ہیں، جن میں سے پہلی کے علاوہ سب قطعی ہیں، اگرچہ پہلی دلیل یعنی تخلص کا التزام ہر غزل تاحدِ زمانی کا پتا دیتا ہے، بھی کافی وزن رکھتی ہے لیکن قطعی اس لیے نہیں ہے کہ جو غزلیں ظہیر فاریابی کی یقینی ہیں ان میں سے اکثر میں تخلص آیا ہے گو بعض تخلص سے خالی بھی ہیں، آقائے عفا[1] نے بھی ظہیر فاریابی کے تخلص استعمال کرنے کا ذکر کیا ہے،

دوسری دلیل یعنی دیوان میں بعض کتابیں ایسی مذکور ہیں جو ظہیر سے بعد کی ہیں، یقیناً محکم اور قطعی دلیل ہے، خواجہ عبد الرشید صاحب[2] کا یہ استدلال کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مصنف جب کتاب کا نام تجویز کرتے ہیں تو کسی کے کلام سے تراکیب مناسبہ مستعار لے لیتے ہیں، اس لیے ہو سکتا ہے کہ ظہیر فاریابی نے "مخزن اسرار" "گلشن راز"، "شرح مطول" وغیرہ تراکیب کا مناسب استعمال اپنے کلام میں پہلے کر لیا ہو اور بعد میں لکھنے والوں نے ان تراکیب کو مستعار لے کر اپنی اپنی کتابوں کا نام رکھ لیا ہو" نہایت دور از کار اور غلط ہے، البتہ خواجہ صاحب نے یہ صحیح ایراد کیا ہے کہ کیمیائے سعادت ظہیر فاریابی کے بعد کی تالیف نہیں پہلے کی ہے، اس سے واضح ہو گیا کہ دیوان ظہیر میں ایسی کتابوں کے بھی نام ہیں جو ظہیر فاریابی سے پہلے کی ہیں، ایسی حالت میں پہلے کے مصنف نے دیوان ظہیر سے کیونکر نام مستعار لیا، حقیقت یہ ہے کہ ظہیر کی طرف منسوب غزلوں میں کتابوں کا نام استعارةً آیا ہے، ان میں ایسی بھی کتابیں ہیں جو فاریابی سے پہلے کی ہیں اور ایسی بھی ہیں جو اس سے بعد کی ہیں، بعد کی کتابوں کا نام آنا اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ یہ دیوان ظہیر فاریابی کا نہیں ہو سکتا، اگر ان تمام ابیات کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو بات بالکل صاف ہو جاتی ہے، مثلاً ایک[3] جگہ ہے،

یک شمہ از شفا و اشارات چشم یار	افشا مکن کہ بے خبران را خبر شود
شرح مطول سر زلف تو بر ہم است	پنداشت دل چو رمز لبت مختصر شود

---

[1] تاریخ ادبیات ج ۲ ص ۷۵۳، [2] معارف جون ۱۹۷۰ء ص ۴۶۲، [3] دیوان ص ۲۳۲

یا مثلاً یہ شعر[1]:-

اکسیر کیمیائے سعادت دل نست گوگرد احمرم کہ طلا را کند نحاس

یا مثلاً یہ چند بیت[2]:-

مطربا کاش بہ قانون بنوازی ما را کز رگ جان حزیں رشتۂ ساز آوردم

شرح ابروش ز دیباچۂ آں چہرہ ظہیر شاہ بیتی است کہ از گلشن راز آوردم

مخزن اسرار معنی ابر گوہر بار ماست[3] درّ درج معرفت لعل لب گفتار ماست

ان سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ ان اشعار کے مصنف نے "شفا" "اشارات" "شرح مطول" "کیمیائے سعادت" "قانون" "گلشن راز" اور "مخزن اسرار" کا ذکر کتاب سمجھ کر کیا ہے، شرح، دیباچہ، بیت کے ساتھ گلشن راز سوائے محمود شبستری (م ۷۲۰ھ) کی مشہور و معروف کتاب کے اور کیا ہو سکتی ہے، اسی طرح جہاں "شفا"، "اشارات"، "شرح مطول" کا ذکر ہے، ان سے سوائے ابن سینا کی "کتاب الشفا" اور "کتاب الاشارات" اور تفتازانی (م ۷۹۲ھ) کی کتاب مطول کی شرح کے اور کیا سمجھا جائے، اس سے واضح ہے کہ مصنف دیوان نے دیدہ و دانستہ ان کتابوں کا ذکر کیا ہے، جن میں سے ابن سینا (متوفی ۴۲۸ھ)، امام غزالی (متوفی ۵۰۵ھ) دونوں قطعاً فاریابی سے متقدم اور نظامی معاصر[4]، اور گلشن راز اور شرح مطول کے مصنفین بعد کے ہیں، اس سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو گئی کہ زیر نظر دیوان ہرگز ظہیر فاریابی کا نہیں ہو سکتا، اسی لیے خواجہ عبدالرشید صاحب کا قیاس بے معنی ہے،

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ کا یہ استدلال کہ جس دیوان میں چہار باغ اصفہان کا ذکر آئے وہ ظہیر فاریابی

---

[1] دیوان ص ۲۰۳ [2] ایضاً ص ۲۶۱ [3] ایضاً ص ۱۹۲ [4] نظامی کی تاریخ وفات میں سخت اختلاف ہے، مختلف تذکروں میں مختلف تاریخیں ملتی ہیں یعنی ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۹۲، ۵۹۹، ۶۰۲، ۶۰۶، ۶۱۹ آقائی صفائے ۶۱۴ ہجری صحیح بتائی ہے،

کا کیونکر ہو سکتا ہے، کس قدر دقیق ہے، چار باغ والے شعر کو ایک اور بیت سے ملا کر پڑھیے تو صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ مصنف اصفہان کا باشندہ ہے، مثلاً

ز سیر چار باغ از دیدہ ام زایندہ رود آمد | صفاہان بر من بیچارہ زندان است در واقع
ساز عراق کن کہ دولت داشو وظہیر | کی بینو است تا بود اندر وطن گرا

ظہیر فاریابی کا وطن فاریاب ہے، اصفہان اور عراق سے اس کا کیا تعلق؟

چار باغ کی بنیاد ۱۰۰۶ھ میں پڑی، اس کی تفصیل دربادی مورخ اسکندر منشی نے عالم آرائے عباسی (ج ۲ ص ۵۴۴، ۵۴۵) میں سال یازدہم جلوس کے تحت بیان کی ہے، چند جملے ملاحظہ ہوں:

لہٰذا دریں سال مطابق ست والف ہجری است رای جہاں آرای بداں قرار گرفت کہ دار السلطنت مزبور (اصفہان) رامقر دولت ابد مقرون ساختہ عمارات عالی طرح نمایند ..... وایام بہار ..... از درب شہر یک دروازہ در حریم باغ نقش جہاں واقع و بدرب دولت موسوم است از آنجا تا کنار زایندہ رود خیابانی احداث زمودہ چہار باغی در ہر دو طرف خیاباں و عمارات عالیہ در درگاہ ہر باغ طرح انداختند ...

در تاریخ طرح چار باغ گفتہ شدہ بود۔

عجب چار باغی است بہجت فزا | گرش ثانی خلد گویند شاید
چو تاریخ آں دل طلب کرد گفتم | بہ نالش بکام دل ستم بر آید

اسی ضمن میں ایک قابل توجہ بات یہ ہے کہ زیر بحث دیوان کا مصنف کرمان میں بھی رہا ہو اور چونکہ ظہیر فاریابی کا کرمان سے کسی قسم کا تعلق ظاہر نہیں ہے، اس سے بھی توثیق ہوتی ہے کہ یہ دیوان[1] فاریابی کا نہیں۔

ما را برات رزق ز کرمان بریدہ شد | زیں پس بنام شاہ خراساں نوشتہ اند

[1] سب سے اہم ثبوت جس کا ذکر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ نے کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ اس نے ایک قطعہ میں اپنے کو صائب کا شاگرد بتایا ہے۔
بشعر تحفہ از آن میکند ظہیر کہ مہر | چو خامہ بر خط تعلیم صائبا داد

حسین[۲] ان کے مجموعہ "بہترین اشعار" میں ظہیر اصفہانی کے نام کے جو شعر اس دیوان میں موجود ہیں جن کی طرف ڈاکٹر[۳] غلام مصطفےٰ نے اشارہ کیا ہے، ان کے علاوہ بعض اور کتابوں میں ظہیر فاریابی اور ظہیر اصفہانی کے نام سے الگ الگ اشعار درج ہیں، مثلاً "گلزار ادب" (مرتبہ حسین کی چاپ دوم ۱۳۲۰ شمسی) میں گیارہ متفرق ابیات کے تحت ظہیر اصفہانی کا تخلص مع وطنی نسبت کے موجود ہے، منجملہ ان کے دو غزلوں[۴] کے پورے اشعار درج ہیں، ان میں سے یہ دو ابیات اس دیوان میں نہیں[۵]

بوسہ ای بخشیدہ دو چشم ز آن دہن | دہ چناں تنگی نہ ہی بخشندگی

بجاں فروشی اگر بوسہ زاں لب شکرم | قسم بجاں عزیزت کہ رایگاں نخرم

اسی سلسلے میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ظہیر فاریابی کے نام سے جو چند ابیات "گلزار ادب" (ص ۱۸۳ - ۲۱۲) میں درج ہیں، ان میں سے دو بیت دو غزلوں کی ہیں، جو اس تہرانی ایڈیشن میں شامل ہیں (دیکھئے ص ۱۹۸، ۱۸۴ بالترتیب) اس سے واضح ہے کہ مرتب "گلزار ادب" اس الحاق کے معاملے کو پوری طرح سلجھا نہ سکے۔

ذیل میں چند امور کی طرف مزید توجہ دلائی جاتی ہے:

۱- دیوان ظہیر فاریابی میں بعض جگہ طرز خط استعارۃً استعمال ہوا ہے، مثلاً

دد دلم از خط سبز خود سوادی دید و گفت | کیں سفال کہنہ مشق خط ریحاں میکند (ص ۳۳)

خط یاقوت شدہ نسخ از غبار سبز خط او | ہنوزش سر زند بینی و ریحان است در دو تا

ندارد رتبہ چنداں کہ ریحاں خوانم آن خط را | خط دو رعذارش خط قرآن است در دو تا

خط ریحاں تو قدیم ہے اور اس کی ایجاد کا سہرا ابن مقلہ (م ۳۲۸ھ) کے سر باندھتے

---

[۱] دیکھئے ص ۲۰۲ اور ۳۲۸۔ یہ دونوں غزلیں دیوان کے ص ۱۹۸ (نمبر ۹۰) اور ص ۲۸۰ (نمبر ۴، ۳) پر موجود
[۲] ریحاں کے علاوہ اس نے محقق، ثلث، نسخ، توقیع، رقاع بھی ایجاد کئے، گویا جتنے قدیم خط تھے سب ا[ن]
کی جدت طبع کا نتیجہ ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھئے "پیدائش خط و خطاطان" ص ۹۰ - ۱۰۷)

(۶) دیوان کی ایک غزل سے پتا چلتا ہے کہ ظہیر کا رفیق کشمیری تھا جو تازہ تازہ عراق آیا تھا، یہ آمد و رفت تاخر زمانی کا پتہ دیتی ہے۔ اور دوسری طرف اس سے شاعر کا وطنی یا یا سکونتی تعلق اصفہان سے ظاہر ہوتا ہے، غزل (نمبر ۲۲) یہ ہے،

چیست بر زخم دلم ای بت کشمیر نمک ناوکت داشت مگر تعبیر در تیر نمک

تا زہند آمدی ای کان ملاحت بعراق گشتہ یادت بدل مردم کشمیر نمک

ای ملاحت کہ ترا تعبیر در قند لب است دایۂ تو مگر آمیختہ در شیر نمک

ان معروضات میں سے اگر سوائے نمبر (۱) کے کوئی قطعی نہیں، پھر بھی انھیں اگر ان تاریخی حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے ــــ شاعر اپنے کو صائب کا شاگرد قرار دیتا ہے، چار باغ اصفہان کا ذکر کرتا ہے، وغیرہ وغیرہ ــــ تو یہ امور اسی نتیجے پر پہنچائیں گے کہ ظہیر جس کا دیوان ہمارے پیش نظر ہے وہ یقیناً ظہیر فاریابی سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھتا،

اردو کے چند مظلوم ادیب

از

جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

شہرت اور کمال فن مترادف نہیں، کتنے ہی طبیب حاذق، شہرت عام سے محروم ہیں، اور کتنے ہی "نام آور" طبیب حذاقت فن سے کورے نکل جاتے ہیں، اور ایک طب نہیں، شعر، ادب، صحافت، وکالت ہر علم، فن اور پیشہ میں یہی حال نظر آتا ہے، اس وقت کے چند ایسے ہی ادیبوں کے نام گنا دیتے ہیں، جنھیں شہرت کا وہ مرتبہ حاصل نہ ہو سکا جس کے مستحق اپنے کمال فن کے لحاظ سے تھے ۔ غیر معروف رہ جانے کے اسباب متعدد ہو سکتے ہیں، اور یہاں مقصود اُن اسباب کی تشخیص اور ان کا تجزیہ نہیں، بلکہ نفس واقعہ یعنی ان ادیبوں کی نا ملکہ مظلومیت کا ذکر کر دینا ہے ۔

ان مظلوموں میں نمبر اول پر مولانا ابو الکلام آزاد ہیں، مولانا کی نفس شہرت میں ان کی شخصیت اتنی زبردست تھی کہ اس نے ملک وملت کے گوشہ گوشہ پر اثر ڈالا ہے ، ا کی دنیا ان کے نام کی آواز سے گونج رہی ہے ۔ سوال ان کی عمومی شہرت کا نہیں، ا شہرت کا ہے ۔ تاریخ ادب اردو میں اب تک خدا معلوم چھوٹی بڑی کتنی کتابیں لکھی ان میں سے کتنوں میں اُن کے ادبی مرتبہ کا ذکر ہے ؟ اسے بھی جانے دیجئے ۔ ان کا نام نا کتابوں میں آیا ہے ؟ ان کی کتابیں، سرکاری و خانگی، ملکی و ملی، کتنی درسگاہوں کے ا

یں داخل ہیں؟ کتنوں کو اس کا علم ہے کہ ان کی تحریریں اردو ادب و انشا کے بہترین نمونوں کا کام دے سکتی ہیں؟ کتنے اس سے باخبر ہیں کہ مولانا کی سیاسی سربلندیوں اور مذہبی عظمتوں یں ایک ٹی ہی حد تک دخل مولانا کے ادب و انشا کو بھی رہا ہے؟ کتنوں کی رسائی اس حقیقت تک ہے کہ موافقین ہی نہیں، مولانا کے مخالف بھی ان کے کمال انشا کے قائل و معترف، اور ان کے زورِ قلم سے متاثر رہے ہیں؟ بہتوں کے کان یں یہ بھنک بھی پہنچی ہے کہ مولانا کی نظر، زبان، خصوصاً زبان دہلی کے کن کن گوشوں اور باریکیوں پر تھی، اور انھیں زبان کے محاورات، کنایات، تلمیحات پر کس درجہ عبور حاصل تھا!

مولانا ابوالکلام کے ساتھ ہی یاد دہلی کے ایک دوسرے مظلوم ادیب خواجہ حسن نظامی کی آجاتی ہے۔ ان کے قلم یں آزاد کی سی عظمت و بلندی نہ تھی، لیکن سلاست اور دلنشینی، درد و گداز، ترنم و شیرینی، تاثیر و کشش یں خواجہ صاحب کسی سے نیچے اور کسی سے پیچھے نہ تھے، ابوالکلام اگر خواص کے ادیب تھے، تو خواجہ صاحب عوام کے۔ اور دہلی کی مستند اور ٹکسالی زبان پر عبور یں بھی یہ اپنی نظیر آپ تھے۔ عام اردو داں طبقہ کے سکھانے، پڑھانے، اسے مہذب و شائستہ بنانے، اسے ادب تک قاعدہ سے لگانے یں جو حصۂ عظیم خواجہ صاحب کا رہا ہے، وہ ہر اہ کے بس کی بات نہ تھی۔ اور کسی ایک انسان کے لیے یہی باعث فخر ہو سکتا ہے۔ رنج کی بات ہے کہ ایسے محسن اردو کو اس درجہ بھلا دیا گیا! اور بھلا کیا دیا گیا، انھیں اردو ادب کے تاریخ نویسوں نے یاد ہی کب رکھا تھا! کسی تاریخ ادب یں غریب کا نام تک بھی شاید نہیں آنے پایا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی دینی، علمی، فاضلانہ، محققانہ شخصیت ہندوستان و پاکستان ہی کو نہیں، کہنا چاہیئے کہ عالم اسلام کو مسلّم ہے، لیکن انتہائی حق تلفی سید صاحبؒ کی ادبی حیثیت سے ہو رہی ہے، مدیر معارف اور مصنف نقوش سلیمانی کی ذات اس کا حق رکھتی تھی کہ اس کے ادب پا یے

نصابِ ادب کے مختلف کلاسوں میں داخل ہوتے، اور تاریخ ادب کے اوراق میں اس کا نام ادب و احترام کے عنوان جلی کے ساتھ درج ہوتا۔

محمد علی کا نام ملک و ملت کے بلند پایہ رہنما، اور ایک فعّال عوامی لیڈر کی حیثیت سے ممکن ہے کہ رہتی دنیا تک رہ جائے، اور نہ صرف ہندوستان و پاکستان کے مسلم و غیر مسلم بلکہ عالم اسلام کے باشندے بھی انھیں خراج عقیدت مدتوں ادا کرتے رہیں۔ جوہر کے شاعرانہ جوہر، اور ایڈیٹر کامریڈ کی انگریزی انشا پردازی بھی ممکن ہے کہ کچھ لوگوں کو مسلّم رہے، لیکن مولانا نے باوجود اردو کے مصنف نہ ہونے کے، اپنے سیکڑوں اردو مقالوں اور خطبوں سے جو مستقل اثر اپنے وقت کے اردو ادب پر چھوڑا ہے، اس کی طرف سے آنکھ بند کر لینا ایک اعلیٰ درجہ کی حقیقت ناشناسی ہی ہے، محمد علی کی ہر تحریر، خواہ وہ خفگی اور غصہ کے ہیجان میں لکھی گئی ہو، یا مسرت و انبساط کے جوش میں، مایوسانہ ہو، یا پُر امید، ہر حال اور ہر صورت میں اپنے اندر ایک جان رکھتی تھی۔ اور اپنے لکھنے والے کی زندہ متحرک، فعّال جاندار شخصیت کی آئینہ دار بھی ہوتی تھی ــــــ ظلم ہے ظلم کہ ایسے جاندار ادیب کو ادب کی تاریخ میں جگہ نہ ملے۔

دہلی کے راشد الخیری اور لکھنؤ کے رتن ناتھ سرشار، دونوں کے نام افسانہ نویس کی حیثیت سے اب بھی زندہ ہیں، اور افسانہ بھی ادب ہی کی ایک شاخ ہے، لیکن انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں کے نام، خالص ادب کی تاریخ میں بھی جگہ پائیں۔ افسانوی دلکشی سے بالکل قطع نظر، دونوں کے ان اوراق میں گویا دہلی اور لکھنؤ کی زبانوں کا عطر کشید کیا ہوا موجود ہے ــــ اردو زبان کی ترکیبوں، تشبیہوں، استعاروں، تلمیحوں، محاوروں کے لیے دونوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

ریاض خیرآبادی اور حسرت موہانی بھی اس باب میں کم نصیب ہی واقع ہوئے ہیں،
دونوں کی شاعرانہ عظمت مسلّم۔ دونوں کے رتبۂ استادی کا بھی اعتراف سب کو۔ لیکن طلبۂ ادب
کی اس محرومی کو کیا کہیے کہ نہ ریاض کے ناولوں اور ریاض الاخبار کی زبان کی شستگی و لطافت
کی کسی کو کانوں کان خبر۔ اور نہ حسرت کے اردوئے معلّی کی اردو آموزی اور ایک پختہ اور مستقل طرزِ
نگارش سے کوئی واقف ۔ حضرت اکبرالہ آبادی بہ حیثیت شاعر، شہرۂ آفاق ہیں لیکن شاعری
کی یہ شہرۂ آفاقی ان کی نثاری کے حق میں حجاب اکبر بن گئی، کمتر ہی کسی کو علم ہوگا کہ اکبرایک زمانہ
میں اودھ پنچ میں خوب داد نثر نگاری دے چکے ہیں، اور ان کے خطوط کے جتنے مجموعے اب تک
چھپ چکے ہیں، وہ چہرۂ ادب کی مشاطگی کے لیے بالکل کافی ہیں۔ چھوٹے، ہلکے پھلکے، سبک و
لطیف جملے ادب و انشاء کی جان!

لکھنؤ کے منشی سجاد حسین (اودھ پنچ کے ایڈیٹر اور کئی کئی ناولوں کے مصنف) اور
دہلی کے میر ناصر علی (صلائے عام کے اڈیٹر) بھی عجب کس مپرسی کے شکار ہو کر رہے ہیں۔
صلائے عام کا دائرۂ اشاعت تو خیر پھر محدود تھا، لیکن اودھ پنچ تو اپنے زمانہ میں خوب چمکا۔
وقت کے خواص و عوام دونوں طبقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ آج یہ معلوم ہوتا ہے
کہ جیسے دونوں میں سے کسی کا وجود ہی کبھی نہ تھا ۔ زبان کی صحت کا دونوں کو خاص اہتمام،
بلکہ التزام تھا۔ اور اودھ پنچ، اور اس کے اڈیٹر کے ناولوں کے چٹکلے اور لطیفے تو کہنا چاہیے
کہ زبان زدِ عام ہو چکے تھے، لیکن وائے زمانہ!

کوئی لیتا نہیں اب ان کا نام

مرزا فرحت اللہ بیگ اور قاضی عبدالغفار تو گویا ابھی کل ہی تک ہمارے درمیان
زندہ و سلامت تھے۔ اور کس دلآویزی سے، کس خوش نوائی سے چہکتے رہتے تھے۔ یکا یک

نذر فراموشی ہو گئے۔ مرزا صاحب کی ٹکسالی اردو کا کیا کہنا۔ اہل زبان ہی تھے۔ اور انکی
لطیف، جمیل نثر کا کیا پوچھنا، قاضی صاحب گو اہل زبان نہ تھے، لیکن اپنی برجستگی، بذلہ سنجی،
میں صحت زبان کے اہتمام کے ساتھ کسی اہل زبان سے کم بھی نہ تھے۔ حیف کہ اتنی جلد دونوں
طاقِ نسیان پر بٹھا دیے گئے۔ ابھی کچھ دن تو دونوں کو ہرحال رونقِ بزمِ ادب رہنا تھا
—— اور یہ تثلیث مکمل ہو جائے، اگر اس ذیل میں نام عبدالمجید سالک کا بھی لے لیا جائے۔
یہ محض اتفاق ہے کہ سالک مرحوم اخبار نویس ہو پڑے، ورنہ ان کا قلم صحافت سے
زیادہ ادب کے میدان میں رواں تھا۔ اور اگر کسی کو ان کے صحافی ہی رکھنے پر اصرار ہو
جب بھی انھیں ایک ممتاز ادیب صحافی تو ہرحال ماننا پڑے گا۔

سید محفوظ بدایونی (علیگ) اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (صدریار جنگ)
بھی اپنی اپنی جگہ پختہ قلم ادیب ہوئے ہیں، ایک ظریفانہ رنگ میں، دوسرے سنجیدہ شوخی
لیے ہوئے۔ دونوں کے چند مقالے بھی اگر پڑھ لیے جائیں تو ذوقِ سلیم پر جلا ہو جائے۔ اور
شریفانہ ادب کے معنی روشن ہو جائیں۔

مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کا نام اور کام مدتوں چلا، لڑکوں کی کم سے کم دو نسلوں کو
اردو تو انھیں کی ریڈروں کے طفیل آئی۔ جو بڑا کام وہ کر گئے اسے مٹنا کبھی بھی نہ تھا،
الیاس احمد مجیبی بیچارے ع

خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

کے مصداق ثابت ہوئے۔ مشہور ہونے ہی کہاں پائے تھے کہ گمنام ہو گئے! لیکن بچوں
کے ادب کے لیے جو کام کر گئے، وہ ان ہی کا حصہ تھا۔ کوئی دوسرا ان کی ٹکر کا نظر نہیں آتا۔
اور مرحومین کی فہرست میں سب سے آخر چودھری محمد علی ردولوی۔ "اخر" ترتیب زمانی

کے لحاظ سے، نہ کہ مرتبہ وحیثیت ادبی کے لحاظ سے۔ لکھنؤ کی پیاری زبان کے ماہر۔ بات بات میں موتی پرونے والے۔ جس نے انھیں نہیں پڑھا، وہ لطف زبان کے چٹخارے سے محروم ہی رہا ـــــ اور جی میں آتا ہے کہ خواجہ عبدالرؤف عشرت کا نام خاتمہ پر لاکر ان سارے گمنام ومظلوم خادمانِ ادب پر حسرت کے ساتھ فاتحۂ خیر پڑھ دیجئے۔

زندہ حضرات پر قلم اٹھانا ذرا مشکل ہی ہوتا ہے، اور پھر ماشاء اللہ جب ان کی تعداد بھی خاصی بڑی۔ پھر بھی دو چار نام لیے بغیر تو چارہ ہی نہیں۔ خواجہ محمد شفیع دہلوی ثم لاہوری، سید ہاشمی فریدآبادی ثم لاہوری اور ملا واحدی دہلوی ثم کراچوی اپنے اپنے طرز خاص کے مالک ہیں۔ اور جس ادبی شہرت کے مستحق ہیں، وہ اب تک ان کے حصے میں نہیں آئی ہے۔ واحدی صاحب کا طبعی انکسار انھیں گمنام رکھنے میں مدد دے رہا ہے، اور سید ہاشمی کی روشناسی مورخ کی حیثیت سے کچھ اس غضب کی ہوئی کہ ان کے ادبی چہرہ کا رنگ روپ سب ماند ہی پڑ گیا ـــــ اور ایسا ہی کچھ حال مہر صاحب لاہوری کا ہے۔ ابوالکلام ثانی تو کوئی اب ہونے سے رہا، پھر بھی ابوالکلامی طرز و اسلوب کی کچھ جھلکیاں اگر نظر آتی ہیں تو مہر ہی کے ہاں۔

آل انڈیا ریڈیو دہلی کے حضرت "آوارہ" (سید آل عبا مارہروی) اپنی ذات سے خود ایک انجمن یا ادارہ ہیں۔ ہر ہر طبقہ کی زبان پر جو عبور کامل انھیں ہے وہ بس ان ہی پر ختم ہے۔ اور میرے لیے تو قابلِ رشک ہے۔ اور زبان سے مراد محض الفاظ کا تحریری استعمال نہیں، بلکہ تلفظ اور لب ولہجہ اور آواز کا اتار چڑھاؤ سب اسی میں داخل ہے۔ "من کی موج" کے مصنف کی یہ گمنامی جتنی حیرت انگیز ہے، اتنی ہی طائفہ ادب کے لیے تاسف انگیز بھی۔

مدیر معارف مولوی شاہ معین الدین احمد ندوی (مصنف "ادبی نقوش") اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر آفتاب احمد رو دولوی بھی صحیح، سادہ، سلیس، شگفتہ زبان لکھنے والوں میں ممتاز ہیں۔ لیکن اپنے استحقاق سے کہیں کم درجہ میں مشہور ـــ اور ڈاکٹر عابد حسین (جامعہ ملیہ والے) کا ادبی کام گو مقدار و کمیت میں بہت کم ہے۔ لیکن کیفیت و مرتبہ میں بہتوں سے زیادہ بلند ـــ گمنام ترین ہستی ان ادبی مظلوموں کی فہرست میں علی گڑھ کے مرد بزرگ مولوی مقتدیٰ خاں شروانی اطال اللہ عمرہ کا ہے، بلکہ عجب نہیں جو بہت سے اس پر چونک پڑیں کہ ان کا نام ادیبوں کے زمرہ میں آیا کیسے!

سب سے آخری نام اس فہرست میں جوش ملیح آبادی ثم کراچوی کا آتا ہے۔ جن کی شاعری کی دھوم دھام نے ان کی نثر نگاری کے چہرے پر گہرا نقاب ڈال رکھا ہے۔ الفاظ کے صحیح و بامحل استعمال پر جو قدرت انھیں حاصل ہے، کم ہی کسی کو ہے۔ اور زبان کے جن جن گوشوں پر ان کی نظر پہنچ چکی ہے، کمتر ہی کسی اور کی پہنچی ہے۔

معارف: مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے مذکورۂ بالا مضمون میں اردو زبان و ادب کی تصانیف کتابوں کے مولفین اور اس کے تاریخ نگاروں کی جس فروگذاشت کی جانب توجہ دلائی ہے، اس کے علاوہ بھی بعض باتیں قابل توجہ ہیں جن کا اس مضمون میں ذکر نہیں ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ انکی جانب بھی اشارہ کر دیا جائے، نئے ادیبوں میں، ادب کا معیار اور ادب نام ہے صرف ترقی پسند شاعری، افسانہ نگاری اور جدید طرز تنقید کا، نئے بازار میں اسی سکہ کا چلن ہے، اس کے علاوہ ہر سکہ ٹکسال سے باہر ہے، چنانچہ آجکل ہر نو آموز ترقی پسند شاعر، افسانہ نویس اور تنقید نگار شاعر اور ادیب عزاز اور جلیل ہے، اور دوسرے ادیب و اصحاب قلم، رجعت پسند جنکی نئی بزم ادب میں کوئی جگہ نہیں ہے، اس سے انکار نہیں کہ ادب اور تنقید بھی ایک ترقی پذیر چیز ہے اور دوسرے علوم وفنون

کی طرح اس زمانہ میں اس میں بھی بڑی وسعت پیدا ہوگئی ہے اور اس کی بعض چیزیں قابلِ اخذ و استفادہ بھی ہیں جن سے ہمارے ادب میں مفید اضافہ ہوا ہے، لیکن محض ترقی پسندانہ شاعری، افسانہ نویسی اور تنقید نگاری ہی کل ادب نہیں ہے، بلکہ اس کا ایک حصہ ہے، ادب کے دائرہ کی یہ تحدید خود ترقی پسند ادب کے لیے بھی مضر ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ اس کا دامن افسانہ اور تنقید کے علاوہ ہر قسم کے سنجیدہ لٹریچر سے خالی ہے، اور خالص ادب میں بھی وہ آج تک کوئی ایسی چیز نہ پیش کر سکا جو ہماری کلاسیکل کتابوں کی طرح ادب و تنقید ادب کے نصاب کا کام دے سکے جس کا احساس خود صاحبِ نظر ترقی پسند ادیبوں کو بھی ہے۔

دوسرے ہر زبان اور اس کے ادب کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے، اور وہ دوسری زبانوں کے ادبی معیاروں اور تنقیدی پیمانوں کو اسی حد تک قبول کر سکتی ہے جس سے اس کے مزاج میں فرق نہ آنے پائے، جس کا ترقی پسند ادیب بہت کم لحاظ رکھتے ہیں، اور بعض اوقات انکی تنقیدیں اردو زبان کے مزاج سے اس قدر دور ہو جاتی ہیں کہ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اردو زبان و ادب کی تنقید ہے، بلکہ اس کے جملے، فقرے تک اس سے ہم آہنگ نہیں ہوتے، بیشتر تنقیدوں میں الفاظ کا ذخیرہ زیادہ اور مغز و معنی کم ہوتے ہیں، ان سے ادب کا تجزیہ و تحلیل بلکہ اس کا پوسٹ مارٹم تو ضرور ہو جاتا ہے لیکن خالص ادبی تنقید جس سے ادب کا صحیح ذوق اور اس کی پرکھ پیدا ہو، بہت کم ہوتی ہے، اس سے شاید ہمارے ترقی پسند دوستوں کو بھی انکار نہ ہو کہ ہماری پرانی ادبی اور تنقیدی کتابوں آبحیات، سخندانِ فارس، مقدمۂ شعر و شاعری، شعر العجم، موازنۂ انیس و دبیر اور کاشف الحقائق وغیرہ سے جو ادبی بصیرت پیدا ہوتی ہے، وہ ترقی پسند ادب کے پورے ادبی و تنقیدی ذخیرہ سے نہیں پیدا ہو سکتی خود ترقی پسند ادیبوں میں وہی ادیب ادبی بصیرت اور ادب کا صحیح اور پختہ مذاق رکھتے ہیں، جو قدیم ادب کے

ذوق شناس ہیں، اور اس پر گہری نظر رکھتے ہیں،

اس تحریر کا مقصد یہ ہے کہ جو تنگ نظری ہمارے بعض قدیم شعراء اور ادیبوں میں تھی کہ وہ اپنے دائرے سے ایک انچ بھی باہر قدم نکالنا پسند نہ کرتے تھے اور نئی چیز سے بھڑکتے تھے، اور اس کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، وہی تنگ نظری ترقی پسند ادیبوں میں بھی ہے، انھوں نے بھی ادب کا دائرہ بہت تنگ کر دیا ہے، اور اپنے حدود میں اپنے طائفہ کے علاوہ کسی کو گھسنے نہیں دیتے اور چونکہ نئی ادبی دنیا پر ان ہی کا قبضہ ہے، اس لیے بہت سے ادیب اور اصحاب علم و قلم اپنے حق سے محروم رہ جاتے ہیں، یہ چیز اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے مضر ہے، اس کی متوازن اور صحت مند ترقی دونوں کے اشتراک و تعاون، ایک دوسرے کی حق شناسی و قدر دانی اور جدید و قدیم ادب کے اچھے عناصر کے معتدل امتزاج ہی سے ہو سکتی ہے،

شعر العجم حصہ اول

فارسی شاعری کی تاریخ جس میں شاعری کی ابتدا، عہد بعہد کی ترقیوں اور ان کے خصوصیات و اسباب سے مفصل بحث کی گئی ہے، اور اسی کے ساتھ تمام شعراء (عباس مروزی سے نظامی تک) کے تذکرے اور ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ ہے۔

ضخامت ۳۰۸ صفحے قیمت :- للعہ

(مطبوعہ معارف پریس)

"منیجر"

نارجیل سے نخیل تک

از
جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

(۶)

خلیج عربی کے ساحلی مقامات کے علاوہ ہندوستان کے لوگ جزیرہ نمائے عرب کے اندرونی مقامات میں بھی رہتے تھے اور ان کی مستقل آبادیاں تھیں، چنانچہ عرب کے وسطی علاقہ نجد میں ہندوستانیوں کا پتہ چلتا ہے جو عہد نبوی سے وہاں آباد تھے، اور عہد رسالت کے بعد تک اپنے مذہب پر قائم رہے، اور ردت کے زمانہ میں کفار و مشرکین اور مرتدین کی یوں مدد کی کہ ان کو ہندوستان کے بنے ہوئے اسلحۂ جنگ دیے جو مسلمانوں کے مقابلہ میں استعمال کیے گئے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عربوں نے یہ ہندوستانی اسلحہ ان سے خریدے ہوں یا ہندوستان سے لے گئے ہوں، مگر غالب گمان یہی ہے کہ انھوں نے عربوں کی مدد کے لیے خود ہی یہ پیش کش کی تھی، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے فوراً بعد جب نجد کے علاقہ یمامہ میں مسیلمہ کذاب نے کھل کر مسلمانوں سے مقابلہ کیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو مسیلمہ کذاب اور اس کی فوج سے لڑنے کے لیے روانہ فرمایا، جب وہ یمامہ کے قریب پہنچے تو مسیلمہ کذاب کی قوم بنو حنیفہ کی ایک جماعت سے مڈبھیڑ ہوئی، اور مجاعہ بن مرارہ بن سلمی کے علاوہ سب قتل ہوئے، حضرت خالدؓ نے مجاعہ کو گرفتار کرکے اپنے ساتھ لیا اور یمامہ سے ایک میل دوری پر پڑاؤ ڈالا، جب یمامہ والوں کو خبر ہوئی تو مقابلہ کی نیت سے باہر نکلے، اس وقت ان کے ہاتھوں میں تلواریں چمک رہی تھیں، ان کو دیکھ کر حضرت خالدؓ کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ آپس ہی میں لڑ گئے ہیں، جب مسلمان فوجوں سے اس کا تذکرہ کیا تو مجاعہ نے بتایا کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ یمامہ کے لوگ جنگ کی تیاری میں اپنی ہندی تلواریں صاف کر رہے ہیں اور ان کو دھوپ دکھا رہے ہیں۔ بلاذری نے لکھا ہے:

فرأى خالد البارقة فيهم، فقال	حضرت خالدؓ نے انکے اندر تلواروں کی چمک دیکھی تو
يا معشر المسلمين قد كفاكم الله شؤونة	فرمایا کہ اے مسلمانو! اللہ نے تم کو دشمن کی مصیبت سے
عدوكم، الا ترونهم وقد شهر بعضهم	نجات دیدی، وہ دیکھو دشمن آپس ہی میں ایک دوسرے پر
السيوف على بعض واحسبهم قد اختلفوا	تلواریں کھینچے ہوئے ہیں، میرا خیال ہو کہ ان میں
ووقع بأسهم بينهم، فقال مجاعة هو	اختلاف ہو گیا ہو اور وہ آپس میں لڑ پڑے ہیں، یہ سنکر
في حديثه، كلا، ولكنها الهندوانية خشوا	مجاعہ نے کہا یہ بات نہیں ہو بلکہ یہ ہندستانی تلواریں
تحطمها فأبرزوها للشمس لتلين متونها[1]	ہیں جنکو انھوں نے دھوپ میں رکھکر صاف کرنا چاہا ہے

اس روایت سے معلوم ہوتا ہو کہ یمامہ اور آس پاس میں آباد ہندستانیوں نے مسیلمہ کذاب اور اسکے متبعین کو ہندوستان کی بنی ہوئی بہترین تلواریں دی تھیں، جو عرب میں قدیم زمانہ سے مشہور تھیں یمن کے مشہور شہر نجران میں بھی عہد رسالت میں بکثرت ہندستانی آباد تھے، اور نجران کے عرب ان کی زندگی اور لباس وغیرہ کو بڑی حد تک متاثر تھے، اس کا ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جملہ سے ملتا ہے، وہ یہ ہو کہ ربیع الآخر یا جمادی الاولیٰ سنہ نبوت میں آپنے حضرت خالدؓ کو نجران کے قبیلہ بنی حارث بن کعب کے پاس دعوتِ اسلام کے لیے روانہ فرمایا حضرت خالدؓ نے ان کو اسلام کی دعوت دی اور انھوں نے بلا تردد قبول کر لی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالدؓ کو لکھا کہ تم بنی حارث بن کعب کا ایک وفد لیکر مدینہ آجاؤ، چنانچہ وہ چھ آدمیوں پر مشتمل ایک وفد لیکر دربار نبوت میں حاضر ہوئے

فلما قدموا على رسول الله صلى الله عليه وسلم	جب وفد کے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے
فرآهم قال من هؤلاء القوم كانهم	اور آپنے ان کو دیکھا تو فرمایا یہ کون لوگ ہیں جو ہندستان
رجال الهند قيل يا رسول الله هؤلاء	کے لوگوں جیسے ہیں، عرض کیا گیا یا رسول اللہ یہ
رجال بني الحارث بن كعب[2]	بنی حارث بن کعب کے آدمی ہیں۔

اس روایت سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہندوستان کے لوگوں کی شکل وصورت

---

[1] فتوح البلدان ص ۹۰ طبع مطبعہ مصریہ ازہریہ [2] سیرۃ ابن ہشام ج ۲ ص ۵۹۲، ۵۹۳ طبع مطبعہ مصر و تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۵۶، تاریخ طبری میں «تقوم الذين كانهم» اور «هؤلاء بنو الحارث» ہے۔

سے اچھی طرح واقف تھے، وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نجران اور اس کے اطراف میں ہندوستانیوں کی تعداد زیادہ تھی، اور مقامی لوگوں پر ان کا شبہہ ہونے لگتا تھا یا وہ ہندوستانیوں سے میل جول کی وجہ سے لباس و ہیئت میں ان کے مشابہ معلوم ہوتے تھے،

عرب کے مغربی علاقہ حجاز میں بھی ہندوستان کے باشندے موجود تھے، خاص طور سے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے عرب باشندے ان سے اچھی طرح واقف تھے، چنانچہ ابتدائے اسلام میں جب مکہ مکرمہ میں کفار قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے تو ابو طالب نے اس زمانہ میں سینکڑوں اشعار کا ایک قصیدہ کہا جس میں یقین دلایا کہ میں اپنے بھتیجے کی مدد و حفاظت سے باز نہیں آ سکتا، اس قصیدہ کے ایک شعر میں ہندوستانی کا تذکرہ یوں کیا ہے:

بضرب تری الفتیان فیه کأنهم　　　عنوارى أسود فوق لحم خرادل

ایسی جنگ کہ اس میں نوجوان حملہ آور شیر معلوم ہوتے ہیں،

بنی امنه محبوبة هندكية[1]　　　بنی جمح عبید قیس بن عاقل

ہندوستانی دل پسند باندی کے بیٹوں کو مارتے ہیں یعنی بنی جمح کو جو قیس بن عاقل کے غلام ہیں،

عہد رسالت میں مکہ مکرمہ میں ہندوستانیوں اور جاٹوں کے رہنے کی ایک اور سند حدیث میں ملتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل مکہ جاٹوں سے اچھی طرح واقف تھے، اور ان کی شکل و صورت اور لباس و ہیئت کو خوب جانتے تھے، ابتدائے اسلام کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو بطحائے مکہ کی طرف لے گئے، یہاں انھوں نے جنات دیکھے جو اپنی شکل و صورت اور ہیئت میں ہندوستان کے جاٹ معلوم ہوتے تھے، حضرت ابن مسعود کا بیان ہے

فبینا انا جالس فی خطی اذا تانی رجال　　　میں اپنے حلقہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ میرے پاس کچھ لوگ

کانهم الزط اشعارهم و اجسامهم　　　آئے جو اپنے بال اور جسم میں جاٹ معلوم ہوتے تھے

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۲۷۰ مطبوعہ ۱۳۵۵ھ مصر

لا ادری خوخۃ ولا ادری قشۃ (ترمذی ابواب الفتن)[1] میں ان کا ستر اور کھال نہ دیکھ سکا،

حضرت ابن مسعودؓ کی اس تمثیل و تشبیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکہ مکرمہ میں رہ کر جاٹوں کی شکل و شباہت سے بخوبی واقف تھے،

مکہ مکرمہ کے بعد حجاز کا دوسرا مرکزی شہر مدینہ منورہ ہے، جہاں بحرین و عمان اور عراق و شام وغیرہ سے ہر قسم کا تجارتی کاروبار ہوتا تھا، عہد رسالت میں مدینہ منورہ میں ہندوستانیوں کے بارے میں کوئی واقعہ نہیں مل سکا، مگر بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی جاٹ موجود تھے، چنانچہ امام بخاریؒ نے الادب المفرد کے باب "بیع الخادم من الاعراب" میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی پروردہ حضرت عمرہ انصاریہؓ سے روایت کی ہے کہ

ان عائشۃ رضی اللہ عنہا دبرت امۃ لھا، فاشتکت عائشۃ، فسأل بنو أخیھا طبیبا من الزط[1]	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنی ایک باندی کو مدبر فرمایا، اسکے بعد آپ بیمار ہوگئیں تو آپ کے بھتیجوں نے اس سلسلے میں ایک جاٹ طبیب سے مراجعت کی،

یہ روایت امام ابو عبداللہ حاکمؒ نے المستدرک میں بھی بیان کی ہے[2]، غالباً یہ واقعہ جیسا کہ ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد کا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ میں جاٹ رہتے تھے، جن میں سے بعض دوا علاج بھی کرتے تھے، اور اغلب یہ ہے کہ وہ اس سے پہلے سے یہاں آباد تھے۔

عرب کے شمال و مغرب میں بھی ہندوستانیوں کا نشان ملتا ہے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تبوک کے آس پاس یہ لوگ رہتے تھے، چنانچہ امام بخاریؒ نے الادب المفرد میں غزوۂ تبوک کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابورہم رضی اللہ عنہ کی طویل ملاقات کا ذکر کیا ہے، جس میں رسول اللہ

[1] الادب المفرد ص ۲۰، مطبعہ تازیہ مصر [2] فضل اللہ الصمد ج ۱ ص ۲۶۰

صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے قبیلہ بنی غفار کے اس غزوہ میں نہ شریک ہونے والوں کے بارے میں سوال کیا اور ابورہم نے جواب دیا،

فقال ما فعل النفر الحمر الطوال	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اس
الثط ، قال تخلفتهم	سرخ جماعت کا معاملہ کیا رہا، جن کے شکم بڑے
قال فما فعل السود الجعاد القصار	ہیں، انہوں نے عرض کیا کہ وہ غزوۂ تبوک میں شریک
الذین لهم نعم بشبکة شرخ الخ[1]	نہیں ہوئے، پھر آپ نے دریافت فرمایا ان
	سیاہ رنگ، گھونگھر بالوں والے پستہ قد
	لوگوں کا کیا حال ہے جن کے جانور مقام
	شبکہ شرخ میں ہیں،

غالب گمان یہ ہے کہ اس حدیث میں "النفر الحمر الثطا" سے مراد بنو غفار کے ہندوستانی غلام اور موالی ہیں اور السود الجعاد القصار سے مراد حبشی غلام اور موالی ہیں۔

احمر جس کی جمع حمر، احامر اور احامرۃ آتی ہے، اور محمر عرب میں عجمی موالی کو کہتے تھے، جن میں ہندوستان کے لوگوں کی کثرت ہوا کرتی تھی،

یہ مختصر سا بیان ان ہندوستانیوں اور ان کی آبادیوں کا ہے جو عرب میں آباد تھے، اگر احادیث اور تواریخ و سیر کی کتابوں کا تفصیلی مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کیا جائے تو مزید باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔

(باقی)

---

[1] الادب المفرد امام بخاری ص ۱۱۳

ادبیات

ظہورِ قدسی

از جناب یحییٰ اعظمی

مبارک خامۂ فطرت کے شہ کار حسیں آئے
مبارک خاتمِ ہستی کے تابندہ نگیں آئے

مبارک آب و گِل کے اک نگارِ دلنشیں آئے
خوشا حسنِ ازل کے پیکرِ ناز آفریں آئے

مبارک مطلعِ کونین کے ماہ مبیں آئے
سراپا نور، رشکِ طور، رخشندہ جبیں آئے

شبستانِ دل کے جسکی اک کرن سے جگمگا اٹھے
وہ خورشیدِ رسالت، شمعِ عرفان و یقیں آئے

نہاں تھی جس کی بعثت میں نویدِ رحمتِ عالم
وہ شرحِ نصِ "الّا رحمۃ للعالمین" آئے

سلام ان پر جو پیکر تھے سراپا رفق و رافت کے
درود ان پر جو از سرتا قدم لطف آفریں آئے

زمانہ میں کسے انکار کی اب تاب باقی تھی
کہ خود پیشِ نظر آئینۂ حق الیقیں آئے

صحائف جن کے مقدم کی بشارت دیتے آئے تھے
زہے ساعت وہ فخرِ اولین و آخریں آئے

ہے شاہد جن کی محبوبی پہ سبحان الذی اسریٰ
وہ جن پہ ہے فدا خود صاحبِ عرشِ بریں آئے

محمدؐ یعنی وہ مزمل و مدثر و یٰسین
محمدؐ یعنی وہ محمودِ رب العالمیں آئے

منور ہو گیا دم بھر میں ظلمت خانۂ گیتی
کہ خود پیغمبرِ دیں، صاحبِ نورِ مبیں آئے

ظہورِ قدس جن کا ہے فروغِ تازۂ ہستی
وہ صبحِ نو بہار و رشکِ شامِ عنبریں آئے

عبارت جس سے شمعِ آخریں ہے بزمِ گیہاں کی
وہ ختم الانبیاء آئے، وہ ختم المرسلیں آئے

وہ مقصودِ ملائک، موردِ الہامِ ربانی
وہ مولائے رسالت، مہبطِ روح الامیں آئے

ترے مقدم سے روشن ہوگئی پھر بزمِ امکانی
درودِ بیکراں تجھ پر ہو اے محبوبِ ربانی

"کیفِ حضوری"

از جناب زائر حرم حمید صدیقی

گہے نغمہ سنجی، گہے آہ وزاری
ہمہ کیف ومستی ہمہ ہوشیاری
زہے لذتِ دید محبوبِ باری
تصور پہ بھی بیخودی سی ہے طاری
کہاں لے کے آئی محبت ہماری

دلم گشت بیگانۂ راحت وغم
خوشا جذبِ کامل کہ از خود گذشتم
چہ گویم، حدیثِ حضوری چہ گویم
بیاں کیا ہو جوشِ مسرت کا عالم
بس اک دیدہ و دل پہ حیرت ہے طاری

تپیدم چو پروانۂ شمعِ محفل
زدل محو شد ہر تمنائے باطل
چہ پرسی زکیفیت دیدِ کامل
حضوری ہوئی جتقدر دل کو حاصل
بڑھی اور بھی شوق کی بیقراری

دلم آتشِ عشق سوزاں چو مشعل
لبم نغمہ پیرائے ندتِ مُستجل
بذوقِ تمام و بشوقِ مکمل
زباں پر درود و سلامِ مسلسل
کبھی سجدہ ریزی کبھی اشکباری

زبیتابی ذوق و شوقِ نہفتہ
جنوں آشنائے چہ دُردانہ سفتہ
دل وجاں نثارش کہ مستانہ گفتہ
حمید اپنا دل مثلِ گل ہے شگفتہ
یہ مہکی فضائیں، یہ بادِ بہاری

مطبوعاتِ جدیدہ

مرعاۃ المفاتیح۔ از شیخ الحدیث مولانا عبید اللہ صاحب رحمانی، صفحات ۵۳۴، تقطیع کلاں، کتابت وطباعت عمدہ، قیمت ۱۸عہ؍، پتہ: مولانا عبید اللہ صاحب مبارک پور، اعظم گڈھ۔

پچھلی دو ڈھائی صدیوں میں علماے ہند نے احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اس کی مثال کسی دوسرے اسلامی ملک میں نہیں ملتی، اس کا اعتراف خود عرب ممالک کے ممتاز علما کو بھی ہے، احادیث نبوی کی متداول کتابوں میں مشکل ہی سے کوئی ایسی کتاب ہوگی، جس کی شرح، حاشیہ یا ترجمہ یہاں نہ کیا گیا ہو، اس فن کی بعض اہم ترین کتابیں سب سے پہلے یہیں طبع ہوئیں، مشکوٰۃ شریف جو اپنی افادیت کی وجہ سے ہندوستان میں ہمیشہ متداول اور داخل نصاب رہی، اس کی بھی یہاں فارسی، عربی اور اردو میں کئی شرحیں لکھی گئیں، ان ہی میں ایک مرعاۃ المفاتیح بھی ہے، جو اپنی ضخامت اور خصوصیات کی بنا پر تمام شروح مشکوٰۃ میں ممتاز مقام رکھتی ہے، اس کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور تیسری جلد پریس میں ہے، غالباً یہ ۵ جلدوں میں مکمل ہوگی، اس کے شارح مولانا عبید اللہ صاحب رحمانی، ممتاز عالم اور سیرت البخاری کے مصنف مولانا عبد السلام مبارکپوری کے صاحبزادے اور ترمذی شریف کے مشہور شارح مولانا عبد الرحمٰن صاحب مبارک پوری کے تربیت یافتہ ہیں، اس لیے اس شرح میں وہ تمام خصوصیات ملتی ہیں جو اس فن کے لیے ضروری ہیں، مولانا نے اس میں متکلمانہ اور فقیہانہ انداز بحث اختیار کرنے کے بجائے، محدثانہ طرز اختیار کیا ہے، یعنی لغات کی شرح

مفہوم کی تعیین، متن و سند کی تحقیق اور اس کی معنویت اور رد پر زیادہ زور دیا ہے فقہی مسالک کا ذکر بھی کیا ہے مگر بیان میں تیزی اور تلخی نہیں آنے پائی ہے، اور ہر مسلک کو اس کے ماخذ سے نقل کرنے کی کوشش کی ہے، مجمل طور پر کتاب ان خصوصیات کی حامل ہے،

(۱) ہر حدیث پر انھوں نے نمبر دیے ہیں، اس لیے کسی حدیث کے تلاش کرنے اور حوالہ دینے میں بڑی آسانی ہوگی اور کتاب اور ابواب کی احادیث کے شمار کرنے میں بھی سہولت ہوگی (۲) اس میں تین فہرستیں ہیں، ایک ابواب، فصول اور احادیث کی، دوسری اسماء صحابہ و تابعین کی، تیسری رواکن کی، (۳) جن صحابہ اور تابعین سے اس میں روایتیں آئی ہیں ان کے مختصر حالات دیے گئے ہیں، (۴) پہلے حدیث کے معنی و مفہوم کو متعین کرنے کی کوشش کیگئی ہے، اسکے بعد اس سے جو مسئلے مستنبط کیے گئے ہیں انکی تفصیل کیگئی ہے، اور اس حدیث کا جو غلط مفہوم لیا گیا ہے اسکی تردید کی ہے، اس سلسلہ میں مصنف نے جس فقہی مسلک کو مرجح سمجھا ہے اس کے وجوہ ترجیح بھی بیان کر دیے ہیں، اگر اس سلسلہ میں مصنف کا قلم کہیں کہیں اپنی عام روش سے ہٹ گیا ہے، مگر غیر متوازن نہیں ہوا ہے، (۵) جس حدیث کی شرح میں ان کو دوسری کتب حدیث اور کتب فقہ سے مدد لینے کی ضرورت ہوئی ہے، بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ ان سے مدد لی ہے (۶) صاحب مشکوٰۃ سے احادیث کی تخریج میں جہاں تسامح ہو گیا ہے، اس کی نشاندہی بھی کر دی ہے، ان کے علاوہ بھی بہت سی خصوصیات ہیں۔ اس شرح کی اشاعت سے شروح حدیث کے ذخیرہ میں ایک نادر اضافہ ہوا ہے، یہ شرح ہر مدرسہ اور کتب خانہ کی زینت بنانے کے لائق ہے۔

اُردو مثنویاں - از ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ضخامت ۲۰۴، کتابت و طباعت بہتر، مع گرد پوش، ناشر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دلی، قیمت :- ۶ روپے

شعرائے اردو نے غزل کے بعد جس صنف پر سب سے زیادہ طبع آزمائی کی وہ مثنوی ہے، مگر افسوس ہے کہ اس صنف کے بارہ میں کوئی مفصل کام نہیں ہوا تھا، ڈاکٹر نارنگ صاحب نے بڑی خوش سلیقگی سے اردو کی مشہور

مثنویوں کے محرکات، ماخذ اور ان کے قصوں کے مندرجات کی تفصیل پیش کرنے کی کوشش کی ہے، ان مثنویوں کا نہ صرف ایک ادبی مقام ہے، بلکہ ان سے اخذ و قبول، قوموں کے اختلاط و اشتراک اور تہذیب و تمدن کے بناؤ سنگار کا بھی علم ہوتا ہے، ان مثنویوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مسلمان شعراء نے اسلامی تصوں کی روایات کے ساتھ ہندوستانی کہانیوں کو بھی قبول کرنے اور ان کو اردو کا جامہ پہنانے میں کبھی بھی بخل سے کام نہیں لیا، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بہت سی ہندوستانی کہانیاں انہی مثنویوں کے ذریعہ زندہ ہوئیں، اس کتاب سے اردو کے تحقیقی و تاریخی ذخیرہ میں ایک عمدہ اضافہ ہوا ہے جس کے لیے ڈاکٹر صاحب موصوف اور مکتبہ جامعہ دونوں مبارکباد کے مستحق ہیں، دلی یونیورسٹی کا شعبۂ اردو بھی قابل ستائش ہے کہ اس کے متوسلین کی وجہ سے اردو زبان کے سلسلہ میں دلی کی قدیم روایت قائم ہے۔

موجِ نسیم۔ از اختر مسلمی، ضخامت ۱۱۲، کتابت و طباعت عمدہ، قیمت: عہ، پتے:-

(۱) اختر مسلمی، پھول پور، اعظم گڈھ (۲) نصیرالحق شمیم بک ڈپو، سرائے میر، اعظم گڈھ

یہ ایک نوجوان شاعر اختر مسلمی کی غزلیات کا مجموعہ ہے، موجودہ دور کے نوجوان شعراء میں غزل گوئی کا ستھرا مذاق رکھتے ہیں، ان کے کلام میں تغزل کی تمام خوبیاں ہیں، انھوں نے طویل بحروں میں بھی غزلیں کہی ہیں اور متوسط اور چھوٹی بحروں میں بھی، قافیہ کے لیے انھوں نے آسان زمینیں بھی اختیار کی ہیں اور سنگلاخ زمینوں میں بھی اشہب قلم کو دوڑایا ہے اور ہر میدان میں کامیاب ہوئے ہیں، خاص طور پر چھوٹی بحروں کی بعض غزلوں میں تو بقول آزاد تلوار کی تیزی اور نشتر کی آبداری موجود ہے، انھوں نے جو سیاسی غزلیں کہی ہیں، وہ سیاسی غزل گوئی کا اچھا نمونہ ہیں، ان میں انھوں نے "درحدیث دیگراں" ہندوستان کے مظلوموں کے جذبات و خیالات کی بڑی عمدہ ترجمانی کی ہے، ان سب غزلوں میں زبان و بیان کی خوبیاں موجود ہیں، امید ہے کہ یہ مجموعہ ہر طبقہ میں مقبول ہوگا،

م، ج

معارف نمبر ۳ جلد ۹۰

جلد ۹۰ - ماہ ربیع الثانی ۱۳۸۲ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۶۲ء - عدد ۳

مضامین

شذرات

اس دور میں ہندوستان کے مسلمانوں کو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ سے جو دینی و روحانی فیوض حاصل ہوئے، اس کی مثال دوسرے سلاسل میں مشکل سے مل سکتی ہے، اس اعتبار سے یہ پورا سلسلہ

این سلسلہ از طلائے ناب است　　　　این خانہ تمام آفتاب است

کا مصداق ہے، اس سلسلہ میں آسمان علم و معرفت کے ایسے ایسے مہر و ماہ پیدا ہوئے جن کی روشنی سے سارا ہندوستان منور ہے اور آج اس ظلمتکدہ میں علم و عرفان کی جو روشنی بھی نظر آتی ہے وہ سب انہی نفوس قدسیہ کا پرتو ہے، اسی نورانی محفل کی ایک شمع فروزاں حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ تھے، وہ اس دور کے شیخ کامل اور قطب وقت تھے، ان کی ذات سے ایک مخلوق ہدایت یاب ہوئی، گمراہوں کو راہ راست ملی، ناقص کامل اور کامل صاحب احوال و مقامات ہوگئے، افسوس ہے کہ یہ شمع ہدایت گذشتہ مہینہ گل ہوگئی، گو الحمد للہ اب بھی اس سلسلہ میں بعض بڑی شخصیتیں موجود ہیں، لیکن "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگرے است" حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ اپنے رنگ میں منفرد تھے، ان کے ساتھ ان کی خصوصیات ختم ہوگئیں، "وہ بات کوہکن کی گئی کوہکن کے ساتھ" اس لیے ان بزرگوں میں سے جو بھی اٹھتا ہے وہ اپنی جگہ ہمیشہ کے لیے خالی چھوڑ جاتا ہے، والبقاء للہ وحدہٗ اللہ تعالیٰ عالم آخرت میں حضرت شیخ کے درجات و مراتب بلند فرمائے۔

دار المصنفین کے لیے دوسرا حادثہ مولوی عبد الغنی صاحب انصاری ریٹائرڈ کمشنر انکم ٹیکس کی وفات کا ہے، مرحوم علامہ شبلی کے عزیز، دار المصنفین کے پرانے ہمدرد و ہواخواہ اور اس کی مجلس انتظامیہ کے رکن تھے، انکی ذات میں جدید و قدیم دونوں کی خوبیاں جمع تھیں، جدید تعلیم کے ساتھ پرانی وضعداری اور تہذیب و شرافت کا نمونہ تھے، اپنے دور کے قابل ترین افسروں میں ان کا شمار تھا، اپنی قابلیت، حسن اخلاق اور سیرت و کردار کی پختگی کی وجہ سے حکومت اور پبلک دونوں میں مقبول و ممدوح تھے، ریٹائر ہونے کے بعد قومی کاموں میں بھی دلچسپی لیتے تھے، ادھر عرصہ سے ان کی صحت خراب ہوگئی تھی، گذشتہ مہینہ کراچی میں انتقال کیا،

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

اردو کے بارہ میں یو پی لسانی کمیٹی کی رپورٹ کا خلاصہ بعض اخبارات میں شائع ہو گیا ہے، اس کمیٹی سے کچھ زیادہ توقعات تھیں بھی نہیں، چنانچہ اس کی سفارشوں میں کوئی نئی بات نہیں ہے، دوسری زبانوں کے طفیل میں اردو کو جو حقوق ملے ہیں، اور جن کو مرکزی اور صوبائی حکومتیں بھی مانتی ہیں، ان میں بعض جزوی ترمیموں اور اصلاحوں کے علاوہ اس کمیٹی نے کوئی ایسی سفارش نہیں کی ہے جس سے اردو کی پوزیشن میں کوئی خاص تبدیلی پیدا ہو، اسی لیے کمیٹی کے ہندو ارکان نے بھی ان سفارشوں سے کوئی اختلاف نہیں کیا ہے۔

ان سفارشوں میں پرانے نیم سرکاری اور آزاد اسلامی مکاتب کو لوکل بورڈ کے تعلیمی نظام کے ماتحت لاکر ان کو اردو میڈیم اسکول بنانے کی تجویز البتہ نئی ہے، مگر یہ ہمیشہ سے اردو کے اسکول چلے آرہے ہیں، اس سے اردو کو نیا حق کیا ملا، ان کو سرکاری نظام تعلیم کے ماتحت لانے سے اگر اردو کی تعلیم میں کچھ سہولتیں حاصل ہوں گی تو اس کے شرائط خصوصاً مدرسین کے لیے مسلم کی شرط ختم کر دینے سے ان مکاتب کو فائدے سے زیادہ نقصان پہنچے گا، اور ان کی دینی تعلیمی حیثیت بالکل ختم ہو جائے گی، ان کی بیسک ریڈروں کی زبان کے بارہ میں جو سفارش کی گئی ہے وہ اردو کے لیے سخت مضر ہے، اس سے اردو زبان ہندی بنجائے گی، اور رسم الخط کے علاوہ ان دونوں میں کوئی فرق نہ رہ جائے گا، اگر کسی درجہ میں یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ان سفارشوں سے اردو کو کچھ سانس لینے کا موقع مل جائے گا تب بھی ان تجویزوں پر عمل کا اصل مسئلہ باقی رہ جاتا ہے، جس کا ان سفارشوں میں بھی کوئی اطمینان بخش حل نہیں ہے، اور اردو کے مطالبات کے بعد سب سے اہم مسئلہ یہی ہے کہ ان سفارشوں پر عمل کی کیا ضمانت ہوگی، اس کی دو ہی صورتیں ہیں، اردو کو جو حقوق بھی ملیں ان کو قانونی حیثیت دیجائے، یا پھر حکومت کے عمال کی ذہنیت میں تبدیلی پیدا ہو، جس کی سردست کوئی امید نہیں ہے، اس رپورٹ میں بعض اور خامیاں بھی ہیں، پوری رپورٹ شائع ہونے کے بعد ہم ان کے بارہ میں تفصیلی خیالات پیش کریں گے۔

مسلمانوں کے لیے ایک انگریزی اخبار کی جتنی شدید ضرورت ہے اس کے بارہ میں کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے، اس کا احساس تمام مسلمانوں کو ہے، چنانچہ بار بار اسکی تحریک ہوئی مگر عمل میں نہ آسکی، ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ سے زیادہ ہے، اور اس گئی گذری حالت میں بھی ان میں ایسے ایسے دولتمند موجود ہیں کہ جتنے آدمی اخبار کا خرچ برداشت کرسکتے ہیں، مگر کوئی جماعت ایسی نہیں ہے جو اس تحریک کو لیکر اٹھے اور انجام تک پہنچائے، اسی لیے آجتک اخبار نہ نکل سکا، اب جماعت اسلامی نے ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار نکالنے کا ارادہ کیا ہے، ممکن ہے کچھ لوگوں کو جماعت اسلامی کے بعض خیالات ونظریات سے اختلاف ہو، مگر یہ اخبار انکے خیالات ونظریات کا نہیں بلکہ عام مسلمانوں کے جذبات وضروریات کا ترجمان ہوگا، اسی لیے جماعت اسلامی نے تمام مسلمانوں کو اس میں شرکت کی دعوت دی ہے۔

اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمانوں کی تمام جماعتوں میں جماعت اسلامی سب سے زیادہ فعال جماعت ہے، اس کے پاس پُرجوش، سرگرم اور تعلیم یافتہ کارکنوں کی ایک پوری جماعت ہے، اسلیے وہ اس کام کو آسانی کے ساتھ انجام دے سکتی ہے، اس اخبار کے متعلق اس نے تمام ضروری معلومات شائع کردیے ہیں، یہ ایسا ضروری کام ہے جس سے کسی کو بھی اختلاف نہیں ہوسکتا، اسلیے تمام مسلمانوں خصوصاً انکی مجالس اور تنظیموں کو اس فرض کفایہ میں پوری مدد کرنی چاہیے، ضرورت تو روزانہ اخبار کی تھی لیکن اس کے لیے بڑے سرمایہ کی ضرورت ہے، اس لیے سردست ہفتہ وار بھی غنیمت ہے، اس کو ترقی دے کر آیندہ روزانہ بنایا جاسکتا ہے لیکن اخبار معیاری ہونا چاہیے۔

ونوبھاوے جی کی روح القرآن کا ہنگامہ اب ختم ہوچکا اور اس کی حقیقت پوری طرح ظاہر ہوچکی، مگر یہ ایسا افسوسناک واقعہ ہے کہ اس کے بعد بھی اس پر لکھنے کی ضرورت باقی ہے، اس کی مصدقہ تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ ونوبھاوے جی کلام مجید کی مختلف آیات کو مختلف عنوانوں کے تحت جمع کرکے اس کا ترجمہ مختلف زبانوں میں شائع کرنے والے ہیں، اور ان ترجموں میں تمام ممکن احتیاطیں کرلی ہیں، یہ کام کسی حیثیت سے بھی قابل اعتراض نہیں، اس قسم کے بہت سے مجموعے خود مسلمانوں بلکہ بہت سے علما تک نے مرتب کیے ہیں، مگر آجتک انکو کسی نے بھی قابل اعتراض نہیں ٹھہرایا اور انکو دین کی خدمت ہی سمجھا، اس لیے اگر ونوبھاوے جی نے قرآن کی بنیادی تعلیمات سے غیرمسلموں کی واقفیت کے لیے اسکی آیات کا کوئی مجموعہ مرتب کیا تو اس میں کیا قباحت ہوئی، یہ تو غیرمسلموں میں قرآنی تعلیمات کی تبلیغ کا ذریعہ ہے، اس لیے جو لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں وہ اس تبلیغ کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔

مقالات

ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

از جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب، ایم اے

(۶)

تعاوت حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے زمانہ میں ایک جیتل میں دو سیر آٹا ملتا تھا، لیکن پھر بھی شروع زندگی میں ان کے پاس اتنے دام نہ ہوتے تھے کہ روٹی کے لیے آٹا خرید سکیں، کئی کئی روز کا فاقہ ہو جاتا، ایک بار مسلسل تین روز کا فاقہ ہو گیا تو کسی نے دروازہ پر دستک دی، اور ایک شخص خشک کھچڑی دے کر غائب ہو گیا، حضرت خواجہ نے بھوک کی شدت میں اس کو کھا لیا، اور اس کو کھا کر جو لذت محسوس کی اس کا ذکر آئندہ بار بار فرماتے اور کہتے تھے کہ پھر کسی کھانے میں ایسی حلاوت محسوس نہیں ہوئی، جب گھر میں کھانے کی کوئی چیز نہ ہوتی تھی تو ان کی والدہ ماجدہ کہا کرتیں کہ آج ہم لوگ خداوند تعالے کے مہمان ہیں، حضرت خواجہ کو اس جملہ سے بڑی لذت ملتی، اور جب ان کے گھر میں آذوقہ ہوتا تو وہ افسوس کرتے کہ ان کی والدہ ماجدہ کی زبان پر وہ جملہ نہ ہوگا،

بعض سلاطین و امرا کے غیظ و غضب، غصہ و کینہ پروری کی بہت بری مثالیں ملتی ہیں، مثلاً سلطان ناصرالدین محمود کے عہد میں عمادالدین ریحان، سنقار اور الغ خاں میں بڑی معاصرانہ چشمک رہی، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، اور حصول اقتدار کی خاطر فوجیں جمع کرکے میدان جنگ میں بھی اتر آتے تھے، بلبن کے عہد میں لکھنوتی میں طغرل نے بغاوت کی تو اس کی سرکوبی کرکے اس کے رشتہ داروں اور ساتھیوں کو تہ تیغ کیا گیا اور ان کے سروں کو سربازار لٹکا کر وہاں کے لوگوں کے دلوں میں دہشت پیدا کی گئی، علاء الدین خلجی تخت نشین ہوا تو اس نے جلال الدین خلجی کے شہزادوں ارکلی خاں، ابراہیم اور ان کی ماں کے خلاف تیس چالیس ہزار کا ایک لشکر جرار الغ خاں اور ظفر خاں کی نگرانی میں ملتان بھیجا، جنھوں نے دونوں شہزادوں اور ان کی ماں کو گرفتار کیا، پھر دونوں شہزادے نابینا کر دیے گئے، اور ماں قید خانہ میں ڈال دی گئی، ظفر خاں عہد علائی کا بہت ہی بہادر فوجی رہنما تھا، اسی وجہ سے دربار کے امرا اس سے حسد کرتے تھے، وہ تاتاریوں کے خلاف لڑتا ہوا محض اس لیے مارا گیا کہ باہمی چشمک میں اور فوجی امرا اس کی مدد کو نہ پہنچ سکے، علاء الدین خلجی رن تنبھور کی مہم میں جارہا تھا تو تلپت کے پاس اس کے بھتیجے اکت خاں نے اس پر قاتلانہ حملہ کیا اور وہ ہلاک ہوتے ہوتے بچا، اس نے اشتعال میں آکر اکت خاں اور اس کے ساتھیوں کو تہ تیغ کرا دیا، وہ رن تنبھور ہی کی مہم میں تھا کہ اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر فخرالدین کوتوال کے لڑکے حاجی مولیٰ نے علم بغاوت بلند کر دیا، اور ایک سید کو تخت پر بٹھایا، علاء الدین خلجی نے اپنے فوجی سرداروں کو بھیجکر یہ بغاوت فرو کرائی، حاجی مولیٰ اور سید کے ساتھ فخرالدین کوتوال کے اور لڑکے بھی موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔

اسی زمانہ میں صوفیۂ کرام نے حلم و بردباری کے جو نمونے پیش کیے، وہ اپنی مثال آپ ہیں حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ ایک روز اپنی خانقاہ میں تشریف فرما تھے کہ دلق پوش قلندروں کی ایک جماعت پہنچی اور ان سے مالی مدد کی خواستگار ہوئی، انھوں نے اس جماعت سے بیزاری

کا اظہار فرمایا، اس پر قلندروں نے گستاخی شروع کر دی اور اینٹ پتھر سے ان کو مارنے لگے، حضرت بہاء الدینؒ نے خادم سے فرمایا کہ خانقاہ کا دروازہ بند کر دو، جب دروازہ بند ہو گیا تو قلندروں نے دروازہ پر پتھر مارنے شروع کیے، حضرت بہاء الدینؒ نے کچھ تامل کرنے کے بعد خادم سے فرمایا دروازہ کھول دو، میں اس جگہ بٹھایا گیا ہوں، خود سے نہیں بیٹھا ہوں، خادم نے دروازہ کھول دیا، اس وقت قلندر نادم ہوئے اور اپنے قصور کی معافی چاہی،

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ خدا کی کسی مخلوق سے عناد رکھنا طریقت کے خلاف سمجھتے تھے، غیاث پور کے قریب کا رہنے والا ایک شخص چھجو نامی بلا وجہ حضرت محبوب الٰہیؒ کا دشمن ہو گیا تھا، اور ایذا رسانی پر کمربستہ رہتا تھا، لیکن جب اس کی وفات کی خبر ان کو ملی تو اس کے جنازہ میں شریک ہوئے اور تدفین کے بعد اس کی قبر پر دوگانہ نماز ادا کی، اور اس کی مغفرت کے لیے دعائیں کیں،

اگر ان کو کسی پر غصہ آتا، تو نہ صرف غصہ کو پی جاتے بلکہ اس کو معاف بھی کر دیتے، اور فرماتے کہ جو شخص غصہ پی جاتا ہے اور معاف نہیں کرتا ہے تو ممکن ہے کہ اس کے دل میں کینہ گھر کر لے، فوائد الفواد میں ہے کہ ایک بار ایک شخص حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے پاس آیا اور ان کو گالیاں دینے لگا، وہ خاموشی سے سنتے رہے، پھر اس نے جو کچھ مطالبہ کیا پورا کر دیا، اور جب وہ چلا گیا تو حاضرین کو مخاطب کر کے کہا کہ ایک شخص ایک مرتبہ بابا فرید کے پاس آیا، اور گستاخانہ طور پر کہنے لگا تو نے اپنے کو بت بنا لیا ہے، بابا فرید نے نرمی سے جواب دیا کہ میں نے اپنے کو نہیں بنایا ہے خداوند تعالیٰ نے مجھکو بنایا ہے،

سیر الاولیاء میں ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے فرمایا کہ کسی کو برا کہنا برا ہے، لیکن برا چاہنا اس سے بھی برا ہے، فوائد الفواد میں ہے کہ حضرت خواجہ نے فرمایا کہ ایک شخص سے دوسروں کو نہ فائدہ پہنچے اور نہ نقصان تو ایسا شخص جماد کہلاتا ہے، لیکن ایسے شخص سے وہ شخص بہتر ہے جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے، نقصان نہیں پہنچتا ہے، لیکن ان دونوں سے وہ شخص بہتر ہے کہ اس سے

دوسروں کو ہمیشہ فائدہ پہنچاتا ہے لیکن لوگ اس کو نقصان پہنچاتے رہتے ہیں، پھر بھی وہ تحمل اور حلم سے کام لیتا ہے، یہ کام صدیقوں کا ہے،

درباری سازشوں سے سلاطین اور امرا کے جتنے قتل ہوئے، ان کی گنتی ممکن نہیں، ملوک سلاطین میں آرام شاہ، سلطانہ رضیہ، بہرام شاہ، خلجی حکمرانوں میں جلال الدین خلجی، قطب الدین مبارک خلجی، اور اس خاندان کا غاصب خسرو خاں تغلق خاندان میں سلطان ابوبکر شاہ، اور خاندان سادات میں معز الدین مبارک شاہ، اور لودیوں میں ابراہیم لودی تہ تیغ ہوئے، اور پھر باہمی کینہ پروری بغض اور حسد کی وجہ سے سلاطین دہلی کے عہد میں ملک اختیار الدین ایتگین، ملک التونیہ، امیر سنقار، ملک طغرل، ملک الکت خاں، ظفر خاں، اور ملک کافور وغیرہ جیسے جلیل القدر امرا بھی نذر شمشیر ہوئے،

لیکن اسی عہد میں صوفیۂ کرام نے اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے ساتھ جو حسن سلوک کیا، وہ انسانی تاریخ کی عجیب وغریب مثالیں ہیں، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی خانقاہ میں ایک بد باطن شخص ان کو قتل کرنے کے ارادہ سے آیا، لیکن انھوں نے نور باطن سے یہ معلوم کرلیا اور اس کو اپنے پاس بلا کر کہا کہ جس ارادہ سے آئے ہو اس کو پورا کرو، یہ سن کر اس پر لرزہ طاری ہوگیا اور اس نے کہا کہ مجھکو لالچ دے کر آپ کو ہلاک کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے، خواجہ صاحب نے اس کو یہ کہہ کر معاف کر دیا کہ ہم درویشوں کا شیوہ ہے کہ ہم سے کوئی بدی بھی کرتا ہے تو ہم اس کے ساتھ نیکی سے پیش آتے ہیں،

ایک روز حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ نماز ظہر کے بعد جماعت خانہ میں آکر اپنے حجرۂ خاص میں مشغول تھے کہ ایک قلندر تراب نامی وہاں پہنچا، اور ان پر چھری سے پے درپے حملے کیے، خون حجرے کے باہر بہنے لگا، لیکن ان کے استغراق میں فرق نہیں آیا، خون دیکھ کر

مریدین حجرے میں گئے اور قلندر کو سزا دینی چاہی، لیکن حضرت چراغ دہلویؒ نے روکا اور اپنے مریدین خاص کو پاس بلا کر قسم دی کہ کوئی شخص قلندر کو ایذا نہ پہنچائے، پھر قلندر سے معذرت کی کہ اگر چھریاں مارتے وقت تمھارے ہاتھ کو تکلیف پہنچی ہو تو معاف کرنا، اور بیس تنکے زر دے کر اس کو رخصت کیا۔

حُبِ جاہ اور حرص اقتدار کی خاطر امراء نے بڑے بڑے نمونے پیش کیے، دہلی کی سلطنت کی تاسیس کے چار سال کے اندر قطب الدین ایبک کی وفات ہوگئی، تو ناصر الدین قباچہ نے ملتان پر قبضہ کر لیا، بنگال میں علی مردان خلجی نے دہلی کے اقتدار کو تسلیم کرنے سے روگردانی کی، بدایوں کے لوگ التمش کے ساتھ ہو گئے، اسی طرح التمش کی وفات کے بعد ۔۔۔ اور ۔۔۔ سیف الدین قرلغ حملہ آور ہو گیا، ۔۔۔ میں بغاوت ہوگئی، بنگال، بہار، ملتان مرکز سے منقطع ہو گئے، امراء کی بغاوتوں کو سر کرنے میں سلاطین کی فوجی، مالی اور دماغی قوتیں برابر صرف ہوتی ہیں، لیکن اسی زمانے میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے مریدوں کو یہ تعلیم دے رہے تھے ۔۔۔ عارف صادق وہ ہے کہ اس کی ملک میں کچھ نہ ہو، اور نہ وہ کسی کی ملک ہو، عارف کا ایثار ۔۔۔ بے نیازی ہے، عارف وہ نہیں ہے جو کسی چیز کے پیچھے پریشان ہو، حضرت بختیار کاکیؒ نے دنیا کی ۔۔۔ ایشوں سے دور رہنے کی تلقین یہ بتا کر دی کہ حضرت بایزید بسطامی نے ستر سال تک عبادت ۔۔۔، مگر جب مقام قرب آیا تو ان کو قربت محض اس وجہ سے حاصل نہ ہو سکی کہ ان کے پاس ۔۔۔ یادی آلائشوں میں مٹی کا ایک کوزہ اور چمڑے کا ایک خرقہ باقی رہ گیا تھا، ان کو پھینک دیا ۔۔۔ درجہ حاصل ہوا، حضرت فرید الدین گنج شکرؒ فرماتے تھے کہ سالک کو رزق حاصل کرنے کے لیے ۔۔۔ پریشان خاطر نہ ہونا چاہیے، اگر وہ اس کے لیے پریشان رہتا ہے تو وہ بد دین اور ۔۔۔ یانت ہے،

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے فقر و فاقہ کی خبر جلال الدین خلجی کو ہوئی تو اس نے ان کی خدمت میں یہ کہلا بھیجا کہ اگر وہ حکم دیں تو ان کے خدمت گزاروں کے لیے کچھ گاؤں نذر کیے جائیں مگر حضرت خواجہ کے فاقہ مست جاں نثاروں نے ان سے عرض کیا کہ آپ کے یہاں ہم کبھی کبھی روٹی کھا لیتے ہیں، لیکن یہ گاؤں قبول کر لیے گئے تو اس کے بعد ہم آپ کے یہاں پانی پینا بھی پسند نہ کرینگے، یہ جواب سن کر حضرت خواجہ بے حد محظوظ ہوئے۔ قاضی محی الدین کاشانی حضرت خواجہ کے بڑے ممتاز مرید تھے۔ ان کے پاس ایک جاگیر کا شاہی فرمان تھا، لیکن جب حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے تو اپنی جاگیر کا شاہی فرمان مرشد کے سامنے لاکر چاک کر دیا۔ اور فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرنے لگے۔

سلاطین و امراء جب دنیاوی آلائشوں میں مبتلا ہو کر جائز و ناجائز و حلال و حرام میں کوئی امتیاز نہ کرتے تھے، تو اس وقت یہی بزرگان دین رضا و تسلیم، صبر و شکر، توکل و قناعت اور ذکر و فکر کے ذریعہ تزکیۂ نفس، تصفیۂ دل اور تجلیۂ روح میں لگے ہوئے تھے۔ جن کو حاصل کرنے کے بعد وہ لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتے، اور ان کی حکومت سلاطین کی حکومت سے زیادہ مقبول ہوتی، وہ فوجوں کے بجائے دلوں کو ٹکرا کر ان میں ایک طوفان بپا کر دیتے جس سے لوگوں کے کردار میں صفائی، اخلاق میں پاکیزگی اور روح میں بالیدگی پیدا ہوتی رہتی، اور ان ہی خوبیوں سے بلند اخلاق اور اعلیٰ کردار بنتا، اور یہ تسلیم کرنا پڑے گا مسلمان ہندوستان میں آکر مجموعی حیثیت سے اچھے اخلاق اور مستحکم کردار کا ثبوت نہ دیتے، تو شاید اس زمین میں جڑ نہ پکڑ سکتے تھے۔ بلکہ اور قوموں کی طرح یہاں کے باشندوں میں ضم ہو جاتے، کردار و اخلاق کو سنوارنے کے لیے اسلام کی باضابطہ تعلیم ضرور تھی، لیکن ان کے عملی نمونے ہندوستان میں صوفیہ اور صلحاء پیش کرتے رہے، اور یہ کہنے میں تامل نہیں کہ شروع میں ان ہی بزرگان دین کے فقر سے مسلمانوں میں اخلاق کے اسرار جہانگیری واضح ہوتے رہے۔ ان ہی بزرگوں کی قلندری

سے مسلمانوں کو صحیح معنوں میں سیرت کی تونگری حاصل ہوتی رہی، اور ان ہی کی دریوزہ گری سے مسلمانوں کے کردار کی سکندری کی راہ کھلی،

اخلاق و کردار کے معمار | شہاب الدین غوری کی فتح کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کا سیاسی اقتدار شروع ہوا، تو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی وجہ سے ہندوستان ان کے مختلف قسم کے برکات سے مستفیض ہوا، انھوں نے صوری و معنوی اخلاق کے محاسن کی اسلامی تعلیم اپنے کردار و سیرت کے عملی نمونے سے کچھ اس طرح پیش کی کہ یہاں کے غیر مسلموں کو بھی اسلام کے جلوے ان ہی میں نظر آنے لگے، اور انھوں نے اس سرزمین میں اسلام کے نور کو اس طرح پھیلایا کہ وہ "وارث النبی فی الہند" کے لقب سے اب تک یاد کیے جاتے ہیں، تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ ان کی نظر جب فاسق پر پڑ جاتی وہ تائب ہو جاتا اور پھر کبھی کسی گناہ میں مبتلا نہ ہوتا، اور ان ہی کی نظر کیمیا اثر کی وجہ سے ان کے خلفاء کی ایک بڑی جماعت تیار ہوئی جو محض اپنے بلند اخلاق اور پاکیزہ صفات کی وجہ سے لوگوں پر حکومت کرتی رہی، اور جب سلاطین ایک جگہ سے دوسری جگہ فوج کشی میں مشغول تھے تو یہ بوریا نشین مختلف مقامات پر پہنچ کر دلوں کی تسخیر میں لگے ہوئے تھے، حضرت خواجہ کے اکابر خلفاء میں حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ اور حضرت حمید الدین ناگوریؒ کی روحانی راجدھانی دہلی تھی، شیخ حمید الدین سوالیؒ نے ناگور میں قیام کر کے اس کو اپنے روحانی جلووں سے معمور کیا، دوسرے خلفاء میں شیخ وجیہ الدین، خواجہ برہان الدین، شیخ صدر الدین کرمانی، شیخ محمد ترک نارنولی، شیخ علی سجزی اور خواجہ یادگار سبزواری نے مختلف جگہوں میں جا کر لوگوں کے اخلاق و سیرت کو سنوارا اور اسلام کی شوکت قائم کی،

مورخوں اور تذکرہ نگاروں دونوں کا بیان ہے کہ التتمش کے عہد میں حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ، شیخ حمید الدین ناگوریؒ، شیخ علی سجزیؒ، شیخ احمد نہروالیؒ، شیخ بدر الدین سمرقندیؒ

سید قطب الدین غزنویؒ، حضرت نظام الدین ابو المؤید غزنویؒ، اور شیخ محمود موینہؒ وغیرہ کی برکتوں سے اس عہد کے لوگوں میں خدا ترسی، تقویٰ، تزکیۂ نفس، عبادت اور ریاضت کا غیر معمولی جذبہ پیدا ہوا۔ بلبن کے عہد میں اتنے مشائخ اور سادات جمع ہو گئے تھے کہ مورخوں نے ان کے وجود کی وجہ سے اس عہد کو خیر الاعصار لکھا ہے۔ حضرت بابا گنج شکرؒ، خواجہ علی چشتیؒ، شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ، ان کے صاحبزادے شیخ صدر الدینؒ، سیدی مولہؒ، شیخ حسام الدین ملتانیؒ، شیخ نجیب الدین فردوسیؒ، شیخ ابوبکر حیدر طوسیؒ وغیرہ کے انوار سے پوری سلطنت منور ہو گئی تھی۔

علاء الدین خلجی کے عہد میں علماء کے اجتماع سے دہلی قبۂ اسلام اور رشک مکہ و مدینہ ہو گئی تھی، تو صوفیۂ کرام کے وجود سے بھی یہ شہر آراستہ تھا۔ مولانا ضیاء الدین برنی کا بیان ہے کہ اس زمانہ کے مشائخ حضرت نظام الدین اولیاؒ، حضرت علاء الدین چشتیؒ اور حضرت رکن الدین سہروردیؒ کے انفاس متبرکہ سے ایک دنیا روشن ہو گئی تھی، گنہگاروں نے ان کے ہاتھ پکڑ کر گناہوں سے توبہ کی، بدکاروں نے بدکاری سے ہاتھ اٹھایا، اور ان دینی بادشاہوں کی محبت اور اخلاق کے اثر سے خداوند تعالیٰ کے فیض کی بارش دنیا میں ہونے لگی، ان بزرگوں کے وجود سے شعائر اسلام اور احکام شریعت کو بہت فروغ ہوا اور طریقت نے بڑی رونق پائی۔

مولانا ضیاء الدین برنی یہ بھی لکھتے ہیں کہ کتنا عجیب زمانہ وہ تھا جو سلطان علاء الدین کے آخری دسویں سال میں نظر آیا، ایک طرف سے سلطان علاء الدین نے ملک کی بہتری کے لیے تمام نشہ آور اور ممنوع چیزوں اور فسق و فجور کے اسباب کو قہر و غلبہ، تعزیر و تشدد اور قید و بند سے روک دیا، مالداروں سے ان کی سود خواری، ذخیرہ اندوزی اور بغاوت کو ختم کر دیا، پھر بازار والوں کو جو سب سے زیادہ جھوٹ بولتے ہیں، سچ بولنے پر مجبور کیا۔ دوسری طرف اسی زمانہ میں شیخ الاسلام نظام الدین اولیاء بیعت کا عام دروازہ کھول کر خاص و عام، غریب و دولتمند،

عالم و جاہل، شہری و دیہاتی، سب کو پاکی کی تعلیم دیتے تھے، اور ان کی وجہ سے مرد، عورت، بوڑھے، جوان، بازاری، عامی، غلام اور نوکر سب کے سب نماز ادا کرنے لگے تھے۔ خواص و عوام کے دلوں نے نیکی اختیار کرلی تھی، عہد علائی کے آخری چند سالوں میں شراب، معشوق، فسق و فجور، جوا اور فحاشی وغیرہ کا نام لوگوں کی زبان پر نہیں آنے پاتا، وغیرہ وغیرہ،

حضرت نظام الدین اولیاؒ کا زمانہ محمد تغلق کی حکومت کے ابتدائی دور تک رہا، محمد تغلق ان سے کسب فیض تو نہ کر سکا، لیکن جیسا کہ پہلے ذکر آیا ہے، وہ چشتیہ سلسلہ کے بزرگ حضرت بابا گنج شکرؒ کے پوتے حضرت شیخ علاء الدینؒ کا مرید تھا، اس کے بارہ میں عام طور سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے وقت کے مشائخ کو ایذائیں پہنچایا کرتا تھا، جیسا کہ آگے بیان ہوگا، لیکن اس کے عہد میں حضرت فخر الدین زرادیؒ، حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ، حضرت قطب الدین منورؒ اور حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ سے عوام و خواص کو بڑا فیض پہنچا، یہی بزرگ فیروز شاہی عہد میں بھی رہے، ان کے علاوہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کا اثر فیروز شاہ پر بہت تھا، ان بزرگوں کے اثرات کی وجہ سے شریعت کے احیاء اور بدعات کی روک تھام میں بڑی مدد ملی، بیت المال میں غیر مشروع اور حرام مال رد کر دیا گیا، محل کے اندر دیواروں پر مصوری اور نقاشی ختم کر دی گئی، چاندی اور سونے کے ظروف کا استعمال بند کر دیا گیا، ممالک محروسہ میں جو باتیں خلاف شرع نظر آئیں قطعاً موقوف کر دی گئیں،

عجیب توارد اور یہ عجیب توارد ہے کہ خواجگانِ چشت کا سلسلۃ الذہب حضرت خواجہ نصیر الدینؒ کی ذات پر ختم ہوا، تو سلاطین دہلی کا عروج بھی فیروز شاہ تغلق کے ساتھ جاتا رہا، حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے مرض الموت میں مولانا زین الدین علی نے عرض کیا کہ

آپ کے اکثر مرید اہل کمال ہیں کسی کو سجادہ نشین مقرر فرمائیں تاکہ سلسلہ جاری رہے۔ فرمایا ان درویشوں کے نام لکھ کر لاؤ جن کو تم اس لائق سمجھتے ہو۔ مولانا زین الدین نے تین قسم کے درویشوں کا انتخاب کیا اعلیٰ، اوسط اور ادنیٰ، حضرت خواجہ نے ان کے نام کو دیکھ کر فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے دین کا غم کھائیں گے لیکن دوسروں کا بار نہ اٹھا سکیں گے۔ اس کے بعد وصیت فرمائی کہ دفن کرتے وقت حضرت شیخ نظام الدینؒ کا خرقۂ مبارک، عصا، تسبیح، کاسہ اور چوبیں نعلین ان کے ساتھ قبر میں دفن کر دیے جائیں، اور ایسا ہی کیا گیا۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے بعد حضرت خواجہ گیسو درازؒ اور حضرت عبد القدوس گنگوہیؒ، شیخ جلال الدین تھانیسریؒ، شیخ عبد العزیز چشتی دہلویؒ، شیخ سلیم چشتیؒ، شیخ دانیال چشتیؒ، شیخ علاء الدین مجذوبؒ، شیخ ابو الحسن جونپوریؒ، سید علاء الدین مجذوبؒ نے چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کی تعلیم تو جاری رکھی، لیکن وہ اپنے پیش رو بزرگوں کی طرح ایک غیر معمولی روحانی طاقت بن کر لوگوں کے دل و دماغ پر چھا سکے، گو ایا رسے شطاریہ سلسلہ چلا، اور خود دہلی میں حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندیؒ اور ان کے خلفاء کے ذریعہ نقشبندیہ سلسلہ کی تعلیمات کی ترویج ہوئی، لیکن عہد اکبری کے آتے آتے تصوف میں اتنی خرابیاں پیدا ہو گئیں کہ اس کے ذریعہ سے پہلے کی طرح روحانی تربیت و اصلاح کا کام خاطر خواہ طریقہ پر نہ ہو سکا۔

خام صوفیہ | یہ خرابیاں اس لیے پیدا ہوئیں کہ حضرت بختیار کاکیؒ، حضرت بابا گنج شکرؒ اور خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، جیسے جلیل القدر صوفیہ پیدا نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ تر خام صوفیہ پیدا ہونے لگے، اور وہ تصوف کی روح سے بیگانہ ہو کر اس کے ظاہری رسوم پر زیادہ زور دینے لگے، اور جب وحدت الوجود کے مسئلہ میں زیادہ گرما گرمی پیدا ہوئی تو وہ اس کے اصلی رموز کو تو سمجھ نہ سکے، اتحاد و حلول کی ظاہری باتوں میں بہہ کر گمراہ ہو گئے، جیسا کہ آگے ذکر

آئے گا، اسی طرح وہ اپنے سلسلہ کے بزرگوں کی اصل تعلیمات کو بھلا کر صرف ان کے کشف و کرامات ہی کو تصوف قرار دیتے رہے، وہ سنت و شریعت کو بھول کر غیر شرعی ریاضات و مجاہدات اور غیر اسلامی احوال و مواجید کے قائل رہے، نماز، روزے کو باطن کی درستگی کے بعد غیر اہم قرار دیا، سماع کی اصلی حقیقت کو نظر انداز کر کے نغمہ اور رقص پر زیادہ زور دینے لگے، پھر کبیر، رامانند اور چیتن وغیرہ کی جو روحانی تحریکیں اٹھیں، تو ایک گروہ اس کا بھی قائل ہو گیا کہ رام اور رحیم دونوں ایک ہیں، دنیا کا مالک ایک ہے، اس تک پہنچنے کے لیے محض اخلاص، محبت اور تلاش کی ضرورت ہے، کسی کی وساطت اور شفاعت درکار نہیں ہے، خالق مخلوق میں ہے اور مخلوق خالق میں ہے، یہ دونوں الگ الگ نہیں ہیں، یہ تحریکیں کچھ ایسی دل آویز تھیں کہ ان میں کچھ مسلمان بھی شریک ہو گئے۔

حضرت مجددؒ کی اصلاحی کوششیں حضرت مجدد نے اسی قسم کی تمام باتوں کو بدعت قرار دیا اور مسلمانوں میں ان بدعتوں کے خلاف تجدیدی اور اصلاحی تحریک شروع کی، اور ایسے تصوف کو ضلالت سے تعبیر کیا، جس میں شریعت کی خلاف ورزی ہوتی ہو، اور ایسے احوال و کیفیات کو جو نامشروع طریقہ پر مترتب ہوں، استدراج کہا، انھوں نے کسی چیز کی حلت یا حرمت کے سلسلہ میں اولیائے کرام کے الہام کو تسلیم کرنے سے بالکل انکار کیا، اسی طرح ارباب باطن کے کشف کو کسی چیز کے فرض یا سنت ہونے کی دلیل قرار نہیں دیا، اور صاف طور پر بتایا کہ علوم لدنیہ کی صحت و مقبولیت کی علامت صریح علوم شرعیہ کے ساتھ ان کی مطابقت ہے، اس کے خلاف جو کچھ ہے، الحاد اور بے دینی ہے، سنت سے ہٹ کر جو ریاضتیں کی جاتی ہیں، وہ صریحاً گمراہی ہے، وہ اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ جو کوئی جس قدر شریعت میں راسخ اور ثابت قدم ہوگا اسی قدر ہوائے نفس سے دور ہوتا جائے گا، کیونکہ نفس کے لیے

شریعت کے اوامر و نواہی کے بجا لانے سے زیادہ دشوار کوئی اور چیز نہیں، اور صاحبِ شریعت کی پیروی کے بعد کسی خرابی کا تصور نہیں آسکتا، اسی لیے وہ ریاضتیں اور مجاہدے جو سنت کی تقلید کے سوا اختیار کیے جائیں وہ معتبر نہیں ہیں، وہ اپنے ایک مکتوب میں شیخ نظام تھانیسری کو یہ بھی لکھتے ہیں کہ جس طرح آپ کی مجلس میں تصوف کی کتابوں کا ذکر ہوتا رہتا ہے، اسی طرح فقہ کی کتابوں کا بھی ذکر ہونا چاہیے، اور اگر تصوف کی کتابیں نہ پڑھی جائیں تو کوئی ہرج نہیں، کیونکہ وہ احوال سے تعلق رکھتی ہیں، اور قال میں نہیں آتیں لیکن کتب فقہ کے نہ پڑھنے پر ضرر کا احتمال ہے، اللہ تعالیٰ ہم کو اور آپ کو اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل متابعت عطا فرمائے۔ وہ خام صوفیوں کے سماع و نغمہ اور وجد و تواجد کی بھی مذمت کرتے رہے، جیسا کہ آگے ذکر آئیگا۔

حضرت مجددؒ نے جس طرح دین کی تجدید کی، اور اکبر کے دین الٰہی کے فتنوں کا سدباب اپنے اصلاحی اور تجدیدی کارناموں سے کیا، اسی طرح تصوف کی بھی تجدید کی، جس کو ان کے صاحبزادوں میں خواجہ محمد صادق، خواجہ محمد سعید اور عروۃ الوثقیٰ خواجہ محمد معصوم، اور خلفاء میں میر محمد نعمان کشمی، مولانا محمد ہاشم کشمی، خواجہ سید آدم بنوری حسینی، شیخ طاہر لاہوری، شیخ بدیع الدین سہارنپوری، شیخ نور محمد پٹنی، شیخ حمید بنگالی، شیخ طاہر بدخشی، مولانا یوسف سمرقندی، مولانا احمد برکی، مولانا محمد صالح کولابی، سید محب اللہ مانکپوریؒ، حاجی خضر افغان، شیخ بابا حسن ابدالی، مولانا امان اللہ لاہوری وغیرہ نے اپنی کوششوں سے برقرار رکھا، اور یہ اب علماء بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ان ہی کے فیوض و برکات کی وجہ سے شاہ جہاں اور عالمگیر جہانگیر اور اکبر سے بالکل مختلف حکمراں گذرے،

صوفیہ کا فقدان اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ عالمگیر کے بعد جس طرح اچھے علما کا پیدا ہونا بند ہو گیا، اسی طرح اچھے صوفیہ کا بھی فقدان ہو گیا، یہاں تک کہ میر محمد حسین رضوی مشہدی

جو اپنے کو فرد بود و نمود اللہ کہتا تھا، قبلہ حاجات اور گہوارۂ سعادت سمجھا جانے لگا، اور تصوف بازیچ
بچگان بن گیا، شاہ عبد العزیز کے ملفوظات میں ہے کہ محمد شاہ کے زمانے میں ہر سلسلہ اور طریقہ
کے بائیس بزرگ صاحب ارشاد دہلی میں موجود تھے، ان ہی میں مرزا مظہر جان جاناں اور
حضرت فخر الدین دہلوی بھی تھے، ان سے پیاس کچھ تو جاتی تھی، لیکن ان میں ان کے اکابر
اسلاف کی روح نہیں تھی، اور پھر صوفیۂ خام کی اتنی کثرت ہوگئی تھی کہ یہ خود بھی گمراہیوں
میں مبتلا رہے، اور اس زمانہ کے مسلمانوں کو بھی مبتلا کیا، جیسا کہ آگے ذکر آئے گا

سلاطین و مشائخ کا تصادم سلاطین و صوفیہ کی زندگی کی نوعیت میں جو بعد المشرقین رہا،
اس لحاظ سے دونوں میں یگانگت پیدا ہونے کا امکان نہ تھا، لیکن صوفیہ کرام کی یہ کرامت
تھی کہ وہ ہر دور میں سلاطین کو اپنے آستانوں پر جھکاتے رہے، اور یہ دیکھکر تعجب ہوتا ہے
کہ علماء تو سلاطین سے مذہبی، فقہی مسائل اور طرز حکومت کی نوعیت پر بہت الجھے، لیکن
صوفیۂ کرام نے ان سے الجھنے کے بجائے ان کو اپنے قریب تر کر دیا، کچھ ایسے سلاطین بھی
گزرے ہیں جن کا تصادم ان کے بعض معاصر مشائخ سے ہوا، لیکن ان کی مثالیں بہت
زیادہ نہیں ہیں، اس تصادم کا جائزہ لینے سے پہلے ایک بات کی وضاحت ضروری ہے
اور وہ یہ کہ تذکرہ نگار جب بوریا نشینوں اور تخت نشینوں کے تعلقات کا ذکر کرتے ہیں
تو وہ کچھ نہ کچھ ایسی باتیں تخت نشینوں کے متعلق ضرور قلمبند کر دیتے ہیں جن سے ان کے
خیال میں درویشی کی عظمت اور جلالت بڑھ جاتی ہے، لیکن تنقید و تجزیہ کے بعد ان کے
بیانات میں بڑی کمزوری دکھائی دیتی ہے، مگر کچھ مورخین ایسے بھی ہیں جو ان تذکرہ نویسوں
کے بیانات سے فائدہ اٹھا کر سلاطین کے کردار کو اس طرح پیش کرنے لگے جن سے وہ
خواہ مخواہ بدنام ہو جاتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ کچھ درباری مورخین ایسے بھی ہیں جو

اپنے شاہی آقاؤں کا حق نمک ادا کرنے کی خاطر شائخ کی اچھی تصویر نہیں کھینچتے ہیں، اس طرح تذکرہ نگاروں اور مورخوں دونوں کی غیر دارانہ تحریروں سے اس عہد کی تاریخ کو نقصان پہنچا ہے، اسی لیے ان اختلافات میں دونوں کے بیانات کو قبول اور رد کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے،

سلاطین اور صوفیہ کے اختلافات کی پہلی مثال سلطان جلال الدین خلجی اور سیدی مولہ کے تصادم میں ملتی ہے، مولانا ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں، سیدی مولہ عجیب و غریب بزرگ تھے، نماز کے پابند تھے لیکن جماعت کے ساتھ نماز ادا نہیں کرتے تھے، کوئی کچھ دیتا تو اس کو قبول نہ کرتے، لیکن ان کے اخراجات اتنے تھے کہ لوگوں کو حیرت ہوتی تھی، کہ وہ اخراجات پورا کرنے کے لیے روپے کہاں سے لاتے ہیں، لوگ کہتے کہ وہ علم کیمیا جانتے ہیں، ان کی خانقاہ میں روزانہ ہزار دو ہزار من میدہ خرچ ہوتا تھا، پانچ سو جانور ذبح کیے جاتے تھے، دو تین سو من شکر اور سو دو سو من نبات خریدی جاتی تھی، ان کے یہاں امراء کی آمد و رفت برابر رہتی، اور ایسے امراء نے جو سلطان جلال الدین خلجی سے بدظن تھے، اس خانقاہ میں بیٹھکر یہ سازش کرنی چاہی کہ سلطان جلال الدین خلجی کے بجائے سیدی مولہ کو حکمراں بنایا جائے، اس کی خبر سلطان کو ہوئی تو اس نے سیدی مولہ اور ان بد باطن امراء کو اپنے سامنے بلایا، انھوں نے اپنے جرم سے انکار کیا، تو سلطان نے چاہا کہ اس زمانے کے رسم کے مطابق ان کو آگ میں ڈال دیا جائے تاکہ اگر وہ سچے ہوئے تو بچ جائیں گے اور جھوٹے ہوئے تو ہلاک ہو جائیں گے، علماء نے اس کی مخالفت کی کہ آگ کے ذریعہ سے جھوٹ اور سچ کی تمیز نہیں کی جا سکتی ہے، اور یہ فعل نامشروع ہے، سلطان نے یہ ارادہ ترک کر دیا اور سیدی مولہ کو بندھوا کر اپنے محل کے پاس بلوایا اور ان سے مباحثہ کیا، اور جب بحث جاری تھی تو حیدری

جماعت کے ایک فرد نے بڑھ کر سیدی مولہ کو استرے سے زخمی کر دیا، اور سلطان جلال الدین خلجی کے لڑکے ارکلی خاں کے اشارہ سے ایک فیل بان ہاتھی لیکر دوڑا اور سیدی مولہ کو ہاتھی کے پاؤں سے مسل ڈالا، مولانا ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ جلال الدین خلجی جیسے حلیم اور بردبار بادشاہ کی وجہ سے درویشی کی عزت جاتی رہی، لیکن جس روز سیدی مولہ کا قتل ہوا، اس روز اتنی زبردست آندھی آئی کہ معلوم ہوتا تھا کہ قیامت آگئی ہے، جلال الدین خلجی نے اس کے بعد محسوس کیا کہ اس سے ایک غلط کام ہو گیا ہے، یہ تصادم ذاتی انتقال یا سیاسی مصالح کی بنا پر ہوا، اس میں اصولی اختلاف نہ تھا،

البتہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے اپنی زندگی کا یہ اصول بنا رکھا تھا کہ وہ کسی سلطان وقت سے نہ ملیں گے، اس سلسلہ میں بعض سلاطین سے ان کا شدید اختلاف رہا، سلطان جلال الدین خلجی کو حضرت خواجہ کے شرف ملاقات کی بڑی تمنا تھی، لیکن اس کی یہ تمنا پوری نہیں ہوئی، اس کے دربار سے امیر خسرو وابستہ تھے، اس لیے اس نے بھیس بدل کر امیر خسرو کے ساتھ حضرت خواجہ کا دیدار حاصل کرنا چاہا، امیر خسرو بھی اس کے لیے راضی ہو گئے، لیکن یکایک ان کو خیال ہوا کہ اپنے دنیاوی آقا کو خوش کرنے میں کہیں ان کے روحانی آقا ناخوش نہ ہو جائیں، اس لیے اپنے مرشد سے سلطان کے ارادہ کو ظاہر کر دیا، حضرت خواجہ کو یہ معلوم ہوا تو اسی وقت شہر چھوڑ کر اپنے مرشد کے مزار کی زیارت کے لیے اجودھن روانہ ہو گئے، سلطان جلال الدین کو خبر ملی تو امیر خسرو سے یہ راز فاش کرنے کی باز پرس کی، امیر خسرو نے بڑی جرأت کے ساتھ سلطان کو جواب دیا کہ آپ رنجیدہ ہوں گے تو زیادہ سے زیادہ میری جان کا خطرہ ہے لیکن مرشد آزردہ ہوتے تو میرے ایمان کا خطرہ ہے، سلطان یہ جواب سنکر خاموش ہو گیا،

سلطان علاء الدین خلجی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے پاس نذریں بھیجتا،

ان سے اپنی فوجی مہم کی کامیابی کے لیے دعاؤں کا طلبگار رہتا، ان کی مجلس سماع کا ذکر شوق سے سنتا، لیکن اس حسن عقیدت کے باوجود دونوں میں کبھی ملاقات نہیں ہوئی، اور جب اس سے حضرت خواجہ سے نہ ملنے کی وجہ پوچھی گئی تو اس نے جواب دیا کہ میں بادشاہ ہو کر سر سے پاؤں تک گناہوں میں آلودہ ہوں، اس آلودگی کی وجہ سے ایسے پاک بزرگ سے ملنے میں شرم آتی ہے،

عوام و خواص میں حضرت خواجہ کی مقبولیت بہت بڑھ گئی تو علاء الدین خلجی کو سلطان وقت کی حیثیت سے ایک موقع پر رشک پیدا ہوا کہ کہیں وہ اس کے لیے خطرہ نہ بن جائیں، اس لیے ان کو آزمانے کی خاطر لکھ بھیجا کہ خداوند تعالیٰ نے دنیا کی سلطنت کی باگ ہمارے ہاتھ میں دی ہے تو ہم کو چاہیے کہ ملک کی بھلائی اور اپنی بہتری کے لیے آپ سے بھی مشورہ کر کے ان پر عمل کرتے رہیں، لیکن حضرت خواجہ کی طرف سے یہ پیام تھا کہ فقیروں کو بادشاہوں کے کام سے کیا مطلب میں ایک فقیر ہوں، اور ایک گوشہ میں رہتا ہوں، بادشاہوں اور مسلمانوں کی دعا گوئی میں مشغول ہوں، اس کے بعد بھی بادشاہ مجھ سے کچھ کہے گا تو میں اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں گا، خدا کی زمین کشادہ ہے، سلطان علاء الدین کو یہ پیام پہنچا تو وہ ان کا اور بھی معتقد ہو گیا، اور پھر ملاقات کی خواہش ظاہر کی، لیکن حضرت خواجہ نے کہلا بھیجا کہ آنے کی ضرورت نہیں ہیں غائبانہ دعا میں مشغول ہوں، اور غائبانہ دعا اثر رکھتی ہے، سلطان نے پھر اصرار کیا تو حضرت خواجہ نے آزردہ ہو کر کہا کہ اس ضعیف کے گھر میں دو دروازے ہیں، اگر بادشاہ ایک دروازہ سے تشریف لائے تو میں دوسرے دروازہ سے نکل جاؤں گا،

سلطان علاء الدین خلجی کی وفات کے بعد اس کا لڑکا قطب الدین مبارک خلجی ملک کافور کی مدد سے اپنے دو بھائیوں خضر خاں اور شادی خاں کو قتل کر کے تخت نشین ہوا، یہ دونوں شہزادے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے عزیز مریدوں میں تھے، اس لیے سلطان قطب الدین خلجی

ان سے بدگمان رہا، اس کی یہ بدگمانی عداوت میں تبدیل ہوگئی، اور وہ مصلحتاً سہروردیہ سلسلہ کے ایک بزرگ شیخ ضیاء الدین رومی کا مرید ہوگیا۔ اور حضرت خواجہ کی دشمنی کا اظہار کھلم کھلا کرنے لگا، اس وقت ان کے لنگر خانہ کا خرچ روزانہ دو ہزار ٹنکہ تھا۔ سلطان کے بعض مفسد امراء نے اس کے کان بھرے کہ یہ تمام اخراجات ان امراء کے نذرانے کی رقم سے پورے ہوتے ہیں۔ جو خانقاہ میں آیا جایا کرتے ہیں۔ سلطان نے خانقاہ میں امراء کی آمد و رفت سختی سے روک دی، مگر اس لنگر خانہ کے اخراجات پر کسی قسم کا اثر نہیں پڑا، اور سارے اخراجات حسب معمول پورے ہوتے رہے۔ سلطان کی پرخاش اور بڑھی اور اس نے حضرت خواجہ کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا، لیکن حضرت خواجہ نے کہلا بھیجا کہ میں گوشہ میں بیٹھا رہتا ہوں، کہیں آتا جاتا نہیں، میرے بزرگوں کا بھی یہ قاعدہ نہیں تھا کہ وہ دربار میں جائیں، اور بادشاہوں کے مصاحب بنیں، اس لیے مجھکو اس سے معذور سمجھ کر معاف رکھنا چاہیے، لیکن سلطان نے اس عذر کو قبول نہیں کیا، اور غصہ میں آکر یہ اعلان کرادیا کہ جو کوئی بھی ان کا سر لائے گا، اس کو ایک ہزار اشرفی انعام میں دیجائیگی، حضرت خواجہ نے سلطان کے پیر شیخ ضیاء الدین رومی کے پاس پیام کہلا بھیجا کہ وہ اپنے مرید کو سمجھائیں کہ درویشوں کو رنج پہنچانا کسی مذہب میں روا نہیں، مگر اس پیام کے پہنچنے سے پہلے شیخ ضیاء الدین رومی کا انتقال ہوگیا، ان کی فاتحہ خوانی کے موقع پر سلطان اور اس کے اکابر امراء ان کے مزار کے پاس جمع ہوئے تو حضرت خواجہ نے بھی اس میں شرکت کی، جس وقت وہ تشریف لائے تو تمام حاضرین ان کی تعظیم کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، سلطان نے یہ دیکھا تو اس کا حسد اور بھی بڑھ گیا اور محل میں جاکر اس نے حکم جاری کیا کہ ہر قمری مہینہ کی پہلی تاریخ کو جب کہ تمام ائمہ اور مشائخ دربار میں رسماً جمع ہوا کرتے ہیں تو وہ بھی حاضر ہوں، جب یہ حکم ان کے پاس پہنچا، تو صرف یہ فرمایا کہ دیکھوں گا کہ کیا ظہور میں آتا ہے، شہر کے اکابر نے حضرت خواجہ کی

خدمت میں پہنچکر ان سے عرض کیا کہ ایک نا عاقبت اندیش سلطان کی وجہ سے کوئی فتنہ پیدا ہو جائے تو دربار میں جاکر اس کو روک دینا بہتر ہے، لیکن حضرت خواجہ نے فرمایا کہ میں اپنے مرشدوں کے خلاف دستور کوئی کام نہ کروں گا، لوگوں میں بڑی سراسیمگی تھی، کہ سلطان الاولیاء اور سلطان دہلی کے تصادم سے ایک بڑی مصیبت بپا ہو جائے گی، لیکن سلطان قطب الدین جس روز دربار میں حضرت خواجہ کی آمد کا منتظر تھا، اسی روز محل کے اندر شورش ہوئی اور وہ خسرو خاں کے ہاتھوں قتل ہوا،

ان تفصیلات سے اندازہ ہوگا کہ یہ اختلاف بھی کسی نظری اور فکری مسئلہ پر نہ تھا، بلکہ سراسر ذاتی تھا، خسرو خاں تخت نشین ہوا تو اس نے اپنی سیہ کاریوں پر پردہ ڈالنے کی خاطر مشائخ کے پاس بھی روپے بھجوائے، حضرت خواجہ کے پاس بھی پانچ لاکھ ٹنکے پہنچے، لیکن انھوں نے اسی وقت ساری رقم فقراء میں تقسیم کر دی، اور جب غیاث الدین تغلق بادشاہ ہوا تو جن لوگوں کو خسرو نے روپے دیے تھے، ان سے غیاث الدین تغلق نے واپس مانگے، اس حکم پر دوسرے مشائخ نے روپے واپس کر دیے، لیکن حضرت خواجہ نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، آگے چل کر غیاث الدین تغلق نے جاہ طلب علما کے مشورے سے ایک محضر میں حضرت خواجہ کو سماع کے جائز و ناجائز ہونے پر مناظرہ کرنے کے لیے طلب کیا، تو اس میں وہ شریک ہوئے، اور سماع کی اباحت اور حلت میں دلائل پیش کیے، اسکی تفصیل آگے آئے گی، بعض تذکرہ نگاروں اور مورخوں نے لکھا ہے کہ سلطان غیاث الدین ۷۲۵ھ میں بنگالہ کی مہم سے واپس آرہا تھا تو اس نے حضرت خواجہ کے پاس یہ پیام کہلا بھیجا کہ وہ غیاث پور سے نکل کر اس کا استقبال کریں، لیکن اس پیام کو پڑھ کر حضرت خواجہ کی زبان سے صرف یہ نکلا کہ ہنوز دلی دور است، چنانچہ غیاث الدین تغلق شہر سے تین کوس کے فاصلہ پر ایک نئی عمارت میں مقیم تھا کہ اچانک یہ عمارت رات کو

گر گئی جس کے نیچے دب کر وہ جاں بحق ہو گیا، لیکن یہ مشہور روایت محض عوام کی ہے جس کو موجودہ دور کے محققین صحیح تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔

حضرت خواجہ نے سلاطین وقت سے ملنے سے جو گریز کیا اس سے عام طور پر یہ خیال ہوتا ہے کہ چشتیہ سلسلے کے خواجگان بادشاہوں کی ملاقات کو دنیاوی نجاست تصور کرتے رہے، اور اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ایک بار سہروردیہ سلسلہ کے بزرگ حضرت رکن الدینؒ دہلی سے سلطان وقت سے مل کر ملتان جا رہے تھے تو واپسی میں پاک پٹن بھی ٹھہرے اور حضرت بابا گنج شکرؒ کے پوتے حضرت علاء الدینؒ سے ملاقات کے وقت معانقہ کیا، تو آخرالذکر نے معانقہ کے بعد غسل فرمایا کہ ان میں بھی درباری نجاست لگ گئی ہے، حضرت رکن الدینؒ نے غسل فرمانے پر ان کی احتیاط کو سراہا اور اپنی ذات سے ندامت کا اظہار کیا،

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا سلاطین سے نہ ملنا ان کی درویشی کے جلوۂ صد رنگ میں سے ایک تابناک جلوہ تھا، لیکن اس سے یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ یا خواجگانِ چشت بادشاہ کو ایک نجس چیز سمجھتے تھے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے سلطان شمس الدین التمش، ناصر الدین محمود اور غیاث الدین بلبن کے لیے تعظیمی الفاظ استعمال کیے ہیں، جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے پھر اوپر یہ بھی ذکر آیا ہے کہ انھوں نے علاء الدین خلجی کو یہ کہلا بھیجا کہ میں بادشاہوں اور مسلمانوں کی دعاگوئی میں مشغول ہوں، ان باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ان کے معیار کے مطابق کوئی سلطان ہوتا، یا وہ اگر سلطان التمش یا ناصر الدین محمود یا غیاث الدین بلبن کے وقت میں ہوتے تو بادشاہ سے ملنے میں پرہیز نہ کرتے، کیونکہ خود ان کے سلسلہ کے اکابر بزرگ بادشاہ سے ملاقات کرنا کوئی دنیاوی نجاست تصور نہیں کرتے تھے،، ایک روایت میں ہے کہ التمش نے حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ کی صحبت میں رہ کر علم لدنی اور معرفتِ باطن کے تمام رموز حاصل کیے،

اور اگر یہ روایت تسلیم نہ بھی کی جائے تو مستند تذکروں میں ہے کہ التمش سے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو جو روحانی لگاؤ تھا اسی کی بنا پر وہ ایک بار اجمیر سے چل کر دہلی تشریف لائے اور سلطان سے ملنے میں تامل نہ کیا، سیر الاولیا، جیسے مستند تذکرہ میں ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے صاحبزادوں کے قبضہ میں اجمیر کے پاس ایک گاؤں تھا، وہاں کے مقطع نے لگان مقرر کرنے میں ان کو کچھ زیادہ تنگ کیا، تو انھوں نے اپنے والد بزرگوار سے عرض کیا کہ وہ دہلی جاکر سلطان سے ایک فرمان لے آئیں حضرت خواجہ نے اپنے صاحبزادوں کی خاطر دہلی کا سفر کیا، اور جب وہ اپنے مرید حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے پاس پہنچے اور ان کو اپنے مرشد کی تشریف آوری کی وجہ معلوم ہوئی تو انھوں نے اپنے مرشد کو سلطان کے پاس جانے سے روک دیا، اور خود سلطان کے یہاں قدم رنجہ فرمایا، وہ کبھی سلطان کے پاس نہیں گئے تھے، حالانکہ سلطان اس کا برابر متمنی رہا، سلطان اپنے مرشد کو اپنے یہاں دیکھ کر متعجب ہوا، اور جو کچھ انھوں نے چاہا، اس نے کردیا، یہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ التمش برابر ان کے خلوت وجلوت میں ساتھ رہا اور رات کے وقت ان کے پاؤں بھی دابا کرتا تھا، فوائد الفواد اور سیر الاولیاء میں ہے کہ سلطان ناصر الدین محمود اوچہ اور ملتان کی طرف گیا تو وہ اپنے پورے لشکر کے ساتھ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ سے ملا، اور وہ بھی اس سے بڑی خوشی سے ملے، سیر الاولیاء ہی کی روایت ہے کہ بلبن سلطان ناصر الدین محمود کا وزیر تھا، تو وہ حضرت گنج شکرؒ سے جاکر ملا، تو انھوں نے اس کے بادشاہ ہونے کی پیشین گوئی بھی کی، حضرت گنج شکرؒ کے پوتے حضرت علاء الدینؒ ان کے سجادہ نشین ہوئے تو وہ دربار سے الگ تھلگ ضرور رہے لیکن انھوں نے محمد تغلق اور فیروز شاہ تغلق کو مرید بھی کیا، خود حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے، سلطان علاء الدین خلجی سے ملاقات کرنا تو پسند نہیں کیا، لیکن اس کے لڑکوں میں سے خضر خاں اور شادی خاں کو مرید کیا، اور یہ دونوں ان کے عزیز مریدوں میں تھے، خضر خاں ہی نے خانقاہ کی عمارت بنوائی

پھر حضرت خواجہ کے سب سے محبوب مرید حضرت امیر خسرو تھے، جو جلال الدین خلجی کے مصحف دار اور بارہ سو تنکے سالانہ کے وظیفہ خوار اور علاء الدین خلجی کے معزز درباری رہے، قطب الدین مبارک خلجی کی شان میں قصیدے بھی کہتے رہے، اور اپنی مثنوی نہ سپہر کے صلہ میں اس سے ہاتھی کے برابر روپے پائے، غیاث الدین تغلق کے ساتھ بنگال بھی گئے، اور ان آقاؤں کی فتح و تسخیر پر نثر اور نظم میں کتابیں بھی لکھتے رہے لیکن اس درباری داری کے باوجود حضرت خواجہ نظام الدین اولیا، کو ان سے بڑا گہرا لگاؤ رہا، تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے سے تو تنگ آجاتا ہوں لیکن امیر خسرو سے کبھی تنگ نہیں ہوتا ہوں، ایک اور موقع پر فرمایا کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ جب پوچھے گا کہ دنیا سے کیا لائے تو میں کہوں گا اس ترک اللہ (یعنی امیر خسرو) کا سوز سینہ، پھر ایک اور موقع پر فرمایا کہ اگر شریعت میں اجازت ہوتی تو میں وصیت کرتا کہ امیر خسرو کو میری قبر میں ساتھ دفن کیا جائے، تاکہ قبر کے اندر بھی یکجائی ہو، امیر خسرو کی زندگی کی یہ کرامت ہے کہ وہ سلاطین وقت کے درباری اور ہمجلیس بھی تھے، اور خلوت میں اپنے مرشد کے ادنیٰ خادم بھی رہے لیکن دونوں میں کسی کو بھی اپنے سے آزردہ ہونے کا موقع نہیں دیا،

امیر خسرو کے درباری تعلقات قائم رکھنے میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کبھی معترض نہیں ہوئے، لیکن اس کی بھی مثال ہے کہ وہ اپنے مریدوں کے درباری تعلقات رکھنے میں مانع بھی ہوئے، مثلاً خواجہ موید الدین کرہ سلطان علاء الدین کی شہزادگی کے زمانے میں اس کے جان نثاروں میں تھے، مگر ترک دنیا کر کے حضرت خواجہ نظام الدین اولیا، کے آستانے پر جبیں سائی کرنے لگے۔ علاء الدین خلجی جب بادشاہ ہوا تو ایک حاجب کو حضرت خواجہ کی خدمت میں بھیج کر پیام دیا کہ خواجہ موید الدین کو رخصت کر دیں تاکہ وہ اس کے کام میں مدد دیں،

حضرت خواجہ نے فرمایا کہ ان کو ایک اور کام درپیش ہے، اور اسی میں وہ کوشش کر رہے ہیں، شاہی حاجب کو یہ جواب گراں گزرا، اور اس نے کہا کہ مخدوم! آپ چاہتے ہیں کہ اپنا جیسا سب کو کرلیں، حضرت خواجہ نے فرمایا اپنے جیسا کیا میں اپنے سے بہتر کرنا چاہتا ہوں،

اسی طرح حضرت خواجہ شمس الدین دہاری شاہی ملازمت میں دیوان کے عہدہ پر مامور تھے، مگر اس عہدہ کو چھوڑ کر حضرت خواجہ کے مرید ہوگئے، اور ان کے ملفوظات کے کاتب بن گئے، ایک دن حضرت خواجہ سے عرض کیا کہ اگر حکم ہو تو آنے جانے والوں کے لیے ایک مکان بنالوں، حضرت خواجہ نے فرمایا کہ یہ کام اس کام سے جس کو تم نے چھوڑا ہے کم نہیں ہے،

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے خلفاء میں حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ، حضرت قطب الدین منورؒ اور حضرت فخر الدین زرادیؒ نے اپنے مرشد کے مسلک کے مطابق سلاطین سے ملاقات کرنے میں گریز ضرور کیا، لیکن ان تینوں کی ملاقاتیں سلطان محمد تغلق سے ہوئیں، گو تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے نفس پر جبر کرکے اس سے ملاقات کی، حضرت نصیر الدین چراغ نے کسی بادشاہ کو اپنے حلقۂ ارادت میں تو نہیں لیا، لیکن سلطان فیروز شاہ کا لائق وزیر خانجہاں ان کا مرید تھا، اور وہ اس پر بہت مہربان رہے، اور جب اس نے ان سے عبادت و ریاضت کی تفصیل پوچھی تو انھوں نے فرمایا کہ تم وزیر مملکت ہو، تمہاری عبادت یہی ہے کہ حاجت مندوں کی حاجت برآری میں انتہائی کوشش کرو، آگے چل کر چشتیہ سلسلہ کے اکابر صوفیہ میں حضرت عبد القدوس گنگوہیؒ، حضرت مجدد الف ثانی، اور حضرت شاہ فخر الدین دہلویؒ وغیرہ کی بھی ملاقاتیں سلاطین وقت سے ہوتی رہیں، اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے علاوہ چشتیہ سلسلہ کے بہت سے

بزرگوں نے بادشاہوں سے ملاقاتیں توکیں، لیکن ان میں سے کوئی دربار میں خود سے حاضری دینا پسند نہ کرتا، بادشاہ وقت خود ان کے پاس آجاتے تو وہ ان سے ملاقات کر لیتے، لیکن ان ملاقاتوں کے باوجود سلاطین اور امراء سے تعلقات رکھنا اپنی فقیری اور گمنامی کی شان کے خلاف سمجھتے رہے، ان کے خلاملا سے راحت پسندی اور تن پروری کا خطرہ محسوس کرتے تھے، اس لیے کبھی ان کا دیہہ دار یا جاگیردار بننا پسند نہیں کیا، اور نہ ان کے دفتر میں اپنا نام لکھوانا گوارا کیا، اپنی فقیری کی شان کمال استغنا ہی میں تصور کرتے رہے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

محمد بن تغلق اور صوفیہ کا تصادم | پہلے کہا جا چکا ہے کہ محمد بن تغلق حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے پوتے حضرت علاء الدین اجودھنیؒ کا مرید تھا، اور ان کی اولادوں کو بڑے عہدوں سے نوازا، اس نے بعض مشائخ کے لیے خانقاہیں بھی بنوائیں، اور بعض کے مزارات بھی تعمیر کرائے اور ان کے لیے جاگیریں وقف کیں لیکن اسی کے ساتھ بعض تاریخوں اور تذکروں میں ہے کہ اس نے شیخ شہاب الدین بن احمد جام کی داڑھی نچوائی، اور آخر میں ان کے منہ میں گوبر ڈلوا کر ان کو ہلاک کرایا، شیخ ہود کو بھی قتل کرایا، شیخ شمس الدین بن تاج العارفین کو قید کیا، حضرت نصیرالدین چراغ دہلویؒ کے گلے کی ہڈیوں میں سوراخ کرا کے ان کو رسیوں سے باندھنے کا حکم دیا اور ان کو قید کر دیا، اسی طرح اس نے حضرت فخرالدین زرادیؒ اور حضرت قطب الدینؒ منور کو بھی ایذائیں پہنچائیں، ان واقعات کی تفصیل لکھ کر سلطان کو جابر، قاہر، سفاک، ظالم اور خونی حکمراں بنایا گیا ہے، اس کے عہد کے ایک شاعر عصامی نے تو اس کو ملحد، بے دین، اصول و فروع سے منحرف وغیرہ وغیرہ قرار دیا ہے، اور یہ بھی الزام رکھا ہے کہ اس کی بے راہ روی کی وجہ سے ملک کے مختلف حصوں میں کفر پھیلا اور اسلام کی رونق کم ہوگئی۔ ابن بطوطہ سلطان کے ساتھ ایک عرصہ دراز تک رہا، اس نے سلطان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ عصامی یا اس کے ہم خیال مورخوں اور تذکرہ نویسیوں کے بیان سے بالکل مختلف ہے، وہ لکھتا ہے کہ سلطان کی سخاوت، شجاعت بھی اور خونریزی

کی حکایات عوام الناس کے زبان زد ہیں، اس کے باوجود ابن بطوطہ نے کسی شخص کو اس سے زیادہ متواضع اور منصف نہیں دیکھا، وہ شریعت کا پابند ہے اور نماز کی بڑی تاکید کرتا ہے، جو نہیں پڑھتا اس کو سزا دیتا ہے اور وہ ان بادشاہوں میں ہے جن کی نیک بختی اور مبارک نفسی حد سے بڑھی ہوئی ہے، •

موجودہ دور کے محققین اور مورخین بھی محمد بن تغلق کو ان عینکوں سے دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں جن سے اس کے بعض معاصر یا عہد مغلیہ کے مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے دیکھا ہے، اور اس دور میں اس پر جتنے الزامات رکھے گئے تھے، ان کا ناقدانہ اور محققانہ تجزیہ کرکے ان کو غلط قرار دینے کی کوشش کی ہے، اسی طرح صوفیۂ کرام کی خوں ریزی اور ایذا رسانی کے بعض واقعات کو بھی من گھڑت داستانیں اور کذب عوام الناس ٹھہرانے کی کوشش کی گئی ہے، موجودہ دور کے ایک مورخ جناب آغا مہدی حسین نے اپنی کتاب سلطان الہند محمد شاہ بن تغلق میں اس کی سیرت کا محققانہ جائزہ لینے کے بعد آخر میں یہ لکھا ہے کہ سلطان محمد کیا تھا، اور بنانے والوں نے اس کو کیا بنا دیا، وہ بیدار مغز، روشن ضمیر، صلح پسند، فراخ دل، مصلح، عالی حوصلہ، عالم، عامل، محقق، مجدد، مدبر، فیاض، سیر چشم، مطاع اور اصول کا پابند تھا، وفاداروں اور فرمانبرداروں کا کیا ذکر دشمنوں پر بھی مہربانی کرتا، مجرموں کے جرم کو معاف کر دیتا اور خطاکاروں کی خطائیں کو بخش دیتا، چشم پوشی سے بھی کام لیتا، سزائیں بہت دیتا، اور خونریزیاں کرتا، مگر جو کچھ کرتا تھا کسی خاص مطلب اور مصلحت سے کرتا تھا، بدقسمتی سے اس کا مطلب پورا نہ ہونے پایا۔ اس نے جاہل ناعالموں کی اصلاح کرنی چاہی تھی، اور بہترین علما، اور مشائخ کو ملکی عہدوں اور ذمہ داریوں پر ملکہ دربار کی مختلف خدمتوں پر مقرر کرنا چاہا تھا، مگر ناکام رہا، دشمنی پھیل گئی، اور مخالفت بڑھ گئی، باغیوں کی بن آئی، اور سلطان محمد کی جان پر آ بنی، بالآخر وہ ہلاک ہو گیا، اس کے مرتے ہی سلطنت پر ان علما کا اثر قائم ہو گیا جن کی اصلاح میں سلطان محمد اتنے عرصہ سے کوشاں تھا، اسی اثر کے تحت میں ایک تحریک ہوئی جس کی بنا پر سلطان کے ظلم اور اسکی خونریزیاں باقاعدہ لکھی گئیں،

(باقی)

شاہ محمد غوث گوالیاریؒ

از

جناب پروفیسر مسعود احمد صاحب حیدرآباد سندھ

(۳)

سفر گجرات، واقعۂ تکفیر اور بیعت شاہ وجیہ الدین علوی

۹۴۷ھ میں جب کہ افغانان سور کا غلبہ ہو گیا تھا، شاہ محمد غوث گوالیار سے ہجرت فرما کر گجرات تشریف لے آئے تھے[۱]، ملا عبد القادر بدایونی (متوفی ۱۰۰۴ھ / ۱۵۹۵ء) نے بھی لکھا ہے:۔

"وبعد از فترات ہند چوں شیر شاہ در مقام آزار شیخ محمد شد، سفر گجرات اختیار نمودہ وحکام وسلاطین آنجا نیز در ربقۂ انقیاد او داخل گردید بتمام در مقام خدمت بودند"[۲]

شیخ محمد غوث نے بھی، جواہر خمسہ (۹۲۹ھ) میں اس طرف اشارہ کیا ہے:۔

"بعد از چند سال از روئے قضا وقدر بہ ولایت گجرات رسید"[۳]

شاہ محمد غوث ۹۳۹ھ کے لگ بھگ گوالیار تشریف لائے تھے اور ۹۴۷ھ میں یہ ہجرت واقع ہوئی تھی[۴]۔ نصیر الدین محمد ہمایوں (متوفی ۹۶۳ھ / ۱۵۵۶ء) نے بھی اپنے مکتوب میں اس طرف اشارہ کیا ہے، "شاہان ہند سے تعلقات" کے ذیل میں مکتوب نقل کیا جا چکا ہے۔

۱؎ محمد غوثی: گلزار ابرار (اردو) مطبوعہ ۱۳۲۶ھ ص ۲۹۲ ۲؎ عبد القادر بدایونی: منتخب التواریخ ج ۳ ص ۵ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء و رحمان علی: تذکرۂ علمائے ہند، ص ۵۹۴ مطبوعہ کراچی ۱۹۶۱ء ۳؎ محمد غوث گوالیاری: جواہر خمسہ (دیباچہ) مطبوعہ دہلی ۱۳۲۵ھ ۴؎ محمد غوث: اوراد غوثیہ، ص ۱۷، مطبوعہ مطبع صبغۃ اللہی ۱۳۱۳ھ

شاہ محمد غوث پر شیر شاہ نے غالباً اس لیے عتاب کیا کہ آپ کا تعلق ہمایوں بادشاہ سے تھا، اس کے علاوہ بعض حاسدوں نے آپ کی تصنیف معراج نامہ شیر شاہ کے سامنے پیش کی اور یہ کہا کہ اس میں بہت سی خلاف شرع باتیں ہیں، اس پر وہ اور غضب ناک اور آپ کی ایذا رسانی کے درپے ہو گیا اور آپ مجبوراً ہجرت کرکے گجرات تشریف لے گئے، مفتی غلام سرور لاہوری نے بھی یہی لکھا ہے،

"وے در حالت عروج حال خویش کتاب موسوم بہ معراج نامہ تصنیف کردہ بود، دراں کتاب مقامات حال عروج خود درج کردہ، چوں بادشاہ ہمایوں معزول الریاست گشت واز ہند بہ طرف ایران رفت، حاسداں معراج نامۂ شیخ را نزد شیر شاہ بادشاہ بردند وبہ عرض رسانیدند کہ وے دریں کتاب کلمات خلاف شرع تحریر فرمودہ است، شیر شاہ درپے آزار وے شد پس شیخ از گوالیار بہ گجرات رفت۔"[1]

شاہ محمد غوث جب گجرات تشریف لے آئے تو یہاں علما نے معراج نامہ کے مندرجات پر ایک طوفان برپا کر دیا اور آپ کے قتل کے درپے ہو گئے، مفتی غلام سرور لاہوری نے اس کا حال بھی لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"علماے گجرات ہم بہ عداوت وے برخاستند، محضرے نوشتہ مستعد قتل وے شدند دراں حال شیخ وجیہ الدین گجراتی کہ سر دفتر علماء و صلحاء و مشائخ گجرات بود و بخدمت شیخ ارادت ہم داشت بہ عرض رسانید کہ چوں مجلس علماء منعقد شود و سخن در معراج افتد شیخ بفرمائید کہ ایں معراج مرا در عالم واقعہ بوقوع آمدہ است نہ در ہوش و بیداری۔ غرض چوں معرکہ علماء درمیان آمد شیخ فرمود کہ ایں معراج عالم بیہوشی ست کہ از ظاہر خبر نداشتم ازیں سبب علماء از آزار شیخ درگزشتند۔"[2]

---

[1] مفتی غلام سرور لاہوری: خزینۃ الاصفیاء، مطبوعہ لکھنؤ، ص ۲-۴۳ ۱۸۷۳ء [2] ایضاً

ملا عبدالقادر بدایونی نے اس واقعہ کو دوسرے انداز سے لکھا ہے، وہ شیخ کے ہمعصر ہیں، اس لیے ان کا بیان زیادہ مستند ہے، وہ لکھتے ہیں :-

"جب سلطان محمود گجراتی کے زمانے میں شیخ محمد غوث ہندوستان سے گجرات گئے تو شیخ علی متقی نے جو مشائخ کبار، اور اپنے وقت کے علما، روزگار میں تھے، ان کے قتل کا فتوی دیا، سلطان نے اس کا اجرا میاں وجیہ الدین کی رائے پر موقوف کر دیا، چنانچہ میاں وجیہ اللہ شیخ کی ملاقات کو گئے، اور پہلی ہی ملاقات میں ان کے ایسے معتقد ہوئے کہ بے اختیار ہو گئے اور اس فتوی کو پرزے پرزے کر ڈالا، یہ سن کر شیخ علی متقی ان کے مکان پر گئے، اور ان سے کہا تم کیوں بدعت کے رواج پر راضی ہو گئے؟ شرع میں رخنہ ڈالتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا، ہم ارباب قال ہیں اور شیخ اہل حال، ہمارا ذہن ان کے کمالات کو نہیں سمجھ سکتا اور ظاہر شریعت میں کوئی اعتراض ان پر نہیں آتا، غرض ان کے اثر سے تمام گجرات کے حکام شیخ محمد غوث کے معتقد ہو گئے اور شیخ نے اس بلا سے نجات پائی"[1]

شیخ وجیہ الدین علوی، شاہ محمد غوث سے اتنے متاثر ہوئے کہ شرف بیعت حاصل کر لیا، اس کی تفصیل شاہ محمد غوث کے خلفا کے ذیل میں بیان کی جائے گی۔

ملا عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے :-

"میاں شیخ وجیہ الدین عالم ربانی متبحر درس، غاشیۂ اطاعت او را بر دوش کشیدہ و ایں جملہ دال بر کمالات و کرامات شیخ است"[2]

شیخ وجیہ الدین علوی کوئی معمولی عالم نہ تھے، اپنے عہد کے جلیل القدر علما میں ان کا شمار کیا جاتا تھا، بلکہ اگر سرآمد علما، کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا، سکندر بن محمد نے مرات سکندری میں جہاں سلطان

---

[1] ملا عبدالقادر بدایونی : منتخب التواریخ (اردو) ص ۵ - ۴ ۱۴ مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۸۹ء
[2] منتخب التواریخ (فارسی) جلد سوم مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء

محمود گجراتی کے ہمعصر علماء کا ذکر کیا ہے وہاں شاہ محمد غوث کے بعد شیخ وجیہ الدین کا ذکر کیا ہے اور ان القاب کے ساتھ

"علم العلما، افضل الفضلا، جامع المنقول والمعقول، حاوی الفروع والاصول کاشف اسرار وجود، ناظر انوار شہود، بندگی میاں وجیہ الدین علوی"[1]

دائرۃ المعارف الاسلامیہ میں شاہ محمد غوث کے سفر گجرات اور شیخ وجیہ الدین علوی کے واقعہ بیعت کو بڑے مبہم انداز سے بیان کیا گیا ہے، اس کی اصلاح ضروری ہے، مقالہ نگار نے لکھا ہے:۔

"کوہستان چنار میں تیرہ برس سے زیادہ ریاضت و مجاہدے کے بعد (شاہ محمد غوث) گجرات تشریف لائے جہاں آپ مشہور و معروف عالم اور صوفی شیخ وجیہ الدین گجراتی سے آشنا ہوئے" (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، مطبوعہ لیڈن (ہالینڈ) ج ۳ ص ۸-۶۸۷ ۱۹۱۳ء)

شاہ محمد غوث کوہستان چنار میں ریاضت و مجاہدے کے بعد ۹۲۹ھ کے لگ بھگ گوالیار تشریف لائے۔ پھر شیر شاہ سوری کے ناروا سلوک سے خاطر برداشتہ ہو کر ۹۴۷ھ میں گجرات تشریف لے گئے، وہاں واقعہ تکفیر، شیخ وجیہ الدین علوی کی بیعت و خلافت کا ذریعہ بن گیا، یہ واقعہ شاہ محمد غوث اور شیخ وجیہ الدین کی زندگی کا بڑا اہم واقعہ ہے، مگر فاضل مقالہ نگار نے بیحد اختصار سے کام لیا ہے،

بعض ماخذوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ محمد غوث گوالیار سے دہلی تشریف لے گئے، پھر وہاں سے گجرات آئے، اور یہاں سے اکبر آباد بھی تشریف لے گئے، مولانا شیر علی بنگالی تحریر فرماتے ہیں:۔

"جب غوث الاولیاء آسودگان دہلی کی زیارت کے واسطے دہلی تشریف لائے تھے اس وقت آپ کی بیعت سے مشرف ہوا، اور آپ کی خدمت میں حاضر رہا، اور جب آپ

---

[1] سکندر بن محمد ۔ مرآت سکندری، ص ۳۴۳ مطبوعہ بمبئی ۱۳۰۸ھ ۱۸۹۰ء

گجرات کا سفر پیش آیا تو ہمراہ تھا، احمد آباد کے بعض کوتہ اندیش عالم اور چھوٹی نظر والے خرقہ پوش آپکے ساتھ دشمنی کا بہانا ڈھونڈھنے لگے اور نادانستہ و نافہیدہ باتیں آپکے متعلق کہنے لگے[1]"

بقول تکملہ نگار مناقب غوثیہ، شاہ محمد غوث تقریباً ۱۸ سال (۹۴۷ھ تا ۹۶۵ھ) گجرات میں مختلف مقامات پر رہے، جن میں قابل ذکر جاپانیر، بھروچ اور احمد آباد ہے۔ احمد آباد میں آپ نے ایک مسجد وخانقاہ تعمیر کرائی تھی، اس کے اتمام کی تاریخ یہ ہے :-

حضرت غوث جہاں، شیخ محمد خطیر	مظہر اسرار حق، معدن سر ہدی
کعبۂ صدق و صفا، قبلۂ اہل فیوض	ساخت چوں بہر خدا مسجد حاجت روا
مسجد ضوبخش در دل عباد آنزاں	سال نیا یش بگو معبد اہل ضیاء

۹۶۳ھ

گجرات کے اٹھارہ سالہ قیام نے شاہ محمد غوث کا حلقۂ اثر بہت وسیع کر دیا تھا، سلاطین گجرات میں سلطان محمود ثانی آپ کا عقیدت مند تھا، حضرت شاہ وجیہ الدین جیسے عالم ربانی و فاضل و متبحر آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے، اور گجرات، دکن و مالوہ وغیرہ کے علماء و فضلاء نے اس سلسلہ کو آپ سے حاصل کیا، گجرات و دکن میں یہ سلسلہ بہت ترقی پذیر ہوا[2]"

سفر اکبرآباد | گجرات میں اٹھارہ انیس سال گزارنے کے بعد شاہ محمد غوث ۹۶۶ھ/۱۵۵۸ء میں اکبرآباد تشریف لائے، ملا عبد القادر بدایونی (متوفی ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵ء) لکھتے ہیں :-

"۹۶۶ھ میں شیخ مشار الیہ (محمد غوثؒ) اپنے مریدین اور معتقدین کے ساتھ بڑے کر و فر سے گجرات سے آگرے تشریف لائے، شہنشاہ اکبر، عقیدت مندانہ پیش آیا، شیخ گدائی کو تنگ نظری اور نفاق و حسد کی وجہ سے، جو ایرانی ہند کا لازمۂ حیات ہے (شیخ محمد غوث)

---

[1] محمد ظہیر الحق احمد آبادی: تتمہ مناقب غوثیہ ص ۶۵-۶۶ مطبوعہ آگرہ ۱۹۳۳ء

[2] محمد ظہیر الحق احمد آبادی: تتمہ مناقب غوثیہ (اردو) ص ۶۳

کا آنا دوسرں کی دکان پر دکان لگانا گمنت نہ جایا سہ

بہ نزد خرد ایں سخن روشن ست

کہ ہم پیشہ ہم پیشہ را دشمن ست

خان خاناں کو بھی جس طرح شیخ سے پیش آنا چاہیے تھا، پیش نہ آیا کیونکہ شیخ گدائی نے اس کے مزاج میں پورا رسوخ پیدا کر لیا تھا، بلکہ اس نے تو مختلف مجالس منعقد کرکے شیخ محمد غوث کے رسالہ کو سامنے رکھا اور کہا کہ شیخ نے اس میں اپنی معراج کی کیفیت بیان کی ہے اور لکھا ہے کہ مجھکو بیداری میں حضرت رب العزت شانہ سے مجالسہ و مکالمہ ہوا ہے، اور اس طرح حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی تقدیم کی ہے، اسی قسم کی اور خرافات جو عقلاً و نقلاً قابل ملامت اور مذموم ہیں، مجالس میں شیخ کی طرف منسوب کی گئیں، شیخ کو اس میں گھسیٹ کر نشانہ تیر ملامت بنایا گیا، یہاں تک کہ شیخ محمد غوث آزردہ خاطر ہو کر گوالیار تشریف لے گئے۔ اور وہاں سلسلۂ رشد و ہدایت جاری کیا، اور جو ایک کروڑ کی جاگیر عطا کی گئی تھی اسی پر قناعت کی"   (منتخب التواریخ جلد ۲ ص ۳۴۳ و ۳۴۵)

عبدالقادر بدایونی نے شاہ محمد غوث کی بھی زیارت کی تھی، چنانچہ انھوں نے ان کے چشم دید حالات اسطرح بیان کیے ہیں :-

"۹۶۶ھ میں فقیر نے آگرے کے بازار میں دور سے (شیخ محمد غوث کو) دیکھا تھا (گھوڑے پر) سوار تشریف لے جا رہے تھے، اور چاروں طرف لوگوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ وہاں سے کسی کا گزرنا محال تھا، بڑے تواضع و انکسار کے ساتھ دائیں بائیں لوگوں کے سلام کا جواب دیتے جاتے تھے، اور ایک لحظہ بھی چین و قرار نہیں تھا، تواضع کا یہ عالم تھا کہ آپ کی خمیدہ کمر قابوس زین تک جا پہنچی تھی، سنہ مذکور میں آپ گجرات سے آگرے تشریف لائے تھے۔"

(ترجمہ)

تاریخ فرشتہ نے جہاں شاہ محمد غوث کا ذکر کیا ہے، وہیں آگرہ میں آپ کی آمد اور آزردہ خاطر ہوکر گوالیار کی مراجعت کا بھی ذکر کیا ہے، اس نے لکھا ہے کہ بیرم خاں نے شاہ محمد غوث کے ساتھ جو سرد مہری اور معاندانہ رویہ اختیار کیا اس سے اکبر بادشاہ کو بڑا افسوس ہوا اور وہ بیرم خاں سے بیحد آزردہ ہوا، چنانچہ فرشتہ لکھتا ہے :-

در ماہ رجب آں سال (۹۶۶ھ) شیخ محمد غوث برادر شیخ بہلول (بھول) کہ حق خدمت برآں دودماں داشت و بوقت استیلاے افغاناں بہ گجرات رفتہ بود، دریں وقت با فرزنداں و مریداں بدرگاہ آمد و چوں از بیرم خاں گوشۂ خاطرے ندید بازبہ گوالیار کہ مسکن قدیم او بود، رفت، خاقان اکبر برسرایں مقدمہ از بیرم خاں ترکمان بہ غایت آزردہ شد

بیت

بلے سلطاں معشوقاں غیور است
ز شرکت ملک معشوقیش دور است[۱]

دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگار نے شاہ محمد غوث کے حالات کے ذیل میں بعض باتیں غیر واضح اور بعض باتیں غلط لکھ دی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ

۹۶۶ھ (۱۵۵۸ء) میں جب آپ (شیخ محمد غوث) آگرے تشریف لے گئے، جہاں اکبر نے آپ کے ساتھ سرد مہری کا برتاؤ کیا[۲]

ملا عبدالقادر بدایونی اور فرشتہ کے جو بیانات اوپر نقل کیے گئے ان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آگرے میں شیخ گدائی اور بیرم خاں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے شاہ محمد غوث نے گوالیار مراجعت کی تھی، اکبر کو آزردہ خاطر ہوکر آپ کے واپس جانے کا بڑا قلق تھا، اسی وجہ سے وہ بیرم خاں سے آزردہ ہو گیا تھا، اکبر ناخوش ہوتا تو خزانۂ شاہی سے شاہ محمد غوث کو جو وظیفہ ملتا تھا اور حکومت کی طرف سے جو

---

[۱] محمد قاسم ہندو شاہ استرآبادی: تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۲۵۰ مطبوعہ بمبئی ۱۲۴۷ھ/ ۱۸۳۲ء [۲] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (ط) لائیڈن ۱۹۱۳ء ج سوم، ص ۶۸۷-۸

جاگیریں عطا کی گئی تھیں، وہ بند ہو جائیں، اس سلسلے میں ہم نے ملا عبد القادر بدایونی، صاحب مآثر الامراء، اور صاحب ذخیرۃ الخوانین کے بیانات اوپر نقل کر دیے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ لاکھوں کی جاگیر اور لاکھوں کا وظیفہ تھا، اکبر کی عقیدت شاہ محمد غوث کی حیات تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ وفات کے بعد آپ کے مزار مبارک پر اکبر نے شاندار مقبرہ بھی تعمیر کرایا، جس کا مفصل ذکر آگے آئیگا۔ اس کی تعریف میں اسمتھ نے لکھا ہے:

"اس عہد کی ممتاز ترین یادگاروں میں شاہ محمد غوث کا مقبرہ ہے، گو کہ وہ مقابلۃً زیادہ مشہور و معروف نہیں" (وی۔ اے اسمتھ: اکبر دی گریٹ مغل، ص ۴۳۳ مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۱۹ء)

شاہ محمد غوث نے اکبرآباد سے گوالیار پہنچنے کے بعد ایک خانقاہ تعمیر کرائی اور بیعت و ارشاد میں مشغول ہو گئے، ملا عبد القادر بدایونی لکھتے ہیں

"رنجیدہ بہ گوالیار رفت و بہ تکمیل مریداں مشغول شد و خانقاہے تعمیر فرمودہ بہ سماع و سرود و وجد و اشتغال داشت و خود دوراں وادی تصنیف و در کسوت فقر بیا رضا جاہ و جلال بود و یک کرور تنکہ مدد معاش داشت"[1]

بدایونی کے ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ محمد غوث اکبرآباد سے گوالیار جانے کے بعد پھر تشریف نہیں لائے لیکن وفات کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے:۔

"در سنہ نہصد و ہفتاد (۹۷۰ھ) بعد از ہشتاد سالگی در آگرہ رحلت بدار الملک آخرت نمود و در گوالیار مدفون شد"[2]

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ پھر اکبرآباد تشریف لائے تھے، اور آخر وقت تک یہیں رہے ۹۶۶ھ/۱۵۵۸ء میں جب پہلی مرتبہ آپ اکبرآباد تشریف لائے تو بیرم خاں حیات تھا، اور (۹۶۷ھ/۱۵۵۹ء) میں اس کو

---

[1] منتخب التواریخ جلد سوم ص ۶

شہید کر دیا گیا تھا، اس سے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ۹۶۷ھ/۱۵۵۹ء اور ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء کے درمیان شاہ محمد غوث دوبارہ آگرہ آباد تشریف لائے، کیونکہ اکبر آپ سے بہت متاثر تھا، بلکہ بیعت وعقیدہ رکھتا تھا۔

وفات: شاہ محمد غوث گوالیاری ۷ رجب المرجب ۹۰۷ھ میں ظہور آباد (غازیپور) میں پیدا ہوئے اور ۱۴ رمضان المبارک ۹۷۰ھ میں آگرہ آباد میں وفات پائی اور گوالیار میں مدفون ہوئے۔

مفتاح التواریخ میں ہے :-

غوث گوالیاری، مرشد شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی ست، بتاریخ چہاردہم رمضان نہصد و ہفتاد ہجری فوت کردہ، در گوالیار مدفون گردیدہ۔ (ص ۲۵۲)

مخبر الواصلین میں جو قطعۂ تاریخ وفات ہے، اس میں ان دو شعروں میں تاریخ وسنہ وفات کا ذکر کیا ہے :-

از مہ صوم بود چہاردہم	کہ گزشت از زمانہ غوث امم
سال نقلش بتعمیہ رضوان	غوث بے لوث زور قم برخواں
	۱۵۰۶ - ۵۳۶ = ۹۷۰ھ

مخبر الواصلین میں یہ قطعۂ تاریخ وفات بھی ہے :-

آں شیخ محمد المخاطب	بالغوث بہ لطف معبود
تاریخ وصال او ملائک	گفتند کہ شیخ اولیاء بود
	۹۷۰

تھامس ولیم بیل نے سنہ وفات تو ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء لکھا ہے مگر تاریخ وفات ۱۴ رمضان المبارک کے بجائے ۱۴ محرم لکھدی ہے[1]، غالباً بیل کا ماخذ نظامی بدایونی کی قاموس المشاہیر ہے، نظامی نے جو کچھ لکھا ہے، بیل نے ہو بہو نقل کر دیا ہے، اس نے لکھا ہے :-

۱۴ ستمبر ۱۵۶۲ء مطابق ۱۴ محرم ۹۷۰ھ کو وصال ہوا، شیخ اولیاء بود

[1] محمد غوث گوالیاری = اورادِ غوثیہ ص ۲۴ و ۲۵ - ولیم بیل = اورینٹل بائیوگرافیکل ڈکشنری ص ۱۸۹، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۸۱ء

ے تاریخ وفات (۹۷۰ھ) نکلتی ہے،[1]

ہرمن ایتھے نے لکھا ہے :-

"غالباً ۹۷۰ھ مطابق ۱۵۶۲ء میں انتقال فرمایا۔"[2]

معلوم نہیں سنہ وفات کے ساتھ لفظ "غالباً" لکھ کر کیوں مشکوک بنا دیا، جب کہ جملہ معاصرین کا اس پر اتفاق ہے کہ ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء میں آپ کی وفات ہوئی،

مناقب غوثیہ (۹۴۹ھ) کے تکملہ نگار نے یہ قطعۂ تاریخ نقل کیا ہے :-

شیخ دوراں غوث انس وجاں محمد غوث ما	شد بہ سال نہصد و ہفتاد در جنت خرام
عرس او خواہی بہ دل کن یاد ایں مصراع را	نیم شب از جمعہ بود و نصف از ماہ صیام[3]

تاریخ ولادت (۷ رجب ۹۰۰ھ) اور تاریخ وفات (۱۴ رمضان ۹۷۰ھ) کے لحاظ سے عمر شریف تریسٹھ سال دو ماہ سات یوم ہوتی ہے، عمر کے تعین کے سلسلے میں عبد القادر بدایونی سے فاحش غلطی ہوئی ہے، حالانکہ انھوں نے شاہ محمد غوث کو ۹۶۶ھ/۱۵۵۹ء میں بچشم خود اکبرآباد میں دیکھا تھا، لیکن چونکہ غوث الاولیاء کی کمر خمیدہ اور جسم بہت ضعیف نظر آرہا تھا، اس لیے بدایونی نے یہ قیاس سے ۸۰ سال عمر لکھ دی، وہ لکھتے ہیں :

"و در سنہ نہصد و ہفتاد (۹۷۰ھ) بعد از ہشتاد سالگی در آگرہ رحلت بدار الملک آخرت نمود و در گوالیار مدفون شد۔"[4]

داراشکوہ نے بھی سفینۃ الاولیاء میں بدایونی کے بیان کو نقل کردیا ہے کہ شاہ محمد غوث نے "اسّی سال کی عمر پائی۔"[5]

---

[1] نظامی بدایونی : قاموس المشاہیر ج ۲ ص ۱۹۸ مطبوعہ بدایوں ۱۹۲۴ء [2] ہرمن ایتھے : "کیٹالاگ آف دی پرشین مینوسکرپٹس ان دی لائبریری آف انڈیا آفس" ج اول ص ۱۰۴۳ مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۰۳ء [3] تکملہ مناقب غوثیہ ص ۸، [4] ملا عبد القادر بدایونی : منتخب التواریخ، ج ۳ ص ۶ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء [5] داراشکوہ : سفینۃ الاولیاء (اردو) ص ۲۳۰ مطبوعہ لاہور۔

مفتی غلام سرور لاہوری نے بھی بدایونی پر اعتماد کر کے لکھا ہے کہ "مدت عمرش ہشتاد سال"۔[1] گر دارا شکوہ اور مفتی غلام سرور نے تاریخ وفات ۱۵ رمضان المبارک لکھی ہے ۔ ڈاکٹر عبد الحق صاحب نے بدایونی کی تعلیقہ میں شاہ محمد غوث کی عمر ۸۰ سال لکھی ہے۔ شیخ محمد اکرام نے بھی یہی لکھدیا ہے غرض ایک معاصر کی قیاس آرائی سے پورے کا پورا سلسلہ غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا، اگر خود شاہ محمد غوث کے بیانات سامنے نہ ہوتے تو صحیح عمر کا معلوم کرنا مشکل ہو جاتا۔

دوسرا مسئلہ جائے وفات کا ہے، اس سلسلے میں بھی لوگوں نے غلطیاں کی ہیں، دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگار نے لکھا ہے :۔

"بالآخر آپ گوالیار تشریف لے آئے جہاں ۹۷۰ھ (۱۵۶۲ء) میں آپ کی وفات ہوئی۔" (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ج ۳ ص ۸۔ ۹۸۷، ۱۹۱۳ء)

مگر اس سلسلے میں عبد القادر بدایونی کا بیان مستند سمجھا جائیگا کیوں کہ شاہ محمد غوث کا انتقال ان کی حیات میں ہوا، اور جیسا کہ اوپر تحریر کیا جا چکا ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ شاہ محمد غوث کا انتقال اکبر آباد میں ہوا، اور لاش مبارک گوالیار لیجائی گئی اور یہیں دفن کیا گیا۔ مزار مبارک پر اکبر بادشاہ کی طرف سے شاہ محمد غوث کے صاحبزادے شیخ عبد اللہ (متوفی ۱۰۲۱ھ/۱۶۱۲ء) کی نگرانی میں شاندار مقبرہ تعمیر ہوا، محمد غوثی نے لکھا ہے :۔

"اس زمانہ میں شہنشاہ زماں اکبر شاہ کو منظور ہوا کہ روضۂ غوثیہ کی عمارت دولت کی طرف سے تیار کی جاوے۔" (محمد غوثی۔ گلزار ابرار (اردو) ص ۴۸۸)

اور بقول صاحب کلیات گوالیار :۔

"برائے مدد خرچ مقبرہ جاگیر از پرگنات .... قریب سہ لک و بست و پنج ہزار روپیہ ۳۲۵۰۰۰

[1] خزینۃ الاصفیا، ص ۳۳۴ ؎ مولوی عبد الحق مرحوم، اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۳۵۔ مطبوعہ کراچی ۱۹۵۳ء

جدو مقرر کردہ!! (کلیات گوالیار بحوالہ مضمون قاضی معراج الدین دھولپوری)

مولوی ذکاء اللہ مرحوم نے مدد معاش اور مصارف روضۂ شریف کے لیے پانچ لاکھ روپیہ کی جاگیر لکھی ہے،

شاہ محمد غوث کے احاطہ میں دربار اکبری کے مشہور مطرب تان سین کا بھی مزار ہے، اور حکومت ہند کی طرف سے اس کا بھی باقاعدہ عرس ہوتا ہے[1]۔

شاہ محمد غوث کے مقبرے کی عمارت اکبری عہد کی ممتاز یادگاروں میں ہے، وی، اے اسمتھ نے اس عمارت پر مفصل تبصرہ کیا ہے، ہم یہاں اس کا بیان نقل کرتے ہیں، جس سے مقبرہ کی شان و عظمت کا پورا پورا اندازہ ہو سکے گا، اسمتھ نے لکھا ہے:-

---

[1] سید حسام الدین راشدی نے مقالات الشعراء کے حاشیہ میں میاں تان سین کے حالات درج کیے ہیں، ہم وہیں سے فارسی عبارت کا خلاصہ پیش کرتے ہیں:-

"ترلوچن داس بن مکرند پانڈے، گوڑ برہمن کے قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا، مضافات گوالیار میں موضع بھینٹ میں پیدا ہوا تھا،

فن موسیقی میں مہارت کے بعد اس کا نام میاں تان سین ہو گیا تھا، شیخ محمد غوث گوالیاری (متوفی ۹۷۰ھ) کی دعاؤں کے طفیل ۹۳۶ھ یا ۹۳۰ھ میں پیدا ہوا،

شیخ محمد غوث کے حضور میں اس نے تربیت پائی اور استادان فن موسیقی سے یہ فن حاصل کیا اور اس قدر کمال حاصل کیا کہ بقول ابوالفضل ہزار سال میں اسکا مثل پیدا نہیں ہوا، ابتدا میں راجہ رام چند والی باندھو (ریواں) نے اس کو اپنے دربار میں رکھا، اسکے بعد راجہ بیربر اور زین خاں کی تحریک سے ۹۷۰ھ میں اکبر نے اس کو اپنے دربار میں طلب کر لیا، وہاں اس نے وہ کارہائے نمایاں کیے کہ ابتک اسکا نام زندہ ہے، آخر ۹۹۷ھ (۱۵۸۹ء) میں اسکا انتقال ہو گیا"۔
(حاشیہ مقالات الشعراء مولفہ میر شیر علی قانع تتوی، مطبوعہ کراچی ۱۹۵۷ء ص ۲-۱۰۱ اور رسالہ آجکل دہلی) موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء

"اس عہد کی ممتاز ترین یادگاروں میں گوالیار میں شاہ محمد غوث کا مقبرہ ہے، گو کہ یہ مقابلتاً زیادہ معروف نہیں، یہ عمارت مقبرہ ہمایوں (دہلی) کے قریبی زمانے میں تعمیر ہوئی ہے، لیکن اس کا ڈیزائن بالکل انوکھا ہے، کچھ بعید نہیں اگر کوئی شخص اس کو خالص ہندوستانی یادگار سمجھ لے،

یہ عمارت مربع ہے، ہر طرف سے ۱۰۰ فٹ ہے، ہر کونے پر ایک زاویہ کے ساتھ مسدس برج بنے ہوئے ہیں، صرف مقبرہ کا ہال ۴۳ مربع فٹ ہے، اس کے چاروں طرف برآمدہ ہے، یہ غیر معمولی بڑے بڑے چھجوں سے محفوظ ہے،

باہر کا حصہ پہلے ایرانی طرز کے نیلے چمکدار ٹائلوں سے ڈھکا ہوا تھا، گنبد پٹھانی طرز کا قدرے اونچا ہے، اور اطراف سے قدرے فاصلے پر ترچھا ہے، بعض محرابیں ہند مسلم طرز کے ہیں لیکن بعض کے مربع ستون ہیں اور دیوارگیری نما راس عمود ہیں جو ہندوؤں کے مندر کے مشابہ معلوم ہوتے ہیں،

ہند و مسلم طرز تعمیر کا یہ خالص امتزاج محض مقامی حالات کی بنا پر ہے، اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں اسلام اور ہندومت کو ہم آہنگ کرنے کی نظری سعی کی گئی ہے، اور یہ کہنا بھی مناسب نہ ہوگا کہ اس عمارت کی تعمیر پر اکبر کی رائے اثر انداز ہوئی ہوگی، کیونکہ جب یہ عمارت بنی ہے اس وقت شہنشاہ بڑا پرجوش مسلمان تھا۔"[1]

اسمتھ کا خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ "مقبرۂ غوث الاولیاء میں ہند و مسلم طرز تعمیر کے امتزاج کی عمداً کوشش کی گئی ہے یا اس میں اکبر کی رائے شامل نہیں تھی، بلکہ یہ امتزاج مقامی حالات کا نتیجہ ہے" ۔۔۔ کیونکہ ابتدائی دور میں اکبر پرجوش مسلمان تھا ۔۔۔ اس میں شک نہیں کہ اکبر

---

[1] وی، اے اسمتھ : اکبر دی گریٹ مغل ص ۴۳۵ - ۶

اپنے ابتدائی دور میں ایک سرگرم اور پرجوش مسلمان تھا، مگر وہ ہندو کش یا ہندو دشمن نہیں تھا۔
بلکہ اس وقت بھی ہندو دوستی اور رواداری اس میں پوری طرح موجود تھی، چنانچہ ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء میں
جب وہ اجمیر حاضر ہوا ہے تو واپسی میں جے پور کے راجہ بہاری مل کی لڑکی سے اس نے شادی
بھی کی ہے،

اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مقبرے کی تعمیر اکبر کی فرمایش پر شاہ محمد غوث کے
فرزند رشید شیخ عبد اللہ کی نگرانی میں ہوئی ہے،

خود صاحب مزار شاہ محمد غوث کی رواداری اور وسعت قلبی کا یہ عالم تھا کہ مسلمان تو مسلمان
ہندوؤں کے لیے بھی تعظیماً کھڑے ہو جایا کرتے تھے، عبد القادر بدایونی لکھتے ہیں:۔

"ہر کرا می دید حتی کہ کفار را نیز تعظیم و قیام می نمود و ازیں جہت اہل فقرا مذکے بملامت
وانکار او برخاستند والغیب عند اللہ ـــ تا چہ نیت داشتہ باشد۔ بیت:

چون رد و قبول ہمہ در پردۂ غیب ست — زنہار کسے را نہ کنی عیب کہ عیب ست[1]

شاہ محمد غوث کے تواضع و انکسار کا یہ عالم تھا کہ زندگی میں کبھی اپنے لیے لفظ "میں" استعمال نہیں
کیا، بلکہ ہمیشہ خود کو "فقیر" سے تعبیر کیا کرتے تھے، اگر کسی کو غلہ بخشش فرماتے تو اس وقت بھی لفظ
"من" استعمال نہ کرتے تھے، بلکہ فرماتے کہ اتنے "میم" "نون" فلاں شخص کو ہدیہ کر دیا جائے۔

عبد القادر بدایونی لکھتے ہیں:۔

وی گویند کہ ہرگز لفظ "من" بزبان او نگذشتہ و ہمیشہ تعبیر از خود بہ "فقیر" کردے۔
چنانچہ در وقت بخشش غلہ ہم می گفت کہ این قدر میم و نون بہ فلانے بہ ہدیہ تا من نباید
گفت، رحمۃ اللہ علیہ واسعۃ"[2]

---

[1] منتخب التواریخ جلد ۳ ص ۴ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء [2] ایضاً

مندرجۂ بالا واقعات سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مقبرے کی تعمیر میں مقامی حالات و اثرات کے ساتھ جو ایک فطری امر ہے، اکبر کی رائے کو بھی پورا دخل تھا، اور جس طرح اکبر اور شاہ محمد غوثؒ زندگی بھر روادار رہے، اسی طرح یہ مقبرہ بھی ان کی رواداری کا آئینہ دار ہے، یہ محض حسن اتفاق نہیں بلکہ عمداً اس امتزاج کی کوشش کی گئی ہے، تاکہ اہل وطن کے ساتھ یگانگت نمایاں ہو،

لفٹنٹ کرنل سر ولزلے ہیگ نے بھی شاہ محمد غوثؒ کے مقبرے کے متعلق اظہار خیال کیا ہے، ان کے اور اسمتھ کے خیالات ملتے جلتے نظر آتے ہیں، اس نے لکھا ہے:۔

"اسی زمانے میں کچھ فاصلے پر گوالیار کے ہند و ماحول میں محمد غوث کا مقبرہ تیار کیا جا رہا تھا، یہ عمارت اپنے غیر معمولی ڈیزائن کی وجہ سے بعض دلچسپیاں رکھتی ہے، یہ اس مسلم صوفی کے مزار مبارک پر بنائی گئی ہے جس کا ابتدائی مغل عہد میں بہت چرچا تھا۔ اس عمارت میں "لودھی" طرز تعمیر کی خصوصیات کی آمیزش ہے، یہ خصوصیات مغربی ہند کی عمارات میں پسند کی جاتی ہیں، اس میں شک نہیں کہ یہ امتزاج مقامی معماروں کی فنکاری کا نتیجہ ہے، ان لوگوں کے سامنے اپنے مسلم آقاؤں کی پسند کی بہ نسبت مالوہ کی تعمیری خصوصیات اور نمونے ہوتے تھے، اس عمارت میں مغل اور مالوہ طرز تعمیر کے امتزاج کا فقدان ہے، کیونکہ یہ اتحادی امتزاج ابھی پیدا نہیں ہوا تھا، شہنشاہ اکبر کی روادارانہ پالیسی کے تحت بعد میں یہ امتزاج پیدا ہوا، بایں ہمہ اس عمارت میں بعض ممتاز خوبیاں بھی ہیں، بالخصوص اس کی مشبک دیواریں، لیکن کونے کے مسدس برجوں کو جو انکے زاویوں سے ملا دیا گیا ہے تو اس سے مجموعی طور پر عمارت کی رفعت متاثر ہوتی ہے اور اسی وجہ سے یہ غیر مربوط سی نظر آتی ہے۔" (دی کیمبرج ہسٹری آف انڈیا ج چہارم ص ۳۰۲ مطبوعہ دہلی، ۱۹۵۸ء)

شاہ محمد غوثؒ کے مقبرے کے متعلق مزید معلومات حسب ذیل ماخذوں سے حاصل ہو سکتی ہیں:-

(ا) لیپل گریفن : فیمس مونیومنٹس آف سنٹرل انڈیا،

مطبوعہ ۱۸۸۶ء، ص x/vii

(ب) فرگوسن، مطبوعہ ۱۹۱۰ء، ص ۲۹۲، ٹمک، ۴۲۲

(ج) برائنر ڈاسپونر: اینول رپورٹ آف دی آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا،

۲۲-۱۹۲۱ مطبوعہ ۱۹۲۴ء، ص ۳۷

(د) ڈاکٹر نورس: انڈین آرکیٹیکچر

بزمِ صوفیہ

جس میں عہد تیموریہ سے پہلے کے صوفیۂ کرام، حضرت شیخ ابوالحسن علی ہجویریؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ، حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، حضرت بو علی قلندر پانی پتیؒ، حضرت شیخ فخر الدین عراقیؒ، حضرت برہان الدین غریبؒ، حضرت ضیاء الدین نخشبیؒ، حضرت شرف الدین احمد منیریؒ، حضرت جہانیاں جہاں گشتؒ، حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ، اور حضرت خواجہ گیسو درازؒ کے مستند حالات اور تعلیمات پیش کی گئی ہیں،

قیمت:- سے

تصوف و سلوک

اس میں تصوف کے متعلق ہر قسم کی عملی و علمی غلطیوں اور غلط فہمیوں کو دور کرکے بتایا گیا ہے کہ حقیقی تصوف دراصل کمالِ اسلام اور کمالِ ایمان کے سوا اور کچھ نہیں ہے،

قیمت:- صہ

"مذکر احباب" کا تنقیدی جائزہ

از جناب ڈاکٹر امام بانی فخر الزمان حسن صاحب ریڈر شعبۂ فارسی وکلینس کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

یہ دسویں صدی ہجری (۹۷۴ھ) کے فارسی شعراء کا عام تذکرہ ہے جس میں اس کے مولف بہاء الدین حسن نثاری بخارائی نے قید مکانی سے آزاد ہو کر اپنے معاصر اور قریب العہد شعراء کا مختصر حال لکھا ہے اور ان کے کلام کا نمونہ پیش کیا ہے، چونکہ بعض شعراء خود مولف کے وطن سے متعلق تھے اور وہ ان کو ذاتی طور سے جانتا تھا، اس لیے ان کے متعلق بڑی حد تک اس کی اطلاعات معتبر ہیں، یہ تذکرہ مجالس النفائس کا تکملہ اور کسی حد تک نفائس المآثر کا ماخذ ہے، مگر بڑے افسوس کی بات ہے کہ یہ بیش قیمت علمی خزانہ ایک عرصے سے ادبی مورخوں اور فہرست نگاروں کی غلط فہمیوں اور مہمل بیانیوں کا نشانہ بنا ہوا ہے، اسٹوری اپنی فہرست میں رقمطراز ہیں:-

> " مذکر احباب" تاریخی نام ہے، یہ ان ۲۰۵ شعراء کا تذکرہ ہے جو بخارا اور اس کے توابع میں میر علی شیر نوائی کے بعد تھے، اور یہ ایک مقالے (الف) چنگیز خانی سلاطین یعنی شیبان خاں وغیرہ (ب) چغتائی سلاطین یعنی بابر وغیرہ اور چار ابواب (۱) وہ شعرا جن کو مؤلف ذاتی طور سے نہیں جانتا تھا، اور وہ فوت ہو چکے تھے، (۲) وہ شعراء جن کو مؤلف جانتا تھا (۳) وہ شعراء جن کو مؤلف جانتا تھا اور وہ اس وقت زندہ تھے، (۴) وہ شعراء جن کو مؤلف نہیں جانتا تھا اور وہ اس وقت زندہ تھے، اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے جو خود مؤلف کے اعزہ سے متعلق ہے۔" (۲-۸-۳)

ظاہر ہے کہ بابر اور اس کے بعد کے چغتائی سلاطین ۱۰۹۵ھ تک بخارا اور اس کے توابع میں کیوں ہوتے۔ اسٹوری سے اس کی توقع نہیں کیجاسکتی ہے کہ وہ متن دیکھنے کی تکلیف گوارا کرتے لیکن اگر وہ صرف فہرست پڑھ لیتے تو ان کو اندازہ ہو جاتا کہ بخارا کیا معنی اور ماوراء النہر[1] کے باہر کے شعراء کی ایک کثیر تعداد تذکرے میں موجود ہے، اور اصفہان، اندجان، آذربائیجان، بدخشاں، بلخ، تاشکند، تبریز، تربت، ترکستان، تون، خیوق، خبوشان، خراسان، ختا، خوارزم، روم، سیستان، شام، شیراز، شیروان، عراق، کاشان، کرمان، لار، لاہجان، مشہد، مرو، ہند، تحف، نشاپور، اور ہند تک کے شعراء شامل ہیں۔ متن پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں تقریباً ایک چوتھائی تعداد ان شعراء کی ہے جو اس وقت ہندوستان میں تھے، ان میں بادشاہ، شہزادے، امراء، پیشہ ور اور غیر پیشہ ور سب شعراء ہیں، اور اس میں ہندوستانی شعراء کے متعلق ایسی اطلاعات بھی ملتی ہیں جو مقامی اور معاصر تذکروں میں نہیں ہیں، مؤلف نے خود جابجا طبقہ ہندی میں اس کا اظہار کر دیا ہے کہ اس کا قلم بخارا اور اس کے توابع میں مقید نہیں، چنانچہ کہتا ہے :-

۱۔ فصل در ذکر جماعتی کہ فقیر ایشاں را دیدہ و بسن شیخوخہ رسیدہ و در بخارا مدفون اند۔

۲۔ فصل در ذکر جماعتی کہ فقیر بایشاں ملاقات نکردہ و ایشان بسن شیخوخہ رسیدہ و در غیر بخارا مدفون اند۔

۳۔ فصل در ذکر جماعتی کہ فقیر ایشاں را دیدہ و بسن شیخوخہ رسیدہ و در بخارا مدفون اند۔

۴۔ فصل در ذکر جماعتی کہ فقیر ایشاں را دیدہ و بسن شیخوخہ نرسیدہ و در بخارا مدفون اند۔

۵۔ فصل در ذکر جماعتی کہ فقیر ایشاں را دیدہ و بسن شیخوخہ نرسیدہ و در غیر بخارا مدفون اند۔

۶۔ فصل در ذکر جماعتی کہ فقیر ایشاں را ملازمت کردہ و بسن شیخوخہ رسیدہ۔

۷۔ فصل در ذکر جماعتی کہ فقیر ایشاں را ملازمت کردہ و بسن شیخوخہ نرسیدہ و در بخارا ساکن اند۔

۸۔ فصل در ذکر جماعتی کہ فقیر ایشاں را ملازمت نمودہ و بسن شیخوخہ نرسیدہ و در بخارا ساکن اند۔

---

[1] یعنی سمرقند، بخارا، ترمذ اور خجند

۹۔ فصل در ذکر جماعتی کہ فقیر ایشان را ملازمت نمودہ و بسن شیخوخہ رسیدہ ساکن بخارا اند

۱۰۔ فصل در ذکر جماعتی کہ فقیر ایشان را دیدہ و بسن شیخوخہ رسیدہ و در بخارا ساکن نیستند۔

۱۱۔ فصل در ذکر جماعتی کہ فقیر بہ ایشان ملازمت نکردہ و بسن شیخوخہ نرسیدہ اند و ساکن بخارا نیستند

زمانۂ تالیف | رضا زادہ شفق اپنی تاریخ ادبیات ایران[۱] میں تحریر کرتے ہیں:۔

" تذکرۃ الاحباب[۲] " ترجمۂ شعرای زمان میر علی شیر نوائی تا سال ۹۷۳ھ تالیف نثاری بخارائی"

سید مبارز الدین رفعت مترجم تاریخ مذکور[۳] لکھتے ہیں:۔

" تذکرۃ الاحباب[۴] " از نثاری بخارائی، میر علی شیر نوائی کے زمانے کے شاعروں کا تذکرہ ۹۷۳ھ تک۔"

معلوم نہیں ان دونوں اصحاب کو اس کے سنہ کا کیسے اندازہ ہوگیا، کیونکہ انھوں نے اس تذکرے کے جو نئے نئے نام لکھے ہیں، ان میں پہلے میں ۱۳ سال زیادہ اور دوسرے میں ۳۲ سال زیادہ شمار ہوتے ہیں، دوسری بات قابل توجہ یہ ہے کہ میر علی شیر نوائی کی وفات ۹۰۶ھ میں ہو چکی تھی،[۵] ان کا زمانہ ۹۷۳ھ تک کیونکر باقی رہ گیا، اسٹوری نے اتنا تو سمجھے کہ یہ تاریخی نام ہے، مگر اس پر غور نہیں کیا کہ یہ تذکرہ کے آغاز کی تاریخ ہے یا اختتام کی؟ حالانکہ مولف نے مقالے میں واضح کر دیا ہے:۔

چون دریں تذکرہ زبانِ قلم	ذکر احباب کرد از ہر باب
نام و تاریخ سالِ اتمامش	گشت از انرو "ذکر احباب"

لیکن متن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سنہ یعنی ۹۷۴ھ کے بہت بعد تک اضافے کا کام جاری رہا، چنانچہ خواجہ حسین مروی کے بیان میں مولف نے اس کے حج کو جانے اور وہاں سے

---

[۱] ص ۸۱۲ [۲] ص ۱۰۰۵ [۳] ص ۵۲۹ [۴] ص ۱۰۰۹ [۵] مجالس النفائس تالیف میر علی شیر نوائی بسعی و اہتمام علی اصغر حکمت، مقدمہ ص ح

واپسی کا بھی ذکر کیا ہے :-

"بعد از وفات بادشاہ بطواف کعبہ معظمہ و مدینہ مکرمہ مشرف گشتہ بہند معاودت نمود۔"

دو اور معاصر اور مقامی تذکرہ نویس :-

(۱) علاء الدولہ قزوینی نفائس المآثر میں لکھتے ہیں :-

"خواجہ حسین مروی در تاریخ ۹۸۰ھ بعد از مراجعت سفر مبارک از حرمین شریفین۔"

(۲) ملا عبد القادر بدایونی منتخب التواریخ[1] میں تحریر فرماتے ہیں :-

"او در سنہ نہصد و ہفتاد ودو از ہندوستان رخصت وطن حاصل کرد و شیخ فیضی

کہ تربیت یافتۂ وے بود "دام ظلہ"[2] تاریخ یافت۔"

تذکرہ احباب کا یہ بیان کہ "بعد از وفات بادشاہ" یعنی ہمایوں، قابل بحث ہے، کیونکہ ہمایوں کی وفات ۹۶۳ھ میں ہو چکی تھی، یہ اور بات ہے کہ اس کے پاس تازہ اطلاعات حاصل کرنے کے ذرائع نہیں تھے، مگر حج کو جانا اور وہاں سے واپسی کا واقعہ اٹل ہے۔

اس سے پہلے حج کو جانے کی اطلاع کہیں سے فراہم نہیں ہوتی[3]

چونکہ مؤلف تذکرہ احباب نے تاریخیں لکھنے سے گریز کیا ہے اس لیے اس سے زیادہ اندازہ نہ ہو سکا اور سنہ آغاز کا کہیں سے پتا نہیں چلتا،

سبب تالیف | مؤلف نے تذکرے کے مقالے میں تحریر کیا ہے کہ مجالس النفائس تالیف میر علی شیر نوائی کے سلسلے کو قائم رکھنے کے لیے اس نے دوستوں کے اصرار پر تذکرہ کی تالیف کا کام شروع کیا ہے، اور ترکی زبان کا نسخہ اس کے مطالعے میں رہا۔[4]

---

[1] نفائس المآثر ق ۳۰ ص ۸۸، [2] یہ اشتباہ مصنف ہے "دام ظلہ" کے اعداد ۹۸۰ھ ہوتے ہیں، اگر ۹۷۹ھ ہوتا تو مدظلہ تاریخ ہوتی [3] عبد اللہ خاں کی فتح ماوراء النہر کے سلسلے میں ایک نسخے میں کاتب کی غلطی سے ۹۸۱ھ مادہ تاریخ لکھ دیا گیا ہے جو دوسرے نسخے میں ۹۹۱ھ ہے [4] لطائف نامے کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

انتساب | اس کتاب کو اس نے دو آدمیوں کے نام سے معنون کیا ہے،

(۱) ابو الغازی اسکندر خاں بہادر

محمد خود یوسف رو سلیماں جاہ یحییٰ دل سکندر نام و خضر الہام موسیٰ دست عیسیٰ دل

(۲) عبد اللہ خاں بہادر

آں عالی حضرت، سلیمان حشمت بنظر اکسیر اثر منظور گردانیدہ بسمع قبول اصغا نماید

ہر آئینہ از توجہ انور ضمیر نکتہ پرورش سخن از آب زلال صافی ترگشتہ بروجہ حسن بکمال خواہد رسید

ایں نسخۂ دلکشا کہ بنمودہ جمال پاکیزہ ترست نقش از آب زلال

خواہم کہ ز لطف خسرو دہر رسد بروجہ حسن معانی او بکمال

و باللہ العصمۃ والتوفیق۔"

ترتیب مضامین | ۱- مقالہ

"بسم اللہ الرحمن الرحیم، حمد ما معد و معبودی راکہ مجموعۂ وجود انسانی راکہ نسخۂ جامعہ جزو کل است" سے شروع ہوکر نعت، انتساب ابوالغازی، تعریف نظم و تعریف نثر سبب تالیف انتساب بنام عبد اللہ خاں اور تاریخ کے بعد

ہر چند کہ ایں نسخہ بوجہ حسن است بس نیست ہمیں عیب کہ تالیف من است

"اللّٰھم استر عیوبنا واغفر ذنوبنا واختم بالسعادۃ آجالنا" پر ختم ہوتا ہے،

۲- ابواب و فصول:-

۱- باب اول در بیان احوال سلاطین چنگیز خانی بر دو فصل مشتمل است

۲- باب دوم در بیان احوال سلاطین جغتائیہ بر دو فصل مشتمل است

۳- باب اول در ذکر جماعتی کہ فقیر ایشانرا ملازمت نمودہ بر چہار فصل مشتمل است

۴۔ باب دوم در ذکر جماعتی کہ فقیر ایشانرا ملازمت کردہ بر چہار فصل مشتمل است

۵۔ باب سوم در ذکر جماعتی کہ فقیر ایشانرا ملازمت نمودہ بر چہار فصل مشتمل است۔

خاتمۂ کتاب۔ در ذکر اجداد و اعمام و برادران و اقربای فقیر۔

ترقیمۂ کاتب۔ اللّٰھم اغفر لمولفہٖ و کاتبہٖ و قارئہٖ و من نظر الیہ بحرمۃ محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم تم بالخیر بالبلدۃ المحفوظۃ سمرقند، بہجرۃ النبویہ، ہنصد و ہشتاد، کتبہٗ فقیر میرک

دستم بزیر خاک چو خواہد شدن تباہ | بادی بیادگار بماند خط سیاہ

پر ختم ہوتا ہے۔

تذکرہ احباب مجالس النفائس کی تنقید اور تکملہ کی حیثیت سے مؤلف تذکرہ احباب نے شعراء کے ترجمے کے دوران میں جا بجا میر علی شیر نوائی کے بیان کی تکمیل اور تنقید بھی کی ہے۔ خواجہ ایوب ابوالبرکہ کے بیان میں میر علی شیر تحریر کرتے ہیں کہ

"شرح حالات او کردن غایت بے حاجیست"[1]

صاحب تذکرہ اس کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"خواجہ ایوب ابوالبرکہ از اکابر ماوراء النہر است۔ در زمان شباب بہری رفتہ بعقیدہ از معاش کردہ بنا بران در تذکرہ امیر کبیر او را یاد کردہ اند، از و چیزی ننوشتہ، بسیار خوش طبع بودہ، و سخنان خوب ازو منقول است و غزلہای زیبا و قصائد غرای او مشہور است و این غزل از سخنان دلکش او ست"۔

ای شاخ گل چو سرو سہی قد کشیدہ ای | بر برگ گل خطی ز زمرد کشیدہ ای

قدت بر آمدہ چو الف مد ظلہ | از ابروان فراز الف مد کشیدہ ای

تصویر نیکشی بہ کش ای نقش بند چین | ننماید چو چشم و زلفش اگر صد کشیدہ ای

---

[1] مجالس ص ۱۱۲ - ۱۱۵

جز نامۂ قبول من ای خامہ قدر ہر نقش دلپذیر کہ باید کشیدہ ای
از دولت وصال فراق طمع مبر جور وجفای یار چہ بیحد کشیدہ ای

خواجہ ایوب از کوزہ ہای بردن تراودکہ در دی ست۔ از اطوار والد شریف خود بی بہرہ نبود و بہزل و مزاح مزاجش مائل بودہ و طور تش بنوعی بودہ کہ ہر چند کس مقبوض او را میدیدہ منبسط می گشتہ و بعقیدی خواجہ بمرتبہ ای بودہ کہ جناب سید محمود خواجہ فرمودند کہ بادشاہ او را برسم رسالت بگجرات فرستادہ صحبت تمکین گجراتیاں تعلق دل خواجہ در آتش انگندہ اند، بجواناں مائل گشتہ ہا نجاماند بادشاہ بعد از فتح او را در قفس محبوس میداشتہ اند و او بی صبری کردہ مترنم این مقالہ بودہ

آصفی صبر ندارد بغم و درد فراق میکشد محنت ایوب ولی صابر نیست

بعد ازاں بمضمون آنکہ، در عفو لذتی ست کہ در انتقام نیست
عمل نمودہ جریمہ اش را عفو فرمودہ رعایت کردہ اند، بعضی برآنند کہ او را گجراتیاں محبوس کردہ اند، این غزلش نیکو واقع شدہ

سحرگہ صحن چمن برگل وشقائق بود چمن بکام دل عندلیب عاشق بود
زراہ مقصد اگر تافتم عنان طلب زہمرہی رفیقاں ناموافق بود
زخط وخال تو آموختم دقائق عشق زہی مجازکہ مجموعۂ حقائق بود
چہ بخت خون من از درد دل خلاص شدم مرض علاج پذیر و طبیب حاذق بود
نداشت طاقت جور وجفای او ایوب[۱] اگرچہ بر ہمہ اقراں بصبر فائق بود

[۱] مجالس النفائس ص ۱۵۲ از حیدر کلوخ

۲۔ حیدر کلوخ کا ترجمہ جو مجالس النفائس[۵] میں دیا گیا ہے، اس میں یہ اضافہ ہے:۔
"این غزلش بسیار خوش و دلکش واقع شدہ و شہرت تمام دارد،"

ولا با مجنون صفت خود را خلاص از قید عالم کن | دہ صحرای محنت گیر و درد و دہ وادی غم کن
هر کس دوستی کردی شد آخر دشمن جانت | اگر با خود نه آئی دشمن مردم و دوستی کم کن
بدرد و داغ نومیدی دوا از کس مجوای دل | به اظهار جراحتهای خونین یاد مرہم کن
چو در خیل سگان یار جایابی غنیمت دان | نمی گویم کنار از صحبت یاران ہمدم کن
مثال از سستی عہد بتان سنگدل حیدر | اساس عقل برہم زن بنای عشق محکم کن

۳۔ خواجہ عبداللہ جہنہ کے عہد کے بیان میں کہتے ہیں :۔

ولد ارشد خواجہ ابو الفضل است کہ شمہ مناقبش امیر نظام الدین علی شیر در تذکرہ[1] بیان فرمودہ فضائل بسیار داشت، بواسطۂ ضعف بصر فضائلش در نظر اولی الابصار پوشیدہ ماندو این ابیات بدو منسوب است،

ہیچ شب نیست کہ از ہجر توام ماتم نیست | روزمن ماتم زدہ از شب کم نیست
محرمی نیست کہ گوید سخن من با او | آنکہ گوید سخن من بر او محرم نیست

در کبر سن فوت شد

۴۔ مولانا فضائی کے بیان میں کہتے ہیں :۔

ولد مولانا بقائی ست در تذکرہ[2] امیر علی شیر ملا را بکمانگری نسبت کردہ اند فقیر پرسید کہ ملا زاں بچہ سبب بایں صنعت منسوب اند، گفت دریں نسبت مرا صنعی نیست این معنی را بر من شکستہ بستہ اند، بتقریب آنکہ بطغر یلاس بہری رفتہ بودم و در دکان کمانگری در حلقہ استادان گوشہ ای گرفتم امیر سہم سعادت کیمیا اثر را بجانب فقیر انداختہ نشانہ تیر ملامت ساختہ۔

---

[1] تذکرہ زیر نظر میں فضائی نام کا کوئی شاعر مذکور نہیں، البتہ بقائی (حاشیہ نقابی) کے ترجمے میں علی شیر نوائی نے کمانگری کی طرف ضرور اشارہ کیا ہے، ص ۵۸

شمشاد قامتش را ای فاختہ بیاد آر — آموز در ہوا ایش از چشم من پریدن
از جان گذشت تیرش بر دل رسید گفتم — تا کی شکستگان را خواہی بجان رسیدن
صد بار اگر بہ پیچی بر خود چو غنچہ نتوان — از باغ ہجر یک گل بیخار ہجر چیدن
منعم مکن چو عہدی از کوی عشق بازی — گر سر رود نخواہم زین کوی پا کشیدن

۲۴- شیخ ابوالوجد:

گرفت بر تقیع خط ماہر وی جا نرا — حجاب کفر بپوشید نور ایمان را
ہنوز بر سر آن کوی نا گرفتہ وطن — دل از غریب نوازی گرفت جانان را
دراز عمر تراز من کسی نخواہد بود — اگر ز عمر شمارند روز ہجران را
بغیر صورت خوب تو کی رسد بخیال — اگر خیال تو ان کرد معنی جان را
حدیث لعل لبش فارغی گو باغیر — کہ میبرد خس وخار آب حیوان را

این مطلعش بسیار خوب واقع شد

جان من از دیدہ در دل میکنم منزل ترا — تا نہان از مردمان بینم بکام دل ترا

۲۵- سلطان عادل لاری:

دوش کہ آن بیوفا جور وجفای نداشت — نالہ دل افسردہ بود گریہ صفای نداشت
دوش کہ پیکان یار در دل تنگم نبود — چون جرس بینوا ہیچ صدای نداشت
دوش کہ آمد طبیب بر سر بیمار غم — چون مرض عشق بود ہیچ دوای نداشت

۲۶- کوکبی: چون کوکبی حیران شادم بدل خوبان — عشقت مرا پیشہ ہر کس کہ ہنر دارد

۲۷- امیدی عراقی: قصیدہ در تتبع انوری گفتہ:

سفیدہ دم کہ ازین عنکبوت زرین تار — گسست رابطۂ تار و پود لیل و نہار

در ری مقتول شده۔

۲۸۔ مولانا ہجری : غریب تو کس نیست اینچنین کہ منم غریب ترکہ بخاطر نمیرسد وطنم

در تبریز فوت شده۔

۲۹۔ خواجہ زاده کابلی :

مرو بہ سیر کہ از خوباں ترا خیل سپہ خیزد است عجب شاہی کہ از دیوانہ می پرسی کہ بہ خیز است

۳۰۔ غزالی مشہدی :

در داہ از دل من کیں ہمہ پرکالہ درد ست گرد بادی ست کہ صد برگ گل لالہ درو ست

نفائس المآثر نے تذکرۂ احباب پر جو اضافے کیے ہیں ان کے لیے ایک علٰحدہ رسالے کی ضرورت ہے، کیونکہ تذکرۂ احباب کے جو شاعر خاص بخارا سے تعلق رکھتے ہیں ان کی تعداد میں بھی نفائس نے اضافہ کیا ہے اور تذکرے ان کے حالات، اشعار، واقعات تاریخی اور تاریخ وفات میں بھی بیشمار اضافے کیے ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، اس لیے کہ ہمارا مقصد صرف تذکرۂ احباب پر تبصرہ ہے، نفائس المآثر پر گفتگو مقصود نہیں، مگر اس کا اظہار کر دینا ضروری ہے کہ تذکرہ اور نفائس ایک دوسرے کا جزو لاینفک ہیں، اور تذکرہ نفائس اور مجالس کی درمیانی کڑی ہے۔

تذکرۂ احباب کے دو نسخے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی آزاد لائبریری کے حبیب گنج[1] سیکشن میں اس تذکرے کے دو نسخے ہیں:-

اول ۱۵/۱ ق سیاہ جلد کا ہے جس کی پشت پر سنہرے الفاظ میں "تذکرۂ احباب" تحریر ہے، اور اسکے نیچے اوپر باریک باریک سنہری دھاریاں زیب و زینت کے لیے بنی ہیں، شروع صفحے پر "بہار الدین حسن نام مؤلف"۔ اس سے تھوڑے فاصلہ پر کونے میں ہدیۂ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب۔ تلہری، ۲ شعبان المعظم سنہ ۱۳۲ھ جزاہ اللہ خیراً قلمی سنہ ۹ ھ" لکھا ہوا ہے۔ پھر درمیان میں کاغذ کی چٹ لگا کر حسب ذیل تحریر درج ہے:-

[1] کتابخانہ حبیب گنج پر ڈاکٹر نذیر احمد صاحب صدر شعبۂ فارسی کا ایک مضمون "فکر و نظر" جنوری ۱۹۶۱ء میں نکل چکا ہے۔

دیدم، سخنش را شنیدم، چو ممکن بود تکذیب او کرده نشد و بجز دبی اعتقادی نیست، مدتی در خدمت ابراهیم مرزا بود و در عایت بسیار یافته، و در تشخیص سخن دقت بسیار میکند بلکه از مرتبهٔ اعتدال میگذرد و این غزل از سخنان اوست

بهر نگاه تو از دل کشیم آه دگر	بود کر آه شود باعث نگاه دگر
وطن بدیدهٔ من کن که نیست یوسف را	بغیر دیدهٔ یعقوب جلوه گاه دگر
بود بسوز دلم برق آه شاهد حال	چه حاجت از پی اثبات این گواه دگر
کجا بدامن آن شهسوار حسن رسد	که هست بر سر هر راه دادخواه دگر
چه حاضری منم آن شهسوار کشور عشق	که دارم از غم عشق هر طرف سپاه دگر

و این مطلع نیز از سخنان رنگین اوست :-

دریده جیب قبا گل ز رشک پیراهنش	بنفشه بستهٔ بند قبای یاسمنش

۱۸۔ نجاتی ۔ تا نوید دقت بر آیات روی مصحفش در دوات غنچه دارد سرخی بسیار گل

۱۹۔ مولانا سروری ۔ تا دست گلرخی من حیران گرفته ام گلدستهٔ ز گلشن دوران گرفته ام

۲۰۔ خواجه حسین مروی ولد خواجه میر دوست دیوان[۱]۔ مدتی در فاخرهٔ بخارا بتحصیل علوم پرداخت ۔ این غزل از اشعار رنگین اوست :-

تا هلال عید اهل دید شد ابروی تو	مردمان دیدند ماه عید را بر روی تو
روی خود وقت سلام ای آفتاب از ما متاب	در نماز عید اگر افتیم در پهلوی تو
بایدش تعویذ بند از رشتهٔ جان ساختن	همچو تعویذ انکه دل بسته است بر بازوی تو

---

[۱] خلف صدق خواجہ جلال الدین منصور سمنانی است "نفائس"۔ اور آگے چل کر مذکر میں ہے :-

شد از التفات شهنشاه عادل	حسین بن منصور صدر افاضل

گرچہ می بیند بہر سو تیز بینان ماہ عید | تو چنان ماہی کہ نتوان تیز دیدن سوی تو
سر فرازم کرد از طوق غلامی تا نہاد | منتی بر گردنِ من حلقۂ گیسوی تو
اکبر شاہان جلال الدین محمد آنکہ ہست | نہ سپہر نیلگون یک خیمہ از اردوی تو
تا بود روی زمیں آرام گاہ نیک و بد | دور بادا چشم بد از عارض نیکوی تو

۲۱- ملا سہمی ۔ از شعرای نو رسیدہ بود بہند رفتہ ، بملازمت بیرم خان مشرف گشتہ و خان این مطلع را گفتہ

دُرد نوشان خرابات عجب مستانند | کہ بیک جرعۂ می ہر دو جہان بستانند

مولانا ادہم حسین گفتہ :-

کشور ہند بہر گوشہ سیہ چشمانند | کہ ہمہ آفت دینند و بلای جانند

وہم ارسلان در تتبع گفتہ :-

ماہرویان جہان وصف ترا نتوانند | کہ برخسار تو آئینہ صفت حیرانند

سہمی را ہم سعادت بطالع افتادہ و این مطلع از مطلع ضمیرش طلوع نمودہ :-

آن کسانیکہ سفیدی ز سیاہی دانند | خط و رخسار ترا آیتِ خوبی دانند

۲۲- مولانا قدسی :

از دو چشم تو نیاید رسم مردی ہرگز | کافران کجا دانند شیوۂ مسلمانی
چون تو یوسف مصری در لطافت و خوبی | بر درت عزیزان را آرزوی دربانی
بسکہ کوکب سعدی در سپہر نیلوئی | می سزد ترا گویند مہر و ماہ تابانی
میکنی شکر ریزی از شکر لبان قدسی | طوطی شکر خائی در فنِ سخندانی

۲۳- مولانا عہدی :-

از دیدن تو قطعاً نتوان طمع بریدن | چشم منی و باشد چشمے برای دیدن

۶۔ مولانا واہبی۔ مولانا کاتبی را میگویند کہ چہار معنی خاص در سلک نظم آوردہ بود و این بیت ازاں جملہ است۔ جانرا صدای تیغ تو از رنج وا رہاند آواز آب زحمت بیمار می برد

ملا در تتبع این پنج بیت گفتہ و بالماس سخن در ہائے خاص سفتہ، بیت:۔

گر زند تیغ تو بر حلق راہ رفتن جان ز آب تیز گذشتن نمی توان آسان

چون بسرست تیغ تو نتوان کشید آہ باید بزیر آب نفس داشتن نگاہ

مضطرب گردم چو گیرد در گلویم تیغ یار در گلوی ہر کہ گیرد آب گردد بیقرار

گفتی ز تیغ من شود آخر جہان خراب آری جہان خراب شود عاقبت ز آب

از تن خاکی بر آرد گرد ہر دم آہ سرد تیغ بردار و بآب لطف خود کن دفع گرد

وآنرا خمسۂ متحیرہ نام کردہ

۷۔ جمالی ہندی، (ایک شعر)[1] ننگ تک بند قلندر کشتی تجرید را از پی تسکین بحر بینوائی لنگر است

۸۔ مولانا فردی۔ تاریخ وفات جناب قاضی اختیار را نیکو گفتہ

ای میر کہ زیب داشت ناموس از تو رفتی و جہان شدہ مایوس از تو

تاریخ وفات تو چہ گوید فردی ای عمدۂ اہل علم افسوس از تو ۹۲۱ھ

۹۔ مولانا افسری۔ در خدمت عبید اللہ میبودہ، خود را در سلک مقربان مینمود، اشعار بسیار دارد، خود را ثانی نوائی خیال کردہ و ثانی تخلص میکردہ۔

ز کعبہ تا سر کویت ہزار فرسنگ است

۱۰۔ درویش مقصود تیرگر

خوبان ہری خوشتر از آب حیاتند بسیار ربایندہ و شیرین حرکاتند

در مسجد جامع بیگم پور ساکن بود ہمانجا مدفون شد۔

---

[1] جمالی، تذکرہ

۱۱- میر ہمایون - (۳ شعر)

نام زنجیر جنون گم شدہ بود از عالم / در رہ عشق من این سلسلہ برپا کردم

صاف از نقش جہان تا شود آئینۂ دل / طلب از میکدہ ہا جام مصفا کردم

بکویش رفتم و گفتم کہ بینم روی نیکویش / بنیرش ہمنشین دیدم گذشتم از سر کویش

۱۲- نویدی نیشاپوری - بمیر قریش نیشاپور قرابت داشت، بہند رفتہ اعتباری پیدا کردہ وقتیکہ محمد رحیم سلطان دندان خود کندہ بتقریب آں از دار دنیا رحلت نمودہ تاریخ او را "کند دندان و رفت از دنیا" گفتہ بود

۱۳- مولانا شیدا - از شاعران قدیم ندیم است، خدمت با پادشاہ میبود۔ تاریخ گفتہ بود

در ارک قلعۂ بلخ عالی عمارتی / تا آب و خاک باشد بادا بقای منزل

تاریخ و نام بانی از من طلب چو کردند / گفتم باہل دانش "تسکین قرای عادل" ۹۶۲ھ

۱۴- عبدی - خانہ ای ساختہ بود و تاریخ و نام او گفتہ :-

صاحبش این خانہ را تاریخ و نام / "بیت الاحزان فقیران" کردہ است ۹۵۱ھ

۱۵- جانی شمس بانی طوطی طبعش در ہند بقفس خاک منزل نمود -

۱۶- مولانا شوری - برسم سیر بمرو متوجہ بود، گفتم مرو، قبول ننمود از آنجا رفیق مراجعت کرد، در شیر شتر مرغ روحش بدام صیاد اجل گرفتار گردید، این شعر حسب حال اوست :

در زیر زمین ست ترا جای شوری / گر زیر نگین ساختہ ای روی زمین را

۱۷- حاضری - ولد رشید مولانا غایب است۔ بصلاح مشہور است، واقعات عجیب و غریب نقل میکند۔ روزی گفت کہ در مجلس شمس الدین شانہ رفیع شانہ حضرت خضر علیہ السلام در بیداری

لہ مقام وفات مذکور نہیں۔ نفائس کہ "مرو" نفائس

در بلخ مدتی در منزل فقیر می بود، ہمانجا فوت شد۔

تذکرۂ احباب نفائس المآثر کے ماخذ کی حیثیت سے

تذکرۂ احباب کی طرح نفائس المآثر بھی تاریخی نام ہے۔ فرق اتنا ہے کہ تذکرۂ احباب سے خود مؤلف کے بیان کے مطابق اتمام کی تاریخ نکلتی ہے اور نفائس المآثر سے اس کے مؤلف کے بیان کے مطابق آغاز کی، دونوں تاریخوں کا تقریباً ایک ہی زمانہ ہے۔ نفائس کا اصل کام ۹۸۰ھ میں ختم ہوا تھا، اور اضافے کا سلسلہ خود اس کی داخلی شہادتوں کی بنا پر ۹۹۸ھ تک جاری رہا، مؤلف نفائس المآثر نے صریح الفاظ میں تو اس ماخذ کا اظہار نہیں کیا لیکن دو جگہ اس کا حوالہ دیا ہے

۱۔ مقصود تیر گر کے ترجمے میں

"بہاء الدین حسن صاحب تذکرۂ شعرا گوید۔"

۲۔ خود نثاری بخاری کے ترجمے میں

"اسمش بہاء الدین حسن است در تذکرۂ شعرای خود میگوید۔"[2]

لیکن حقیقت یہ ہے نفائس المآثر کا معتدبہ حصہ تذکرۂ احباب کا ممنون ہے، مگر یہ امر بھی واضح کردینا ضروری ہے کہ صاحب نفائس نے تذکرہ کی نہ اندھی تقلید کی ہے، اور نہ تنہا اسکی اطلاعات پر قناعت کی ہے بلکہ اس کے ساتھ اپنی تحقیقات بھی تحریر کی ہیں، جا بجا تذکرہ کے انتخاب اشعار سے صرف نظر کرکے اپنا انتخاب دیا ہے۔

۱۔ وہ شعراء جن کو نفائس نے تذکرہ سے محض نقل کردیا ہے اور ان کے متعلق معلومات میں کوئی نیا اضافہ نہیں کیا ہے۔

(۱) عبد العزیز خاں[3]، (۲) ابو الفتح سلطان سعید خاں بن ابو سعید خاں۔[4] (۳) شادی جویباری

---

[1] "نفائس المآثر تام مؤلف کہ اسمی ست با مسمی موافق و سال شروع را مطابق" مقدمہ نفائس ورق ۲ (ب)
[2] ورق ۲۰۴ (ب)، [3] تخلص عزیزی۔ ہر کہ عزیزی بدید خط لب یار گفت ؎ زر سیاہ است این یا شب ہجران حسین کو کہن، نفائس

(۴) میرابراہیم جامی[1] (۵) مولانا قدسی[2] (۶) مولانا فروغی (۷) یجزدی (۱۰) طاہر قاضی (۹) علی بیگ (۱۰) ہمدم کوکہ (۱۱) محرم کوکہ ۔ (۱۲) مولانا شکی ۔

وہ شعراء جن کے متعلق نفائس کو تذکرے سے نئے معلومات حاصل ہوئے ہیں ،

۱- کامران ۔ (ایک شعر) چوں بمقصود نشد ہیچکسی رہ برا بعد ازیں خاک در دو؟) پیر مغان وتنہا

۲- عسکری ۔ (...) گفتی بدخش ماہ تمام است مہ نو در حضرت او عرض کن دعوی کم را

۳- ابراہیم مرزا بن سلیمان بادشاہ[3] ہنگام قتل ایں رباعی خوانده

ای لعل بدخشاں ز بدخشاں رفتی تابنده چو خورشید درخشاں رفتی

در دہر چو خاتم لب لبسلیماں بودی افسوس کہ از دست سلیماں رفتی

سنبل زلفش دلم را رام نتوانست کرد شاخ نازک بود و مرغ آرام نتوانست کرد

(رباعی) آئینہ و رخسار تو خورشید نماست خط رخ ہت از سبزہ تر رخ فزاست

ہر کس کہ برخ دید خط سبز تو گفت سالی کہ نکوست از بہارش پیداست

۴- قاسم (پسر کامران) (۲ شعر)

ندارد کس زخوباں ساعدی کاں نازنیں دارد زخوبی آنچہ باید ماہ من در آستیں دارد

اندک استغنای او عشاق را دل خوں کند گر بقدر حسن استغنا کند کس چوں کند

۵- ہمایوں عراقی (۲ شعر)

شب مرا سحر از پرتوی جمال تو باشد خوش آں فراق کہ پایان آں وصال تو باشد

بدرد مردن دلب ناکشودنم بہ از آں ست کہ نالہ ای کنم آں موجب ملال تو باشد

---

[1] مرزا ابراہیم جامی نفائس ۔ میرابراہیم اندجانی تذکرہ نسخہ (ب) (باضافہ استاد ترکی) [2] قدسی، نفائس [3] دفائی ، نفائس

"اسمائے خوشنویساں کہ در حواشی و تذکرۂ احباب مذکور است (۱) میر شیخ پوراتی ولد شیخ نور الدین

(۲) حافظ سلطان علی اوبہی (۳) مولانا کمال الدین ابو الخیر (۴) مولانا شرفی ولد حافظ شیرازی

(۵) خواجہ حسین ولد میر دوست (۶) مولانا میر علی الکاتب (۷) مولانا عہدی۔"

اس نسخہ کی تقطیع ۸×۸ء۶ اور ضخامت ۱۳ سوت ہے،

صفحات کی تعداد ۱۱۰ اوراق اور ہر صفحے میں ۱۵ سطور ہیں، خوشخط اور نستعلیق لکھا ہوا ہے، آیات قرآنی

اور اسماء رجال (عنوانات میں) سنہرے حرفوں میں لکھے ہوئے تھے جن میں سے کچھ بدقت تمام اور باقی بالکل نہیں

پڑھے جا سکے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ عرصے سے بہت خستہ اور شکستہ حالت میں تھا، جا بجا کیڑوں نے بھی کھا لیا ہے،

اب ہر ورق پر باریک کاغذ چڑھا دیا گیا ہے، کاتب خوشخط ضرور ہے مگر کسی قدر بدا ملا اور بہت بے پروا ہے،

فصول کی ترتیب میں اس نے بے توجہی سے کام لیا ہے،

معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی کے مطالعے میں رہ چکا ہے، کیونکہ متن کی سرخیاں مثلاً ہراۃ، بخارا، وجہ تسمیہ بخارا

سمرقند اور توران جو مؤلف نے ترجمۂ شعراء کے سلسلے میں کہیں کہیں ضمناً دیے ہیں، سب حاشیے پر نوٹ ہیں

ایک جگہ مؤلف نے "از لفۃ الجنۃ للمتقین" تحریر کیا ہے، قاری صاحب نے از لفت کو بھی شہروں کے ساتھ

حاشیے پر نوٹ کر دیا،

جا بجا کتب خانہ حبیب گنج کی نیم دائرہ مہریں پڑی ہیں، دائرے کے اوپر "وخیر جلیس فی الزمان کتاب"

اور اندر کی طرف اوپر سنہ پھر "کتب خانہ حبیب گنج" اور اس کے نیچے "ضلع علی گڈھ لکھا ہوا ہے" ایک

جگہ مہر کا سنہ ناخواندہ ہے۔ باقی کسی میں ۱۳۱۲ھ، ۱۳۱۷ھ اور ۱۳۲۴ھ پڑھا جاتا ہے، آخری صفحے پر نوٹ ہے:

"نسخۂ ہذا شش سال بعد تالیف نوشتہ شد، تاریخ تالیف تذکرۂ احباب ۹۷۴ھ۔

حبیب الرحمٰن ۱۶ ربیع الاول ۱۳۵۶ھ۔

نمبر ۱۵/۲۔ دوسرا نسخہ بیرونی شکل میں کم و بیش ایسا ہی ہے لیکن اندر سے بہت خوشخط ہے،

اور تراجم کے درمیان میں فصول کے عنوانات سرخ روشنائی اور جلی قلم سے لکھے ہوئے ہیں، فہرست سلاطین چغتائیہ کے تراجم اور کاتب کا ترقیمہ اس سے خارج ہے، تراجم کے لحاظ سے یہ نسخہ پہلے نسخہ سے کم نہیں ہے اور اس وقت یہ نسخہ بہت کار آمد ثابت ہوتا ہے، جب کہ پہلے نسخے کے عنوانات صاف نہیں پڑھے جاتے، اس میں ۱۱۳ صفحات اور ہر صفحے میں ۱۳ سطور ہیں، اس کی غلط شیرازہ بندی اس کا سب سے بڑا عیب ہے،

حال مؤلف | اسٹوری کو یہ شکایت ہے کہ مؤلف نے اپنا نام مقالے میں نہیں دیا ہے، اس وجہ سے "برٹش کوارٹرلی" میں اس تذکرے کے مولف کا نام نہیں ہے۔ مقالے میں تو واقعی نام نہیں ہے لیکن اس سے ذرا آگے بڑھ کر روزبہان الاصفہانی کے ترجمے میں وہ لکھتا ہے کہ "ایشان فقیر را بہا الدین نام کردند وایں قطعہ را گفتہ بید خود نوشتہ وآں خط مدتی در دست فقیر بود، قطعہ :

خواجہ بہاء دین کنمش نام | خواجہ حسن نقد دلِ بادشا
ابنۃ اللہ نسبتاً حسن | ثانی آں خواجۂ ابرار باد

تخلص نثاری تھا، سلطان عادل لاری کے ترجمے میں لکھتا ہے،

لمؤلفہ۔ وفا تا از میان کم شد نثاری را

خاتمے میں اس نے اپنے چند اجداد اور اعمام کے نام ضرور گنائے ہیں، مگر تالیف میں کہیں بھی اس کی زندگی کے حالات، ملازمت ومعاش وغیرہ کا پتا نہیں چلتا، ترجموں کے دوران کہیں اپنے اشعار بھی دیے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایران وہندوستان کے شاہان وقت سے اس کو تعلق تھا اور فارسی کے علاوہ کبھی کبھی ترکی میں بھی شعر کہتا تھا، یہاں کچھ اشعار نمونے کے طور پر نذرِ ناظرین کیے جاتے ہیں،

در چمن سرو خراماں مرا یاد کنید | در سخن غنچۂ خندان مرا یاد کنید
جعد سنبل چو برخسارِ گل افتد ہر سو | حلقۂ زلفِ پریشانِ مرا یاد کنید

در شب تیره چو برقع فگند بدر منیر | پرتو شمع شبستان مرا یاد کنید
در مصاحف چو در آید بنظر آیهٔ وقف | لب لعل وخط ریحان مرا یاد کنید
ابر نیسان بهاران چو گهر افشاند | کلک نظم گهر افشان مرا یاد کنید

مطلع خواجه نظام الدین یحیی الهاشمی

عزیب عشق ماند بر زمین گرنا گهان پهلو | که گرداند زخاک او اگر گرداندان پهلو

مطلع لطیف

چنان بر خاک حسرت ماند جسم ناتوان پهلو | که نتواند دگر گشتن ازین پهلو بآن پهلو

در تعریف عبید الله خان :-

تیر تو کر چون عقاب پرواز گر است | از چشمهٔ چشم دشمنان آبخور است
مانند کلید باب فتح آمده است | تیغ تو کر آئینهٔ روی ظفر است

در تعریف عبدالعزیز خان

چنان طی کرده در ملک سخاوت راه احسان را | که صد چو حاتم طی بر درش بهر سوال آمد

در تعریف خواجه عبدالسلام

ای کمال دولتت از وصمت نقصان بری | وی ضمیر روشنت آئینهٔ اسکندری

در تعریف افتخار الاطبار مولانا محمد مزید :

بسی نادر فنان بردند قانون شفا از تو | که اندر جنگ ایشان بو د عاجز بو علی سینا
کلام معجزت باشد مدام از شرح مستغنی | از آن نفس نفیست بزند بر خلق استغنا

حافظ ابراہیم گاہی این کمینه را با لطاف خاص مخصوص میسازد، بتقریبی این رباعی تقیرداعی را یاد فرموده بود،

ای مظهر لطف ذوالمنن خواجه حسن | ظاهر شده ایم گرچه مادر دو بدن

ہر دو ہم یکیم در عالم انس کہ در غلط افتم کہ توئی یا من

و این فقیر در تتبع گفتہ

مشکین رقمت کہ نامزد گشت بمن چون بوی اویس آمدہ از سوی قرن

ہستی ملک الکلام و در ملک سخن تو خسرو و بندۂ تو صد خواجہ حسن

فقیر بجہت تحفۂ بادشاہ جمجاہ ہمایون بادشاہ این قصیدۂ مصنوع گفتہ بود (ترجمۂ واصفی)

چہ میکشی چو شتر آب و خاک حجرۂ تن شتر بباد فتادہ بحجرہ آتش زن

چہ میکشی شتر و حجرہ بہر آتش و آب چو میبرد شتر باد و خاک حجرۂ تن

چو میبرد شتر و حجرہ ات آتش باد مگوی از شتر و آب و خاک حجرۂ تن

ترجمہ قاضی محمود الحسینی، فقیر بسبیل مزاح گفتہ بود

مہدی کہ در علوم ریاضی سرآمد است نیک است در نجوم ولی ہیئتش بد است

دوسرے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ نویں اور دسویں صدی ہجری میں اس تخلص کے چار شاعر اور بھی گذرے ہیں:

(۱) نثاری[1] - محمد علی جلائر - پسر علی جلائر است و اطوار غریبہ داشت و این مطلع از وست:

کسی ہرگز چو من بیغم ندیدست چو من غمدیدہ ای غم ہم ندیدست

(۲) نثاری تونی[2] - در خیاباد متوطن بود، تحصیل علوم و کمالات بسیار نمودہ و در علم ہیأت و نجوم و از اقسام فنون و شعر و عروض واقف، شاعر سامان و از ارباب زادہای کلان است سرو قدر در ہجر شاہ درویش از منظومات[3] اوست و وفاتش در حدود سنہ سبع و ستین و تسعمائہ، از اشعار اوست:

ای از تو گلرخان را چون لالہ داغ بر دل پیشت سہی قدان را چون سرو پائی در گل

---

[1] مجالس ص ۲۸۴ [2] نفائس. [3] و یک دیوان عقب گزاشت تحفۂ سامی. فٹ نوٹ

خوش آنکہ دل ز علائق بیک نگار دہد ہزار تفرقہ را بر یکی قرار دہد

ولہ ز آب چشم از نیگوئی گر حباب افتد بجاکہ پردۂ مردم بروی آب افتد

〃 دل شبی چنگ در آں سلسلۂ پر خم زد باد صبح آمد و ایں سلسلہ را برہم زد

(۳) نثاری تبریزی[1]۔ قنادی بود، در ایام حکومت قاضی مسافر قصیدہ ای در مدح او گفتہ و رعایتی از و نیافتہ، در ہجو قاضی گفت:

دل تبنگ آمد مرا از فکر مدح ناسلف بعد ازیں ہجو تو میگویم خوشامد برطرف

ہست دیوانخانہ و خلوت گہ خاتون تو آں یکی دار المظالم ایں یکی بیت اللطف

بسبب وقوع ایں امر نثاری از تبریز بیروں آمد، چندانکہ قاضی مذکور حاکم بود بتبریز نرفت چندانی نگذشت کہ قاضی بر صندوق کردند بعد از زجر و ایذای بسیار در قلعۃ الموت گوش و بینی بریدہ بند کردند، مقید بود تا مرد، نثاری سلیقہ نیک دارد از اشعار اوست

خواہم آں گلگوں قبا تیغی بخونم تر کند کار من در عاشقی باشد کہ رنگی بر کند

ولہ سراہی، پی نظارۂ ماہی دارم کہ بر ش راہ ندارم سراہی دارم

〃 تیر او کے ز دل چاک من آید بیروں بعد مردن مگر از خاک من آید بیروں

〃 از نظر رفت مرا دیدہ بدیدار ہنوز حیرت افزای من آں قامت رفتار ہنوز

〃 چند سوزیت با دل پر درد و محنت بنگرم بگذری با غیر و دنبالت بحسرت بنگرم

〃 اندک استغنای او عشاق را دل خوں کند گر بقدر حسن استغنا کند پس چوں کند

〃 پیش آں مہ دیدہ بر آئینہ روی دوختم او ز رشک افروخت من از شرمساری سوختم

اس کے علاوہ ملا حیدری اور نثاری نے ایک دوسرے کی ناقابل تحریر فاحش ہجویں لکھیں جو دونوں کی بیحیائی اور بدمذاقی کا نمونہ اور نفائس المآثر میں موجود ہیں۔

(۴) نثاری قزوینی[2]۔ خالی از طبعی نیست اوقات بکسب میگذراند ایں رباعی از وست

پیوستہ بدل بار غم یار کشم وز دیدہ ہمہ منت دیدار کشم

جانم بلب آمد و تن از غم کاہید اینہا ہمہ از دوری دلدار کشم

---

[1] نفائس [2] یہ شعر تذکرۂ احباب میں قاسم مرزا بن کامران کی جانب منسوب ہے [3] نفائس

ظہیر فاریابی

از جناب حکیم منظور الحسن صاحب برکاتی ٹونک

مکرم و محترم دام مجدکم ! سلام مسنون

آپکے موقر رسالہ معارف کا مطالعہ ہر ماہ بڑی پابندی سے کرتا رہتا ہوں، اور اس میں جو علمی، تحقیقی اور تاریخی مضامین و مقالات شائع ہوتے ہیں ان کو نہ صرف دلچسپی و توجہ سے پڑھتا ہوں بلکہ ان سے استفادہ بھی کرتا رہتا ہوں،

پچھلے مہینوں، اپریل، جون اور جولائی کے شماروں میں "دیوان ظہیر اور اس کا مصنف" کے عنوان سے جو تحقیقی بحث صاحب مضمون جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب، صدر شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی، اور جناب خواجہ عبد الرشید صاحب کے درمیان شائع ہوئی ہے، وہ تحقیقی ہونے کے ساتھ ساتھ معلومات افزا اور قابل قدر بھی ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ فاضل مضمون نگار اور ان کے مضمون پر جرح و تعدیل کرنے والے بزرگ دونوں ہی سے اس بحث کے سلسلے میں بعض اہم "تاریخی سہو" بھی ہو گئے ہیں۔

جن کی تصحیح کی جانب اس عریضہ کے ذریعہ آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں، اور اس سلسلہ میں اپنی حقیر معلومات پیش کر رہا ہوں۔

اگر آں جناب میری معروضات سے متفق ہوں۔ اور مناسب خیال فرمائیں تو اس کو بھی معارف میں شائع فرما دیں۔ امید کہ جواب سے سرفراز فرمائیں گے،

(۱) ظہیر فاریابی، اپنے عہد کے باکمال، قادر الکلام و صاحب طرز اور مسلّم الثبوت شاعر تھے،
جو نہ صرف انوری کے معاصرین میں ہیں، بلکہ اس پایہ کے شاعر ہیں کہ اکثر نقادانِ سخن نے ان کا اور انوری
کا موازنہ و مقابلہ بھی کیا ہے، اور بعض نے تو انوری کے مقابلہ میں ان کو ترجیح بھی دی ہے، چنانچہ
حضرت علامہ شبلی شعر العجم حصہ اول میں رقم طراز ہیں:۔

"اباقان خان کے زمانہ میں یہ بحث پیدا ہوئی کہ انوری اور ظہیر فاریابی دونوں
میں کس کو ترجیح ہے، سب نے "مجد ہمگر" کو ثالث قرار دیا اور ایک منظوم استفتا لکھا۔" (ص ۲۲۷)

اس لیے یہ کہنا کہ "غزلیات کا ایک دیوان بھی ظہیر سے "منسوب" کر دیا گیا ہے۔" (معارف اپریل ص ۳۱۱)
درست نہیں، ظہیر کی غزل گوئی کا ثبوت "مجد ہمگر" کے ان اشعار سے بھی ملتا ہے، جو اس نے مذکورہ بالا
بحث کے سلسلہ میں بحیثیت حکم کے لکھے ہیں، جن میں ظہیر کے اشعار کو "در شاہوار" کہا ہے اور
قصیدہ گوئی میں انوری کو ظہیر پر فضیلت دی ہے۔

البتہ یہ بات درست مانی جا سکتی ہے کہ ظہیر کے موجودہ مطبوعہ دیوان میں جو غزلیں ہیں
ان میں بعض غزلیں یا اشعار زبان و بیان، یا دوسرے تاریخی شواہد کے اعتبار سے ظہیر فاریابی
کے نہیں ہو سکتے"

لیکن اس سے یہ قیاس کرنا کہ ظہیر فاریابی سرے سے غزل کے شاعر ہی نہ تھے، اور ان سے
غزلیات یادگار ہی نہیں ہیں، انصاف کے خلاف ہے۔

اسی طرح یہ نتیجہ بھی اپنے صغریٰ و کبریٰ کے اعتبار سے صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ
"اگر خواجہ صاحب کے خیال کے مطابق وہ اشعار ظہیر فاریابی کے سمجھ لیے جائیں تو پھر اس
شاعر کی ایسی مقبولیت کا ثبوت چاہیے جس کی وجہ سے ان کتابوں کے مقدس مصنفین نے ظہیر
فاریابی جیسے درباری قصیدہ نگار کی تراکیب اپنی کتابوں کے لیے پسند کی ہوں۔"
(معارف جولائی)

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے۔ ظہیر فاریابی کی مقبولیت کا ثبوت تو تمام تاریخی کتابوں میں موجود ہے، اس لیے بعد کے شعرا کا ظہیر کی تقلید کرنا یا ان کی "تراکیب" کا استعمال کرنا کوئی ہلکی بات نہیں ہے۔

(۲) ظہیر فاریابی کا دیوان پہلی مرتبہ بھی مطبع نول کشور ہی سے شائع ہوا ہے، اس کا سنہ طباعت ۱۸۸۴ء ہے، اس وقت یہ مطبع لکھنؤ کے بجائے کانپور میں تھا، منشی نول کشور نے اس دیوان کے حاصل کرنے میں بڑی جد و جہد اور سعی بلیغ کی تھی، اور وہ اس کی دستیابی اور اپنی اس کامیابی پر بہت نازاں اور مسرور تھے۔ چنانچہ دیوان کے اختتام پر جو عبارت خاتمۂ طبع کے طور پر خواجہ محمد یحییٰ حیا کے قلم سے لکھی گئی ہے، وہ یہ ہے:-

"ظہیر زمین و آسمان راستایش نصیبہ ہمگیں امتازا یایش صلی اللہ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین، الی یوم الدین، امابعد، پوشیدہ مباد کہ از بد و علوایں کارخانہ لطافت نشانہ جناب مستطاب نامی و گرامی جمہور نول کشور دام اقبالہ وادام اجلالہ تائیدات بیغایات غیبی لاریبی، بہر حال کفیل آمال است نظرایں دریں ہنگام فرخی فرجام یک نسخہ متبرکہ دیوان حق تبیان حکیم ظہیر فاریابی کہ در دستیابی حکم کیمیا بل عنقا داشت، بیمن توجہ موجہ جناب نضائل مآب عمدۂ عمدگاں، زبدۂ زبدگان محمد افضل خاں نبیرۂ افضل وطیرہ جناب جلائل ایاب نواب محمد سرفراز خاں رئیس باعظم و شان ڈیرہ اسمٰعیل خان بعاریت بہر سیدہ نقل کالاصل این نسخہ مندرجہ بخط پاکیزہ وکاغذ عمدہ بصحت حسب وسعت ماہ جون ۱۸۸۴ء دریں مطبع فیض منبع واقع دارالسرور کانپور منطبع گردید۔ منہ و کرمہ۔" (ص ۱۲۸)

اس اشاعت کا ایک نسخہ ٹونک کے قدیم تاریخی کتب خانہ "سعیدیہ ڈسٹرکٹ لائبریری

میں موجود ہے،

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ظہیر فاریابی کے دیوان کے تین ایڈیشن نکلے

پہلا ۱۸۸۴ء در مطبع نولکشور کان پور (جس کی ایک کاپی کتب خانہ ٹونک میں ہے)

دوسرا ۱۹۱۸ء ،، لکھنؤ (جس کا حوالہ خواجہ صاحب نے دیا ہے)

تیسرا ۱۹۱۶ء ،، ،، (جس کا تذکرہ ڈاکٹر صاحب کے مضمون میں ہے)

مطبع نول کشور کو دیوان ظہیر سے پہلے "قصائد ظہیر" کی اشاعت کا بھی فخر حاصل ہے، جو سنہ ۱۸۸۰ء میں پہلی بار شائع ہوئے۔

۳۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ صاحب نے ظہیر کا سنہ وفات ۵۹۸ھ/۱۲۰۱ء تحریر کیا ہے جس کی تردید خواجہ عبد الرشید صاحب نے کی ہے، اور بحوالہ دیوان ظہیر لکھا ہے کہ

"سال وفات این سخن در یکتائے روزگار ۵۵۸ھ بود"

اس سلسلے میں عرض ہے کہ ظہیر کا سنہ وفات مندرجہ ذیل شہادتوں کی بنا پر ۵۹۸ھ ہی صحیح ہے، ۵۵۸ھ غلط ہے:

الف۔ کتب خانۂ سعیدیہ ٹونک میں خدا بخش لائبریری پٹنہ کی ایک مطبوعہ فہرست "محبوب الالباب فی تعریف الکتب والکتاب" کے نام سے ہے، جو خود مولوی خدا بخش صاحب مرحوم کی مرتب کردہ ہے۔ اس فہرست کے صفحہ ۴۶۶ پر "قصائد ظہیر فاریابی" کے تعارف و تبصرہ کے ذیل میں تحریر ہے کہ

"وفات ظہیر در ۵۹۸ھ واقع شد، مرقدش در سرخاب تبریز بود"

ب۔ سلطان قزل ارسلان، ظہیر کا ممدوح ہے، ظہیر نے اس کی مدح میں کئی بلند پایہ قصیدے کہے ہیں، اور قزل ارسلان ۵۸۲ھ میں مسند نشین ہوا ہے

پروفیسر محمود شیرانی مرحوم تنقید شعر العجم میں لکھتے ہیں:

"قزل ارسلان صرف پانچ سال یعنی ۵۸۲ھ سے ۵۸۷ھ تک حکومت کرتا ہے۔" (ص ۳۲۰)

قزل ارسلان کی مدح میں ظہیر کے قصائد کا ہونا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ظہیر ان سنین میں حیات تھا،

ج۔ سلطان سنجر کے عہد حکومت میں سبعہ سیارہ کے برج میزان میں جمع ہونے اور اس پر انوری کی پیشین گوئی کے سلسلہ میں ایک طویل بحث چلی تھی، اس بحث و نزاع میں ظہیر نے بھی حصہ لیا تھا، اور

"ستاروں کا اجتماع بقد نزہت القلوب حمد اللہ متوفی ۵۸۱ھ اور بقد کامل ابن الاثیر ۲۹ رجمادی الآخر ۵۸۲ھ کو ہوا ہے، ان میں پہلی تاریخ صحیح ہے۔"

(تنقید شعر العجم ص ۱۹۸)

طوفان کا ذکر اکثر معتبر تاریخوں میں ملتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قضیہ ان ایام میں بہت کچھ بحث و جدال اور مناظرات کا موجب ہوا ہے، اس بحث میں جیسا کہ پروفیسر براؤن نے ذکر کیا ہے ظہیر فاریابی نے سرگرمی سے حصہ لیا ہے۔" (ایضاً ص ۱۹۹)

قاموس المشاہیر مطبوعہ نظامی پریس بدایوں سے بھی اسکی تائید ہوتی ہے، اس کا بیان ہے:-

"ظہیر الدین فاریابی .... طغرل ثالث سلجوقی اور اتابک قزل ارسلان کا زمانہ پایا تھا، تبریز میں ۶۰۲ھ مطابق ۵۹۸ھ میں وفات پائی۔"

غرض یہ سب تاریخی شہادتیں ظہیر فاریابی کے سنہ وفات ۵۹۸ھ ہی کو ثابت کرتی ہیں۔

۴۔ مخزن الاسرار نظامی کے سنہ تصنیف اور مولانا نظامی کے سنہ وفات کی تعیین میں ڈاکٹر صاحب اور خواجہ صاحب دونوں ہی سے "سہو" ہوا ہے، ڈاکٹر مصطفیٰ صاحب نے

مخزن کا سنہ تصنیف، اور مولانا نظامی کا سنہ وفات ۵۹۹ھ قرار دیا ہے، اور خواجہ عبدالرشید صاحب نے بحوالہ تذکرۂ میخانہ ۵۵۰ھ سنہ تصنیف تحریر کیا ہے، حالانکہ نہ یہ صحیح ہے اور نہ وہ، بلکہ مخزن الاسرار بقول علامہ شبلی ۵۵۹ھ (شعر العجم جلد اول ص ۲۹۰) اور بقول پروفیسر محمود شیروانی ۵۵۲ھ (تنقید شعر العجم ص ۳۰۱) میں تصنیف ہوئی ہے۔

۵- مولانا نظامی کے سنہ وفات کے سلسلے میں پروفیسر محمود شیروانی رقم طراز ہیں :-

"بعض سکندر ناموں میں ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے پایا جاتا ہے کہ نظامی نہ صرف ساتویں صدی کے آغاز ہی میں موجود تھے، بلکہ اس کے پہلے عشر کا ایک معتد بہ حصہ کم از کم طے کر چکے تھے۔" (تنقید شعر العجم ص ۳۱۰)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں :-

"اس کی (سکندر نامہ) کی آخری اشاعت اتابک نصرۃ الدین ابوبکر کی خدمت میں پیش کیجاتی ہے، اور ۶۰۷ھ میں اس کی وفات کے بعد نظامی اس کتاب کو نورالدین ارسلان شاہ کے نام منسوب کرتے ہیں۔" (تنقید شعر العجم ص ۳۲۹)

دو نایاب تحریریں

(استدراک)

از جناب محمد بشیر الحق صاحب دسنوی عظیم آبادی

جولائی سنہ ۱۹۶۲ء کے معارف (ص ۷۷) میں جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی کا استدراک نظر نواز ہوا، صاحب موصوف کے استدراک میں تصحیح کی ضرورت ہے،

معلوم نہیں جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی نے یہ کہاں سے لکھدیا کہ حیات الحسن صاحب کے ترجمے کی پہلی جلد منشی انشاء اللہ مدیر وکیل امرت سر نے غالباً سنہ ۱۹۰۱ء میں یا کچھ بعد شائع کر دی تھی، منشی انشاء اللہ خاں اخبار وکیل امرت سر کے مدیر نہیں تھے بلکہ اخبار وطن کے مدیر تھے جو لاہور سے نکلتا تھا،

پیرزادہ محمد حسین صاحب جج نے جو ترجمہ کیا تھا اس کا نام عجائب الاسفار یعنی شیخ ابن بطوطہ کا سفرنامہ جلد دوم ہے، یہ سنہ ۱۸۹۸ء میں دارالاشاعت پنجاب کی طرف سے مولوی سید ممتاز علی صاحب کے مطبع رفاہ عام لاہور میں چھپ کر شائع ہوا تھا، بڑی خوبی اس کتاب کی یہ ہے کہ مترجم کے حواشی سے بھری ہوئی ہے، کتاب کا ایک تہائی سے زیادہ حصہ کارآمد اور بہت سی مفید حواشی کی نذر ہوگیا ہے، پوری کتاب بڑی تقطیع کے ۵۰۰ صفحوں میں ہے، اور کتاب کے آخر میں دس صفحوں میں انگریزی میں انٹروڈکشن (Introduction)

ہے۔ کتاب ہذا مترجم نے اپنے استاذ G. W. Lietner, M. A

Ph. D. L. L D. Do L xc xc xc کے نام Dedicate کی ہے۔

اسی سلسلے کی ایک اور کتاب ہے جس کا نام:

خلاصہ تحفۃ النظار

یعنی

سفرنامہ شیخ ابن بطوطہ

از

جناب مولوی عبد الرحمن خاں صاحب صدر حیدرآباد اکیڈمی

مع تنقید و مختصر تاریخی تبصرہ

مطبوعہ جید پریس دہلی ۱۹۴۸ء

اس کتاب کو مکتبہ برہان جامع مسجد دہلی نے شائع کیا ہے، کتاب چھوٹی تقطیع کے ۲۴۰ صفحوں میں چھپی ہوئی ہے۔

تینوں مذکورہ بالا کتابیں خدا بخش اورنٹیل پبلک لائبریری کے الاصلاح لائبریری دیسنہ سکشن میں محفوظ ہیں۔

مقالات شبلی

اول	قیمت	عہ/	دوم	قیمت	عہ/
سوم	"	۴عہ	چہارم	"	۳ے/
پنجم	"	۴عہ	ششم	"	۳ے/
ہفتم	"	عہ/	ہشتم	"	۳ے/

ادبیات

غزل

از جناب کریم الرضا خانصاحب وکیل شاہجہانپور

دل کو ہزار ہو سکوں درد کی بات اور ہے — جو غم یار میں کٹے رات وہ رات اور ہے

شکوۂ جور آسماں یونہی زباں پہ آگیا — آپ برا نہ مانئے آپ کی بات اور ہے

اُسکی نگاہ دلفریب وجہ سکوں سہی مگر — دل کو تلاش جس کی ہو وہ کوئی بات اور ہے

ناصح کم نگاہ سے کہتا ہے شوق پردہ در — جلوۂ ذات اور ہے ذکر صفات اور ہے

شوق طلب ہو زندگی بندۂ زندگی نہ بن — قید حیات اور ہے ذوق حیات اور ہے

لاکھ حجاب ہوں مگر لطف تصورات حسن — عشق کے دل سے پوچھئے عقل کی بات اور ہے

عقل اسیر چار سو عشق محیط کائنات
عشق کا حکم اور ہے عقل کی بات اور ہے

غزل

از جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری

رقصاں تمام عالم ہستی نظر میں ہے — میں کیا سفر میں ہوں کہ زمانہ سفر میں ہے

لطفِ مآلِ عشق و محبت نظر میں ہے | اک کیفِ مستقل مرے قلب و جگر میں ہے
وہ دن گئے کہ ہنستے تھے رونے پہ وہ مرے | اب دل کی شان اور ہی انکی نظر میں ہے
چھٹتا ہے آدمی سے جہاں زندگی کا ساتھ | ایسا بھی اک مقام تری رہگذر میں ہے
عالم میں انقلاب ہزاروں بپا ہوئے | لیکن وہی اثر مری شام و سحر میں ہے

جو ہر قفس میں نکہتِ گل طعنہ زن نہ ہو

اڑنے کی تاب ورنہ ابھی بال و پر میں ہے

غزل

از جناب ساجد امیٹھوی

راتوں کی تابشوں میں نہ حسنِ سحر میں ہے | جادو ترے جمال کا میری نظر میں ہے
آنکھوں میں اشکِ غم تری صورت نظر میں ہے | اے ناخدا سنبھال سفینہ بھنور میں ہے
پھولوں کو مل نہ پائی جو چاکِ جگر میں ہے | ساری بہارِ حسن چمن آج میرے گھر میں ہے
دیکھیں تو ٹوٹتا ہے کہاں اب طلسمِ شوق | منزل سے دور رہرو منزل سفر میں ہے
لٹتے جہاں ہیں آرزوئے دل کے قافلے | ایسا بھی اک مقام تری رہگذر میں ہے
ہم دل جلوں کی آہ کے اثرات دیکھنا | ہنگامہ بجلیوں میں قیامت شرر میں ہے
ٹکرا کے دار سے بھی نہ تیور بدل سکے | وہ عزمِ غم شکن ترے آشفتہ سر میں ہے
کیا بات ہو شبابِ تمنا کی عشق میں | جلوے میں جو نہیں ہو وہ جلوہ نگر میں ہے

ساجد اب اس سے بڑھ کے بھی کیا آرزو کروں

سب کچھ تو میری زندگیِ مختصر میں ہے

مطبوعات جدیدہ

العبر فی خبر من غبر
از امام ذہبی صفحات ۵۰۰، ٹائپ اعلیٰ، ناشر:
حصہ اول
دائرۃ المطبوعات والنشر، کویت، قیمت درج نہیں،

امام ذہبی ان اساطین امت میں ہیں جنھوں نے علم حدیث وتاریخ میں ایسی بیش قیمت تصانیف چھوڑی ہیں جن سے دنیائے اسلام کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتی، انہی کتابوں میں العبر بھی ہے، انھوں نے تاریخ پر تین کتابیں لکھی ہیں، ان میں سب سے ضخیم و مفصل "تاریخ اسلام ہے" جو ۲۱ جلدوں میں مکمل ہوئی تھی، اس کی تصنیف سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے دو مختصر تاریخیں لکھیں، جن میں ایک کا نام دول الاسلام، دوسری کا نام العبر فی خبر من غبر ہے، ان کی تاریخ اسلام تو غالباً اب تک شائع نہیں ہو سکی ہے، البتہ دونوں مختصر تاریخیں چھپ گئی ہیں، دول الاسلام دائرۃ المعارف حیدرآباد سے عرصہ ہوا شائع ہو چکی ہے اور العبر کی طباعت کویت کے نئے علمی ادارہ دائرۃ المطبوعات کی طرف سے ہوئی، دول الاسلام کی ابتدا حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت سے کی ہے اور العبر کی ابتدا پہلی ہجری سے، اس کتاب کی دو جلدیں ہیں، پہلی جلد چھپ کر بازار میں آگئی ہے اور دوسری زیر طبع ہے،

یہ کتاب فن تاریخ پر ان کی ماہرانہ بصیرت کی شاہد عادل ہے، انھوں نے ایک ذمہ دار مورخ کی حیثیت سے واقعات کے نقل کرنے میں کسی طرح کی کتر بیونت نہیں کی ہے، اپنے جذبات اور رائے کا اظہار ضرور کیا ہے، مگر نقل واقعات کے بعد اور پورے توازن کے ساتھ اس میں انھوں نے جن حقائق کی طرف چند جملوں میں اشارے کر دیے ہیں وہ بعض طویل تاریخوں سے بھی واضح نہیں ہوتے،

مثلاً وہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے دور خلافت کا ذکر کرکے لکھتے ہیں :- حتی کاد تجتمع الامۃ علیہ اس جملہ میں اس دور کی ایک پوری تاریخ بھی پوشیدہ ہے اور انھوں نے بڑے متوازن انداز میں اپنے جذبات کا اظہار بھی کر دیا ہے، اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں یلوم اباہ علی القیام فی الفتنۃ ویطیعہ (ص۲۲) اسی طرح عبد الملک بن مروان کے عہد میں مسلمانوں پر رومیوں کی تاراج کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس نے رومیوں کے حملوں سے بچنے کے لیے اس شرط پر صلح کرلی کہ ہر جمعہ کو وہ ایک ہزار دینار رومیوں کو بطور تحفہ پیش کرے گا، اس صلح کا ذکر کرکے پھر ایک اسلامی مورخ کی حیثیت سے اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں : ھذا اول وھن دخل علی الاسلام وما ذاک الا لاختلاف الکلمۃ ولکون الوقت فیہ خلیفتان قیانزعان الا ما شاء اللہ کان (ص۶) اس جملہ سے کتنے شدید تاثر کا اظہار ہوتا ہے، مگر ایک مورخ کے منصب سے ذرا بھی ہٹے نہیں ہیں، دوسری صدی کے مشہور مفسر ضحاک بن مزاحم کے تذکرہ میں ایک ایسے عظیم مدرسہ کا ذکر کیا ہے کہ جس میں تین ہزار لڑکے تعلیم پاتے تھے، کان فقیہ مکتب عظیم فیہ ثلاثۃ آلاف صبی۔ (ص۱۲۴)

اس طرح سیکڑوں شذرات الذہب اس کتاب میں بکھرے ہوئے ہیں، یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر پڑھا لکھا اسے ایک اسلامی تاریخی ڈائری کے طور پر اپنے ساتھ رکھے، حکومت کویت اس کتاب کی اشاعت پر مبارکباد کی مستحق ہے۔

نظر گاہ - از جناب افقر موہانی، صفحات ۱۹۰، کتابت وطباعت عمدہ، ناشر صدیق بک ڈپو امین آباد لکھنؤ۔ قیمت :- ۶؍

سید محمد حسن افقر موہانی کا شمار اساتذۂ فن میں ہوتا ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ "فردوس معانی" آج سے ۳۰ - ۴۰ برس پہلے شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ اس کے بعد ان کا دوسرا مجموعہ "ارمغان" شائع ہوا

اور اب ان کا تیسرا مجموعہ "نظرگاہ" نظر افروز ہوا ہے، اس مجموعہ میں تقریباً ڈیڑھ سو غزلیں ہیں،
ان کے کلام کا ابھی اچھا خاصا حصہ اشاعت سے محروم ہے۔

افقر صاحب دو واسطوں سے مومن کے شاگرد ہیں، اس لیے ان کے کلام میں مومن کا رنگ جھلکتا ہے، افقر صاحب کا کلام اپنے معاصر شعراء اصغر، فانی، حسرت، جگر، فراق وغیرہ سے کسی طرح کمتر نہیں ہے، بلکہ متانت و پاکیزگی میں اصغر کے علاوہ ان کا کوئی مدمقابل نہیں ہے اور درد و سوز کے لحاظ سے وہ سب میں ممتاز ہیں، افقر ایک صوفی شاعر ہیں اور ان کی شاعری تصوف کی تمام قدروں اور خصوصیت سے عشق و محبت کے جذبات سے لبریز ہے، یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ وہ اس دور کے خواجہ میر درد ہیں، خواجہ صاحب کے بارے میں تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ شاعری دون مرتبۂ اوست، اور افقر نے بھی کہا ہے

نہیں شاعری حاصل زیست افقر ۔۔۔ فراق و جگر ہو کے کیا کیجئے گا

ترقی پسندی کے اس دور میں ان کے کلام کی قدر کرنے والے بہت کم رہ گیے ہیں، مگر اس کے باوجود یہ مجموعہ ذوق و شوق سے پڑھا جائے گا۔

کلام غالب - از جناب جلیل قدوائی، ایم اے، ٹائپ متوسط، صفحات ۱۰۶،
ناشر ادارۂ نگارش و مطبوعات، کراچی ۱۸

غالب کا دیوان گو خود ہی انتخاب ہے، مگر اس کے باوجود اس کے متعدد منتخبات شائع ہو چکے ہیں، انتخاب کرنے والوں نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس کا انتخاب کیا ہے، ان ہی میں کلام غالب بھی ہے جسے جلیل احمد صاحب نے جنھیں بچپن سے غالب اور ان کے کلام سے عشق ہے انتخاب کیا ہے، انتخاب کے بارے میں مصنف نے خود لکھا ہے کہ "اس انتخاب میں غالب کے وہ تمام اشعار جو خوش مذاق اہل علم و نقاد کی زبان پر ہیں یا وہ اس قابل ہیں کہ رہیں، اور جن پر غالب کی شہرت و عظمت کا مدار ہے،

یا ہو سکتا ہے، وہ سب کے سب شامل کر لیے گئے ہیں،" یہ دعویٰ بڑی حد تک اس لیے صحیح ہے کہ اس انتخاب میں دیوان کا تقریباً تین حصہ آگیا ہے، غالب کے قدر دانوں میں یہ انتخاب ضرور مقبول ہوگا۔

سچا دین حصۂ اول، دوم، سوم، چہارم از افضل صاحب و یوسف صاحب اصلاحی، ناشر: مکتبہ جماعت اسلامی ہند، سوئی والان ۱۴۲۵ دہلی ۶

یہ چاروں رسالے ابتدائی درجات کے بچوں کے لیے اس غرض سے لکھے گئے ہیں کہ ان کے ذریعہ بچوں کو اسلامی عقائد و عبادات، اخلاق و معاملات اور سیرت نبویؐ اور سیرت صحابہؓ سے واقف کرایا جائے، اس سے پہلے ریاست حیدرآباد کے شعبۂ دینیات کی طرف سے اسی طرح کا ایک جامع سٹ دس حصوں میں شائع کیا گیا تھا، یہ رسالے گویا اسی کی تکمیل یا نقش ثانی ہیں، انداز بیان اچھا اور دلکش ہے، فقہی مسلک کے سلسلہ میں یہ احتیاط رکھی گئی ہے کہ بچے کے ذہن پر کسی ایک ہی مسلک کی چھاپ نہ پڑنے پائے، مگر اس احتیاط سے یہ خطرہ بھی ہے کہ کہیں بچوں کو طہارت اور نماز روزہ کی ضروری تفصیلات کا بھی علم نہ ہو سکے۔ قرآن مجید کی قرأت کے قاعدے کو پہلے حصے کے بجائے دوسرے تیسرے حصے میں ہونا چاہیے تھا، اگر عقائد و عبادات کی تفصیلات کے لیے ایک الگ رسالہ لکھا گیا ہوتا تو زیادہ مفید ہوتا،

اسلامی نظمیں، بدھو کی بیوی از جناب محمد شفیع صاحب نیر، ناشر مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ قیمت ۶۵ نئے پیسے اور ۳۰ نئے پیسے۔

یہ دونوں رسالے بچوں کے مشہور شاعر محمد شفیع صاحب نیر کی کاوش کا نتیجہ ہیں، وہ بچوں کیلئے نثر و نظم دونوں میں ہلکی پھلکی کتابیں لکھتے رہتے ہیں، انہی میں یہ دونوں کتابیں بھی ہیں، یہ بچوں کی نفسیات سے خوب واقف ہیں اس لیے ان کی لکھی ہوئی کتابیں بچے بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں، امید ہے کہ دوسری کتابوں کی طرح یہ دونوں کتابچے بھی مقبول ہوں گے۔

فلسفۂ دعا - از پروفیسر افضل احمد صاحب عارف ایم اے، صفحات ۱۰۲، کتابت و طباعت بہتر، ناشر مکتبہ رشیدیہ، غلہ منڈی منٹگمری، ہندوستان: مکتبۂ علم و ادب دیوبند۔ قیمت للعہ

عبد و معبود کے رشتہ کو جو چیزیں جوڑتی ہیں ان میں ایک موثر جزء دعا بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ دعوت و تبلیغ کیساتھ تمام انبیاؑ، اور خصوصیت سے سرور عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سنت رہی ہے کہ انھوں نے سرا، و ضرا، نعمت و مصیبت ہر حال میں خدا ہی کو پکارا ہے، قرآن و حدیث میں جو دعائیں اگلے انبیاؑ، اور ان کے حواریین اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کی زبان سے منقول ہیں، ان میں ایک طرف توحید کا اعلیٰ تصور، آخرت کا پرشور احساس اور خوف و رجا کی بہترین آمیزش ملے گی، دوسری طرف آپ کی زندگی کے ہر موقع و محل اور نازک سے نازک انسانی احساسات و جذبات کی ترجمانی ملے گی۔ تیسری طرف ان کے پڑھنے سے آپ کے ایمان میں روشنی اور قلب و دماغ میں جلا آئے گی اور سوز و گداز پیدا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی دعا سے اس سے زیادہ خوش ہوتا ہے جتنا کہ ایک باپ یا ماں کا دل اپنے ننھے بچے کی فرمائش سے باغ باغ ہوجاتا ہے، جس کسی کو دعوت کے ساتھ دعا کی دولت بھی ہاتھ آجائے اس نے واقعی بڑی دولت پائی۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

پروفیسر افضل صاحب قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس موضوع پر ایک عمدہ کتاب لکھ دی، یہ کتاب بار بار زبان دل اور چشم پرنم کے ساتھ پڑھنے کے لائق ہے۔

م، ج

جلد ۹۰ ماہ جمادی الاول ۱۳۸۲ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۶۲ء عدد ۴

مضامین

شذرات

اردو زبان کے مشہور خدمت گذار اور نامور صاحب قلم ڈاکٹر سید محی الدین زور قادری کی وفات دنیائے اردو کا بڑا سانحہ ہے، انھوں نے علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے اردو زبان و ادب کی بڑی خدمت کی، وہ دکن کے مولوی عبدالحق اور دکنیات کے خصوصیت کے ساتھ بڑے ماہر تھے، قدیم دکھنی اردو کی بہت سی نادر کتابیں انھوں نے شائع کیں، ان کا سب سے بڑا کارنامہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد ہے، اس ادارہ نے اردو زبان و ادب کی جو گوناگوں خدمات انجام دیں، اس کی مثال اردو کے اسکی عمر کے اداروں میں نہیں مل سکتی، اس کی . . . حیثیت دکن میں وہی ہے، جو شمالی ہند میں انجمن ترقی اردو ہند کی ہے اور آج اندھرا پردیش میں اردو کا وجود اور اس کا وقار اسی ادارے کے دم سے قائم ہے، ڈاکٹر زور کی مستقل تصانیف اور ان کی مرتب اور شائع کردہ کتابوں کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہوگی، وہ حیدرآباد کے ایک خانوادۂ مشائخ سے تعلق رکھتے تھے، اسی نسبت سے اپنے نام کے ساتھ قادری لکھتے تھے، اور اس سلسلہ کو انھوں نے قائم بھی رکھا تھا، چنانچہ ان کے بڑے صاحبزادے ان کی خاندانی خانقاہ کے سجادہ نشین ہیں، مگر ان کی علمی و ادبی شہرت نے ان کی اس حیثیت کو اتنا چھپا دیا تھا کہ اس کا علم بھی بہتوں کو نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے،

لسانی کمیٹی کی رپورٹ پر اتنی بحث ہو چکی ہے خصوصاً حیات اللہ صاحب انصاری اور قاضی عدیل صاحب عباسی ان کی موافقت اور مخالفت میں اتنا لکھ چکے ہیں کہ اس کا ہر رخ سامنے آگیا ہے،

مقالات

ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

از جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ایم اے

(۷)

فیروز شاہ کا تصادم صوفیہ سے فیروز شاہ تغلق شریعت کا لحاظ ہر حال میں رکھتا، اور اس نے اسکی پاسبانی کرکے نہ صرف علماء بلکہ صوفیہ کی بے راہ روی کو بھی سختی سے روکا، اس کے عہد میں ایک بزرگ احمد بہاری تھے، جو دہلی میں آکر رہ گئے تھے، ان کے بہت سے مریدین تھے، فیروز شاہ کا بیان فتوحات فیروز شاہی میں ہے کہ ان کے مریدین دہریے تھے، جو احمد بہاری کو خدا سمجھتے اور کہا کرتے تھے کہ دہلی میں خدا طلوع ہوا ہے' اور خود احمد بہاری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ باتیں کرتے تھے' اسی لیے فیروز شاہ نے ان کے پاؤں میں زنجیر ڈلوا کر اپنے سامنے بلوایا، اور قید کر دیا، ان کے مریدین کو ادھر ادھر مختلف شہروں میں بھیجکر منتشر کر دیا، ان کے ایک دوست شیخ عز کاکوی بھی تھے، ان پر بھی شطحیات کا الزام آیا اور علماء کے فتوی پر ان کو قتل کر دیا گیا، فتوحات فیروز شاہی میں احمد بہاری اور شیخ کاکوی کے

قتل کا ذکر نہیں ہے لیکن حضرت مخدوم الملک شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ احمد بہاری اور شیخ کاکوی دونوں قتل کر دیے گئے جس سے مخدوم الملک کو بڑا دکھ ہوا، وہ دونوں کو توحید کے اسرار و رموز کا واقف کار اور ترک و تجرید کا حامل سمجھتے تھے، اور ان کی باتوں کو عالم دیوانگی پر محمول کرتے تھے، اسی لیے ان کو ان دونوں کے قتل کی خبر ملی تو فرمایا کہ جس شہر میں ایسے بزرگوں کا خون بہایا جائے، تعجب ہے اگر وہ آباد رہے، ان کے حامیوں کا خیال ہے کہ فیروز شاہ کے بعد دہلی تیمور کے ہاتھوں جو برباد ہوئی، وہ گویا ان ہی بزرگوں کا خون رنگ لایا تھا،

فیروز شاہ کے عہد میں عین الملک ماہرو کے غلام نے صوفی بن کر اپنے مریدوں کو تاکید کی کہ میں اناالحق کہوں تو تم سب بلند آواز سے تو ئی تو ئی کہو، اس نے اپنے مریدوں کے لیے ایک رسالہ بھی لکھا، فتوحات فیروز شاہی میں ہے کہ اس کو بھی پابہ زنجیر طلب کرکے سخت سزا دی گئی، فتوحات فیروز شاہی میں اس کے قتل کا بھی ذکر نہیں لیکن وہ بھی علماء کے فتوی پر قتل ہوا،

فیروز شاہ کے زمانے میں مشائخ کی قبروں کی زیارت کے سلسلہ میں بہت سی بدعتیں بھی پیدا ہو گئی تھیں، ان کے مزارات کی زیارت کے لیے عورتیں، پالکیوں، گھوڑوں اور خچروں پر سوار ہو کر جاتیں، ان کے پیچھے اوباش لگ جاتے، جو طرح طرح کی مذموم حرکتیں کرتے۔ فیروز شاہ نے عورتوں کو مزاروں پر جانے سے بالکل روک دیا، اور اس حکم کی خلاف ورزی پر سخت سزائیں دیں۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ اور جہانگیر | مغل بادشاہوں کے دور میں جہانگیر اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے درمیان کچھ دنوں ضرور اختلاف رہا، عالمگیر کے عہد میں حضرت سرمد کی شہادت کا المناک حادثہ بھی ضرور پیش آیا لیکن ان دونوں واقعات کو چھوڑ کر ہر موقع پر مغل حکمران صوفیۂ کرام کے آگے سر تسلیم خم کرتے رہے،

پہلے ذکر آیا ہے کہ جہانگیر میں بڑی مذہبی حمیت و غیرت تھی لیکن اسی کے ساتھ اس سے وفا بل

اعتراض باتیں سرزد ہوتی رہیں، ایک تو وہ پیالہ کش رہا، دوسرے اسلام کے حکم کے خلاف اس کے حرم میں ایک وقت میں چار سے زیادہ بیگمات رہیں، اور یہ لکھتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ میں پیالہ کشی اور کثرت ازدواج شاہانہ لوازم میں داخل ہوگئی تھیں، بلبن، فیروز شاہ تغلق اور بابر جیسے دیندار بادشاہوں کی مجلسوں میں بھی کچھ دنوں تک شیشہ و ساغر کا شغل رہا، جہانگیر تو علانیہ شراب نوشی کرتا رہا، بلکہ اپنی طرح شہزادہ خرم کو بھی شراب پینے کے لیے آمادہ کرتا، اپنے دسویں سال جلوس میں ایک موقع پر صاف گوئی سے کام لے کر لکھتا ہے :-

"وہ (یعنی خرم) ۲۴ سال کا ہوگیا تھا، اس کی شادی بھی ہوگئی تھی، اس کے بچے بھی ہوگئے تھے لیکن اب تک اس نے شراب پی کر اپنے کو آلودہ نہیں کیا تھا، آج کے روز وہ وزن کیے جانے والا تھا، (یعنی اس کی سالگرہ تھی) میں نے اس سے کہا کہ بابا صاحب تم اولاد والے ہوگئے ہو، بادشاہ اور شہزادے شراب پیا کرتے ہیں، آج تمھارا جشن وزن ہے، تو تمھارے ساتھ میں بھی شراب پیتا ہوں، اور تم کو اجازت دیتا ہوں کہ جشن کے مواقع پر نوروز اور بڑی بڑی مجلسوں میں شراب پیا کرو لیکن اعتدال قائم رہے"

جہانگیر آخر وقت تک شراب پیتا رہا، لیکن جمعرات، جمعہ کی رات اور اتوار کو نہیں پیتا، جمعرات اسکی تخت نشینی کا دن تھا، جمعہ کی رات کو وہ متبرک رات سمجھتا، اور اتوار اکبر کی پیدائش کا دن تھا، اسی طرح اس کے حرم میں چار سے زیادہ بیویاں رہیں، اکبر نے اپنے عہد حکومت میں اس کی جو شادیاں رچا کر اپنے سیاسی اغراض پورے کیے، ان میں چھ راجپوت شہزادیوں سے ہوئیں، جہانگیر نے خود اپنے عہد حکومت میں تین نکاح کیے، ممتاز اور باثر ہندو اور مسلمان منصبداروں نے اپنی اپنی لڑکیوں کو اس کے حرم میں بڑی بڑی امیدوں کے ساتھ داخل کیا، اور خود راجکماریاں اور امیرزادیاں بھی ملکہ بننے کے شوق میں سوکنوں کا خیال کیے بغیر حرم میں داخل ہوتی رہیں، اسلامی قانون کی یہ خلاف ورزی جس

کسی مسلمان حکمراں نے کی۔ اس کی زندگی پر ایک بدنما داغ ہے،

جہانگیر اپنی ان معصیتوں کے باوجود مذہب کا برابر احترام کرتا رہا، پہلے ذکر آچکا ہے کہ اس نے ابوالفضل کا قتل اس لیے کرایا کہ اس کا خیال تھا کہ اسی نے اس کے باپ کو مذہبی گمرہی میں مبتلا کیا، اس کا بھی ذکر پہلے آیا ہے کہ اس نے لاہور کے شیخ ابراہیم کو مذہبی بے راہ روی اور سفلہ پروری کی وجہ سے چنار میں قید کردیا، اور پھر قاضی نوراللہ شوستری جیسے مقتدر شیعی عالم کو غصہ میں اس لیے قتل کرادیا کہ ان کی بعض باتوں سے اس کے مذہبی احساسات کو ٹھیس لگی، ان کی موت شیعوں کے لیے ایک بڑا المناک حادثہ ہے جس کا دکھ ان کو ابتک ہے۔ اسی لیے وہ شہید ثالث کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں، ملا عبدالقادر جیسے متشدد سنی عالم بھی قاضی نوراللہ شوستری کے لیے بہت اچھے الفاظ استعمال کرتے ہیں، حالانکہ ملا صاحب نے اکبر اور اس کے دین الٰہی کے حامیوں کے لیے جو الفاظ استعمال کیے ہیں، ان سے ان پر غیر معمولی تعصب اور تنگ نظری کا الزام آتا ہے لیکن وہ قاضی نوراللہ شوستری کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"اگرچہ شیعی مذہب است، اما بسیار صفت وعدالت و نیک نفسی وحیا و تقوی وعفاف و اوصاف اشراف موصوف است، و بعلم وحلم وجودت فہم وحدت طبع وصفائی قریحہ و ذکا مشہور است، صاحب تصانیف لائقہ است"

لیکن ان خوبیوں کے باوجود قاضی نوراللہ شوستری کی زبان سے جہانگیر کے سامنے عاجلانہ طور سے کچھ ایسے کلمات نکل گئے جن سے جہانگیر کو بڑا اشتعال پیدا ہوا، اور اس نے ان کو قتل کرادیا، یہ واقعہ ۱۰۱۹ھ یعنی اس کے پانچویں سال جلوس کا ہے، نورجہاں ایک سال کے بعد محل میں داخل ہوئی تھی، اس کی موجودگی میں شاید یہ حادثہ پیش نہ آتا۔ جہانگیر غالباً اپنی ندامت میں اس حادثہ کا ذکر اپنی تزک میں نہیں کرتا ہے لیکن ایسے مقتدر شیعہ عالم کا قتل جہانگیر کے تمام شیعی امرا کے لیے بہت ہی تکلیف دہ رہا،

اس حادثہ کے نو سال کے بعد جہانگیر کا تصادم حضرت مجدد الف ثانیؒ سے ہوا، اور اس کا آغاز

اس طرح ہوا کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے ایک خواب کا ذکر اپنے مرشد حضرت خواجہ باقی باللہؒ سے ایک مکتوب میں کیا جس میں تحریر فرمایا:-

.... دوسری عرض یہ ہے کہ دوسری دفعہ اس مقام کے ملاحظہ کے وقت اور بہت سے مقامات ایک دوسرے کے اوپر ظاہر ہوئے، نیاز و عاجزی سے توجہ کرنے کے بعد جب اس مقام سے اوپر کے مقام میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ حضرت ذی النورین رضی اللہ عنہ کا مقام ہے اور دوسرے خلفاء کا بھی اس مقام میں عبور واقع ہوا ہے، اور یہ مقام بھی تکمیل و ارشاد کا مقام ہے، اور ایسے ہی اس مقام سے اوپر کے دو مقام بھی جن کا اب ذکر ہوتا ہے تکمیل و ارشاد کے مقام ہیں، اور اس مقام کے اوپر ایک اور مقام نظر آیا، جب اس مقام میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا مقام ہے اور دوسرے خلفاء کا بھی وہاں عبور واقع ہوا ہے، اور اس مقام سے اوپر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا مقام ظاہر ہوا، بندہ اس مقام پر بھی پہنچا، اور اپنے مشائخ میں سے حضرت خواجہ نقش بند قدس سرہ کو ہر مقام میں اپنے ساتھ ہمراہ پاتا تھا، اور دوسرے خلفاء کا بھی اس مقام میں عبور واقع ہوا ہے، سوائے عبور اور مقام اور مرور و ثبات کے کچھ فرق نہیں ہے، اور اس مقام کے اوپر سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اور کوئی مقام معلوم نہیں ہوتا، اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مقام کے مقابل ایک اور نہایت عمدہ نورانی مقام کہ اس جیسا کبھی نظر میں نہ آیا تھا، ظاہر ہوا اور وہ مقام اس مقام سے تھوڑا بلند تھا جس طرح کہ صفہ کو سطح زمین سے ذرا بلند بناتے ہیں، اور معلوم ہوا کہ وہ مقام محبوبیت کا مقام ہے، اور وہ مقام رنگین اور منقش تھا، اپنے آپ کو بھی اس مقام کے عکس سے رنگین پایا۔" (ماخوذ از مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانی اردو ترجمہ از قاضی عالم الدین صاحب)

اس خط کی شہرت پھیلی تو کچھ بد باطن اشخاص نے ان پر الزام رکھا کہ انھوں نے اپنے کو حضرت ابوبکرؓ سے افضل تر قرار دیا ہے، لیکن وہ اس الزام کی تردید اپنے ایک مکتوب میں یہ لکھ کر کرتے ہیں :-

وہ شخص جو اپنے آپ کو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے افضل جانے اس کا امر دو حال سے خالی نہیں ہے، یا وہ زندیق محض ہے یا جاہل...... یا وہ شخص جو حضرت امیر رضی اللہ عنہ کو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے افضل کہے، اہل سنت وجماعت کے گروہ سے نکل جاتا ہے تو پھر اس شخص کا کیا حال ہے جو اپنے آپ کو افضل جانے۔"

جہانگیر کو بھی حضرت مجددؒ کے اس خط کی خبر ملی، اس کو اس کا یہ مطلب سمجھایا گیا کہ حضرت احمد سرہندیؒ اس کے دعویدار ہیں کہ وہ مقام محبوبیت میں پہنچکر خلفائے راشدین سے زیادہ مقرب الٰہی ہوگئے ہیں، تذکرہ نگاروں اور مقالہ نویسوں کی روایت ہے کہ دربار میں حضرت مجدد الف ثانیؒ طلب کیے گئے، جہانگیر نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ اپنے کو حضرت ابوبکر صدیقؓ سے زیادہ افضل سمجھتے ہیں، انھوں نے جواب دیا کہ میں حضرت علیؓ کو تو ان پر فضیلت دینے کے لیے تیار نہیں ہوں، اپنے کو ان سے افضل تر سمجھنے کا کیا سوال ہو سکتا ہے، میں تو اپنے کو کتے سے بھی افضل نہیں تصور کرتا ہوں، پھر ان سے پوچھا گیا کہ تقرب الٰہی میں اپنے کو حضرت عثمانؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مقام سے گزرتا ہوا کیوں لکھا ہے، جواب دیا کہ دربار کا کوئی امیر بڑے منصب داروں کے مقام سے گذرتا ہوا تخت شاہی سے تقرب حاصل کرتا ہے تو کیا وہ ان منصب داروں سے معزز اور افضل تر سمجھا جاتا ہے؟ جہانگیر خوش ہوا، لیکن فوراً ہی اس نے سجدۂ تعظیمی نہ کرنے کی بازپرس کی، حضرت مجددؒ نے فرمایا کہ سجدہ بجز خداوند قدوس کے کسی اور کے لیے جائز نہیں، دربار کے شیخ اسلام مفتی عبد الرحمن نے سلاطین کے لیے سجدۂ تحیت کا جواز پیش کیا، لیکن حضرت مجددؒ نے فرمایا کہ یہ رخصت ہے اور عزیمت کے خلاف ہے، عزیمت یہی ہے کہ غیر اللہ کو سجدہ نہ کیا جائے، اس خلاف توقع جواب کو سن کر جہانگیر نے مشتعل ہو کر ان کو گوالیار میں محبوس کر دیا،

گر کہا جاتا ہے کہ ایک روز اس نے خواب میں دیکھا کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اس سے فرماتے ہیں کہ تم نے ایک بڑے آدمی کو قید کر دیا ہے، جہانگیر نے منفعل ہو کر ان کی رہائی کا حکم صادر کیا اور اپنے پاس بلا کر معذرت کی، اور پھر ان کی ذات اقدس سے اس کی عقیدت اتنی بڑھی کہ روزانہ مغرب کے بعد وہ ان سے ملاقات کرتا، اور ان کے سرچشمۂ علم و فضل سے اس کے قلب کی تطہیر ہوتی گئی،

لیکن اس سلسلہ میں خود جہانگیر کا بیان جو تزک جہانگیری میں ہے، وہ ایک عقدۂ لاینحل کی حیثیت رکھتا ہے، وہ اپنے چودھویں سال جلوس میں لکھتا ہے:۔

"ان ہی دنوں مجھ سے عرض کیا گیا کہ شیخ احمد نامی نے ایک جعل ساز (شیادے) نے سرہند میں مکر و فریب (زرق وسالوس) کا جال بچھا کر بہت سے ظاہر پرستوں کو پھانس رکھا ہے اس نے ہر شہر اور ہر علاقہ میں ایک خلیفہ مقرر کر رکھا ہے، جو دوکانداری معرفت فروشی اور مردم فریبی میں بہت پختہ ہیں، اس نے اپنے مریدوں اور معتقدوں کو بہت سی خرافات لکھی ہیں، ان کو ایک کتاب میں جمع کر دیا ہے، اور نام مکتوبات رکھا ہے، اس میں بہت سی مہمل اور لاطائل باتیں لکھی ہیں، جو کفر کی حد تک پہنچتی ہیں، ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ میں سلوک کی راہ میں ذی النورین کے مقام سے گذرا، جو نہایت اونچا اور پاکیزہ تھا، اور اس سے گذر کر مقام فاروق سے پیوست ہو گیا، اور مقام فاروق سے گذر کر مقام صدیق عبور کیا، ہر مقام کی تعریف اس کے مطابق کر کے لکھا ہے کہ مقام محبوبیت میں پہنچ گیا، یہ مقام مشاہدہ تھا، جو کہ نہایت منور اور دلکش تھا، اور مجھ پر مختلف قسم کے انوار کا عکس پڑ رہا تھا، یعنی استغفر اللہ خلفاء کے مقام سے گذر کر ان سے عالی تر مقام پر پہنچ گیا، اس نے اسی طرح کی اور بھی گستاخانہ باتیں لکھی ہیں جن کا لکھنا طوالت اور بے ادبی ہے، میں نے

اسی بنا پر حکم دیا کہ وہ دربار میں حاضر ہو، میرے حکم کے مطابق آیا اور جو کچھ میں نے پوچھا اس کا معقول جواب نہیں دے سکا، وہ ریاکار، بے عقل، مغرور، خود پسند معلوم ہوا، اس کے اس حال کی اصلاح کے لیے یہی مناسب سمجھا کہ کچھ روز کے لیے اس کو قید کر دیا جائے، تاکہ اس کے مزاج کی شوریدگی، دماغ کی آشفتگی کچھ دور ہو جائے، اور عوام کی شورش فرو ہو جائے، اس کو انی رائے سنگھ دلن کے حوالے کیا کہ اس کو گوالیار کے قلعہ میں قید رکھے۔"

اس تحریر سے یہ ظاہر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جہانگیر اپنے چودھویں سال جلوس تک حضرت مجددؒ سے بالکل ناواقف تھا، اور اس سال ان سے جعل ساز، معرفت فروش اور مردم فریب کی حیثیت سے پہلی دفعہ واقف ہوا، اور جب ان سے ملا تو ان کو شوریدہ مزاج، آشفتہ دماغ، بے عقل، مغرور اور خود پسند پایا، تزک جہانگیری اپنی صداقت پسندی، صاف گوئی اور حقیقت نگاری کے لیے مشہور ہے لیکن مذکورۂ بالا بیان میں یہ چیزیں بالکل نظر نہیں آتی ہیں، یہ کسی طور پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا ہے کہ جہانگیر حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اہمیت سے چودھویں سال جلوس تک بالکل بے خبر رہا، پہلے کہا جا چکا ہے کہ عہد اکبری میں جو غیر اسلامی اور مشرکانہ رنگ پیدا ہو گیا تھا، اس کو دور کرنے کے لیے انھوں نے پوری کوشش کی، اور شیخ فرید بخاری، خواجہ جہاں، خان خاناں عبدالرحیم خان اور دوسرے جلیل القدر امراء کو برابر خطوط لکھ کر جہانگیر کو اپنی حکومت میں اسلامی رنگ پیدا کرنے پر بالواسطہ مجبور کیا، اور جہانگیر نے حکم بھی دیا کہ چار دیندار عالم منتخب کیے جائیں اور ان کے مشورے سے ملکی نظم و نسق ایسا قائم کیا جائے کہ کوئی حکم خلاف شرع نہ ہونے پائے، یہ سن کر حضرت مجددؒ نے شیخ فرید بخاری کو ایک مکتوب میں لکھ کر چار کے بجائے صرف ایک عالم کو منتخب کرنے کی تجویز پیش کی، تاکہ اختلاف پیدا نہ ہو، شیخ فرید بخاری جہانگیر کا بہت ہی محبوب مقرب بارگاہ تھا، اس کو جہانگیر اپنا بہت بڑا مخلص اور فدائی بھی سمجھتا رہا، کیونکہ اس کی تخت نشینی میں شیخ فرید کا

کوئی پہلو تشنہ باقی نہیں ہے، تاہم سب کو تسلیم ہے کہ یہ رپورٹ بہت ناقص ہے، اس میں اردو کے بعض ضروری مسائل کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے، اور اردو کے مطالبات سے اس کی سفارشوں کو کوئی نسبت نہیں ہے، اس لیے اردو کے تمام اخبارات حتیٰ کہ انجمن ترقی اردو ہند کے ترجمان ہماری زبان تک نے جس کی پالیسی اس کی ذمہ داریوں کی بنا پر نسبتۃً نرم اور معتدل ہے، اس رپورٹ کی مخالفت کی ہے، اس لیے موجودہ شکل میں وہ قطعاً ناقابل قبول ہے، لیکن ایک بڑا سوال یہ بھی ہے کہ اردو کے موجودہ مخالف حالات میں اس کو بالکل رد کر دینا اردو کے لیے مفید ہوگا، یا بعض ضروری ترمیموں کے قبول کر لینا،

اس حقیقت سے ہر شخص واقف ہے کہ آزادی کے بعد کچھ ہندوستان کی تقسیم کے اثرات اور کچھ براہمن بھارت کی احیائی ذہنیت نے اردو کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، اور اس کو بھی پاکستان کا ہمزاد تصور کیا جاتا ہے، اور اس کی مخالفت ہندوستان کا ایسا قومی مسئلہ بن گئی ہے، جس میں کسی جماعت کا استثناء نہیں ہے، ایک مختصر جماعت کو چھوڑ کر جس کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے، مرکز سے لیکر صوبوں تک اور ہندو مہاسبھا اور جن سنگھ سے لیکر کانگریس تک سب کے جذبات اردو کے بارہ میں تقریباً یکساں ہیں، اور ہندوستان کی بہت بڑی اکثریت اردو کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے، کچھ منصف مزاج اور حق پسند ضرور ایسے ہیں جو اردو کو ختم کرنا پسند نہیں کرتے، لیکن انکی تعداد اتنی کم ہے کہ وہ کبھی کبھی اردو کے حق میں کلمۂ خیر کہہ دینے کے علاوہ عملاً اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے، حتیٰ کہ پنڈت جواہر لال نہرو تک اس معاملہ میں بے بس ہیں، ان حالات میں حکومت سے زیادہ توقع رکھنا عبث ہے، اگر وہ ہمت کرکے اردو کے لیے کچھ کرنا بھی چاہے تو بہت آگے نہیں جا سکتی اور ملک کے متفقہ جذبات کو نظر انداز کرکے اپنے کو خطرہ میں نہیں ڈال سکتی۔

ان حالات میں چارۂ کار کیا ہے، زور و قوت سے اردو کے حقوق منوانے کا سوال ہی نہیں، اس راہ میں جو دشواریاں بلکہ خطرات ہیں، ان سے ہر شخص واقف ہے، عدالت سے فیصلہ کرانے میں بھی بڑی طوالت اور پیچیدگیاں ہیں، محض زبانی احتجاج اور حکومت کو برا بھلا کہنے سے کچھ حاصل نہیں، جس کا تجربہ ۱۳ سال سے ہو رہا ہے، اس لیے اگر جذبات سے قطع نظر کر کے محض اردو زبان کے مفاد کے نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر غور کیا جائے تو مناسب صورت یہی نظر آتی ہے کہ کمیٹی کی سفارشوں کو ضروری ترمیموں کے ساتھ منظور کر لیا جائے، کمیٹی کی رپورٹ حرف آخر تو ہے نہیں کہ اس میں ترمیم کی مطلق گنجائش نہ ہو، اس میں ایک اہم مسئلہ اسلامی مکاتب کا بھی ہے، کمیٹی کی رپورٹ پر غور کرنے کے لیے انجمن ترقی اردو ہند کی مجلس عاملہ کا جلسہ عنقریب ہونے والا ہے، حیات اللہ صاحب انصاری اور مدیل عباسی صاحب دونوں انجمن کے رکن ہیں، قاضی صاحب دینی تعلیم کونسل اتر پردیش کے سکریٹری بھی ہیں، اس لیے وہ اس کی نمائندگی بھی کر سکتے ہیں، انجمن کو جمعیۃ کے تعلیمی بورڈ کے نمائندے کو بھی مدعو کر لینا چاہیے، یہ تینوں مل کر جو فیصلہ کر دیں اس کو مان لیا جائے، اور باقی حقوق کے لیے جد و جہد جاری رکھی جائے۔

مسلم یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر مسٹر بدرالدین طیب جی کے متعلق ایک طبقہ کی رائے ہے کہ وہ حکومت کے آدمی ہیں، اور ان کو تعلیمی مسائل کا کوئی تجربہ نہیں ہے، اس لیے آزادی سے یونیورسٹی کو نہ چلا سکیں گے اور خطرہ ہے کہ حکومت کے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ نہ بن جائیں لیکن ابھی اس بارہ میں کوئی فیصلہ کرنا قبل از وقت ہے، وہ ایک بڑے دادا کے پوتے اور خود بھی ایک لائق اور روشن دماغ مسلمان ہیں، انھوں نے حال میں یونیورسٹی کی روایات کے متعلق جو تقریر کی ہے وہ بھی امید افزا ہے، اس لیے توقع یہی رکھنی چاہیے کہ وہ یونیورسٹی کی روایات و خصوصیات اور ملک کے نئے تقاضوں دونوں کا لحاظ رکھیں گے اور ان کا دور یونیورسٹی کے لیے مفید ثابت ہوگا۔

بڑا ہاتھ رہا، اس نے اس کو مرتضیٰ خاں کا خطاب بھی دیا، اسی کے ساتھ شیخ فرید حضرت مجددؒ کا بڑا معتقد بلکہ عزیز مرید بھی تھا، اس کا انتقال جہانگیر کے گیارہویں سال جلوس میں ہوا، ظاہر ہے کہ اس کی وساطت سے جہانگیر کو حضرت مجددؒ کی اہمیت کا اندازہ ضرور ہوا ہوگا، اور وہ زندہ رہتا تو جہانگیر اور حضرت مجددؒ کے اختلاف کی نوبت ہی نہیں آتی، پھر خود شہزادہ خرم اور دوسرے امرا کو حضرت مجددؒ سے جو محبت اور عقیدت رہی، اس سے جہانگیر بے خبر نہ رہا ہوگا، ایک روایت یہ بھی ہے کہ جہانگیر اور حضرت مجددؒ میں مراسلت بھی رہی، لیکن تعجب ہے کہ دونوں میں ملاقات نہیں ہوئی، حالانکہ جہانگیر اپنے دور کے تمام اکابر بزرگان دین سے مل کر اپنے اسلامی حسن باطن کا ثبوت دیتا رہا، وہ اپنے بارہویں سال جلوس میں احمد آباد گیا تو وہاں کے مشہور بزرگ شیخ اسمٰعیل بن شیخ محمد غوثؒ سے ملا، اور ان کو خلعت اور پانچ سو روپے دیے، اور پھر جتنے بزرگ اس سے ملنے کے لیے آئے ان کو بھی خلعت اور جاگیریں عطا کیں اور اپنے کتب خانۂ خاص سے تفسیر کشاف، تفسیر حسینی اور روضۃ الاحباب وغیرہ جیسی کتابیں نذر کیں، اور پھر اس نے ایک عام حکم دیا کہ مشائخ کی اولادوں کے ساتھ ہر قسم کی رعایتیں کی جائیں، چودھویں سال جلوس میں شیخ عبد الحق محدث دہلوی سے ملا تو انکے متعلق لکھا ہے کہ دہلی کے گوشہ میں بیٹھ کر مدت سے توکل و تجرید کی زندگی بسر کر رہے ہیں، انکی صحبت بے ذوق نہیں ہے، طرح طرح کے مراحم و دلنوازی کر کے ان کو رخصت کیا، اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ انھوں نے ایک کتاب تصنیف کی ہے جس میں مشائخ ہند کے حالات ہیں، اس کے لکھنے میں بڑی زحمت اٹھائی ہے، وہ اسی سال پنجاب گیا تو کلانور کے پاس پہنچکر اس کو سندھ کے مشہور بزرگ شیخ میر محمد مشہور بہ میاں میرؒ سے ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا جو اس وقت لاہور میں تھے، اس کا لاہور جانا ممکن نہ تھا، اسلیے حضرت میاں میرؒ خود اس کے پاس تشریف لائے، جہانگیر ان سے مل کر متاثر ہوا، ان کے بارہ میں لکھتا ہے کہ بڑے قابل، مرتاض، مبارک نفس، صاحب حال، گوشہ نشین، توکل پسند اور دنیا سے مستغنی بزرگ ہیں، خلوت میں ان کی صحبت سے مستفید ہوا، اس زمانہ

میں ان کا وجود غنیمت اور عزیز ہے۔ ان سے بڑے حقائق و معارف سننے میں آئے۔ میں نے چاہا کہ آپ کی خدمت میں نذر پیش کروں لیکن جرأت نہ ہوئی۔ آخر میں ایک سفید ہرن کی کھال جا نماز کے طور پر استعمال کرنے کے لیے ان کی خدمت میں پیش کی۔

بزرگان دین سے اس عقیدت کے باوجود حضرت مجددؒ کے تمام کارناموں اور خوبیوں کو نظرانداز کرکے جہانگیر کا ان کو جعل ساز، دوکاندار، معرفت فروش، مردم فریب وغیرہ کہنا تعجب انگیز ہے۔ کیونکہ وہ طبعاً بہت ہی محبت کیش تھا، اور اس کا دل بڑا ہی درد مند واقع ہوا تھا، خود حضرت مجددؒ اس کے اسلامی حسن باطن کے معترف رہے، اس لیے اس نے حضرت مجددؒ کی شان میں جو الفاظ لکھے ہیں ان کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے، وہ علم و فن کا بڑا ادا شناس بھی تھا، اس لیے حضرت مجددؒ کے مکتوبات جیسے گنجینۂ حقائق و معارف کو مہمل اور لاطائل کہنا اور بھی زیادہ باعث تعجب ہے، یا تو اس پوری عبارت کو الحاقی سمجھکر رد کر دیا جائے، اور اگر یہ الحاقی نہیں ہے، تو پھر یہ قیاس کرنا غلط نہ ہوگا کہ جہانگیر نے حضرت مجددؒ کی شان میں اس قسم کے نازیبا الفاظ لکھ کر نور جہاں اور اپنے شیعی امراء کی نظروں میں قاضی نوراللہ شوستری کے خون کا دھبہ اپنے دامن سے دھونے کی کوشش کی ہے، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت مجددؒ کی بزرگی اور شہرت کے باوجود جہانگیر نے ان سے اسیری کے واقعہ سے پہلے ملنا پسند نہیں کیا، اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حضرت مجددؒ نے اپنی تجدیدی اور اصلاحی کوششوں میں شیعوں کے خلاف بھی ایک محاذ قائم کیا تھا، اور ان کے اثرات کو دور کرنے کی خاطر بڑے شد و مد سے انکے مذہبی عقائد کی تردید میں لگے ہوئے تھے، ظاہر ہے کہ وہ تمام شیعی امراء کی نظروں میں خار کی طرح کھٹک رہے ہوں گے، ایسی صورت میں جہانگیر نے اپنے شیعی امراء کی دلداری اور دلجوئی کی خاطر ان سے ملنا پسند نہ کیا ہو، اس لیے اگر یہ کہا جاتا ہے کہ شیعی امراء نے جہانگیر کو ان کے خلاف ابھار کر ان کو قید کرا دیا تو یہ بعید از قیاس نہیں، اس سے نہ صرف قاضی نوراللہ شوستری کے قتل کا خونبہا ادا

ہوگیا، بلکہ شیعیت کے خلاف بھی کچھ دنوں کے لیے سرگرمیاں کم ہوگئیں، اگر قاضی نوراللہ شوستری کے قتل سے جہانگیر کے سنی امرا، خوش ہوئے ہوں گے تو اس کے شیعی امراء کو حضرت مجددؒ کی اسیری سے کچھ تسکین ضرور ہوئی ہوگی۔ جہانگیر کا حضرت مجددؒ کو اپنے ایک ہندو منصب دار رائے سنگھ کے حوالے کرنا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اس معاملہ میں وہ اپنے سنی امراء پر زیادہ بھروسہ نہیں رکھتا تھا۔ کیونکہ اس کو سنی امراء میں ان کی مقبولیت کا اندازہ رہا ہوگا۔

اس اسیری کے بعد تذکرہ نگار تو یہ لکھتے ہیں کہ جہانگیر نے اپنی غلطی پر منفعل ہوکر حضرت مجددؒ کو رہا کردیا، اور ان سے معذرت کی لیکن وہ خود اپنے پندرہویں سال جلوس میں لکھتا ہے کہ

"شیخ احمد سرہندی دکان آرائی، خود فروشی اور بے صرفہ گوئی کی خاطر کچھ دنوں کے لیے زندان ادب میں محبوس تھے، ان کو اپنے پاس بلاکر رہائی دی، خلعت اور خرچ کے لیے ایک ہزار روپے بھی دیے، اور ان کو اختیار دیا کہ وہ چاہے چلے جائیں یا میرے ساتھ رہیں، انھوں نے انصاف کے ساتھ عرض کیا کہ اس تنبیہ اور تادیب سے ان کو ہدایت حاصل ہوئی، انھوں نے ساتھ رہنے ہی میں اپنی مراد برآری دیکھی"

اگر یہ عبارت بھی الحاقی نہیں تو جہانگیر کے اس بیان میں بھی شیعی اعزہ اور امرا کی دلدہی کے جذبہ کا اظہار ہوتا ہے، اس ناخوشگوار واقعہ کا انجام خوشگوار طریقہ پر ہوا، رہائی کے بعد جہانگیر اور حضرت مجددؒ دونوں ایک دوسرے سے قریب تر ہوگئے، حضرت مجددؒ اپنے صاحبزادوں خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ "الحمد اللہ...... بادشاہ کے ساتھ عجیب و غریب صحبتیں گزر رہی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان گفتگوؤں میں بال برابر مداہنت نہیں دخل پاتی، اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان محفلوں میں وہی باتیں ہوتی ہیں جو خاص خلوتوں اور مجلسوں میں بیان ہوا کرتی ہیں، اگر ایک مجلس کا حال لکھا جائے تو دفتر ہو جائے، خاص کر آج ماہ رمضان کی سترہویں رات کو انبیاء

علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت اور عقل کے عدم استقلال اور آخرت کے ایمان اور اس کے عذاب و ثواب اور رویت و دیدار کے اثبات اور حضرت خاتم الرسلؐ کی نبوت کی خاتمیت اور ہر صدی کے مجددؒ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی اقتدا اور تراویح کے سنت اور تناسخ کے باطل ہونے اور دوسرے موضوع پر بہت کچھ ذکر ہوا، اور بادشاہ بڑی خوشی سے سنتے اور سب کچھ قبول کرتے رہے!!

اس خط سے ظاہر ہے کہ دونوں کے تعلقات خوشگوار ہوگئے تھے لیکن بعض تذکرہ نویس اور مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ جہانگیر نے حضرت مجددؒ کو رہا کرنے کے بعد اپنے ساتھ لشکر میں نظر بند کر رکھا تھا، لیکن یہ محض بدگمانی اور غلط قسم کی قیاس آرائی ہے، ایک مشہور روایت یہ بھی ہے کہ جہانگیر آخر میں حضرت مجددؒ سے اتنا متاثر ہوگیا تھا کہ وہ کہا کرتا تھا کہ میرے پاس ایک دستاویز نجات ہے، اور وہ حضرت شیخ کا ارشاد مبارک ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم کو جنت میں لے جائے گا تو ہم تیرے بغیر نہ جائیں گے، کچھ اہل قلم اس روایت کو مستند نہیں سمجھتے اور اس کی تردید میں اپنا زور قلم خواہ مخواہ صرف کرتے ہیں، لیکن اس کو صحیح مان لیا جائے تو کیا ہرج ہے، دوسری قومیں طرح طرح کی روایتیں گڑھ کر اپنی تاریخ بنا رہی ہیں، اگر ہماری تاریخ میں کچھ ایسی روایتیں ملتی ہیں جن کی صحت اور عدم صحت دونوں مصدقہ نہیں، لیکن اگر ان سے تاریخ کا کوئی پہلو روشن ہوتا ہے تو ہمارے اہل قلم کو بلا وجہ اس کی تردید کے پیچھے نہ پڑنا چاہیے، اس سے نہ صرف ہماری تاریخ کو نقصان پہنچا ہے، بلکہ ایک دوسرے کی تردید اور تائید کرنے میں خواہ مخواہ علمی اور تحقیقی سرگرمیاں برباد ہوتی رہی ہیں۔

حضرت سرمد کی شہادت | عالمگیری عہد کا ایک بہت بڑا المیہ حضرت سعید اشرف سرمد کی شہادت ہے، وہ نسلاً کاشانی یہودی تھے، اسلام لانے سے پہلے ان کا شمار علمائے یہود میں تھا، وہ توریت کے بہت بڑے عالم سمجھے جاتے تھے، اسلام قبول کرنے کے بعد فلسفہ و حکمت میں بڑی دستگاہ بہم پہنچائی، جس کا اظہار انھوں نے اپنی رباعیوں میں جا بجا کیا ہے، وہ ایک ممتاز رباعی گو کی حیثیت سے

بھی مشہور ہوئے، تجارت ان کا خاندانی پیشہ تھا، اسی سلسلہ سے اپنے وطن کاشان کو چھوڑا تو خلیج فارس کے راستے سے ہوتے ہوئے ٹھٹھہ آئے، یہاں ان کو ابھے چند نامی ایک ہندو لڑکے سے محبت ہوگئی، لڑکے نے بھی ان کی مریدی اختیار کرکے ان سے عبرانی، توریت اور زبور پڑھنا شروع کیا، اور ان کی نگرانی میں توریت کے ابتدائی چھ ابواب کے ترجمے فارسی میں کیے، جن کو دبستان المذاہب کے مصنف نے اپنی کتاب میں شامل کر لیا ہے، ٹھٹھہ کے قیام میں حضرت سرمد اس قدر مغلوب الحال ہوگئے تھے کہ مجذوبی کے عالم میں کوچہ اور بازار میں برہنہ دکھائی دیتے تھے، اسی مجذوبانہ کیفیت میں وہ حیدرآباد دکن پہنچے، اور وہاں سے شاہجہاں کے عہد میں دہلی آئے، ان کی عارفانہ رباعیوں کی شہرت دہلی پہلے پہنچ چکی تھی، اس لیے ان کے پاس ان کا کلام سننے کے لیے لوگوں کا بڑا مجمع رہنے لگا، داراشکوہ بھی ان کا گرویدہ ہو گیا، اور انھوں نے پیشین گوئی کی کہ شاہجہان کے بعد وہی بادشاہ ہوگا، اس سے داراشکوہ کی گرویدگی اور بڑھ گئی، وہ داراشکوہ کے سامنے آتے تو اپنی عریانی چھپانے کے لیے کمر میں کپڑے کا کوئی ٹکڑا باندھ لیتے، لیکن جب اورنگ زیب اور دارا کے درمیان جانشینی کی جنگ ہوئی تو دارا کو شکست ہوئی اور پھر وہ ارتداد، الحاد، اور کفر کے الزام میں تہ تیغ ہوا، تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ عالمگیر نے تخت نشینی کے بعد سرمد سے دریافت کیا کہ انھوں نے داراشکوہ کو بادشاہت کی جو خوشخبری دی تھی وہ کیسے پوری نہ ہو سکی؟ سرمد نے جواب دیا کہ وہ مژدہ صحیح نکلا، کیونکہ دارا کو ابدی سلطنت کی تاجپوشی نصیب ہوئی ہے، یہ جواب اورنگ زیب کو ناگوار گزرا، بعض تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ ان کی رباعیوں میں حسب ذیل رباعی کی شہرت ہوئی

آنکو کہ سر حقیقتش باور شد	خود پہن تر از سپہر پہناور شد
ملا گوید کہ بر شد احمد بہ فلک	سرمد گوید فلک با حمد در شد

ان پر یہ الزام رکھا گیا کہ وہ معراج جسمانی کے منکر ہیں، تذکرہ نویس یہ بھی لکھتے ہیں کہ قاضی

عبدالقوی فقہی جزئیات کا بڑا لحاظ رکھتے تھے، احتساب میں بھی بہت سخت تھے، ان کو حضرت سرمد کی برہنگی بڑی ناگوار تھی، اس لیے ان سے باز پرس کی تو انھوں نے جواب دیا کہ "شیطان قوی است" اور پھر یہ رباعی پڑھی:

خوش بالائے کردہ چنیں پست مرا　　　چشمے بدو جام بردہ از دست مرا
او در بغل من است و من در طلبش　　　دزدے عجبے برہنہ کردہ است مرا

قاضی عبدالقوی مذکورۂ بالا جواب اپنے اوپر طنز سمجھے اور انھوں نے ان پر عریانی کا جرم قائم کرکے عالمگیر کو ان کے قتل کا مشورہ دیا لیکن عالمگیر نے کہا کہ صرف عریانی وجہ قتل نہیں ہو سکتی ہے، بعض تذکروں میں یہ بھی ہے کہ عالمگیر نے ان کو دربار میں بلا کر ان سے برہنگی کا سبب پوچھا تو انھوں نے یہ رباعی پڑھی:

آنکس کہ ترا سریر سلطانی داد　　　ما را ہمہ اسباب پریشانی داد
پوشاند لباس ہر کرا عیبے دید　　　بے عیباں را لباس عریانی داد

ان کے متعلق یہ بھی مشہور تھا کہ وہ کلمہ کا صرف ایک جزیعنی لا الٰہ پڑھتے ہیں۔

اس طرح حضرت سرمد پر مختلف قسم کے الزامات تھے، علماء ان سے خوش نہ تھے، اور خود عالمگیر کو بھی ان سے ناگواری تھی، اس لیے وہ علماء کے ایک اجتماع میں طلب کیے گئے، دربار میں ان سے کلمہ پڑھنے کے لیے کہا گیا تو انھوں نے حسب عادت صرف ایک جزیعنی لا الٰہ پڑھا، علماء نے اس پر اعتراض کیا تو انھوں نے کہا کہ میں ابھی نفی میں مستغرق ہوں، مرتبۂ اثبات پر نہیں پہنچا ہوں، تو پھر جھوٹ کیسے کہوں، علماء نے کہا ایسا کہنا کفر ہے، اگر کہنے والا توبہ نہ کرے تو واجب القتل ہے، اور ان کے قتل کا فتویٰ صادر کر دیا گیا، تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ اس فتویٰ کے بعد دربار سے حضرت سرمد قتل گاہ کی طرف چلے تو تمام شہر امنڈ پڑا، اس قدر ہجوم تھا کہ

راستہ چلنا دشوار ہوگیا لیکن حضرت سرمد پر کوئی اثر نہ تھا، اور وہ اطمینان و سکون کے ساتھ رباعیاں کہتے جارہے تھے، اور جب جلاد تلوار لیکر ان کی طرف بڑھا تو ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی، اور وہ یہ شعر پڑھ رہے تھے:

رسیدہ یار عریاں تیغ ایں دم ہر رنگے کہ آئی می شناسم

پھر یہ اشعار پڑھے:

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

سر جدا کرد از تنم شوخے کہ با ما یار بود قصہ کوتہ کرد ورنہ درد سر بسیار بود

تذکرہ نویس یہ بھی لکھتے ہیں سر کشتہ سے دیر تک کلمۂ طیبہ کی آواز بلند ہوتی رہی، واللہ اعلم،

اور ان کی ذات سے لوگوں کی گرویدگی آج تک باقی ہے، اور انھوں نے وحدۃ الوجود، وحدۃ الشہود جبر و اختیار، محبت الٰہی، ذکر الٰہی، رضائے الٰہی، دیدار الٰہی، دیدار نبوی پر جو رباعیاں کہی ہیں وہ آج بھی ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں، لیکن ان کی عارفانہ انفرادیت ان کی مجذوبانہ کیفیت میں کچھ ایسی گم ہو کر رہ گئی ہے کہ ان کے متعلق جب کوئی کچھ لکھنے بیٹھتا ہے تو طرح طرح کی موشگافیاں کرتا ہے، چنانچہ کلیفورنیا یونیورسٹی کے پروفیسر والٹر جے فشل نے حیدرآباد دکن کے رسالہ اسلامک کلچر میں "ازمنۂ وسطیٰ میں ہندوستان کے مغل شاہنشاہوں کے دربار میں یہود اور یہودیت" کے عنوان سے ایک مضمون میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ سرمد بظاہر مسلمان ہوگئے تھے، لیکن انھوں نے اسلام برائے نام قبول کیا تھا، وہ ہمیشہ یہودیوں کو تنبیہ کرتے رہتے تھے کہ وہ مسلمانوں کے مذہب کو قبول نہ کریں، اور انھوں نے ہندوستان پہنچ کر یہودیت کی بڑی خدمت کی، اس لیے وہ یہودی مذہب کی تاریخ میں نمایاں جگہ پانے کا حق رکھتے ہیں، ان کی پہلی خدمت تو یہ تھی کہ انھوں نے دبستان المذاہب جیسی اہم کتاب کے مصنف سے علمی اشتراک کرکے یہودیت کو فارسی جاننے والے

ہندوستانیوں سے روشناس کیا، ان کی دوسری خدمت یہ تھی کہ ان ہی کی وساطت سے ہندوستان میں توریت کا فارسی ترجمہ رائج ہوا، تیسری بڑی خدمت یہ تھی کہ انھوں نے داراشکوہ کو یہودی عقائد سے واقف کرایا، پروفیسر مذکور آخر میں یہ لکھتے ہیں کہ سرمد کے قتل کرانے کی ایک بڑی وجہ ان کی یہودیت بھی تھی، انھوں نے اسلام ضرور قبول کرلیا تھا لیکن وہ اسلام سے سطحی طور پر متاثر تھے، وہ صوفی بن کر شاہی خاندان کو اپنے زیر اثر لارہے تھے، اورنگ زیب نے اس خطرہ کو محسوس کرلیا تھا چنانچہ دارا کے قتل کے محضر میں اس نے یہ وضاحت بھی کردی تھی کہ داراشکوہ کے ذریعہ یہودیت اور کفر کا غلبہ ہو جاتا،

پروفیسر مذکور یہودی ہیں اس لیے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں خود ان کی یہودیت کی فتنہ سامانی اور شہر انگیزی ہے، حضرت سرمد سے عام مسلمانوں کو جو عقیدت پیدا ہوگئی ہے، اس کو وہ کسی طرح زائل کرنا چاہتے ہیں، علماء اور عالمگیر نے جو کچھ ان کے ساتھ کیا، وہ صحیح تھا یا غلط، اس بحث سے قطع نظر ہو کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ آج بھی ان کے مرقد پر زائرین کا مجمع رہتا ہے، جو ان کی مقبولیت کی دلیل ہو اور موجودہ دور کا بڑے سے بڑا متقشف عالم بھی ان کے متعلق نازیبا الفاظ استعمال نہیں کرتا،

صوفیہ کرام کی شان استغناء اوپر کی تفصیلات سے ظاہر ہوا ہوگا کہ بعض سلاطین کو کچھ صوفیہ سے ذاتی یا سیاسی یا مذہبی اختلافات ضرور ہوئے لیکن ان کی مثالیں زیادہ نہیں ہیں، زیادہ تر سلاطین اکابر صوفیہ کی بارگاہوں میں سر نیاز خم کرتے رہے لیکن ان روحانی بزرگوں نے ان سے قریب ہونے کے باوجود ان سے دور رہ کر اپنی روحانی عظمت برقرار رکھی، اور اپنی فقیری کی شان ان سے مستغنی اور بے نیاز رہنے ہی میں تصور کی، اور ان سے کسی قسم کا مادی فائدہ اٹھانا اپنے لیے سم قاتل سمجھتے رہے،

سلطان التتمش حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کا مرید تھا، اس کو حضرت خواجہ کے گھر والوں کی عسرت اور تنگی کا حال معلوم ہوا تو اس نے اپنے وزیر کے معرفت کچھ گاؤں کا فرمان لیکر ان کی خدمت میں بھیجا، خواجہ صاحب نے لینے سے انکار کیا اور فرمایا کہ ہمارے خواجگان نے کسی سے گاؤں قبول کیا ہوتا تو ہم بھی قبول کرلیتے، اگر ہم

گاؤں لے لیں تو قیامت کے روز اپنے خواجگان کو کیا منہ دکھائیں گے، سلطان ناصر الدین محمود نے حضرت بابا گنج شکرؒ کی خدمت میں اپنے وزیر الغ خاں کو چار گاؤں کا فرمان اور ایک کثیر رقم بطور ہدیہ دے کر بھیجا، مگر انھوں نے یہ کہکر واپس کر دیا کہ ان کو دوسروں کو ضرورت ہو، اسی طرح ایک بار ان کی خدمت میں اجودھن کے والی نے کچھ گاؤں اور نقد رقم پیش کرنے کی کوشش کی تو فرمایا کہ اگر میں یہ گاؤں اور رقم لے لوں تو مجھے لوگ درویش نہیں کہیں گے، مالدار کہیں گے، اور میرا لقب درویش و میہ دار ہو جائیگا،

اگر اصرار کر کے سلاطین اور امراء کچھ نذرانے ان اکابر صوفیہ کو پیش کرتے تو وہ ایک ہاتھ سے لیکر دوسرے ہاتھ سے مساکین اور غرباء میں تقسیم کر دیتے، سلطان محمد تغلق نے حضرت شیخ قطب الدین منورؒ کے پاس شہزادہ فیروز اور مولانا ضیاء الدین برنی کو ایک لاکھ ٹنکے دے کر بھیجا، انھوں نے اتنی بڑی رقم دیکھکر فرمایا یہ درویش ایک لاکھ ٹنکے لیکر کیا کریگا اور لینے سے انکار کر دیا، شہزادہ فیروز اور مولانا ضیاء الدین برنی سلطان کے پاس واپس گئے، سلطان نے پچاس ہزار ٹنکے دے کر پھر دونوں کو بھیجا لیکن شیخ نے ان کو بھی قبول نہیں کیا، بالآخر دو ہزار ٹنکے بھیجے گئے، لیکن ان کو بھی قبول نہیں کیا، اور فرمایا درویش کے لیے دو سیر کھچڑی اور ایک سیر روغن کافی ہے، لیکن جب اصرار کیا گیا تو انھوں نے دو ہزار کی رقم لے لی، کچھ تو اپنے مرشد حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مزار کے لیے محفوظ رکھی اور بقیہ فقراء میں تقسیم کر دی،

اسی طرح سلطان محمد تغلق نے حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے اخراجات کے لیے ایک پرگنہ کی جاگیر کا فرمان جاری کیا، اور اپنے مقطع کو حکم دیا کہ اگر وہ قبول نہ کریں تو بھی زبردستی دیا جائے، شاہی مقطع کی گلوخلاصی کی خاطر انھوں نے یہ جاگیر قبول کر لی، لیکن فیروز شاہ تغلق کے عہد میں دہلی جاکر یہ فرمان واپس کر دیا کہ یہ ان کے کام کا نہیں، فیروز شاہ تغلق نے حصول برکت کی خاطر کچھ خدمت کرنی چاہی اور ایک بڑی رقم پیش کی، اس کو قبول تو فرمالیا لیکن شاہی دربار سے نکلتے ہی فقراء اور مساکین میں تقسیم کر دیا اور درویشانہ استغنا کے ساتھ خالی ہاتھ وطن کی طرف مراجعت کی،

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کا مطبخ ہمیشہ گرم رہتا، کئی ہزار فقراء اور مساکین ان کے مطبخ میں روزانہ کھانا کھاتے، ان اخراجات کے لیے ان کے یہاں بکثرت نذرانے آتے تھے، لیکن دن کو جو چیزیں خانقاہ میں آتیں شام تک تقسیم کر دیجاتیں، انکی خانقاہ میں دنیاوی ساز وسامان جمع ہوجاتے تو ان کو دیکھ کر ان پر گریہ طاری ہوجاتا، اور اگر کسی وقت کوئی قیمتی چیز بطور تحفہ آجاتی تو اور بھی زیادہ آہ و بکا کرتے اور ہدایت دیتے کہ یہ جلد از جلد فقراء میں تقسیم کر دیجائے اور جب یہ محتاجوں کو پہنچ جاتی تو ان کو اطمینان ہوتا، وہ ہر جمعہ کو تجرید فرماتے، یعنی وہ اپنے تمام حجروں اور انبار خانوں کو یہاں تک خالی کرا دیتے کہ ان میں جھاڑو دیدیجاتی، اس کے بعد جامع مسجد تشریف لے جاتے اور اطمینان سے نماز ادا کرتے، وہ بادشاہوں اور شہزادوں سے تحفے اور ہدیے قبول نہیں کرتے اور کوئی پیش کرتا تو ٹھنڈی آہ بھر کر کہتے کہ یہ لوگ درویشی کو غارت کرتے ہیں،

اکابر صوفیہ کی اولادوں کی روایت شکنی | آگے چل کر ان بزرگوں کی اولادوں اور سجادہ نشینوں میں یہ شان باقی نہیں رہی، سلاطین وقت نے ان کو عہدے دیے تو ان کو قبول کر لیا، اور ان کی خانقاہوں کیلیے جاگیریں عطا کیں تو خوشی سے منظور کر لیں، بلکہ جاگیریں حاصل کرنے کی کوشش کی،

حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے صاحبزادے اور سجادہ نشین شیخ علاء الدین اجودھنی شاہی دربار کی حاضری کو نجس اور پلید سمجھتے رہے، اسی لیے جیسا کہ پہلے ذکر آیا ہے، جب حضرت رکن الدین ملتانیؒ دہلی کے دربار سے واپسی میں اجودھن ان کی ملاقات کو آئے اور ان سے معانقہ کیا تو انھوں نے معانقہ کے بعد غسل کیا تاکہ دربار کی نجاست دور ہوجائے لیکن خود ان کے صاحبزادوں میں شیخ معز الدین اور شیخ علم الدین نے محمد تغلق کے عہد میں عہدے قبول کیے، اول الذکر گجرات کے ناظم ہوئے اور آخر الذکر شیخ الاسلام کے عہدے پر مامور کیے گئے،

حضرت شیخ عبد القدوسؒ کے پوتے ملا عبد النبی اکبر کے زمانہ میں صدر الصدور بننے کو تو بن گئے، لیکن آخر میں اکبر کو ان سے جو اختلاف ہوا تو ان کو قید خانہ میں بند کر دیا، جہاں وہ کر عالم بقا کو سدھار سے، ملا عبد القادر بدایونی کا بیان ہے کہ اکبر نے حضرت غوثؒ گوالیاری کو ایک کرور دہم کی جاگیر دی تھی،

اس لیے ان کے اخراجات بہت تھے، اور وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ شاہانہ کرو فر کے ساتھ سفر کرتے تھے،

حضرت شیخ سلیم چشتیؒ نے راہ سلوک طے کرنے میں بڑی ریاضت کی، اور انتہائی فقر و فاقہ کی زندگی بسر کی، لیکن ان کے معاصر شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ کا بیان ہے کہ آخر میں ان میں بڑی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی، انھوں نے عمارتیں بنوانی شروع کیں، باغ لگوائے اور کنوئیں کھدوائے، اور بعض عادتیں جو شریعت کے خلاف تھیں، عوام کی طرح ان میں بھی پیدا ہو گئیں، یہ تبدیلی شاہی دربار سے تعلقات کے بعد ہوئی، جہانگیر نے ان کی اولادوں کو بھی بڑے بڑے عہدے دینے شروع کیے، ان کے پوتے اسلام خاں فاروقی چشتی کو بنگال کا صوبہ دار مقرر کیا، عجیب و غریب صفات رکھتے تھے، میدان جنگ میں ہاتھی سے لڑ جاتے تھے، اور اس کو زمین پر دے مارتے تھے، خاندانی روایت کے مطابق صوفی بھی تھے، زندگی بھر جوار کی روٹی، ساٹھی کا چاول اور ساگ کھاتے رہے، مذہبی احکام کے بھی بڑے پابند تھے، لیکن امارت آئی، تو لوازم امارت کی خاطر فنون لطیفہ کی بھی سرپرستی کرنے لگے، اور بنگال کے رقص و سرود کے ارباب کمال مثلاً لولی، ہورکنی، کنچنی اور ڈومنی پر نو لاکھ ساٹھ ہزار سالانہ خرچ کیا کرتے تھے،

ہر خانقاہ کے لیے سلاطین نے بڑی بڑی جاگیریں عطا کیں، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کے متولی اور سجادہ نشین اپنے اسلاف کی روایت کے خلاف مالدار، دہہ دار اور جاگیردار بن بیٹھے، اور ان میں نفس کشی کے بجائے نفس پروری، ریاضت و عبادت کے بجائے امارت و جاہ پسندی اور فقر و فاقہ کے بجائے تن آسانی اور راحت پروری آگئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلاطین پہلے ان کی بارگاہ میں جبیں سائی کرتے تھے، لیکن اب وہ خود ان کے فیض و کرم کے زلہ ربا ہو گئے، دارا شکوہ کے پیر ملا جیو اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے کہ جس طرح میں دارا کے حال کی طرف متوجہ رہتا ہوں تم بھی رہا کرو، اگر تم اس کی طرف متوجہ نہ ہوگے تو خدا سے پھر جاؤ گے، وہ اپنے مریدوں سے

دارا شکوہ ہی کی صورت کا مراقبہ کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ آگے چل کر محمد شاہ رنگیلے نے اپنے زمانے میں ایک صوفی شاہ مبارک کو برہان الطریقت کا خطاب دیا، اور ایک دوسرے بزرگ شاہ بدا کو برہان الحقیقت کے لقب سے نوازا، اور شاہ مزکو فصیح البیان کا خطاب دیا۔

آخری دور میں حضرت شاہ کلیم اللہ جہان آبادی، حضرت شاہ نظام الدین اورنگ آبادی اور حضرت شاہ فخر الدین دہلوی جیسے بزرگوں نے صوفیۂ کرام کے استغناء کی عظمت اور توکل کی شان کو برقرار رکھنے کی ضرور کوشش کی، لیکن دنیا دار صوفیہ کی وجہ سے خانقاہوں کی اہمیت بھی جاتی رہی، اور جہاں علم، معرفت، تقوی، دینداری، اخلاص، استغناء، توکل حقوق العباد و حقوق اللہ اور تہذیب نفس کی بہترین تعلیمات حاصل ہوا کرتی تھیں، وہاں معرفت فروشی، مردم فریبی اور تصوف کی دوکان داری ہونے لگی، خواجگان چشت کی تعلیم یہ تھی، کہ سالک تمام دنیاوی آلائشوں سے پاک رہے حتی کہ وہ اپنے رزق سے بھی بے غم رہے، اور اگر اس کے لیے اندوہگیں رہتا ہے، تو وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے، کیونکہ خداوند تعالیٰ خود اس کا رزق اس کے پاس پہنچائے گا، پھر بھی اس کا توکل یہ ہونا چاہیے کہ اس کو جو کچھ بھی ملے راہ خدا میں دیدے، اور اگر رزق جمع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی تمام عنایتوں سے محروم ہو جاتا ہے، حضرت مجدد الف ثانی رحؒ نے اپنے ایک مکتوب میں فرمایا کہ فقیروں پر لازم ہے کہ وہ اپنے کو ہمیشہ ذلیل، محتاج اور مسافر سمجھیں، روتے اور التجا کرتے ہوئے زندگی گذاریں، اور اپنے عیبوں کو دیکھتے، گناہوں کے غلبہ کا مشاہدہ کرتے اور علام الغیوب سے ڈرتے رہیں، اپنی نیکیوں کو تھوڑا سمجھیں اگرچہ بہت ہوں، اور اپنی برائیوں کو بہت خیال کریں، اگرچہ تھوڑی ہوں، اور مخلوق میں مشہور اور مقبول ہونے سے ڈرتے رہیں، لیکن یہ تمام شرائط جاگیردار صوفیہ نے پوری نہیں کیں، اور جن کو جاگیریں نہیں ملیں وہ عملیات، تعویذوں اور گنڈوں کے ذریعہ مشہور ہو کر رزق جمع کرنے کی فکر میں لگے رہے،

ایسے ہی ریاکار صوفیہ کے نمونے دیکھ کر علماء کا ایک گروہ نصرت انکا مخالف بلکہ سلوک تصوف کا بھی نکتہ چیں رہا،

علماء اور صوفیہ | اور یہ عجیب بات ہے کہ تمام اکابر صوفیہ نے علماء ہی کی طرح تعلیم حاصل کی لیکن علماء

اور صوفیہ کی تفریق خوامخواہ پیدا ہوگئی، حضرت بختیار کاکیؒ نے تمام ظاہری علوم کی تعلیم پائی تھی،
حضرت بہاء الدین زکریا سہروردیؒ نے کلام پاک ساتوں قراءتوں کے ساتھ حفظ کیا تھا، اور
پندرہ سال تک خراسان اور بخارا تحصیل علم کرتے رہے، حضرت فریدالدین گنج شکرؒ نے بھی
کلام پاک حفظ کیا، اور فقہ کی کتاب نافع مولانا منہاج الدین ترمذی سے پڑھی، حضرت خواجہ
نظام الدین اولیاؒ راہ سلوک کی ابتدائی منزل میں کسی شرعی مسئلہ پر غور و فکر کر رہے تھے کہ
ایک مجذوب نے آکر کہا کہ مولانا نظام الدین! علم بہت بڑا حجاب ہے، حضرت شیخ نظام الدین اولیا
کے دل میں یہ بات کھٹکی کہ علم حجاب تو ہو سکتا ہے لیکن بڑا حجاب کیونکر ہو سکتا ہے، مجذوب نے کہا،
جب اس جگہ پہونچو گے تو معلوم ہو جائے گا، اس کے بعد حضرت شیخ نظام الدین اپنے مرشد حضرت
فریدالدین گنج شکرؒ کی خدمت میں پہنچے اور مجذوب کی باتیں کہہ سنائیں، حضرت فریدالدین گنج شکرؒ
نے فرمایا کہ حجاب دو قسم کا ہوتا ہے، ایک ظلمانی، دوسرا نورانی، گناہ اور برائیاں ظلمانی حجاب
ہیں، جو شخص ان سے توبہ کرے گا اس کا گناہ معاف کر دیا جائے گا، لیکن علم ایک نورانی
حجاب ہے جس کو ہر شخص نہ عبور کر سکتا ہے اور نہ اس کے کنارے سے اٹھ سکتا ہے جس
وقت تک شرعی علوم میں دستگاہ نہیں ہوگی، خدا کی محبت، معرفت اور قربت حاصل
نہیں ہو سکتی، اس لیے علم ایک بڑا حجاب ہوتا ہے،

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے قدوری، حریری، مشارق الانوار کی باضابطہ
تعلیم پائی، اور جب ان کی دستار فضیلت باندھی گئی تو بدایوں کے علماء اور مشائخ دونوں اس
تقریب میں شریک تھے، ان کا شمار متبحر علماء میں بھی ہوتا رہا، ان کے مرید ان کے علمی تبحر سے

بھی اعتقاد رکھتے تھے، اسی لیے ان کی خانقاہیں رشد و ہدایت کے ساتھ درس و تدریس کا بھی سلسلہ رہتا تھا،

اکابر صوفیہ کی علمی فضیلت کے معترف سب ہی ہوتے، مثلاً مولانا قطب الدین کاشانی دہلی آئے اور حضرت حمید الدین ناگوریؒ کی تصانیف پڑھیں تو اپنے ہمراہی علماء سے کہا کہ اے یارو! جو کچھ ہم نے اور تم نے پڑھا ہے وہ سب ان تصانیف میں موجود ہے، اور جو کچھ نہیں پڑھا ہے وہ علم بھی ان کتابوں میں موجود ہے، اسی طرح حضرت شیخ صدر الدین عارف، حضرت شیخ ابوالفتح رکن الدین، حضرت شیخ برہان الدین غریب، حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ، حضرت شرف الدین احمد منیری، حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت، حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ، حضرت بہاء الدین نقشبندی، حضرت عبد القدوس گنگوہیؒ اور دوسرے اکابر مشائخ کا درجہ علوم ظاہری میں جید علماء سے کم نہیں، لیکن اس حقیقت کے باوجود علماء اور صوفیہ کی تفریق پیدا ہوگئی، اور غلط یا صحیح وہ دو علحدہ علحدہ گروہ سمجھے گئے، اور بڑی چھوٹی بہت سی باتوں پر دونوں میں اختلافات پیدا ہوتے رہے۔

شریعت وطریقت کا جھگڑا علماء کو صوفیہ سے اختلاف کا بڑا سبب یہ تھا کہ وہ برابر ڈرتے رہے کہ کہیں طریقت اور حقیقت کے مسائل و افکار میں شریعت گم ہو کر نہ رہ جائے، حالانکہ جتنے اکابر صوفیہ گذرے ہیں، وہ برابر یہ کہتے رہے کہ جس طرح آفتاب سے نور، جوہر سے عرض اور موصوف سے صفت جدا نہیں ہوسکتی، اسی طرح شریعت حقیقت سے علحدہ نہیں ہوسکتی، خود حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی یہ تعلیم رہی کہ صوری حیثیت سے اخلاق کی تکمیل یہ ہے کہ سالک اپنے ہر کردار میں شریعت کا پابند ہو، جب اس سے کوئی بات خلاف شریعت سرزد نہ ہوگی تو وہ دوسرے مقام پر پہنچے گا، جس کا نام طریقت ہے اور جب اس میں ثابت قدم رہے گا تو معرفت کا درجہ

حاصل کرے گا، اور جب اس میں بھی پورا اترے گا تو حقیقت کا مرتبہ پائے گا، اس کے بعد وہ جو کچھ مانگے گا اس کو ملے گا، اسی لیے خواجہ صاحب نے شریعت کے تمام ارکان اور جزئیات کی پابندی پر بڑا زور دیا ہے، اور یہی مسلک چشتیہ سلسلہ کے تمام بزرگوں کا رہا،

سہروردیہ سلسلہ میں حضرت صدر الدین عارفؒ فرمایا کرتے تھے کہ ایمان کی استقامت کی علامت یہ ہے کہ بندہ اللہ اور رسول کو محبوب رکھے اور محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تمام پیمبروں میں افضل سمجھے، اور جو کچھ آپ نے فرمایا اس کو صحیح اور درست سمجھے، خواہ یہ باتیں عقل میں آئیں یا نہ آئیں اگر نہ آئیں تو بھی ان کو تسلیم کرے تاکہ اعتقاد درست رہے، کیونکہ خود رسول اللہ ؐ نے اللہ کے حکم کو جانا اور اس کی کیفیت کو معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی،

فردوسیہ سلسلہ کے بزرگوں میں حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے اپنے مکتوبات میں فرمایا ہو کہ شریعت کے بغیر راہ سلوک میں قدم رکھنا جہالت اور ہلاکت ہے، شریعت سے طریقت اور طریقت سے حقیقت معلوم ہوتی ہو، ایک سالک کو شریعت سے واقفیت نہیں تو وہ طریقت اور حقیقت سے آگاہی نہیں حاصل کرسکتا ہے، حقیقت بغیر شریعت کے زندقہ اور شریعت بغیر حقیقت کے نفاق ہے،

حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے ہر مکتوب میں مکتوب الیہ کو شریعت کی پابندی کی تعلیم و تلقین کرتے رہے، وہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ صدیقین کی دلی آرزو اور اعلیٰ غرض یہ ہوتی ہو کہ وہ حضرت مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ و السلام کی کمال متابعت سے مشرف ہو جائے، اسکے سوا سب کچھ جھوٹے وہم اور بیہودہ خیالات ہیں، سلام ہو اس شخص پر جس نے ہدایت پائی اور حضرت مصطفیٰ علیہ و آلہ الصلوٰۃ والسلام کی متابعت کو ہمیشہ لازم جانا،

لیکن رفتہ رفتہ صوفیہ میں کچھ ایسا گروہ بھی پیدا ہو گیا جو یہ کہتا کہ ایمان کی علت معرفت ہے۔ اگر معرفت ہو اور طاعت نہ ہو تو اللہ تعالیٰ بندہ سے مواخذہ نہ کرے گا، لیکن طاعت ہو اور معرفت نہ ہو تو بندہ نجات نہیں پائے گا،

کچھ ایسے صوفیہ بھی پیدا ہو گئے جو اپنے کو قلندر کہتے. نماز نہیں پڑھتے اور روزے نہیں رکھتے، انکے ترک فرائض کی یہ تاویل کیجاتی کہ یہ لوگ ایک وقت اور ایک حال میں اسی روح اور جسد کے ساتھ کئی جگہ دکھائی دیتے ہیں، اس لیے ایک جگہ تو بظاہر تارک فرائض نظر آتے ہیں لیکن اسی وقت وہ دوسری جگہ فرض بجا لاتے ہیں، کچھ ایسے صوفیہ بھی ہو گئے جو اپنے کو مجذوب کہتے اور شریعت کی کوئی پابندی نہ کرتے، ان کے بارہ میں کہا جاتا کہ وہ عالم جنون میں رہتے ہیں اور مجنون پر تکلیفات شرعیہ نہیں۔

علماء کی نظروں میں یہ باتیں کھٹکتیں، گو اکابر صوفیہ خود اس کی تردید کرتے رہتے کہ وہ معرفت پسندیدہ نہیں، جس میں طاعت نہ ہو، ان کے نزدیک معرفت شوق اور محبت کا نام ہے، شوق اور محبت کی علامت طاعت ہے، شوق اور محبت جس قدر زیادہ ہوتی جائیگی، اسی قدر فرمان الہٰی کی تعظیم بڑھتی جائے گی، حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے تو ایسے صوفیہ پر لعنت بھیجی ہے، جو یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ حقیقت کا جب کشف ہو جاتا ہے تو پھر شریعت کی ضرورت باقی نہیں رہتی، انھوں نے تو کتاب، سنت اور اجماعِ امت کی تقلید کو ہر حال میں ضروری قرار دیا ہے، اور دوسرے خانوادوں کے بزرگوں کو بھی یہی تعلیم رہی،

لیکن اکابر صوفیہ کے اس مسلک کے باوجود کچھ ریاکار متصوفین ایسے بھی تھے جو نماز کے پابند نہ ہوتے اور کہتے کہ وہ عالم سکرات میں ہیں، عریاں رہتے اور لوگوں کو یقین دلاتے کہ عالم جذب میں ہیں، حسن پرست ہو کر ہوسناک بنجاتے لیکن اعلان کرتے کہ اس طرح ذات الہٰی کی صفتِ جمال کے مشاہدہ میں مشغول ہیں، عشق مجازی کی بوالہوسی میں مبتلا رہتے لیکن عشق حقیقی کا دم بھرتے، گمرہی اور ضلالت اختیار کیے ہوتے، لیکن انا الحق کا نعرہ لگاتے اور دوسروں کو باور کراتے کہ خداوند تعالیٰ کی روح ان میں حلول کر گئی ہے، ٹونے ٹوٹکے اور جادو کرتے لیکن ان کو کشف و کرامات کہتے، ایسے متصوفین نے محض دنیاوی مال و منال اور جاہ و حشمت کی خاطر اپنے کو صوفی ظاہر کر کے تصوف کو بدنام کیا، پاک نہاد صوفیہ بھی ان کو برا سمجھتے لیکن علماء کا ایک گروہ ان ہی کے نمونے دیکھ کر تصوف کا ناقد رہا۔

(باقی)

کچھ مطہر کے بارے میں

از جناب پروفیسر سید حسن صاحب پٹنہ

عہد تغلق کے ایک نیم گمنام مگر اہم فارسی شاعر مولانا مطہر کے بارے میں ابتک تین مقالے لکھے جا چکے ہیں، ایک ڈاکٹر وحید مرزا کا ہے، دوسرا مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم کا، اور تیسرا ڈاکٹر شموئیل اسرائیلی کا، ڈاکٹر وحید مرزا کا مقالہ خاصا بسیط ہے، جو مئی ۱۹۳۵ء کے اورنٹیل کالج میگزین لاہور میں شائع ہوا تھا، فاضل مقالہ نگار کو شاعر کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ[1] دستیاب ہو گیا تھا، مقالہ اسی کی بنیاد پر سپرد قلم ہوا ہے، میگزین کے اڈیٹر نے متفرق تذکروں سے مطہر کے حالات نقل کر کے مقالہ کے شروع میں اضافہ کر دیا ہے اور اگست ۱۹۳۵ء کے شمارے میں ملا محمد صوفی مازندرانی کے تذکرے "بتخانہ"[2] سے مطہر کے بہت سے اشعار نقل کر کے بطور ضمیمۂ مقالہ شائع کر دیے ہیں، مولانا شروانی مرحوم کا مقالہ[3] مطہر کے اُس مخطوطے پر مبنی ہے جو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے کتاب خانے میں دریافت ہوا تھا، یہ انکشاف بھی اسی زمانے میں ہوا جب ڈاکٹر وحید مرزا نے حکیم آشفتہ لکھنوی کے نسخے پر مقالہ لکھا تھا، ڈاکٹر شموئیل[4] اسرائیلی کا مضمون انگریزی زبان میں ہے، اور شاید ابھی تک کہیں شائع نہیں ہوا ہے، راقم الحروف نے اس کی ایک ٹائپ شدہ کاپی دیکھی ہے، یہ بھی علی گڈھ کے نسخے ہی پر مبنی ہے،

تینوں مقالہ نگاروں نے مطہر کے نام، وطن اور حالات زندگی کے بارے میں بڑی کد و کاوش

---

[1] مملوکہ جناب حکیم آشفتہ لکھنوی، نہ معلوم یہ مخطوطہ اب موجود ہے یا نہیں [2] نسخہ مملوکہ بوڈلین لائبریری [3] یہ طویل مقالہ رسالہ معارف کے دو شماروں میں (بابت جولائی اور اگست ۱۹۳۵ء) شائع ہوا [4] ہیڈ شعبۂ فارسی علی گڈھ مسلم یونیورسٹی،

سے جستجو کی ہے، اور تذکرہ نگاروں کے اقوال کے علاوہ خود شاعر کے کلام سے اسکے بارے میں معلومات اخذ کیے ہیں، ان کی تحریروں کا حاصل یہ ہے کہ مطہر کا اصلی نام اور ولدیت، تاریخ ولادت اور زمانۂ وفات کچھ معلوم نہیں ہیں، تذکروں میں بھی اس کا ترجمہ بہت مختصر اور غیر تشفی بخش ہے، ڈاکٹر وحید مرزا کی تحقیق کے مطابق مطہر نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ سلطان فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ھ تا ۷۹۰ھ) کے عہد میں گذارا، اور ایک قصیدہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سلطان فیروز کے بیٹے اور جانشین سلطان ناصر الدین محمد شاہ کے وقت میں بھی موجود تھا، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں، ان کے خیال کے بموجب مطہر کا زمانہ ۷۱۶ھ سے ۷۹۰ھ تک متعین ہوتا ہے یعنی وہ حافظ شیرازی کا ہم عصر تھا۔

جن تذکروں میں مطہر کا کچھ حال ملتا ہے ان میں سب سے قدیم اخبار الاخیار (تذکرہ مصنفین دہلی، از شیخ عبد الحق دہلوی، منتخب التواریخ بدائنی، اور بتخانہ، مولفہ ملا صوفی مازندرانی ہیں، شیخ عبد الحق دہلوی، اور بدایونی نے مطہر کو کڑا کا باشندہ بتایا ہے، اور عبد اللطیف بن عبد اللہ عباسی ساکن احمد آباد گجرات نے جس نے بتخانہ میں اضافے اور اس کے شروع میں شعراء کے تراجم شامل کیے، لکھا ہے کہ مطہر باہر سے ہندوستان آیا تھا، اس اختلاف کی بنا پر تینوں مذکورۂ صدر فاضل مقالہ نگاروں نے حقیقت کی جستجو کی ہے، لیکن تینوں اپنے اپنے طور پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مطہر ہندوستان کا باشندہ تھا، راقم السطور کا خیال ہے کہ مطہر کے وطن کے بارے میں تینوں مقالہ نگاروں کا فیصلہ غلط فہمی پر مبنی ہے، اس سلسلہ میں عبد اللطیف عباسی کا یہ قول بہت اہم ہے کہ

"از اقوالش ظاہر میشود کہ بہند[1] آمدہ و مداح سلطان فیروز شاہ وا عیان دولت او بودہ عمرش بمنزل ثمانین رسیدہ بود[2]"

---

[1] منقول از اورنٹیل کالج میگزین، معلوم ہوتا ہے کہ نقل کرنے میں یہاں کچھ حذف ہو گیا ہے، ممکن ہے کہ اس طرح ہو "از ایران بہند آمدہ" [2] نقل از اورنٹیل کالج میگزین بابت مئی ۱۹۳۵ء ص ۱۱۳

افسوس ہے کہ تینوں مقالہ نگاروں کو مظہر کا کوئی ایسا شعر و دیوان میں نہ ملا جس سے اس معاملہ پر روشنی پڑتی، معلوم ہوتا ہے کہ مظہر کے کلام کا وہ حصہ جس میں اس نے اپنے وطن کی طرف اشارہ کیا ہوگا، دیوان سے غائب ہوگیا ہے۔ اخبار الاخیار، تذکرۂ مصنفین دہلی، منتخب التواریخ اور احوال الشعراء مولفہ عباسی تینوں تقریباً ایک ہی عہد کی تالیفات ہیں، اسی زمانے کا ایک اور اہم تذکرہ عرفات العاشقین مولفہ تقی اوحدی بھی ہے، یہ تذکرہ تینوں مقالہ نگاروں میں سے کسی کی نظر سے نہیں گذرا ہے۔ عرفات میں مظہر کا دو جگہ ذکر آیا ہے، ایک جگہ "مولانا مظہر" اور دوسری جگہ "قاضی مظہر کڑہ" کا عنوان دیا گیا ہے لیکن آخر میں یہ بھی بتا دیا ہے کہ طرز اشعار دونوں کے یکساں ہیں، عرفات کے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

" مولانا مظہر: از افاضل زمان وسخنوران کامل بیانست، او مدح بادشاہان ہند و گجرات، قریب ہشت ہزار بیت دیدم طبعی بامزہ وشعری ہموار وسلیس دارد، قالی (کذا) گویند اصلش از ایرانست"۔

اس کے بعد اشعار کا انتخاب ہے، پھر یہ عبارت ملتی ہے:۔

" در نسخہ ای[1] ہفت ہشت قصیدہ از قاضی مظہر کڑہ بنظر مخلص رسید کہ مداح فیروز شاہ بودہ و مدح عین الملک منز نمودہ و برغم الکثروی غیر مظہر گجراتی مذکور است، اگرچہ طرز یکیست۔ واللہ اعلم"۔

اس کے بعد پھر اشعار نقل ہوئے ہیں،

تقی اوحدی کے بیانات سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ مظہر کے دیوان میں

---

[1] علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری کے شعبۂ مخطوطات میں ایک اور نسخہ قصائد مظہر کا ہے جس میں تقریباً ل تعداد میں قصیدے ہیں، کیا عجب ہو کہ یہ وہی نسخہ ہو جسے اوحدی نے دیکھا تھا،

تقریباً آٹھ ہزار ابیات تھے، حکیم آشفتہ لکھنوی کا نسخہ ناقص ہے، اس میں صرف دو ہزار سے کچھ فاضل اشعار ہیں، مخطوطہ علی گڈھ میں بھی تقریباً ساڑھے پانچ ہزار ابیات ہیں تبخانہ میں اشعار کا انتخاب ہے، اس لیے ایسے اشعار جن میں مظہر نے اپنے وطن کا نام لیا ہوگا، یقیناً مفقود ہو چکے ہیں۔ دوسرے یہ کہ تقی اوحدی کے زمانے میں یہ بات مشہور تھی کہ مظہر ایرانی الاصل ہے، تذکرہ مجمع الفصحا میں عرفات کی تقلید کی گئی ہے۔ اور اوحدی کے اقوال کو دوسرے الفاظ میں نقل کر دیا گیا ہے، احوال الشعراء اور عرفات کے بیانات کو رد کر کے یہ فیصلہ کر دینا کہ مظہر کا وطن اصلی کڑا تھا، اور وہ ہندوستانی نژاد تھا، کچھ مناسب نہیں ہے۔ ہم لوگوں کے اعتبار سے مولفین عرفات و احوال الشعراء یقیناً دور مظہر سے قریب تر تھے اور ان کے پاس رائے قائم کرنے کے لیے بہتر مواد موجود تھا یعنی خود شاعر کا مکمل دیوان۔ مجمع النفائس اور مخزن الغرائب کے مولفین نے بھی وطن کے بارے میں کوئی قطعی بات نہیں لکھی ہے، البتہ صبح گلشن میں اس کو سید سے متوطن شہر کڑا لکھ دیا گیا ہے، مولف نزہتہ الخواطر نے بھی اس کے حوالے سے یہی بات لکھ دی ہے، اور نیشل کالج میگزین کے ایڈیٹر نے بھی مظہر کے ہندی الاصل ہونے میں شبہ ظاہر کیا ہے، ڈاکٹر شمعون اسرائیلی صاحب نے بدا ؤنی کی اس عبارت " دیگر مولانا مظہر کڑہ است کہ اولادش حالا در بلدہ لکھنؤ ساکن اند وآبا عن جد معزز و محترم آمدہ اند۔" سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ خود مظہر کے آبا و اجداد معزز و محترم رہے ہیں، حالانکہ یہاں مقصد مظہر کی اولاد سے ہے، مظہر اور بدا ؤنی کے درمیان تقریباً تین سو سال کا فرق ہے یعنی اولاد مظہر کی کئی نسلیں گذر چکی ہوں گی،

کچھ عرصہ ہوا ایک ایسی تحریر پڑھنے کا اتفاق ہوا جس سے مظہر کے نام و وطن کے متعلق مزید تفتیش و تحقیق کی راہ نکل آئی ہے، تقریباً بیس سال ہوئے ڈاکٹر قاسم غنی نے عصر حافظ پر ایک معرکۃ الآرا کتاب لکھی ہے[۱]، جس میں اس موضوع پر نہایت دقت نظر اور ہوشمندی کے سا

---

[۱] بحث در آثار و افکار و احوال حافظ جلد اول، تاریخ عصر حافظ از دکتر قاسم غنی تہران ۱۳۲۱ھ شمسی

عالمانہ تبصرہ اور اس ضمن میں حافظ کے معاصرین کا بھی تذکرہ کیا ہے، اس کتاب کے صفحات ۲۳۰ تا ۲۳۴ کے حاشیے میں ایک شاعر عزالدین مطہر کا بھی ذکر کیا گیا ہے، تاج الدین احمد وزیر نے ۷۸۲ھ میں ایک جُنگ (بیاض) مرتب کی تھی جس میں اس نے اپنے ہمعصر متعدد علماء وفضلا سے خود ان کے ہاتھوں سے کچھ لکھنے کی فرمائش کی تھی، اس جُنگ کا ایک نسخہ اصفہان کے میونسپل (شہرداری) کتاب خانے میں محفوظ ہے، اس کے چودہ صفحے عزالدین مطہر مذکور کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے ہیں، عزالدین مطہر شاہ شجاع (۷۵۹ھ تا ۷۸۶ھ) فرمانروائے شیراز وکرمان ویزد کے ہمزمان شعراء وفضلا میں شمار ہوتا تھا، ان چودہ صفحوں میں مطہر کے قصائد، غزلیں اور رباعیاں درج ہیں شروع صفحے پر یہ عبارت تحریر ہے:-

"مما افصح عن لطائف المرتضی الاعظم صاحب جوامع الکلم فی نوابغ الحکم عزالملّة والدین مطہر اعلی اللہ شانہ"

اور اس حصے کے آخر میں یہ عبارت لکھی ہوئی ہے:-

"حررہ العبد الاضعف افقر عباد اللہ الغنی مطہر بن عبداللہ بن علی الحسنی، احسن اللہ حالہ وحقق آمالہ تذکرة لصاحبہ الصاحب الاعظم مستجمع مکارم الاخلاق ومحاسن الشیم خواجہ تاج الدولہ والدین احمد عظم اللہ قدرہ فی منتصف رجب المرجب لسنة اثنی وثمانین وسبعمائة حامداً ومصلیاً لرسولہ"

اس بیاض سے ڈاکٹر قاسم غنی نے مطہر کا ایک طویل قصیدہ نقل کیا ہے جو شاہ شجاع کی مدح میں لکھا گیا ہے، قصیدہ کے ابتدائی اشعار یہ ہیں:-

حذر کن ای دل از آسیب روزگار حذر کہ چرخ شعبدہ باز است ودہر حیلت گر

بہیچ وجہ مبین مہر این سپہر دو روی
بہیچ باب منہ دل درین سرای دو در

طمع مکن گہر خوشدلی در پیروزی
کہ ہست طارم پیروزہ نیک بدگوہر

ز ہیچ خشک و تر اندر ترازوی خرد است
جہان دہر چہ بود در جہان چہ خشک و چہ تر

بہست دو شقا خاتم بقا مسپار
بپای یک ہوس شہرزہ جوا مسپر

چو جان ثبات ندارد ز بند جان پرہیز
جہان چو میگذرد از سر جہان بگذر

متاع عمر گرانمایہ رایگان مفروش
برای سود و زیان عشوہ سپہر مخر

چو یادگار بشر نیست در جہان جز نام
بخیر کوش کہ نامت بخیر بہ کہ بشر

مدح کے اشعار ملاحظہ ہوں :-

ستودہ داور دوران خدیو دارارای
خجستہ خسرو عادل دل سکندر در

جہان پناہ فلک جاہ خسروی کہ گرفت
فلک ز فرش قدر و جہان ز قدرش فر

بعقل تابع حکم خدا و دین رسول
بفضل جامع علم علی و عدل عمر

جلال دنیی و دین زیب ملک شاہ شجاع
ابوالفوارس غازی پناہ فتح و ظفر

زہی ضمیر تو در پردۂ قضا رہبر
دل منیر تو از سر غیب دادہ خبر

شدہ عبارت تو از معاطر اقلام
فریب عارض دلدار و طرۂ دلبر

بحسن صورت لفظ تو زینت معنی
بلطف شیوہ خط تو زیور دفتر

بیاض معنی بکر از سواد خط خوشت
چو نور ایمان تابندہ از دل کافر

آخر قصیدہ کے چند اشعار یہ ہیں :-

جہان پناہا در مدح ذات طاہر تو
شدست شعر مظہر ز آب خضر اطہر

دلی چو مہر ضمیرت شعاع علم زند
کجا فروغ دہد نور ذرۂ احقر

مظہرا چو بعجز اعتراف بنمودی | رُخ نیاز سوی قبلۂ دعا آور
ہمیشہ تاکہ بود مجمع ستارہ سپہر | مدام تاکہ بود مطلع خورشید خاور
در تو مطلع خورشید سلطنت بادا | سپہر باد ترا چاکر و ستارہ حشر

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا عزالدین مظہر بن عبداللہ مادح شاہ شجاع وہی مظہر ہے جو ہندوستان کے فرمانروا سلطان فیروز شاہ تغلق کا مدیح نگار رہا ہے، اور جس کو بعض تذکرہ نگاروں نے کڑا کا باشندہ بتایا ہے۔ راقم الحروف کا قیاس ہے کہ دونوں مظہر ایک ہی شخص ہیں ورنہ ایک ہی زمانے میں ہندوستان و ایران میں ایک ہی تخلص کے دو شاعر اور قصیدہ نگار کا موجود ہونا بہت ہی عجیب و غریب بات ہے، تذکرہ نگاروں نے مظہر کا صرف تخلص لکھا ہے نام نہیں بتایا ہے۔ جُنگ مذکور میں اس کا نام عزالدین لکھا ہے۔ مآثر الامرا اور تاریخ فرشتہ میں عہد فیروز شاہ کے ایک شاعر عزالدین کا نام لیا گیا ہے، جس نے نگرکوٹ کی فتح کے موقع پر بعض سنسکرت کی کتابوں کا نظم میں ترجمہ کرکے سلطان فیروز شاہ کو پیش کیا تھا، گمان ہوتا ہے کہ یہ وہی عزالدین شاعر ہے جس کا تخلص مظہر ہے، مظہر کا ایک قصیدہ بھی موجود ہے جو اس نے اسی فتح کی تہنیت میں لکھا تھا،

مظہر ہندوستان کب آیا؟ اس سوال کا جواب قطعی طور پر دینا محال ہے، مظہر نے سلطان فیروز شاہ کی مہم جاجنگر کا حال ایک قصیدہ میں لکھا ہے، یہ مہم ۷۶۱ھ میں انجام پائی تھی، اور نگرکوٹ کی فتح ۷۶۲–۷۶۳ھ میں حاصل ہوئی، اس کا مطلب یہ ہے کہ مظہر ان ایام میں ہندوستان میں موجود تھا، ایک قصیدہ میں ۷۷۰ھ کا ذکر ہے،

ترا بہفصد و ہفتاد ہجر مدت عمر | چو عمر نوح نبی باد ہفصد و پنجاہ

تاج الدین احمد وزیر کے جُنگ کی کتابت ۷۷۳ھ میں ہوئی، اس میں جو عربی عبارت

مطہر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے، وہ بھی اسی سال کی ہے، جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ اس زمانے میں ایران میں تھا، اس سے مطہر کے معاملے کی پیچیدگی میں اضافہ ہو جاتا ہے، اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ مطہر کی ایران و ہندوستان میں آمد و رفت رہی ہے تو یہ گتھی بھی بہت حد تک سلجھ جاتی ہے، شاہ شجاع کا انتقال ۷۸۶ھ میں ہوا، قیاس ہے کہ اس کے بعد مطہر ایران کی سکونت آخری بار ترک کر کے ہندوستان چلا آیا اور سندھ کے راستے سے ہو کر گجرات میں اقامت پذیر ہو گیا، عہد قدیم میں ایران و ہندوستان کے درمیان آمد و رفت اسی راستے سے ہوا کرتی تھی، احمد آباد اور گجرات میں مطہر کے دیوان کا دستیاب ہونا اسی امر کا ثبوت ہے، چنانچہ سراج الدین علی خاں آرزو نے مجمع النفائس میں مطہر کو گجراتی ہی لکھا ہے، ریاض الشعراء میں بھی واضح طور سے بیان کیا گیا ہے کہ "از ایران آمدہ گجرات توطن نمود" اور قرائن بھی کہتے ہیں کہ یہی درست ہے، تاریخ فرشتہ میں عزالدین کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ اس نے بعض پرانی سنسکرت کتابوں کا فارسی نظم میں ترجمہ کر کے سلطان فیروز شاہ کی خدمت میں پیش کیا، ممکن ہے کہ مطہر نے گجرات میں اقامت کے دوران میں سنسکرت سیکھی ہو، جس طرح ابوریحان البیرونی نے سیکھی تھی، یا ان کتابوں کا کسی سے ترجمہ کرا کے سنا ہو، اور ان مطالب کو فارسی میں نظم کر دیا ہو۔

چند اور چیزیں بھی ہیں جو مطہر ایرانی اور مطہر ہندوستانی کو ایک ہی شخص ماننے میں ہماری مدد کرتی ہیں۔

ڈاکٹر قاسم غنی نے عزالدین مطہر کو شاہ شجاع کے عہد کے ممتاز شعراء و فضلاء میں شمار کیا ہے، تاج الدین احمد وزیر نے اپنے جنگ میں مطہر کے لیے جو القاب استعمال کیے ہیں، ان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مطہر ہندی کو بھی اپنے علم و فضل پر ناز ہے، اور وہ بار بار اسکا تذکرہ کرتا ہے،

گفتا باز ہنر چہ وسیلت بود ترا کاندر زمانہ نادرۂ در جمیع باب

در شعر و در بدیہہ و در وعظ و در مثل
در رمز و در لطیفہ و در خط و در کتاب

در علم و فضل نیست چو من مفتی و حکیم
در نظم و نثر نیست چو من شاعر و دبیر

مظہر کے قصیدوں سے بھی اس کے علم و فضل کا اظہار ہوتا ہے۔

دوسری قابل توجہ بات مظہر کی طویل عمری ہے، عبد اللطیف عباسی نے اس کا سن تقریباً اسی سال بتایا ہے، لیکن خود مظہر نے اپنے کو پیر صد سالہ لکھا ہے:

ساقیا جام ارغوانی دہ
وز میم عمر جاودانی دہ

پس بجام دوزاں سالہ مدام
"پیر صد سالہ" را جوانی دہ

تا دو دنا توانی از تن ما
بادہ چنداں کہ میتوانی دہ

مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم کی تحقیق کے مطابق مظہر کا سال ولادت ۷۱۶ھ قرار پاتا ہے، اس اعتبار سے اس کی وفات ۸۱۶ھ کے قریب ہوئی ہوگی، اگر عز الدین مظہر شاہ شجاع کی وفات کے بعد ہندوستان چلا آیا تو اس کو یہاں مستقل طور پر تیس سال تک رہنے کا موقع ملا، کسی غیر ملک کو اپنا وطن بنانے کے لیے اتنی مدت کافی ہے، اسی عرصے میں وہ شمالی ہند کو منتقل ہو گیا ہوگا اور کڑا میں بود و باش اختیار کرلی ہوگی۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تقی اوحدی نے مظہر کو قاضی مظہر لکھا ہے۔ "مجمع الفصحاء" میں بھی اسے "قاضی آگرہ" بتایا گیا ہے، عین ممکن ہے کہ مظہر کے علم و فضل کے پیش نظر اسے عہدۂ قضا پر مامور کیا گیا ہو اور وہ اسی سلسلے سے کڑا اور آگرہ چلا آیا اور یہاں سکونت اختیار کرلی۔

مظہر کے جو اشعار اورینٹل کالج میگزین اور مولانا شروانی مرحوم کے مقالے میں نقل ہوئے ہیں ان کے بغور مطالعہ سے شاعر کے حالات و شاعری کے متعلق بعض نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

مظہر نے بتایا ہے کہ وہ کسی وقت صاحب مال و منال تھا، لیکن دولت سے زیادہ

علم کا دلدادہ تھا، امراء و رؤسا اس کی ملاقات وندیمی کے آرزومند تھے اور اس سے دربار داری کرانا چاہتے تھے،

گفتم ای دوست خبریافتہ باشی کہ مرا بود جمعیت حالی و منالی موفور ...

عشق من کنج وکتابی بد و مخدومان را میل بہ مدح وندیمی وملاقات وحضور

ان مخدوموں کی خواہش پوری کرنے میں اس کے محبوب شغلے میں خلل کا اندیشہ تھا، اور اگر توجہ نہ کرتا تو دولت کے نقصان کا خطرہ تھا، اس لیے مظہر سخت خلجان میں مبتلا تھا، اسے یہ فکر دامنگیر تھی کہ وہ ایسی جگہ توطن اختیار کرے جہاں کا فرمانروا رافت وکرم میں مشہور ہو،

گر مراعات کنم علم وعمل راست خلل ور رعایت نکنم دہ و درم راست فتور

لاجرم خواستم از بہر نشستن جایی کہ بود والی آنجای برافت مذکور

کیا عجب ہے کہ اسی احساس و خواہش نے اسے ترک وطن پر مجبور کیا ہو،

مظہر کو اپنے حسب ونسب کا بھی تفاخر ہے،

آنکہ دارد حسبی تازہ تر از سرو چمن وانکہ دارد نسبی پاک تر از ماء طہور

تاج الدین وزیر کے جُنگ میں بھی مظہر نے اپنا نسب حسنی بتایا ہے، اور مولف جنگ نے اسے عز الملت والدین کا لقب عطا کیا ہے،

اسی قصیدے میں ایک ایسا شعر ہے جس میں مظہر نے غالباً اپنے وطن کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن افسوس ہے کہ اس کا دوسرا مصرع دیوان کے تینوں نسخوں میں ناقص نقل ہوا ہے، وہ شعر یہ ہے:-

بحت میمونت بلند است کہ آورد مرا در جناب تو جدا کردہ ز جیدان ...

ایک قصیدے کے بعض اشعار سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مظہر ہندوستان میں تنہا تھا اور

اعزہ و احباب کی جدائی میں دن رات بیقرار، بے خواب اور اشکبار رہتا تھا :

دلی مباد کہ افتد چو من کسی تنہا — درایں چنین قفسی از دیار و از احباب

کہ باشد از غم یاران ہمیشہ دباران — چو برق سینہ پر آتش چو ابر دیدہ پر آب

نہ در روانش سکونی بود نہ در دل صبر — نہ روز ہاش قراری زغم نہ شبہا خواب

گہی چو رعد بنالد ز درد تنہائی — گہی چو سیل براند ز چشمہا خون ناب

گمان یہ ہوتا ہے کہ ابتدا میں مظہر تنہا ہندوستان آیا تھا، پھر یہاں مستقل طور پر سکونت اختیار کرنے کے بعد اپنے اعزہ و اقارب کو اپنے پاس بلا لیا تھا، چنانچہ اس نے ناصر الدین محمد شاہ (جانشین سلطان فیروز تغلق) سے یہ درخواست کی کہ سابق سلطان نے جو جاگیر اسے عطا کی تھی وہ اس کی اولاد کے نام سے منتقل کر دیجائے، کیونکہ شاعر اب ضعیف و ناتواں ہو چکا ہے، رنج و ریاضت کے قابل نہیں رہا، سلطان ناصر الدین محمد شاہ ۷۹۹ھ میں تخت نشین ہوا، یہ درخواست یقیناً اسی زمانے میں یا اس کے بعد کی ہوگی، یعنی اس زمانے میں جب مظہر شاہ شجاع کی تحت سے معزولی یا موت کے بعد ہندوستان آکر کئی سال سے یہاں مقیم رہ چکا تھا،

مظہر نے اپنی شاعری کے ساتھ اپنی نثر نگاری کا بھی تذکرہ کیا ہے،

درعلم و فضل نیست چو من مفتی و حکیم — درنظم و نثر نیست چو من شاعر و دبیر

مظہر کا دیوان اشعار نامکمل و کمیاب ہی سہی دنیا میں موجود تو ہے، تذکروں میں بھی اسکے اشعار نقل ہوئے ہیں، لیکن اس کی تالیفات نثر کا کچھ پتہ نہیں چلتا، تاج الدین احمد وزیر کے جنگ میں مولف نے مظہر کو صاحب "جوامع الکلم فی نوابغ الحکم" لکھا ہے، کیا عجب ہے کہ یہ مظہر کی نثری تالیف ہو،

مظہر کے اشعار کا مطالعہ کرنے سے اس کا ایک وصف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک اچھا

شعر میں پے درپے ایسے الفاظ استعمال کرنا جن کے حروف آغاز ایک ہی ہوں، انگریزی علم بیان وبدیع میں یہ صفت صنعت لفظی میں شمار ہوتی ہے، اور اس کا نام "تجانس حرفی" (Alliteration) ہے، ہندی شاعری کی بھی یہ ایک عام اور مرغوب صنعت ہے، اس سے شعر میں ایک خاص صوتی اثر پیدا ہوتا ہے، جو قاری یا سامع کو فوراً اپنی طرف متوجہ کرلیتا ہے، مظہر کے کلام میں ایسے اشعار کثیر تعداد میں موجود ہیں، چند نمونے ملاحظہ ہوں،

'سین' سے شروع ہونے والے الفاظ :

سنگیں دلی سہا دہنی سرو قامتی — سیمیں تنی ستارہ جبینی ستمگری

سکندر و جم و سلمت و سنجر و سہراب — سفندیار و سیاوش و سام و رستم و زال

بر سماکیں سر و بر سمک لا رضش ساق — خود جہاں جای ندیست کسی در آفاق

سمی ساق ترکی کہ ہندوی چشمش — سیہ سرمہ دارد کہ از سحر مائل

ابتدا میں 'م' رکھنے والے الفاظ :

مقام و مفرش و مجمر و میوہ — مصاحب می و معشوق و مطرب مزمار

'ک' ہر کمندی کہ ز فتراک کمیں بکشاید — کمترین صید بہ دگردون اختر گیرند

'د' زینہار از دو دل دہر فریبی نخوری — کہ شکر در دہن و دست بخنجر دارد

چند اور نمونے :

زیر ہر صفہ و ہر سقف سرای دگر است — پیش ہر ساحت و ہر صحن فضای دگر است

ہمہ از سنگ رخام است و ستونہای رواق — ہمہ از مرمر صافیست ستون برافراق

ساقیا شبگیر شد شمع شبستانی بیار — بزم روحانی بنا کن جام ریحانی بیار

مرا چون بوی تو یابم بہار نبود درست — مرا چون روی تو بینم بہشت نایدکار

بہر لطیفہ لطیف و نو بدیسہ یابدین   گرد زسرو قد زمن میان و سیمتن

از کام جو بی نیک نہاد نوای نیل   واندر دہان پیشہ نگنجد نوای پیل

شاہ شجاع کی مدح میں جو قصیدہ لکھا گیا ہے، اس میں بھی متعدد اشعار ایسے ہیں جو اپنی

خصوصیت کے حامل ہیں، ملاحظہ ہوں :-

نسیم لطف تو پیرایۂ نعیم بہشت   سموم قہر تو سرمایۂ عتاب سقر

رواں بجسم جاں بخش تست راحت روح   چنانکہ بر ورق گل وزد نسیم سحر

ز سہم تیر تو بشکستہ دست چرخ کماں   ز تاب تیغ تو افگندہ آفتاب سپر

ستودہ داور دوران خدیو دارا رای   خجستہ خسروی عادل دل سکندر در

بعقل تابع حکم خدا و دین رسول   بفضل جامع علم علی و عدل عمر

تذکرۂ میخانہ سے مطہر کے جو اشعار اورینٹل کالج میگزین میں نقل ہوئے ہیں

ان میں ایک یہ شعر بھی ہے،

آغاز شد ز ظلمت شب روشنی روز   زاں ساں کہ نور مومنی از جان کافری

شاہ شجاع کی تعریف میں عزالدین مطہر کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو :

بیاض معنی بکر از سواد خط خوشت   چو نور ایمان تابندہ از دل کافر

دونوں اشعار کے مصراع ثانی کا مضمون توارد کے زمرے میں نہیں آسکتا، کیونکہ دونوں

مصرعوں کا کہنے والا ایک ہی ہے،

مذکورہ بالا معروضات کا خلاصہ یہ ہے کہ مطہر کا نام عزالدین تھا، اور اس کا باپ

عبد اللہ تھا، جس کا سلسلہ سادات حسنی سے ملتا ہے، مطہر ایرانی الاصل تھا، ایران سے

ہندوستان میں اس کی آمد و رفت تھی، ایران میں شاہ شجاع کا مدح نگار رہا،

ہندوستان آکر سلطان فیروز شاہ تغلق اور اس کے اعیان سلطنت کی مدح سرائی کی، شاہ شجاع کی معزولی یا موت کے بعد اس نے ترکِ وطن کر کے ہندوستان میں مستقل اقامت اختیار کر لی اور یہیں تقریباً ۸۱۶ھ میں وفات پائی،

اس کے اشعار کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صبح کا جلوہ اور مناظر سحر اس کے لیے خاص کشش رکھتے تھے، چنانچہ وہ بار بار اپنے قصیدوں کی تشبیب اور غزلوں میں مناظرِ صبح کی نقشہ کشی کرتا ہے، چند اشعار جن میں صبح کا سماں کھینچا یا اس کا ذکر کیا ہے، بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:-

صبح چون رایت سیمین سحر بر گیرند　　　طاس مہ بر علم خسرو خاور گیرند
مجلسی خوبتر از جنت فردوس کنند　　　بادهٔ صاف تر از چشمهٔ کوثر گیرند

بامدادان کہ بیفگند ہوا پردهٔ قار　　　شاہد صبح بیند و دلبرخی رخسار
آسمان نامهٔ اعمال زمین کرد سپید　　　شب تو گوئی کہ گنہ بود و سحر استغفار

چون برآورد شہنشاہ فلک رایت نور　　　شد طراز علمش طلعت شعری عبور
صبح بر ظلمت شب تاخت بشمشیر چنانک　　　فوج اسلام کند لشکر ہند و مقہور

بامدادان کہ منادی سحر در دیجور　　　ریخت بر مشک سیہ گرد سپید از کافور
آسمان دانهٔ انجم چو فرو ریخت بخاک　　　غلغلی در چمن افتاد ز آواز طیور

ای باد صبحدم نفسی مشکناب ده　　　وز بوی جانفزات نسیم گلاب ده

میزند صبح سمن بوی دم از دلداری　　　میکند رنگ ریاحین چمن عطاری
در چنین صبح دلاویز دم جان پرور　　　کو گہ عیش و نشاطست و گہ میخواری
وقت سحر کہ زہرہ چو دوشیزہ دختری　　　بنمود رخ ز گوشهٔ گل بستہ چادری

آغاز شب ز ظلمت شب روشنی دود — زان سان کہ نور مومنی الجان کا وری

سحر گاہ است و ز مشرق ہمہ انوار می بارد — ز شبنم در سر گلہا در شہوار می بارد

صبح شد سر ز خواب بر گیرید — دور جام شراب بر گیرید

صبح گاہ است سر از خواب گران بردارید — بادہ خوابیدہ ز دل در دہان بردارید

صبحدم غالیہ سائیست صبا عنبر بیز — ابر کافور فشاں خاک چمن مشک آمیز

آغاز صبح و وقت صبوحست ای غلام — اینک ستارۂ سحری بر کنار بام

صبح چوں بنمود رخ شادی ز سر باید گرفت — مجلس نو دیگر و بزم دگر باید گرفت

ساغری از حوض کوثر صاف تر باید کشید — دلبری از حور عین پاکیزہ تر باید گرفت

وقت صبحست صبوح می و مزمار کنید — بزم سازید و حریفاں ہمہ بیدار کنید

صبح در ز آسمان کشود اینک — دولت و بخت او نمود اینک

دل صبح و سینۂ ساغر — ایں چہ صدق و صفاست می بینی

صبح شد پردہا بر اندازید — بزم را نقش دیگر اندازید

مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم نے اپنے مقالے میں ان کتابوں کی ایک فہرست دی ہے، جو مظہر کے مطالعے میں رہی ہیں۔ اس فہرست میں دو اور ناموں کا اضافہ کیا جائے:

عوارف المعارف اور فصوص الحکم

ز عرفان عوارف و وجدان نصوص
ز وعظ و نصائح کتاب سری

خیام کا قدیم ترین تذکرہ

از
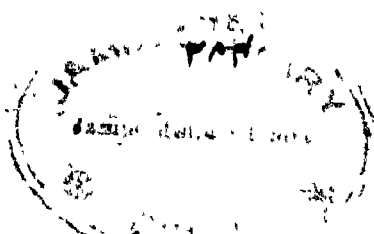
جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے، ایل ایل بی، بی ٹی ایچ، رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اترپردیش

روسی مستشرق ژوکوسکی (Zhukovski) نے ۱۸۹۷ء میں دیگر رفقا کے ساتھ اپنے استاد وکٹر روزن (Victor Rozen) کی پروفیسری کی بست و پنج سالہ یادگار کے موقع پر Presentation Volume میں جو مقالہ لکھا تھا اس میں خیام کے حالات زندگی تمام قابل رسائی ماخذوں سے تاریخی ترتیب کے ساتھ نقل کیے ہیں، اس مقالہ کی رو سے قدیم ترین کتاب جس میں خیام کا حال دستیاب ہوا تھا، شمس الدین محمد بن محمود الشہرزوری کی "نزہۃ الارواح و روضۃ الافراح" ہے، جس کا زمانۂ تصنیف حسب تحقیق ڈاکٹر سخاؤ مرتب الآثار الباقیہ ۵۸۶ھ اور ۶۱۱ھ کے درمیان ہے،

لیکن ۱۹۰۶ء میں پروفیسر اڈورڈ براؤن نے اس رائے سے اختلاف کیا اور لٹریری ہسٹری آف پرشیا کی دوسری جلد میں لکھا کہ قدیم ترین کتاب جس میں خیام کا ذکر ملتا ہے نظامی عروضی سمرقندی کا "چہار مقالہ" ہے، ۱۹۱۰ء میں علامہ مرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی نے اس رائے کی تائید کرتے ہوئے لکھا:

"مقالہ سوم بواسطہ اشتمال آں بر بعضے معلومات درخصوص خیام ..... واراے اہمیت مخصوص است، زیرا کہ چہار مقالہ اولین کتابے است کہ ذکرے از عمر خیام در آں شدہ و از آنکہ مصنف خود معاصر او بودہ و با وے ملاقات نمودہ است" (مقدمہ صفحہ)

مگر حال ہی میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے اعزازی پروفیسر فارسی ڈاکٹر قاری کلیم اللہ حسینی نے

اس رائے کی صحت پر اعتراض کیا ہے، آخر ۱۹۵۹ء میں علی گڑھ میں جو آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کا دوسرا اجتماع ہوا تھا اس کے لیے قاری صاحب نے ایک مقالہ مرتب کیا جس کا عنوان ہے "The Tatimmah Suwanul Hikmah of Zahiruddin Abdul Hasan Al-Bayhaqi" اس کے خلاصہ میں لکھا ہے :-

"تتمہ میں عمر خیام کے جو حالات ہیں وہ قدیم ترین ہیں، میری اس نئی دریافت سے پہلے تک نظامی سمرقندی کے چہار مقالہ کے متعلق شہرت تھی کہ وہ عمر خیام کے حالات میں قدیم ترین ذریعۂ معلومات ہے۔" (Summary of paper P. 13)

کچھ دن بعد "اسلامک کلچر" (جنوری، اپریل ۱۹۶۰ء) کے اندر ڈاکٹر صاحب نے "ظہیر الدین البیہقی کی عربی و فارسی ادب میں خدمات" کے عنوان سے جو مقالہ لکھا اس میں مذکورۂ بالا دعوے کا اعادہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا :

"اس نئی دریافت سے پہلے تک نظامی عروضی سمرقندی کے چہار مقالہ میں عمر خیام کے حالات سب سے قدیم ترین تھے، پروفیسر ای۔ جی۔ براؤن نے لٹریری ہسٹری آف پرشیا (ایران کی علمی تاریخ) اور علامہ مرزا محمد قزوینی نے چہار مقالہ کے مقدمہ میں یہی لکھا ہے، علامہ کا یہ خیال ہے کہ چہار مقالہ میں خیام کے حالات اس کتاب کی ایک اہم جز ہے ...... لیکن یورپ کے کتب خانوں کی چھان بین میں جب ابو الحسن بیہقی کی تتمۂ صوان الحکمۃ کا پتہ چلا تو اسی کو خیام کے حالات کا قدیم ترین ماخذ سمجھنا چاہیے، کیونکہ یہ چہار مقالہ سے تین سال پہلے لکھی گئی، چہار مقالہ کی تکمیل ۵۵۰ھ میں ہوئی، اور تتمہ ۵۴۵ھ میں لکھی گئی۔"

(اسلامک کلچر، جنوری ۱۹۶۰ء ص ۵)

فاضل مقالہ نویس نے بغیر کسی دلیل کے یہ دعویٰ فرمایا ہے کہ "تتمہ صوان الحکمۃ" ۵۴۵ھ میں اور

"چہار مقالہ" اس کے تین سال بعد ۵۵۲ھ میں تالیف ہوئے ہیں اور اس لیے اول الذکر ثانی الذکر سے
مقدم ہے، اس طرح ان کی اس "نئی دریافت" نے اساتذۂ قدیم کے نظریات پر خط نسخ پھیر دیا ہے،
مگر اس قسم کے دعاوی کچھ مستحسن نہیں معلوم ہوتے، قطع نظر اس کے کہ یہ تقدیم و تاخیر خود محل نظر ہے
(جس کی تفصیل آگے آرہی ہے) تین سال کا عرصہ اتنی اہمیت نہیں رکھتا کہ اس کی بنا پر متاخرین کی دریافتوں
کو متقدمین کے آراء کے نسخ و ابطال کا حق دیا جائے بالخصوص جبکہ یہ بھی واقعہ ہے کہ عہد حاضر کی طرح
قدماء میں اپنی تصانیف میں اکی تاریخ تدوین ثبت کرنے کا عموماً دستور نہیں تھا، اس لیے ان کے زمانۂ
تصنیف کا تخمینہ بالعموم قرائن ہی کے ذریعہ لگایا جاتا ہے، بیشک شہرزوری کی "نزہۃ الارواح" سے "چہار مقالہ"
اور "تتمہ صوان الحکمہ" دونوں مقدم ہیں (موخر الذکر تو نزہۃ الارواح کا ماخذ ہے) لیکن تصریحات
کے فقدان کی صورت میں چہار مقالہ اور تتمہ صوان الحکمہ میں تقدیم و تاخیر کا فیصلہ بہت مشکل ہے،
یہ دونوں معاصر ہیں، اور غالباً دونوں کی تصنیف کا زمانہ ایک ہی ہے، اگرچہ داخلی شواہد سے یہی
معلوم ہوتا ہے کہ چہار مقالہ کی تصنیف تتمہ صوان الحکمہ سے مقدم ہے نہ کہ موخر (جیسا کہ ڈاکٹر کلیم اللہ
صاحب کا دعویٰ ہے)

چہار مقالہ کا زمانۂ تصنیف چہار مقالہ کے زمانۂ تصنیف کے باب میں علامہ مرزا محمد بن عبد الوہاب قزوینی
کی دو رائیں ہیں، تعلیقات میں انھوں نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

"پس تاریخ تالیف آں محصور می شود بین سنہ ۵۵۰ - ۵۵۲"

اس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف نے چہار مقالہ میں دو جگہ سلطان سنجر سلجوقی (۵۱۱ھ - ۵۵۲ھ) کا اس
انداز میں ذکر کیا ہے گویا وہ زندہ ہے، چنانچہ صفحہ ۴۰ پر اس کے لیے دعا کی ہے: "اطال اللہ بقائہ
وادام الی المعالی ارتقائہ"۔

صفحہ ۴۴ پر سنجر اور سلطان علاء الدین غوری کے لیے دعائیہ کلمات تحریر کیے ہیں: خلد اللہ ملکہما و سلطانہما"

ان دعائیہ کلمات سے معلوم ہوتا ہے کہ "چہار مقالہ" سنجر کی زندگی میں تصنیف ہوا تھا، اس لیے یہ ۵۵۲ھ سے پہلے ہی تصنیف ہوا ہوگا، بعد میں نہیں، اس لیے تالیف چہار مقالہ کی انتہائی غایت ۵۵۲ھ ہے۔

پھر چونکہ نظامی عروضی صفحہ ۱۳ پر کتاب اور دبیروں کو مشورہ دیتا ہے کہ ادبا سے قدیم کی کتابوں میں سے "مقامات بدیع و حریری و حمید کا مطالعہ کرتے رہیں اور مقامات حمید سے مراد غالباً قاضی القضاۃ ابوبکر عمر بن محمود الملقب بہ حمید الدین المحمودی البلخی (المتوفی ۵۵۹ھ) کی "مقامات حمیدی" ہے، اور چونکہ "مقامات حمیدی" کا سال تحریر حسب تصریح حاجی خلیفہ (کشف الظنون جلد سادس صفحہ ۵۶) ۵۵۱ھ ہے، نیز اس کتاب کے اکثر مخطوطوں میں اور اسی طرح کا نپور (۱۲۶۸ھ) اور طہران (۱۲۹۰ھ) کے اڈیشنوں کے دیباچہ میں ۵۵۱ھ مذکور ہے، اس لیے تالیف چہار مقالہ کی ابتدائی حد ۵۵۱ھ ہوتی ہے،

مقامات حمیدی کا سال تصنیف | مگر اس ابتدائی حد کے تعین میں چند دقتیں ہیں:

(۱) مقامات حمیدی کے قدیم ترین نسخہ میں جو برٹش میوزیم میں موجود ہے اور چھٹی صدی ہجری کا لکھا ہوا ہے، یہ تاریخ مذکور نہیں ہے، تاریخ نہ ہونا تو زیادہ تعجب کی بات نہیں ہے، مگر قزوینی جس نے اس مخطوطہ کا مطبوعہ نسخوں سے مقابلہ کیا تھا، لکھتا ہے کہ دونوں میں معتد بہ فرق ہے، اور اس تفاوت و اختلاف کی توجیہ صرف اسی طرح ہو سکتی ہے کہ قاضی حمید الدین نے "مقامات حمیدی" کے ایک سے زیادہ نسخے لکھے تھے، پہلا ۵۴۷ھ سے پہلے اور دوسرا ۵۵۱ھ میں جو پہلے کی اصلاح ہے، برٹش میوزیم کا محولہ بالا مخطوطہ پہلے نسخہ ہی کی نقل ہے، نیز احتمال غالب یہی ہے کہ نظامی عروضی کے پیش نظر مقامات کا نسخہ قدیم تھا، یہ فرض کرنا غیر مناسب ہے کہ پہلے نسخہ میں مصنف نے تاریخ تصنیف ۵۵۱ھ دی ہو اور برٹش میوزیم والا نسخہ اس کی نظر ثانی ہو، کیونکہ نظر ثانی میں تاریخ کا نظر انداز کر دینا ناقابل فہم ہے۔

(ب) اس سے زیادہ جو بات اس مفروضہ کی تضعیف کرتی ہے یہ ہے کہ نظامی عروضی نے

چار مقالہ ۵۵۱ھ سے پہلے تصنیف کیا تھا، (تفصیل آگے آرہی ہے) اس لیے اگر مقامات حمیدی پہلی مرتبہ جمادی الاولی ۵۵۱ھ کے بعد تصنیف ہوئی، تو چند مہینوں میں اس کتاب کا اس درجہ شہرت عام و قبول بین الانام حاصل کر لینا مستبعد معلوم ہوتا ہے کہ ایک معاصر مقامات بدیع و مقامات حریری کے دوش بدوش اس کے مطالعہ کی سفارش کرے،

(ج) غالباً قاضی حمید الدین نے مقامات حمیدی کے تین نسخے مرتب کیے تھے، تیسرا نسخہ ۵۵۵ھ کے بعد مرتب کیا، اور یہ وہی نسخہ ہے جو مطبوعہ اڈیشنوں کی بنیاد ہے، کیونکہ مطبوعہ نسخوں کے بیسویں مقامہ میں مصنف نے خلفاء کے نام عربی اور فارسی دونوں میں نظم کیے ہیں، ان میں آخری خلیفہ مستنجد باللہ ہے، چنانچہ عربی قصیدے میں لکھتے ہیں ؎

وھا مستنجد الحر الکریم ختامھم　　امام الانام الیوم یظھر مفتخر

اسی طرح فارسی قصیدے میں کہتے ہیں ؎

وز بعد او گرفت بمستنجد آں سریر　　وامروز ہست عالم از و پر جمال و فر

اور مستنجد باللہ ۲ ربیع الاول ۵۵۵ھ کو تخت خلافت پر بیٹھا تھا، اس لیے مطبوعہ اڈیشن والا نسخہ ۵۵۵ھ کے بعد کا ہے، حالانکہ کتاب ۵۵۲ھ سے کہیں پہلے (غالباً ۵۳۶ھ کے کچھ بعد) تصنیف ہو چکی تھی، اسلیے مقامات کے متعدد نسخے مرتب ہوئے ہونگے: پہلا ۵۳۶ھ کے کچھ بعد، دوسرا جمادی الآخر ۵۵۱ھ میں اور تیسرا ۵۵۵ھ کے بعد۔

میرے اس خیال کی وجہ کہ مقامات حمیدی کا پہلا نسخہ ۵۳۶ھ کے قریب مرتب ہوا تھا، یہ ہے کہ اس کتاب کا تیسرا مقامہ "غزو جہاد" پر ہے "المقامۃ الثالثۃ فی الغزو والجہاد"۔ اس میں جہاد میں جانے والے غازی کی تیاری اس تفصیل سے دی گئی ہے گویا کسی نے اس واقعہ کا آنکھوں دیکھا حال ابھی ابھی مصنف کو بتایا ہے، تاریخ کے تفحص سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں دو واقعے بڑے معرکے کے

ہوئے تھے، ایک واقعہ سلطان سنجر کو گورخاں والی چین کے ساتھ پیش آیا تھا، دوسرا غزنوں کے ساتھ، غزمسلمان تھے، اس لیے جو لڑائی ان کے ساتھ ہوئی تھی، اسے "غزو وجہاد" سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، البتہ گورخاں والی چین اور اس کی فوج غیر مسلم تھے [بقول ابن خلدون: "وھو مانوی المذھب"] غرض ۵۳۶ھ میں دونوں فوجوں میں گھمسان کی لڑائی ہوئی اور یہ کفر و اسلام کی جنگ تھی، خود مقامات حمیدی میں ہے: "وپردۂ ظلام میان کفر و اسلام حائل آمد"

اگرچہ اس جنگ میں مسلمانوں کو شکست فاش ہوئی مگر سیستان کی فوج نے ڈٹ کر مقابلہ کیا روضۃ الصفا میں ہے:-

وچون سلطان روئے بہزیمت نہاد تاج الدین ابوالفضل ملک نیمروز در قلب لشکر بجائے سلطان بایستاد و جنگہائے مردانہ کرد بمرتبۂ کہ مخالفان از وفور جلادت او متعجب گشتند"

اسی سجستان کی فوج میں وہ راوی تھا جس سے قاضی حمید الدین نے مقامات میں یہ روایت کی ہے: "عزم غزو درست کردم و از ہرات قصد بست نمودم"۔ کیونکہ یہی شہر "بست" سجستان (نیمروز) کا دار الحکومت تھا۔

اس لیے یہ باور کرنے کے قطعی وجوہ ہیں کہ جس جہاد کی طرف اس مقامہ میں اشارہ ہے، وہ سلطان سنجر اور گورخاں خطائی کی معرکہ آرائی تھی، اور اگرچہ اس جنگ میں سنجری فوج کو شکست فاش ہوئی مگر سجستانی فوج کو جو تاج الدین ابوالفضل ملک نیمروز کے زیر قیادت لڑی تھی، باوجود ناکامی کے اس کا احساس رہا کہ انھوں نے داد مردانگی دینے میں کوئی کمی نہیں کی، اسی لیے اس مقامہ میں اگرچہ اختتام پر نہ فتح کی شادمانی کا سماں ہے، نہ شکست کی مایوسی و دل شکستگی کا۔ پھر بھی شروع میں اس عزم بلند اور خود اعتمادی کا اظہار ہے، جسے نیمروز (سجستان) کی فوج نے عملاً ثابت کر دکھایا۔

"بہ رفقۂ تازیان وجماعۂ غازیان میراندم وقوارع قرآن میخواندم ..... جمجمہ مراکب

وصدمہ مواکب غازیاں شنیدم ومجاہداں راہ خدا را دیدم کہ شکر می کردند و آوازاللہ اکبر برمی آوردند"

اور چونکہ مقامہ میں جہاد میں شرکت کی تفصیلات من وعن منقول ہیں، اس لیے غالباً یہ جزئیات اصل واقعہ پر زیادہ عرصہ گزرنے سے پہلے ہی تحریر میں آگئی تھیں، اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ یہ مقامہ ۵۳۲ھ کے کچھ ہی بعد (مثلاً ۵۴۰ھ کے قریب) لکھا گیا تھا تو شاید غلط نہ ہوگا،

چہار مقالہ کا سال تصنیف اس طرح مطبوعہ ایڈیشن میں ۵۵۱ھ کا مذکور ہونا اس بات سے مانع نہیں ہے کہ چہار مقالہ اس سنہ سے پہلے (۵۴۷ھ میں) تصنیف ہوچکا تھا، کیونکہ نظامی عروضی کے پیش نظر مقامات کا وہ ایڈیشن تھا جو ۵۳۲ھ کے کچھ ہی دن بعد مرتب ہوا تھا، اور اس عرصہ میں اس نے غیر معمولی شہرت حاصل کر لی تھی،

اب سوال چہار مقالہ کے سال تصنیف کے تعین کا ہے، اس کے لیے کتاب کی داخلی شہادتوں کے ساتھ خارجی واقعات پر نظر ڈالنی ہوگی

۵۴۷ھ میں سنجر کو علاء الدین غوری سے لڑنے کے لیے جانا پڑا، جیسا کہ خود مصنف چہار مقالہ (نظامی عروضی سمرقندی) نے لکھا ہے، اس میں سنجر کو فتح اور علاء الدین غوری کو شکست ہوئی، مگر جلد ہی صلح ہوگئی، اس جنگ سے فارغ ہونے کے بعد سنجر کو غزوں کا فتنہ فرو کرنے کے لیے لشکر کشی کرنا پڑی جس میں وہ بری طرح ناکام ہوا، ابن الاثیر کہتا ہے:-

فی محرم من سنۃ ثمان واربعین	ان کے بعد محرم ۵۴۸ھ میں سلطان سنجر پہنچا
وخمسمائۃ وصل بعدھم السلطان	غز سے مقابلہ ہوا...... سلطان سنجر کی
سنجر فالتقاہ الغز... فانھزم	فوج کو شکست ہوئی اور وہ صفر سنہ
عسکر سنجر ومضی منھزماً فی صفر من ھذہ السنۃ	مذکور میں پسپا ہو کر لوٹ گئی،

انجام کار، اپنے حرم کے ساتھ غزوں کے ہاتھوں گرفتار رہا، بیوی کی رسوائی کی وجہ سے فرار ہونے کی کوشش بھی نہ کر سکا، آخر کار ۵۵۰ھ میں بیوی کا انتقال ہو گیا، اور سلطان کسی طرح اس قید سے فرار ہو کر مرو پہنچا، یہاں خزانہ خالی اور عام بدحالی پائی، اس سے دل ٹوٹ گیا اور ۲ ربیع الاول ۵۵۲ھ کو انتقال کر گیا، روضۃ الصفا میں ہے:-

"سلطان قریب چہار سال درمیان ایشان گرفتار بود و از بیم آنکہ حرمش ترکان خاتون در بیت مخالفاں ماند تدبیر استخلاص نمی کرد، چوں در سنہ احد و خمسین و خمسمائۃ حرم محترم سلطان وفات یافت سلطان اندیشۂ مخلص نمودہ ...... از آب (جیحون) عبور نمودہ ...... آنگاہ روے بدار الملک خود نہاد و چوں بمرو رسید خزانہ تہی و ولایت خراب و رعیت منتشر یافت غم و اندوہ بر مزاج شریفش استیلا پذیرفت .... از دار غرور بسرای سرور انتقال فرمود" (جلد چہارم صفحہ ۱۱۳)

نظامی عروضی اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں کرتا، اس ترک ذکر سے تو کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ تحریر میں اس کا کوئی محل نہ تھا، لیکن جس طرح وہ اسے دعائیں دیتا ہے کہ "اطال اللہ بقاءہ و ادام الی المعالی ارتقاءہ" یا "خلد اللہ ملکھما" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس زمانہ کی دعائیں نہیں ہیں جب شوکت سنجری غزوں کی شورش سے پامال ہو چکی تھی، کیونکہ ایک قیدی بادشاہ کے لیے یہ دعائیں تضحیک سے کم نہیں، خصوصاً جب کہ اس کے ساتھ اس کی رہائی کی دعا بھی نہ ہو، اس لیے یہ عالم شوکت سنجری کا غزوں کی بغاوت سے پہلے ہی کا معلوم ہوتا ہے۔

اس لیے چہار مقالہ کی تالیف غزوں کی بغاوت سے پہلے ہی ہو چکی تھی، (جو محرم ۵۴۸ھ سے شروع ہوئی) یعنی ۵۴۸ھ میں، اس خیال کی تقویت اس بات سے ہوتی ہے کہ مقالہ سوم اور مقالہ چہارم کی آخری حکایتیں سنجر اور علاء الدین غوری کی جنگ واقعہ ۵۴۷ھ سے متعلق ہیں،

اور دونوں حکایتوں میں واقعہ کی تفصیل اس انداز سے لکھی ہے کہ گویا اس کی یاد ابھی ذہن میں تازہ ہے۔

اس جنگ میں علاء الدین اور اس کا بھتیجا محمد بن مسعود گرفتار ہوئے، شہزادہ محمد بن مسعود کی رہائی فدیہ پر مشروط ٹھہری مگر روپیہ آنے میں تاخیر ہوئی، نظامی عروضی نے پیشین گوئی کی جو صحیح نکلی، روپیہ مقرر وقت کے اندر آگیا، ادائیگی فدیہ کے بعد شہزادہ وطن آگیا، نظامی عروضی نے جس انداز میں اس واقعہ کی تفصیل لکھی ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابھی کل ہی کا واقعہ ہے:۔

"دیگر روز خداوند زادہ شمس الدولہ والدین خلدت سلطان عالم بپوشید و مطلق شد و بزد زین حاسے بعز خویش نہاد ہر روز کار او بر زیادت است و بر زیادت باد۔"

دوسری جگہ لکھتا ہے کہ شہزادے نے اسے اس صحیح پیشین گوئی اور خوشخبری کا وطن پہنچکر انعام دیا، مگر یہ انعام دینے کا واقعہ ماضی قریب ہی میں پیش آیا، لکھتا ہے:۔

"و در یں شبہا بود کہ بندہ را بنواخت و گفت نظامی یاد داری کہ ہری آں حکم کردی و چناں راست باز آمد خواستم کہ دہان تو پر زر کنم آنجا زر نداشتم اینجا زر روانم، زر بخواست و دہان من دو بار پر زر کرد .... ایزد تبارک و تعالیٰ ہر روز ایں دولت را بزیادت کناد۔"

تتمہ صوان الحکمۃ کا سال تصنیف ڈاکٹر کلیم اللہ صاحب حسینی نے "تتمہ صوان الحکمۃ" کا سال تصنیف ۵۴۹ھ بتایا ہے، مگر اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی دلیل نہیں دی، البتہ حال ہی میں "ہماری زبان" (مورخہ ۲۲ جولائی ۱۹۶۱ء) میں انھوں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں دو دلیلیں دی ہیں؛

(۱) میں نے "ہماری زبان" (مورخہ یکم مئی ۱۹۶۱ء) میں لکھا تھا:۔

"سال گذشتہ قاری سید کلیم اللہ حسینی نے اسلامک کلچر حیدرآباد میں دعویٰ کیا تھا، کہ چار مقالہ سے بھی قدیم تر بیہقی کا تتمہ صوان الحکمۃ ہے، جو ان کے خیال میں ۵۴۹ھ کی

تصنیف ہے، حالانکہ خود کتاب کی داخلی شہادت کی رو سے ۵۵۳ھ سے بعد کی تصنیف ہو اور اس طرح چہار مقالہ سے موخر ہے (اگرچہ خیال یہ ہے کہ یہ ۵۶۰ھ کے بعد کی تصنیف ہے)

اس پر جناب ڈاکٹر کلیم اللہ صاحب نے "ہماری زبان" (۲۲ جولائی ۱۹۶۱ء) میں تحریر فرمایا:-

"مراسلہ نگار صاحب نے تتمہ صوان الحکمہ کی تصنیف کا سنہ نہ صرف ۵۵۳ھ تسلیم کیا ہے بلکہ ان کے خیال میں وہ ۵۶۰ھ یا اس کے بعد کی تصنیف ہے، معلوم نہیں ان کا یہ خیال کس مواد پر مبنی ہے، ہم نے تو اپنے خیالی سنہ کا ثبوت پیش کر دیا ہے"

یہ ثبوت جناب ڈاکٹر قاری کلیم اللہ حسینی کے لفظوں میں حسب ذیل ہے:-

"یاقوت الحموی نے معجم الادباء جلد ۵، صفحہ ۲۰۸ پر علی بن زید البیہقی کے خود نوشتہ حالات اس کی تصنیف مشارب التجارب وغرائب الغرائب سے نقل کیے ہیں، بیہقی نے اپنی ۵۴۹ھ تک تصنیف کردہ کتابوں کا اس طرح ذکر کیا ہے:-

وھا انا اذکر تصانیفی فی ھذہ المدۃ سنۃ ۵۴۹

اس سے صاف ظاہر ہے کہ بیہقی نے اپنی انھیں تصانیف کا ذکر کیا ہے جو اس سنہ تک مکمل ہو چکی تھیں، ورنہ ۵۵۳ھ یا اس کے بعد کی تصنیف کا ذکر ۵۴۹ھ میں کیسے آسکتا ہے، ہاں اس سنہ تک اس نے تاریخ بیہقی اور لباب الانساب اور دیگر کتابیں تصنیف نہیں کی تھیں، اس لیے ان کا نام اس فہرست میں درج نہیں ہے"

دوسری جگہ فرمایا:-

"ہمارے نزدیک تتمہ صوان الحکمہ کا سنہ تصنیف ۵۴۹ھ ہی مسلم ہے، اگر وہ اس سنہ کے بعد کی تصنیف ہوتا تو مصنف اس سنہ میں مکمل شدہ کتابوں کی فہرست میں اس کو ہرگز شامل نہ کرتا، جیسا کہ اس نے تاریخ بیہقی اور لباب الانساب کو شامل نہیں کیا، جو اس سنہ کے

بعد کی تصانیف ہیں"

محترم المقام جناب ڈاکٹر صاحب کا استدلال بظاہر بڑا متین و رصین ہے، مگر بدقسمتی سے جن شواہد پر انھوں نے اس کی تعمیر فرمائی ہے ان کے نقل کرنے میں ان سے شعوری یا غیر شعوری طور پر تسامح ہو گیا ہے،

جناب ڈاکٹر صاحب یاد کرانا چاہتے ہیں کہ بیہقی نے مشارب التجارب میں تصریح کی ہے کہ "۵۴۹ھ تک کی میری تصانیف کی فہرست حسب ذیل ہے (وھانا اذکر تصانیفی فی ھذہ المدۃ ۵۴۹ھ) حالانکہ ایسا نہیں ہے:

(ا) ایک عربی داں سمجھ سکتا ہے کہ "فی ہذہ المدۃ ۵۴۹ھ" بیہقی جیسے ادیب کی عبارت نہیں ہو سکتی۔

(ب) غیر عربی داں حضرات کی اطلاع کے لیے اس تلخ حقیقت کا اظہار بادل ناخواستہ کرنا پڑتا ہے کہ جناب ڈاکٹر قاری کلیم اللہ صاحب نے محض سخن پروری کے لیے "فی ہذہ المدۃ" کے بعد "۵۴۹ھ" کا اضافہ کر دیا ہے، جو ایک محترم المقام پروفیسر کے شایان شان نہیں ہے، یاقوت جس کا جناب ڈاکٹر کلیم اللہ صاحب نے حوالہ دیا ہے معجم الادباء میں لکھتا ہے:۔

"وھانا اذکر تصانیفی فی ھذہ المدۃ: کتاب اسئلۃ القرآن مع الاجوبۃ مجلدۃ کتاب اعجاز القرآن ......"

معجم الادباء میں "ہذہ المدۃ" کے بعد ۵۴۹ھ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

اس عبارت سے اوپر ایک جگہ ۵۴۹ھ کا ذکر ضرور آیا ہے کہ میں نیشاپور میں غرۂ رجب ۵۴۹ھ تک ٹھہرا، اس کے بعد والدہ کی زیارت کے لیے سفر کیا، اور اسی سنہ میں میرے بیٹے احمد اور والدہ کا انتقال ہو گیا، میری والدہ حافظ قرآن اور وجوہ تفاسیر کی عالمہ تھیں۔

اس سلسلے میں چند امور قابل ذکر ہیں:۔

(ا) بیہقی ۵۴۹ھ کے سولہ سال بعد (۵۶۵ھ) تک زندہ رہا، اس لیے ناممکن ہے کہ ایک شخص جس نے ۵۴۹ھ تک ۷۴ کتابیں لکھی ہوں، ۱۶ سال کے عرصہ میں صرف دو ہی کتابیں لکھے، اس لیے

بہت ممکن ہے کہ ۵۴۹ھ کتابت کی غلطی ہو، اور ایسے اغلاط (بلکہ اغلاط فاحشہ) کتاب میں اور بھی ہیں، مثلاً

صفحہ ۲۱۰ سطر ۶ - ۷ پر مرقوم ہے:

واقمت بھا الی السابع والعشرین من	میں وہاں ۲۷ جمادی الاولی ۵۲۶ھ تک
جمادی الاولی ۵۲۶ھ وکنت فی تلک المدۃ	مقیم رہا اور اسی مدت میں حساب، جبر ومقابلہ
انظر فی الحساب والجبر والمقابلۃ وطرق من الاحکام	اور کچھ احکام پر غور وفکر کرتا رہا،

حالانکہ بیہقی نے ۵۶۵ھ میں وفات پائی ہے، اسکے بعد ۵۲۶ھ کا ذکر یقیناً کتابت کی غلطی اور ۵۶۲ھ کی تصحیف ہے،

اس لیے ممکن ہے اصل مشارب التجارب یا معجم الادبا میں کوئی بعد کا سنہ ہوگا جو کاتبوں کی تحریف و تصحیف

سے ۵۴۹ھ ہوگیا جس طرح انھوں نے ۵۶۲ھ کو ۵۲۶ھ کر دیا۔

(ب) یہ ۵۴۹ھ ہو یا اس کے بعد کا کوئی سنہ مشارب التجارب بالخصوص اس کا یہ حصہ جو بیہقی کی سوانح حیات

اور اس کی فہرست تصانیف پر مشتمل ہے ۵۴۹ھ کی تصنیف معلوم نہیں ہوتا، ماں اور بیٹے کی وفات کے دہرے غم

کے بعد طبیعت میں اس نشاط و سکون کا رہنا غیر فطری ہے جو تصنیف و تالیف کی شرط اولین ہے۔

غالباً بیہقی نے اس حادثہ فاجعہ کے عرصہ بعد مشارب التجارب لکھی، اس میں اپنی زندگی کے حالات

بھی لکھے، اور جب ماں اور بیٹے کی وفات کا واقعہ قلمبند کرنے لگا تو غم والم کے پرانے زخم ہرے ہوگئے، اسکے

بعد اس نے کوئی واقعہ نہیں لکھا، اور قصہ مختصر کرنے کے لیے تصانیف کی فہرست دیدی "دھا انا اذکر تصانیفی فی

ھذہ المدۃ" اس رنج والم ہی کا اثر تھا کہ فہرست تصانیف میں کوئی ترتیب ملحوظ نہیں رکھی، نہ فن وار نہ سنہ وار۔

اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ تتمہ صوان الحکمہ میں نہ صرف یہ کہ ۵۵۳ھ کا مذکور ہے[1]

ہے، بلکہ کتاب کی داخلی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ ۵۶۰ھ کے بعد تصنیف کی گئی تھی۔ (تفصیل آگے آرہی ہے)

(باقی)

---

[1] اسی طرح بہاء الدین ابو محمد الخرقی تتمہ صوان الحکمہ کی تالیف سے قبل وفات پاچکا تھا، چنانچہ بیہقی اسکا ذکر بصیغۂ ماضی کرتا ہے "کان من حکماء مرو"۔ بیہقی نے اس کا سال وفات نہیں دیا، مگر سبکی نے طبقات الشافعیہ جلد رابع ص ۲۴۴ پر اس کا سال وفات ۵۵۳ھ بتایا ہے۔ لہذا تتمہ صوان الحکمہ ۵۵۳ھ کے بعد کی تصنیف ہے۔

قرونِ وسطیٰ کا ایک عظیم مورخ

المسعودی

از جناب مولوی شبیر عطا صاحب ندوی

نام و نسب علی نام، ابو الحسن کنیت اور قطب الدین لقب ہے، سلسلۂ نسب یہ ہے: علی بن الحسین بن علی بن عتبہ،

المسعودی کا سلسلۂ نسب حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ پر منتہی ہوتا ہے، اس نسبت سے ان کو المسعودی کہتے ہیں۔[1]

وطن المسعودی کا خاندان بابل میں بود و باش رکھتا تھا، اسی سرزمین میں المسعودی ولادت ہوئی، علامہ ابن ندیم نے الفہرست میں مسعودی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ افریقہ کا رہنے والا تھا،[2] لیکن یہ صحیح نہیں ہے، ابن ندیم کی اس غلطی کا انکشاف یاقوت نے معجم الادباء میں کیا ہے، یاقوت نے خود مسعودی کی کتابوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ مسعودی بابل میں پیدا ہوا، اور بغداد میں سکونت اختیار کی، افریقہ یا اسپین سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، البتہ وہ مصر و شام میں مدتوں قیام پذیر رہا،[3] المسعودی نے خود بھی اس کی تصریح کی ہے کہ اقلیم بابل ہی اس کا مسکن آبائی ہے۔ مروج الذہب میں یہ الفاظ

---

[1] فوات الوفیات ج ۲ ص ۵۴ و النجوم الزاہرہ ج ۳ ص ۳۱۰ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۳۰۷ و معجم الادباء ج ۵ ص ۱۴۷

[2] الفہرست مطبوعہ مصر ج ۲ ص ۲۱۹ [3] معجم الادباء ج ۵ ص ۱۴۸

اس کے قلم سے ملتے ہیں :۔ وا وسط الاقالیم اقلیم بابل الذی مولدنا به وان کانت ریب الایام انأت بیننا وبینه۔[1]

بغداد میں سکونت | ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسعودی کا خاندان بابل ہی میں رہ گیا، مگر اس نے خود بغداد کا رخ کیا، دورِ حاضر کے مشہور محقق کرد علی کی بھی یہی رائے ہے کہ مسعودی نے بغداد میں سکونت اختیار کر لی تھی،[2] عام مورخین مسعودی کو بغدادی الاصل کہتے ہیں،[3] ان دونوں رایوں میں تطبیق یوں دی جا سکتی ہے کہ المسعودی بابل میں پیدا ہوا اور بغداد میں اس کی تعلیم و تربیت ہوئی،

اساتذہ | مسعودی کے اساتذہ میں مشہور ادیب اور مورخ نفطویہ زیادہ مشہور ہے۔

ابراہیم نام،[4] ابو عبد اللہ کنیت اور نفطویہ لقب ہے[5]، عہد اموی کے مشہور فوجی افسر مہلب ابن ابی صفرہ سے اس کا سلسلۂ نسب ملتا ہے،[6] ابن خلکان نفطویہ کے متعلق لکھتے ہیں[7]: کان عالما بارعادله التصانیف الحسان۔ ابن عماد لکھتے ہیں کان کثیر العلم واسع الروایۃ صاحب فنون[8]۔ المسعودی کا بیان ہے۔

کان احسن اهل عصره تالیفا	نفطویہ بحیثیت مصنف کے اپنے زمانہ میں ممتاز
واملحهم تصنیفا	تھا اور اس کی تصنیفات میں بڑی دلکشی ہوتی ہے،

نفطویہ کی ولادت ۲۴۴ھ میں واسط میں ہوئی[8] لیکن اس کا مستقل قیام بغداد میں رہا جہاں ۳۲۳ھ میں اس کا انتقال ہوا،[9] نفطویہ نے اپنے بعد کئی کتابیں یادگار چھوڑیں، جن میں کتاب المقنع فی النحو اور غریب القرآن زیادہ مشہور ہیں،[10] نفطویہ نے تاریخ اسلام پر بھی ایک ضخیم کتاب لکھی تھی۔[11]

---

[1] مروج الذہب ج ۳ ص ۱۳۱، [2] کنوز الاجداد ص ۱۲۱، [3] فوات الوفیات ج ۲ ص ۵۹، النجوم الزاہرہ ج ۳ ص ۳۱۵، ومآسیس المشتبۃ الکرام فی فنون الاسلام ص ۱۲۱، [4] لطائف المعارف ص ۲۵۰ مطبوعہ لیڈن، معجم الادباء ج ۱ ص ۳۰۰، [5] الفہرست لابن الندیم [6] وفیات الاعیان ج ۱ ص ۳، [7] شذرات الذہب ج ۲ ص ۹۸، [8] وفیات الاعیان ج ۱ ص ۱۰، [9] معجم الادباء ج ۱ ص ۳۰۰، [10] الفہرست ابن ندیم ص ۱۲۱، [11] معجم الادباء ج ۱ ص ۱۳۱۵

جس کے متعلق مسعودی کا بیان ہے کہ اپنے موضوع پر بہترین کتاب تھی، مسعودی نے اس کتاب سے بہت استفادہ کیا تھا،

(۲) مسعودی کے اساتذہ میں دوسری شخصیت ابوخلیفہ الجمحی کی ہے فضل بن حباب نام ابو خلیفہ کنیت اور الجمحی نسبت ہے، محدثین کے حلقہ میں ابوخلیفہ کی شخصیت کے تعارف کی ضرورت نہیں ہے[۱] وہ عرصہ تک بصرہ کا قاضی رہا، ایک بار بصریوں کا ایک وفد لیکر بغداد المعتضد کے دربار میں بھی حاضر ہوا تھا، معتضد اس کی قابلیت سے بہت متاثر ہوا،

المسعودی نے بصرہ جاکر خاص طور سے ابوخلیفہ سے استفادہ کیا تھا، مشہور مورخ ابوالمحاسن جمال الدین یوسف ابن تغری بردی نے النجوم الزاہرہ میں اس کی تصریح کی ہے، وہ لکھتا ہے ولہ رحلۃ الی البصرۃ التی فیھا ابوخلیفۃ[۲] مسعودی نے ابوخلیفہ کے متعلق بہت واقعات اپنی کتابوں درج کیے ہیں، ۳۰۵ھ میں ابوخلیفہ نے وفات پائی،

مندرجۂ بالا اساتذہ کے علاوہ مسعودی نے بغداد کے دوسرے اہل علم سے بھی استفادہ کیا تھا[۳] اس نے فلسفہ اور علم کلام بغداد ہی میں رہ کر سیکھا تھا، اس کو غالباً معتزلہ کے چند نامور متکلمین کی مجلسوں میں بیٹھنے کا موقع ملا ہوگا، امام ابوالقاسم محمود الکعبی البلخی، امام ابوالعباس الناشئی امام نوبختی امام ابوعلی جبائی اس عہد کے نامور متکلمین میں تھے، مسعودی اپنی کتابوں میں اکثر کلامی بحثیں، متکلمین معتزلہ کے اصول بیان کرتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے علم کلام سے گہری دلچسپی تھی،

المسعودی کی سیاحت | تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مسعودی نے اپنی عمر کے ۲۵ سال سیر وسیاحت

---

[۱] معجم الادباء ج ۶ ص ۱۳۴ و بغیۃ الوعاۃ ص ۳۷۳ و شذرات الذہب ج ۲ ص ۲۴۶

[۲] النجوم الزاہرۃ ج ۳ ص ۳۱۶ [۳] تاسیس الشیعۃ الکرام فی فنون الاسلام ص ۲۹۰ مطبوعہ عراق

میں بسر کیے، اس نے بغداد سے سفر شروع اور عراق، شام، آرمینیا، روم، افریقہ، سوڈان کے علاوہ چین، تبت، ہندوستان اور سرندیپ کی سیاحت کی۔[1]

مسعودی ہندوستان میں

المسعودی ہندوستان سے بہت اچھے تاثرات لیکر گیا، اس نے ہندوستانیوں کی قدیم رسموں کا غائر نظر سے مطالعہ کیا، البیرونی سے بہت پہلے اس نے ہندوستان کے مذاہب کی تحقیق کی تھی، شطرنج کو وہ ہندوستان کی ایجاد بتاتا ہے، یہاں کے نادر جانوروں کا تذکرہ بڑی تفصیل سے کرتا ہے، ہندوستان کے مشہور پرندطاؤس کی بڑی تعریف کی ہے۔[2] اسی طرح گینڈے وغیرہ کا تذکرہ دلچسپ انداز میں کرتا ہے۔[3]

مسعودی نے ہندوستان کے شمالی صوبوں میں سندھ اور پنجاب کو دیکھا تھا جنوب میں وہ کھمبائت تک گیا تھا، وہ پنجاب کے دریاؤں کا تذکرہ کرتا ہے، گنگا کا ذکر بھی کئی جگہ کیا ہے، ہمالیہ کے متعلق لکھتا ہے کہ تبت کے پہاڑوں سے زیادہ بلند پہاڑ نہیں دیکھے، بقول علامہ سید سلیمان ندوی ظاہر ہے اس سے مراد ہمالیہ ہی ہے، اس نے لکھا ہے۔ ہند میں بہت سی زبانیں رائج ہیں، مسلمانوں کی نوآبادیاں اس کے ہندوستان آنے سے بہت پہلے قائم ہو چکی تھیں، وہ لکھتا ہے، ہندو راجہ مسلمانوں کا بڑا لحاظ رکھتے ہیں، ان کی مسجدیں بھی موجود ہیں،[4] پان اور چھالیہ کے ذکر میں لکھتا ہے کہ اب یمن وغیرہ میں بھی اس کا استعمال ہونے لگا ہے۔[5]

اس نے ستی وغیرہ رسموں کا بھی معاینہ کیا تھا، چنانچہ بڑی حیرت سے لکھتا ہے:

وللهند اخبار عجيبة تنزع	ہندوستان کے عجیب غریب واقعات ہیں
من سماعها النفوس وانواع من	جن کو سنکر دل بیچین ہوجاتا ہے، اور انواع
الآلام تالم عند ذکرها	واقسام کے آلام ہیں جن کے ذکر سے تکلیف

[1] الکشاف، القنوع ص ۵۶ و فجر الاسلام ج ۱ ص ۲۴۷ [2] مروج الذہب ج ۲ ص ۴۰۳
[3] ایضاً ج ۱ ص ۲۰۳ [4] ایضاً ج ۱ ص ۳۸۳ [5] ایضاً ج ۲ ص ۴۱۰

الا ان وتقشعر منها الابشار الخ[۱] ہوتی ہوا دبدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں،

المسعودی کی سیاحت کا مقصد | مسعودی نے محض تفریحاً سیاحت نہیں کی تھی، بلکہ اس کا مطمح نظر ہر ملک کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا اور اس کی تاریخ سے صحیح واقفیت پیدا کرنا تھا، وہ جہاں بھی گیا یہ مقصد اس کے پیش نظر رہا، اس دور کے نامور مورخ ڈاکٹر احمد امین مسعودی کے متعلق لکھتے ہیں[۲]:

ولم تکن اسفارہ للنزھۃ بل کانت لمعرفۃ الاقطار واخبارھا

مسعودی نے اپنی عمر کے آخری دس سال مصر میں گذارے اور وہیں اپنی شہرہ آفاق کتاب مروج الذہب ومعادن الجواہر لکھی،

المسعودی کی تصنیفات | تصانیف کے لحاظ سے المسعودی اپنے عہد کا سب سے بڑا مصنف و اہل قلم ہے، اس کی کتابیں مختلف علوم وفنون پر تھیں، افسوس ہے کہ اس کی بہترین تصنیفات دستبرد زمانہ کی نذر ہوگئیں[۳]، آج بہتوں کے نام بھی نہیں معلوم ہو سکتے، لیکن خوش قسمتی سے مروج الذہب اور التنبیہ والاشراف میں جا بجا مسعودی نے اپنی جن کتابوں کا تذکرہ کیا ہے، اس کی روشنی میں ایک فہرست مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے،

(۱) اخبار الزمان - جس کا پورا نام اخبار الزمان ومن اباده الحدثان من الامم الماضیہ والاجیال الخالیہ والملوک الداثرہ[۴]۔ مسعودی کو اپنی اس تالیف پر بڑا ناز تھا، مروج الذہب میں تقریباً ۳۰ بار اس نے اس کا ذکر کیا ہے، حاجی خلیفہ نے بھی کشف الظنون میں بھی اس کا تذکرہ کیا ہے[۵]، وہ لکھتا ہے کہ اس کتاب کے تیس اجزا ہیں، اور ہر جزء ایک فن پر مشتمل ہے، مروج الذہب کے مقدمہ میں مسعودی نے اخبار الزمان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے: میں نے اخبار الزمان کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو مندرجہ ذیل

---

[۱] مروج الذہب ج ۲ ص ۴۰، [۲] ظہر الاسلام ج ۲ ص ۲۰۰، [۳] ایضاً ص ۲۰۰، [۴] ابن ندیم نے اخبار الزمان کا تذکرہ نہیں کیا ہے [۵] کشف الظنون ج ۱ ص ۱۶، ومروج الذہب ج ۱ ص ۲۷۰ مطبوعہ پیرس [۶] مروج الذہب ج ۱ ص ۲

مباحث پر مشتمل ہو: زمین کی شکل، دنیا کے چند بڑے شہر، عجائبات عالم، سمندروں کے حالات، دنیا کی جھیلیں، دنیا کے مشہور پہاڑ، دنیا کے چند بڑے دریا، زمین کی کانیں، سمندروں کی گہرائیاں، جزیروں کے حالات، قدیم عمارتیں، مسمار شدہ شہر، داستانِ آفرینش، نسل انسانی کی ابتدا، جغرافیائی تغیرات اور ان کے طبعی اسباب، اقالیم عالم کے خواص، تاریخ عہد قدیم کے متعلق مختلف اقوال، اس بارہ میں شریعت کا فیصلہ، قدیم فرمانروایانِ عالم کی تاریخ، گذشتہ قوموں اور قرون مظلمہ کی تحقیق، فراعنۂ مصر نیز اکاسرۂ فارس اور قیاصرۂ روم کے حالات، قدیم فلاسفہ، حکما، نیز انبیا کے قصے، بعثت نبوی کا بیان، سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، خلفاء راشدین، امویین و عباسیین کی تاریخ، فاطمیوں کا دعویٰ خلافت اور اس سلسلہ میں عباسیوں سے ان کے اختلافات وغیرہ ......"

مندرجۂ بالا عنوانات پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کس قدر جامع اور ضخیم تاریخ تھی، مسعودی نے اس کی تالیف کا کام ۳۳۲ھ میں ختم کیا، علمی دنیا کے لیے یہ ایک المیہ ہے کہ اخبار الزمان دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو گئی اور کسی کتبخانہ میں اس کا سراغ نہیں ملتا،

اخبار الزمان کا مطبوعہ نسخہ اور اس کی تاریخی حیثیت | اخبار الزمان کے نام سے ایک کتاب ۱۹۳۸ء میں مصر سے شائع ہوئی تھی، یہ مطبوعہ نسخہ اخبار الزمان کے اس قلمی نسخہ کی نقل ہے جو پیرس کی پبلک لائبریری میں موجود ہے، اور جس کا عکسی نسخہ مصر کے شاہی کتبخانہ میں محفوظ ہے، پیرس کا یہ نسخہ نویں صدی ہجری کا مخطوط ہے[2]،

مندرجۂ ذیل دلائل کی بنا پر اخبار الزمان کا یہ مطبوعہ نسخہ اس اخبار الزمان سے بالکل مختلف ہے جس کا تذکرہ مسعودی نے بار بار کیا ہے،

(۱) جیسا کہ خود مسعودی نے بیان کیا ہے اور صاحب کشف الظنون نے بھی اس کی تائید کی ہے کہ

---

[1] تاریخ آداب اللغۃ العربیہ جرجی زیدان ج ۲ ص ۳۱۴ [2] تذکرۃ النوادر ص ۳۷

اخبار الزمان ایک بڑی ضخیم تاریخ تھی، جو ہزاروں صفحات پر مشتمل تھی، اس کا خلاصہ الاوسط کے نام سے پھر اسی الاوسط کا خلاصہ مروج الذہب کے نام سے کیا گیا تھا[1]، مروج الذہب کی موجودہ ضخامت پندرہ سو صفحات ہے، اسی تناسب سے الاوسط کی ضخامت تین ہزار اور اخبار الزمان کی چھ ہزار ہونا چاہیے، لیکن مطبوعہ نسخہ صرف دو سو باون صفحات پر مشتمل ہے[2]،

(۲) مروج الذہب میں اخبار الزمان کے جو حوالے ہیں وہ موجودہ مطبوعہ نسخہ میں نہیں ملتے[3]،

(۳) مسعودی نے اخبار الزمان کا نام مروج الذہب کے مقدمہ میں یہ درج کیا ہے،

"اخبار الزمان ومن اباده الحدثان من الامم الماضیہ والاجیال الخالیۃ والملوک الداثرۃ" اور مطبوعہ نسخہ میں یہ نام اس طرح ہے "اخبار الزمان ومن اباده الحدثان وعجائب البلدان والغامر بالماء والعمران۔

مندرجہ بالا دلیلوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مطبوعہ نسخہ اخبار الزمان نہیں ہے، بلکہ اس کا خلاصہ ہے لیکن خلاصہ بھی نامکمل، یہ خلاصہ کس نے کیا؟ خود مسعودی نے کیا یا کسی اور نے، اس کے بارہ میں شاید آیندہ کوئی تاریخی انکشاف ہوسکے، اخبار الزمان مطبوعہ مصر کے مصحح عبد اللہ انصاری کا بیان ہے کہ ایک مستشرق کو اخبار الزمان کے بارہ میں معلوم ہوا کہ وہ شنقیط میں ہے، اس نے بڑے اشتیاق سے وہاں کا سفر کیا لیکن وہاں کے شیوخ نے اسے نسخہ کے زیارت کرنے کی بھی اجازت نہیں دی، مستشرق مذکور نے ہر ممکن طریقہ سے اسے حاصل کرنے کی کوشش کی، اور اس کوشش میں اسے اپنی جان تک سے ہاتھ دھونا پڑا، اور وہ نسخہ پھر ایک عرصہ کے لیے مفقود ہوگیا[4]، مگر یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اخبار الزمان دنیا سے ناپید نہیں ہوگئی، دسویں صدی کے مشہور ترکی مورخ طاش کبری زادہ کے ایک بیان سے اندازہ ہوتا ہو کہ اسے ترکی کے کسی کتبخانہ میں اسکا کوئی نسخہ دیکھا تھا جو بعد کو نہ مل سکا۔ ویانا میں بھی اخبار الزمان کا ایک ٹکڑا موجود ہے[5]۔

---

[1] مروج الذہب ج ۱ ص ۲ وکشف الظنون ج ۱ ص ۱۰ [2] یہ نسخہ مطبع عبد الحمید مشہد حسینی مصر سے ۱۳۵۷ھ میں شائع ہوا [3] مقدمہ ناشر اخبار الزمان ص د [4] ایضاً [5] تاریخ آداب اللغۃ العربیہ جورجی زیدان ج ۲ ص ۳۱۴

(۲) الاوسط - اسے اخبار الزمان کا خلاصہ کہنا چاہیے، حاجی خلیفہ کی یہی رائے ہے[1] مسعودی نے اس کتاب کا تذکرہ مروج الذہب میں بار بار کیا ہے، الاوسط میں بعض مباحث کا اضافہ کیا گیا ہے جو اخبار الزمان میں نہیں تھے، مثلاً محدثین کا تذکرہ اخبار الزمان میں نہیں تھا، الاوسط میں بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے،

مسعودی کی دوسری کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی ناپید ہوگئی، آکسفورڈ یونیورسٹی لائبریری میں ایک قدیم لامعلوم الاسم نسخہ کے بارے میں مستشرقین کا خیال ہے کہ غالباً یہ الاوسط ہے، دمشق کے کتبخانوں میں بھی الاوسط کے کچھ حصے پائے جاتے ہیں[2]

(۳) مروج الذہب ومعادن الجوہر - المسعودی کی خواہش تھی کہ ایک ایسی جامع تاریخ مرتب کی جائے جو تاریخ عام نیز تاریخ اسلام کے ہر پہلو پر حاوی ہو، اس لیے اس نے اخبار الزمان اور الاوسط کے اہم تاریخی مباحث اور اپنی دوسری علمی و ادبی تصنیفات کے جستہ جستہ حصے لیکر ایک نئی کتاب مروج الذہب کی شکل میں مرتب کی[3] گو مصنف کو اس کا اعتراف ہے کہ مروج الذہب میں بعض خامیاں ہیں لیکن اس کا سبب یہ ہے کہ اس کو سکون کے ساتھ کبھی بیٹھنا نصیب نہیں ہوا، کیونکہ اس نے عمر کا زیادہ حصہ سیاحت میں بسر کیا[4] مروج الذہب کی خصوصیات مندرجۂ ذیل ہیں،

(۱) مروج الذہب اگرچہ اسلام کی تاریخ ہے مگر اس کے مقدمہ میں تمام مہذب قوموں کی تاریخ اجمالاً بیان کی گئی ہے[5]، (۲) صاف اور سادہ واقعہ نگاری کا بہت عمدہ نمونہ ہے، (۳) ادبی حیثیت سے بھی ممتاز ہے، اس کے چھوٹے چھوٹے ادبی فقرے، سادہ اور بے تکلف روزمرہ کے الفاظ کا استعمال اور طرز ادا کی بے ساختگی قابل تعریف ہے، (۴) مروج الذہب ا

---

[1] کشف الظنون ج ۱ص ۱۱، [2] تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ جورجی زیدان ج ۲ص ۳۱۴ [3] مروج الذہب ج ۱ص ۲ ج ۴ص ۳۰۰ [4] ایضاً ج ۱ص ۵ [5] تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ جورجی زیدان ج ۲ص ۳۱۴

مسعودی کی تمام تاریخی تصنیفات کا نچوڑ ہے۔[1] (۵) مروج الذہب میں مسعودی نے دوسرے علمی مباحث پر بھی بڑی تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ معتزلہ وغیرہ کے بارے میں اس نے چند اہم انکشافات کیے ہیں،[2]

(۶) مروج الذہب میں مسعودی نے اپنا رویہ بہت ہی محتاط رکھا ہے، وہ لکھتا ہے :

و لیعلم من نظر فیہ انی لم انتصر	جو شخص اس کتاب کو پڑھے گا اسکو اسکا اندازہ ہوجائیگا
لمذھب ولا تحیزت الی قول	کہ میں نے کسی مسلک مذہب کی حمایت نہیں کی ہے
ولا حکیت عن الناس الا محاسن	اور نہ ان میں سے کسی کا قول اختیار کیا ہے، البتہ صرف
اخبارھم[3]	قوموں کے محاسن اور ان کی اچھی چیزیں بیان کی ہیں،

(۷) مسعودی کو خود یہ کتاب بہت پسند تھی، ایک جگہ لکھتا ہے کہ مروج الذہب بادشاہوں کو تحفہ میں دینے کے لائق ہے، اس نے بڑی محنت اور جانفشانی سے اس کو لکھا تھا، اور اس کو یہ اندیشہ تھا کہ اس کتاب کی شاید اتنی قدر نہ ہوسکے جتنی وہ چاہتا ہے لیکن مسعودی کے اندیشہ کے برعکس اور اس کی تمنا کے مطابق اس کتاب کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، اور ہر دور میں اس سے استفادہ کیا جاتا رہا، مروج الذہب مصر سے کئی بار شائع ہوئی،[4] فرانس میں اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کیا گیا، جو نو جلدوں میں ۱۸۶۲ء میں پیرس سے شائع ہوا، اسپرنگر نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا تھا جس کی پہلی جلد ۱۸۴۱ء میں لندن سے شائع ہوئی تھی، اردو میں بھی اس کا ترجمہ حیدرآباد دکن سے شائع ہوچکا ہے،[5]

(۴) التنبیہ والاشراف - اس کا پورا نام فنون المعارف وما جری فی الدھور السوالف والاستکثار لما مر فی سوالف الاعصار ہے، یہ کتاب مذکورہ بالا

---

[1] مروج الذہب ج ۱ ص ۲۲ [2] مروج الذہب ج ۴ ص ۲۰ جلد ص ۲۲۱ ج ۷ [3] ایضاً ج ۱ ص ۳
[4] معجم المطبوعات العربیہ ص ۱۷۴۳، واکتفاء القنوع ص ۵۶ [5] مروج ادو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن

کتب کی روشنی میں لکھی گئی ہے خصوصاً الاستذکار کے تقریباً تمام مباحث اختصار کے ساتھ اس میں آگئے ہیں، التنبیہ والاشراف کی حیثیت ایک تاریخی بیاض کی سی ہے مسعودی کی تصنیفات کی ایک اہم خصوصیت تنوع ہے، یہ خصوصیت اس کتاب میں بہت نمایاں ہے، اس میں بعض ایسے تاریخی مباحث ہیں، جن کی نظیر دوسری کتابوں میں نہیں ملتی[۱] ضروری تاریخی یادداشتیں تقریباً سب اس میں موجود ہیں، ۱۸۹۴ء میں لیڈن سے پہلی بار شائع ہوئی[۲]۔ اس کا فرانسیسی ترجمہ بھی ہو چکا ہے، اردو میں اسے مولانا عبد اللہ عمادی نے منتقل کیا۔

(۵) الاخبار المسعودیات۔ اس کتاب کا تذکرہ مسعودی نے التنبیہ والاشراف میں کیا ہے[۳]۔

(۶) مزاہر الاخبار وظرائف الآثار۔ یہ اہلبیت اور شیعیان علی کی تاریخ ہے[۴]۔

(۷) حدائق الاذہان فی اخبار آل محمدؐ۔ یہ بھی اہل بیت کی تاریخ ہے[۵]۔

(۸) کتاب البیان فی اسماء الائمہ۔ التنبیہ والاشراف میں اس کا نام آیا ہے[۶]۔

(۹) ذخائر العلوم وما کان فی سالف الدہور۔ یہ بڑی اہم کتاب ہے۔ ابن ندیم نے اخبار الزمان کے بجائے اسی کا تذکرہ کیا ہے مسعودی نے التنبیہ والاشراف میں اس کے حوالے دیے ہیں، کشف الظنون میں بھی اس کا نام آیا ہے[۷]۔

(۱۰) کتاب الانتصار[۸]۔ یہ خوارج کی تاریخ ہے۔

(۱۱) کتاب مقاتل فرسان العجم[۹]۔ التنبیہ والاشراف میں اس کا ذکر آیا ہے۔

---

[۱] تاریخ آداب اللغۃ العربیہ جورجی زیدان ج ۲ ص ۳۱۵ [۲] معجم المطبوعات العربیہ ص ۱۷۴۴ [۳] التنبیہ والاشراف ص ۳۴۳ [۴] مروج الذہب ج ۴ ص ۳۹۰ [۵] ایضاً ج ۳ ص ۱۹۱، کشف الظنون ج ۱ ص ۳۲۰ [۶] التنبیہ والاشراف ص ۲۹۰ [۷] الفہرست ص ۲۱۹، کشف الظنون ج ۱ ص ۴۷۷ [۸] مروج الذہب ج ۵ ص ۴۴ [۹] التنبیہ والاشراف ص ۱۰۲، کشف الظنون ج ۱ ص ۲۹۰

(۱۲) راحۃ الارواح۔ اس میں شاہانِ عالم کے حالات اور ان کی کشورکشائیوں پہ تفصیلی تبصرہ تھا۔[1]

(۱۳) کتاب تقلب الدول وتغیر الآراء والملل ۔ } التنبیہ والاشراف میں ان
(۱۴) کتاب نظم الجواہر فی تدبیر الممالک ۔ } دونوں کا تذکرہ موجود ہے۔[2]

(۱۵) کتاب القضایا والتجارب[3]۔ میرا خیال ہے المسعودی نے اپنا سفرنامہ بھی مرتب کیا ہوگا، خود مسعودی کے بیان سے اس کی تائید ہوتی ہے، وہ لکھتا ہے :۔

وقد اتینا علی سائر	میں نے روئے زمین اور مختلف
ماشاھدناہ حسا فی	ملکوں کی سیاحت میں جو کچھ مشاہدہ
مطافاتنا الارض والممالک	کیا اور حیوانات، نباتات اور جمادات
وما نمی الینا من خبر	کے خواص اور طبعی اسرار معلوم ہوئے
الخواص واسرار الطبیعۃ	اور عجیب وغریب عمارتوں اور آثار کے
من الحیوان والنبات	متعلق بعض دوسروں کے جو معلومات
والجمادات وعجائب	حاصل ہوئے ان سب کو اپنی
البنیان والآثار والبقاع	کتاب کتاب القضایا والتجارب
فی کتابنا المترجم بکتاب	میں جمع کر دیا ہے۔
القضایا والتجارب[4]	

اس بنا پر القضایا والتجارب کو اگر مسعودی کا سفرنامہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا،

---

[1] کشف الظنون ج ۱ ص ۵۳۱ [2] التنبیہ والاشراف ص ۳۲۴ و ص ۴۰۱ [3] کشف الظنون ج ۲ ص ۲۹۸ [4] مروج الذہب ج ۲ ص ۴۰

مندرجہ بالا کتابوں میں مسعودی نے زیادہ تر تاریخی اور جغرافیائی حالات بیان کیے ہیں، تاریخ و جغرافیہ کے علاوہ بھی اس نے مختلف علوم پر کتابیں لکھی ہیں، جن کی مختصر فہرست درج ذیل ہے:

کتاب المقالات فی اصول الدیانات[1]، کتاب الابانہ عن اصول الدیانہ[2]، کتاب نظم الادلہ فی اصول الملۃ[3]، کتاب الصفوۃ فی الامامۃ[4]، کتاب الاستبصار فی الامامہ[5]، کتاب المسائل والعلل فی المذاہب والملل[6]، کتاب نظم الاعلام فی اصول الاحکام[7]، کتاب خزائن الدین وسر العالمین[8]، کتاب سر الحیات[9]، کتاب وصل المجالس[10]، کتاب المبادی والتراکیب[11]، کتاب الروس السبعیہ[12] فی الاحاطۃ بآیات العالم واسرارہ، کتاب الزاہی[13]، کتاب الدعاوی[14]، کتاب الاسترجاع[15]، کتاب الرؤیا والکمال[16]، کتاب الواجب فی الفروض اللوازم[17]، کتاب الزلف[18]، کتاب طب النفوس[19]، کتاب الرسائل[20]، کتاب التعیین[21]، کتاب البیان فی اسماء الائمہ[22]۔

مسعودی کی تصنیفات کی یہ مختصر فہرست ہے۔ جو ابن تغری بردی، شاکر کتبی، تاج سبکی یاقوت حموی، ابن عماد حنبلی، حاجی خلیفہ کی کتابوں کی مدد سے مرتب کی گئی ہے۔ مسعودی نے مروج الذہب اور التنبیہ والاشراف میں اپنی جن تصنیفات کا ذکر کیا ہے، ان کا بھی ذکر اس فہرست میں آگیا ہے۔

(باقی)

---

[1] تا [22] ان سب کتابوں کا تذکرہ مروج الذہب، التنبیہ والاشراف، کشف الظنون، النجوم الزاہرہ، فہرست ابن ندیم، لسان المیزان، معجم الادبا، طبقات الشافعیہ، فوات الوفیات وغیرہ میں ہے۔

ادبیات

حقائق و معارف

از جناب افقر موہانی وارثی

آنکھ جھپکی، ابھی کچھ نہیں ہے
ہستیِ آدمی کچھ نہیں ہے

عارضی زندگی کچھ نہیں ہے
غم ہی غم ہے خوشی کچھ نہیں ہے

طالبِ عشق ہے حسن لیکن
مقصدِ عاشقی کچھ نہیں ہے

اک فریبِ نظر ہے یہ دنیا
دہر کی دل کشی کچھ نہیں ہے

میرا سجدہ ہے اور انکی چوکھٹ
غیر کی بندگی کچھ نہیں ہے

مستیٔ چشم ساقی سلامت
مجھکو مے کی کمی کچھ نہیں ہے

شیخ صاحب ہیں پیر مغاں بھی
ان کا معیار ہی کچھ نہیں ہے

حاصلِ موت بھی کچھ ہے لیکن
حاصلِ زندگی کچھ نہیں ہے

ان کا جلوہ ہے نظروں میں رقصاں
آنکھ اب دیکھتی کچھ نہیں ہے

کب ہے سجدہ میں قیدِ تعین
وقت کی بندگی کچھ نہیں ہے

دیکھ کر چشمِ ساقی کی مستی
حاجتِ میکشی کچھ نہیں ہے

ایسی دنیا کا عالم نہ پوچھو
جو ابھی ہے، ابھی کچھ نہیں ہے

آستاں ان کا چھوٹے نہ افقر
خلد کی دل کشی کچھ نہیں ہے

غزل

از جناب تسکین قریشی

جب تری رہگذر سے گذرے ہیں
ہم تو کچھ بے خبر سے گذرے ہیں

کیا یونہی مل گیا ہے منصبِ عشق
ان کی اک اک نظر سے گذرے ہیں

کتنے چہروں سے اٹھ گئی ہے نقاب
ہم جنوں میں جدھر سے گذرے ہیں

مے چھٹی اور میکدہ نہ چھٹا
جب بھی گذرے ادھر سے گذرے ہیں

خود انھیں بھی خبر نہیں جن کی
وہ بھی جلوے نظر سے گذرے ہیں

ٹھوکریں کھائی ہیں وہیں تسکیں
ہم سنبھل کر جدھر سے گذرے ہیں

غزل

از جناب اختر مسلمی اعظمی

خوشی میں بھی خوشی حاصل نہیں ہے
تمھارا غم اگر شامل نہیں ہے

نہ ہو دل میں اگر دردِ محبت
تو کوئی اور شے ہو دل نہیں ہے

محبت منزلِ انسانیت ہے
محبت کی کوئی منزل نہیں ہے

سمجھ لے آدمی مرنا جو آساں
تو جینا بھی کوئی مشکل نہیں ہے

طبیعت میں نہ ہو آساں پسندی
تو پھر مشکل کوئی مشکل نہیں ہے

جو اٹھ جاتی ہے سوئے تشنہ کاماں
تری چشم کرم مائل نہیں ہے

باب التقریظ والانتقاد

رسائل و اخبارات کے خاص نمبر

ادبی دنیا - مرتبہ مولانا صلاح الدین احمد صاحب تقطیع کلاں، کاغذ معمولی، کتابت وطباعت اچھی صفحات ۲۹۶، قیمت عہ، پتہ دفتر ادبی دنیا، مال روڈ، لاہور

مشہور ادبی رسالہ "ادبی دنیا" نے اس مرتبہ بھی حسب معمول اپنا خاص نمبر نکالا ہے، اس کے بیشتر مضامین ادبی اور بعض علمی و سوانحی ہیں، افسانوں اور ادبیات کا بھی ایک حصہ ہے، ادبی مضامین میں "بغاوت کی ایک مثال، ن، م راشد" علمی مضامین میں "اردو کی قدیم مذہبی مثنویاں" اور سوانحی مضامین میں "سید حسین" خاص طور سے لائق ذکر ہیں، نظموں اور غزلوں کا حصہ بھی معیاری ہے، آخر میں بحث و نظر" کے عنوان سے "حسن" کے متعلق چند اصحاب قلم نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے، اور "تجزیاتی مطالعہ" کے زیر عنوان ایک نظم "کتب خانے" کا چند اصحاب ذوق نے تجزیہ کیا ہے، "شام کی باتیں" کے تحت بڑی دلچسپ چیزیں دی گئی ہیں مجموعی حیثیت سے نمبر مطالعہ کے لائق ہے، امید ہے کہ ادبی دنیا کے دوسرے خاص نمبروں کی طرح یہ نمبر بھی مقبول ہوگا،

ادب لطیف سالنامہ - مرتبہ جناب مرزا ادیب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۲۶۰، قیمت سے، پتہ دفتر ماہنامہ ادب لطیف، ۸۸ میکلو روڈ، لاہور،

اردو کے ادبی اور ترقی پسند رسالوں میں "ادب لطیف" ایک اہم رسالہ ہے، اس کا سالنامہ بھی مختلف اصناف ادب کے مضامین کا مجموعہ ہے، مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر عبد الحق مرحوم، ڈاکٹر سید عبد اللہ اور ڈاکٹر عبادت بریلوی وغیرہ جیسے مشہور اور نقاد اہل قلم کے مضامین، افسانہ نگاروں میں عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، حیات اللہ انصاری، انور عظیم اور رام لعل وغیرہ کے افسانے ہیں، "داغ" پر سید سبط حسن کا اور "نظم اور اس کا پس منظر" کے عنوان سے ڈاکٹر وزیر آغا کا مضمون محنت اور دیدہ ریزی سے لکھے گئے ہیں، اردو کے بعض اہم شعراء کے کلام کا تنقیدی وفنی جائزہ لیا گیا ہے، نظموں اور غزلوں کا حصہ بھی مجموعی اعتبار سے بلند پایہ ہے، ترقی پسند ادب اور ادیبوں کی بعض بے اعتدالیوں اور خامیوں سے قطع نظر یہ سالنامہ مفید مضامین اور معیاری ادب کا اچھا مجموعہ ہے۔

نیرنگ خیال سالنامہ۔ مرتبہ حکیم محمد یوسف حسن و سید محسن ہاشمی صاحبان، متوسط سائز کاغذ معمولی، کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۰۸، قیمت سالانہ مع خاص نمبر ۱۶ بغیر خاص نمبروں کے ۱۰ پتہ دفتر نیرنگ خیال ۴۵ نیلمنگ روڈ، لاہور۔

نیرنگ خیال اردو کا قدیم اور مشہور ادبی رسالہ ہے، اس کا یہ سالنامہ بھی سنجیدہ علمی و ادبی اور طنزیہ مضامین اور دلچسپ افسانوں پر مشتمل ہے، شروع میں فاضل مرتب کا اداریہ "ادب اور اس کی ذمہ داریاں" خاص طور سے بہت مفید اور قابل غور ہے، مضامین میں سب سے زیادہ ممتاز اور اہم ڈاکٹر سید عبد اللہ کا وہ خطبۂ صدارت ہے جو انجمن ادبی رسائل کے اجلاس منعقدہ ۲۸، ۲۹ جنوری ۱۹۶۲ء میں پڑھا گیا تھا، سید عابد علی عابد کا مضمون "اقبال کی اردو رباعی"، "فورٹ ولیم کالج" پر سید سبط حسن اور "آئین اسٹائن کا نظریۂ اضافت" پر مسعود بٹ کے مضامین معلومات افزا اور تلاش و محنت کا نتیجہ ہیں، مریم جمیلہ کا مضمون "کیا ہمیں بدلتے زمانوں کے ساتھ بدل جانا چاہیے" بھی مفید اور لائق مطالعہ ہے، نظموں اور غزلوں کا حصہ بھی ستھرا ہے، مجموعی حیثیت سے یہ نمبر بھی کامیاب ہے۔

شاعر جمہوریت نمبر - مرتبہ جناب اعجاز احمد صدیقی و چھند رناتھ، متوسط سائز کاغذ معمولی، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۱۴۶، قیمت: عہ ناشر مکتبہ قصر الادب پوسٹ بکس نمبر ۵۲۶۶ بمبئی ۴۰۰۰

رسالہ 'شاعر' اردو زبان و ادب کا پرانا خدمتگذار ہے، وہ سال میں کئی خاص نمبر شائع کرتا ہے، جمہوریۂ ہند کی بارہویں سالگرہ کے موقع پر اس نے جمہوریت نمبر نکالا ہے۔ یہ نمبر جمہوریت کے متعلق مفید مضامین، افسانوں، ڈراموں اور منظومات پر مشتمل ہے، لکھنے والوں میں بیشتر ملک کے مشاہیر اہل قلم ہیں، ہندوستان میں گذشتہ ۱۲ سال سے جمہوریت کا تجربہ کیا جا رہا ہے، اس قلیل عرصہ میں بعض اعتبار سے اس نے غیر معمولی ترقی کی ہے لیکن ابھی جمہوریت نے صحیح اور کامل شکل اختیار نہیں کی ہے، اس لیے اس نمبر میں جمہوریت کی خوبیوں اور ہندوستان میں اسکی کامیابیوں کے ساتھ اس کی خامیوں، فروگذاشتوں اور بے انصافیوں کی جانب بھی توجہ دلائی گئی ہے، جو خاص طور سے ارباب حل و عقد کے لیے لائق غور ہے، رسالہ کے آخر میں "شاہراہِ ترقی" کے عنوان سے مختلف ریاستوں اور صوبوں میں پنج سالہ منصوبوں کے تعمیری کارناموں کا ذکر ہے، خالص ادبی افسانوی نمبروں کے مقابلہ میں ایسے خاص نمبر زیادہ مفید ہیں۔

تحریک خصوصی شمارہ - مرتبہ جناب گوپال متل وغیرہ، متوسط سائز کاغذ، کتابت و طباعت اعلیٰ صفحات ۱۳۰، قیمت عہ، پتہ دفتر ماہنامہ تحریک انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی۔

تحریک ابھی نوعمر رسالہ ہے، مگر اس کم عمری میں اس نے اردو کے رسالوں میں اپنی اہم جگہ بنالی ہے، اس کے کئی خاص نمبر بھی نکل چکے ہیں، اس نمبر کو چین نمبر کہنا چاہیے، اس میں موجودہ کمیونسٹ چین کے ادبی اور ثقافتی رجحانات کا جائزہ لیا گیا ہے، اور وہاں کے تین اہم طبقوں، یعنی دانشوروں، طالب علموں اور عوام پر ماؤ سی تنگ کے انقلاب کا اثر دکھایا گیا ہے، اس نمبر سے کمیونسٹ چین کے اصلی خط و خال سامنے آجاتے ہیں، ایک مضمون "چین کے دانشور"

کے سوا جو فاضل مرتب کے قلم سے ہے، باقی تین مضامین خود چین کے مشہور مصنفین کی کتابوں اور ناولوں سے لیے گئے ہیں، اس لیے ان کا بیان گھر کے بھیدی کی شہادت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سرخ انقلاب سے آزادی، آسودگی اور امن و انصاف کے بجائے غلامی، ابتری اور ظلم و تشدد چین کے حصہ میں آیا ہے، اسی لیے کبھی کبھی اہل چین کی زبان سے آہ و فغاں کی صدائیں بھی نکل جاتی ہیں، اور کچھ مظلوم و ستم رسیدہ . . . جبر و تشدد کے اس نظام کے خلاف کھڑے ہو جاتے ہیں، مرتب نے ہر مضمون کے شروع میں اس کی مختصر وضاحت کر دی ہے۔ اور ہندوستان دشمن چین کی مدح سرائی پر ہندوستان کے سرخوں کی بھی خبر لی ہے، اور ان کی خوش فہمیوں کی پوری تردید کی ہے شروع میں لائق مرتب نے اس نمبر کی غرض و غایت اور چین کے انقلاب کا مختصر تذکرہ بھی کر دیا ہے، اس نمبر سے چین کے متعلق کمیونسٹ پروپگنڈے کی پوری تردید ہو جاتی ہے، اور اس کی اصل تصویر سامنے آجاتی ہے۔

جامعہ سالنامہ۔ مرتبہ جناب عبد اللطیف اعظمی، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۰۲

قیمت عہ پتہ: رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی،

یادش بخیر، رسالہ جامعہ تقریباً ڈیڑھ سال سے اپنی روایاتی شان سے نکلنا شروع ہوا ہے، اس نے اپنا ایک خاص نمبر نکالا ہے، جو ۱۹۶۱ء کی اردو مطبوعات کے جائزہ پر مشتمل ہے، اس میں مختلف اصناف علم و ادب کی کتابیں شامل ہیں، ڈاکٹر عبادت بریلوی نے پاکستان کی اردو مطبوعات کا جائزہ لیا ہے، بعض مضامین میں ۶۱-۱۹۶۰ء کے ادب کا جائزہ لیا گیا ہے، ایک مضمون میں ۱۹۶۱ء میں وفات پانے والے ادیبوں اور نامور لوگوں کا مختصر تذکرہ ہے لیکن اس جائزہ میں مذہبی، علمی و تعلیمی وغیرہ بہت سے اصناف کی کتابیں چھوٹ گئی ہیں، ایک نمبر میں ان سب کا احاطہ دشوار بھی تھا جس کا اعتراف مرتب کو بھی ہے۔ اس نمبر کے اکثر مضامین تلاش و محنت سے لکھے گئے ہیں

اور وہ مفید ہیں، رشید حسن خاں صاحب کا مضمون "نظم (۱۹۶۰ء) میں شائع ہونے والے مجموعے" خصوصیت کے ساتھ بہت مفید اور لائق مطالعہ ہے، راجندر ناتھ شیدا، غلام احمد فرقت کاکوروی، اور خود فاضل مرتب کے مضامین بھی قابل ذکر ہیں، اس نمبر کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں بعض نامور ادیبوں اور شاعروں کی تصانیف پر بڑی جرأت کے ساتھ مخلصانہ اور سنجیدہ تنقید کی گئی ہے، گویہ نمبر اپنے مقصد کے لحاظ سے جامع نہیں ہے، پھر بھی بہت مفید اور کارآمد ہے۔ اگر اردو کی مطبوعات کا سال بسال اسی طرح تنقیدی جائزہ ہوتا رہے تو اس سے مختلف قسم کے علمی و ادبی فوائد حاصل ہوں گے۔

نیا شعور ٹیگور نمبر۔ مرتبہ جناب شکیل الرحمن وغیرہ، کاغذ، کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۱۴۹ قیمت تحریر نہیں، شائع کردہ شعبۂ اردو، جامعہ جموں وکشمیر سری نگر۔

ٹیگور کی صد سالہ یادگار کے موقع پر اردو کے بہت سے رسالوں نے ٹیگور نمبر نکالے تھے۔ اس سلسلہ میں "نیا شعور" نے جو جموں وکشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی طرف سے شائع ہوا ہے، اپنا پہلا ہی نمبر ٹیگور کے نام سے نکالا ہے، اس سلسلہ میں ان کے افکار وتعلیمات سے بحث کی گئی ہے۔ اور اس کی روشنی میں ان کی کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے، پروفیسر شکیل الرحمن کا مضمون گو طویل لیکن مفید ہے، اداریہ میں بنگالی ادب کی مختصر تاریخ ہے، اس طرح یہ رسالہ ٹیگور کے افکار وتصورات کا بہت اچھا ترجمان ہے،

قومی زبان عبدالحق نمبر۔ مرتبہ انجمن ترقی اردو پاکستان، صفحات ۲۳۲، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، قیمت ۱۲/ پتہ کل پاکستان انجمن ترقی اردو، اردو روڈ کراچی۔

انجمن ترقی اردو پاکستان کا ترجمان پندرہ روزہ قومی زبان جو عرصہ سے بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب مرحوم کی سرپرستی میں نکلتا ہے، مولوی صاحب مرحوم کی وفات کے بعد ان کی یادگار میں اپنا خاص نمبر نکالا ہے، اس میں بیشتر ایسے مضامین، منظومات اور تاثرات کو جو مولوی صاحب مرحوم کی یاد میں دوسرے اخبارات ورسائل میں شائع ہو چکے ہیں جمع کر دیا گیا ہے، یہ مضامین زیادہ تر تعزیتی

نوعیت کے ہیں، اس لیے ہلکے پھلکے اور مختصر ہیں، بعض اہم بھی ہیں، جن سے بابائے اردو کی شخصیت و سیرت کے بعض نمایاں اور ممتاز پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے، شروع میں کچھ تعزیتی پیغام ہیں، ان میں صدر ایوب اور ان کے سکریٹری شہاب قدرت اللہ کا پیغام قابل ذکر ہے، اور آخر میں ہند و پاک کے بلند پایہ علمی و ادبی رسالوں کے تاثرات نقل کیے گئے ہیں، اس لیے یہ نمبر بابائے اردو کے متعلق معلومات اور ان کی موت پر تاثرات کا بہت اچھا مجموعہ ہے،

سب رس امجد نمبر۔ کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۴۷، قیمت عہ

پتہ۔ ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد، دکن،

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کو حکیم الشعراء سید امجد حسین حیدرآبادی سے بڑا گہرا تعلق تھا، چنانچہ اس نے ان کی زندگی ہی میں ان کی شخصیت اور خدمات کے اعتراف میں اپنے رسالہ سب رس کا خاص نمبر شائع کیا تھا اور اب ان کی وفات کے بعد بھی ان کی یادگار میں یہ خاص نمبر نکال کر نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے، اس میں حضرت امجد کے حالات و سوانح کے ساتھ ان کے شعری و ادبی خدمات اور انکی غزل گوئی، رباعی گوئی اور نثر نگاری وغیرہ پر مختصر گر جامع تبصرہ ہے، آخر میں وہ نظمیں ہیں جن میں مختلف شعرائے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا ہے، حضرت امجد حیدرآبادی صحیح معنوں میں حکیم الشعرا تھے، ان کی شاعری کی طرح ان کی شخصیت بھی بڑی پاکیزہ و دل آویز تھی، یہ نمبر ان دونوں کا مرقع ہے۔

طبی ڈائجسٹ اجمل نمبر۔ مرتبہ حکیم محمد صلاح الدین نعمانی صاحب، صفحات ۷۵،

متوسط سائز، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، قیمت ۷۵ نئے پیسے، پتہ دفتر ماہنامہ

طبی ڈائجسٹ، مارکیٹ روڈ، حیدرآباد، پاکستان،

طبی ڈائجسٹ ایک طبی رسالہ ہے، جو حیدرآباد (پاکستان) سے نکلتا ہے، اس نے حکیم اجمل خاں مرحوم کی یادگار میں یہ نمبر نکالا ہے، اس میں حکیم صاحب مرحوم کی شخصیت کا جائزہ لیا گیا ہے، اور

ان کے کمالات، طبی خدمات اور فنی اجتہادات تحریر کیے گئے ہیں، ان کے قومی و ملی خدمات، ان کی عظمت و شرافت اور اخلاقی بلندی وغیرہ مختلف خصوصیات کا بھی ضمناً تذکرہ کیا گیا ہے، حکیم صاحب مرحوم کی شخصیت ایسی جامع و ہمہ گیر تھی اور ان کے کارنامے اتنے گوناگوں ہیں کہ ایک نمبر میں ان کا احاطہ دشوار ہے، تاہم اس نمبر سے یہ فائدہ بھی کم نہیں کہ اس سے انکی یاد تازہ رہے گی،

حاذق حسن و صحت نمبر - مرتبہ جناب حبیب اشعر صاحب۔ متوسط سائز، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۳۰۲، قیمت عہ ، پتہ: ماہنامہ حاذق ۲۲۷/۲-۱اے فورٹ روڈ، حضوری گیٹ، لاہور،

حاذق بھی ایک طبی رسالہ ہے، اس نمبر میں حسن و صحت کے متعلق مضامین جمع کیے گئے ہیں، رسالہ کے شروع میں انسان کی زندگی میں حسن و صحت کی اہمیت بتائی گئی ہے، اور جسم اور کے مختلف اعضاء، اور اس کی شکل و صورت وغیرہ کو حسین و توانا بنانے اور صحت و تندرستی کو قائم رکھنے کی تدبیریں تحریر کی گئی ہیں، اس کے بعد دنیا کی بعض حسین عورتوں کے سوانحی خاکے، چند حسینوں کے خطوط، پھر حسن و جمال کے متعلق اردو کے قدیم و جدید اساتذۂ فن کی نظمیں اور غزلیں دی گئی ہیں، اور آخر میں فلسفۂ جمال کے متعلق چند اچھے مضامین ہیں، اس نمبر کے مندرجات حسن و جمال کی طرح ہلکے پھلکے مگر دلکش ہیں، شروع کا حصہ طبی حیثیت سے خاص طور سے بہت مفید ہے۔ بعض مقالے خاصے معیاری ہیں، اس لیے یہ نمبر اپنی گوناگوں ادبی دلچسپیوں کے ساتھ صحت و تندرستی اور حسن و جمال کے تحفظ کا بھی نسخہ ہے۔

"ض"

مطبوعات جدیدہ

اردو تعلیم کے لسانیاتی پہلو - از ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صفحات ۴۸، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر آزاد کتاب گھر، کلاں محل، دلی ۶

ڈاکٹر نارنگ اہل علم کے حلقہ میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں، ان کے قلم سے ادھر چند برسوں میں جو متعدد تحقیقی و علمی کتابیں نکلی ہیں ان میں یہ رسالہ بھی ہے، اس میں انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کسی زبان کے سیکھنے اور مہارت پیدا کرنے کے لیے محض اس زبان کے ذخیرۂ الفاظ کا حفظ کر لینا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے صوتیاتی نظام اور قواعد، صرف و نحو سے بھی واقفیت ضروری ہے، اس کے بغیر آدمی کو بولنے اور لکھنے پر قدرت تو ہو سکتی ہے مگر اس میں مہارت اور اہل زبان جیسی بے تکلفی نہیں پیدا ہو سکتی، اردو زبان کی تعلیم میں عموماً ذخیرۂ الفاظ پر زور دیا جاتا ہے، اور یہ سلسلہ اعلیٰ تعلیم تک چلا جاتا ہے، حالانکہ طالب علم کو سب سے پہلے زبان کے صوتیاتی نظام اور اس کے قواعد سے واقف کرانا ضروری ہے، پھر اس حیثیت سے بھی اس کی اہمیت ہے کہ ہر دس بیس برس کے بعد الفاظ کے ذخیرہ کا ایک بڑا حصہ متروک ہو جاتا ہے، مگر زبان کا صوتیاتی نظام اور اس کے اصول و قواعد ہمیشہ اپنی جگہ قائم رہتے ہیں، یہ ایک خالص خشک علمی موضوع ہے، مگر ڈاکٹر نارنگ کی شگفتہ نگاری نے اس میں اچھی خاصی دلکشی پیدا کر دی ہے، یہ رسالہ بقامت کہتر و بقیمت بہتر کا مصداق ہے، اگر بعض فنی اصطلاحات کی دو دو جملوں میں تشریح کر دی جاتی تو اس کی افادیت میں اضافہ ہو جاتا۔

یک رنگ و صد آہنگ ۔ از ڈاکٹر احمد اعظم رودولوی صفحات ۱۲۸، کتابت وطباعت بہتر، ناشر مصنف۔ پتہ: کتابی دنیا، نظیرآباد، لکھنؤ، قیمت ؏

یہ ایک جواں سال مگر خوش ذوق شاعر کا مجموعۂ کلام ہے، پورے مجموعے میں صرف دو نظمیں اور بقیہ غزلیں ہیں، ڈاکٹر احمد کی شاعری کی عمر کچھ کم نہیں ہے، مگر ان کا دائرۂ تعارف ان کے مخصوص احباب تک محدود تھا، اس مجموعہ کے ذریعہ پہلی بار ان کا تعارف عام اہل علم میں ہو رہا ہے، ڈاکٹر احمد کو غزل گوئی سے فطری مناسبت معلوم ہوتی ہے، اور ان کی غزلوں میں تغزل کی تمام ہی ظاہری ومعنوی خوبیاں موجود ہیں، الفاظ کے حسن انتخاب، طرز بیان کی متانت، ترکیبوں کی جدت و موسیقیت اور تشبیہات کی ندرت کے ساتھ درد و سوز کی کیفیت اور معرفت وحکمت کی باتوں نے ان کی شاعری کو شراب دوآتشہ بنا دیا ہے، عقل وخرد کی کم سوادی وکم نظری اور عشق ومحبت کی دیدہ وری وچارہ گری کے مضامین وہ خوب خوب باندھتے ہیں، اور ان میں بلامبالغہ یک رنگ و صد آہنگ کا سماں پیدا کر دیتے ہیں، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اسرار محبت سے بیگانہ رہی دنیا ... ارباب جنوں سی ہیں کچھ دیدہ وری آئی

یہ حسن کا عالم بھی مرہون جنوں نکلا ... غنچوں کی بھی فطرت میں کچھ جامہ دری آئی

بکھرے ہوئے جلوؤں کے انداز کو یہ پوچھو ... دیوانے کی قسمت میں کیوں دربدری آئی

ہے جنت بنا دیتی ہے روش محبت کی ... نشیمن ورنہ طومار خس وخاشاک ہوتا ہے

کرم کر اے جنوں اس کو قبائے آگہی دے ... لباس عقل آتا ہی نظر بوسیدہ بوسیدہ

ابھی ہے دور بہت منزل کمال جنوں ... ابھی تو جیب وگریباں بھی تار تار نہیں

ان کی اکثر غزلوں کو پڑھ کر خواجہ میر درد کی عرفاں آب غزلوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اپنی شاعری کے بارے میں انھوں نے بالکل صحیح کہا ہے

احمد میرے سخن میں تغزل بھی ہے مگر ... طرز ادا و حسن بیاں عارفانہ ہے

امید ہے کہ یہ مجموعہ اہل ذوق میں کافی مقبول ہوگا اور اس کے مطالعہ سے موجودہ ذوق شعری میں جلا اور پاکیزگی پیدا ہوگی، البتہ اس مختصر مجموعہ کی ابتدا حمد و نعت کے بجائے وداع حجاز سے کچھ خلش سی پیدا کرتی ہے، اسی طرح لفظ "دربدری" بھی محل نظر ہے، محاورہ دربدر پھرنا ہے۔

حقوق الاسلام مع رسالہ سماع و مزامیر } از قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ ترجمہ وحید الدین سلیم پانی پتی، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر پاک اکیڈمی (۱۸۱) وحید آباد گولی مار کراچی ۱۸۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ ان بزرگوں میں ہیں جن پر ہندوستان کو ہمیشہ فخر رہے گا، مرزا مظہر جانجاناں کی بزم عرفاں سے انھیں علم الہدی اور شاہ عبد العزیزؒ کے آستان علم سے بیہقی وقت کا خطاب ملا تھا، تفسیر مظہری ان کے علم و فضل کا سب سے بڑا مظہر ہے، قاضی صاحبؒ کی کتاب مالا بد منہ آج چالیس پچاس برس پہلے گھر گھر پڑھی جاتی تھی اور بچوں کے نصاب کا لازمی جزو تھی، قاضی صاحب نے جو اپنی تحریری یادگاریں چھوڑی ہیں ان میں یہ رسالہ بھی ہے، اس میں خدا اور رسول کے حقوق اور انسانوں کی تمام اصناف سے لیکر جانوروں تک کے حقوق کا ذکر ہے، ہندوستان میں اس موضوع پر غالباً یہ سب سے پہلی تصنیف ہے۔ قاضی صاحب کی دوسری تصانیف کی طرح یہ رسالہ بھی ان کے عالمانہ اور شستہ انداز بیان کا اعلیٰ نمونہ ہے، ترجمہ کے لیے وحید الدین سلیم پانی پتی جیسے صاحب علم و ادب کا نام ضمانت ہے، سماع و مزامیر پر بھی ایک رسالہ قاضی صاحب نے لکھا تھا، آخر میں وہ بھی شامل ہے، اس میں انھوں نے تمام فقہاء و محدثین کی رائیں نقل کرنے کے بعد سماع کے سلسلہ میں خود محاکمہ کیا ہے، اور نقش بندیوں کا یہ طریقہ نقل کیا ہے کہ نقش بندیوں نے وہ کام قرآن اور نماز اور ذکر و فکر سے لیا ہے جو اوروں نے گانے بجانے سے لیا تھا، رسالہ ہر مسلمان کے پڑھنے کے لائق ہے۔

انسان اور اسکے مسائل ۔ از مولوی سید جلال الدین انصر عمری، صفحات ۴۰، کتابت و طباعت بہتر، ناشر مکتبہ جماعت اسلامی ہند، قیمت ۵۰ عمر

انسانی زندگی بے شمار اور گوناں گوں انفرادی و اجتماعی مسائل سے گھری ہوئی ہے، انکی

مسائل کے حل یا عدم حل پر اس کی صلاح و فلاح اور سکون و اطمینان کا مدار ہے، اس لیے ہر زمانہ میں انسانی دماغ نے ان مسائل کو سلجھانے کی کوشش کی، مگر اس کے فکر کی رسائی مادی مسائل کے حل سے آگے نہ بڑھ سکی۔ انسان چونکہ اپنے مادی وجود کے ساتھ اپنا ایک اخلاقی وجود بھی رکھتا ہے جس کی ضرورتوں اور پیچیدگیوں تک انسان کا ذہن مشکل ہی سے پہنچ پاتا ہے، اس لیے وہ زندگی کے اس خلا کو بالکل ہی پر نہ کر سکا، بلکہ انسان کی الجھنوں میں ان سے کچھ اور اضافہ ہی ہوگیا، یہ سعادت صرف خدا کے بھیجے ہوئے دین کو حاصل ہے، کہ اس نے انسان کے مادی اور اخلاقی دونوں وجودوں کے مسائل اور ان کی الجھنوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے، اور اس میں اسے اس لیے کامیابی ہوئی ہے کہ وہ دین خود انسان کے خالق کا بھیجا ہوا ہے، جو اس کے قلب و دماغ کے احساسات و جذبات اور ضروریات سے خود انسان سے بھی زیادہ واقف ہے، مولوی جلال الدین انصر صاحب نے انہی مسائل کا تجزیہ کرکے ان کا اسلامی حل پیش کیا ہے، بحث کا طریقہ فلسفیانہ نہیں بلکہ مصلحانہ ہے، امید ہے کہ اس کے مطالعہ سے ذہن کی بہت سی الجھنیں ختم ہو جائیں گی،

ترجمہ فیوض الحرمین۔ از مولانا عابد الرحمٰن صاحب صدیقی، ضخامت ۲۰۸ کتابت و طباعت متوسط، ناشر محمد سعید اینڈ سنز، قرآن محل کراچی، قیمت للعہ

شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب فیوض الحرمین کا ترجمہ ہے۔ ترجمہ کی زبان صاف اور سلیس ہے، اگر اس کے انتخاب کا ترجمہ شائع کیا جاتا تو زیادہ مفید ہوتا، اس سلسلہ میں پاکستان کے ناشروں کو زیادہ توجہ دینی چاہیے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے علم و فضل کے ساتھ جو باطنی نعمتیں عطا کی تھیں، اس رسالہ سے اس پر کافی روشنی پڑتی ہے، یہ محض خواص کے مطالعہ کی چیز ہے۔

ع ۔ م

جلد ۹۰ ماہ جمادی الثانی ۱۳۸۲ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۶۲ء عدد ۵

مضامین

مقالات

ایک ضروری اطلاع:-

معارف کے پاکستانی خریداروں کے لیے

پاکستان میں معارف کے جو خریدار ہیں اور وہ اس کا چندہ ہندوستان نہیں بھیج سکتے یا جو اپنے نام اب معارف جاری کرانا چاہتے ہیں، وہ اس کا سالانہ چندہ مبلغ ہے جناب یحییٰ احمد صاحب ہاشمی لکچرار اردو سندھ یونیورسٹی حیدرآباد (مغربی پاکستان) کے یہاں جمع کرکے اسکی رسید دارالمصنفین اعظم گڑھ کو بھیج دیں تو معارف ان کے نام جاری ہو جائے گا۔

"منیجر"

شذرات

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینے ہمارے قدیم اور سابق رفیق مولانا سعید انصاری نے لاہور میں انتقال کیا، وہ دارالمصنفین کے دور اول کے رفقاء میں تھے، ان میں تالیف و تصنیف کا بہت اچھا سلیقہ تھا، اور وہ اردو زبان و ادب کا بڑا ستھرا مذاق رکھتے تھے لیکن مزاج میں استقلال اور اعتدال و توازن نہ تھا، اس لیے کسی ایک مقام پر جم کر نہ رہ سکے پہلی مرتبہ دارالمصنفین میں ان کا قیام سات آٹھ سال تک رہا، اس مدت میں انھوں نے سیر انصار اور سیر الصحابیات لکھی، اور امام ابومسلم اصفہانی معتزلی کی تفسیر جامع التاویل لمحکم التنزیل" جواب دنیا سے ناپید ہو چکی ہے، اس کے اقتباسات امام رازی کی تفسیر کبیر سے جمع کرکے اسکو کتابی شکل میں مرتب کیا، جو اسی زمانہ میں دارالمصنفین سے شائع ہو گئی تھی، پھر دارالمصنفین چھوڑ کر صوفی نیڈ ی بہاء الدین کے یہاں چلے گئے اور اس کے لیے سیر الصحابہ کے نام سے شیخینؓ کے حالات ایک جلد میں لکھے، اس کے بعد مختلف اسکولوں میں ٹیچر رہے، مگر ان میں مستقل قیام نہ رہ سکا اس لیے حضرت سید صاحبؒ نے ان کو پھر دارالمصنفین بلا لیا، اس مرتبہ ان کا قیام تین چار سال رہا، مگر متفرق مضامین کے علاوہ اس دور کی اور کوئی یادگار نہیں ہے، یہاں سے دوبارہ الگ ہونے کے بعد مختلف رسالوں کے اڈیٹر رہے، پھر سید صاحب نے ان کو ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے سہ ماہی اردو رسالہ کا اڈیٹر مقرر کرا دیا، چند برسوں کے بعد اس سے بھی الگ ہو گئے، اور پاکستان قائم ہونے کے بعد لاہور چلے گئے، حضرت سید صاحبؒ نے ان کو لاہور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو انسائیکلوپیڈیا میں رکھا دیا، اسی خدمت پر تھے کہ دفعۃً ان کے انتقال کی خبر ملی، شاعر بھی تھے نشتر تخلص تھا، اردو اور فارسی دونوں میں داد سخن دیتے تھے، اردو کلام کا انتخاب جمالیاتی شاعری کے نام سے الہ آباد کے قیام کے زمانہ میں اور فارسی غزلوں کا مجموعہ چند سال ہوئے لاہور سے شائع کیا تھا، اپنے

مکاتیب کا مجموعہ بھی مرتب کیا تھا، مگر اس کی اشاعت کی نوبت نہ آسکی تھی کہ وقت آخر ہو گیا، انکی شخصیت ان کے احباب کے لیے بڑی دلکش و دلآویز تھی اور ان کے بعض اوصاف بڑے معصومانہ تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے۔

چین نے اپنے دوست اور محسن ملک کے ساتھ جو جارحانہ رویہ اختیار کیا ہے اس کی توقع کسی شریف اور شائستہ قوم سے نہیں ہو سکتی، ہندوستان نے ہر موقع پر اس کے ساتھ انسانیت اور شرافت کا ثبوت دیا، اس کا بدلہ وہ اس وحشیانہ شکل میں دے رہا ہے، اس غیر متوقع صورتِ حال نے ہندوستان کو فوری طور پر فکر و تردد میں ضرور مبتلا کر دیا تھا، لیکن اس قسم کے حالات سے آزاد قوموں کو سابقہ پڑتا ہی رہتا ہے، اور ملک کی حفاظت اور اس کی عزت و ناموس کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں، ہندوستان کی آزادی کے بعد اس کے امتحان کا یہ پہلا موقع ہے، ایک باوقار قوم کی حیثیت سے اس کو اس امتحان میں پورا اترنا ہے، اور پوری قوت سے چین کا مقابلہ کرکے اس کی حیثیت واضح کر دینا ہے۔ دنیا میں تنہا مادی قوت ہی سب کچھ نہیں ہے، اس سے بڑھ کر حق و صداقت اور انصاف و اخلاق کی طاقت ہے جو ہندوستان کے ساتھ ہے، اور اب وہ مادی قوت میں بھی کمزور نہیں ہے، اس لیے بالآخر فتح اسی کی ہوگی۔

یہ تنہا ملک و وطن ہی کا سوال نہیں، بلکہ حق و انصاف کا بھی سوال ہے، اور چین ایک ملحد ملک ہے، اس لیے اس کا مقابلہ مسلمانوں کا مذہبی فرض بھی ہے، اخلاقی بھی اور وطنی بھی، دوسرے نظاموں کی تو "بقائے باہم" کے اصول پر کمیونزم سے مفاہمت ہو سکتی ہے، لیکن اسلام سے کسی قیمت پر بھی نہیں ہو سکتی، چنانچہ مسلمانوں کی تمام مذہبی جماعتوں نے جنگ میں اپنی پوری حمایت اور عملی شرکت کا اعلان کیا ہے، اور مسلمانوں کا قدم اس میدان میں کسی سے پیچھے نہ رہیگا اور وہ ملک کے دفاع میں کسی قربانی سے دریغ نہ کرینگے۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد اسلامی ملکوں کے جو سربراہ بھی یہاں آئے، وہ سب کے سب اسلام کا نام زبان پر لاتے شرماتے یا کم سے کم گھبراتے تھے، اور صرف قومیت، وطنیت اور جمہوریت وسیکولرزم کے ترانے گاتے تھے، ٹنکو عبدالرحمن پہلے شخص ہیں جنھوں نے علانیہ اسلامی خیالات کا اظہار کیا بلکہ ملایا کے سرکاری مذہب اسلام ہونے کا بھی بغیر کسی جھجک کے اعلان کیا، لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے مسلمانوں کو قوم پروری اور وطن دوستی کی بھی پوری تلقین کی اور ان دونوں خیالات میں اس قدر اعتدال و توازن ہو کہ کوئی مخالف بھی ان پر حرف گیری نہیں کر سکتا، درحقیقت مذہب و ملت اور قوم و وطن کے حقوق و فرائض میں واقعی تضاد نہیں ہے، بلکہ تضاد ان کے تنگ نظر پرستاروں نے پیدا کر دیا ہے، اگر ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کے پہلے رہنما اور اس راہ میں سب سے زیادہ ایثار و قربانی کرنے والے وہی مسلمان تھے جو پکے مسلمان اور اسلام کے صحیح نمائندے تھے، باقی مستثنیٰ مثالوں سے تو کوئی کلیہ بھی خالی نہیں، ایسے کٹر مسلمانوں میں بھی ملک و وطن سے بے وفائی کی مثالیں مل جائیں گی جن کی قوم پروری، ملت فروشی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی، اور وہ حکومت کے بڑے منظور نظر اور خطاب یافتہ تھے بلکہ خود ہندوؤں میں اس کی مثالیں موجود ہیں،

دار المصنفین نے تاریخ ہند کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس کو اہل نظر نے بڑی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا، اس سلسلہ کی تالیفات کی افادیت اور مقبولیت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس کی دو کتابوں پر اتر پردیش کی حکومت نے انعام دیا، "ہندوستان کے قرون وسطیٰ کی ایک ایک جھلک" پر دو سال ہوئے ایک ہزار کا انعام ملا تھا، اور "ہندوستان کے قرون وسطیٰ کا فوجی نظام" پر اس سال بارہ سو روپیے کا انعام ملا، اس سلسلہ کی تکمیل کے بعد حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک پرانا خواب پورا ہو جائے گا اور یہ دار المصنفین کا ایک بڑا علمی کارنامہ ہوگا۔

مقالات

ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

از جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ایم اے

(۸)

وحدۃ الوجود کا جھگڑا

ہندوستان میں اسلام کے ابتدائی دور کے صوفیۂ کرام میں زیادہ تر خشیت الٰہی کا غلبہ رہا، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا ارشاد تھا کہ عارف کے لیے تین ارکان ضروری ہیں، ہیبت، تعظیم اور حیا، اپنے گناہوں سے شرمندہ ہونا ہیبت ہے، طاعت گذاری تعظیم ہے، اور خدا کے سوا کسی پر نظر نہ ڈالنا حیا ہے، حضرت خواجہ بختیار کاکی رحمۃ اللہ خشیت الٰہی کی بنا پر کشتۂ خنجر تسلیم ہوئے، ان بزرگ پر خداوند تعالیٰ کی ہیبت ایسی طاری رہتی کہ وہ برابر عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے، حضرت فریدالدین گنج شکرؒ ریاضت کی وجہ سے اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ دو قدم چلنا ان کے لیے مشکل تھا، ایک بار وہ کچھ تھوڑی دور چلنا چاہتے تھے، عصا کے سہارے اٹھے، مگر چند قدم چلے ہوں گے کہ چہرہ کا رنگ متغیر ہو گیا، ہاتھ سے عصا چھوڑ دیا، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ ساتھ تھے، انھوں نے پریشانی

کا سبب پوچھا تو فرمایا عصا پر سہارا کیا تھا، اس لیے عتاب نازل ہوا کہ غیر کا سہارا لیتے ہو، اسی لیے عصا چھوڑ دیا اور محجوب ہوں۔ وہ فرماتے تھے کہ عبادت الٰہی سے عشق کی تکمیل ہوتی ہے، عبادتِ الٰہی سے اسرار الٰہی معلوم ضرور ہوتے ہیں لیکن ان کا ظاہر کرنا عشق کے منافی ہے۔

لیکن آگے چلکر صوفیہ کرام میں عشق الٰہی کا غلبہ زیادہ ہوگیا اور جب اسکا اظہار کرنے لگے تو وحدۃ الوجود کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا، خواجگان چشت کے ملفوظات میں عشق الٰہی کا ذکر تو جا بجا ہے جس میں وحدۃ الوجود کے رموز و نکات تلاش کیے جا سکتے ہیں لیکن میرا خیال یہ ہے کہ وحدۃ الوجود کی باضابطہ علمی بحث سب سے پہلے حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات سے شروع ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ مجاہدہ اور ریاضت کی کثرت سے سالک ایسا مستغرق ہو جاتا ہے کہ عالم جو آئینۂ حیرت ہے اسکو نظر نہیں آتا، ساری ہستیاں اس کی نظر میں گم ہو جاتی ہیں، اور وہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کچھ نہیں دیکھتا، اس پر فنائیت طاری ہوتی ہے، اس کو فنا فی التوحید یعنی ہمہ اوست کہتے ہیں، فنا فی التوحید کے بعد بھی ایک مرتبہ ہے جس کا نام الفناء عن الفنا ہے، اس مرتبہ میں سالک کو کلی استغراق میں اپنی فنائیت کی بھی خبر نہیں ہوتی، اور وہ خدا کے جلال اور جمال میں کوئی فرق اور تمیز نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ تمیز باقی رہ جاتی ہے تو یہ تفرقہ کی دلیل ہے، عین الجمع اور جمع الجمع کا مقام اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب سالک اپنے اور کل کائنات کو خدا کے نور میں غرق کر دیتا ہے، اور اس کو خبر نہیں ہوتی ہے کہ کون اور کیا غرق ہوا، اس مقام تفرید میں پہنچکر سالک کو وحدۃ الوجود کی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے، اور وہ ایسا محو ہو جاتا ہے کہ اس کو اسم و رسم، وجود و عدم، عبارت و اشارت، عرش و فرش اور اثر و خبر سے کوئی واقفیت نہیں ہوتی، اور اس مقام کے سوا کہیں اور جلوہ گر نہیں ہوتا، یہاں کے سوا اس کا نشان کہیں اور ظاہر نہیں ہوتا، اس جگہ حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے بطور انتباہ لکھا ہے کہ توحید وجود کا علم کے درجہ میں ہو یا شہود کے ابتدائی درجہ سے انتہائی درجہ میں ہو، ہر درجہ میں بندہ بندہ ہے اور خدا خدا ہے، اس لیے انا الحق سبحانی ما اعظم شانی (میں خدا ہوں، میں پاک ہوں اور میری شان

اس قدر بڑی ہے) وغیرہ کہنا کلمات کفر ہیں۔

وحدۃ الوجود کی زیادہ تفصیلی بحث حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے یہاں ملتی ہے۔ ان کے نزدیک ہمہ اوست ہی حقیقی توحید ہے اور اس کو انھوں نے آیات قرآنی، احادیث نبوی اور دوسرے دلائل سے ثابت کیا ہے، اس مسئلہ پر اس دور میں جتنی بحثیں ہوتی رہیں، ان میں شریعت کا دامن کسی حال میں نہیں چھوڑا گیا، مگر آگے چل کر اس کا رنگ کچھ اور ہو گیا۔

حضرت عبد القدوس گنگوہیؒ شریعت کے بڑے پابند تھے، اور اپنے تقویٰ میں ان تمام چیزوں سے پرہیز کرتے جن کی شرعی حیثیت ذرا بھی مشکوک ہوتی، وہ عام قصابوں کا ذبیحہ نہ کھاتے تھے، کیونکہ وہ عموماً نمازی نہ ہوتے تھے لیکن جب وہ وحدۃ الوجود کے قائل ہوئے تو ان پر اس کا اتنا غلبہ ہوا کہ وہ اس کو جزو ایمان سمجھنے لگے، اور اس کے منکر کو بدعقیدہ سمجھتے، لطائف قدوسی میں ہے کہ ایک بار ان کے صاحبزادوں نے ان سے عرض کیا کہ وحدۃ الوجود کی کوئی تصریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں نہیں ملتی، اور ہم اس کو اپنے عقیدہ کا ایک جزبنائے ہوئے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ آخرت میں اس پر مواخذہ کیا جائے، حضرت عبد القدوس گنگوہیؒ نے پہلے ان کو قائل کرنے کی کوشش کی، لیکن پھر ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ان کے لڑکے وحدۃ الوجود کے منکر ہیں، تو علم معرفت میں بھی ناقص ہیں، اس لیے ان کے ساتھ رہنا پسند نہیں کیا، اور گنگوہ چھوڑ دینے کا قصد کیا، وہ گنگوہ تو نہ چھوڑ سکے لیکن اپنے لڑکوں کے پیچھے نماز پڑھنی چھوڑ دی، ان پر وحدۃ الوجود کا جو غلبہ تھا، اس کا اظہار انکے حسب ذیل مکتوب سے ہوتا ہے:۔

یہ کیسا شور ہے اور کیسا غوغا پھیلا ہوا ہے کہ کوئی مومن ہے، کوئی کافر ہے، کوئی اطاعت کرنے والا ہے، کوئی گنہگار ہے، کوئی صحیح راستہ پر ہے، کوئی غلط راہ پر چل رہا ہے، کوئی مسلم ہے، کوئی پارسا ہے، کوئی ملحد ہے، کوئی ترسا ہے، سب ایک ہی لڑی کے موتی ہیں"

ان فقروں میں انسانی محبت، اخوت اور وحدت کا بڑا درد بھرا پیام ہے، لیکن راہ سلوک کی منزلوں کو طے کرکے جس مقام پر حضرت عبد القدوس گنگوہیؒ پہنچ گئے تھے، وہاں سے یہ درد بھری آواز نکل کر فضا میں گونجی تو کوئی تعجب کی بات نہیں تھی، لیکن بعض دنیادار اور خام صوفیہ اس مقام پر پہنچے بغیر نظری طور پر وحدۃ الوجود کے قائل رہے، اور مذہب و ملت، خیر و شر اور نور و ظلمت کی تفریق مٹانے کی کوشش میں بڑی افراتفری پیدا کر دی، اور توحید وجودی کی آڑ لیکر شرعی احکام سے مداہنت اور اغماض کرنے لگے، اور نظری طور پر یہ دلائل پیش کرتے کہ شریعت حقیقت کا چھلکا ہے، اور حقیقت شریعت کا گودا ہے، اور جب حقیقت حاصل ہو جائے تو شریعت کی ضرورت باقی نہیں رہتی، شریعت کے نافذ کرنے کا مقصد یہ تھا کہ معرفت حاصل ہو، اور جب معرفت حاصل ہو جائے تو شریعت کی پابندی سے خود بخود آزادی حاصل ہو جاتی ہے، شرعی احکام کی پابندیاں صرف عوام کے لیے ہیں، خواص کو معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو پھر اس کے لیے نماز روزے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، کیونکہ نماز کی بنیاد تو اس پر ہے کہ آدمی اور خدا دو جداگانہ چیزیں ہیں، اور اس کے ادا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ غیر و غیریت دور ہو، اور جب یہ غیریت دور ہو جائے تو پھر نماز کی پابندی بیکار چیز ہے، اسی طرح وہ عذاب و ثواب کے بھی منکر ہو گئے، اور کہتے کہ روح وحدت سے نکل کر کثرت میں آئے اور پھر کثرت سے وحدت میں گم ہو جائیں گے تو عذاب و ثواب کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، وہ یہ بھی کہتے کہ جب وہ وحدت میں گم ہو جاتے ہیں تو انا الحق کا نعرہ لگاتے ہیں، ایسی حالت میں اگر ان کے مریدان کا سجدہ کریں تو ناجائز نہیں، اسی افراتفری میں وہ حسین و جمیل صورتوں کو پسند کرتے اور کہتے کہ حسن و جمال حضرت واجب الوجود سے مستعار ہے، اسی لیے حسینوں کی صحبت رسائی حق کی راہ ہے، وہ سادہ رخوں کے رنگ میں اللہ ہی کے ایسا رنگ دیکھتے، اور حسینوں کے غمزوں اور عشووں کے ذریعہ مجازی عشق سے حقیقی عشق تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھتے۔

علما ان تمام باتوں کو بدعت اور گمراہی قرار دیتے اور ان پر عقیدہ رکھنے والوں کو بزرگ ماننے کے بجائے خارج از اسلام سمجھتے، وہ صرف لا الٰہ الا اللہ کے ماننے والے کو مسلمان سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوتے جب تک کہ وہ محمد رسول اللہ کے بھی قائل نہ ہوتے، کیونکہ نہ صرف ان کی بلکہ شریعت کے پابند صوفیہ کی بھی دلیل تھی کہ خود خداوند تعالیٰ نے کلام پاک میں فرمایا ہے کہ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (یعنی اے محمدؐ تم لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم خدا کی محبت کا دعویٰ کرتے ہو تو میری اتباع کرو یعنی میرے افعال، اقوال اور احوال کی پیروی کرو، پس اللہ تم کو دوست رکھے گا) اسی لیے علما، توحید اور رسالت دونوں پر یقین کامل رکھنے ہی میں عقیدہ اور ایمان کی سلامتی سمجھتے اور کہتے کہ صوری اور معنوی اخلاق کی درستگی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل متابعت نہ ہو، اسی متابعت کے ذریعہ سے اللہ تبارک و تعالیٰ کی قربت حاصل ہونا ممکن ہے، وہ انا الحق کے کہنے والوں کو مرتد اور بے دین سمجھتے، اسی لیے ان کے خلاف ہنگامہ کرتے، اور سلاطین وقت سے مل کر ان کو قتل یا جلا وطن کرا دیتے، جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ ایک برگزیدہ عالم بھی تھے اور عارف باللہ بھی، اس لیے انھوں نے وحدۃ الوجود کے منکر ہونے کے بجائے اس کے فلسفہ میں بڑی وضاحت پیدا کی۔ اور وحدۃ الوجود کا ازالہ وحدت شہود کی بحث سے کر دیا، انھوں نے خود راہ سلوک میں ان تمام منزلوں کو بھی طے کیا تھا، جہاں عام صوفیوں کا طائر خیال بھی نہیں گیا تھا، اسی لیے اپنے مشاہدات اور مکاشفات کی بنا پر یہ بتایا کہ جس مقام پر جا کر صوفیوں کو وحدت وجود محسوس ہوتی ہے، وہ سلوک کی آخری منزل نہیں بلکہ درمیانی منزلوں کی واردات ہیں، جہاں سالک کو محسوس ہوتا ہے کہ وجود ایک ہی ہے، اور اس ایک ذات کے سوا کچھ موجود نہیں لیکن آگے بڑھ کر معلوم

ہوتا ہے کہ محض وحدت شہود ہے، یعنی صرف ایسا نظر آتا ہے، وحدت وجود نہیں یعنی واقع میں ایسا نہیں ہے، اس وحدت شہود کے بعد عبدیت کا مقام آتا ہے، جہاں پہنچکر خالق کائنات کی حد لگا تحقیق روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہیں، اسی لیے مقام عبدیت اور ایمان بالغیب دونوں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے یہاں ایک ہی ہیں،

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے خیالات کو پورے دلائل کے ساتھ پیش کیا اور طرح طرح کی نکتہ آفرینیاں کیں، مثلاً ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ توحید شہودی یہ ہے کہ ایک ذات کے سوا کچھ اور مشہود نہ ہو، اور توحید وجودی یہ ہے کہ ایک موجود کو جاننے کے بعد اس کے غیر کو نابود سمجھا جائے اور غیر کو نا معلوم جاننے کے با وجود اس کا محض مظہر اور جلوہ خیال کیا جائے۔ توحید وجودی علم الیقین کی قسم سے ہے اور توحید شہودی عین الیقین ہے، مثلاً کسی کو آفتاب کا علم ہو تو یہ علم آفتاب ستاروں کے وجود کو بے وجود نہیں کر سکتا، اور جو عین آفتاب کو دیکھتا ہے، اس کی نگاہ عین الیقین میں ستاروں کا وجود غیرت و نابود ہے، مقام عین الیقین سے حق الیقین میں پہنچنا کوئی تضاد نہیں، اور یہ عین علم شریعت ہے۔

علماء وحدۃ الوجود کے ماننے والے کو کافر و زندیق کہتے، اس طرح صوفیہ اور علماء میں مسئلہ وحدۃ الوجود میں جو اختلاف تھا، اس کو حضرت مجدد نے دور کرنے کی بھی کوشش کی، اور اپنے ایک مکتوب میں فرمایا کہ جو لوگ وحدت وجود کے قائل ہیں اور اشیاء کو عین حق جانتے ہیں، اور ہمہ اوست کہتے ہیں، ان کی یہ مراد نہیں ہے کہ اشیاء حق تعالیٰ کے ساتھ متحد ہیں، اگر وہ یہ سمجھتے ہیں، تو یہ کفر، الحاد، زندقہ اور گمراہی ہے، کیونکہ واجب ممکن نہیں ہو سکتا، اور بے چون چون نہیں ہو سکتا، ہمہ اوست کے معنی یہ ہیں کہ اشیاء نہیں ہیں، بلکہ حق تعالیٰ موجود ہے، منصور نے جو انا الحق کہا تو اس سے یہ مراد نہیں کہ میں حق ہوں اور حق کے ساتھ متحد ہو گیا ہوں، بلکہ اس کے یہ معنی تھے کہ میں ہوں، حق تعالیٰ موجود ہے،

انھوں نے غلبۂ حال میں اپنے اور خلق کے وجود کو نہ دیکھا، صرف ایک ذات رب کی دیکھی، اگر اپنی ذات دیکھتے اور یہ الفاظ کہتے تو کفر تھا، حضرت مجددؒ اس تشریح کے بعد فرماتے ہیں کہ صوفیہ اشیاء کو حق تعالیٰ کے ظہورات جانتے ہیں، اور ان کو حق تعالیٰ کے اسماء اور صفات سمجھتے ہیں، اشیاء حق تعالیٰ سے وہی نسبت رکھتے ہیں جو آدمی کے ساتھ اس کا سایہ رکھتا ہے، کسی آدمی کے سایہ کو یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ آدمی کے ساتھ متحد ہے، اور یہ عینیت کی نسبت رکھتا ہے، سایہ آدمی کی اصل کو بدلتا نہیں ہے، وہ محض آدمی کا ظہور ہے، اسی طرح صوفیہ کے نزدیک اشیاء حق تعالیٰ کے ظہورات ہیں، نہ کہ عین، اسی لیے ہمہ اوست کے معنی ہمہ از وست ہیں، جیسے سایہ آدمی سے ہے، نہ کہ عین آدمی ہے، اور ہمہ از وست کو علماء بھی تسلیم کرتے ہیں، اس صورت میں صوفیہ اور علماء میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا،

حضرت مجددؒ نے اس بحث کا ازالہ تو عارفانہ رنگ میں کیا، لیکن عالمانہ رنگ میں اس پر زور دیا کہ سالک ہو یا عارف جب تک وہ اپنے عقائد اور اعمال میں کتاب و سنت کا پابند نہیں ہے، وہ قابل تقلید نہیں، اور جن صوفیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام اور اسلاف صالحین کے سرچشمہ سے فائدہ نہیں اٹھایا ہے، ان کا تتبع ہرگز نہ کیا جائے، انکے نزدیک شریعت کی پابندی ہر حال میں ضروری ہے، فرماتے ہیں کہ جو شخص باطن کو درست کرتا ہے اور ظاہر کو یونہی چھوڑ دیتا ہے وہ بھی قابل تقلید نہیں، اور جو عارف شرعی احکام کی پابندی کو ضروری نہیں سمجھتے، وہ جاہل ہیں، احوال باطنی کا احکام شرعیہ سے آراستہ ہونا ضروری ہے، اگر علوم لدنیہ کی مطابقت صریح علوم شرعیہ سے نہیں تو ایسے تمام علوم کا حاصل کرنا الحاد اور بے دینی ہے، حضرت مجددؒ نے ان مباحث کو کچھ ایسے موثر انداز میں پیش کیا کہ بعض خام صوفیہ نے وحدۃ الوجود کے سلسلہ میں جو فتنہ انگیزیاں پیدا کر رکھی تھیں، وہ دب کر رہ گئیں۔

البتہ عالمگیری دور میں داراشکوہ نے توحید وجودی کو ایک دوسرے رنگ میں پیش کرنا شروع کیا، اس نے اپنے رسالہ حسنات العارفین میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ توحید و معرفت کے منازل و مدارج میں ایک ایسا مقام بھی آتا ہے، جب ایک سالک شریعت کفر، ایمان، خیر و شر، عبد اور معبود سے بالکل بے نیاز ہو جاتا ہے، اور بے خودی میں اس کی زبان سے ایسے کلمات نکلتے ہیں جو بظاہر مذہب و ایمان کے منافی ہوتے ہیں لیکن وہ قابل مواخذہ نہیں، اور وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ خود اس کی زبان سے شطحیات صادر ہوتے ہیں اور اسی مقام کے وجد و ذوق میں وہ صوم و صلوٰۃ سے مستغنی ہو گیا، لیکن راسخ العقیدہ علماء نے یہ کہکر اس کی مخالفت کی کہ کچھ شطحیات ایسی ضرور ہیں جو بعض صوفیائے کرام کی زبانوں سے غیر اختیاری طور پر نکلیں لیکن وہ خود داراشکوہ کی طرح ان کے جواز کے قائل نہ تھے۔

اور جب داراشکوہ نے مجمع البحرین لکھی تو علماء کے حلقہ میں ایک ہلچل پیدا ہو گئی۔ وہ لکھتا ہے کہ ہندوستان کے موحدوں کے اشغال کی یوں تو بہت سی قسمیں ہیں، لیکن بہترین شغل اجپا ہے جو ہر مذہب و ملت کے لوگ خواب اور بیداری میں بلا قصد اور بے اختیار ہو کر برابر جاری رکھتے ہیں، قرآن مجید کی یہ آیت اسی کی طرف اشارہ کرتی ہے، ان من شیٔ الا یسبح بحمدہ ولکن لا تفقھون تسبیحھم (اور کوئی چیز نہیں جو نہ پڑھتی ہو، خوبیاں اس کی لیکن تم نہیں سمجھتے ان کا پڑھنا، ۱۵- بنی اسرائیل، رکوع ۵)۔ اسی طرح ہندوستان کے موحد سانس کے اندر جانے اور باہر آنے کو دو لفظوں سے تعبیر کرتے ہیں، جو سانس باہر آتی ہے اس کو او اور جو سانس اندر جاتی ہے اس کو من، یعنی اومنم کہتے ہیں، صوفیہ اس کو ھو اللہ کہتے ہیں، اور یہ ہر ذی حیات کی سانس کے ساتھ ہے۔

اسی طرح داراشکوہ یہ بھی لکھتا ہے کہ برہما، بشن اور مہیش، جبرئیل، میکائیل اور اسرافیل ہیں، برہما جبرئیل کی طرح ایجاد، بشن میکائیل کی طرح بقا، اور مہیش اسرافیل کی طرح فنا کے موکل ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی صفات ان ہی تینوں کے ذریعہ سے ظاہر ہوتی رہتی ہیں، صوفیہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی دو ہی صفتیں ہیں، جمال اور جلال لیکن

ہندو فقرا کے یہاں تین صفتیں (ترگن) ہیں، ست (ایجاد)، رج (بقا)، تم (فنا) اسی طرح داراشکوہ نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ روح اور آتما، ابو الارواح اور پرماتما، ناسوت اور جاگرت، ملکوت اور سپن، جبروت اور سکھوپت، لاہوت اور تریا، اسم اعظم اور بید کھہ، اللہ اور اوم فرشتہ اور دیوتا، مظہر اتم اور اوتار، فردوس اعلیٰ اور بیکنٹھ، قیامت کبریٰ اور مہا پرلی، رستگاری اور مکت، عالم کبیر اور برہمانڈ، حوران بہشت اور اچھرا، طوبیٰ اور کلپ برچھ وغیرہ ایک ہیں، دارا نے یہ دکھا کر یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اسلامی تصوف اور فلسفۂ ویدانت میں لفظی اختلاف کے سوا کوئی اور فرق نہیں، توحید کے شیدائی ان دونوں میں سے جس کی بھی تقلید کریں، حقانیت کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں،

اسی حقانیت کی تلاش میں داراشکوہ نے اپنشد کا مطالعہ شروع کیا، اور اس کا خود بیان ہے کہ اس کو علم توحید توریت، انجیل اور زبور کے مطالعہ سے حاصل نہ ہو سکا، کیونکہ ان میں توحید کا بیان مجمل ہے، وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اس کی تسلی قرآن پاک سے بھی نہ ہو سکی، کیونکہ اس کی اکثر باتیں رمزی ہیں، آخر اس کو توحید کی تمام باتیں اپنشد میں مل گئیں، جس کے پچاس ابواب کا ترجمہ اس نے فارسی میں کرکے عام کیا، اور وہ اس کا اس قدر قائل ہو گیا کہ وہ اس کو کتاب قدیم پہلی آسمانی کتاب، بحر توحید کا سرچشمہ، قرآن مجید کی اصل اور کتاب مکنون قرار دیتا ہے، اور پھر اس نے یہ بھی ظاہر کرنے کی کوشش کی ہو کہ ہمہ اوست یا ہمہ از وست یا ہمہ در وست کا جو خیال صوفیہ میں مقبول ہے وہ ان ہی اپنشدوں سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے، اس نے بھگوت گیتا اور جوگ بشسٹ کے فارسی ترجمے انہی موحدانہ خیالات سے متاثر ہو کر کیے اور وہ رام چندر جی اور بشسٹ جی کی روحانیت کا بھی قائل ہو گیا،

دارا اپنی اس وسیع المشربی کی وجہ سے ہندوؤں میں خصوصاً شاہجہانی دربار کے راجپوت سرداروں میں بہت مقبول ہو کر ان کا ہیرو بن گیا، لیکن علما جو کتاب اور سنت کی جامد تقلید کے قائل تھے، ان

باتوں کو پسند نہ کر سکے، ان کی اور ان کے ساتھ راسخ العقیدہ مسلمانوں کی نظریں اورنگ زیب کی طرف اٹھیں، جو حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تعلیمات سے متاثر تھا، اور شریعت کا پابند ہونے کی امکانی کوشش کرتا رہتا تھا، وہ مسلمانوں کا ہیرو بن گیا، اور جب وہ دکن سے جنگ جانشینی کے لیے روانہ ہونے کو تھا، تو حضرت شیخ برہان کی خدمت میں برہانپور حاضر ہوا، شیخ برہان بادشاہ اور امراء سے ملنا پسند نہ کرتے تھے، اس لیے اورنگ زیب پہلے بھیس بدل کر ان کی مجلس میں شریک ہوا، ایک نووارد کو دیکھ کر شیخ برہان نے اس سے نام پوچھا، اس نے اپنا نام بتایا تو وہ اس کی طرف مخاطب نہیں ہوئے، نہ اور لوگوں کی طرح اس کو کوئی تبرک دیا، لیکن وہ دوسرے دن پھر ان کی خانقاہ میں پہنچا، شیخ برہان نے اپنی آزردگی کا اظہار کرتے ہوئے اس سے کہا کہ یہ مکان تم کو پسند ہے تو لے لو، ہم کہیں اور جگہ چلے جائیں گے، مگر تیسرے دن اورنگ زیب پھر ان کے پاس گیا، وہ نماز کے لیے اپنی خانقاہ سے باہر نکل رہے تھے کہ اورنگ زیب مودبانہ ان کے سامنے کھڑا ہو گیا، اور عرض کی کہ دارا نے شریعت کو نظر انداز کر رکھا ہے، اگر مجھ کو حکومت ملی تو دین نبوی کے احکام کے ساتھ رعیت پروری بھی کروں گا، آپ باطنی توجہ فرمائیں، شیخ برہان نے فوراً کہا، ہمارے جیسے کم استطاعت فقیروں کی دعا سے کیا ہوتا ہے، تم بادشاہ ہو، نیکی، عدل پروری، رعیت نوازی کی نیت کے ساتھ دعا کرو، ہم بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں، اسی وقت اورنگ زیب کے ساتھی شیخ نظام نے اورنگ زیب کہا بادشاہی مبارک ہو،

دارا شکوہ اگر موحد بننے پر اکتفا کر لیتا تو اپنی وسیع المشربی اور رواداری کی وجہ سے کبیر، جے دیو، راماننج اور چیتن وغیرہ کی صف میں نمایاں جگہ پا لیتا، لیکن اپنے کو موحد اور عارف باللہ ظاہر کرنے کے ساتھ وہ عام تیموری شہزادوں کی طرح درباری سیاست کا بھی کھیل کھیلتا رہا، اور آخر میں آگرہ میں بیٹھ کر حصول تخت و تاج کے لیے وہ برادرانہ جنگ

کرائی، اور جب اس میں ناکامی ہوئی تو سموگڈھ کی لڑائی میں فوج کی رہبری خود کی، ان دونوں لڑائیوں میں راجپوت جس پامردی اور شجاعت سے اس کی خاطر لڑے وہ ہندوستان کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے، لیکن ایک بہت بڑے گروہ کا یہ خیال ہے کہ راجپوتوں کی یہ جانبازی اور جلادت شاہجہاں کے بڑے لڑکے سے زیادہ مجمع البحرین کے مصنف، اپنشد، بھگوت گیتا اور یوگ وششٹ کے مترجم، اور رام چندر جی اور وششٹ کے معتقد کی خاطر تھی، لیکن دیر و حرم کی تفریق مٹانے والا دارا مغلوب ہوا، اورنگ زیب غالب ہو کر ہندوستان کا شہنشاہ بنا تو دارا علماء اور فقہاء کے فتوے کے مطابق نذر شمشیر کر دیا گیا۔ ایک گروہ کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر دارا تخت پر بیٹھتا تو مسلمانوں کی سلطنت باقی رہتی لیکن جس گروہ نے اورنگ زیب کو اپنا ہیرو بنا لیا ہے، وہ یہ کہتا ہے کہ دارا کی تخت نشینی سے مسلمانوں کی حکومت تو باقی رہتی لیکن اسلام ختم ہو گیا ہوتا۔ اورنگزیب کے بعد مسلمانوں کی سلطنت تو ختم ہو گئی لیکن اسلام باقی رہ گیا۔ اور یہ ہندوستان کی تاریخ کا بڑا دلچسپ پہلو ہے کہ اورنگ زیب کی مخالفت میں غیر مسلم موزخوں نے اپنی تحقیقات کا ایک ڈھیر لگا دیا ہے لیکن جتنا زیادہ اس کو برا دکھانے کی کوشش کی جا رہی ہے، اتنا ہی وہ عام مسلمانوں کی نظروں میں محبوب ہوتا جا رہا ہے۔ اور اب وہ اس کو ایک مذہبی پیشوا سمجھنے لگے ہیں جس کے خلاف کسی قسم کی ناروا بات سننے کے لیے تیار نہیں "

شاہ ولی اللہ اور توحید وجودی | عالمگیری عہد میں داراشکوہ اور سرمد کے قتل کے بعد توحید وجودی کا جھگڑا دب کر رہ گیا، آگے چل کر کچھ ابھرا تو توحید وجود اور توحید شہود پر پھر بحث شروع ہوئی، لیکن اس جھگڑے کو شاہ ولی اللہ نے چکایا، وہ عالم بھی تھے اور صوفی بھی، ان کا شرارۂ علم ان کے نور باطن سے چمکا تو انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اہل وجود اور اہل شہود کے درمیان محض نزاع لفظی اور فرق تعبیری ہے، حقیقی اور واقعی نہیں، اس سے یہ فائدہ ہوا کہ

وحدۃ الوجود کا مسئلہ عملی زندگی میں غیر موثر ہو کر رہ گیا، اور وہ شاعروں یا بعض صوفیہ کے یہاں ایک نظری اور روایتی چیز بن کر رہ گیا،

سماع کا جھگڑا | وحدۃ الوجود کے مسئلہ کے بعد علما، اور صوفیہ میں جو چیز سب سے زیادہ متنازعہ فیہ رہی وہ سماع تھا۔ چشتیہ سلسلہ کے تمام بزرگوں کے یہاں سماع ان کی عبادت و ریاضت کا ایک جزء بن گیا تھا، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ پر محفل سماع میں غیر معمولی کیفیت طاری رہتی، اور وہ بعض اشعار سنکر کئی روز تک بیہوش رہتے، حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ ایک بار کچھ اشعار سنکر سات روز تک مسلسل بیہوش رہے، نماز کے وقت ہوشیار ہو جاتے، لیکن نماز ادا کرکے پھر بیہوش ہو جاتے۔ ان کا وصال بھی سماع کی بدولت ہی ہوا حضرت فرید الدین گنج شکرؒ پر بھی سماع کے وقت عجیب کیفیت طاری رہتی، اور وہ بھی کچھ اشعار سنکر ایک بار سات دن اور سات رات تک عالم سکر میں رہے، وہ تو بے چین ہو کر رقص بھی کرنے لگتے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ فرماتے کہ سماع سے تحریک قلب ہوتی ہے، اور اس تحریک سے بڑی بڑی سعادتیں حاصل ہوتی ہیں، عالم ملک سے انوار ارواح پر اور عالم جبروت سے احوال قلوب پر اور عالم ملکوت سے آثار جوارح پر نازل ہوتے رہتے ہیں۔

حضرت مخدوم الملک شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے یہاں بھی محفل سماع ہوتی لیکن ان پر جب کبھی وجد طاری ہو جاتا تو خلوت میں چلے جاتے، دروازہ بند کر لیتے، وہاں کسی کو آنے کی اجازت نہ دیتے، سہروردیہ سلسلہ کے بزرگوں میں حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ بھی سماع سے شغل فرماتے تھے،

ان تمام بزرگان دین کے سماع کی محفلوں میں بڑی احتیاط برتی جاتی، اور ان میں غیر معمولی قسم کے آداب ہوتے، مثلاً چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کا یہ مسلک تھا کہ محفل سماع میں سنانے والا امرد اور عورت نہ ہو، اور جو چیز سنائی جائے وہ فواحش سے پاک ہو، اور جو سنے صرف خدا کے لیے سنے، سماع کے وقت مزامیر نہ ہوں، حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ فرماتے ہیں کہ مجلس سماع میں جو شریک ہوں وہ درویش یا درویشوں کے دوست ہوں

اور اس میں شرکت کے وقت دل تمام چیزوں سے پاک ہو، اور دل حق سبحانہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور طرف مائل نہو، لیکن ان تمام شرائط کے ساتھ بھی سماع علمار کی نظروں میں حرام رہا، اور وہ صوفیہ کے اس شغل پر اعتراض کرتے رہے، ایک روز حضرت فریدالدین گنج شکرؒ کے سامنے اسکی حلت وحرمت پر گفتگو ہورہی تھی تو فرمایا کہ سبحان اللہ! کوئی جل کر راکھ ہو جائے اور دوسرے ابھی اختلاف ہی میں ہوں. لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی فرماتے کہ سماع ان ہی لوگوں کے سامنے جائز ہے جو اس میں ایسے مستغرق ہوں کہ ایک لاکھ تلواریں بھی ان کے سر پر ماری جائیں یا ایک ہزار فرشتے بھی ان کے کان میں کچھ کہیں تو بھی ان کو خبر نہ ہو، لیکن علمار ان باتوں سے مطمئن نہ ہوتے، اور وہ صوفیہ سے سماع کے مسئلہ پر برابر الجھتے رہتے، حضرت حمیدالدین ناگوریؒ سماع کے بڑے دلدادہ تھے، ان کی وجہ سے دہلی میں سماع کی محفلیں برابر ہوتی رہتیں، سلطان شمس الدین التمش کے دربار کے مفتیوں کو یہ بدعت پسند نہ تھی، اس لیے انھوں نے التمش پر زور دیکر خواجہ حمیدالدین ناگوریؒ کو ایک محضر میں دربار طلب کیا، اور جب بحث شروع ہوئی تو حضرت حمیدالدین ناگوریؒ نے بہت ہی موثر انداز میں کہا کہ یہ اہل قال کے لیے حرام اور اہل حال کے لیے مباح ہے، اس بحث سے التمش تو مطمئن ہوگیا، لیکن دربار کے مفتی قائل نہ ہوسکے، اسی طرح حضرت مخدوم شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے فرمایا ہے کہ سماع اہل حق کے لیے مستحب، اہل زہد کے لیے مباح اور اہل نفس کے لیے مکروہ ہے، سماع اگر طلب منفعت کے لیے ہے تو یہ مذموم ہے اور اگر طلب حقیقت کے لیے ہو تو محمود ہے،

اس سلسلہ میں علمار وصوفیہ کے اختلافات کا دردناک پہلو اس وقت ظاہر ہوا جب کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے فیوض سے دہلی کے بدکار اپنی بدکاری سے باز آرہے تھے، بے نمازی نماز کے پابند ہو رہے تھے، بد دیانت بدیانتی اور بدمعاملگی کو چھوڑ رہے تھے شراب خواری وغیرہ اندوزی بند ہوگئی تھی، خواص اور عوام کے دلوں میں گناہ کا خوف غالب ہوگیا تھا،

حتی کہ شاہی خاندان کے افراد فسق و فجور سے پرہیز کرنے لگے تھے، اس وقت بھی علماء کا ایک گروہ حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ سے سماع کی حلت و حرمت پر اتنا الجھا کہ ان کو سلطان غیاث الدین تغلق کے سامنے ایک محضر میں حاضر ہو کر اپنے مذہبی عقائد کی وضاحت کرنی پڑی، خود حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کا بیان ہے کہ اس محضر میں دہلی کے فقہا، ان کی عداوت اور حسد سے بھرے ہوئے تھے، اور جب وہ نفس غنا کے جواز میں حدیثیں پیش کرتے تو علماء احناف کہتے کہ تم مقلد ہو، تم کو حدیث سے کیا مطلب ہے، اگر فقہ حنفی کی روایت ہو تو پیش کرو، یہ سن کر حضرت خواجہ فرماتے کہ وہ شہر کیونکر آباد رہے گا، جہاں لوگوں کی رائے کو احادیث نبوی پر ترجیح دی جاتی ہو، لیکن اس محضر میں حضرت شیخ بہاء الدین ذکریا ملتانیؒ کے نواسے مولانا علم الدین حکم بنائے گئے تھے، وہ اپنے زمانے کے جید عالم تھے، انھوں نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے دلائل کو سنکر سماع کی اباحت میں فیصلہ دیا، اور سلطان غیاث الدین تغلق نے اس فیصلہ کو تسلیم کر کے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کو بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ رخصت کیا،

لیکن علماء پھر بھی مطمئن نہ تھے، اور وہ معترض رہے، ایک بار حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کو ایک مجلس میں حسب ذیل شعر پر وجد آیا،

جفا بر عاشقاں گفتی نخواہم کرد ہم کردی   قلم بر بیدلاں گفتی نخواہم راند ہم راندی

اس زمانہ کے ایک عالم مولانا معیث تھے، جو شاعر بھی تھے، انھوں نے ایک رسالہ میں لکھ کر یہ اعتراض کیا کہ اس شعر میں کوئی بات نہیں ہے، اگر جور و جفا کی نسبت خداوند تعالیٰ کی جانب کیجائے تو یہ کفر ہے، اور اس قسم کے اور اعتراضات تھے، یہ رسالہ حضرت چراغ دہلویؒ کی خدمت میں بھی پیش کیا، اور انھوں نے اس کو پڑھا، اور واپس کر دیا، کچھ دنوں کے بعد ایک اور مجلس میں ان کو حسب ذیل اشعار پر بے قراری ہوئی؛

ما طبلِ مغانہ دوش بے باک زدیم عالی علمش بہ سرِ افلاک زدیم
از بہر یکے مغ بچۂ می خوارہ صد بار کلاہ توبہ برخاک زدیم

اس بے قراری کے عالم میں چھت پر تشریف لے گئے اور مولانا مغیث کو بلایا اور جب وہ سامنے آئے فرمایا، مولانا لکھو کہ اس سے میرا کیا جہل ثابت ہوتا ہے،

لیکن علماء کا اعتراض ایک حد تک صحیح تھا، اکابر صوفیہ جس کیفیت کے ساتھ محفل سماع میں شریک ہوتے اور عام صوفیہ میں لازمی طور پر نہیں ہوتی، اور افراتفری پیدا ہو جاتی، خود حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے زمانے میں بعض خانقاہوں میں محفل سماع پورے شرائط کے ساتھ نہ ہوتی، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے ملفوظات میں ہے کہ ان کے مریدوں میں سے ایک نے گذارش کی کہ آج کل بعض خانقاہوں میں درویش چنگ و رباب و مزامیر کی محفل سماع میں رقص کرتے ہیں، یہ سن کر حضرت خواجہ نے فرمایا کہ وہ اچھا نہیں کرتے، کیونکہ جو فعل نامشروع ہے، وہ ناپسندیدہ ہے، ایک مرید نے عرض کی کہ یہ درویش جب محفل سے باہر آتے ہیں اور ان سے کہا جاتا ہے کہ ایسی محفل میں کیوں شریک ہوئے، جہاں مزامیر تھے، اور وہاں کیوں رقص کیا، تو جواب دیتے ہیں کہ ہم سماع میں اس قدر مستغرق ہو جاتے ہیں کہ ہم کو خبر نہیں ہوتی کہ اس جگہ مزامیر بھی ہیں، حضرت خواجہ نے فرمایا کہ یہ جواب درست نہیں، اور یہ تمام باتیں معصیت کی ہیں،

حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ مزامیر کے ساتھ سماع سننا پسند نہیں فرماتے، اور فرماتے کہ اول تو سماع ہی میں علماء کا اختلاف ہے، اگرچہ کچھ شرائط کے ساتھ اس کو مباح کیا گیا ہے لیکن مزامیر تو بالاتفاق حرام ہیں، آگے چل کر سماع کے ساتھ مزامیر لازمی ہو گئے، اور اس کی روحانی کیفیات کم ہوتی گئیں، اور یہ محض سرود و نغمہ کی ایک مجلس بن گئی، حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے زمانہ کی ایک مجلس سماع کے متعلق ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ سماع کے وہ شرائط جو

مستقیم الاحوال بزرگوں کی کتابوں مثلاً عوارف المعارف وغیرہ میں مفصل درج ہیں، ان میں سے اکثر اس وقت کے لوگوں میں مفقود ہیں، بلکہ اس قسم کا سماع ورقص اور مجلس اجتماع جو آجکل کے لوگوں میں مروج ہے، کچھ شک نہیں کہ مضر محض اور منافی صرف ہے، سماع سے مدد واعانت کا حاصل ہونا مفقود ہے، اور مضرت ومنافات موجود، پھر ایک دوسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ بہت سے لوگ اپنے اضطراب وبے قراری کی تسکین سماع ونغمہ اور وجد وتواجد میں ڈھونڈھتے ہیں اور اپنے مطلوب کو نغمے کے پردہ میں مطالعہ کرتے ہیں، اسی لیے انھوں نے رقص ورقاصی کو اپنی عادت بنا لیا ہے، حالانکہ انھوں نے سنا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے حرام میں شفا نہیں رکھی، اگر نماز کے کمالات کی حقیقت کچھ بھی ان پر منکشف ہو جاتی تو ہرگز سماع ونغمہ کا دم نہ بھرتے اور وجد وتواجد کو یاد نہ کرتے، ع

چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

علماء کی مخالفت کے باوجود بہت کم ایسی خانقاہیں ہوں گی جہاں سماع کی مجلسیں مزامیر کے ساتھ نہ ہوتی ہوں، اور ہندوستان کے ماحول میں یہ افادیت سے خالی نہ رہا، ہندوؤں کی ہر مذہبی اور معاشرتی تقریب میں سرود ونغمہ ضرور ہوتا، بلکہ ان کے مذہب کا یہ لازمی جزبن گیا تھا، اسی لیے وہ صوفیہ کی مجالس سماع کی طرف خواہ مخواہ مائل ہوئے، اور شاید ان ہی کی تسکین کی خاطر ان مجلسوں میں ہندی دوہے بھی گائے جانے لگے جن سے خود صوفیہ کو بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی، اور انھوں نے بھی دوہے کہنے شروع کیے، حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ، حضرت عبد الحق رودولویؒ اور حضرت عبد القدوسؒ کے دوہے مشہور رہے، یہ دوہے ہندی راگ میں گائے جاتے اور ہندی راگ صوفیہ کو اس قدر پسند آئے کہ انھوں نے خود بھی کچھ راگ اختراع کیے، راگ درپن میں ہے کہ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے دھنا سری، توری اور مالسری کو مخلوط کرکے ملتانی دھنا سری ایجاد کی جو

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء اپنی محفلوں میں بہت پسند کرتے تھے، قوالی کی ایجاد تو امیر خسرو ہی سے منسوب ہے، اور پھر انھوں نے ایرانی اور ہندوستانی نغموں کو ملاکر بہت سے نئے راگ اور راگنیاں ایجاد کیں، مثلاً ان کے ایجاد کردہ ایمن میں ہنڈول اور نیریز ملے ہوئے ہیں، عشاق میں سارنگ، بسنت اور نوا کے راگ ہیں، موافق میں ٹوڑی، مالوی، دوگاہ اور حسینی ملے ہوئے ہیں، فرغنہ میں کنگلی اور گوری کو ملایا ہے، وغیرہ وغیرہ،

قبر پرستی | مسلمان عوام، علماء اور صوفیہ کے اختلاف کو نظر انداز کرکے ان کے فقہی مباحث سے زیادہ دلچسپی نہ لیتے، اور وہ عموماً صوفیۂ کرام کی کرامتوں اور روحانی طاقتوں کو دیکھ کر ان کے گرد پروانہ وار جمع رہتے، اور ان کی وفات کے بعد بھی ان کو زندہ سمجھتے، اس طرح ان متوفی بزرگوں کی حکومت برابر جاری رہتی، علماء کا ایک گروہ اس قبر پرستی کے خلاف ہمیشہ رہا، لیکن عوام اس مخالفت سے کبھی متاثر نہیں ہوئے، اور صوفیہ کی قبریں ابھی تک نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوؤں کی زیارت گاہ بنی ہوئی ہیں، اور ہندو بھی مسلمانوں ہی کی طرح ان سے منتیں اور مرادیں مانگتے ہیں اور نذریں چڑھاتے ہیں،

یہ قبر پرستی مذہبی لحاظ سے تو کسی طرح جائز قرار نہیں دی جا سکتی، لیکن ہندوستان کا جو مذہبی احول تھا، اس میں اس بدعت کا ایک روشن پہلو حسب ذیل لطیفہ سے ظاہر ہوتا ہے، اکبری عہد میں راجہ مان سنگھ کے دربار میں ایک سید اور ایک برہمن میں مذہبی بحث چھڑ گئی، دونوں اپنے اپنے مذہب کی فضیلت بیان کرتے رہے، لیکن کوئی دوسرے کو قائل نہ کر سکا، آخر میں مان سنگھ پر فیصلہ چھوڑ دیا گیا، اس نے کوئی فیصلہ دینے

سے یہ کہہ کر گریز کیا کہ اگر میں مذہب اسلام کو ترجیح دوں تو لوگ بادشاہ وقت کی خوشامد پر محمول کریں گے، اور اگر اس کے برعکس رائے دوں تو تعصب سمجھا جائے گا لیکن جب اس سے اصرار کیا گیا تو کہا مذہبی حقایق کی بنا پر تو فیصلہ دینا مشکل ہے، لیکن یہ دیکھتا ہوں کہ ہندوؤں میں خواہ کیسے ہی گنوان پنڈت یا دھیانی فقیر ہو، مرنے پر جلا دیا گیا، اس کی خاک اڑ گئی، رات کو وہاں کوئی جاتا ہے تو آسیب کا خطرہ محسوس کرتا ہے، لیکن مسلمانوں کے جس شہر یا قصبہ یا گاؤں میں گذرو بزرگ پڑے سوتے ہیں، ان کے مزار پر چراغ جلتے ہیں، پھول مہکتے ہیں، چڑھاوے چڑھتے ہیں، اور لوگ ان کی ذات سے فیض پاتے ہیں،

لیکن آگے چل کر اس قبر پرستی میں شرک کی بو آنے لگی، عوام بزرگوں کی قبروں پر جا کر جانور چڑھا کر ان کی قربانی کرتے، مدار صاحب اور سید سالار کی قبروں کی زیارت کو فریضۂ حج کے برابر سمجھتے، اور بعض بزرگوں کی قبروں کو چومتے اور ان کے سامنے سجدہ کرتے، عورتیں پیروں کے نام پر روزے رکھتیں، اور اپنی حاجت برآری کا ذریعہ سمجھتیں، اور رفتہ رفتہ یہ بزرگ واقعی حاجت روا اور مشکل کشا سمجھے جانے لگے، علماء نے ان بدعتوں کی مخالفت پورے طور پر کی، اور ان میں مبتلا ہونے والے تمام لوگوں کو بدعتی قرار دیا حضرت شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ عالم بھی تھے، اور صوفی بھی، وہ بھی بدعتیوں کی بدعتوں سے برگشتہ خاطر تھے، تقویۃ الایمان میں تحریر فرماتے ہیں،

> قبر کی زیارت کرنی جائز اور مباح ہے، اور جس زیارت سے کہ نہ دنیا کی رغبت کم ہو اور نہ آخرت کی یاد آوے وہ زیارت درست نہیں،
>
> پھر جو کوئی قبر کی زیارت کے واسطے جاوے کہ وہاں نماز پڑھے اور قبر کا طواف

کرنے یا اس کا بوسہ دے یا اپنے رخسار اور چھاتی کو قبر پر ملے اور ان مردوں کو پکارے اور ان سے مدد مانگے یا وہاں چادر، شامیانہ، نقارے، کھانا مٹھائی چڑھاوے یا لڑکیوں لڑکوں اور عورتوں کو لے جاوے، یا وہاں روشنی، مجلس اور میلا کرے، یا اور کچھ خرافات کرے سو وہ بدعتی ہے، یا مشرک یا مرتکب کردہ اور فعل حرام کا، سو اس زمانہ میں اکثر لوگ قبروں پر انھیں کاموں کے واسطے جاتے ہیں، دنیا سے بے رغبتی اور آخرت یاد کرنے کو کوئی نہیں جاتا، بلکہ دنیا ہی کی رغبت کے سبب سے جاتے ہیں، اور جو کوئی منع کرے تو واہی تباہی دلیلیں اس کے مقابلہ میں لاتے ہیں، اور اس کا سبب یہ ہے کہ بعض دنیا طلب مولوی اور نام کے عاقبت سلب مشائخ قبروں پر جاکر بیٹھنے لگے، عرس کرنے لگے، روشنی، راگ وہاں ہونے لگا، ریوڑی، گٹا، حلوا، شیرمال چڑھنے لگا، چادریں مفت آنے لگیں، اور عورتیں جوان، بڑھیا جانے لگیں، نوبت، نقارے بجنے لگے، نذر و نیاز کا روپیہ پیسہ جمع ہونے لگا، مولوی اور مشائخ پوجے جانے لگے، تب انھوں نے عوام جاہلوں کو خراب کرنے کو دو چار ادھر ادھر کے قصے کہانی ان قبر والوں کی بنالیں، دو ایک روایتیں جھوٹی سچی نکال لیں، دو تین حدیثیں اپنے مطلب پر لگالیں، اس طرح انھوں نے اپنی دنیا کو تو تباہ کیا اور دوسروں کی عاقبت کو بھی تباہ کیا، بلکہ اپنا روسیاہ کیا، پھر اب کے لوگ ان کے کام اور بات کی سند پکڑنے لگے، حالانکہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ اور رسول کے سوا کسی کی سند پکڑنا نہ چاہیے۔"

علما اور صوفیہ کی مصالحت | علما عام طور سے دنیا دار اور نام نہاد صوفیہ پر اعتراضات

کرتے رہے لیکن ان کے اعتراضات تمام صوفیہ پر سمجھے جانے لگے، اس سے عوام کے ذہن میں یہ انتشار پیدا ہوجاتا کہ علماء اور صوفیہ دو علحدہ چیزیں ہیں، لیکن ان کا یہ انتشار اس وقت دور ہوجاتا جب علماء اور صوفیہ ایک دوسرے کے سامنے جھکتے رہتے، ایسی مثالوں کی کمی نہیں۔

حضرت مخدوم الملک شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے خلفاء میں مولانا مظفر بلخی بڑے مشہور خلیفہ گزرے ہیں، بلخ کے ایک شاہی خاندان سے تھے، راہ سلوک میں گامزن ہونے سے پہلے ان کو اپنے علم پر بڑا غرور تھا، اور مشائخ سے الجھتے رہتے، حضرت مخدوم الملک کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو اپنی کچھ علمی مشکلات ان کے سامنے پیش کیں، حضرت مخدوم الملک ان کا جواب دیتے تو مولانا مظفر بلخی کہتے لانسلم (میں تسلیم نہیں کرتا ہوں) وہ جس قدر الجھے، اسی قدر حضرت مخدوم الملک ان سے اخلاق سے پیش آتے رہے، یہاں تک کہ مولانا مظفر کی ساری مشکلات حل ہوگئیں، ان کو اپنا علم ہیچ معلوم ہونے لگا، اور وہ حضرت مخدوم الملک سے متاثر ہوکر ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے، لیکن حضرت مخدوم الملک نے ان سے فرمایا کہ راہ طریقت علم کے بغیر طے نہیں ہوتی ہے، اور اب تک انھوں نے جو علم حاصل کیا ہے وہ جاہ و منزلت کے لیے تھے، جو ان کے لیے بار آور نہ ہوسکے گا، اب وہ پھر سے خلوص نیت سے اللہ کے واسطے علم پڑھیں، تاکہ راہ سلوک میں ان کو ترقی حاصل ہو، یہ سن کر وہ علم کی تلاش میں پاپیادہ اٹھ کھڑے ہوئے، راستہ میں ان کے پاؤں میں آبلے پڑ گئے، تو ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے، اتفاقاً حضرت مخدوم الملک کے ایک دوسرے مرید دہلی سے علم حاصل کرکے واپس آرہے تھے، مولانا مظفر کی

کیفیت دیکھ کر ان کو اپنا گھوڑا دیدیا، اور ان کو اعزاز و اکرام کے ساتھ دہلی پہنچوا دیا، دو سال تک وہاں علم حاصل کرتے رہے، فیروز شاہ تغلق نے انکی شہرت سنکر ان کو اپنے ایک کوشک میں درس و تدریس کی خدمت سپرد کی، کچھ دن وہاں رہے ہونگے کہ ایک دن کچھ مطربوں کی آواز سن کر ایسے بے خود ہوئے کہ کوشک کے اوپر سے نیچے کود گئے، اور اسی حال میں حضرت مخدوم الملک کے پاس جانے کے لیے چل کھڑے ہوئے، وہاں پہنچے تو ان کے علم کا پندار ختم ہو چکا تھا، لیکن مرشد نے ان کے نفس کو کچلنے کے لیے خانقاہ کے درویشوں کی خدمت کے لیے مامور کیا، اور مولانا مظفر کو اس خدمت کو انجام دینے میں اور بھی زیادہ خوشی ہوئی، ان کے جسم پر کپڑے پھٹ کر تار تار ہو جاتے، تو ان میں گرہیں ڈال لیتے، یا سی لیتے، خود حضرت مخدوم الملک نے ایک روز دیکھا کہ ان کے کپڑے پھٹ کر پارہ پارہ ہو گئے ہیں، اور ان کے چہرہ سے خواری یعنی عاجزی اور مسکینی ظاہر ہو تی ہے، پھر بھی خوش ہیں اور زبان حال سے یہ کہہ رہے ہیں:-

خوشم بدولت خواری و ملک تنہائی

کہ التفات کسے را بروزگارم نیست

مخدوم الملک نے یہ دیکھ کر ان کو اچھے کپڑے اور اچھے کھانے دیے، لیکن وہ کسی اور عالم میں پہونچ چکے تھے،

جانِ آدم چوں بہ سّرِ فقر سوخت

ہشت جنت را بیک گندم فروخت

وہ حضرت مخدوم الملک کے بڑے محبوب خلیفہ ہوئے، اور ان کو تن شرف الدین

اور جان شرف الدین کہا کرتے تھے،

اسی طرح حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے خلیفہ حضرت برہان الدین غریبؒ جب دولت آباد پہنچے تو وہاں کے ایک عالم مولانا سید زین الدین کو اپنے علم کا بڑا غرور تھا، وہ صوفیہ سے دور بھاگتے، اور ان کے متعلق اچھے الفاظ استعمال نہیں کرتے، لیکن رفتہ رفتہ وہ حضرت برہان الدین غریبؒ کے قائل ہوتے گئے، ایک روز ان کی قیام گاہ پر پہنچے، اور جب سامنا ہوا تو دوڑکر اپنی پیشانی ان کے قدموں پر جھکا دی، حضرت برہان الدینؒ نے فرمایا، ہاں مولانا! یہ رسم شریعت میں جائز نہیں، مولانا نے کہا کہ جب تک میں اس رسم کو شریعت کے خلاف جانتا تھا، نعمت باطنی سے محروم تھا، اسی طرح دہلی کے مولانا نصیر الدین قاسم اپنے علم اور تقویٰ میں بہت مشہور تھے، ان کے استاد مولانا معین الدین عمرانی کو ان پر فخر تھا، حضرت خواجہ سید گیسو درازؒ کے بچے ان سے درسی کتابیں پڑھا کرتے تھے، لیکن وہ پیری مریدی کے قائل نہ تھے، لیکن آخر میں یکایک حضرت سید گیسو درازؒ سے بیعت کر لی، مولانا معین الدین عمرانی کو اس کی خبر ہوئی تو مولانا نصیر الدین قاسم کو بلاکر کہا کہ تم تو خود عالم تھے، پھر سید محمد کے مرید کیوں ہو گئے، مولانا نصیر الدین نے عرض کیا پہلے عالم تھا، اب حضرت مخدوم کے سامنے مسلمان ہوا ہوں،

حضرت بوعلی قلندر پانی پتی پر سکر اور مستی کی کیفیت برابر طاری رہتی، ایک بار ان کی مونچھیں شرعی حدود سے بہت بڑھ گئی تھیں، کسی کو تراشنے کی ہمت نہ ہوتی تھی، ان کے ہم عصر مولانا ضیاء الدین سنامی اپنے وقت کے بڑے متشرع عالم تھے، ان کو شریعت کی پابندی کرانے کا بڑا جوش رہتا تھا، انھوں نے حضرت بوعلی قلندر کی ریش مبارک

کو پکڑ کر مونچھوں کو شرعی حد کے مطابق تراش دیا، جب وہ تراش کر تشریف لے گئے تو حضرت بو علی قلندرؒ اپنی ریش کو پکڑ کر بار بار فرماتے، یہ ریش کیسی مبارک ریش ہے کہ شرع محمدی کی راہ میں پکڑی گئی، مولانا ضیاء الدین سنامی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ سے سماع پر برابر احتساب کرتے رہے، اور اس سلسلہ میں ان کی شدید مخالفت کی، لیکن جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے، مولانا ضیاء الدین سنامی نے اپنی دستار حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے قدموں کے پاس بچھوا دی، حضرت خواجہ نے اس کو اٹھا کر اپنی آنکھوں پر رکھ لیا، جب وہ مولانا ضیاء الدینؒ کے پاس پہنچے تو مولانا آنکھیں چار نہ کر سکے، حضرت خواجہ اٹھکر باہر چلے آئے، لیکن اسی وقت خبر ملی کہ مولانا کی روح پرواز کر گئی، وہ رونے لگے اور فرمایا کہ ایک حامی شریعت تھا، وہ بھی نہ رہا،

آگے چل کر حضرت مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے علمائے سوء اور دنیا دار صوفیہ دونوں پر تنقید کر کے پاک نہاد علماء اور صوفیہ کو ایک دوسرے سے قریب تر کیا، یہ تمام بزرگ بڑے پایہ کے عالم بھی تھے اور سلوک کی آتشیں راہیں بھی طے کی تھیں، حضرت مجدد نے علماء سوء کی جس طرح مذمت کی اس کا ذکر پہلے آچکا ہے، اسی طرح انھوں نے ان صوفیوں پر لعنت بھیجی جو بدعت کا التزام اور سنت سے اجتناب کرتے اور اپنے ایک مکتوب میں فرمایا کہ اہل ہوا اور بدعتیوں کو خوار رکھنا چاہیے جس نے کسی بدعتی کی تعظیم کی اس نے گویا اسلام کے گرانے میں اسکی مدد کی، وہ ایسے پیر کو پیر نہیں سمجھتے جو محض خرقہ پہنکر پیر بنجاتے، انکے نزدیک پیر کہلانے کا وہی مستحق ہو سکتا ہے جو ریاضتوں اور مجاہدوں سے اپنے نفس امارہ کو ختم کر کے سنت سنیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی متابعت کو لازم جانتا ہو، اور اپنے

مرید کو حق سبحانہ کی طرف رہنمائی کرتا ہو، وہ اپنے ایک اور مکتوب میں فرماتے ہیں کہ تمام سنتیں حق تعالیٰ کے نزدیک مقبول اور پسندیدہ ہیں، اور ان کے اضداد یعنی بدعتیں شیطان کے پسندیدہ ہیں، وہ اپنے ایک مکتوب میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ صوفیہ کا کشف والہام پر اعتبار کرنا ضروری نہیں، اگر وہ کتاب وسنت کے خلاف ہے تو اس سے پناہ مانگنی چاہیے، اور ایسے کشف و الہام کے مقابلہ میں علماے اہل حق کی تقلید لازمی ہے، صوفیہ کے کشف کو علمائے حق کے قول پر مقدم جاننا سراسر گمراہی ہے، وہ تو علماء کی بدعت حسنہ اور سیئہ کی تفریق کو بھی تسلیم نہیں کرتے، وہ بدعت کو بدعت ہی سمجھتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ کسی بدعت میں خواہ بدعت حسنہ ہی کیوں نہ ہو ظلمت اور کدورت کے سوا حسن اور نورانیت کا کا مشاہدہ ہو ہی نہیں سکتا۔

اسی طرح شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنی تحریروں میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ جن صوفیہ نے کتاب و سنت کو ترک کر دیا ہے وہ ہم میں سے نہیں، اور جو علماء تصوف کا انکار کرتے ہیں، وہ چور اور رہزن ہیں، ان سے بچنا چاہیے۔

حضرت اسمٰعیل شہیدؒ نے تقویۃ الایمان میں بتایا کہ بعض لوگ یہود اور نصاریٰ کی طرح درویش ہو جاتے ہیں، ٹاٹ پہنتے ہیں، زنجیریں گلوں میں ڈالتے ہیں، تو ایسی فقیری اور درویشی ان ہی کی ایجاد ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم نہیں دیا۔ اور اسی طرح بعض لوگ فقیر بنکر گدی پر بیٹھ جاتے ہیں، اپنے مکان سے باہر نہیں ہوتے، اپنی طرف سے طرح طرح کے وظیفے ایجاد کرتے ہیں، نماز معکوس پڑھتے ہیں، اور اسی قسم کی ہزاروں باتوں کو عبادت جانتے ہیں، تو یہ سب بدعت ہیں، اگلی امتیں ان ہی باتوں کی وجہ سے سختی میں پڑ گئیں، اور اللہ تعالیٰ نے ان پر سے اپنی مہربانی اٹھالی اور ان کو ان کی سختی اور مشکلوں میں چھوڑ دیا۔

(باقی)

شاہ محمد غوث گوالیاریؒ

از جناب پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب ایم اے

(۴)

اولاد امجاد شاہ محمد غوث گوالیاریؒ نے چار شادیاں کیں، ان سے نو صاحبزادے اور پانچ صاحبزادیاں پیدا ہوئیں[1]، جن کی تفصیل یہ ہے :-

پہلی بیوی سے تین صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں (۱) قطب عالم شاہ عبداللہ المعروف بہ شیخ بدھا، آپ کا مزار مبارک گوالیار میں روضہ شاہ محمد غوثؒ کے بائیں جانب ہے، (۲) میر شاہد، آپ کا مزار مبارک روضۂ مذکور کے ایوان میں ہے (۳) میر ہادی شریف، مزار مبارک روضۂ مذکور کے صحن میں ہے۔ (۴) بی بی زاہدہ، (۵) بی بی ماجدہ،

دوسری بیوی سے دو صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں ہوئیں :- (۱) میر علی، مزار مبارک گوالیار میں روضۂ شاہ محمد غوث کے صحن میں ہے، (۲) میر ولی، مزار مبارک صحن روضۂ مذکور میں ہے، (۳) بی بی کریمہ (۴) بی بی رحیمہ،

تیسری بیوی سے ایک صاحبزادہ اور ایک صاحبزادی ہوئیں :- (۱) شاہ نورالدین المعروف بہ ضیاءاللہ عابد، مزار مبارک اکبرآباد میں بمقام ضیا محل منڈی حضرت میں ہے (۲) بی بی حفیظہ،

---

[1] شاہ محمد غوث کی اولاد کے متعلق یہ تفصیلات ایک مستند مخطوطہ سے نقل کی گئی ہیں، جو موصوف کے خاندان کے چشم و چراغ سید خطیرالدین صاحب نے عنایت فرمایا تھا۔

چوتھی بیوی سے تین صاحبزادے ہوئے:- (۱) سید اسمٰعیل (مزار مبارک گجرات میں ہے)
(۲) سید مظفر (ایضاً) (۳) سید اویس (ایضاً)

مولانا محمد غوثی نے گلزار ابرار (۱۰۲۲ھ) میں اور ملا عبد القادر بدایونی (م ۱۰۰۴ھ / ۱۵۹۶ء) نے منتخب التواریخ میں شاہ محمد غوث کے تین چار صاحبزادوں کا خاص طور سے ذکر کیا ہے، یہاں صرف انہی صاحبزادگان کے حالات بیان کیے جاتے ہیں،

مناقب غوثیہ کے تکملہ نگار نے شاہ محمد غوث کے حالات کے ذیل میں لکھا ہے:

یہاں تک آپ کا بے انتہا فیض پہنچا کہ ہندوستان کے سب شہروں میں آپ کی عارف و فاضل اولاد اور رہنما خلفاء پہنچے اور ان کی برکت سے خلق مالا مال ہو گیا ہے خصوصاً ولایت گجرات و دکن اور خاندیس و مالوہ میں بے شمار حضرات ملازمت سے مشرف ہوئے، جن کی ایک مجمل فہرست یہ ہے:-

حضرت شیخ عبد اللہ المعروف بہ شیخ بڈھا، جانشین گوالیر قدس سرہٗ، حضرت شیخ نور الدین ضیاء اللہ قدس سرہٗ، حضرت شاہ اویس قدس سرہٗ، حضرت شاہ اسمٰعیل قدس سرہٗ، فرزندان حضرت شاہ محمد غوث گوالیری قدس اللہ سرہ العزیز،[1]

شیخ عبد اللہ: آپ کی کنیت ابو الوجیہ اور لقب قطب الاقطاب ہے، شاہ جہان آباد میں یوم جمعہ ۱۰ ماہ ربیع الاول ۹۳۰ھ میں ولادت ہوئی، آپ کی والدہ ماجدہ حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کی اولاد سے تھیں، آپ نے شیخ وجیہ الدین علوی احمد آبادی (م ۹۹۸ھ) اور مولانا مبارک دانشمند گوالیاری سے رسمی علوم کی تحصیل کی، اور اساتذۂ وقت میں آپ کا شمار ہوا، تمام علوم میں درس دیتے تھے، ۹۷۰ھ میں جب غوث الاولیاء کا وصال ہوا تو آپ ہی مسند خلافت پر متمکن ہوئے، اسی زمانے میں

[1] فضل اللہ شطاری: مناقب غوثیہ ترجمہ اردو و تکملہ از سید محمد ظہیر الحق احمد آبادی مطبوعہ آگرہ ۱۳۲۳ھ ص ۶۷ - ۶۸

جب اکبر بادشاہ نے چاہا کہ مقبرہ شاہ محمد غوثؒ کی تعمیر کیجائے تو شیخ عبد اللہ ہی کو یہ ذمہ داری تفویض کی گئی۔ اکبر چاہتا تھا کہ شیخ عبد اللہؒ گوشہ نشین رہیں، چنانچہ بقول مولانا محمد غوثی اس نے حکم دیا:۔

مخدوم زادہ چند روز بجسب ظاہر کمر میں تلوار باندھ کر اولیاء دولت میں شامل رہیں تاکہ آپ کی باطنی توجہ پر ظاہری امداد اضافہ ہو کر یہ دونوں امداویں شاید حضرت غوث الاولیاء کی باطنی پرورش کے ثمرات کی برابر ہو جاویں اور سب جگہ اور ہر حال میں آپ کی ہمراہی میرے قلبی سکون کا باعث ہو کر مجھ کو شاد کام اور کامیاب کرے[1]۔

اس حکم کے مطابق شیخ عبد اللہؒ چالیس سال تک صورتاً سپاہی اور معناً درویش رہے، اکبر نے جب آپ کو مرزا شاہ رخ کے پاس سفارت پر بدخشاں بھیجا تو شاہ رخ بنفس نفیس ایک منزل کی مسافت تک آپکے استقبال کے لیے آیا، اور دولت خانے پر کمال عزت و احترام سے رکھا اور شاہانہ مہمانداری کی،

۱۰۱۴ھ میں جب جہانگیر تخت نشین ہوا تو آپ نے ضعف پیری کے سبب معذرت کر کے دربار سے علحدگی اختیار کر لی، اور ۱۰۱۴ھ سے ۱۰۲۱ھ تک آپ گوالیار ہی میں خلق اللہ کی رشد و ہدایت میں مصروف رہے، اور ۱۸ محرم الحرام ۱۰۲۱ھ میں آپ کا وصال ہو گیا۔

شیخ نور الدین ضیاء اللہ آپ پابند شریعت اور سالک طریقت تھے، اپنے عہد کے اکابر صوفیا اور اجلہ علماء میں آپ کا شمار تھا، اپنے والد ماجد شاہ محمد غوثؒ کے وصال کے بعد ۹۷۰ھ میں آگرہ تشریف لے گئے، وہاں خانقاہ تعمیر کرائی اور ۲۵ سال چلہ نشین رہے۔ کامل دس سال تک شیخ محمد طاہر محدث نہروالہ سے حدیث کی تحصیل کی۔ اور شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی سے تمام علوم کی تکمیل کر کے استاد وقت ہوئے۔ جس زمانے میں آپ نہروالہ میں احادیث کی تصحیح فرما رہے تھے، غوث الاولیاء نے شیخ نور محمد کو، آپکے لیے خرقۂ خلافت اور اجازت نامہ دے کر نہروالہ بھیجا تھا۔

---

[1] محمد غوثی: گلزار ابرار، ترجمہ اردو از فضل احمد، مطبوعہ ۱۳۲۶ھ، ص ۴۸۸

جس زمانہ میں اکبر دارالخلافہ لاہور میں مقیم تھا، اس زمانہ میں اس کو یہ حادثہ پیش آیا کہ ہرن کے سینگ سے زخمی ہو گیا، زخم کاری تھا، سب لوگ عیادت کے لیے حاضر ہوئے مگر شیخ ضیاء اللہ نہ پہنچ سکے، اکبر نے آپ کو یاد فرمایا، چنانچہ آپ اکبر آباد سے لاہور گئے، اور بقول مولانا غوثی ؒ:

شہنشاہ نے بھی آپ کی تشریف آوری سے اپنی عافیت اور تن درستی کی فال لی،[1]

چند روز کے بعد بادشاہ نے فرمایا کہ شاہزادہ دانیال کی ایک حرم امید سے ہے آرزو یہ ہے کہ وضع حمل آپکے یہاں ہو، شیخ نے پہلو بچانا چاہا لیکن آخر میں مجبور ہو کر قبول کرنا پڑا، مگر اس واقعہ سے تنگ دل رہے، اس کے ایک ہفتہ کے بعد مرض الموت پیش آیا اور ۳ رمضان المبارک ۱۰۰۵ھ میں رحلت فرمائی،[2]

مولانا محمد غوثی بھی اکبر آباد میں شیخ ضیاء اللہ کی زیارت سے مشرف ہوئے تھے، موصوف لکھتے ہیں:

ہجری ۱۰۰۲ھ میں راقم اپنے وطن سے چل کر دارالسلطنت آگرہ میں گیا تھا، اس وقت میں راقم کے چچازاد بھائی، شیخ علی شمس آپ کی ملازمت میں استفادہ کر رہے تھے، انھوں نے حقیر کو آپ کی آستانہ بوسی اور خدمت کے شرف سے مشرف کیا تھا، پانچ مہینے اس جگہ رہ کر آپ کی فیض بخشی کا حصہ لیا،[3]

محمد حسین آزاد نے لکھا ہے:-

شیخ ابوالفضل کی ان سے دوستانہ راہ و رسم تھی، انشا میں بھی کئی خط ان کے نام ہیں، اکبر نامے میں لکھتے ہیں کہ شیخ ضیاء اللہ ولد شیخ محمد غوث گوالیاری نے ۱۰۰۵ھ میں دنیا کو الوداع کہا، تھوڑا سا نقد دانش جمع کیا تھا صوفیوں کی گفتار و لاویز سے آشنا تھے، اور نکتہ شناس آدمی تھے،[4]

---

[1] محمد غوثی: گلزار ابرار (اردو) ص ۲۲۴ [2] ایضاً ص ۴۲۳-۲۲۳ [3] محمد حسین آزاد: دربار اکبری ص ۱-۶۸۰ مطبوعہ لاہور ۱۹۱۰ء

رقعات ابوالفضل حصہ دوم میں شیخ ضیاء اللہ کے نام، ابوالفضل کا یہ مکتوب ملتا ہے۔ موصوف نے ۹۹۶ھ میں لاہور سے لکھا تھا:۔

بخدا شناس حق پرست شیخ ضیاء اللہ ولد شیخ محمد غوث

شیخ زادان ضیاء اللہ دوست

دانندۂ خردمنداں وستائیدۂ دانشوراں وگماشتۂ ایزد منان وبرداشتۂ حضرت سبحان در حرکات وسکنات جسمانی درحاولی رعنائے پروردگار خود منظور داشتہ بنگاشتہ خیرطراز دوستاں خود را خوش داشتہ بودند ع

چناں خوش حال گردیدم کہ پنداری ترا دیدم

شوق صحبت دوستاں را ہرگاہ در مشافہہ باعتضاد اشارت وعبارت بہ عالم ظہور نتوان آورد، غائبانہ بنوشتہ تنہا متصدی بیان آں شدن از کوتاہی خرد نویسندہ خواہد بود، حاشا کہ فقیر خود را بآں راضی نتواں کرد کاش آرزوے ملاقات قبل از زاں مقدار داشتے بمقتضائے آرزو وغبت نمی شود خود را از اں خالی ندیدے۔ اگر بمبلغ علم خود توانستے کرد ہرگز از شدت الم دوری کہ موافق علم اللہ است جز خرسندی نداشتے تا بہ شکایت چہ رسد، اگر باخبار قبض خاطر خود کہ بیشتر اکثر ناشی از فوت سعادات وخیرات است دوستدارندگان کمال را مسرت رسانم۔ بہر آئینہ بہتر آن است کہ باعلام اخبار خاطر ناشناس خود را کہ اغلب ناشی از نابالیستی چندست کہ بمیزان خرد خوشی را ناشایست است دانا دلاں را ملول گردانم اللہ تعالیٰ بحوادث روزگار دل خوشی بخشاد۔

ربیع الاول سنہ نہصد ونود وشش در لاہور تعلمی یافت[1]

---

[1] رقعات ابوالفضل، مرتبہ مولوی جلال الدین احمد، مطبوعہ ۱۹۲۶ء، دفتر دوم، ص ۲۵۹

ملا عبدالقادر بدایونی (م ۱۰۰۴ھ) بھی شیخ ضیاء اللہ سے دو مرتبہ ملے تھے، منتخب التواریخ جلد سوم میں یہ دونوں ملاقاتوں کا حال لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں: "شیخ محمد غوث کے جانشین ہیں، تصوف میں جو انداز بیان ان کا ہے، صوفیاء میں کم ہی کسی کا رہا ہوگا، ان کی محفل میں ہمیشہ معرفت وحقیقت کی ہی باتیں ہوتی تھیں، ان باتوں کا موضوع ہمیشہ توحید اور وحدت ہی کا مسئلہ ہوتا تھا"[1]

پھر لکھتے ہیں: "پہلے پہل جب ان کے فضائل کا شہرہ بلند ہوا تو میرے سننے میں آیا کہ شیخ اپنے باپ کی مسند فقر وارشاد پر جانشین ہو گئے ہیں، بلکہ بعض پہلوؤں سے وہ ان پر فضیلت بھی رکھتے ہیں، قرآن شریف کے بھی حافظ تھے، اور اس کی تشریح وتوضیح کرتے تو کسی تفسیر سے مدد لینے کی ان کو ضرورت نہیں پڑتی تھی"[2]

اپنی پہلی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "۹۷۰ھ میں ان سے ملاقات کے لیے میں آگرہ گیا، اور کسی واقف کار کو وسیلہ اور ذریعہ بنائے بغیر بے تکلفی اور سادگی سے جس کا عادت سے عادی تھا، سلام علیک کہہ کر مصافحہ کیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کو میری یہ بے تکلفی کچھ پسند نہ آئی، اہل محفل نے مجھ سے پوچھا "آپ کہاں سے آرہے ہیں؟" میں نے کہا "سہسوان سے" پھر پوچھا گیا "تم نے کچھ پڑھا لکھا بھی ہے؟" میں نے جواب دیا کہ "عرصہ پہلے ہر فن کی کچھ نہ کچھ تحصیل کی ہے"[3]

اس سوال وجواب کے بعد بقول بدایونی مجلس میں ایک شخص کو حال آگیا، اس نے ہاتھ پیر مارنے شروع کیے، اس طرح خوف زدہ کرکے بدایونی کو اٹھانا مقصود تھا، مگر یہ کہاں ٹلنے والے تھے، جب اس سے بھی کام نہ چلا تو علمی مباحثہ شروع ہوا، اس میں بھی کچھ پیش نہ چلی تو بدایونی کا حال احوال پوچھ کر بات ادھر سے ادھر کر دی۔

---

[1] ملا عبدالقادر بدایونی: منتخب التواریخ، ترجمہ اردو از محمود احمد فاروقی، جلد سوم ص ۹۲۹ مطبوعہ لاہور ۱۹۶۲ء [2] و [3] ایضاً ص ۹۲۹

اس دلچسپ ملاقات کے بعد بدایونی نے دوسری ملاقات کا اس طرح ذکر کیا ہے:۔

دوسری ملاقات اس وقت ہوئی جب میں اکبر بادشاہ کی ملازمت میں تھا، اور شیخ حسب طلب حیران پریشان تنہا عبادت خانہ شاہی میں آکر ٹھہرے ہوئے تھے۔

جمعہ کا دن تھا کہ بادشاہ پہلے ایک دو آدمیوں کے ساتھ وہاں تشریف لے گئے مرزا غیاث الدین، علی اخوند، مرزا اخوند اور مرزا علی، آصف خاں کو کہہ رکھا تھا کہ شیخ کو بحث میں الجھا کر تصوف کا مطلب دریافت کرو، دیکھیں وہ کتنے پانی میں ہے، چناں چہ آصف خاں نے گفتگو شروع کی اور لوائح کی یہ رباعی پیش کی:۔

گر در دل تو گل گزرد، گل باشی	ور بلبل بے قرار، بلبل باشی
تو جزئی و حق کل ست، اگر روزے چند	اندیشۂ کل پیشہ کنی، کل باشی

اور پوچھا کہ "اللہ تعالیٰ کو "کل" کس طرح کہا جا سکتا ہے، جب کہ وہ "جز" اور "کل" ہونے سے برتر و اعلیٰ ہے"۔۔۔ شیخ تباہ حالی کے بعد دربار میں آئے تھے، اس لیے انھوں نے ایسے دھیمے لہجے میں کچھ باتیں کہیں جو کسی کے سمجھ میں نہیں آئیں، مجھ سے رہا نہ گیا، میں نے جسارت کرکے کہا کہ مولوی جامی نے اگرچہ اس رباعی میں اللہ تعالیٰ پر "کل" ہونے ہی کا اطلاق کیا ہے، لیکن ایک رباعی میں جزئیت بھی بیان کی ہے:

ایں عشق کہ ہست جزو لاینفک ما	حاشا کہ شود بہ عقل ما مدرک ما
خوش آں کہ دمد پرتو نورے از نور یقیں	ما را برہاند از ظلام شک ما

لیکن "اس کل" ہونے اور "جزو" ہونے کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ "جزو" ہو "یا کل" سب کچھ وہی ہے (ہمہ اوست) اور اس کے علاوہ دوسرا کوئی وجود حقیقت میں نہیں ہے، اصل میں اس کی اصل حقیقت کو عبارت میں نہیں لایا جا سکتا، اس لیے اس کی

تعبیر کبھی "کل" سے اور کبھی "جز" سے کی جاتی ہے، پھر میں نے وحدت وجود کو ثابت کرنے کیلئے

اور چند مسائل جن پر میں نے ان دونوں عبور حاصل کیا تھا، شیخ کی طرف سے تائیداً بیان

کیے، میری اس تقریر پر بادشاہ بہت خوش ہوئے اور شیخ (ضیاء اللہ) بھی"[1]

ملا عبد القادر بدایونی نے اکبر آباد میں شیخ ضیاء اللہ کی سجادہ نشینی کے زمانے کا ایک دلچسپ

واقعہ یہ بیان کیا ہے کہ

"گوالیار میں شیخ محمد غوث کے عزیزوں میں ایک نوجوان شیخ زادہ تھا، جو ایک باز

اور راست روی میں مشہور تھا، آگرے میں وہ ایک طوائف پر عاشق ہو گیا، یہ خبر شہنشاہ

کو ملی، تو انھوں نے اس گانے والی کو ایک مصاحب مقبل خاں کے حوالہ کر دیا"[2]

لیکن اس کے باوجود عاشق صادق اپنے محبوبہ کو قید سے نکال لایا، بادشاہ نے شیخ ضیاء اللہ کے

ذریعہ ان دونوں کو دربار میں بلوایا اور نکاح کر دینا چاہا، لیکن شیخ موصوف نے اس سے اختلاف کیا

شیخ زادہ اس مخالفت کی تاب نہ لاسکا اور خنجر کھینچ کر اپنا کام تمام کر لیا،

بدایونی لکھتے ہیں :-

"اس کی تجہیز و تکفین پر علماء میں بڑا اختلاف پیدا ہو گیا تھا، شیخ ضیاء اللہ کا کہنا تھا کہ

حدیث شریف میں من عشق وعف وکتم ثم مات، مات شہیداً کے مطابق وہ

شہید عشق ہے، اس لیے اس کو شہید کی شان سے دفنانا چاہیے،[3]

شہید خنجر عشقم بخونِ دیدہ آلودہ ۔ بخاکم بیجاں پر خوں سپارید و مشوئید مرا

غرض اس شہید عشق کی تدفین عاشقانہ شان کے ساتھ ہوئی۔

شیخ اویسؒ آپ بھی غوث الاولیاؒ کے فرزند رشید ہیں، جوانی ہی میں علوم عربیہ سے فراغت حاصل

---

[1][2] منتخب التواریخ ج ۲ ص ۱۳۲ و ص ۳۹۱ [3] ایضاً ص ۳۹۱

کرلی تھی، صاحب ول بزرگ تھے، جواہر خمسہ کے پانچوں جواہر کے عامل تھے، شہرت سے دور، عزلت گزینی کو پسند کرتے تھے، احمد آباد میں غوث الاولیاء کی تعمیر کردہ خانقاہ اور مسجد میں رونق افروز تھے،

شیخ اویسؒ کی والدہ ماجدہ، علامہ امیر شاہ میر شیرازی سے نسبا منسلک تھیں، جو سادات عظام میں سے تھے، سلطان محمود گجراتی کے عہد میں جانپانیر (گجرات) میں قیام کیا، امیر شاہ میر، صدر الدین محمد شیرازی اور مولانا جلال الدین دوانی ایک عہد میں یہاں صدر نشین رہے تھے،

صاحب گلزار ابرار، مولانا محمد غوثی، ۱۰۰۴ھ میں شاہ وجیہ الدین علوی گجراتیؒ کے روضہ کی زیارت کے لیے خاندیس سے (احمد آباد) گئے تھے، وہاں شیخ اویس سے بھی ان کی ملاقات ہوئی تھی، مولانا محمد غوثیؒ نے شیخ سے گلزار ابرار کی تالیف کے ارادے کا اظہار کیا اور دعا کے لیے درخواست کی، شیخ نے فرمایا:-

"اگرچہ یہ منصوبہ دیر سے ظہور پذیر ہوگا لیکن بہت اچھا ہوگا"[1]

چنانچہ دس سال تک مسودہ کی تیاری کی نوبت ہی نہیں آئی، آخر میں شیخ ابوالخیر مبارک خضر نے گلزار ابرار کی تسوید پر باصرار آمادہ کیا، مولانا محمد غوثی، شیخ موصوف سے اجین میں ملے تھے، شیخ ابوالخیر والی بدخشاں امیر شاہ رخ کی خدمت میں جاتے ہوئے اجین رکے تھے، اور اسی زمانے میں مولانا محمد غوثی، مولانا کمال محمد عباسی کے عرس میں شرکت کے لیے اجین آئے ہوئے تھے،

شیخ ابوالخیر کی تحریک اور ہمت افزائی سے دو سال میں گلزار ابرار کا مسودہ تیار ہوگیا، مگر اس کی تصحیح اور تبییض میں پھر رکاوٹ پیدا ہوگئی، بالآخر ماہ رجب المرجب ۱۰۲۲ھ میں مبیضہ تیار ہوا، بقول مولانا محمد غوثی، شیخ اویسؒ کے ارشاد کے اٹھارہ سال بعد مبیضہ مکمل ہوگیا، (۱۰۰۴ھ تا ۱۰۲۲ھ)

---

[1] محمد غوثی: گلزار ابرار (اردو) ص ۷۰۹ مطبوعہ ۱۳۲۶ھ

شیخ اسمٰعیل آپ بھی شیخ محمد غوث گوالیاری کے فرزند رشید ہیں، ان سے بھی ملا عبد القادر بدایونی سے راہ و رسم تھی، انھوں نے شیخ ضیاء اللہ کے حالات کے ذیل میں اس طرف اشارہ کیا ہے، لکھتے ہیں:۔

انہی دنوں شیخ کے سوتیلے بھائی شیخ اسماعیل جو فتحپور کے محلہ خواجہ جہاں میں میری قیام گاہ سے قریب ہی رہتے تھے، اور ہماری آپس میں جان پہچان اور ملاقات تھی"[۱]

مناقبِ غوثیہ کے تکملہ نگار نے لکھا ہے:۔

جب شہنشاہ جہانگیر (احمدآباد گجرات) آیا تو آپ کے تیسرے فرزند شاہ اسمٰعیل کو خلعت و جاگیر وغیرہ عطا کی اور قیام تک خصوصیت سے اپنے ہمراہ رکھا"[۲]

غرض شاہان ہند نے نہ صرف شاہ محمد غوث بلکہ آپ کے فرزندوں کے ساتھ بھی حسن سلوک اور نیازمندانہ برتاؤ رکھا، مناقب غوثیہ کا تکملہ نگار لکھتا ہے:۔

آپکے (شیخ محمد غوث) کے وصال کے بعد شہنشاہ اکبر اور جہانگیر نے آپکے فرزندوں سے ہمیشہ حسن سلوک اور نیازمندانہ برتاؤ جاری رکھا، اور ان کی عزت و توقیر میں کوئی کمی نہ کی، بلکہ بہت کچھ عنایات و التفات فرماتے رہے، آپ کے فرزند حضرت نورالدین عرف ضیاء اللہ صاحب، شاہ کے ہمراہ سفر میں بھی رہتے تھے"[۳]

تصانیف مفتی غلام سرور تحریر فرماتے ہیں:۔

"شیخ را تصانیف بسیار است من جملہ آں کتاب جواہر خمسہ و اوراد غوثیہ و بحرالحیات مشہور تر اند"[۴]

---

[۱] ملا عبد القادر بدایونی : منتخب التواریخ (اردو) مطبوعہ لاہور ۱۹۶۲ء جلد سوم ص ۱۳۱ [۲] و [۳] فضل اللہ شطاری: مناقب غوثیہ تکملہ و ترجمہ اردو ص ۹-۸۰۷ [۴] مفتی غلام سرور لاہوری : خزینۃ الاصفیاء ص ۴۴۳

(۱) جواہر خمسہ کا پہلا مبیضہ ۹۲۹ھ میں کوہ چنار پر زمانۂ ریاضت میں پایۂ تکمیل تک پہنچا، پھر جب شاہ محمد غوثؒ شیر شاہ سوری کی آزار رسانیوں سے مجبور ہو کر گجرات تشریف لائے تو مریدین و معتقدین نے التماس کی کہ جواہر خمسہ کی مزید توضیح و تصریح کر دیجائے، چنانچہ آپ نے بعض مقامات کی توضیح، تنقیح کی۔ جب دوسرا نسخہ تیار ہو گیا تو فرمایا:

پہلا نسخہ جہاں کہیں بھی ہو اس نسخۂ ثانی سے تصحیح کر کے مطابق کر لیا جائے[۱]"

جواہر خمسہ کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے، اور ہر باب کو جوہر سے موسوم کیا ہے جس کی تفصیل یہ ہے:۔

پہلا جوہر:۔ اقسام عبادت کا بیان، فرائض مذہب اور ہر مہینے اور ہر ہفتے سے متعلق جو عبادات ہیں، ان کا ذکر،

دوسرا جوہر:۔ زہد و تقوی کے بیان میں ۔

تیسرا جوہر:۔ اسمائے اعظم، ادعیۂ ماثورہ، اور احزاب مشہورہ کی دعوت کے اعمال اور ان کی شرطیں ،

چوتھا جوہر:۔ مشرب شطاریہ کا بیان

پانچواں جوہر:۔ اشغال ورثۃ الحق کا بیان یعنی ان خصوصیات کا جن سے سالک وارث حق ہو سکتا ہے[۲]

شطاریہ سلسلے کے صوفیہ کا جواہر خمسہ پر باقاعدہ عمل رہا ہے، شاہ محمد غوث کے شیخ طریقت حاجی حمید الدین حضور (م ۹۳۰ھ / ۱۵۲۳ء) نے اول ہی روز مطالعہ کے بعد فرمایا تھا:۔

خلق را ہدایت وافر ابدالآباد حجۃ اولیاء اللہ خواہد بود، ہیچ ولی نباشد کہ بریں اسرار مطلع نگردد[۳]"

---

[۱] محمد غوثی: گلزار ابرار (اردو) ص ۴۰۔ ۲۹ [۳] محمد غوث گوالیاری: جواہر خمسہ ترجمہ اردو، ص ۱۰

چنانچہ شاہ وجیہ الدین علوی نے اپنے خلیفہ سید صبغۃ اللہ بروجی، انھوں نے اپنے خلیفہ شیخ احمد الشناوی، پھر انھوں نے اپنے خلیفہ شیخ احمد قشاشی کو جواہر خمسہ کی اجازت دی، موصوف نے شیخ ابراہیم کو، انھوں نے اپنے صاحبزادے شیخ ابوطاہر اور پھر موصوف نے اپنے شاگرد رشید حضرت شاہ ولی اللہ کو جواہر خمسہ کی اجازت دی۔"[1]

شاہ محمد غوث نے جواہر خمسہ فارسی میں تصنیف کی تھی جس کو بعد میں شیخ وجیہ الدین علوی کے تلمیذ رشید سید صبغۃ اللہ بروجی (م ۱۰۱۵ھ / ۱۶۰۶ء)[2] نے عربی میں منتقل کیا، پھر ان کے شاگرد شیخ احمد الشناوی نے اس پر حاشیہ لکھا، شیخ محمد عقیلہ المکی نے اپنی تالیف لسان الزمان میں اس ترجمہ کی بڑی تعریف کی ہے،[3] ڈاکٹر زبید احمد نے لکھا ہے کہ امام الدین محمد عارف العثمانی المعروف بہ ابوالبنی منظاری (م ۱۰۲۰ھ / ۱۶۱۱ء) نے جواہر خمسہ کی عربی میں شرح بھی لکھی تھی۔[4]

---

[1] شیخ محمد اکرم: رود کوثر مطبوعہ لاہور ۱۹۵۸ء ص ۳۴۴ [2] مولانا رحمان علی نے سید صبغۃ اللہ کے حالات میں لکھا ہے: ان کا نام سید مجد الدین بن روح اللہ حسینی ہے، شیخ وجیہ الدین گجراتی کے شاگرد اور خلیفہ تھے، ایک مدت تک اپنے مرشد کے حکم کے مطابق درس و ارشاد میں مشغول رہے، ایک کثیر جماعت ان کی شاگرد و مرید ہوئی، اس کے بعد حرمین شریفین گئے، ان کی زیارت سے مشرف ہوکر اپنے وطن واپس آئے، ۹۹۹ھ / ۱۵۹۰ء میں مالوہ پہنچے اور وہاں سے احمد نگر آئے، اور ایک سال برہان الملک کے اشارے سے مالوہ میں مقیم رہے، پھر حرمین شریفین کے ارادے سے بیجاپور گئے، سلطان ابراہیم بیجاپوری نے پورا اعزاز و اکرام کیا اور آپ کے لیے سامان سفر مہیا کیا، خاص جہاز پر سوار کرکے حرمین روانہ کیا، سید موصوف مع متبعین و خدام کے حرمین پہنچے اور زیارت سے مشرف ہونے کے بعد احد کے پہاڑ کے قریب مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کر لی، اور جواہر خمسہ کو عربی میں منتقل کیا، کتاب الوحدۃ فی رسالہ آراء الدقائق فی شرح مرآۃ الحقائق، اور تالا یسع المرید، ان کی تصنیفات ہیں، احمد شناوی جن قرا حبیب اللہ اور عبدالعظیم ان کے شاگرد تھے، ۱۰۱۵ھ / ۱۶۰۶ء میں مدینہ منورہ میں وفات پائی،

(مولانا رحمان علی: تذکرہ علمائے ہند، مترجمہ محمد ایوب قادری، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۱ء، ص ۲۴۴)

[3] نواب صدیق حسن خان: ابجد العلوم، مطبوعہ بھوپال ۱۲۹۵ھ ص ۸۹۰ جزء ۳ [4] زبید احمد: عربی زبان کی خدمت میں ہندوستان کا حصہ (انگریزی) ص ۳۰۳

جواہر خمسہ کے عربی ترجمہ سے مغربی فضلا کو التباس ہوگیا ہے، حاجی خلیفہ نے جواہر خمسہ کے عربی نسخہ کا ذکر کیا ہے، مگر تعریب کی صراحت نہیں کی، انھوں نے لکھا ہے:

الجواہر الخمس، للشیخ ابی المؤید محمد بن خطیر الدین ؒ ہو مختصر اولہ

الحمد للہ الاحد الصمد الخ۔

الفہ بگجرات، سنہ ۹۵۶ و رتبہ علی جواہر (۱) فی العبادة (۲) فی الزہد

(۳) فی الدعوة (۴) فی الاذکار، (۵) فی عمل المحققین من اہل الطریقہ۔[۱]

جواہر خمسہ کا عربی ترجمہ مصر میں طبع ہوا تھا، اس کا ایک مخطوطہ برلن میں بھی ہے، غالباً مستشرقین کے پیش نظر یہی نسخہ رہا، اور یہی التباس کا سبب بنا، یہاں تک کہ انڈیا آفس لائبریری، لندن اور برٹش میوزیم، لندن میں جواہر خمسہ کے جو فارسی مخطوطات ہیں ان کو بھی مفروض سمجھا گیا، چنانچہ ہرمن ایتھے، برو کلمن، سی، اے اسٹوری اور ڈاکٹر لوس وغیرہ نے جواہر خمسہ کو عربی الاصل قرار دیا ہے، اور فارسی نسخوں کو عربی نسخہ کی تفریس پر محمول کیا ہے۔

راقم نے الجواہر الخمسہ کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں اس مسئلے پر بحث کی ہے، یہ مضمون برہان (دہلی) کے اپریل سنہ ۱۹۶۲ء کے شمارے میں شائع ہوچکا ہے، تفصیلات کے لیے اس کی طرف رجوع کریں۔

(۲) اوراد غوثیہ - یہ بھی شاہ محمد غوث گوالیاریؒ کی صوفیانہ تصنیف ہے، مفتی غلام سرور لاہوری اور مولانا محمد غوثی نے اس کا خاص طور پر ذکر کیا ہے، مصنف کے بیان کے مطابق یہ کتاب جمادی الاول سنہ ۹۴۹ھ میں تصنیف ہوئی،

"واملائے مذکور در ماہ جمادی الاول سنہ تسع و اربعین و تسعمائۃ ست۔"[۲]

---

[۱] کشف الظنون (متن و ترجمہ بزبان لاطینی) ج ۲ ص ۵۰۵ [۲] اوراد غوثیہ ص ۵۵

اس کتاب کے دیباچے میں بھی مصنف نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف جواہر خمسہ کا ذکر کیا ہے، چنانچہ لکھا ہے :-

ایں کتاب را اوراد غوثیہ نام نہادہ شد، چوں سالک را ازیں اکتفا نشود، جواہر خمسہ کہ تصنیف ایں درویش ہیچ دریائے محیط است کہ وسعت معانی آں ہیچ عرش دارد، ہر چند کہ شغل کند و پائیش بفتش پیش آں کتاب را پیشوائے خود سازد و در عمل آرد تا بپایہ مقصود رسد[1]

(۳) معراج نامہ۔ شیخ محمد غوثؒ کی یہ تصنیف بڑی معرکۃ الآرا ہے۔ بقول مفتی غلام سرور لاہوری، اسی کتاب کی وجہ سے شیر شاہ سوری، شیخ موصوف سے بدظن ہو کر آپ کے درپے آزار ہوا، اور آپ کو ترک وطن کر کے گجرات جانا پڑا ۔

بعضے حاسداں معراج نامہ شیخ را نزد شیر شاہ بادشاہ بردند و بعرض رسانیدند کہ وے دریں کتاب کلمات خلاف شرع تحریر فرمودہ است، شیر شاہ در پے آزاد شد۔ پس شیخ از گوالیار بہ گجرات رفت۔"[2]

گجرات میں تشریف لے گئے تو یہاں بھی بقول ملا عبد القادر بدایونی شیخ علی متقی نے شیخ محمد غوثؒ پر کفر کا فتویٰ لگا دیا، یہ فتویٰ جب شیخ وجیہ الدین علوی کے پاس گیا تو انھوں نے اس کو چاک کر دیا[3]، اور شیخ علی متقی سے فرمایا :-

---

[1] اوراد غوثیہ ص ۳ [2] مفتی غلام سرور لاہوری: خزینۃ الاصفیاء ص ۳۳۳ [3] بقول شیخ محمد اکرام، اس واقعہ کے بعد شیخ وجیہ الدین علوی نے تکفیر مسلم کے مسئلے پر ایک مستقل رسالہ تالیف فرمایا تھا جس میں :- "ابتداءً فقہی کتابوں سے تکفیر پر روشنی ڈالی، پھر احادیث سے سنداً سب کو مشرح بیان کیا ہے، آخر میں صوفیائے کرام کے احوال سے بحث کی ہے جو حالت سکر میں جو کہہ جاتے ہیں وہ قابل مواخذہ نہیں ہوتا، پھر سید محمد غوثؒ گوالیاری کی کتاب اوراد غوثیہ (؟) پر جو اعتراضات کیے تھے، ان کا جواب دیا ہے ...... آپ کا ارشاد یہ تھا کہ کسی شخص کی سو باتوں میں سے ایک (باقی ص ۱۳

ما ارباب تعلیم و شیخ اہل حال، فہم آں کمالات او نمی رسد و بہ ظاہر شریعت ہیچ اعتراض بروے متوجہ نمی گردد۔[1]

پھر جب گجرات سے اکبرآباد پہنچے تو اسی معراج نامے کی وجہ سے بیرم خاں اور شیخ گدائی در پے آزار ہو گئے
شیخ محمد غوث مجبوراً گوالیار واپس آ گئے۔ ملا عبد القادر بدایونی نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:-

رسالۂ شیخ محمد غوث راکہ دراں جا کیفیت معراج خود بیان کردہ گفتہ کہ در بیداری مرا مجالسہ
و مکالمہ با حضرت رب العزۃ عز شانہٗ واقع شد و بر حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم تقدیم کردند
امثال ایں خرافات کہ عقلاً و نقلاً مذموم و ملوم باشد درمیاں آوردہ شیخ را پیش کشیدہ
ہدف تیر ملامت ساختند تا بہ خاطر آزردہ بہ گوالیار رفت۔[2]

مختصر یہ کہ اس معراج نامے کی وجہ سے شیخ محمد غوثؒ کو بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ــــ
شاہ وجیہ الدین جیسی نکتہ رس کے پاس تھی جو اس کتاب کے اسرار و معارف کو سمجھ سکتا،
قیاس یہی کہتا ہے کہ یہ رسالہ عہد ہمایونی کی تصنیف ہے، کیونکہ ۹۴۷ھ میں شیر شاہ کا غلبہ ہو گیا تھا۔

(۴) بحر الحیات۔ یہ کتاب امرت کنڈ[3] کا ترجمہ ہے، جو شاہ محمد غوث نے کیا تھا، بقول شیخ محمد اکرام:

اس میں ہندو یوگیوں اور سنیاسیوں کے اطوار و اشغال کی تفصیل کو فارسی میں منتقل کیا ہے، اپنی
ابتدائی تصنیف جواہر خمسہ میں بھی انکی ایک آدھ جھلک دکھائی، اس سے شطاریہ طریقے کے
اس ارتباط پر روشنی پڑتی ہے، جو اس کو ہندو یوگا سے تھا۔[3]

(۵ و ۶) ضمائر و بصائر۔ ان رسائل میں شاہ محمد غوثؒ نے علم تصوف کے موضوع، مبادی مسائل

(بقیہ حاشیہ ص ۳۶۲) اسلام کی ہو تو اس کو مسلم سمجھو، اور کسی کلمہ گو اہل قبلہ کو کافر نہ کہو۔ (شیخ محمد اکرام: رود کوثر مطبوعہ لاہور ۱۹۵۶ء ص ۳۳۹

[2] ملا عبد القادر بدایونی: منتخب التواریخ، ج ۳ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء ص ۴۴ [3] ایضاً ج ۲ ص ۵-۳۴

[3] شیخ محمد اکرام: رود کوثر مطبوعہ لاہور ۱۹۵۶ء ص ۴۰-۳۶

اور مقاصد کا بیان ہے، اور اس علم کے حقائق اور معاملات ظاہر کیے گئے ہیں[۱]۔

(۷) **کلید مخازن** - مبدأ و معاد کے متعلق یہ بڑا عجیب و غریب رسالہ ہے۔ اس میں علوی و سفلی اشیاء کی تحقیق، توحید صوفیہ کے مشرب اور کشفی تحقیق کے اصول بتائے گئے ہیں، اور ارباب فنا و بقا کے لیے عینی اور علمی موجودات کی شناخت، کشف و معائنہ کے ذریعہ ظاہر کی گئی ہے[۲]۔

مولانا محمد غوثیؒ نے لکھا ہے کہ شاہ محمد غوثؒ کے خلیفہ بزرگ شیخ بدیع الدین جیلانی سمرقندیؒ نے کلید مخازن پر عمدہ حاشیہ لکھا ہے، اور تعلیقات لگائی ہیں[۳]۔

مولانا محمد غوثیؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ احمد آباد (گجرات) میں یہ کتاب میر عبد الاول کے ہاتھ آگئی، موصوف بڑے صاحب معرفت اور ذی علم تھے، جب انھوں نے یہ رسالہ صفحہ بصفحہ مطالعہ فرمایا اور رسالہ کے معزا اور رانیہا کا لطف اٹھایا تو غوث الاولیاء کی خدمت میں مکتوب ارسال کیا، جس میں تحریر تھا:-

> حکمت و ہیئت کے چند مسئلے جن کی دشواریاں عدم دسترسی ذہن کے سبب بہ آسانی حل نہیں ہوئی تھیں، اس مشکل کشا رسالہ کی بدولت آسان ہوگئیں[۴]۔

مندرجۂ بالا تصانیف کے علاوہ مناقب غوثیہ کے تکملہ نگار نے ان کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے:-

> جواہر سبعہ، رسالۂ صغیر، شرح نورنامہ، رفیع الدرجات، سبیل المستقیم و المجذوبین، حسن الاخلاق[۵]۔

(۱۴) **کنز الوحدہ** - مولانا محمد غوثیؒ نے لکھا ہے کہ یہ شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کی آخری تصنیف ہے، اس کتاب کے ضمن میں توحید کشفی اور ایمان حقیقی کا بیان ہے، موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ

[۱، ۲، ۳] محمد غوثی: گلزار ابرار (اردو) ص ۳۲۹، ۳۰۰، ۲۰۰ [۴] ایضاً ص ۳۰۰

[۵] فضل اللہ شطاری: مناقب غوثیہ تکملہ از سید ظہیر الحق مطبوعہ آگرہ ۱۳۰۳ھ ص ۱۱۵

شاہ محمد غوثؒ کے خلیفہ بزرگ شیخ بدیع الدین جیلانی سمرقندی نے کنز الوحدة پر عمدہ حاشیہ لکھا ہے اور تعلیقات لگائی ہیں۔[1]

(۴) گلزار ابرار۔ بعض تذکرہ نگاروں نے گلزار ابرار کو بھی شاہ محمد غوث گوالیاری کی طرف منسوب کر دیا ہے، چنانچہ نظامی بدایونی نے قاموس المشاہیر میں لکھا ہے:-

> آپ کی تصانیف سے گلزار ابرار اور جواہر خمسہ ہیں، اول الذکر میں صوفیائے کرام کے حالات درج ہیں...[2]

ولیم بیل نے بھی یہی ستم ظریفی کی ہے، اس نے لکھا ہے:-

> آپ کئی کتابوں کے مصنف ہیں، ان تصانیف میں جواہر خمسہ اور دوسری گلزار ابرار ہے، موخر الذکر میں ہندوستان کے تمام مشائخ صوفیا کے حالات زندگی، جائے دفن اور بہت سی دوسری باتیں درج ہیں۔[3]

مگر فی الحقیقت گلزار ابرار مولانا محمد غوثی کی تالیف ہے،[4] شیخ اویسؒ کے حالات کے ذیل میں گلزار ابرار پر بھی ضمنی طور پر روشنی ڈال دی گئی ہے، شاہ محمد غوثؒ کا وصال ۹۷۰ھ میں ہوا اور گلزار ابرار کا سنہ تکمیل و تالیف ۱۰۲۲ھ ہے، اور زمانہ تالیف ۱۰۱۴ھ تا ۱۰۲۲ھ۔ ظاہر ہے کہ یہ کتاب شاہ محمد غوث گوالیاری کی تصنیف نہیں ہو سکتی، محمد غوثی نے گلزار ابرار کے سال اتمام پر یہ قطعہ لکھا ہے:-

بے حجابانہ خلوتے دارند — چوں بزرگان دریں چہار چمن

خلوتے بے حجاب گشت ازاں — سال اتمام ایں حدیقہ دیں[5]

۱۰۳۶ - ۱۴ = ۱۰۲۲ھ

(باقی)

---

[1] محمد غوثی: گلزار ابرار (اردو) مطبوعہ ۱۳۲۶ھ ص ۲۰۸ [2] نظامی بدایونی: قاموس المشاہیر مطبوعہ بدایوں ۱۹۲۶ء ج ۲ ص ۱۹۵

[3] آپ شیخ حسن بن موسیٰ احمد آبادی (م ۹۸۲ھ) کے فرزند ہیں، آپ کی ولادت مانڈو میں شب جمعہ ۱۱ رجب ۹۶۲ھ میں ہوئی (محمد غوثی گلزار ابرار (اردو) ص ۱۰۶)۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے سنہ ولادت ۹۴۳ھ لکھا ہے اگرچہ خود محمد غوثی نے ۹۶۲ھ لکھا ہے، موصوف نے یہ بھی لکھا ہے:- "محمد غوثی حضرت سید محمد غوث گوالیاری شطاری سے بیعت تھے" (حیات شیخ عبد الحق مطبوعہ دہلی ص ۲۰۸) یہ بیان صحیح نہیں، کیونکہ خود محمد غوثی نے لکھا ہے کہ ان کو تاج العرفا شیخ ضیاء الدین خاں خلیفہ پیر صدر الذاکرین سے شرف بیعت حاصل تھا (گلزار ابرار اردو ص ۱۰۹) [5] گلزار ابرار (اردو) مطبوعہ ۱۳۲۶ھ، ص ۶۳۲
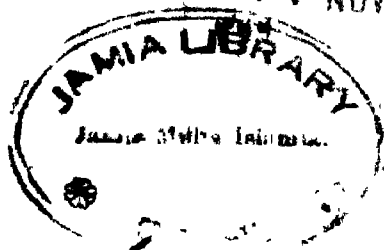
خیام کا قدیم ترین تذکرہ

از

جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے۔ ایل ایل، بی، پی ایچ۔ ڈی رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش

(۲)

(۲) جناب ڈاکٹر قاری کلیم اللہ صاحب کی دوسری دلیل حسب ذیل ہے :-

"تتمہ کے غائر مطالعہ کے بعد اس میں جو سنین قریب اختتام کتاب واقع ہوئے ہیں، انھیں ترتیب دیا ہے وہ ۵۴۴ھ سے ۵۴۹ھ تک کے مسلسل ہیں، اس کے بعد کوئی سنہ موجود نہیں ہے بجز ۵۵۳ھ لیکن اس سنہ کے بعد بھی ۵۴۳ھ، ۵۴۹ھ واقع ہوئے ہیں، ۵۴۹ھ تک مسلسل سنین کے واقعات لکھ کر تین سال تک خاموش رہنا پھر ۵۵۳ھ کا سنہ درج کرنا تعجب خیز ہے، ہماری رائے میں یہ سنہ غلط درج ہوا ہے، اور کسی کاتب کی سہو کتابت کا نتیجہ ہو سکتا ہے، جو عام بات ہے، درمیانی ہندسہ "۵" کے عوض "۴" ہوگا، کیونکہ ۵۴۴ھ سے مسلسل سنین شروع ہوتے ہیں، ۵۴۳ھ اس کی پہلی کڑی ہو سکتا ہے، ورنہ ۵۴۹ھ تک مسلسل سنین کے واقعات بیان کر کے تین سال کے بعد کا واقعہ لکھنا گویا یہ تسلیم کرنا ہے کہ اس مدت میں کوئی قابل ذکر عالم یا واقعہ گزرا ہی نہیں، جو بعید از قیاس ہے"

بالفاظ دیگر جناب ڈاکٹر صاحب نے ترتیب و تحریر کتاب (تتمہ صوان الحکمۃ) میں دو اصولوں کو بطور مسلمہ کے تسلیم کر لیا ہے۔

ا۔ کتاب کی ترتیب تاریخی ہے،

ب۔ مصنف نے ہر سنہ کے واقعات یا شخصیات کے ذکر کا التزام کیا ہے،

حالانکہ دونوں باتیں نہیں ہیں، نہ ابتداے کتاب میں نہ وسط میں نہ قریب اختتام کتاب،

(جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے نظریہ قائم کیا ہے)

(۱) کتاب کا آغاز حنین بن اسحاق سے ہوتا ہے، اس کے بعد اس کے بیٹے اسحاق بن حنین کا ذکر ہے جس کا سال وفات ۲۹۸ھ ہے، مگر چوتھا تذکرہ ثابت بن قرہ الحرانی کا ہے جس کا سال وفات ۲۸۸ھ ہے،

پانچواں تذکرہ محمد بن زکریا الرازی کا ہے، اور چھٹا علی بن زین الطبری کا جو رازی کا استاد اور اس سے مقدم ہے،

چودھواں تذکرہ متی بن یونس کا ہے، جس کا زمانۂ فروغ چوتھی صدی کا ثلث اول ہے، اور پندرھواں یحیی بن ابی منصور کا، جو اس سے سو سال پہلے، تیسری صدی کے ثلث اول میں رصدگاہ مامونی کا متولی تھا (خود بیہقی نے لکھا ہے: "صاحب الرصد فی ایام المامون")

سولھواں تذکرہ ابونصر فارابی (المتوفی ۳۳۹ھ) کا ہے، انیسواں ابوعبد اللہ الناتلی کا (جو شیخ بوعلی سینا کا استاد تھا) اور اکیسواں تذکرہ کندی کا ہے جو تیسری صدی کے نصف اول میں تھا،

وسط کتاب میں اڑتیسواں تذکرہ ابوالوفا والبوزجانی کا ہے اور بیالیسواں ابن الحکم بغدادی کا جو اس سے مقدم تھا، اور سینتالیسواں کوشیار بن لبان الجیلی کا جو دونوں سے کہیں مقدم تھا، سترواں تذکرہ قطب الزمان طبسی (المتوفی ۵۳۹ھ) کا ہے، اٹھترواں ابوسعد التبریزی کا جو بیہقی کے باپ کے زمانہ میں تھا، چھیاسیواں تذکرہ شہرستانی (المتوفی ۵۴۸ھ) کا ہے، اٹھاسیواں ابن المحسن طبیب کا جس کا زمانہ ۴۳۶ھ تا ۴۹۵ھ ہے،

اسی طرح آخر کتاب میں ترانوے واں تذکرہ ابو البرکات بغدادی (المتوفی ۵۴۷ھ) کا ہے،
ایک سو دو واں محمود خوارزمی کا جس نے ۵۲۱ھ میں وفات پائی، اور ایک سو چار واں محمد بن احمد
المعموری کا جو ۵۱۲ھ میں قتل ہوا، ایک سو سواں تذکرہ علی بن شابک القصاری کا ہے جو تتمہ کی
تصنیف کے وقت بقید حیات تھا، اور آخری یعنی ایک سو گیارہواں تذکرہ زین الدین اسمٰعیل جرجانی
کا جو ۵۳۱ھ میں وفات پاچکا تھا،

(ب) ابتداء کتاب ہو یا اختتام کتاب بہت سے سنین ایسے ملیں گے جن میں کوئی قابل ذکر واقعہ
ہوا ہی نہیں اور نہ بیہقی ہی نے اس کا التزام کیا ہے۔ اس کی تفصیل موجب تطویل ہوگی، اس لیے
صرف نظر کیا جاتا ہے۔

بہرحال جناب ڈاکٹر صاحب کے استدلال کی دونوں بنیادیں انتہائی ضعیف ہیں، اور ان کی
اساس پر کوئی قابل اعتنا بات نہیں کہی جاسکتی، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے:-

"ہماری رائے میں یہ (۵۳۵ھ) غلط درج ہوا ہے ..... درمیانی ہندسہ 'د' کے بجائے 'م'
ہوگا کیونکہ ۵۴۳ھ سے مسلسل سنین شروع ہوتے ہیں، ۵۴۳ھ اس کی پہلی کڑی ہوسکتا ہے۔"

بہت ممکن ہے کاتب سے ۵۵۳ھ کے رقم کرنے میں سہو ہوا ہو، مگر قرائن اس بات کے مقتضی ہیں
کہ یہ ۵۴۳ھ نہ ہوگا، بلکہ اصل میں ۵۶۳ھ ہوگا (تفصیل آگے آرہی ہے)۔

ڈاکٹر صاحب نے راقم السطور سے مطالبہ کیا ہے:

"مراسلہ نگار صاحب نے تتمہ صوان الحکمہ کی تصنیف کا سنہ نہ صرف ۵۵۳ھ تسلیم کیا ہے
بلکہ ان کے خیال میں وہ ۵۶۹ھ یا اس کے بعد کی تصنیف ہے، معلوم نہیں ان کا یہ خیال
کس مواد پر مبنی ہے؟"

ادب کے ساتھ عرض ہے کہ اس عاجز نے یہ رائے تتمہ صوان الحکمہ اور حکما وفضلاء کے دیگر

تراجم کے تقابلی مطالعے کے بعد قائم کی ہے، تتمہ صوان الحکمہ میں بیہقی نے امین الدولہ ابن التلمیذ کی وفات کا ذکر کیا ہے:۔

الحکیم ابوالحسن ابن التلمیذ البغدادی..	حکیم ابوالحسن ابن تلمیذ البغدادی ۵۴۹ھ
توفی فی شہور سنۃ تسع واربعین وخمسمائۃ	میں وفات پائی،

اگرچہ یہ سال وفات باتفاق مورخین غلط ہے، تاہم اتنا یقینی ہے کہ یہ کتاب امین الدولہ ابن التلمیذ کی وفات کے بعد تالیف ہوئی تھی اور امین الدولہ ابن التلمیذ کا سال وفات متفقہ طور پر ۵۶۰ھ ہے، چنانچہ ابن خلکان لکھتا ہے:

ابوالحسن ھبۃ اللہ بن ابی الغنائم	ابوالحسن ہبۃ اللہ بن ابی الغنائم...
... المعروف بابن التلمیذ النصرانی	المعروف بابن التلمیذ النصرانی طبیب
الطبیب الملقب بامین الدولۃ	الملقب بہ امین الدولہ بغدادی نے
البغدادی.... توفی فی صفر سنۃ	۵۶۰ھ میں وفات پائی۔
ستین وخمسمائۃ	

ابن القفطی لکھتا ہے:۔

سلطان الحکماء امین الدولہ ابو	سلطان الحکماء امین الدولہ ابوالحسن ہبۃ
الحسن ھبۃ اللہ بن صاعد الطبیب	اللہ بن صاعد الطبیب النصرانی جو
النصرانی یعرف بابن التلمیذ.....	ابن تلمیذ کے نام سے مشہور ہے....
وتوفی ھبۃ اللہ بن صاعد فی صفر	اور ہبۃ اللہ بن صاعد نے صفر ۵۶۰ھ
سنۃ ستین وخمسمائۃ	میں وفات پائی

اسی طرح ابن ابی اصیبعہ جس نے اطبا کا مستقل تذکرہ لکھا ہے، اس کا سال وفات ۵۶۰ھ بتاتا ہے:۔

وکانت وفاۃ امین الدولہ ببغداد	امین الدولہ کی وفات بغداد
فی الثامن والعشرین شہر ربیع	میں ۲۸ ربیع الاول ۵۶۰ھ
الاول سنۃ ستین وخمسمائۃ	میں ہوئی،

پھر شہرزوری کی "نزہۃ الارواح" تتمہ صوان الحکمۃ ہی کی نقل ہے، برلن میں اس کتاب کا جو مخطوطہ ہے اس میں جس صفحہ پر ابن التلمیذ کا تذکرہ ہے، اس کے حاشیہ پر کسی نے غالباً ذہبی کی تاریخ الاسلام سے حسب ذیل عبارت نقل کی ہے:

"وفی تاریخ الکبیر: توفی ہبۃ اللہ ابن الصاعد یعنی ابن التلمیذ فی صفر سنۃ ستین وخمسمائۃ"

ان تصریحات کے بعد جو متفقہ طور پر ابن التلمیذ کا سال وفات ۵۶۰ھ بتاتی ہیں، اس باب میں کوئی شک نہیں رہتا کہ "تتمہ صوان الحکمۃ" جس میں اس کی موت کا مذکور ہے، ۵۶۰ھ کے بعد تصنیف ہوئی، ورنہ گیارہ سال پیشتر بیہقی اسے "توفی فی شہور سنۃ تسع واربعین وخمسمائۃ" نہیں لکھ سکتا تھا،

اس کے بعد غالباً جناب ڈاکٹر صاحب کو اس نیازمند کی رائے سے اتفاق کرنے میں تامل نہ ہوگا،

یہ بھی واضح رہے کہ جہاں تک فضلائے مشرق وخراسان کا تعلق ہے، بیہقی کو ان کے متعلق براہ راست اطلاع تھی، فضلائے عراق ومغرب کے باب میں اس کی معلومات رطب ویابس سبھی پر مشتمل تھیں مثلاً کندی جو عرب نژاد اور مذہباً مسلمان تھا، اس کے بارے میں، اس کا خوشہ چین ہونے کے باوجود اسے کوئی قطعی اطلاع نہیں تھی، وہی بے سروپا قصے جو خراسان میں مشہور تھے اس نے بھی سنے تھے، چنانچہ تتمہ صوان الحکمۃ میں اس کے بارے میں لکھتا ہے:۔

یعقوب بن اسحٰق الکندی......	یعقوب بن اسحٰق کندی کے مذہب کے بارہ میں
اختلفوا فی ملتہ فقال قوم کان	اختلاف ہے، ایک جماعت کہتی ہے وہ یہودی تھا
یہودیا ثم اسلم وقال بعضہم	پھر اسلام لایا، بعض لوگ نصرانی کہتے ہیں

کان نصف نیاً وانا ما حصلت علم	میں نے علم المناظر میں جو کچھ حاصل کیا
المناظر وما تخیلت اشکال ذلك	اور اس علم کی جو اشکال نکالیں وہ صرف
العلم الا من تصنیفه الذی هو	اسی کی تصانیف سے جو اس فن میں
نادر فی ذالك الفن	نادر ہیں۔

اسی طرح یحیٰی النحوی کے بارے میں اس کا بیان تاریخ کے بجائے افسانۂ محض ہے یحیٰی النحوی جو فتح اسکندریہ (۲۱ھ) سے کہیں پہلے وفات پاچکا تھا بیہقی کے یہاں امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہد خلافت (۳۵ھ - ۴۰ھ) بلکہ امیر معاویہؓ کے عہد حکومت میں بھی زندہ بتایا جاتا ہے۔

ان دو دلیلوں کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے خیال کی صحت پر ایک سند بھی بیان کی ہے، فرماتے ہیں:-

"تتمہ صوان الحکمہ اور اس میں عمر خیام کا ترجمۂ حال موجود ہونے کا ذکر میں نے اس زمانہ میں پیرس میں علامہ مرزا محمد قزوینی سے کیا تھا، اور تتمہ کی تقدیم چہار مقالہ پر ظاہر کی تھی تو انھوں نے فرمایا تھا:

"آقا ایں تحقیق من بود و ایں تحقیق جدید شما است آنرا تسلیم می کنم"

مجھے افسوس ہے کہ جناب ڈاکٹر صاحب نے شوقِ خود ستائی میں صحت بیان کی زیادہ پروا نہیں کی، قزوینی نے کبھی ان کی "تحقیق جدید" کو تسلیم نہیں کیا، ان کا مصمم خیال تھا کہ

(ا) تتمہ صوان الحکمہ ۵۵۳ھ کے بعد کی تصنیف ہے، نیز

(ب) تتمہ صوان الحکمہ چہار مقالہ سے موخر ہے،

چنانچہ "بست مقالہ" میں جس کا جناب ڈاکٹر صاحب نے حوالہ دیا ہے، فرماتے ہیں:

"تاریخ تالیف کتاب، تاریخ تالیف تتمہ صوان الحکمہ را علی التحقیق راقم سطور تاکنون نتوانستہ ام معلوم نمایم ولے چوں از طرفے دریں کتاب وفات ابوبکر بن عروہ کہ در سنہ پانصد و پنجاہ و سہ واقع شدہ مذکور است (ورق ۸۰ ب) و از طرف دیگر چوں وفات

خود مولف چنانکہ گزشت در سنہ پانصد و شصت و پنج است پس تالیف این کتاب بالضرورۃ محصور خواہد شد بین دو سنہ مذکور یعنی ۵۵۳ھ۔ ۵۶۵ھ"

دوسری جگہ فرماتے ہیں :-

"تاریخ تالیف تتمہ صوان الحکمہ بطور تحقیق برائے راقم سطور معلوم نیست چہ ہنوز اصل نسخہ بنظر من نرسیدہ است، ولے ازینکہ تاریخ وفات شہرستانی معروف صاحب ملل و نحل راکہ در ۵۴۸ھ است و تاریخ وفات ابوبکر بن عروہ راکہ در ۵۵۳ھ است بدست میدہد (رجوع بفہرست نسخ عربی برلین ج ۹ ص ۵۵۴) وازینکہ وفات خود مولف چنانکہ گزشت در ۵۶۵ھ است واضح می شود کہ تتمہ صوان الحکمہ مابین سنوات ۵۵۳ھ۔ ۵۶۵ھ تالیف شدہ است یعنی فقط چند سالے بعد از تالیف چہار مقالہ کہ در حدود ۵۵۱ھ است چنانکہ در دیباچۂ آن کتاب مشروحاً بیان شدہ است۔"

قزوینی کی ان تصریحات سے ڈاکٹر صاحب کی اس خوش فہمی کی بھی تردید ہوتی ہے کہ انھوں نے چہار مقالہ پر تتمہ صوان الحکمہ کی تقدیم کو تسلیم کر لیا تھا، چنانچہ قزوینی نے ایک دوسرے مقام پر بھی تذکرۂ خیام کے باب میں تتمہ صوان الحکمہ کو چہار مقالہ سے موخر بتایا ہے :-

"اند شرح حال حکیم عمر خیام کہ بعد از چہار مقالہ نظامی عروضی سمرقندی ظاہرا قدیم ترین و مختصر ترین ترجمہ حالے است کہ بقلم یکے از معاصرین او بدست است ۔"

جناب ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے :-

(علامہ قزوینی نے) مجھ سے خواہش بھی کی کہ میں برلن سے تتمہ میں مندرج حال خیام کی نقل ان کے لیے بھیجوں، چنانچہ میں نے وہ نقل ان کے لیے بھیجی، علامہ قزوینی نے جب صوان الحکمہ مصنفہ ابوسلیمان سجستانی پر مضمون لکھا اور تتمہ صوان الحکمہ کے مصنف

پر بھی روشنی ڈالی تو خیام کے متعلق میرے مرسلہ نقل کا بھی ذکر کیا جو متعاقب بست مقالہ قزوینی حصہ دوم کے عنوان صوان الحکمہ کے صفحات ۸۹ - ۱۲۶ پر مذکور ہے"۔

ڈاکٹر صاحب نے ان صفحات کا تو حوالہ دیدیا، مگر اس صفحہ کا حوالہ نہیں دیا جس میں قزوینی نے ان کی اس مرسلہ نقل کے متعلق اپنی رائے کا ذکر کیا تھا۔ بست مقالہ حصہ دوم صفحہ ۱۲۰ کے حاشیہ نمبر ۲ میں قزوینی نے لکھا ہے:۔

"درسواد ے .... کہ آقائے کلیم اللہ ہندی ازیں ترجمہ حال برائے من فرستادہ اند بعضے اغلاط جزئیہ مشاہدہ می شود کہ اغلب آنہا ظاہراً در نسخہ اصل بودہ است ولے بعضے از آنہا نیز شاید مربوط بناسخ یعنی آقائے کلیم اللہ باشد سہواً او غفلۃً "۔

یہ رائے ہے فارسی زبان و ادب کے ایک مبصر کی، جناب ڈاکٹر صاحب کی اس کاوش و تحقیق کے متعلق جس کی اساس پر انھوں نے متقدمین کی تحقیقات پر خط نسخ پھیرنے کی کوشش کی ہے۔ قزوینی کی اس رائے کی صحت کسی مزید ثبوت کی محتاج نہیں ہے۔ جناب ڈاکٹر صاحب نے اسلامک کلچر (جنوری و اپریل ۱۹۶۱ء) میں تتمہ صوان الحکمہ کے اقتباسات کا جو ترجمہ دیا ہے اس سے بآسانی معلوم ہوسکتا ہے کہ نہ صرف نقل کتاب ہی میں بلکہ اس کے پڑھنے اور سمجھنے میں بھی ان سے شدید تسامحات (بلکہ بعض مقامات پر مضحکہ خیز تسامحات) ہوئے ہیں، مگر اس کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے،

بہر حال چہار مقالہ آخر ۵۵۱ھ کی تصنیف ہے۔ اور تتمہ صوان الحکمہ ۵۵۳ھ کے بعد بلکہ ۵۵۶ھ کے بعد کی تصنیف ہے۔ اور اس لیے دونوں میں قدیم تر چہار مقالہ ہے۔

خیام کا قدیم ترین تذکرہ۔ لیکن اب تو "تتمہ صوان الحکمہ" کی اقدمیت کا خیال تقویم پارینہ بن چکا ہے، اور محققین نے اس سے کہیں زیادہ قدیم مآخذ و مصادر دریافت کرلیے ہیں، جن میں سے بعض تو خود خیام کی زندگی ہی میں مرتب ہوچکے تھے، ان کا ایک گوشوارہ ڈاکٹر معین نے چہار مقالہ کے جدید اڈیشن (۱۹۵۴ء)

میں دیا ہے۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۶۰ء میں اس قسم کا دعویٰ:

"It was discovered by me during my resear-
-ches in the libraries of Europe that the Tatimmah
Suwan-ul-Hikah of Abul-Hasan Bayhaqi
contained the earliest account of Umar Khayyam."

بڑا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے،

بہرحال محققین ایران نے عمر خیام کے احوال و آثار کے سلسلے میں تین قدیم ترین ماخذ دریافت کیے ہیں:-

۱- آقائے مجتبیٰ مینوی کو حکیم سنائی کا ایک خط ملا ہے جو انھوں نے خیام کو اپنے ایک ذاتی کام سے لکھا تھا،

۲- آقائے بدیع الزماں فروزاں فر نے زمخشری کی "الزاجر للصغار" میں مصنف (زمخشری) اور خیام کی اُس وقت کی ملاقات کا حال دریافت کیا ہے جبکہ خیام نوجوان تھا،

۳- آقائے جلال ہمائی نے عبد الرحمٰن الخازنی کی "میزان الحکمہ" میں آبی ترازو کی تیاری کے سلسلے میں عمر خیام کا ذکر دریافت کیا ہے،

ان کے علاوہ ان سے بھی زیادہ قدیم ماخذ کا حوالہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم و مغفور نے دیا ہے، یہ قابوس نامہ ہے جو خیام کی نوجوانی کے زمانہ (سنہ ۴۷۵ھ) میں تصنیف ہوا تھا لیکن قابوس نامہ مطبوعہ گلزار حسینی پریس بمبئی جس کے صفحات کا سید صاحبؒ نے حوالہ دیا ہے، مجھے نہیں مل سکا،

البتہ حکیم سنائی کا مکتوب اور "الزاجر للصغار" کا متعلقہ اقتباس ڈاکٹر معین نے چہار مقالہ کے جدید اڈیشن میں نقل کر دیا ہے، اور خازنی کی "میزان الحکمہ" دائرۃ المعارف حیدرآباد نے شائع کر دی ہے، مگر ان تینوں میں صرف "میزان الحکمہ" میں سنہ تصنیف مذکور ہے، باقی دو میں نہیں ہے، اسلیے

ان تینوں کے درمیان اقدمیت کا مسئلہ طے کرنا انتہائی مشکل ہے، اور قطعیت کے ساتھ ان میں ترتیب زمانی قائم نہیں کی جاسکتی،

ویسے خیال ہوتا ہے کہ شاید عبدالرحمٰن الخازنی کی "میزان الحکمۃ" (مصنفہ ۵۱۵ھ) تینوں میں قدیم ہے، اس خیال کی وجہ حسب ذیل ہے:۔

۱۔ حکیم سنائی نے محولہ مکتوب خیام کو اپنے ایک ذاتی کام سے لکھا تھا،

سنائی نیشاپور گئے تھے اور ایک سرائے میں ٹھہرے۔ ان کے غلام نے کسی صراف کے یہاں چوری کی، جب گرفتار ہوا تو اسے توقع تھی کہ سنائی اس کی برأت کے لیے کوشش کریں گے، مگر وہ خاموش رہے، جب وہ سنائی کی طرف سے مایوس ہوگیا تو اس نے جھوٹا اقرار کرلیا کہ روپیہ میں نے اپنے مالک سنائی کو دیدیا ہے۔ اس لیے حکیم سنائی سے بھی مواخذہ ہوا، ایک تو ناکردہ جرم کا الزام، دوسرے الزام کے گھناؤنے پن کی ندامت، سنائی کو سخت ذہنی اذیت ہوئی، اور عمر خیام کے وسیلہ سے اس معاملہ کو رفع دفع کرانے کے لیے یہ مکتوب لکھا، اُن کا خیال تھا کہ یہ صاحب وجاہت اور باوقار حکیم جو ملوک امراء سے برابر کے تعلقات رکھتا تھا۔ جو علاء الدولہ فرامرز سے دو بدو گفتگو کرتا تھا، جسے شمس الملوک امیر بخارا تخت شاہی پر اپنے برابر بٹھاتا تھا، جو وزیر شہاب الاسلام کے یہاں محترم سمجھا جاتا تھا، اگر اس کے معاملہ میں ذرا بھی دلچسپی لے تو یہ قضیہ بڑی آسانی سے طے ہوسکتا ہے، اور یہ داغ ندامت ان کی پیشانی سے مٹ سکتا ہے، اس لیے انھوں نے اس مکتوب میں اسے تحریضاً لکھا تھا:۔

"من متعجب و سکون و صلابت تو کہ چندیں محیلاں در شہر ذوالفقار زبان تو در نیام و چندیں فساد در جوار تو و درۂ صلابت تو بر طاق۔"

مگر اس سکون و صلابت کی وجہ یہ تھی کہ خیام خود گوشۂ عزلت میں چھپ کر بیٹھ چکا تھا، اور معاملات شہر (نیشاپور) میں دخل دینے کا تو کیا سوال خود اپنی جان کی خیر مناتا تھا، چنانچہ ابن القفطی نے اس گوشہ نشینی

اور خاموشی کے سلسلے میں لکھا ہے کہ جب آخر عمر میں خیام کے الحاد و بیدینی پر لوگوں نے طعن و تشنیع کرنا شروع کیا تو وہ سخت خائف ہوا، اس کی جان کے لالے پڑ گئے، اور اپنے صحت اسلام کے ثبوت کے لیے حج بیت اللہ کے لیے گیا، واپسی میں لوگوں سے ملنے جلنے میں اتنا احتیاط ہو گیا تھا کہ اپنے ہم مشربوں سے بھی؛ لہٰذا، اس کے بعد زندگی کے بقیہ ایام گوشۂ عزلت ہی میں گزار دیے:

ولما قدح اهل زمانه فی دینه واظهر واما اسره من مکنونه خشی علی دمه وامسک من عنان لسانه وقلمه وحج مناقاة لا تقیة وابدی اسرارا من السرار غیر نقیة۔ ولما حصل ببغداد سعی الیه اهل طریقته فی العلم القدیم فسدد دونهم الباب سد القادم لا سد الندیم ورجع من حجه الی ملغه یروح الی محل العبادة"

اور اسی عالم میں اس نے وفات پائی، چنانچہ بیہقی نے اس کے تذکرے میں لکھا ہے:

وحکی ختنه الامام محمد البغدادی انه کان یتخلل بخلال من ذهب وکان یتامل الالٰهیات من الشفا فلما وصل الی فصل الواحد والکثیر وضع الخلال بین الورقتین وقال ادع الاخر کیا حتی اوصی فوصی فقام وصلی ولم یاکل ولم یشرب فلما صلی العشاء الاخیرة سجد وکان یقول فی سجوده اللهم تعلم انی عرفتک علی مبلغ امکانی فاغفر لی فان معرفتی ایاک وسیلتی الیک ومات"

اس لیے اگر خیام کا سال وفات ۵۱۷ھ ہے، جیسا کہ عامہ مستشرقین کا خیال ہے تو یہ قضیہ نامرضیہ ۵۱۵ھ سے کچھ ہی پہلے پیش آیا ہو گا، کیونکہ وفات کے وقت جو حیرت اور بے تعلقی اس پر طاری تھی حکیم سنائی نے (جنھیں شاید ہم مشرب ہونے کے باوجود اس سفر میں خیام سے شرف ملاقات نہ ہو سکا تھا) اس کو "سکون و صلابت" اور "ذوالفقار زبان در نیام" سے تعبیر کیا ہے، اور اگر خیام کا سال وفات ۵۲۶ھ ہے جیسا کہ ہندوستان میں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم و مغفور نے اور

ایران میں ڈاکٹر معین نے رائے ظاہر کی ہو تو یہ واقعہ ۵۲۵ھ سے کچھ ہی پہلے کا معلوم ہوتا ہے۔

ہر حال میں سنائی نے یہ مکتوب خیام کو غالباً ۵۱۵ھ کے بعد لکھا تھا۔

ب۔ زمخشری نے رسالہ" الزاجر للصغار عن معارضۃ الکبار" میں لکھا ہے:۔

ولقد ہدی بحکیم الدنیا و فیلسوفھا الشیخ الامام الخیامی وقد نظمنی وایاہ

المجلس الفریدی فسألنی .... ثم زاد فی توقیری وقال غیر مرۃ لفرید

العصر .. وکان یجلس الینا ویستمع الاوراد التی تدرس بین یدی

وکان یقول لاصحابی الا اخبرکم عن بصیرۃ وخبرۃ ان مثل ھذا التیقظ

والتحقیق لا یوجد فی جمیع المعمورۃ لا فی ھذہ الوقعۃ فاعلموا ؟"

فرید العصر لقب ہے حکیم ابو نصر محمود بن جریر الضبی الاصفہانی کا جو وزیر صدر الدین محمد

ابن فخر الملک کے متوسلین میں سے تھا، حکیم فرید العصر نے ۵۰۷ھ میں وفات پائی، اکابر فضلاء

وادباء اس کے تلامذہ میں سے تھے، انھیں میں سے زمخشری (المتوفی ۵۳۸ھ) بھی تھا۔ اس لیے

زمخشری کا یہ واقعہ لکھتو یہ ۵۰۷ھ سے پہلے کا ہے۔ مگر خود کتاب" الزاجر للصغار" کب تصنیف

ہوئی، اس کا تعین نہیں ہو سکا، اس ضمن میں آقائے بدیع الزماں فروزانفر نے لکھا ہے:۔

"زمخشری در سال ۵۳۸ وفات کردہ، بنا بریں...... رسالہ الزاجر ہم قبل از ۵۳۸ باید

تالیف شدہ باشد، ولے ابہیں اقتصار نمی کنیم و ثابت می کنیم کہ در عمر زمخشری ہم درچہ فاصلہ

ای تالیف شدہ۔"

اس کے بعد بقول ڈاکٹر معین آقاے فروزاں فر نے اس رسالہ کے زمانہ تصنیف کی تحدید و تعیین

میں دلائل دیے ہیں جن کا ماحصل یہ ہے:

"مسلم می شود کہ تاریخ تالیف آں قبل از سال ۵۱۲ھ بودہ است۔"

لیکن ۵۱۶ھ سے پہلے کب ؟ یہ بات ہنوز تعین کی گرفت میں نہیں آسکی ۔

ج ۔ لیکن میزان الحکمۃ کا سال تصنیف (بلکہ سال تکمیل) بصراحت مصنف ۵۱۵ھ ہے، چنانچہ اس کتاب کے صفحہ ۹ سطر ۱۲ پر مرقوم ہے :-

"وصنفت کتاباً فی میزان الحکمۃ لخزانتہ المعمورۃ فی شہور سنۃ خمس عشرۃ وخمسمائۃ لھجرۃ نبینا محمد المصطفی علیہ السلام وتم ذلک بسعادتہ۔"

کتاب کے مصنف کا نام ابوالفتح عبدالرحمٰن الخازنی ہے، جو کتب خانہ مرو کے لائبریرین ابوالحسن علی بن محمد کا رومی الاصل غلام تھا سال وفات معلوم نہیں لیکن سنجر کے زمانہ میں تھا جس کے نام پر اس نے "زیج سنجری" معنون کی تھی، اور تتمہ صوان الحکمۃ کی تالیف سے قبل وفات پا چکا تھا، کیونکہ بیہقی اسے بصیغۂ ماضی یاد کرتا ہے :- کان غلاماً رومیاً لعلی الخازن المروزی۔"

مگر ۵۲۹ھ کے قریب زندہ تھا، کیونکہ اسی زمانہ میں بیہقی نے نجوم میں کمال بہم پہنچایا تھا، اور اس فن میں امتیازی مرتبہ حاصل کیا تھا، غالباً اسی زمانہ میں اس کا ترتیب دیا ہوا ایک زائچہ عبدالرحمٰن الخازنی کے سامنے پیش کیا گیا جس کی اس نے بہت زیادہ تعریف کی اور کہا : "ان مستخرجہ کامل فی تلک الصناعۃ متصعد۔"

خازنی کی تصانیف میں بیہقی نے دو کتابوں کا نام لیا ہے : (۱) زیج سنجری، اور (۲) میزان الحکمۃ۔ موخر الذکر (میزان الحکمۃ) اپنے موضوع پر اسلامی عبقریت کا شاہکار ہے، اسکے نصف اول میں اس فن کے قدیم ماہرین کی کاوشوں کا تذکرہ ہے، اور آخری نصف میں مصنف (عبدالرحمٰن الخازنی) نے اپنی تحقیقات کا ذکر کیا ہے۔

اس کتاب کا ایک بڑا اچھا نسخہ جامع مسجد بمبئی کے کتب خانہ میں موجود ہے، جو تصنیف کتاب کے ستر سال بعد ۵۸۵ھ میں لکھا گیا تھا دوسرا نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے، ایک تیسرا نسخہ لینن گراڈ میں میں ہے، جس کے ایک جزو کو روسی مستشرق خانیکوف (Hhanikoff) نے کسی زمانہ میں شائع کیا تھا۔

۱۳۵۹ھ میں دائرۃ المعارف حیدرآباد نے نسخۂ آصفیہ، نسخۂ جامع مسجد بمبئی اور مخطوطہ لینن گراڈ کے عکس شمسی کی مدد سے اس مفید کتاب کو شائع کر دیا ہے،

خازنی نے "میزان الحکمۃ" کے صفحہ ۷ پر ان حکما کی فہرست دی ہے جنھوں نے ارشمیدس کے زمانہ سے مصنف (خازنی) کے عہد تک اس موضوع پر تحقیق کی، یونانیوں میں اس نے اس سلسلے میں ارشمیدس اور مانالاؤس کے نام لیے ہیں، عہد عباسی کے فضلا میں سے سند بن علی، یوحنا بن یوسف اور احمد بن الفضل المساح کے نام بتائے ہیں۔ متاخرین میں سے سامانی عہد کے فضلا میں ابوبکر محمد بن زکریا الرازی کا۔ دیلمی حکومت کے حکما میں سے ابوالفضل ابن العمید اور شیخ ابو علی سینا کا نام گنایا ہے، اور آخر میں سلجوقی دور کے باکمالوں میں سے جنھوں نے ماسکونیات (Hydrostatics) کے اس اہم مسئلے پر تحقیقات کیں، عمر خیام اور ابو حاتم مظفر بن اسمٰعیل اسفزاری کا ذکر کیا ہے، چنانچہ صفحہ ۸ (سطر ۸ - ۱۰) پر لکھتا ہے:۔

"ثم فی مدۃ الدولۃ القاہرۃ ثبتہا اللہ نظر فیہ الامام ابو حفص عمر الخیامی وحقق القول فیہ وبرھن علی صحتہ (صح) رصدہ والعمل بہ لماء معین دون میزان معلم وکان معا الشام ابو حاتم المظفر بن اسمٰعیل الاسفزاری ناظراً فیہ مدۃ احسن نظر ومتاملاً فی صنعتہ"

اس کے بعد کتاب کے چوتھے مقالے میں (کل کتاب میں آٹھ مقالے ہیں) آبی ترازوؤں (موازین الما) کا ذکر کیا ہے جنھیں حکمائے متقدمین و متاخرین نے اختراع کیا تھا، اس مقالے میں پانچ باب ہیں، پہلے چار باب بالترتیب ارشمیدس، مانالاؤس، مینیلاؤس اور محمد بن زکریا الرازی کی تیار کردہ ترازوؤں کے اصول و استعمال پر ہیں۔ پانچواں باب عمر خیام کی "میزان الما" کے عمل اور اس کے اصول و نظریات پر ہے، اس باب کا عنوان ہے

"الباب الخامس فی میزان الماء المطلق للامام عمر الخیامی والعمل بہ والبرھان علیہ اذا کانت الکفتان او احدٰھما فی الماء"

باب صفحہ ۸۷ سے صفحہ ۹۲ تک پھیلا ہوا ہے، اس میں چار فصلیں ہیں،

پہلی فصل: میزان (خیامی) کی ساخت وتیاری اور اس سے وزن کرنے کے طریقہ کا بیان:

"فی صنعۃ المیزان والوزن بہ۔"

دوسری فصل: چاندی سونے کے مرکب میں سے دونوں دھاتوں کی مقدار کا ہندسی طور پر دریافت کرنا:۔ "فی معرفۃ مافی الجرم الممتزج من الذھب والفضۃ بالبرھان الھندسی۔"

تیسری فصل: چاندی سونے کے مرکب میں سے دونوں دھاتوں کی مقدار کا الجبر والمقابلہ کے ذریعہ دریافت کرنا:۔ "فی معرفۃ مافی الجرم الممتزج من الذھب والفضۃ بالجبر والمقابلہ۔"

چوتھی فصل: تین یا تین سے زیادہ دھاتوں کے مرکبات میں سے ان کی مقدار کا دریافت کرنا۔ "فی المرکبات من ثلاثۃ جواھر فما فوقھا۔"

آخر کتاب میں ساتویں مقالے کے آٹھویں باب میں خیام کی "قسطاس مستقیم" کی تیاری اور استعمال کا ذکر ہے، جس کے ذریعہ ایک حبہ سے لیکر ایک ہزار دینار یا درہم تک وزن کیے جا سکتے ہیں۔ یہ باب کتاب کے صفحہ ۱۵۱ سے صفحہ ۱۵۳ تک پھیلا ہوا ہے اور اس کا عنوان ہے:۔ "الباب الثامن فی القسطاس المستقیم للشیخ الامام ابی حفص عمر بن ابراھیم الخیامی رحمہ اللہ تعالیٰ۔"

حرف آخر | غرض "میزان الحکمۃ" للخازنی قدیم ترین کتاب ہے، جس میں عمر خیام کا حوالہ بالخصوص اس کی علمی کاوشوں کا تذکرہ ملتا ہے، اور جب تک کوئی اور کتاب جو مصرحہ طور پر ۵۱۵ھ سے قبل تصنیف ہوئی ہو، سامنے نہیں آتی، عبد الرحمن الخازنی کی "میزان الحکمۃ" ہی کو خیام کے احوال وآثار کے سلسلے میں قدیم ترین ماخذ قرار دیا جائے گا۔

قرونِ وسطیٰ کا ایک عظیم مورخ

المسعودی

از جناب مولوی شاہ محمد شبیر عطا صاحب ندوی

(۲)

اسلامی تاریخوں کا نقص | بیشتر اسلامی تاریخیں سنین کی جنتریاں یا واقعات کی فہرست ہیں، ان پہ چند مخصوص (اکثر سلاطین و وزراء کی) شخصیتیں چھائی ہوتی ہیں، جو قومی زندگی کے دوسرے شعبوں اور گوشوں کو اس طرح چھپا دیتی ہیں جس طرح ایک بڑا سایہ دار درخت چھوٹے چھوٹے پودوں کو چھپا لیتا ہے، اور قوم کی حیثیت ان کی شخصیت میں گم ہو کر رہ جاتی ہے، اور ان مخصوص شخصیتوں کی زندگی کے تمام شعبوں میں سے صرف فوجی اور سیاسی شعبہ نمایاں نظر آتا ہے، چنانچہ اگر آپ معلوم کرنا چاہیں کہ فلاں عہد حکومت میں قوم کا تمدن کیا تھا، اس کی عقلی حالت کیا تھی، دینی حالت کیسی تھی، اس کا سیاسی نظام کس قسم کا تھا، قوم کے سیاسی، علمی اور اجتماعی رجحانات کیا تھے، اس کے مستقبل کی تشکیل میں کون کون سے اندرونی و بیرونی عوامل و مؤثرات کام کر رہے تھے؟ تو اس کا جواب آپ کو کسی ایک کتاب میں نہیں ملے گا، اور اس کے لیے آپ کو تاریخ و ادب، شعراء کے دواوین اور قصے کہانیوں کے ہزاروں صفحات پڑھنے پڑھیں گے، پھر بھی ضروری نہیں کہ کوئی تشفی بخش جواب مل سکے اسی

بنا پر یورپین مستشرقین جب اسلامی تاریخ کے اوراق الٹتے ہیں تو ان کی نگاہ صرف اُن ہی واقعات پر پڑتی ہے جو خونی حروف سے لکھے گئے ہیں، اس لیے وہ لامحالہ تاریخ اسلام کو قصائی کی دکان کہتے ہیں،

اسلامی مورخین خلفاء کی مسند نشینی، عمال کے عزل ونصب ورد وبدل، اور خانہ جنگیوں کے واقعات تو نہایت تفصیل سے لکھتے ہیں، لیکن ان کی تاریخوں میں امراء و سلاطین کے انتظامِ سلطنت، ان کی سیاست، اخلاق و عادات اور عام ملکی بہبودی کے واقعات کا کوئی ذکر شاذ و نادر ہی ملتا ہے۔ اکثر اسلامی مورخین کا یہ عام شیوہ ہے کہ وہ ہر رطب و یابس کو اپنی کتابوں میں جگہ دے دیتے ہیں، اور کبھی اس کی کوشش نہیں کرتے کہ اصل حقیقت کا پتہ لگائیں، یا جغرافیہ کے نتائج سے فائدہ اٹھائیں۔

مسعودی کا امتیاز مسعودی فن تاریخ کا امام ہے، اس کے جیسا وسیع النظر مورخ اسلامی تاریخ کے طویل عہد میں مشکل سے ملے گا۔ وہ دنیا کی دوسری مہذب قوموں کی تاریخ سے پوری طرح واقف تھا اور اعلیٰ درجہ کا نقاد بھی تھا، اول درجہ کے مورخ ہونے کے علاوہ اصابت رائے، صحت فکر، سخن فہمی، نکتہ سنجی اور وجدان صحیح کے اعتبار سے وہ اپنے عہد کا ایک ممتاز مورخ ہے، اس کی کتابوں میں وسعت معلومات، تحقیق و تدقیق کے نمونے جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی تاریخ کی بنیاد مشاہدہ پر رکھتا ہے، اور کسی واقعہ پر رائے زنی علی وجہ البصیرۃ کرتا ہے، اس نے تاریخ اسلام کو چند نئی قدروں سے روشناس کرایا اور سب سے پہلے فلسفۂ تاریخ ایجاد کیا، اس کا تعلق چونکہ معتزلہ سے تھا، اس لیے تنگ نظری اور تعصب سے کوسوں دور تھا۔

مندرجۂ ذیل خصوصیات قابل غور ہیں،

(۱) المسعودی کے بیانات چشم دید یا مستند واقعات پر مشتمل ہوتے ہیں، چنانچہ وہ لکھتا ہے:-

ولم نعرض عن ذکر الاخبار ہم نے ایسے واقعات کا ذکر نہیں کیا ہے

عالم يعجم عند نا في العالم	جن کا وجود ہم سے نزدیک دنیا میں حق
وجود لاحسا ولا خبراً قاطعا	صحیح نہیں ہے، اور ان کی صحت بالکل
للعناد ودافعا للريب	یقینی اور غیر مشتبہ نہیں ہے،
ومزيلا للشك (مروج الذہب ج ۲ ص۱)	

(۲) وہ جہاں خود نہیں پہنچ سکا وہاں کے حالات کسی مقامی ثقہ شخص سے دریافت کرتا ہے۔ (ایضاً ج ۳ ص۵)

(۳) جغرافیائی تحقیقات یا تو اس نے خود کی ہیں یا کسی ماہر سے دریافت کر کے لکھتا ہے، مثلاً عبداللہ ابن وزیر حمصی کے بارے میں لکھتا ہے:

ولم يبق في هذا الوقت ابصر منه	اس زمانہ میں اس سے زیادہ بحر روم
بالبحر الرومي (مروج الذہب ج ۱ ص۲۵۳)	کا کوئی واقف کار نہیں ہے۔

(۴) المسعودی نے تاریخ نگاری کی ایک نئی شاہراہ نکالی اور عقل کو الٰہیات کے بجائے طبعیات میں استعمال کیا۔ اور فلسفۂ تشکیک سے مدد لی، روایت کے بجائے وہ درایت پر زیادہ زور دیتا ہے، ڈاکٹر کرد علی اس کے بارے میں لکھتے ہیں،

اقتبس من كل كلام ما راقه	اور اس کو جو باتیں بھی پسند آئیں اور ان کی
واعتقد صحته	صحت پر اسکو یقین تھا انکو نقل کیا ہے،

(۵) مسعودی اپنے پڑھنے والوں کے ذہن سے زیادہ قریب رہنا چاہتا ہے، اور ان کے جذبات کا احترام کرتا ہے، اس لیے وہ بہت سی باتیں محض اس بنا پر نہیں لکھتا کہ لوگوں کو مشکل سے اس کا یقین آئے گا، چنانچہ ایک جگہ لکھتا ہے:

لولا ان النفوس تنكر ما لم	اگر لوگ ان چیزوں کا انکار نہ کرتے جنکو
تعرفه وتدفع ما لم تالفه	وہ نہیں جانتے اور ان سے وہ مانوس

واخبرنا عن انواع عجائب	نہیں ہیں تو ہم ان سمندروں کے انواع
هذه البحار وما فیها من الحیتان	واقسام کے عجائبات اور ان کے سانپوں
والدواب وغیر ذلک من	اور چوپایوں وغیرہ پانی کی عجیب غریب
اعاجیب المیاه (مروج الذہب ج ۱، ص ۲۳۶)	چیزوں کا بیان کرتے،

دوسری جگہ لکھتا ہے:

والاخبار فی هذه المعانی تأباها	اس قسم کی ان تمام خبروں کا جن کا بہت
کثیر من النفوس لا تقبلها کثیر من	لوگ انکار کرتے ہیں اور بہترین عقلیں ان کو قبول
العقول لم نعرض لا یرادها (م ج ۱، ص ۲۶)	نہیں کرتی ہیں، ہم نے عمداً ذکر نہیں کیا ہے،

(۶) سب سے پہلے مسعودی نے فلسفۂ تاریخ ایجاد کیا، بعد کو ابن خلدون نے انہی بنیادوں پر اس کی پوری عمارت تیار کی، مثلاً شامیوں کے بارے میں کہتا ہے کہ "امویوں کے بارے میں ان کے تاریخی نظریات نے عقیدہ کی شکل اختیار کر لی ہے، کیونکہ وہ صدیوں سے اس ماحول میں پرورش پاتے ہیں، جو بنی امیہ کو تقدیس کے بہت اونچے معیار سے دیکھتا ہے،

(۷) مسعودی نے فطرت انسانی کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا، چنانچہ اس نے اس کا لحاظ خاص طور سے کیا ہے کہ تاریخ کے خشک مضامین سے لوگ تاریخ ہی سے گھبرا نہ جائیں، اس لیے تاریخ کے ساتھ ساتھ وہ دوسرے علوم و فنون کے بارے میں بھی بتاتا جاتا ہے، وہ خود ہی لکھتا ہے:۔

وقد یلحق الانسان الملل بقرأة	کبھی انسان کو اس کے خلاف طبیعت باتیں
ما لا تهواه نفسه فینتقل منه	تھکا دیتی ہیں اور وہ دوسری باتوں کی طرف
الی غیره فجمعنا فیه من سائر	متوجہ ہو جاتا ہے، اس لیے ہم نے اس کتاب
ما یحتاج الی الناس من ذوی	میں وہ سب باتیں جن کو صاحب علم لوگ

المعرفۃ الی علمہ (م۔ج ۲ ص ۲۱۴) جاننا چاہتے ہیں جمع کر دی ہیں،

اور جب یہ ضمنی مباحث زیادہ طویل ہونے لگتے ہیں تو ان الفاظ میں معذرت کرتا ہے:

ھذا کتاب خبر لیس کتاب آراء و نحل (م۔ج ۱ ص ۱۱) یہ واقعات اور خبروں کی کتاب ہے، افکار و عقائد کی نہیں۔

(۸) سب سے اہم خصوصیت مسعودی کی بے تعصبی ہے۔ اس کی حیثیت ایک قاضی عادل کی ہے،

کہیں سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کسی واقعہ سے اس کا کوئی جذباتی تعلق ہے، اس لیے وہ تاریخ نگاری میں

انتہائی محتاط رویہ اختیار کرتا ہے۔ اس نے خود اس کا اعتراف کیا ہے:۔

ولیعلم من نظر فیہ انی لم انتصر فیہ	تاکہ جو لوگ اس کو پڑھیں، ان کو اس کا اندازہ
لمذھب ولا تحیزت الی قول	ہو جائے کہ میں کسی خاص مسلک کی حمایت نہیں
ولا حکیت عن الناس الا محاسن	کی ہے، اور نہ کوئی قول اختیار کیا ہے اور میں نے
اخبارھم (مروج الذہب ج ۹ ص ۳۳)	لوگوں کی صرف اچھی باتیں بیان کی ہیں،

(۹) مسعودی کی ایک ممتاز خصوصیت تنوع مضامین بھی ہے۔ اس کی کتابوں میں ایسے مختلف النوع

تاریخی اور علمی و ادبی نکتے ملتے ہیں، جو دوسری کتابوں میں نہیں مل سکتے۔

(۱۰) کبھی کبھی عام مورخین کی طرح مسعودی بھی قدیم افسانوی حکایتیں بیان کرتا ہے، اس لیے

نہیں کہ یہ کہانیاں تاریخی حیثیت رکھتی ہیں، بلکہ ان سے قوموں کی خو بو کا اندازہ ہوتا ہے۔

المسعودی کی تحقیقات | اب ہم ان گراں قدر معلومات کو پیش کرنا چاہتے ہیں، جنھیں مسعودی نے اپنی

کتابوں میں جا بجا بکھیرا ہے۔

۱۔ جغرافیۂ قرآنی ۔ مسعودی نے پہلی بار قرآن مجید کا تاریخی جغرافیہ لکھنے کی کوشش کی اور

مندرجۂ ذیل مقامات کی تحقیق کی۔

الجودی کے متعلق لکھتا ہے کہ یہ پہاڑ جزیرہ ابن عمر میں واقع ہے جو موصل کے قریب ہے،

دریائے دجلہ اور جودی میں صرف آٹھ فرسخ کا فاصلہ ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی اسی پہاڑ کی چوٹی پر آکر لنگر انداز ہوئی تھی۔ (مروج الذہب ج ۱ ص ۷۵)

حضرت نوح علیہ السلام جس مقام پر اترے تھے، اسے ثمانین کہتے ہیں، اور آج بھی (یعنی ۳۳۲ھ میں بھی) وہ اسی نام سے مشہور ہے۔ (ایضاً ج ۱ ص ۷۵)

المؤتفکہ۔ یہ بستیاں حجاز اور شام کے درمیان اردن کے قریب واقع تھیں۔ اب بھی (یعنی ۳۳۲ھ میں) ان کا وجود باقی ہے۔ اس بستی کی ویرانی میں آج بھی کوئی کمی نہیں آئی ہے اور وہ پتھر جس نے اس بستی کو تباہ و برباد کیا تھا، اب بھی اکثر مسافروں کو نظر آجاتے ہیں، ان پتھروں کا رنگ سیاہ چمکدار ہے۔ (مروج الذہب ج ۱ ص ۸۶)

دیار ثمود۔ مسعودی نے دیار ثمود کو بھی دیکھا تھا۔ اس بستی کے پرانے کھنڈرات سے اس نے یہ اندازہ لگایا کہ قوم ثمود غیر معمولی قد و قامت نہیں رکھتی تھی۔ جیسا کہ عام طور سے اسرائیلیات میں مشہور ہے۔ (ایضاً ج ۳ ص ۸۴)

چشمۂ ایوب علیہ السلام۔ یہ چشمہ شام کے مشہور قصبہ نوی میں تھا۔ اور میرے زمانہ میں بھی موجود ہے۔ (مروج الذہب ج ۱ ص ۹۱) سامریوں کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ قدم عالم کے قائل تھے (ایضاً ص ۱۱۵)

اصحاب کہف کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ روم کے مشہور شہر افسیس کے رہنے والے تھے، واثق عباسی نے محمد بن موسی المنجم کو روم اسی غرض سے بھیجا تھا کہ وہ اصحاب کہف کے متعلق تحقیقات کرے مشہور فلسفی کندی کے ایک شاگرد نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے (ایضاً ج ۲ ص ۳۰۷)

معتزلہ۔ معتزلہ کے بارے میں مسعودی نے بڑے اہم معلومات دیے ہیں، معتزلہ کے اصول کی تشریح کی ہے، ان کے علماء کے حالات بیان کیے ہیں، ان کا سیاسی مسلک بتایا ہے اور ان کی علمی حیثیت پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۔ معتزلہ کی وجہ تسمیہ۔ عام طور سے معتزلہ کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے[1]

سماھم المسلمون معتزلۃ لاعتزالھم — مسلمانوں نے انھیں اس لیے معتزلہ کہا ہے

قول الامۃ باسرھا — کہ وہ پوری امت سے الگ تھلگ رہتے ہیں،

لیکن مسعودی اس کی تردید کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ اعتزال ایک اصطلاحی لفظ ہے، جس کے معنی ہیں عقیدہ المنزلۃ بین المنزلتین کو تسلیم کرنا۔ چونکہ معتزلہ اس عقیدے کو مانتے ہیں، اس لیے انھیں معتزلہ کہا جاتا ہے۔ جیسے عقیدہ ارجاء کو ماننے والے مرجئہ کہلاتے ہیں، (مروج الذہب ج ۶ ص ۲۲)

۲۔ معتزلہ کے اصول خمسہ۔ توحید، عدل، وعد و وعید، منزلۃ بین المنزلتین، الامر بالمعروف ونہی عن المنکر، المسعودی نے معتزلہ کے ان پانچوں اصولوں کی پوری تشریح کی ہے[2]

معتزلہ کا نظریۂ امامت وخلافت | معتزلہ کے نظریۂ امامت وخلافت کے بارہ میں مسعودی لکھتا ہے:

امامت کا اختیار امت کو ہے، کیونکہ اللہ اور اس کے رسول نے اس کے لیے کسی خاص شخص کو مخصوص نہیں کیا ہے، اور مسلمانوں نے کسی متعین اور مخصوص شخص پر اجماع کیا، اس کا اختیار امت کو ہے، وہ جس کو چاہے اپنی جماعت میں سے، جس کو چاہے انتخاب کرے، جو ان پر احکام نافذ کرے خواہ وہ قریشی ہو یا ملت اسلامیہ اور اہل عدالت اور ایمان میں سے کوئی اور ہو، اس میں نسب وغیرہ کی کوئی قید نہیں ہے، اور امام کا انتخاب ہر زمانہ کے لوگوں پر واجب ہے، جن لوگوں کی یہ رائے ہے کہ امامت قریش اور غیر قریش دونوں کے لیے جائز ہو ایسی تمام معتزلہ کا قول ہے (مروج الذہب ج ۶ ص ۲۴)

معتزلہ کی اصول پسندی | معتزلہ نے ہمیشہ حق کا ساتھ دیا، اور اگر اس سلسلہ میں تلوار اٹھانے کی ضرورت پیش آئی تو اس سے بھی گریز نہیں کیا۔ مسعودی نے اس قسم کی تین مثالیں دی ہیں:

۱۔ ولید بن یزید اموی کے مقابلہ میں یزید بن ولید کو کامیابی محض معتزلہ کی وجہ سے ہوئی[3]

---

[1] الفرق بین الفرق ص ۹۴ [2] اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مروج الذہب ج ۶ ص ۲۳ [3] ایضاً ج ۶ ص ۲۱

۲۔ امام محمد الملقب بنفس زکیہ کی شہادت کے بعد ان کے بھائی امام ابراہیم نے منصور عباسی کے خلاف جب خروج کیا تو ان کے ساتھ معتزلہ کی ایک بڑی تعداد جنگ میں شریک تھی (مروج الذہب ۵ ص ۱۹۳) حالانکہ مشہور معتزلی امام عمرو بن عبید کے تعلقات منصور سے بیحد خوشگوار تھے، لیکن اس کے باوجود معتزلہ نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔

۳۔ افریقہ میں خارجیوں کی بڑی تعداد آباد تھی، معتزلہ ہمیشہ سے خارجیوں کے دشمن تھے، انھوں نے ان کے مقابلہ میں تلوار اٹھانا اپنا فرض سمجھا اور ان دونوں میں برابر لڑائی ہوتی رہی۔ (ایضاً ج ۱ ص ۳۰) مسعودی نے ان لڑائیوں کی تفصیل اخبار الزمان میں دی ہے۔

مشاہیر معتزلہ مسعودی نے معتزلہ کے چند مشاہیر علماء کا تذکرہ کہیں کہیں ضمناً کیا ہے۔ جن کے کچھ اقتباسات درج ذیل ہیں۔ جن مشاہیر کے حالات لکھے ہیں وہ یہ ہیں:۔

(۱) واصل بن عطاء (۲) عمرو بن عبید (۳) ابو الہذیل العلاف (۴) ابراہیم بن سیار النظام (۵) بشر بن المعتمر (۶) جعفر بن حرب (۷) جعفر بن مبشر (۸) معتمر بن سلیمان (۹) ثمامہ بن اشرس (۱۰) محمد بن عبد اللہ بن محمد الاسکافی (۱۱) ابو موسیٰ الفراء (۱۲) ابن ابی داؤد (۱۳) الجاحظ (۱۴) المنجم (۱۵) المامون۔

واصل بن عطاء۔ آپ کی کنیت ابو حذیفہ ہے۔ ۱۳۱ھ میں انتقال ہوا، مسعودی نے ان کے بارے میں لکھا ہے:۔

وھو شیخ المعتزلۃ وقدیما واول	وہ شیخ المعتزلہ اور قدیم لوگوں میں سے تھے
من اظھر القول بالمنزلۃ بین	وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے المنزلہ بین
المنزلتین وان الفاسق من اھل	المنزلتین کا قول ظاہر کیا اور اہل ملت
الملۃ لیس لمومن ولا کافر وبہ	کے فاسق نہ مومن ہیں اور نہ کافر، اسی لیے

سمیت المعتزلۃ وھو الاعتزال وہ معتزلہ کہلائے اور یہی اعتزال ہے۔
(مروج الذہب ج۶ ص۲۲)

عمرو بن عبید۔ انکی کنیت ابوعثمان ہے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ باب کابل سے قید ہوکر آئے تھے۔ مسعودی نے لکھا ہو کہ کان شیخ المعتزلۃ فی وقتہ (ایضاً ص۲۳) ایک اور جگہ لکھا ہو کہ کان شیخ المعتزلۃ والمقدم فیھا (ج۲)

عمرو بن عبید نے کئی رسالے اور مختلف تقریریں جو اعتزال کے مسائل پر مشتمل تھیں، یادگار چھوڑیں۔ مسعودی نے المقالات فی اصول الدیانات میں ان کے کلام کے نمونے دیے ہیں۔ ان کی وفات ۱۴۴ھ میں ہوئی۔ مسعودی نے ان کے بارے میں کئی واقعات لکھے ہیں۔ ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک بار عمرو بن عبید منصور عباسی کی ملاقات کی غرض سے گئے، محل پر پہنچکر سواری سے اتر کر وہیں فرش خاک پر بیٹھ گئے، وزیر اعظم کو جب معلوم ہوا تو وہ خود آیا اور ان سے درخواست کی کہ محل کے اندر تشریف لے چلیں، جب ان کی ملاقات منصور سے ہوئی تو اس نے قالین بچھانے کا حکم دیا، اور مسند پر اپنے پاس جگہ دی۔ اس کے بعد ان سے درخواست کی کہ کچھ نصیحت فرمائیے۔ انھوں نے مختلف نصیحتیں کیں، اس کے بعد جب اٹھنے لگے تو منصور نے کہا میں نے آپ کے لیے دس ہزار کی رقم پیش کیے جانے کا حکم دے دیا ہے۔ انھوں نے کہا مجھے اس رقم کی حاجت نہیں، منصور نے کہا خدا کی قسم آپ کو لینا پڑے گا۔ انھوں نے جواب دیا خدا کی قسم میں نہیں لے سکتا، منصور کا بیٹا مہدی بھی موجود تھا، اس نے تعجب سے پوچھا، امیر المومنین کے مقابلہ میں آپ قسم کھاتے ہیں؟ انھوں نے منصور سے پوچھا یہ صاحبزادے کون ہیں؟ اس نے کہا یہ میرا بیٹا محمد ہے، جو میرے بعد میرا جانشین ہوگا۔ اس کا لقب المہدی ہے، آپ نے فرمایا تم نے اسے غلط تربیت دی ہے۔ اس کا لباس ابرار کا لباس نہیں ہے، تم نے اسے جو خطاب دیا ہے اس کا بھی وہ مستحق نہیں ہے۔ پھر مہدی سے فرمایا بھتیجے اگر تمھارے والد قسم کھائیں تو اسے توڑ سکتے ہیں کیونکہ تمھارے والد کفارہ ادا کر دیں گے لیکن تمھارے چچا ایسا نہیں کر سکتے۔ پھر منصور نے کہا، آپ کی کوئی خواہش ہو تو فرمائیں۔ انھوں نے کہا، صرف یہ خواہش ہے کہ دوبارہ یہاں آنے کی زحمت نہ دیجائے، منصور نے کہا، اس کے معنی یہ ہیں کہ پھر ہماری ملاقات پھر نہ ہو سکے گی، انھوں نے

کما بھی تو میں چاہتا ہوں، یہ کہہ کر واپس ہو گئے۔ (مروج الذہب ج ۶ ص ۲۰۸ تا ۲۱۰)

ابو الہذیل العلاف۔ اس کا سنہ ولادت ۱۳۱ھ اور سنہ وفات ۲۳۶ھ ہے بعض لوگوں کے نزدیک ۱۳۵ھ سنہ ولادت ہے، ہشام بن الحکم جس کے بارے میں مسعودی لکھتا ہے، کان شیخ المجسمة والرافضة فی وقتہ ان کے کئی مناظرے ہوئے جو مسعودی نے نقل کیے ہیں، ابو الہذیل کا مسلک بقول مسعودی یہ تھا:۔

کان یذھب الی نفی التجسیم ورفع	وہ تجسیم کے منکر اور تشبیہ کے خلاف
التشبیہ والی ضد قول ھشام فی	اور توحید و امامت کے مسئلہ میں ان کے
التوحید والامامة (مروج الذہب ج۷)	خیالات ہشام کے بالکل ضد تھے۔

مسعودی ان کی شان میں لکھتا ہے: کان معتزلی المذھب وشیخ البصریین (مروج الذہب ج۷ ص ۲۲۹)

ابراہیم بن سیار النظام۔ مذہباً معتزلی اور اپنے دور کے بصرہ کے ممتاز معتزلہ میں تھے (ایضاً ص)

بشر بن المعتمر۔ معتزلی المذہب، بغدادیوں کا شیخ اور نظار ین اور متکلمین کا استاد تھا (ایضاً ص)

ابو موسیٰ الفراء۔ فرا کی وفات ۲۲۶ھ میں ہوئی۔ ان کے بارے میں مسعودی کی رائے یہ ہے

کان من شیوخ العدلیة وکبار المتکلمین من البغدادیین (مروج الذہب ج ۷، ص ۲۳۳)

جعفر بن مبشر۔ ان کی وفات ۲۳۴ھ میں ہوئی، مسعودی کا بیان ہے: کان من کبار اھل العدلیة واھل الدیانة من البغدادیین (ایضاً) ان کے ایک بھائی محدث تھے، مسعودی نے ان کا نام حسن بتایا ہے۔

جاحظ۔ مسعودی نے مروج الذہب میں جا بجا جاحظ کا تذکرہ کیا ہے، وہ ان کے علمی کمالات کا معترف ہے، مسعودی نے جاحظ کی مشہور عالم بدصورتی کی ایک مثال بھی جاحظ کے الفاظ میں نقل کی ہے۔ لکھتا ہے کہ متوکل کو ایک بار شاہزادوں کی اتالیقی کے لیے ایک لائق استاد کی ضرورت تھی، میری شہرت دور دور پھیل چکی تھی، اس لیے کسی نے مشورہ دیا کہ اتالیق

کے لیے مجھ سے زیادہ موزوں دوسرا شخص نہیں مل سکتا. چنانچہ مجھے طلب کیا گیا، جب میں متوکل کے حضور میں پیش ہوا تو وہ میرے دیکھنے کی تاب نہ لا سکا اور حکم دیا کہ دس ہزار روپے مجھے اس تکلیف دہی کے صلہ میں دے دیے جائیں (مروج الذہب ج ۷، ص ۲۲۲)

ابن ابی دواد. - قاضی ابو عبد اللہ احمد ابن ابی دواد معتصم کے زمانہ میں سلطنت کے سیاہ وسفید کے مالک تھے۔ ان کی فیاضی نے برامکہ کی یاد دلوں سے محو کردی ہے، معتصم ان کے کمال سے بہت متاثر تھا، اور کہا کرتا تھا کہ ان کے جیسے شخص سے زینت اور ان کے قریب سے فرحت حاصل ہوتی ہے، اور ان میں بڑے وفا ہے، شعراء نے ان کی مدح میں قصائد لکھے، ابوتمام کا یہ شعر انہی کی شان میں ہے :

لقد انست مساوی کل دھر محاسن احمد بن ابی دواد

لیکن ان کا انجام اچھا نہیں ہوا، وہ آخر میں مفلوج ہو گئے تھے، اور ان کے سارے اختیارات واثق نے ان کے لڑکے کو سونپ دیے، پھر وہ معتوب ہوا اور اس کے اختیارات سلب کرلیے گئے اور ساری املاک ضبط کرلی گئی، جس کے صدمہ سے وہ مرگیا، اس کے چالیس دن بعد ابن ابی دواد بھی چل بسے، یہ وہی بزرگ ہیں جو اشاعرہ کی دار وگیر میں سب سے زیادہ پیش پیش تھے۔

المامون۔ مامون کے بارے میں مسعودی نے بہت لکھا ہے، ہم صرف ایک واقعہ نقل کرتے ہیں، جس سے مذہب میں ان کی پختگی کا اندازہ ہوگا۔

مامون پر جب سکرات کا عالم طاری ہوا تو ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلے

یامن لایزول ملکہ ارحم من زال ملکہ

جب زیادہ حالت خراب ہوئی تو معتصم نے ایک شخص سے کہا کہ وہ مامون کو کلمہ طیبہ کی تلقین کرے اس نے بلند آواز سے پڑھنا چاہا تھا کہ مامون سے سن کر دھرا سکے، مگر شاہی طبیب ابن ماسویہ

نے روک دیا، اور کہا اس وقت وہ ایسے عالم میں ہیں کہ اپنے پروردگار اور مانی میں کوئی فرق نہیں کر سکتے۔ مامون نے فوراً آنکھیں کھولدیں۔ وہ آنکھیں جن میں بلا کی عظمت اور سرخی تھی اور ابن ماسویہ بھڑکیا اور کچھ کہنا چاہا لیکن زبان نے یاری نہ دی، مامون نے بے بسی میں آسمان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا، آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ اس وقت خدا نے زبان میں قوت گویائی بخش دی، اور اس نے یہ کہکر ہمیشہ کے لیے خاموشی اختیار کرلی:

یا من لا یموت ارحم من یموت[۱]

المنجم۔ ابو الحسن احمد بن یحیی المنجم، اس کے بارے میں مسعودی نے لکھا ہے کہ وہ علمی بحث و نظر کے حاذقوں اور اہل توحید و عدل کے رؤسا میں تھے[۲]۔

لطیفہ۔ مسعودی نے اس کے حالات کے سلسلہ میں یہ لطیفہ لکھا ہے کہ شطرنج کا کھلاڑی معتزلی عقیدہ کا ہموا ہوتا ہے، اور نرد کا شائق اور جبر کا قائل ہوتا ہے، کیونکہ شطرنج میں ہار جیت کا فیصلہ زیادہ تر عقل و دانش سے ہوتا ہے، اور نرد میں قضا و قدر یا دوسرے الفاظ میں خوش قسمتی یا بد قسمتی سے[۳]،

الاسکافی۔ محمد بن عبداللہ بن محمد الاسکافی نے ۲۴۱ھ میں وفات پائی، اسی سال امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا بھی انتقال ہوا، مسعودی نے لکھا ہے کہ کان من اہل النظر والبحث ومن علیۃ اہل العدل[۴]

جعفر بن حرب۔ آپ کا انتقال ۲۳۶ھ میں ہوا، قبیلۂ ہمدان سے ان کا تعلق تھا، اور قحطانیوں میں ان کا بڑا اعزاز کیا جاتا تھا، مدینۃ السلام (بغداد) کی مشہور شاہراہ شارع باب حرب ان کے والد نے بنوائی تھی، مسعودی آپ کے فضل و کمال کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے:۔ وھو شیخ البغدادیین من المتکلمین[۵] (باقی)

---

[۱] مروج الذہب ج ۷ ص ۱۰۱ [۲] ایضاً ج ۸ ص ۲۲۵ [۳] ایضاً ج ۸ ص ۲۰۳ [۴] ایضاً ج ۷ ص ۲۳۱

مثنوی مولانا روم کا ایک اہم مخطوطہ

از

جناب ڈاکٹر اکمل ایوبی صاحب ادارہ علوم و فنون اسلامیہ مسلم یونیورسٹی

حضرت مولانا جلال الدین رومی (۶۷۲ھ - ۱۲۰۷ء) کی "مثنوی معنوی" فارسی ادب کا بیش بہا سرمایہ ہے۔ اب تک اس کے متعدد اڈیشن چھپ چکے ہیں[1]، اور دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ مگر اس کثرت اشاعت کے باوجود اس مثنوی کے شائقین اور مولانا روم کے دلدادگان نے ہمیشہ اس کے قلمی نسخوں کی تلاش جاری رکھی۔ اب تک اس کے جتنے قدیم قلمی نسخے دریافت ہوئے ہیں، قریب قریب ان سب کا ایک اجمالی خاکہ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب[2] نے انجمن ترقی اردو (ہند) کے ہفتہ وار اخبار "ہماری زبان" کے جلد ۲۰ شمارہ ۱۵[3] میں پیش کر دیا ہے، اسی اخبار کے شمارہ ۱۶[4] و ۲۲[5] میں میں نے بھی اس مثنوی کے ان ۱۳ قدیم قلمی نسخوں کا ذکر کیا تھا، جو اس وقت "ترکی جمہوریہ" کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں، اس سلسلے میں میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ استانبول میں "کتابخانۂ ظہیر آفندی" نام کا کوئی کتب خانہ موجود نہیں ہے، اور اس کتب خانے سے متعلق مثنوی مولانا روم کے اس نادر قلمی نسخے کا اب کسی کو علم نہیں ہے، جس کی بابت ڈاکٹر ریٹر نے ڈاکٹر نکلسن کو نہ صرف اطلاع دی تھی بلکہ اس کے کچھ حصوں کا عکس (فوٹو گراف)[6]

---

[1] تفصیل کے لیے خانبابا مشار کی فہرست کتابہای چاپی فارسی (تہران ۱۳۳۷ھ ش) ص ۱۵۳۶ تا ۱۵۳۷ دیکھیے

[2] صدر و پروفیسر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ [3] مورخہ ۷ مارچ ۱۹۶۱ء [4] مورخہ ۲۲ اپریل ۱۹۶۱ء

[5] مورخہ ۸ جون ۱۹۶۱ء

بھی رواد کیا تھا، جو مثنوی کے دفتر سوم، چہارم اور پنجم کے اڈیشن کے وقت نکلسن کے زیر مطالعہ رہ بھی چکا ہے۔ اس مخطوطے کے متعلق میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ ریٹر کے ایک ترک شاگرد اور میرے استاد پروفیسر احمد آتش اس کتب خانے کے مخطوطات کی تلاش میں سرگرداں ہیں لیکن ابھی تک ان کو کامیابی نہیں ہوئی ہے، چونکہ یہ مخطوط قدیم ترین نسخوں میں سے تھا، اور نکلسن نے اس کے مکمل متن کو استعمال بھی نہیں کیا تھا، اس لیے ترک محققین اس کی تلاش میں لگے رہے، اپنی سیاحت کے دوران میں میں نے بھی استانبول اور ترکی کے دوسرے بڑے شہروں میں اس مخطوطے کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی، مگر کامیابی نہ ہو سکی، ہندوستان واپس آنے کے کچھ عرصہ بعد مجھے پھر اس کا خیال آیا، اور میں نے متعدد ترک دوستوں کو اس کے متعلق خطوط تحریر کیے، ان تمام خطوط کے جوابات عموماً نفی میں ملے لیکن ابھی کچھ عرصہ ہوا میرے ایک ترک دوست محمد اوندر نے اس نسخے کی بابت مجھے ایک خط[1] تحریر کیا جس کا مواد شائقین مثنوی معنوی کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے، محمد اوندر متعدد کتابوں کے مصنف، فارسی ادب کے ماہر اور شہر قونیہ کے "مولانا موزہ سی" کے ڈائرکٹر ہیں، اس لیے ان کے بیان پر شک و شبہہ کی گنجایش نہیں ہے،

محمد اوندر نے لکھا ہے کہ اب یہ نسخہ قونیہ کے "مولانا موزہ سی" میں آگیا ہے۔ استانبول کے "کتاب خانۂ ظہیر آفندی" سے یہ نسخہ کس کس کے پاس گیا، اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا ہے، اس وقت صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ ابھی حال ہی میں "ترکی جمہوریہ" کے مشہور "ایش بنغاسی" نے اس نسخہ کو ترکی کے صدر مقام "انقرہ" میں دس ہزار ترکی لیرہ (تقریباً ۱۵ ہزار روپیہ) میں خرید کر "مولانا موزہ سی" کو بطور ہدیہ پیش کیا ہے، یہ "موزہ" ۳ رمارچ ۱۹۲۶ء کو قائم کیا گیا اور اب یہاں مولانا روم سے متعلق نوادرات کا اچھا خاصہ ذخیرہ جمع ہو گیا ہے، یہاں مثنوی کا وہ قدیم ترین نسخہ بھی موجود ہے جس کی کتابت مولانا کی وفات کے صرف ۵ سال بعد

---

[1] یہ خط ترکی زبان میں ہے اور میرے پاس محفوظ ہے۔

اور رجب ۶۷۷ھ میں قونیہ کے مشہور خطاط محمد بن عبداللہ المولوی نے اس نسخے سے مکمل کی تھی، جو حضرت مولانا اور ان کے خلیفہ (حسام الدین چلپی) کے مطالعہ میں رہ چکا تھا۔ اب "ایشن بنقاشی" کے ہدیہ سے "مولانا موزہ سی" میں ایک بہت بڑا اضافہ ہو گیا ہے، محمد اوندر کی اطلاع کے مطابق یہ بہت خوبصورت مخطوطہ ہے۔ اس کے کاتب حسن ابن الحسین المولوی ہیں، اس پر تاریخ کتابت ۱۳ شوال ۶۸۷ھ درج ہے، یہ ۱۴٫۰ × ۱۸٫۰ سنٹی میٹر ابعاد والے ۶۰۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور اس کے ہر صفحے پر چار کالم اور تقریباً ۵۰ ابیات درج ہیں لیکن کل ابیات کی تعداد ۲۵۶۹۸ ہے۔ اس کا خط سلجوقی نسخ ہے۔ اور اس کی کتابت حضرت مولانا روم کی وفات کے پندرہ سال بعد اور مثنوی کے قدیم ترین دستیاب شدہ نسخے کے دس سال بعد ہوئی تھی لیکن یہ نسخہ اس وجہ سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ اس کا مقابلہ ایک ایسے نسخے سے ہوا ہے جو خود حضرت مولانا روم کی نظر سے گذر چکا تھا۔ دوسرے اس کے حاشیہ پر تصحیحات بھی درج ہیں،

پیش نظر نسخے کی اہمیت ترکوں کے لیے اس وجہ سے اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے کہ اس پر مندرجۂ ذیل دو عبارتیں مختلف رسم الخط میں تحریر ہیں :-

(۱) حضرت پیرک وفاتی الیتوز یتمش ایکیدہ اولد یعنی جو سنہ اون یش سنہ صکرہ یازلد یعنی آکلاشیلیور صاری عبداللہ آفندی و ترجمان مثنوی نحیفی سلیمان افندنیک دخی الکرینہ گچمش معتبر بر نسخۂ نفیسۂ شریفہ در

(۲) مجاب الوہاب ترجمان مثنوی زباندان مولوی حسنۃ الدہر و نادر الزمان نحیفی محمد سلیمان افندی ۹ یافت در جلال شہر ربیع الثانی

ان عبارتوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مشہور ترک مترجم نحیفی محمد سلیمان[1] (م ۱۱۵۱ھ) جنھوں نے "مثنوی معنوی" کو ترکی نظم کا لباس پہنایا اور مثنوی کے دفتر اول کے شارح صاری عبد اللہ آفندی[2] (م ۱۰۶۶ھ) کے مطالعہ میں بھی یہی نسخہ رہ چکا ہے اور ہو سکتا ہے کہ ترجمہ و شرح لکھتے وقت مذکورہ نسخہ ہی پیش نظر رہا ہو۔

---

[1] ان کے حالات کے لیے دیکھیے E. J. W Gibb: A History of Ottoman Poetry Vol IV P 79-82

[2] صاری عبد اللہ آفندی "نصیحت الملوک" نامی کتاب کے مصنف ہیں، یہ خود بھی شاعر تھے اور عابدی تخلص کرتے تھے، ان کا پورا نام عبد اللہ بن سید محمد بن احمد تھا، لیکن ترک ان کو صاری عبد اللہ ہی کہتے ہیں۔

ظہیر فاریابی

محترم و مکرم السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

میرا خط معارف کے شمارہ ستمبر کے متعلق مل گیا ہوگا، اسے ازراہ کرم شائع کرا دیں۔

حکیم منظور الحسن صاحب نے اپنے مضمون سے غلط فہمی پیدا کر دی ہے کہ میں نے یہ قیاس کر لیا ہو کہ ظہیر فاریابی سرے سے غزل کا شاعر نہیں ہے ۔ بڑا ظلم ہے ۔ انھوں نے مطبوعہ دیوان پر غور کرنے کی بالکل زحمت نہیں فرمائی، میں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ سرے سے ظہیر فاریابی نے غزل ہی نہیں لکھی، میں نے یہ بھی کہیں نہیں کہا کہ نولکشور سے صرف ایک مرتبہ دیوان شائع ہوا ہے۔ غیر متعلق اور فضول بحثوں میں لوگ مبتلا ہو گئے ہیں، ایسے معترضین کے مضامین اگر آپ پہلے ہی صاحب مضمون کے پاس بھیج دیا کریں تو وہ غلط فہمی کو دور کر دیا کرے، میں نے پچھلے عریضے میں لکھا تھا کہ لباب الالباب کی تعلیقات از سعید نفیسی (تہران ۱۳۳۵ھ ص ۳۰۳) میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ وہ مطبوعہ دیوان گیارھویں صدی کے ظہیر کا ہے۔ فقط والسلام

احقر غلام مصطفیٰ خاں

مطبوعات جدیدہ

سیرتِ بلالؓ ۔ از ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، صفحات ۲۰۰، کتابت وطباعت اعلیٰ
مع گردپوش، قیمت سے؍، ناشر کتاب خانہ کبیر اسٹریٹ لاہور۔

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ السابقون الاولون مہاجر صحابہ میں ہیں، مسجد نبویؐ کے موذن کی حیثیت سے ہر پڑھا لکھا مسلمان ان کو جانتا ہے، مگر ان کی زندگی کے اور بھی بہت سے روشن پہلو ہیں جن سے عام طور پر لوگ واقف نہیں ہیں، خاص طور پر عربوں کے درمیان ایک حبشی غلام کو اسلام کی برکت سے جو ممتاز مقام ملا وہ اسلامی مساوات کی ایک زندہ وتابندہ مثال ہے، دار المصنفین کی سیر الصحابہ میں ان کے حالات بھی ہیں لیکن غالباً اردو میں ان پر کوئی مستقل کتاب نہیں تھی اس لیے ڈاکٹر عبداللہ صاحب چغتائی نے یہ مستقل کتاب لکھی ہے، اس میں ان کی زندگی کے کارناموں کے ہر پہلو پر سیر حاصل بحث کی ہے، حضرت بلالؓ کی زندگی کے بارے میں معلومات کا ذخیرہ محدود ہے، اس لیے کتاب میں تمہیدی باتوں کا ذکر کثرت سے آ گیا ہے جس سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، شروع کتاب میں حضرت بلالؓ کی قبر اور گنبد خضرا کے مبارک وخوبصورت فوٹو بھی شامل ہیں، کتاب بڑی عقیدت ومحبت سے لکھی ہے، اس لیے مؤثر بھی ہے، سواد عراق کے فتح کے بعد اس کی تقسیم اور عدم تقسیم کے سلسلہ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے سے جن لوگوں نے اختلاف کیا تھا، ان میں حضرت بلالؓ کا نام سرفہرست ہے، اور یہ معاملہ اتنا اہم ہو گیا تھا کہ حضرت عمرؓ نے عاجز آکر حضرت بلالؓ کا نام لیکر یہ دعا کی اللھم اکف بلالا واصحابہ

امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں اس کی پوری تفصیل دی ہے، ڈاکٹر صاحب نے نہ جانے کیوں اس اہم واقعہ کو نظر انداز کر دیا۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر بہت مفید و پُر معلومات ہے۔

نظام صلاح و اصلاح ۔ از مولانا عبد الباری صاحب ندوی، صفحات ۲۰۰، کتابت و طباعت بہتر، ناشر ادارہ مجلس علمی کراچی، قیمت :- سے

مولانا عبد الباری صاحب ندوی ہمارے دور کے ان بزرگوں میں ہیں جو دینی و ملّی مسائل پر سنجیدہ انداز میں برابر غور و فکر کرتے رہتے ہیں، ان کے اسی غور و فکر کا نتیجہ وہ کتابیں ہیں جو انھوں نے مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تجدیدات پر لکھی ہیں، اب انھوں نے ایک نئی کتاب "نظام صلاح و اصلاح" تحریر فرمائی ہے جس میں سورۃ العصر کی روشنی میں مسلمانوں کے نظام صلاح و اصلاح کی تفصیل بیان کی ہے، مولانا نے اس میں مسلمانوں کی انفرادی، اجتماعی اور فکری و عملی غلطیوں کی مصلحانہ انداز میں نشاندہی کی ہے، اور اس کی اصلاح کی تدبیریں بھی بتائی ہیں، اور مسلمانوں کے معاش و معاد کا کوئی ایسا اہم مسئلہ نہیں ہے جس پر مولانا نے روشنی نہ ڈالی ہو، خاص طور پر اس مادی دور میں آخرت کی طرف سے مسلمانوں میں جو بے فکری پیدا ہو گئی ہے اس پر بڑے حکیمانہ اور تذکیری انداز میں گفتگو کی ہے، اس سلسلہ میں دینی جماعتوں اور انفرادی طور پر دین کا کام کرنے والے اشخاص کا بھی انھوں نے تعارف کرایا ہے، مولانا نے جہاں جہاں اپنے مقصد کی توضیح کے سلسلہ میں مولانا تھانویؒ کے ملفوظات و تحریروں سے مدد لی ہے اس میں بڑی تاثیر پیدا ہو گئی ہے، خاص طور پر آتنا فی الدنیا حسنۃً، صفت قومیت، فکر آخرت اور معاشرت پر جو کچھ لکھا ہے وہ تو حرز جان بنانے کے لائق ہے، ہر پڑھے لکھے مسلمان کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے، ممکن ہے کہ کتاب کے بعض مندرجات اور توضیحات سے کسی کو اختلاف ہو، مگر ان کے بنیادی فکر سے اختلاف ممکن نہیں ہے۔

قوموں کا عروج و زوال (مذاہب کی روشنی میں) از سید اقبال احمد صاحب جونپوری، صفحات ۵۰۴، کتابت و طباعت متوسط، ناشر شیراز ہند پبلشنگ ہاؤس جونپور، ۹۳

سید اقبال احمد صاحب کئی مفید علمی کتابوں کے مصنف ہیں، یہ کتاب ان کی تازہ علمی کوشش کا نتیجہ ہے، اس میں انھوں نے تمام مذاہب کی بنیادی تعلیم کی روشنی میں یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ دنیا کے تمام ہی مذاہب نے عقیدہ و عمل اور اخلاق و معاملات کے سدھارنے کے لیے زریں اصول و افکار دیے ہیں، انسان نے جب بھی ان خدائی ہدایتوں اور اخلاقی تعلیمات کو اپنایا وہ ترقی پذیر ہوا، اور جب بھی اس نے اسے چھوڑ کر نفس کی خواہشات کی بندگی اختیار کی تو وہ زوال پذیر ہوا ہے، اس مسئلہ کا سرِ رشتہ وحدت ادیان سے مل جاتا ہے مگر مصنف نے حتی الامکان اس سے دامن بچانے کی پوری کوشش کی ہے، جو قابل ستایش ہے، اس میں انھوں نے سب سے پہلے اسلام کے عقائد اور اس کے اخلاقی و معاملاتی اصولوں پر بحث کی ہے، پھر دوسرے انبیاؑ کی تعلیمات پیش کی ہیں، پھر رام چندر جی، سری کرشن جی اور ویدانت اور گرونانک اور گاندھی جی وغیرہ کی تعلیمات کی وضاحت ان کتابوں کی روشنی میں کی ہے، اور عروج و زوال کا نقشہ پیش کیا ہے اور اس کتاب میں اتنے متفرق معلومات آگئے ہیں کہ تنہا اسکے مطالعہ سے مختلف النوع تفصیلات حاصل ہوجاتے ہیں، مصنف نے ایک مفید کام انجام دیا ہے جسکے لیے لائق تحسین ہیں۔

ذکر مجید - از جناب حکیم عبدالقوی صاحب دریابادی، صفحات ۱۵۶، کتابت و طباعت معمولی، پتہ: صدق جدید بک ایجنسی، کچہری روڈ، لکھنؤ، قیمت: - عہ

مولوی عبدالمجید صاحب دریابادی مرحوم، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے بڑے بھائی اور حکیم عبدالقوی صاحب منیجر صدق جدید کے والد بزرگوار تھے، انھوں نے اودھ کے ایک متوسط کھاتے پیتے گھرانے میں آنکھ کھولی، اور اختتام تعلیم کے بعد سرکاری ملازمت میں آگئے، ملازمت کی ابتدا نائب تحصیلداری سے ہوئی مگر ڈپٹی کلکٹر

جو کر ریٹائر ہوئے، سرکاری ملازمت کے باوجود خاندانی اثرات اور اپنی فطرت سلیم کی وجہ سے ہمیشہ صوم و صلوٰۃ کے پابند اور دینی و ملی کاموں سے دلچسپی لیتے رہے، ریٹائر ہونے کے بعد گو صحت خراب رہنے لگی تھی، مگر لکھنؤ میں جتنے سنجیدہ علمی، ادبی اور مذہبی کام ہوتے تھے ان سب میں وہ پوری دلچسپی سے حصہ لیتے تھے، دار العلوم ندوۃ العلماء، فرنگی محل، انجمن ترقی اردو، انجمن اصلاح المسلمین کرامت حسین کالج، ان سب اداروں کے وہ سرگرم ممبر رہے، اپنے اخلاق و عادات کے اعتبار سے بھی اودھ کے دیندار شرفاء کی یادگار تھے، ادب و مطالعہ کا بھی پاکیزہ مذاق رکھتے تھے، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے انکی وفات پر جو مختصر مگر پُر اثر مضمون "نا زبردار بھائی" لکھا تھا، جو اس کتاب میں بھی شامل ہے، اس سے ان کی زندگی کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے، کتاب میں ان تمام مشاہیر اور اہل تعلق کے تعزیت نامے بھی شامل ہیں، جو مولانا دریابادی یا ان کے پسماندگان کو لکھے گئے، مولوی عبدالمجید صاحب کی زندگی مختلف حیثیتوں سے دوسروں کے لیے نمونہ تھی اس لیے اس کا مطالعہ عام ناظرین کے لیے بھی فائدہ سے خالی نہیں،

انیس زندگی - محمد انیس الرحمن صاحب (ایڈوکیٹ) صفحات ۲۲۲ کتابت و طباعت بہتر، ناشر دانا اکیڈمی شنکر بلڈنگ اے - ایم ۲ فریر روڈ، کراچی ملا

عورت انسانی زندگی کی آبرو اور اسکی زینت ہے، مگر ہماری تہذیب نے اسے اسکے مقام عفت و عصمت سے نیچے گرا دیا، اور اس حمام میں مصر او رروم و ایران کی قدیم مادی تہذیبیں اور جدید مادی تہذیب سب ننگی نظر آتی ہیں، ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے زمانہ میں عورت کو محض ایوان تعیش کی زینت سمجھا، اس پہلو سے مادی تہذیب کا دامن ہمیشہ داغدار رہا، لیکن اسلام نے اسکو جو مقام عطا کیا ہے اگر اسکو ملجائے تو نہ صرف ہماری گھریلو بلکہ ہماری سوسائٹی کی بہت سی گتھیاں سلجھ جائیں، اس کتاب میں مصنف نے اس موضوع پر تین حیثیتوں سے بحث کی ہے (۱) شادی کو لازمی قرار دیا جائے (۲) ایک شادی پر ہر شخص کو مجبور کیا جائے (۳) غیر صحت مند جوڑوں کو افزائش نسل سے روکا جائے، پچھلی بحث کو چھوڑ کر کہ اسمیں اختلاف کی گنجائش ہے پہلے دونوں مسئلوں پر سنجیدہ اور مدلل گفتگو کی ہے، اور ایک شادی کے لازمی نظریہ کو غلط ثابت کیا ہے، کتاب مطالعہ کے لائق ہے۔

م - ح

جلد ۹۰ ماہ رجب المرجب ۱۳۸۲ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۶۲ء عدد ۶

مضامین

شذرات

اللہ تعالیٰ کبھی کبھی شر سے خیر کا پہلو پیدا کر دیتا ہے۔ "خدا شرے برانگیزد کہ خیرے ما در آں باشد"۔ مشہور مقولہ ہے، چین کا حملہ بھی اسی قسم کا شر ہے، اگر ہم چاہیں تو اسکے ذریعہ بہت کچھ فوائد حاصل کر سکتے ہیں، اور اپنی کمزوریوں کو دور کر سکتے ہیں، اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ قومی اتحاد و یکجہتی جو بڑی مشکل سے حاصل ہو سکتی تھی خود بخود حاصل ہو گئی، اور ہندوستان کی ساری سیاسی پارٹیاں اور مذہبی فرقے اپنے اختلافات، مطالبات اور شکایتیں بھلا کر ملک کے دفاع پر متحد ہو گئے، ضرورت ہے کہ اس عارضی اتحاد کو پائیدار اور مستقل بنانے کی کوشش کی جائے۔ اس کے لیے اس سے بہتر موقع نہیں مل سکتا، اس راہ میں سب سے بڑا مسئلہ مذہبی اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کا ہے، انھوں نے جس متحدہ آواز سے وطن کی آواز پر لبیک کہا ہے اور پوری قوم جس طرح ملک کے دفاع کے لیے متحد ہو گئی ہے، اسکی مثال ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں نہیں ملتی، اور ہم کو خوشی ہے کہ اس میدان میں مسلمانوں کا قدم کسی سے پیچھے نہیں ہے، اس لیے حکومت اور اکثریت دونوں کا یہ فرض ہے کہ وہ بھی اسکی قدر دانی اور حوصلہ افزائی کا ثبوت دیں، یہ وقت شکایتوں اور حقوق طلبی کا نہیں ہے، لیکن مسلمانوں کے اس جذبہ کا پورا اعتراف کرنا چاہیے اور وہ امتیازی سلوک ختم کر دینا چاہیے جس سے ان میں غیریت کا احساس پیدا ہو، خصوصاً فرقہ پروروں کو اپنا دل آزار رویہ بالکل ترک کر دینا چاہیے، جب سیلاب آتا ہے تو اس سے بچنے کے لیے حشرات الارض اور موذی جانور تک آپس میں مل جاتے ہیں، فرقہ پروروں کو انہی سے سبق حاصل کرنا چاہیے، اس وقت ہندوستان کو قومی اتحاد و یکجہتی اور تمام طبقوں کی مادی و اخلاقی امداد کی ضرورت ہے، اس لیے ان سب کا فرض ہے کہ وہ اپنی ساری صلاحیتیں اور قوتیں اس کیلئے وقف کر دیں، اور جو چیزیں اس راہ میں رکاوٹ ڈالنے والی اور ملک میں بے اعتمادی پیدا کرنے والی ہوں انکا سختی سے تدارک کیا جائے۔

ایسے نازک وقت میں جب بیرونی دشمنوں کا مقابلہ ہو تو آپس کے روٹھے ہوئے مل جاتے ہیں، کاش ہندوستان اور پاکستان بھی اپنے اختلافات بھلا کر چین کے مقابلہ میں متحد ہو جاتے، گو سیاسی تقسیم نے دونوں کو دو ملک بنا دیا ہے اور خواہ ان میں کتنے ہی اختلافات ہوں اس حقیقت سے نہیں انکار کیا جا سکتا کہ یہ دونوں ایک ہی جسم کے ٹکڑے ہیں، ان کی تاریخ، تہذیب، نسل اور قومیت بڑی حد تک مشترک ہے، انکی جغرافیائی پوزیشن ایسی ہے کہ ان کا دفاع ایک دوسرے کی اعانت کے بغیر نہیں ہو سکتا، اور وہ ایک دوسرے کو نظر انداز کر کے بیرونی حملہ آوروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے، چین کے حملے نے یہ حقیقت ایسی واضح کر دی ہے کہ جن سنگھ تک ہند و پاک میں صلح و صفائی کی ضرورت ماننے پر مجبور ہو گیا ہے، اس لیے دونوں میں مصالحت کا اس سے بہتر موقع نہیں مل سکتا، دیر سے سہی مگر ایک نہ ایک دن دونوں میں صلح ہو کر رہے گی، اس لیے جو بات ہونے والی ہے اس کو ایسے وقت میں کیوں نہ کیا جائے جس سے دونوں میں زیادہ اخلاص و اعتماد پیدا ہو، اس کے سیاسی فوائد سے قطع نظر، ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ دونوں ملکوں کی اقلیتوں کو آئے دن کی مشکلات سے نجات مل جائے گی۔

مسلمانوں کے مذہبی اختلاف نے ہمیشہ انکی قوت کو نقصان پہنچایا ہے، بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ انکے سیاسی زوال میں بھی کسی حد تک اس کو دخل ہے، اس کے باوجود ان کو عبرت حاصل نہیں ہوتی، فروعی اختلافات سے کسی مذہب کے پیرو بھی خالی نہیں ہیں، اور ان کے بدولت ایک زمانہ میں بڑے بڑے معرکے رہ چکے ہیں، مگر اب اس قسم کی ہنگامہ آرائی کا زمانہ ختم ہو چکا، چنانچہ مسلمانوں کے علاوہ کسی مذہبی فرقے میں یہ ہنگامے نہیں پائے جاتے، مگر ان کا ایک طبقہ ابتک اپنی گرمیٔ بازار کے لیے اس کو زندہ کیے ہوئے ہے، اس سلسلہ میں مغربی پاکستان میں جو طوفان برپا ہے اور جس سطح پر فریقین میں جنگ ہو رہی ہے وہ انتہائی شرمناک ہے، لطف یہ ہے کہ اہل سنت کے کسی طبقہ میں بھی عقیدہ کا کوئی ایسا بنیادی اختلاف نہیں ہے جس کا تعلق کفر، شرک یا فسق سے ہو، یہ اختلافات محض فروعی ہیں اور انکی حیثیت بھی نزاع لفظی سے زیادہ نہیں ہے، اس کے باوجود کفر سازی اور شرک نوازی کا ایک طوفان برپا ہے۔

یہ اختلافات کوئی نئے نہیں ہیں، صدیوں سے چلے آرہے ہیں، خود ہندستان میں اس پر بہت تقریری اور تحریری مناظرے ہوچکے ہیں کہ انکے لٹریچر سے ایک پورا کتبخانہ مرتب ہوسکتا ہے، مگر کوئی فریق بھی دوسرے فریق کو اسکے عقائد سے باز نہ رکھ سکا، اسلئے اب اس قسم کے ہنگاموں سے مسلمانوں میں تفرق و انتشار پھیلانے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہے، مسلمانوں کے تقریباً تمام فرقوں خصوصاً اہل سنت کے تمام طبقوں میں ایسے بنیادی متفقہ عقائد موجود ہیں جو اسلام اور ایمان کیلئے بالکل کافی ہیں، انکو چھوڑ کر فروعی اور اختلافی مسائل کو چھیڑنے سے کچھ حاصل نہیں ہے، ضرورت اسکی ہے کہ ان کو مطلق نہ چھیڑا جائے اور کسی فرقہ کو کفر و شرک اور فسق و بدعت کا ملزم اور سب و شتم کا نشانہ نہ بنایا جائے، اور بدعتی، وہابی، مشرک اور قبر پرست وغیرہ کے القاب ترک کردیے جائیں، ہر فرقہ کے عقائد اور انکی تحریروں اور عبارتوں کی تشریح و تاویل میں اسی کا بیان صحیح مانا جائے، اس سے بڑی حد تک اختلافات ختم یا کم سے کم بہت ہلکے ہوجائیں گے، یہ مداہنت یا مصلحت پرستی نہیں بلکہ شرعی حکم بھی یہی ہے کہ کسی مسلمان کو کافر و مشرک بنانے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، خصوصاً حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پیرووں کو اس بارہ میں اور بھی محتاط ہونا چاہیے، جن کے نزدیک سارے اہل قبلہ مسلمان ہیں۔

اس قسم کے اختلافات اور ہنگاموں سے علما کے وقار کو بڑا نقصان پہنچتا ہے، اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں انکی ہوا اکھڑتی ہے، یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ علماء کے اختلافات کا فیصلہ دنیاوی عدالتیں کرتی ہیں، اور قیام امن کیلئے پولیس کی امداد کی ضرورت ہوتی ہے، یعنی جو منصب علماء کا تھا وہ انھوں نے دنیاوی عمال کے حوالے کردیا ہے، اس سے قطع نظر آج جبکہ اسلام کا مقابلہ کفر و الحاد اور مادیت و دہریت سے ہے، آپس کے اختلافات میں اپنی قوت ضائع کرنا دین و ملت کا بہت بڑا نقصان ہے۔

گذشتہ مہینے حکومت ہند کی سائنسی تحقیقات اور ثقافتی امور کی وزارت کی جانب سے افغانستان کے مشہور بزرگ شیخ الاسلام حضرت عبد اللہ انصاری المتوفی ۴۸۱ھ کی نو سو سالہ برسی منائی گئی تھی جس میں مختلف اہل علم کو مقالات پڑھنے کی دعوت دی گئی تھی، دار المصنفین کی جانب سے ہمارے رفیق سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب نے شرکت کی اور شیخ الاسلام پر انگریزی میں ایک مقالہ پڑھا، افغانستان کے سفیر نے بھی مقالہ پڑھا تھا اور ایران کی سفارت کی جانب سے ایک تقریر ہوئی تھی، اس قسم کی تقریبات اس حیثیت سے بہت مفید ہیں کہ اس کا اثر ہندستان اور دوسرے ملکوں کے تعلقات پر بہت اچھا پڑتا ہے،

مقالات

شاہ محمد غوث گوالیاریؒ

از

جناب پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب حیدرآباد (مغربی پاکستان)

(۵)

شخصیت کی عظمت کا اندازہ اس کے وابستگان سے بھی ہوتا ہے، اس حیثیت سے شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی (م۔ ۹۹۸ھ) کی ارادت و عقیدت ہی شاہ محمد غوثؒ کے علو مرتبت پر دال ہے، ملا عبد القادر بدایونی نے لکھا ہے:-

"و میاں شیخ وجیہ الدین عالم ربانی، متبحر مدرس، ناشیۂ اطاعت او بر دوش کشیدہ و ایں جملہ دال بر کمالات و کرامات شیخ است[1]۔"

اس کے بعد لکھتے ہیں:-

"و بسیار از مشائخ نامی بزرگ دیگر در ملک دہلی و گجرات و بنگالہ از عقب دامن او برخاستہ، و آثار کمال او ہنوز در ہند باقی ماندہ[2]۔"

زمانۂ ریاضت ہی سے شاہ محمد غوثؒ نے بیعت و ارشاد کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ شاہ

---

[1] عبد القادر بدایونی: منتخب التواریخ، ج ۳ ص ۴ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء [2] ایضاً ص ۶

فضل اللہ شطاری لکھتے ہیں :۔

" اور اس رباعنت کے زمانے میں اکثر خلفاء و مرید، طالب و خادم نعمت سے مستفید و بہرہ مند ہوئے، مثلاً شیخ جمال محبوب اللہ، و خواجہ معین الدین خراسانی، و شیخ ناصر قتال، و شیخ نور طبقاتی شیخ نعمت اللہ صوفی و شیخ قاضی شطاری، و شیخ احمد دانا، شیخ احمد سیاہ، خواجہ عالم حاجی و شیخ جلال عبد القاہر، و شیخ ذرہ سوختہ، و شیخ مبارک مجذوب، و شیخ ماہ عاشق و شیخ عطاء اللہ گنج نشین، و شیخ داؤد موحد، و شیخ حسن صاحب دعوت، اور ان کے علاوہ بے شمار مرید ہوئے جن کی تعداد حد سے زیادہ ہے جس کا پایان و حساب نہیں،[۱]

جب شاہ محمد غوثؒ گوالیار میں مسند رشد و ہدایت پر متمکن ہوئے تو یہاں بھی بے شمار حضرات مستفیض ہوئے، چنانچہ شاہ فضل اللہ شطاری لکھتے ہیں :۔

" نیز اکثر خلفاء، وفدا، صاحب نعمت و متعدد دولت اس جگہ سے بہرہ مند ہوئے ہیں، چنانچہ شیخ سیف الدین سیف اللہ، شیخ ارزانی عرف شاہ یداللہ و شیخ جیا اہل اللہ، و شیخ ابو الخیر خراسانی و سید فتوح اورا والنہری، و شیخ ناظر فیاض و شیخ تاج الدین وعنت نارنولی و سید مبارک صوفی و سید احمد عاشق و شیخ سعد اللہ اور ان کے مثل بسیار خلق عالم صورت سے عالم معنی کو پہنچی ہے اور فائدہ پایا ہے، ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا کہ اس راہ میں قدم رکھا ہو اور کوئی دم سوائے حق کے رہا ہو، بیشک جو کوئی غوث کے سایہ عنایت میں آگیا اس کا استغناث کسی شے میں نہ رہا اس کا استغناثہ اس کی استغاثت میں تھا۔ واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم[۲]

راقم کے پاس ایک قدیم مخطوطہ ہے، اس میں شاہ محمد غوث گوالیاری کے ایک سَو سے زیادہ اجلہ مریدین کے اسماء گرامی لکھے ہیں، جن کو بخوف طوالت نقل نہیں کیا جاتا ہے،

---

[۱] فضل اللہ شطاری، مناقب غوثیہ (اردو) ص ۲۲ مطبوعہ آگرہ ۱۳۲۳ھ، [۲] ایضاً ۲۳

صاحب تاریخ الاولیاء سید امام الدین احمد نے بھی شاہ محمد غوث کے چند ممتاز خلفاء کا ذکر کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں :-

"دکن و گجرات میں آپ کے تشریف لانے سے بڑے بڑے علماء نے فیض پایا ہے، چنانچہ آج تک دکن و خاندیس آپ کے فیض سے مملو ہے۔ خلفاء آپ کے بہت ہیں، چنانچہ شیخ لشکر محمد عارف بالفقہ برہان پوری، شیخ وجیہ الدین گجراتی، شیخ صدر الدین ذاکر، شیخ ولی محمد، شیخ دودو اللہ شطاری، شیخ میاں ابراہیم سرہندی، میاں تان سین، سید کالے شطاری، شاہ منجھن، شیخ اکھو وغیرہ مشہور و معروف ہیں [1]۔"

ہم مثال کے طور پر صرف چند خلفاء کے حالات تحریر کرتے ہیں :-

شیخ وجیہ الدین احمد علوی | مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے شیخ وجیہ الدین کے حالات زندگی کے اجمالی حالات یہ لکھے ہیں :-

ولادت او در محرم ۹۱۱ھ احدی عشر و تسعمأۃ واقع شد۔ مولد او چانپانیر است وہاں جا نشو و نما یافت و در بلدۂ گجرات فنون متعارفہ از لاعماد طاری کسب نمود و رسم ارادت بخدمت شیخ قاضن قدس سرہٗ بجا آورد و چون محمد غوث گوالیاری قدس سرہٗ بہ احمد آباد تشریف فرمود، شیخ وجیہ الدین در جمال بیابوں محویتے بہم رسانید و در سایۂ تربیت شیخ کار تمام کرد [2]۔"

مولانا محمد غوثی لکھتے ہیں :-

"آپ شیخ نصر اللہ کے بیٹے تھے، مولد اور مرقد، دونوں احمد آباد (گجرات) میں ہیں، آپ دونوں جہاں کے قطب، دونوں جہاں کے حقائق کے مرکز، حصولی اور حضوری علم کے مالک، اکتسابی اور وہبی علم کے خداوند، کتابی منقوش اشیاء کے رموز داں،

---

[1] امام الدین احمد، تاریخ الاولیاء، ص ۳۲-۴۳ مطبوعہ بمبئی [2] غلام علی آزاد بلگرامی، مآثر الکرام ص ۱۹۶

اور اسرار لوح محفوظ کے رازدار تھے۔ کہتے ہیں کہ آپ نے علمی صورت سے نکل کر ہجری ۹۰۳ھ
(نوسو دو) میں عنصری پیکر کے وطن کو اپنی ولادت کے جلوے سے منور فرمایا اور ولادت کے
بعد پانچویں سال کے آغاز سے اخیر تینتیس ۳۳ سال تک آپ طرح طرح کے علوم متداول
اور غربیہ کی تحصیل میں مشغول رہے، یہاں تک کہ ما شاء علم سے زیادہ ہی زیادہ آپ کو
حاصل ہوگئے، جب مجازی کثرت آباد سے حقیقی وحدت گاہ کو آخری سفر ہوا تو تاریخ
انتیسویں ۲۹ صفر تھی اور ہجری ۹۹۷ھ نوسو ستانوے تھا، اس وقت تک آپ تمام علوم کے
درس دینے میں مشغول رہے، اور اللہ تعالیٰ جل شانہ کی بخششیں آپ کے اوقات عزیز کے
شامل حال رہیں، اس باسٹھ سال کی مدت میں آپ کے فیض رسانی کی بدولت بہت سے
ذی استعداد لوگوں نے آپ کی شاگردی سے خلعت استادی پایا اور بلند ہمت صوفیوں
نے آپ کی دلنشین تلقین سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔"[1]

ملا عبد الباقی نہاوندی بھی شیخ وجیہ الدینؒ سے فیض یاب تھے، مآثر رحیمی شیخ موصوف کی حیات
میں تالیف کی تھی اس میں لکھتے ہیں :-

"میاں وجیہ الدین فاضلے دانشمند و مالکے خردمند است و شاگرد بیواسطہ
علما و طاری بود کہ از جملہ شاگردان و تلامذہ علامہ زمان و وحید دوران مولانا جلال الدین
دوانی است کہ از غایت شہرت احتیاج بتعریف و توصیف ندارد، واکثر از ملایان
متبحر ہندوستان شاگردیان مولی الیہ اند۔ و بجامعیت او در میان فضلاے ایں عصر کسے بہم نمی
رسد، و در مجاہدہ نفس و ترک لذات دنیاوی نیز سعی بکمال کردہ، بتزکیہ نفسے فی الجملہ او را
بہم رسیدہ بود، و احوال خیر مآل میاں مذکور از غایت شہرت و نہایت عالمگیری از

---

[1] محمد غوثی : گلزار ابرار (اردو) ص ۵۰۴ مطبوعہ ۱۳۲۶ھ

تفصیل آں باز دارد۔"[1]

ملا عبدالقادر بدایونی بھی شیخ وجیہ الدین کے زمانے میں موجود تھے، شیخ موصوف کے انتقال کے بعد، ان کے حالات میں لکھتے ہیں :-

"..... یہ علوی نسب سے تعلق رکھتے تھے لیکن اپنے نسب کو انھوں نے مسافر ہونے کی وجہ سے شہرت نہ دی۔ اپنے زمانے کے بڑے عابد و متقی عالم تھے، شریعت کی نہایت پابندی کرتے تھے۔ گوشہ نشینی ان کا شعار تھا، ہمیشہ دینی علوم کے درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے، تمام عقلی اور نقلی علوم پر قدرت وعبور حاصل تھا، چنانچہ "صرف ہوائی" سے لیکر "قانون" "شفا" "شرح مفتاح" اور "عضدی" جیسی کتابوں سے شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہوگی جس پر انھوں نے شرح یا حاشیہ نہ لکھا ہو، ایک مخلوق ان کے علمی افادہ سے فیض اٹھاتی رہی۔"[2]

آگے چل کر لکھتے ہیں :-

"ارادت کا تعلق تو کسی اور سے تھا لیکن شیخ محمد غوث سے تربیت وارشاد حاصل کیا تھا، اور آداب طریقت میں ان کے پیرو تھے۔ انہی کے پاس سلوک کی تکمیل کی تھی، صوفیانہ مشرب سے بڑا ذوق اور مناسبت تھی۔[3]

"واقعہ تکفیر" کے ذیل میں شیخ محمد غوث سے شیخ وجیہ الدین کے سبب ارادت وعقیدت کا تفصیلی جائزہ لیا جا چکا ہے، متعلقہ قسط کی طرف رجوع کریں۔

مولانا عالم گل بہاری کے تذکرے کے حوالے سے مولانا محمد غوثی نے شیخ وجیہ الدین کا یہ واقعہ نقل کیا ہے، جو ۹۵۳ھ میں پیش آیا تھا۔

---

[1] عبدالباقی نہاوندی : مآثر رحیمی ص ۸۰۔۷ مطبوعہ کلکتہ ۱۹۲۴ء [2,3] عبدالقادر بدایونی : منتخب التواریخ (اردو) ص ۵۸۳

شیخ وجیہ الدین نے مولانا عالم گل بہاری سے فرمایا :- جن مقدمات پر الٰہی حقایق کا دریافت اور کشف موقوف ہے ان مقدمات کی تحصیل کا شوق میرے دل میں بھی اس وقت پیدا ہوا تھا کہ جب درس و تدریس میں مشغول تھا، ناگاہ ایزدی مشیت جس کی ہر ایک مقدر شئے میں سو سو نکتے اور نیرنگیاں ہیں، حضرت غوث الرحمٰن کو گوالیار سے گجرات کی طرف کھینچ لائی یہ صورت مجکو حضرت غوث الرحمٰن کی شرف پابوسی سے مشرف ہونے کا باعث ہوئی اور بہت تھوڑے عرصہ میں ممدوح کی کیمیائی پرورش کے ذریعہ میرا اسلام تانبے کی طرح کندن سونا بن گیا، رسمی عقائد کی قید سے نکل کر حقیقی ایمان کی بہشت میں چہل قدمی کرنا نصیب ہوا، اور چند روز بعد خلافت مطلق کا خلعت پاکر سرفراز ہوگیا، اور پالیا جو کچھ پاس نہ تھا اور جو کچھ پاس تھا پھر وہ نہ ملا - بیت

انچہ حق بہر بندگان آراست

آرزو آن خیال نداند خواست [1]

شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے بھی لکھا ہے :-

انتساب و اعتقاد وے در تصوف بہ شیخ محمد غوث بود اگرچہ مرید جائے دیگر بود -" [2]

اور اس "انتساب" اور "اعتقاد" پر شیخ وجیہ الدینؒ کو ناز تھا، ملفوظات میں لکھا ہے :-

"می فرمودند کہ قبل از ملاقات شیخ ہیچ خبر از خدا نداشتم، مرا کہ بہ خدا رسانید شیخ محمد غوث بود رضی اللہ عنہ -" [3]

مولانا عبد الحی مرحوم نے مقصود والمراد کے حوالے سے لکھا ہے :-

---

[1] محمد غوثی : گلزار ابرار (اردو) ص ۴۰۶ مطبوعہ ۱۳۲۶ھ [2] عبد الحق محدث : اخبار الاخیار ص ۱۹۳ مطبوعہ دہلی

[3] ملفوظات شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی . فارسی قلمی (قبل ۹۹۰ھ) اسلامیہ کالج لائبریری، پشاور

"مقصود المراد (ملفوظات سید ہاشم علوی) میں خود شاہ ہاشم (شیخ وجیہ الدین کے بھتیجے) کی زبانی یہ لکھا ہے کہ شاہ وجیہ الدین کی تربیت حضرت شاہ محمد غوث نے فرمائی، اور علم حقائق سکھایا اور باوجودیکہ انھوں نے بائیس سال کی عمر میں ایک سو بیس علم تحصیل کیے لیکن خود شاہ صاحب (شاہ وجیہ الدین) فرماتے تھے کہ اگر میں شیخ سے ملاقات نہ کرتا تو میں مسلمان نہ ہوتا، اور پھر فرمایا کہ جو معرفت اللہ تمام عمر میں حاصل نہ ہوئی تھی وہ ایک شب میں حاصل ہوگئی۔"[1]

شیخ وجیہ الدین کے ملفوظات میں لکھا ہے:-

"دیگر فرمودند" وقتے بخواب دیدم پیر دست گیر شاہ قاضن را کہ زیر درخت آسودہ اند فقیر نیز آں جا حاضر شدم۔ فرمودند کہ کیستی؟ گفتم "فلاں کس مرید شما" فرمودند کہ "شما را بایں درجہ کہ رسانید؟" گفتم کہ "شیخ محمد غوث" فرمودند "بلے شیخ محمد غوث ایں چنیں مرد ایست"[2] (ملفوظات۔ قلمی (پشاور))

اس واقعہ سے شیخ محمد غوث کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے لکھا ہے:-

ولبس الخرقة من الشيخ قاضن	جب شیخ محمد غوث گوالیاری صاحب جواہر خمسہ
قدس سرہ ولما ورد الشیخ	گجرات میں وارد ہوئے تو شیخ وجیہ الدین
محمد غوث الكواليارى صاحب	ان کے جمال میں گم ہو گئے اور ان ہی
الجواهر الخمسه بگجرات تلاشى	کے زیر سایہ طریقت کی انتہا تک پہنچے
الشيخ وجيه الدين فى جماله	طلبہ ان کے افادات عالیہ سے مستفید
وسلك الى منتهى الطريقه	ہوئے اور مشرق و مغرب کو اپنی

[1] ڈاکٹر عبد الحق مرحوم: "اردو کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام" ص ۵۷ مطبوعہ کراچی ۱۹۵۳ء

فی ظلالہ ومتع الطلبۃ بجلائل   برکتوں کے نور سے معمور کر دیا،

الافادات۔ وملأ شرق العالم

وغربہ من لوامع البرکات[1]

شیخ وجیہ الدین کو خرقۂ خلافت شیخ قاضن سے تو ملا ہی تھا، شیخ محمد غوث گوالیاری نے بھی خرقۂ خلافت عطا فرمایا اور ان کا شمار آپ کے اجلہ خلفاء میں ہے۔ شیخ وجیہ الدینؒ کے ملفوظات کا ایک قلمی نسخہ جو مولانا راشد برہانپوری کی ملکیت میں ہے، اس کے ترقیمے کی عبارت سے شیخ موصوف کی خلافت کی توضیح ہو جاتی ہے، لکھتے ہیں :-

تمت ھذا الملفوظات شاہ وجیہ الدین الحق والدین الخلیفۃ الکامل المکمل للشیخ محمد غوث قدس اللہ سرھما وافاض علینا فیضھما۔ آمین آمین۔ آمین! (بحوالہ علمی نقوش مولفہ ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں مطبوعہ کراچی ۱۹۵۶ء)

جہانگیر نے بھی لکھا ہے :-

شیخ وجیہ الدین، شیخ محمد غوث کے ایسے بلند مرتبہ خلیفہ تھے جن پر خود مرشد کو فخر ہوتا ہے۔[2]

آئین اکبری میں ابو الفضل نے بھی شیخ وجیہ الدینؒ کا ذکر کیا ہے۔

تصانیف جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، شیخ وجیہ الدین متبحر عالم اور کثیر التصانیف بزرگ تھے، کتابوں کے بے شمار شرح و حواشی لکھے ہیں۔ ڈاکٹر زبیر احمد نے مندرجہ ذیل تصانیف کے نام لکھے ہیں :-

(۱) حاشیہ علی تفسیر البیضاوی (۲) شرح نخبۃ الفکر (۳) حاشیہ علی شرح الوقایہ۔ (۴) حاشیہ علی التلویح (۵) حاشیہ علی اصول البزدوی (۶) الحقیقۃ المحمدیہ۔

---

[1] غلام آزاد بلگرامی : سبحۃ المرجان فی آثار ھندوستان ص ۵۸ (۱۳۰۳ھ) [2] نور الدین جہانگیر تزک جہانگیری مطبوعہ لاہور ۱۹۶۸ء ص ۵۰۴

(۷) حاشیہ علی الشرح العضدی علی المختصر لابن حاجب (۸) الحاشیہ علی التجرید (۹) الحاشیہ علی شرح العقائد للتفتازانی (۱۰) الحاشیہ علی الحاشیۃ القدیمہ (۱۱) حاشیہ علی شرح الچغمینی (۱۲) حاشیہ علی شرح الجامی (۱۳) شرح ارشاد النحو (۱۴) حاشیہ علی المطول (۱۵) حاشیہ علی مختصر المعانی۔[۱]

مولانا محمد غوثی نے بھی مندرجہ ذیل حواشی و شرح کا ذکر کیا ہے:۔

(۱) حاشیہ فوائد ضیائیہ (۲) شرح ارشاد قاضی (۳) شرح ابیات منہل و ما مینی، (۴) حاشیہ شرح تجرید (۵) حاشیہ قطبی (۶) شرح شمسیہ (۷) حاشیہ شرح کلمۃ العین، (۸) شرح جام جہاں نما (۹) شرح کلید مخازن من تصنیف غوث الاولیاء[۲] وغیرہ وغیرہ۔

وفات | مولانا محمد غوثی نے لکھا ہے کہ شیخ وجیہ الدینؒ نے ۲۹ صفر ۹۹۸ھ میں احمد آباد (گجرات) میں وفات پائی[۳]۔ ملا عبد القادر بدایونی نے سنہ وفات ۹۹۸ھ لکھا ہے[۴]۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے بھی ۲۹ صفر ۹۹۸ھ لکھا ہے[۵]، اور یہی سنہ ڈاکٹر عبد الحق مرحوم[۶] اور حکیم شمس اللہ قادری[۷] نے بھی تحریر کیا ہے۔ مگر موخر الذکر نے تاریخ ۱۹ صفر لکھی ہے، ملا عبد القادر بدایونی نے وجیہ الدین[۸] سے سنہ وفات نکالا ہے، اور مولانا رحمان علی نے جنت الفردوس نزلا سے[۹]، مگر ان دونوں مادوں سے سنہ وفات نہیں نکلتا، غالباً مترجمین سے کہیں سہو ہو گیا ہے۔

شیخ لشکر محمد عارفؒ | آپ کا شمار بھی شیخ محمد غوثؒ کے اجلہ خلفاء میں ہے، آپ ملک راجن ابن ملک پیر ابن ملک رکن قریشی کے فرزند رشید تھے، مضافات گجرات میں قصبہ ملاسہ میں دسویں صدی ہجری کے آغاز میں پیدا ہوئے، والدؒ نے تیرہ روز بعد اور والدہ نے چھ برس بعد وصال فرمایا، پرورش دادانے کی،

---

[۱] ڈاکٹر زبید احمد - کنٹری بیوشن آف انڈیا ٹو عربک لٹریچر، مطبوعہ الٰہ آباد ۱۹۴۶ء ص ۴۰۹ [۲] محمد غوثی - گلزار ابرار (اردو) ص ۴۰۹ [۳] ایضاً ص ۵۰۴ [۴] عبد القادر بدایونی - منتخب التواریخ (اردو) ج ۳ ص ۵۰۵ [۵] غلام علی آزاد بلگرامی - سبحۃ المرجان ص ۴۴ [۶] عبد الحق - اردو کی نشو و نما ص ۳۰ [۷] شمس اللہ قادری - اردوئے قدیم مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۲۵ء ص ۴۴ [۸] منتخب التواریخ (اردو) ج ۳ ص ۵۰۵ [۹] مولانا رحمان علی - تذکرہ علمائے ہند، مطبوعہ کراچی، ص ۵۴۰ (اردو)

اور ابتدا، سن شعور میں قاضی محمود بیرپوری کے دامن سے وابستہ ہوگئے،

سولہ برس کی عمر میں، ہنائے حقیقی کی تلاش میں نکل پڑے، طلب صادق تھی، اس لیے بحر المعارف شیخ قطب جہانیاں ذاکر نہروالہ کی خدمت میں رسائی ہوگئی، شیخ موصوف نے دو سال تک روحانی تربیت کی،

۹۵۱ھ میں احمد آباد (گجرات) میں شیخ محمد غوث گوالیاری کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کے دامن طریقت سے وابستہ ہوگئے، جب شیخ موصوف نے گوالیار کی طرف مراجعت کی تو آپ نے ہمراہ چلنے کا ارادہ ظاہر کیا، مگر شیخ محمد غوث گوالیاریؒ نے فرمایا:-

"عارف! ہم تم کو اپنی جگہ طالبان معرفت کی ہدایت کے واسطے اس صوبے میں چھوڑتے ہیں"، چنانچہ بتعمیل حکم مرشد کم و بیش تیس سال تک احمد آباد میں رہنے کی توفیق ہوئی، آخر ہجری ۹۰۲ھ میں برہان پور (خاندیس) کی طرف ارادہ کرکے روانہ ہوگئے[1]"

۹۹۳ھ تک رشد و ہدایت میں مصروف رہے، اور ۲ر شوال سنہ مذکور میں رحلت فرمائی، آپ کے نام ہی سے آپ کا سنہ وفات (۹۹۳ھ) نکلتا ہے،

لشکر محمد عارف کی ایک صاحبزادی بڑی فاضلہ تھیں، درس دیا کرتی تھیں، عبدالرحیم خان خاناں اور اس کے بیٹے داراب خاں نے لشکر محمد عارف کے جلیل القدر خلیفہ شیخ عیسی جند اللہ سے درخواست کی کہ ہم بوبو راستی علیہا الرحمہ (دختر مذکور) کے درس سے مستفید ہونا چاہتے ہیں، چنانچہ آپ نے قبول فرمایا اور بہلیوں پر سوار ہوکر مع خانخاناں وغیرہ راستی پورہ پہنچے، حضرت موصوف لمعات و نزہتہ الارواح اور اسی پایہ کی اعلیٰ کتب تصوف بطرز شائستہ و دلنشین پڑھانے میں شہرت رکھتی تھیں، درس جاری تھا، یہ لوگ کافی عرصہ تک اس روز

---

[1] محمد غوثی، گلزار ابرار (اردو) ص ۷-۳۶۱

کے درس سے مستفید ہوئے، واپسی میں مسیح الاولیاء (شیخ عیسیٰ) داراب خاں کی سواری کے رتھ پر اپنی خانقاہ میں تشریف لائے[۱]،

مسیح الاولیاء، شیخ عیسیٰ جند اللہ ابن شیخ قاسم سندھی قدس سرہ العزیز (م ۱۰۳۱ھ) شیخ لشکر محمد عارف کے اجلہ خلفاء میں سے تھے۔ آپکے اسلاف کا وطن قصبہ پاتری (سندھ) تھا، ہمایوں کی لشکرکشی سے جب سندھ میں اختلال و بدنظمی پیدا ہوئی تو آپکے والد ماجد شیخ قاسم اور عم محترم شیخ طاہر محدث ۹۵۰ھ میں ترک وطن کرکے احمد آباد تشریف لے گئے[۲]۔ بقول اعجاز الحق قدوسی :-

شیخ قاسم اور ان کے بڑے بھائی شیخ طاہر محدث، اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کرکے پہلے احمد آباد تشریف لائے اور انھوں نے اسی زمانے میں حضرت محمد غوث گوالیاری سے بیعت ہوکر چودہ خانوادوں میں خلافت حاصل کی، پھر آپ اپنے مرشد کی اجازت سے اپنے خاندان کے ساتھ برار تشریف لائے[۳]۔

شیخ عیسیٰ جند اللہ کی ولادت ایلچپور (برار) میں ۵ ذی الحجہ ۹۶۲ھ میں ہوئی[۴]، سقوط سلطنت برار کے بعد شیخ طاہر محدث مع شیخ عیسیٰ برہانپور تشریف لائے۔ والی خاندیس شاہ فاروقی نے محلات اور نقد و جنس پیش کی، سندھی مہاجرین بھی آپکے قریب ہی آباد ہوگئے، یہ آبادی آجتک سندھی پورہ کے نام سے مشہور ہے۔

شیخ عیسیٰ جند اللہ، شیخ یوسف بنگالی اور شیخ طاہر محدث سے علوم عقلیہ اور نقلیہ میں فارغ ہوکر عم محترم کے مشورہ پر طالب علمی کی راہ میں جادہ پیما ہوئے۔ غالباً ۹۸۲ھ میں گوالیار تشریف لائے اور حضرت شیخ محمد غوث کے روضہ پر حاضر ہوکر روحانی لذتیں حاصل کیں[۵]، گوالیار سے اکبرآباد آئے، پھر یہاں سے حکیم عثمان بنگالی کے حلقہ درس سے مستفید ہونے کے لیے برہانپور تشریف لے گئے، مگر آتش شوق اس حلقہ درس میں بھی نہ بجھی — ان ہی دنوں بازار میں شیخ لشکر محمد عارف کی نگاہ ان پر پڑگئی، آپ نے شیخ عیسیٰ سے فرمایا[۶] "تم تو ہمارے ہو، ہمارے پاس کیوں نہیں آتے"

---

[۱] طیب اللہ راشد برہانپوری: تذکرۂ اولیائے سندھ مطبوعہ کراچی ۱۹۵۹ء ص ۱۰۲ [۲] شیخ اسمٰعیل زرجی: کشف الحقائق (قلمی) بحوالہ راشد برہانپوری ص ۱۰۳ [۳] عیسیٰ جند اللہ: عین المعانی (قلمی)، [۴] اعجاز الحق قدوسی: تذکرۂ صوفیائے سندھ مطبوعہ کراچی ۱۹۵۹ء ص ۱۵۶، [۵] تذکرۂ اولیائے سندھ، ص ۴۴ [۶] ایضاً ص ۴۵

اس ارشاد پر شیخ عیسیٰ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک دو صحبتوں میں تزکیۂ نفس حاصل کیا، اور خود مسیح القلوب بن گئے، محمد قاسم فرشتہ فرط ارادت سے لکھتا ہے :-

دو عیسیٰ است فرخندہ در نسل آدم یکے ابن قاسم، یکے ابن مریم

شیخ محمد عیسیٰ کو تعلیم سے بڑا شغف تھا، چنانچہ ملا اسمٰعیل سے قرآن مجید پڑھا، شیخ طاہر محدث سے فقہ و حدیث میں تکمیل کی، شیخ مبارک سندھی سے اصول فقہ و علم کلام میں سند فضیلت حاصل کی، شیخ عثمان بوکانی سے علوم عقلیہ و نقلیہ میں کمال حاصل کیا، شیخ فتح اللہ شیرازی سے ریاضی و عروض سیکھا، شیخ ابراہیم قادری سے تجوید و قرأت سیکھی اور شیخ لشکر محمد عارف سے علم لدنی میں کمال حاصل کیا، اس کے باوجود ہمیشہ کرامات سے گریز فرماتے تھے، اور اپنے شیخ طریقت سے لشکر محمد عارف کے بارے میں فرماتے :-

"جو لوگ حضرت شیخ لشکر عارف باللہ کی مجلس میں اولیاء اللہ کی کرامتوں کا ذکر کرتے تو آپ پسند نہ کرتے تھے کسی نے دریافت کیا کہ کیا آپ مقربان خدا کی اس فضیلت کو باور نہیں فرماتے؟ فرمایا : اولیاء کی کرامت کا کیوں منکر ہونے لگا لیکن لوگ کرامت ہی کو اولیاء اللہ کا کمال سمجھتے ہیں، یہ غلط ہے اور یہی مجھے پسند نہیں، کیونکہ کرامت تو ان کے روحانی قرب و فضیلت کے مقابلے میں ادنیٰ ترین درجہ ہے پھر ادنیٰ چیز کو اعلیٰ مدارج پر فوقیت دینا ایک طرح سے ان بزرگوں کرام کی توہین ہے،"[1]

شیخ عیسیٰ اپنے زمانے کے بلند پایہ عالم تھے، اجلہ علماء آپ کے درس سے مستفید ہوا کرتے تھے، آپ کی ان تصانیف سے آپ کے تبحر علمی کا پتہ چلتا ہے :-

(۱) روضۃ الحسینی (۹۸۹ھ) (۲) عین المعانی (۹۹۶ھ) (۳) انوار الاسرار (تفسیر قرآن حکیم) (۴) رسالہ حواس پنجگانہ (۵) حاشیہ بر اشارۂ غریبہ کتاب انسان کامل (۶) شرح قصیدہ بردہ (فارسی) (۷) رسالہ قبلۃ المذاہب اربعہ (۸) حاشیہ بر شرح ضیائیہ (۹) فتح محمدی در علوم با لتعلق بہ التفسیر

---

[1] تذکرۂ اولیاء سندھ، ص ۹ - ۴۸

(۱۰) تتمیم شرح مائۃ عامل (۱۱) رسالہ عقود (۱۲) ترجمہ اسرار الوحی (۱۳) رسالہ وحدت الوجود، (۱۴) رسالہ در بیان تعینات وحقیقت محمدیہ۔

شیخ عیسیٰ جند اللہؒ کا وصال ۱۰۳۱ھ میں ہوا،[۱] (موصوف کے تفصیلی حالات گلزار ابرار (ص ۵۰۸ تا ۵۴۳) میں مطالعہ کیے جائیں)

شیخ علی شیر بنگالی | آپ بھی شیخ محمد غوث گوالیاری کے خلفا میں ہیں، آپ تمام علوم نقلیہ اور فنون عقلیہ سے فارغ تھے، نور الہدیٰ ابو الکرامات کی نسل سے تھے، جو شیخ جلال الدین مجرد کے اجلہ خلفا میں سے تھے، شیخ علی شیر بنگالی شاہ محمد غوثؒ سے بیعت وعقیدت رکھتے تھے، شرح نزہۃ الارواح میں خود لکھا ہے کہ جب جوان ہوا تو حق پرستی اور خدا شناسی کے درد نے دل کو گدگدایا، طلب وشوق میں گھر سے نکل پڑا ہر ایک شناسائے درد سے اپنا درد کہتے، مگر مداوا نہ پاتے، بالآخر:۔

ایک رات قصبہ اودھ میں اسی اندیشہ کے اندر غنودگی پیدا ہوئی اور اس حالت میں غوث الاولیا قدس سرہٗ کی مثالی صورت مشاہدہ کی، اس مشاہدے نے مجھکو فریفتہ کر دیا، اب ان آرزؤں کا ہجوم ہوا کہ بیداری میں دولت ملازمت حاصل کی جاوے، اسی اثنا میں خبر ملی کہ غوث الاولیا آسودگان دہلی کی زیارت کے واسطے تشریف لائے ہیں، یہ سنکر بے تامل شہر دہلی کی طرف روانہ ہوا، جب موضع کیلوکھری میں پہنچا تو عالم بیداری میں وہی صورت نظر آئی، جو عالم مثال میں دیکھ چکا تھا، جب مدارج بیعت طے ہوئے تو مل گیا جس کی تلاش تھی، اور دیکھ لیا جو ملتا نہ تھا، اس کے بعد میں نے چند سال آپکے خدمت گزاروں میں کھڑے ہو کر کچھ فیض حاصل کیا،[۲]

شیخ علی شیر بنگالی کا انتقال ۹۷۰ھ کے کچھ بعد احمد آباد میں ہوا، خوابگاہ وہیں ہے۔

شیخ صدر الدین ذاکر | مولانا محمد غوثی نے آپکے حالات میں لکھا ہے کہ

---

[۱] گلزار ابرار (اردو) [۲] ایضاً ص ۳۰۹

آپ شیخ شمس کے بیٹے ہیں، اور نام محمد ہے، زاد بوم جاپانیر اور خوابگاہ بروودہ (بڑودہ) ہے
آپ کے آباء کرام سوداگری کے ذریعہ گزر اوقات کرتے تھے پچیس سال کی عمر میں ترک اور تجرید
کی توفیق ہوئی. ۹۵۲ھ قطب الاقطاب غوث الاولیاء کی خدمت میں پہنچ کر مرید ہوئے.....

جب آپ کے پیر بزرگوار نے گجرات سے گوالیار معاودت فرمائی تو آپ ہمراہ گئے. اور وہاں پر
جواہر خمسہ کو تمام و کمال عمل میں لائے، بعدہٗ خلافت کا خرقہ اور تمام مشہور سلسلوں کا اجازت نامہ
حاصل کرکے اپنے وطن میں رہنے کی اجازت لی ، ہجری ۹۸۹ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔[1]

شیخ شمس الدین شیرازی | آپ کا لقب اور تخلص زندہ دل تھا، شیراز کے رہنے والے تھے، فرمانروایان فارس
کی نسل سے تھے، جب حکومت بنی اعمام کے ہاتھ آئی تو آپ کے ساتھ انھوں نے اچھا سلوک نہیں کیا،
چارو ناچار والدہ کے مشورے سے ترک وطن کیا، والدہ نے دو نصیحتیں فرمائی تھیں :-

۱- اپنے دست بیعت سے ایسے بزرگ کا دامن پکڑنا جو زمانہ کا قطب اور غوث ہو.

۲- جب تک زندہ رہو واپس آنے کی کوشش نہ کرنا.

چنانچہ آپ لباس قلندرانہ پہنکر عراق و عرب کی طرف روانہ ہو گئے شہر شہر مرشد کامل کو تلاش کیا، وہاں
سے جزیرہ دیو آئے، یہاں ایک درویش سے ملاقات ہوئی جو غوث الاولیاء کے مرید تھے، انکی صحبت میں جذب کی کیفیت پیدا ہوئی.
اسی اثنا میں آپ کو اطلاع ملی کہ شیخ محمد غوث...... گوالیار سے ہجرت فرماکر احمد آباد تشریف لے آئے ہیں،
...... چنانچہ وہاں سے آپ احمد آباد پہنچے اور شرف بیعت حاصل کیا، تہذیب و تکمیل کے بعد آپ کو خاندان کا
صوبہ دکن کی رہنمائی کی اجازت ملی. مگر شیخ کی حیات میں آپ نے بیعت کرنے کی جرأت نہ کی، وفات کے
بعد شیخ عبد الغفور نامی جوان صالح کو بیعت کیا تھا.

مولانا محمد غوثی لکھتے ہیں کہ ایک سال درمیان دیگر شیخ کے روضۂ مبارک کی زیارت کے لیے

---

[1] گلزار ابرار (اردو)

گوالیار آیا کرتے تھے، راستہ میں خنڈو (انڈور) میں مولانا موصوف کے محل میں قیام کرتے تھے، مولانا موصوف علم اکسیر اور جفر میں شیخ شمس الدینؒ کے شاگرد تھے،

۹۰۶ھ سے گوالیار آنا ترک کر دیا تھا، ۹۱۰ھ میں آپنے انتقال کیا[1] شیخ عبد الغفور نے آپکے بعد اس سلسلے کو چلایا،

شیخ وودو اللہ شطاری | آپ شیخ معروف صدیقی کے بیٹے ہیں، اسم گرامی شیخ لاد ہے، ہمیشہ درویشانہ اور فقیرانہ بسر کی، آپکے اسلاف کا سلسلۂ نسب شیخ عبد الرحمن معتمن تک پہنچتا ہے، جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پوتے تھے،

شیخ وودو اللہ سلسلہ شطاریہ میں شیخ محمد غوثؒ سے بیعت تھے، کم وبیش بارہ سال اپنے پیر بزرگوار کی خدمت میں رہ کر شطاری مشرب کے اشغال واذکار کا طریقہ اور اسکی دعوت کی سند لی اور انکو عمل میں بھی لائے،

غوث الاولیاء نے جب گوالیار سے گجرات ہجرت فرمائی تو آپ بھی چلے آئے اور چند سال آشٹہ میں گوشہ نشین رہے، ۹۷۴ھ میں ترک سکونت کرکے مالوہ سے خاندیس میں قصبہ جاموڈ میں اقامت گزیں ہوئے،

شیخ عیسیٰ جند اللہ نے بھی آپ کی زیارت کی تھی، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں :-

ایک دفعہ مجھکو کسی تقریب سے اپنے مرشد شیخ لشکر محمد عارف کے ہمرکاب جاموڈ کے میدان میں جانے کا اتفاق ہوا تھا، وہاں شیخ وودو اللہ کی ملازمت بھی میسر ہوئی تھی، ہم نے ایک نورانی پیر دیکھا جس کی پیشانی سے ولایت وکرامت کے انوار دیکھنے والوں کی نظر کے سامنے عیاں تھے۔[2]

آپنے ۹۹۳ھ میں وفات پائی اور جاموڈ (خاندیس) ہی میں مدفون ہوئے،

شاہ منجھن | عبد اللہ بن قاضی خیر الدین کے فرزند رشید اور نجیب الطرفین تھے، آپکے جد امجد علامۃ العلماء قاضی تاج الدین، انکوی تھے اور نانا زبدۃ السادات قاضی سماء الدین دہلوی تھے، جو فتویٰ نویسی منصب عالی پر سرفراز تھے اور قتلغ خانی کے خطاب سے مشہور تھے۔

---

[1] گلزار ابرار (اردو) ص ۵-۲۰۴ [2] ایضاً ص ۳۸۶

شاہ منجھن کے شیخ طریقت تاج العرفا، شیخ تاج الدین بخاری ہیں، موصوف جب ہندستان تشریف لائے تو غوث الاولیاء کے دامن سے وابستہ ہوگئے، اور شطاریہ سلسلے میں خرقۂ خلافت واجازت حاصل کیا،

شیخ تاج الدین نے شاہ منجھن کو غوث الاولیا کی خدمت میں رہنے کی ہدایت وسفارش کی تھی۔ چنانچہ شاہ منجھنؒ نے غوث الاولیاء سے جواہر خمسہ پڑھی اور اس کو عمل میں لائے، غوث الاولیاء نے از راہ کرم وہ خرقہ عطا فرمایا جو کوہستان چنار کے زمانہ ریاضت میں زیب تن فرماتے تھے، اس خرقہ کے متعلق مولانا محمد غوثی لکھتے ہیں:-

ہجری ۱۰۱۱ھ میں آپ کے فرزند ارجمند شیخ عثمان کے ہاتھوں راقم نے بھی اس خرقہ کی زیارت کی تھی[۱]۔

شاہ منجھن، شیخ احمدی کے ہم درس تھے، تمام علوم متداولہ کا محققانہ درس دیتے تھے، حدود شرعیہ کا خاص لحاظ رکھتے تھے۔ پوری زندگی درس وتدریس ومطالعہ ومراقبہ میں گذری جس سال شیر شاہ سوری نے قلعہ رائے سین فتح کرکے اسلام آباد نام رکھا اس سال آپ اپنے وطن لکھنوتی سے چل کر اس قلعہ میں تشریف لائے، اور ایک زمانہ تک اس قلعہ کی شیخ الاسلامی اور خانقاہ داری کے منصب پر فائز رہے، جب قلعہ مذکور پر ہنود کا قبضہ ہوا تو آپ وہاں سے ترک سکونت کرکے سارنگ پور (مالوہ) چلے آئے اور یہاں مکان بنالیا، ان اطراف میں شاہ منجھن جیسا متبحر عالم موجود نہ تھا، بقول مولانا غوثی:-

آپ کے گرامی قدم کی برکت سے سارنگ پور شہر شیراز کی طرح دار العلوم بن گیا، اور بہت سے اہل کمال آدمیوں کے واسطے وہاں کی دامنگیر خاک سکونت کا باعث ہوئی[۲]،

شاہ منجھن آخر عمر میں آشتہ میں گوشہ نشین ہوگئے۔ یہ قصبہ سارنگ پور سے دو منزل کے فاصلے پر واقع ہے اور یہیں ماہ ربیع الاول ۱۰۰۱ھ میں آپ کا وصال ہوا[۳]،

مولانا محمد غوثی بھی شاہ منجھن کی زیارت سے مستفیض ہوئے تھے، گلزار ابرار میں اس طرح ذکر ہے:-

---

[۱] گلزار ابرار (اردو) ص ۳۷۳ [۲] ایضاً [۳] ایضاً ص ۳۷۳

جب ہجری ۹۶۸ھ میں مالک اقلیم، اکبر شاہ نے مالوہ کی طرف کوچ فرمایا تو صوبہ مالوہ کے تمام مشائخ ایک وجہ خاص سے لشکر میں فراہم کیے گئے، اس مجمع میں راقم کو شاہ منجھن کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا تھا، دیدار اور دست بوسی سے فیض پایا تھا[1]

شیخ عبدالحئی جیوہ | شاہ محمد غوثؒ کے اجلہ خلفاء میں ہیں، متوکلانہ زندگی بسر کی تسلیم و رضا کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا، شان بے نیازی یہاں تک تھی کہ ایک دن (بقول شیخ داؤد شطاری) حضرت شاہ محمد غوثؒ نے کچھ غلہ آپ کے پاس بھیجا، آپ نے لینے سے انکار کر دیا، دوبارہ بھیجا گیا، پھر انکار کر دیا، تیسری بار بھیجا تو ساتھ ہی یہ تہدیدی پیغام بھی آیا:-

"دفتر خلافت سے تمھارا نام کاٹ دوں گا"[2]

مگر شیخ جیوہ نے اپنے شیخ طریقت کو کیا متوکلانہ جواب دیا ہے، فرمایا:-

"پیر کی رہنمائی کی بدولت رد کے خوف کا اور قبول کی امید کا نقش خاطر درویش سے بالکل دھو دیا گیا ہے، یہ تہدیدی پیغام بھی نقش بر آب ہے"[3]

شاہ محمد غوثؒ کے پاس جب یہ جواب پہنچا تو آپ خود شیخ جیوہ کی قیام گاہ پر تشریف لائے اور بغلگیر ہو کر ارشاد فرمایا:-

عبدالحئی! استقامت اور ثابت قدمی کے منصب کا فرمان آج تمھارے نام نامی اور دستخط سے مکمل ہو گیا، اب تم الاستقامۃ فوق الکرامۃ کا علم طریقت کی معرکہ آرائی میں نصب کرو اور فاستقم کما امرت کا تاج افعال کے سر پر اور فقر کی ہفت کشور کی سلطنت اپنے اوپر مسلم سمجھو[4]

گوالیار میں شیخ جیوہ کے دربار میں لوگوں کا اژدحام لگا رہتا تھا، وہ اس سے بہت تنگ دل تھے، اس لیے مجبوراً ترک وطن کر کے دہلی آئے، یہاں بھی وہی ہجوم رہنے لگا، ناچار پانی پت روانہ ہوئے، وہاں بھی یہی بھیڑ بھاڑ رہی، آخر کار دریائے جمنا کے کنارے قصبہ بدولی میں گوشہ نشین ہو گئے اور غالباً یہیں وفات پائی،

---

[1] گلزار ابرار (اردو) ص ۳۱۳ [2] ایضاً ص ۴۰۴ [3] ایضاً [4] ایضاً ص ۵-۴۰۶

لفاء و متوسلین | شاہ محمد غوثؒ کے خلفاء و مریدین بیشمار ہیں، ان حضرات نے سلسلۂ شطاریہ کو ہند اور بیرون ہند
یلایا، ان کے حالات کے لیے مولانا محمد غوثی کی تصنیف گلزار ابرار مطالعہ کی جائے۔

گوالیار میں شاہ محمد غوث کے فرزند شیخ عبداللہ (م ۱۰۲۱ھ) مسند نشین ہوئے، شیخ مبارک اور شیخ
الزماں سمرقندی بھی یہیں تھے، اکبرآباد میں شاہ محمد غوث کے دوسرے فرزند شیخ نورالدین ضیاء اللہؒ
۱ھ/ ۱۵۹ء) مسند نشین تھے۔ شیخ عبداللہ صوفی بھی یہیں تھے، برہانپور (خاندیس) میں شیخ اکمل الدین برہان
لشکر محمد عارف (م ۹۹۳ھ/ ۱۵۸۵ء) اور سراج محمد بنیانی سلسلے کی اشاعت فرما رہے تھے، بڑودہ میں شیخ
الدین محمد شمس ذاکر (م ۹۸۹ھ/ ۱۵۸۱ء) اور شیخ حبیب شطاری فیض رساں تھے، احمد آباد میں شاہ محمد غوث
دو صاحبزادگان شیخ ادریس اور شیخ اسمٰعیل رونق افروز تھے۔ اعاظم خلفاء میں شیخ وجیہ الدین علوی اور
علی شیر بنگالی مستفیض فرما رہے تھے، سنبھل میں شیخ محمد عاشق، اجمیر میں مولانا عبدالفتاح ناگوری، سرہند
شیخ محمد جالی، بولپی میں شیخ جلال واصل، بدولی میں شیخ جیوہ عبدالحیٰ، بیجاپور میں شیخ شمس الدین شیرازی،
ن (مالوہ) میں شیخ احمد متوکل اور شیخ عالم، سارنگ پور میں شیخ منجھن، غرض سارے اطراف و اکناف میں
اء پھیلے ہوئے تھے اور سلسلۂ شطاریہ کی اشاعت پوری آب و تاب سے ہو رہی تھی، شاہ وجیہ الدین (م ۹۹۸ھ
خلیفہ شیخ صبغۃ اللہ بروجی (م ۱۰۱۵ھ/ ۱۶۰۶ء) نے مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کی اور اس سلسلہ کو حجاز میں پھیلایا
دوستان میں نقشبندیہ سلسلے کی اشاعت سے سلسلہ شطاریہ متاثر ہوا، تاہم سولھویں صدی عیسوی میں
صوص بنگال، بہار، مالوہ، گجرات میں اس سلسلے کی اہمیت کم نہ تھی، شاہ ولی اللہ اور ان کے استاد
خ ابوطاہر مدنی نے بھی شطاریہ اعمال و اشغال سیکھے تھے، (محمد اکرام: رود کوثر، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۸ء ص ۴۰-۴۱)

ہند و پاک میں صوفیائے کرام نے اشاعت اسلام کے سلسلے میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ
ہر من الشمس ہیں لیکن اس عظیم ملک میں زبان اردو کی نشو و نما اور فروغ میں ان حضرات کی مساعی کسی سے
م نہیں ہیں، اس حیثیت سے اگر ان کے ملفوظات کا مطالعہ کیا جائے تو دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، اس سلسلہ میں

شاہ محمد غوث اور ان کے خلفا شیخ وجیہ الدین علوی (م ۹۹۸ھ / ۱۵۸۹ء) لشکر محمد عارف (م ۹۹۳ھ / ۱۵۸۵ء) اور ان کے خلیفہ شیخ عیسیٰ جند اللہ (م ۱۰۳۱ھ / ۱۶۲۱ء) کے چند ملفوظات پیش کیے جاتے ہیں،

مقصود المراد (ملفوظات سید ہاشم علوی برادر زادہ شیخ وجیہ الدین) میں سید ہاشم علوی کی زبانی شاہ محمد غوثؒ کا یہ ہندی قول نقل کیا گیا ہے،

"بھیکی بچے خدا کو نہ میلے"

یعنی بھکاری کو خدا نہیں ملتا،

شیخ وجیہ الدین علوی کے ملفوظات جو ان کے مریدین نے بحر الحقائق کے نام سے مرتب کیے ہیں اس میں مریدین کی طرف سے چند سوالات فارسی میں ہیں لیکن شیخ وجیہ الدین کے جوابات ہندی میں ہیں، چند سوالات مع جوابات نقل کیے جاتے ہیں:-

(۱) فرمودند کہ "جس چیز میں ذوق وشوق پاوے اسے ترک نہ دیوے" یعنی در آں چیزے کہ صوفی ذوق وشوق یابد آں را ترک نہ دہد۔

شخصے گفت:- اگر آں چیز متفق الحرمت باشد، چہ کند؟ از اعراض نمودہ فرمودند:

"بھونڈا ہوے سونا کرے"

(۲) عزیزے عرض کرد، بخانۂ دنیا داراں تردم۔ فرمودند: "در کاہے دنیا دار بھی اپنچ" یعنی اہل دنیا نیز از ما اند۔

(۳) می فرمودند طالب کشف نباید شد۔ "اہنوں کو کیا کشف ہوئے یا نہ ہوئے، کام اس کا ہے"۔

(۴) در حکایت کردن فرمودند: "کیا ہوا جو بھوکوں مؤا، بھوکوں ہوئے تیں کیا خدا کو انپڑیا، خدا کو انپڑنے کی استعداد ہور"

(۵) کسے از ریاضت عرض کرد۔ فرمودند: "میں کہاں یا کدھاں ریاضت کیتی"؟

(۴۹) فرمودند: جیسی تجلی پکڑے تیسا ارادہ پاوے، اگر عبد کی تجلی پکڑے عبدیت ارادہ دیوے[1]

دوائح الانفاس میں شیخ لشکر محمد عارف کا ایک ہندی قول ملتا ہے، آپ کے خلیفہ شیخ عیسیٰ جند اللہ جب چلّہ سے فارغ ہو کر خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا:

"الحمد للہ بیمن توجہ حضرت ایشان ایں چلہ بتوکل تمام شد، حضرت جند اللہ ثانی ارعنہ (لشکر محمد) پارہ گرم شد، فرمودند:" اے بھائی ایں غریب بندہ کوں توکل کہاں، بخدا وند تعالےٰ سبحانہ را ہر زمانے باید آزمود"[2]

ایک مرتبہ شیخ برہان الدین راز الٰہی نے اپنے شیخ طریقت شیخ عیسیٰ سے دریافت کیا کہ "دنیا" کیا ہے آپ نے جواب میں یہ ہندی دوہا پڑھا:

جی ہر کوں بسراوے سہی
دنیا ناؤں اسی کا کہی[3]

(زبان اردو کے مشہور شاعر خان آرزو (م ۱۱۶۹ھ) شاہ محمد غوث ہی کی اولاد سے تھے، گوالیار سے دہلی آکر آباد ہو گئے تھے[4])

غرض صوفیائے کرام کے اس مقدس گروہ نے ہند و پاک کو ایک زبردست فکری اور لسانی سرمایہ دیا، ان حضرات کے احسانات ناقابل فراموش ہیں۔

---

[1] عبد الحق مرحوم: اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، مطبوعہ کراچی ۱۹۵۳ء ص ۳۵-۳۸

[2] عطاء اللہ راشد برہانپوری: تذکرۂ اولیائے دکن مطبوعہ کراچی ۱۹۶۳ء [3] ایضاً ص ۷۴

[4] شمس اللہ قادری: اردوئے قدیم مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۲۵ء

قرونِ وسطیٰ کا ایک عظیم مورخ

کشکولِ مسعودی

از
جناب مولوی شاہ محمد شبیر عطا صاحب ندوی

(۳)

مسعودی نے بعض بڑی نادر معلومات فراہم کی ہیں جو دلچسپی کے لحاظ سے پیش کی جارہی ہیں۔

۱۔ فوجی نظام۔ مسعودی کہتے ہیں: جنگی سیاست، تدبیر لشکر، تنظیم سپاہ، مقدار فوج اور اس کے اسماء و اصطلاحات سے جو لوگ باخبر ہیں، ان کے متعلق اس کے واقف کاروں کا یہ بیان ہے:

(۱) سرایا۔ (جمع سریہ) وہ فوجی دستے جن کی تعداد تین سو سے پانسو تک کے درمیان ہو، یہ رات کو نکلنے والی مہم ہے،

(۲) سوارب (جمع سارب)۔ دن کو نکلنے والی مہم،

(۳) مناسر (جمع منسر)، جس مہم میں پانسو سے زیادہ مگر آٹھ سو سے کم افراد ہوں،

(۴) جیش۔ جو آٹھ سو کی مہم ہو وہ جیش ہے اور یہ سب سے کم تعداد ہے جو کسی جیش میں ہو سکتی ہے،

(۵) خشخاش۔ وہ مہم جس میں آٹھ سو سے زیادہ اور ہزار سے کم افراد ہوں۔

(۶) جیش الآن۔ وہ مہم جس میں ایک ہزار افراد شرکت کریں۔

(۷) جیش جحفل۔ وہ مہم جس میں چار ہزار افراد شرکت کریں۔

(۸) جیش جرار ۔ وہ مہم جس میں بارہ ہزار افراد ہوں،

(۹) جرائد (جمع جریدہ) وہ سرایا و سوادب جو نکلنے کے بعد متفرق ہو جائیں اور چالیس نفر سے کم ہوں تو وہ جرائد کہے جائیں گے، (التنبیہ والاشراف ص ۲۷۹ و ۲۸۰)

(۱۰) مقانب (جمع مقنب)۔ جو دستہ چالیس سے لیکر تین سو سے کم پر مشتمل ہو،

(۱۱) جمرات (جمع جمرہ)۔ جو دستے تین سو سے لے کے کچھ زیادہ پانسو تک ہوں،

(۱۲) عصبہ۔ چالیس آدمی جس مہم میں شریک ہوں۔

(۱۳) کتیبہ ۔ وہ جمعیت جو منتشر نہ ہو۔

(۱۴) حضرہ۔ وہ لوگ جن سے دس یا دس سے کم کے ساتھ مقابلہ کیا جائے،

(۱۵) نفیضہ۔ وہ جماعت جس کے بل پر مقابلہ کیا جائے مگر بہ لحاظ تعداد جیش نہ ہو۔

(۱۶) ارعن۔ وہ جیش کثیر جو پہاڑ کی طرح ڈٹا ہو۔[1]

(۱۷) خمیس۔ جیش عظیم

(۱۸) جرار ۔ وہ فوج جو اپنی کثرت کے باعث بغیر اتبوہ کے کوچ نہ کرسکے۔ (التنبیہ والاشراف ص ۲۸۰)

(۲) عہد نبوت کے کاتبین اور ان کے مراتب | جو کاتب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو ہوتا وہی لکھتا بھی تھا، مندرجہ ذیل کاتب آپ کی خدمت میں رہے :-

(۱) حضرت خالد بن سعید بن العاص۔ پیشی کے کاتب تھے، ہر قسم کے کام جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آتے ان میں وہی کتابت کرتے تھے۔

(۲ و ۳) مغیرہ بن شعبہ اور حصین بن نمیر۔ یہ دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ضروریات لکھتے تھے۔

(۴ و ۵) حضرت عبداللہ بن ارقم اور حضرت علاء بن عقبہ۔ یہ دونوں قرض کے وثیقے، دستاویزیں،

---

[1] رعن پہاڑ کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو ناک کی طرح آگے نکلا ہو، اسی سے تفضیل کا صیغہ ارعن استعمال کیا گیا ہے۔

ہر قسم کے شرائط اور معاملات کے کاتب تھے۔

(۶، ۷) حضرت زبیر و حضرت جہیم بن الصلت - یہ دونوں زکوٰۃ و صدقات کے کاتب تھے۔

(۸) حضرت حذیفہ بن الیمان۔ حجاز کی آمدنی کا تخمینہ لکھتے تھے۔

(۹) حضرت معیقب بن ابی فاطمہ - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مال غنیمت کی کتابت کرتے تھے۔

(۱۰) حضرت زید بن ثابت انصاری۔ بادشاہوں کے نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین لکھتے تھے۔ اور آپ کی خدمت میں جو خطوط آتے تھے ان کا جواب دیتے تھے، ان کے فرائض میں یہ بھی تھا کہ فارسی رومی قبطی اور حبشی زبانوں کے خطوط کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ترجمہ کرتے تھے۔ حضرت زید نے یہ زبانیں ان غیر ملکیوں سے سیکھی تھیں جو مدینہ میں رہا کرتے تھے۔

(۱۱) حضرت حنظلہ بن ربیع - جب ان کاتبوں میں سے کسی شعبہ کا کوئی کاتب موجود نہ ہوتا تھا، ان کے فرائض میں یہ ان کی نیابت کرتے تھے، اور ان کا کام انجام دیتے تھے۔

(۱۲) عبداللہ بن سعد بن ابی سرح - انھوں نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ کی کتابت کی تھی، پھر مرتد ہوگئے (لیکن بعد کو پھر اسلام لے آئے)

(۱۳ و ۱۴ و ۱۵) شرحبیل بن حسنہ، ابان بن سعید، علاء بن حضرمی۔ ان تینوں نے بھی کبھی کبھی پیشگاہ نبوی میں کتابت کی تھی۔

(۱۶) حضرت معاویہؓ۔ وفات نبویؐ سے چند ماہ پیشتر معاویہؓ نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کتابت کی تھی۔ (التنبیہ والاشراف ص ۲۸۲ و ۲۸۳)

عباسیوں کی زرپاشی | مسعودی لکھتا ہے :۔ عباسی خلفاء کی تاریخ میں مہدی سے زیادہ فیاض، دریا دل بلکہ مسرف دوسرا خلیفہ نہ تھا، منصور اپنے زمانہ میں انتہائی کفایت شعاری سے کام لیکر بے کران دولت چھوڑ گیا تھا، جو امراء کے علاوہ خزانہ عامرہ میں ایک کروڑ چالیس لاکھ اشرفیاں اور ساٹھ کروڑ درہم تھے،

مہدی نے اسے بے دریغ صرف کر دیا، خزانہ خالی ہو گیا، اور ابو حارثہ خزانچی نے کنجیاں اس کے سامنے لا کر ڈال دیں کہ خالی خزانہ کے لیے کنجیوں کی کیا ضرورت ہے۔ (مروج الذہب ج ۶، ص ۲۲۱)

عباسیوں کا دور زریں اور ملک کی آسودہ حالی

ملک کی آسودہ حالی کے متعلق لکھتا ہے:۔ رعایا کی فارغ البالی، ملک کی آسودہ حالی اور عیش و تنعم کے سامان کی فراوانی کے اعتبار سے متوکل کا دور عباسی حکومت کا دور زریں تھا، اس کے زمانہ میں تمدنی نفاستیں اور نزاکتیں اس نقطہ پر پہنچ گئی تھیں جس کے بعد زوال کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔

متوکل کا زمانہ اپنی بھلائیوں، خوبیوں، سرسبزی و شادابی، فارغ البالی اور رفاہیت عیش کے لحاظ سے عہد سرور تھا، عوام و خواص سب اس سے خوش اور رضا مند تھے، اس کا زمانہ راستوں کے امن و امان، چیزوں کی ارزانی کے لحاظ سے بہترین دور تھا، اخراجات کی جس قدر کثرت اس کے زمانہ میں ہوئی اس قدر عباسیہ کے گذشتہ زمانہ میں نہ تھی، فوج، موالی، خدم وحشم کے اخراجات اور ان کے بڑے بڑے عطیے اور انعامات کے علاوہ متوکل نے ایک ارب درہم قصر جعفری کی تعمیر میں خرچ کیے، اور ان اخراجات کے بعد بھی چالیس لاکھ دینار اور ستر لاکھ درہم اپنے بعد چھوڑ گیا،[1]

زندہ عجائب خانے

چڑیا خانوں کی ایجاد کا سہرا بھی عباسیوں کے سر ہے، امیرالمومنین قاہر باللہ کو چمن بندی سے بڑا شغف تھا، اس نے ایک پر فضا باغ تیار کرایا تھا جس میں رنگ برنگ کے پھول اور درخت نصب تھے، اسی چمن کے وسط میں اس نے خوبصورت، خوش الحان پرندے سلطنت کے دور دراز مقامات سے منگا کر پالے تھے، جس میں قمری اور طوطی وغیرہ بہت سے پرندے تھے، اس باغ کا منظر بہت ہی دلفریب تھا، (مروج الذہب ج ۸، ص ۳۳۷)

خلیفہ کی دلچسپی دیکھ کر امراء کو بھی شوق ہوا، اور اکثر امیروں نے اس کو ترقی دی، ان کو

---

[1] تاریخ اسلام مولفہ شاہ معین الدین احمد ندوی ج ۳ تذکرہ متوکل بحوالہ مروج الذہب ج ۷، ص ۲۷۵

دیکھ کر شعراء کیوں پیچھے رہتے، چنانچہ مشہور شاعر ابن بسام نے ایک شاندار محل بنوا کر اس میں خوبصورت پرندوں کو چھوڑا،

اس زمانہ میں یہ شوق اتنا عام ہو گیا تھا کہ بغداد کی ایک سڑک کا نام شارع الاسد تھا، اور دوسری کا شارع الکبش۔ (مروج الذہب ج ۸ ص ۱۸)

کبوتروں کی ڈاک | کبوتروں سے پیام رسانی کا کام مہذب دنیا میں عرصہ تک لیا جاتا رہا، اور اب بھی جنگ کے زمانہ میں ان سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ مسعودی نے لکھا ہے کہ معتصم کو مشہور باغی بابک کی گرفتاری کی اطلاع کبوتر کے ذریعہ دی گئی تھی (مروج الذہب ج ۷، ص ۱۲۶)

پھولوں سے عشق | امیر المومنین معتضد باللہ عباسی نے ایک باغی درباری سے آخری خواہش دریافت کی کہ مرنے سے پہلے کیا چاہتے ہو؛ اس نے عرض کیا صرف ایک بار پھولوں سے لطف اندوز ہونے کی اجازت دی جائے۔ (مروج الذہب ج ۸ ص ۱۹۹)

تصویردار سکے | المسعودی نے لکھا ہے کہ الراضی باللہ عباسی کے زمانہ میں مشہور ترکی سپہ سالار بجکم (جو امیر الامراء کے عہدہ پر تھا) نے ایسے سکے ڈھلوائے تھے جن پر بجکم کی تصویر تھی، یہ سکے سونے کے تھے، اور ہر سکہ کا وزن دس مثقال تھا، سکہ کے ایک طرف امیر الامراء کی تصویر تھی اور دوسری طرف یہ اشعار کندہ تھے،

انما العز فاعلم۔ للامیر المعظم۔ سید الناس بجکم (مروج الذہب ج ۸ ص ۳۴۱)

توشہ خانے | عباسیوں کو قدیم نوادر، قیمتی اور کمیاب اشیاء کے جمع کرنے کا بڑا شوق تھا، ہارون رشید کے توشہ خانہ میں سابق اموی خلفاء کی پوشاکیں بڑے احتیاط سے رکھی ہوئی تھیں، ان ہی میں خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کی شاہی عبا بھی تھی، جسے ہارون نے ایک موقع پر اصمعی کو بخش دیا تھا، (ایضاً ج ۶ ص ۱۸)

حضرت امیر معاویہؓ کی ڈائری کا ایک ورق | حضرت معاویہؓ کے یومیہ معمولات مندرجہ ذیل تھے،

عام طور سے آپ عادت میں پانچ بار لوگوں کو باریاب کرتے، صبح کی نماز سے فارغ ہوتے ہی

بھی واقعات پڑھوا کر سنتے . پھر محلسرا تشریف لے جاتے اور قرآن مجید کی تلاوت کرتے (عام طور سے
ایک پارہ قرآن پڑھتے تھے) تلاوت سے فارغ ہوکر خانگی امور کے سلسلہ میں احکام صادر کرتے، اور چار رکعت
نفل پڑھنے کے بعد باہر آتے تھے، اس وقت صرف مخصوص لوگوں کو پیش کیا جاتا جن سے آپ گفتگو کرتے
اسی وقت وزرائے سلطنت حاضر ہوکر امور سلطنت کے متعلق احکام حاصل کرتے، دوران گفتگو ہی میں
ناشتہ کا وقت آجاتا اور آپ وہیں ناشتہ کرتے، ناشتہ کرتے جاتے اور گفتگو بھی ہوتی رہتی، ناشتہ میں عام طور
پر کبھی حلوان کا گوشت ہوتا یا پرندوں کا لذیذ گوشت ہوتا تھا، ناشتہ سے فارغ ہوکر کچھ دیر کے لیے
پھر محل میں تشریف لے جاتے. وہاں سے جب برآمد ہوتے تو خادم کو مسجد میں کرسی رکھنے کا حکم دیتے
خادم کرسی کو محراب مسجد سے ملا کر رکھدیتا آپ اس پر جلوہ افروز ہوتے (یہ گویا دربار عام تھا) اور آپ کے
سامنے فریادیوں کو پیش کیا جاتا، ہر شخص کو عام اجازت تھی کہ وہ بلا روک ٹوک آکر استغاثہ کر سکتا ہے
ان میں کمزور بھی ہوتے، لاوارث بھی ہوتے، اسوقت آنے والوں میں عرب کے صحرانشین بدوی ہوتے، بے یار و مددگار غریب
بیوہ عورتیں ہوتیں، جن کے ساتھ بچے بھی ہوتے تھے، ہر فریادی کے بارے میں آپ فرداً فرداً احکام
جاری کرتے، کوئی مظلوم ہوتا تو اسی وقت اس کی مدد کے لیے آدمی بھیجتے اور تمام آنے والے بامراد
واپس جاتے، ان قضیوں کو ختم کرکے جاکر مسند پر بیٹھتے اور حکم ہوتا کہ لوگوں کو ان کے مرتبہ اور رتبہ کے
لحاظ سے اندر آنے کی اجازت دیجائے، چنانچہ لوگ حسب مراتب آتے اور سلام عرض کرتے،
آپ خندہ پیشانی سے سلام کا جواب دیتے، اور مزاج پرسی کرنے والوں کے جواب میں الحمد للہ
کہتے، جب آنے والے باطمینان بیٹھ جاتے اور دربار جم جاتا تو آپ فرماتے (یہ دربار خاص تھا)
لوگو تم اس لیے معزز کہلاتے ہو کہ تم کو اس دربار میں شرکت کا اعزاز بخشا گیا ہے، اس لیے تمہارا
فرض ہے کہ ان لوگوں کی ضرورتیں اور حاجتیں میرے سامنے پیش کرو جن کی رسائی دربار میں نہیں ہوسکتی، اس کے جواب میں
کوئی امیر کھڑے ہوکر یہ عرض کرتا کہ فلاں شخص نے شہادت پائی، آپ فرماتے اس کے ورثا کے لیے

وظیفہ مقرر کر دیا جائے، کوئی اطلاع دیتا کہ فلاں شخص مفقود الخبر ہو گیا، آپ فرماتے اس کے گھر والوں کا خیال رکھا جائے، اس پیشی کا سلسلہ کھانے کے وقت تک جاری رہتا، اور آپ احکام صادر کرتے رہتے کہ کھانے کا وقت آتا تو دسترخوان وہیں لگا دیا جاتا، اس وقت آپ کا پرائیوٹ سکریٹری بھی آجاتا، آپ اس کو دسترخوان کے سامنے بیٹھنے کا حکم دیتے، اس وقت بھی آنے والوں کا سلسلہ جاری رہتا، ہر آنے والا تھوڑی دیر بیٹھتا اور آپ کے ساتھ شریک طعام ہو کر اپنی درخواست پیش کرتا، آپ اس پر حکم دیتے، اس طریقہ سے تقریباً چالیس آدمیوں کی باریابی دسترخوان ہی پر ہو جاتی، سکریٹری ہر شخص کی عرضی پڑھ کر سناتا جاتا تھا، اس کے بعد دسترخوان بڑھایا جاتا اور آپ ظہر کی نماز کے لیے تشریف لیجاتے، وہاں سے محل میں واپس جاکر چار رکعت نفل پڑھتے، پھر ایک مخصوص نشست ہوتی، اس موقع پر نفکہات بھی پیش کیے جاتے، اگر موسم سرما ہوتا تو خاص قسم کے کلچے، شیر مالیں اور اسی طرح کی دوسری چیزیں یا خشک میوے ہوتے، اور اگر گرم موسم ہوتا تو تازہ میوے ہوتے، آپ ان سے شغل بھی کرتے جاتے اور وزراے سلطنت کو ہدایتیں بھی دیتے جاتے، عام طور پر احکام جلد دیتے تھے، عصر تک یہ شغلہ رہتا عصر کی نماز سے فارغ ہو کر محلسرا جاتے، اس وقت کسی کو آپ سے ملنے کی اجازت نہ تھی، تھوڑی دیر کے بعد باہر تشریف لاتے اور مسند پر جا بیٹھتے، اس وقت پھر لوگوں کو حسب مراتب باریابی کی اجازت ہوتی، اسی وقت شام کا کھانا آجاتا، جس کا سلسلہ مغرب تک جاری رہتا، مغرب کی اذان سنکر نماز پڑھنے کے لیے مسجد تشریف لیجاتے، نماز کے بعد چار رکعت نفل پڑھتے اور ہر رکعت میں پچاس آیتیں تلاوت کرتے، نفل میں قرآن مجید آہستہ پڑھتے اور کبھی آواز کے ساتھ، پھر محلسرا میں جاتے، اس وقت کسی کے لیے ملنے کا موقع نہ ہوتا، وہاں سے عشا کی اذان کے بعد برآمد ہوتے، نماز سے فراغت کے بعد مخصوص حاشیہ نشینوں اور مصاحبوں کو شرف باریابی بخشتے، اس وقت وزرا سے بھی امور مملکت کے متعلق مشورہ کرتے، اس کے بعد ایک تہائی رات گئے تک عربوں کے قصے، ان کی قدیم جنگیں،

مجوسیوں کی داستانیں، ان کے بادشاہوں کا نظام حکمرانی اور گذشتہ قوموں کے حالات اور ان کی جنگی تدبیریں، وغیرہ وغیرہ پڑھوا کر سنتے، اس نشست میں اندر سے کچھ مٹھائیاں اور فواکہات آجاتے ان سے بھی شغل رہتا، اس کے بعد خوابگاہ میں تشریف لے جاتے، (مروج الذہب ج ۵ تذکرہ حضرت معاویہ)

المسعودی کے معاصرین المسعودی کے تعلقات جن علماء سے رہے ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے لیکن وہ اپنے معاصرین کی فضیلت کا پورا اعتراف کرتا ہے۔ اپنے نامور معاصر امام ابن جریر طبری کے متعلق اس نے بڑے شاندار الفاظ استعمال کیے ہیں، مشہور ادیب اور ماہر زبان ابن درید کا تذکرہ بہت اچھے الفاظ میں کیا ہے جغرافیہ والوں میں اس کا دوست ابوزید سیرافی تھا مسعودی نے اس کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کی اعتراف کیا ہے۔ مصر میں کافی عرصہ تک مسعودی کا قیام رہا، وہاں اس کے معاصر مورخوں میں امام ابن یونس مولف تاریخ مصر اور امام ابن یوسف الکندی مولف کتاب الولاۃ والقضاۃ تھے،

اس نے اکثر متکلمین کو دیکھا تھا، جن میں امام جبائی، امام ابوالحسن اشعری، امام ابوالقاسم بلخی، امام ابوالعباس الناشی، امام حسن ابن موسیٰ النوبختی وغیرہ قابل ذکر ہیں،

مسلم جہاز رانوں سے بھی اس کے تعلقات تھے، چنانچہ عبداللہ بن وزیر کے بارے میں لکھتا ہے

ولم یبق فی ھذا الوقت ابصر منہ بالبحر الرومی (مروج الذہب ج ا ص ۲۸۳)

المسعودی کا مذہب المسعودی کے مذہب کے بارہ میں مختلف رائیں ہیں، ایک روایت یہ ہے کہ وہ شیعی تھا، دوسری روایت یہ ہے کہ باطنی تھا، تیسری روایت یہ ہے کہ معتزلی تھا،

تیرھویں صدی کے مشہور شیعی مورخ مرزا محمد باقر خوانساری لکھتے ہیں

المسعودی المشتھر بین العامۃ بشیعی المذھب (روضات الجنات فی احوال العلماء والسادات ص ۳۷۹)

ریاض العلماء (جو شیعوں کی مشہور کتاب ہے) کے مصنف کا بیان ہے

الشیخ المسعودی من اصحابنا الامامیۃ مسعودی کا شمار علمائے امامیہ میں ہے

المعاصر للصدوق[1] وہ شیخ صادق کے معاصر تھے،

ایران کے ایک بڑے مجتہد ابو علی کربلائی رقمطراز ہیں:-

المسعودی هذا من اجلة العلماء	مسعودی مشاہیر متقدمین علمائے امامیہ میں بڑی
الامامیة من قدماء الفضلاء	جلیل القدر شخصیت کے مالک ہیں، اس کا
الاثنی عشریة ویدل علیه	ثبوت ان کی کتابوں اور تصنیفات کے
ملاحظة اسامی کتبه ومصنفاته[2]	ناموں ہی کے دیکھنے سے ملتا ہے،

ایک بڑے عالم فرقہ امامیہ جمال الدین مطہر نے اپنی کتاب "خلاصہ" کی پہلی فصل میں لکھا ہے، (اور اس کتاب یعنی خلاصہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صرف ثقات ہی کا تذکرہ ہے، یا ان حضرات کا جن پر ماہرین فن رجال کا اتفاق ہے کہ وہ ثقہ تھے،

له کتب فی الامامة وغیرها	مسعودی نے امامت کے مسئلہ پر کئی کتابیں لکھی
منها کتاب اثبات الوصیة لعلی	ہیں، ایک کتاب کتاب اثبات الوصیہ
بن ابی طالب[3]	بھی ہے۔

تاسیس الشیعۃ الکرام فی فنون الاسلام کے مصنف حسن الصدر لکھتے ہیں

وکان یستتر بالشافعیة فی المذهب	یعنی مسعودی اپنے کو بظاہر شافعی ظاہر کرتا تھا
مدة اقامته بمصر والشام	جبتک وہ مصر و شام میں مقیم رہا، حالانکہ وہ
(تاسیس الشیعۃ الکرام ص ۲۵۴	امامی تھا،

دوسری رائے یہ ہے کہ وہ باطنی تھا،

---

[1] ریاض العلماء بحوالہ روضات الجنات ومعجم المطبوعات العربیہ ص ۴۴۰، [2] منتہی المقال فی احوال الرجال بحوالہ تاسیس الشیعۃ الکرام ۲۵۴ [3] خلاصہ بحوالہ تاسیس الشیعۃ الکرام ص ۲۵۴

ڈاکٹر کردعلی لکھتے ہیں: "اگر مسعودی کا شیعہ ہونا ثابت ہو جاتا ہے تو اس سے ایک نتیجہ یہ بھی نکل سکتا ہے کہ وہ فاطمی تحریک سے متاثر تھا، یا خود اس کا داعی تھا، کیونکہ مسعودی کے زمانہ میں فاطمی تحریک بڑے منظم طریقہ پر وادی نیل میں جاری تھی، مشہور فاطمی جنرل جوہر صقلی کے مصر فتح کرنے سے پہلے ہی فاطمیوں کی خفیہ سازشیں مصر میں ہو رہی تھیں، اس لیے ہو سکتا ہے کہ مسعودی نے فاطمی تحریک کا مطالعہ کیا ہو اور اپنی خدمات فاطمیوں کے سامنے پیش کی ہوں، یا خود فاطمیوں نے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہو، کیونکہ مسعودی ایسا شخص تھا جس نے عباسیوں کا انحطاط اور ان کی گرتی ہوئی ساکھ کو محسوس کر لیا تھا۔ پھر مسعودی کا مذہب اس کو ترغیب دیتا تھا کہ وہ عباسیوں کے بجائے اہل بیت کو حکومت کی مسند پر دیکھے (حالانکہ مسعودی نے بظاہر کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے ہمارا یہ گمان صحیح ہو سکے) مسعودی نے اپنی کتاب التنبیہ والاشراف ۳۴۴ھ میں لکھی ہے، جب فاطمی حکومت ۲۹۶ھ میں افریقہ میں قائم ہو چکی تھی، پھر فاطمیوں نے ۳۰۱ھ ہی سے مصر پر حملے شروع کر دیے تھے، ان کے گماشتے اور داعی سارے بر اعظم افریقہ میں فاطمیت کی تبلیغ کرتے رہے، یہ میری ذاتی رائے ہے"۔[1]

تیسری رائے یہ ہے کہ وہ معتزلی تھا۔

امام جمال الدین ابو المحاسن یوسف ابن تغری بردی الاتابکی اپنی جلیل القدر تصنیف النجوم الزاہرۃ فی ملوک مصر والقاہرہ (جو مصر کی تاریخ پر سب سے مستند کتاب ہے، اور چونکہ مسعودی مصر میں رہ چکا تھا اور اس کا مدفن بھی وہیں ہے، اس لیے ابن تغری بردی کی معلومات زیادہ وقیع ہوں گی) میں مورخ اسلام امام شمس الدین الذہبی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ مسعودی معتزلی تھا۔[2]

امام تاج الدین السبکی طبقات الشافعیہ الکبریٰ میں مسعودی کو شافعی لکھتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ عقیدۃً وہ معتزلی تھا۔[3]

---

[1] کنوز الاجداد ص ۱۱۲ و ۱۱۳ [2] النجوم الزاہرہ فی ملوک مصر والقاہرہ ج ۳ ص ۳۱۶ [3] طبقات الشافعیہ الکبریٰ ج ۲ ص ۳۰۷

محمد بن شاکر کتبی فوات الوفیات میں لکھتے ہیں

قال الشیخ شمس الدین عدادہ	شیخ شمس الدین کا بیان ہو کہ اس کا شمار
فی البغدادیین (فوات الوفیات ج ۲ ص ۹۴)	بغدادیین میں ہے۔

یہاں شیخ شمس الدین سے امام ذہبی اور بغدادیین سے معتزلہ مراد ہیں، یہ ایک اصطلاح ہو

شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ مسعودی شیعی اور معتزلی تھا (لسان المیزان ج ۴ ص ۲۲۴)

اور مسعودی کی شیعیت کی دلیل میں لکھا ہے: ان علیا کان احب الخلق الیہ یعنی حضرت علی مسعودی کی نظر میں ساری دنیا سے زیادہ محبوب تھے ......

میری رائے | مندرجہ بالا تینوں رائیں ناظرین کے سامنے ہیں، جہاں تک میں نے مسعودی کا مطالعہ کیا ہے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مسعودی کا تعلق اعتزال سے تھا، اس کے دلائل حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ مسعودی کے متعلق امام تاج الدین سبکی نے اسکی تصریح کی ہے کہ وہ شافعی تھا اور شیعہ شافعی نہیں ہوتے،

۲۔ اکثر شیعی علما مسعودی کے شیعہ ہونے کے منکر ہیں، وہ کہتے ہیں، اگر مسعودی شیعہ ہوتا تو وہ شیعی نظریہ کے مطابق تاریخ بھی لکھتا لیکن اس نے اس کے برعکس شیعیت کی حمایت نہیں کی، ڈاکٹر کرد علی لکھتے ہیں

ولم یقبلہ بعض رجال الشیعۃ	شیعہ حضرات اس بنا پر مسعودی کو شیعیت کے
فی جملتھم لانہ ذکر فی مروج	زمرہ سے خارج کرتے ہیں کہ اس نے تاریخ
الذھب ایام خلافۃ الاول	نگاری کا وہ طرز اختیار کیا ہے جو شیعی مزاج کے
والثانی ثم خلافۃ علی ثم خلفاء	خلاف ہو، مسعودی نے مروج الذہب میں جس
بنی امیہ ثم بنی العباس وذکر	ترتیب سے خلفاء کے حالات لکھے ہیں اس ترتیب
سیرھم وآثارھم وقصصھم	ہی سے شیعوں کو اختلاف ہو، مسعودی نے
واخبارھم علی طریقۃ العامۃ	شیخین کی خلافت کا تذکرہ پہلے کیا ہے، پھر

ويعرفون بالعامة اهل السنة وبالخاصة الشيعة) ونحو تاريخهم من دون تعرض لذكر مساويهم وقبائحهم كظلمهم اهل البيت وغيره ذالك

حضرت علی کا تذکرہ کرتا ہے، اور خلفائے ثلاثہ کے بعد امویوں اور عباسیوں کا تذکرہ کرتا ہے (حالانکہ یہ سب شیعی نظریہ کے مطابق غاصب تھے) مسعودی نے خلفاء کے حالات، ان کے فضائل ومناقب بالکل اہل سنت کے نظریہ کے مطابق لکھے ہیں، اور اس نے ان مظالم کا تذکرہ تک نہیں کیا، جو یہ خلفاء اہل بیت پر کرتے رہے، اور خلفاء کی برائیوں کی پردہ پوشی کی ہے۔

(کنوز الاجداد ص ۱۱۲)

۳۔ مسعودی نے مروج الذہب میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تذکرہ جس عقیدت سے کیا ہے اور جو الفاظ اس کے قلم سے نکلے ہیں وہ کسی شیعی کی قلم سے نکل ہی نہیں سکتے، مروج الذہب کی جلد پنجم صفحہ ۱۲۰ پر لکھتا ہے

فلنذكر الآن جملا من فضائل الصحابة وغيرهم رضي الله عنهم اذ كانوا حجة على من بعدهم وقدوة لمن تاخر عنهم

اب ہم صحابہ وغیرہ رضی اللہ عنہم کے کچھ فضائل لکھتے ہیں، کیونکہ وہ اپنے بعد کے آنے والوں کے لیے حجت اور نمونہ تھے۔

۴۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں لکھتا ہے:۔ وانما سمى الفاروق لانه فرق بين الحق والباطل (مروج الذہب ج ۴ ص ۱۹۲)

آگے چل کر لکھتا ہے:۔ وہ (حضرت عمرؓ) بڑے متواضع تھے، موٹا جھوٹا کپڑا پہنتے تھے، اللہ

کے معاملہ میں بڑے سخت تھے، اور ان کے عمال خواہ وہ ان کے پاس موجود ہوں یا ان سے دور ہوں اپنے تمام افعال و عادات و خصائل و اخلاق میں ان کی پیروی کرتے تھے۔ اور اس عزت کے باوجود جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا کی تھی وہ اون کا، چمڑے وغیرہ کا پیوند لگا جبہ پہنتے تھے، کمبل اوڑھتے تھے۔ اپنے کندھے پر مشکیزہ اٹھاتے تھے۔ آپ کی سواری میں اونٹ ہوتا تھا جس کا جادہ کھجور کی کھال سے کسا ہوتا تھا، یہی حال ان کے عمال کا تھا، باوجودیکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی فتوحات اور مال میں وسعت عطا فرمائی تھی۔ (مروج الذہب ج ۴ ص ۱۹۳)

پھر صحابہ کرام میں افاضل صحابہ کا تذکرہ اس طریقہ سے کرتا ہے

قال بعض من تقدم من الشعراء	ایک شاعر جس نے عہد صحابہ دیکھا تھا، افاضل
فی صدر الاسلام یذکرھم	صحابہ کی ترتیب میں یہ اشعار کہے،

فیا سائلی عن خیار العباد — نصادفت ذا العلم و الخبرة

خیار العباد جمیعا قریش — وخیر قریش ذوو الھجرة

وخیر ذوی الھجرة السابقون — ثمانیة وحدھم نصرة

علی و عثمان ثم الزبیر — وطلحة واثنان من زھرة

وشیخان قد جاورا احمد — وجاور قبراھما قبره

فمن کان بعدھم فاخرا — فلا یذکرن عندھم فخره[1]

۵- حضرت امیر معاویہؓ کو کوئی شیعہ گوارا نہیں کر سکتا، لیکن مسعودی نے آپ کے فضائل و مناقب بھی بیان کیے ہیں، اس کو امیر معاویہ کے حالات سے اتنی دلچسپی تھی کہ اس نے آپ کے بارے میں جزئیات بھی نہیں چھوڑیں، ان کے شبانہ یوم کے معمولات کا حال اوپر گذر چکا ہے، ایک جگہ لکھتا ہے:۔

---

[1] مروج الذہب ج ۴ ص ۱۳۶ و ۱۳۷

وقبر معاویة یزار الی هذا الوقت ۳۳۲ سنة وعلیه بیت یبنی فتفتح کل یوم الاثنین والخمیس	حضرت معاویہؓ کی قبر کی زیارت آج تک کیجاتی ہے، یعنی ۳۳۲ھ تک (جس میں مسعودی نے اسے دیکھا تھا، اور اس پر ایک عمارت بنی ہوئی ہے (اسی مرقد ہے) جو ہفتہ میں دو بار دوشنبہ و جمعرات کو کھولی جاتی ہے۔
(مروج الذہب ج ۵ ص ۱۴)	

۶۔ وہ شیعوں کے برخلاف خلافت عباسیہ کے تنزل پر نوحہ خوانی کرتا ہے، (ایضاً ج ۲ ص ۸۲)

۷۔ قرامطہ پر اس نے لعنت بھیجی ہے (جبکہ قرامطہ اور فاطمیوں کا ربط تاریخ سے ثابت ہے) اگر مسعودی اسمٰعیلی ہوتا تو وہ اپنے ہم مشربوں پر لعنت نہ بھیجتا (مروج الذہب ج ۹) اس بنا پر ڈاکٹر کرد علی کا یہ کہنا کہ وہ اسماعیلی تھا محض قیاس ہے اور اس کا وہ کوئی قطعی ثبوت نہیں دے سکے

۸۔ مسعودی نے ایک کتاب کتاب الواجب فی الفروض اللوازم لکھی تھی، اس میں اس نے یہ ثابت کیا تھا کہ متعہ حرام ہے، اور غسل رجلین و مسح رجلین کی بحثیں بھی اس میں شامل ہیں، جو اس کے شیعہ نہ ہونے کا ایک بڑا ثبوت ہے (مروج الذہب ج ۵ ص ۱۸۹)

۹۔ شیعی علماء نے مسعودی کی شیعیت کی دلیل میں صرف یہی کہا ہے کہ اس کی تصنیفات میں امامت کے موضوع پر کئی کتابیں ہیں لیکن اس نے خارجیوں کے حالات میں بھی ایک کتاب لکھی ہے[1] (جس کا تذکرہ شیعی مورخین نہیں کرتے، کیا اس سے اس کی شیعیت پر استدلال صحیح ہوگا،

(لطیفہ) تاسیس الشیعۃ الکرام فی فنون الاسلام کے مصنف نے مسعودی کی تصنیفات کی فہرست لکھی ہے اس میں کتاب الزلفی کا بھی ذکر ہے، مصنف نے یہ سمجھکر کہ کتاب الزلف (یہ دونوں ایک ہی نام ہیں) یہ بھی کوئی امامت پر کتاب ہوگی، اس کا بھی تذکرہ کر دیا، حالانکہ یہ کتاب موسیقی پر ہے، مسعودی لکھتا ہے: "قد

---

[1] دیکھئے کشف الظنون ج ۱ ص ۷ و معجم الادباء ج ۵ ص ۱۴۹ و النجوم الزاہرہ ج ۳ ص ۳۱۶ و طبقات الشافعیۃ الکبری ج ۲ ص ۳۰۷ و مروج الذہب ج ۵ ص ۱۴۴

اشبعنا القول فی الموسیقا واصناف الملاهی واصناف الرقص والطرب والنغم ونسبة النغم وما استعملته کل امة من الامم من اصناف الملاهی من الیونانیین والروم والسریانیین والنبط والسند والهند والفرس وغیرهم الخ فی کتابنا المترجم بکتاب الزلف۔ (مروج الذهب ج ۴ ص ۳۲۶)

۱۰۔ شیعی علما کا یہ کہنا کہ مسعودی تقیہ کرتا تھا، واقعی قابل غور ہے، غالباً تاریخ کا ہر طالب علم یہ جانتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں شیعوں کو جتنا عروج حاصل ہوا ویسا کسی دور میں کم ہوا ہوگا، خلافت عباسیہ کے متولی بنی بویہ تھے، جن کی شیعیت پر سب کا اتفاق ہے۔

عراق سے قریب ہی حمدانیوں کی آزاد سلطنت تھی جس کا مشہور فرمانروا سیف الدولہ شیعی تھا، مصر میں اخشیدیوں کی حکومت تھی، اور خود اخشید کے تعلقات افریقہ کے فاطمیوں سے بڑے خوشگوار تھے، بلکہ اخشید کی لڑکی کی شادی فاطمی ولیعہد سے ہونے والی تھی،[۱]

پھر افریقہ میں ایک آزاد شیعی سلطنت قائم تھی، جس کا قبضہ مصر پر تو بعد میں ہوا لیکن اس کے اثرات پہلے ہی سے قائم تھے، اس لیے ایسے حالات اور ماحول میں مسعودی جیسے شخص کا شافعی مذہب اس لیے اختیار کرنا کہ اسے جان کا خوف تھا کچھ مضحکہ خیز سا معلوم ہوتا ہے۔

۱۱۔ ان سارے دلائل سے قطع نظر کرکے اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ مسعودی شیعہ تھا، تو وہ اس قسم کا شیعہ تھا جیسے قرون اولیٰ کے شیعہ ہوا کرتے تھے، جب شیعیت نام تھا صرف محبت اہل بیت کا، یا جیسا کہ امام احمد بن یحییٰ المرتضیٰ الیمانی نے لکھا ہے

کان التشیع یومئذ من یفضل	اس وقت شیعیت یہ تھی کہ حضرت علیؓ کو حضرت
علیا علی عثمان[۲]	عثمانؓ پر فضیلت دیتے تھے،

اور اس قسم کے شیعی علما میں امام نسائی اور امام حاکم نیشاپوری مصنف المستدرک علی الصحیحین اور

---

[۱] تاریخ الاسلام السیاسی مولفہ حسن ابراہیم حسن ج ۳ ص ۲۳۷، [۲] المنیۃ والامل ص ۲۸

دوسرے اہل سنت علما بھی آتے ہیں، اس میں مسعودی ہی کی کیا تخصیص ہے،

۱۱۔ مسعودی معتزلی تھا، اس کی تصریح مورخین نے کی ہے۔ اور اس نے خود معتزلہ کے بارے میں جوانکشافات کیے ہیں وہ صرف وہی شخص کرسکتا ہے جو اعتزال سے قریبی تعلق رکھتا ہو۔

۱۲۔ امام جبائی، امام ابوالقاسم بلخی، امام نوبختی، امام ابوالعباس الناشئی جیسے مشاہیر معتزلہ کا زمانہ اس نے پایا تھا، جن سے اس نے ضرور استفادہ کیا ہوگا،

۱۴۔ فوات الوفیات کے مصنف نے امام شمس الدین کے حوالہ سے لکھا ہے کہ وہ معتزلی مسلک رکھتا تھا، اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مسعودی محض مورخ ہی نہیں تھا، بلکہ معتزلی متکلم بھی تھا، چنانچہ اس نے علم کلام پر ضخیم کتابیں لکھی ہیں، افسوس ہے کہ اس کی تصنیفات ضائع ہوگئیں، ورنہ ان دلائل کی ضرورت نہ ہوتی، اور خود اس کی تصنیفات اس کی سب سے بڑی شاہد ہوتیں،

ایک ضروری اطلاع

معارف کے پاکستانی خریداروں کے لیے

پاکستان میں معارف کے جو خریدار ہیں، اور وہ اس کا چندہ ہندوستان نہیں بھیج سکتے، یا جو اپنے نام اب معارف جاری کرانا چاہتے ہیں وہ اس کا سالانہ چندہ مبلغ ۔۔۔ جناب یحییٰ احمد صاحب ہاشمی لکچرار اردو سندھ یونیورسٹی حیدرآباد (مغربی پاکستان) کے یہاں جمع کرکے اس کی رسید دار المصنفین اعظم گڈھ کو بھیج دیں تو معارف ان کے نام جاری ہو جائے گا،

منیجر

عربی کے ہندی الاصل الفاظ

مترجمہ جناب عبد الرؤف صاحب ایم اے لکچرار شعبۂ اردو کلکتہ یونیورسٹی

حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بھی عرب و ہند کے تعلقات میں اس موضوع پر لکھا ہے، اور بہت سے عربی کے ہندی الاصل الفاظ نقل کیے ہیں جن میں اس مضمون کے متعدد الفاظ بھی ہیں، لیکن پروفیسر حن پائے دت ایم اے ڈی فل شعبۂ تقابلی لسانیات کا مضمون بھی مفید ہے، اس لیے اس کا ترجمہ شائع کیا جاتا ہے۔ "م"

سہ حرفی مادوں کی امتیازی خصوصیت کے لحاظ سے عربی سامی خاندان کی زبانوں کی ایک شاخ ہے، بلکہ سامی خاندان کی السنہ میں بعض امور کے لحاظ سے صدر کی حیثیت رکھتی ہے، کیونکہ سامی خاندان کی تمام زبانوں کے لیے وہ بنیادی شکلیں مہیا کرتی ہے، عربی زبان کے دامن میں الفاظ کے جو ذخیرے موجود ہیں ان کے لحاظ سے دنیا کی کوئی زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اور اس اعتبار سے وہ ہماری خصوصی توجہ کی مستحق ہے، عرب جب متمدن دنیا کے ہر گوشے میں پھیلنے لگے تو ان کی زبان بھی فطری طور پر دنیا کی دوسری زبانوں سے قریب تر ہونے اور ان کا اثر قبول کرنے لگی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مختلف موجودہ بولیوں میں منقسم ہو گئی، ملک عرب کا جب دیگر ممالک سے سابقہ پڑا اور ان سے اس کے رشتے قائم ہوئے تو ان رشتوں کو سامی خاندان کی دیگر شاخوں کے ذریعہ برقرار رکھا گیا، اس لیے عرب کی زبان اپنے سامی النسل ہونے کی جبلی خصوصیات، پاکیزگی اور وسعت کو برقرار رکھ سکی اور دوسری سامی زبانوں کے مقابلے میں اس نے بیرونی اثرات کو بہت کم قبول کیا۔

مذاق ادب عربوں کی سرشت میں داخل ہے، عرب قوم شعروادب سے خواہ وہ تقریری ہو یا تحریری جس طرح اثر پذیر ہوتی ہے، غالبا دنیا کی کوئی قوم اس باب میں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی، عربی زبان اپنے بولنے والوں کو جو کیف واثر بخشتی ہے، کسی دوسری زبان کے بولنے والے شاید ہی اپنی زبان سے اس طرح محظوظ ہوتے ہوں، سامی النسل ہونے کے اعتبار سے قدیم عربوں نے نہ کسی عظیم فن کو جنم دیا اور نہ اس کی آبیاری کی، لیکن اپنی جمالیاتی حسیات کی ترجمانی کے لیے انھوں نے ایک راہ ڈھونڈلی اور وہ تھی ان کی قوت تحریر یا زور خطابت، جس طرح یونانیوں نے بت تراشی اور فن تعمیر کو جمالیاتی حس کے اظہار کا ذریعہ بنایا تھا، ٹھیک اسی طرح عربوں نے قصیدے کو اور یہودیوں نے حمد خوانی کو اپنے مذاق ادب کا ترجمان بنایا، عربوں کے یہاں ایک کہاوت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ "انسان کا حسن اس کی زبان کی فصاحت میں پوشیدہ ہے"۔ اسی طرح ایک دوسری ضرب المثل میں ہے کہ حکمت صرف تین چیزوں پر نازل ہوئی، یعنی "فرنگیوں کے دماغ، چینیوں کے ہاتھ اور عربوں کی زبان پر"۔ اپنی مخصوص ساخت کے اعتبار سے عربی نے نہایت ہی حسن کے ساتھ ایک جامع، فصیح اور پر لطف لب ولہجہ اختیار کرلیا،

عربی پہلے ہی سے ایک ترقی یافتہ زبان تھی، وہ ایسی قوموں کی زبان رہ چکی ہے جو اپنی ذہانت اور اولوالعزمی کے اعتبار سے اپنی ہم عصر دنیا سے بہت آگے تھیں، اس لیے مغربی زبانوں کے لیے عربی نے لفظوں کے ذخیرے مہیا کردیے، اور عربی زبان سے مستعار الفاظ ان زبانوں میں پہنچ کر ان کا جزو لاینفک بن گئے، ٹھیک اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ واضح انداز سے عربی نے مشرقی زبانوں مثلاً فارسی، ہندوستانی اور ترکی کو لفظوں کا خزانہ بخشا اور یورپ اور ایشیا کی اکثر وبیشتر مشہور زبانوں میں سائنس اور تجارت سے متعلق اصطلاحیں عربی زبان سے لی گئیں، اور ان زبانوں میں بہت سے لفظوں کی اصل عربی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی زبانیں خصوصاً اسپینی زبان عربوں کے زیر حکومت پروان چڑھی، اس کے علاوہ بحر روم کے ساحلی علاقوں میں بولی جانے والی دوسری زبانیں، مثلا

اطالوی، فرانسیسی وغیرہ صدیوں تک عربی سے استفادہ کرتی رہیں، بلکہ گمان غالب یہ ہے کہ روم اور یونان کی کلاسیکی زبانوں نے بھی عربی سے کسی حد تک استفادہ کیا ہوگا۔

عربوں کو اپنی زبان اور ادب کی جامعیت پر ہمیشہ ناز رہا ہے، اور اپنے مذہب اور کلچر کو انھوں نے دوسرے مذاہب اور کلچروں کے مقابلہ میں برتر سمجھا ہے، اس لیے ان کے دلوں میں کبھی یہ گمان بھی نہیں گزرا کہ ان کی زبان بھی دنیا کی دیگر اقوام بالخصوص ہندوستانیوں سے الفاظ مستعار لیے ہوں گے یہ واضح رہے کہ دنیا کی کوئی زبان بھی ایسی نہیں ہے جس میں دوسری زبانوں کے الفاظ موجود نہ ہوں، کیونکہ کوئی قوم ہمیشہ الگ تھلگ نہیں رہ سکتی، اور فطرت کا یہ قانون ہے کہ جب دو مختلف قومیں آپس میں ملتی اور ایک دوسرے سے قریب ہوتی ہیں، تو ان کے الفاظ بھی ایک دوسرے کی زبان میں داخل ہو جاتے ہیں، البتہ بعض اوقات ایسے لفظوں کی تعداد کم ہوتی ہے اور بعض اوقات زیادہ، اور جب ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں داخل ہوتے ہیں تو ان سے اس قوم کی برتری کا اظہار بھی ہوتا ہے جس کی زبان سے وہ الفاظ لیے جاتے ہیں، اگرچہ اس برتری کی نوعیت زمانے کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے۔

اس اصول کے اعتبار سے موجودہ اور کلاسیکی عربی میں بہت سے الفاظ غیر ملکی زبانوں کے ہیں، اور اس کے مزاج اور عناصر سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے ان میں تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں، جسے اصطلاح میں "تعریب" اور ایسے لفظوں کو "مولدہ" کہتے ہیں۔

سنسکرت اور عربی زبان میں کچھ خارجی مماثلت بھی ہے، مثلاً کلمہ کی تقسیم یا تثنیہ کا صیغہ دونوں میں مشترک ہیں لیکن زبان کی اندرونی ساخت کے اعتبار سے دونوں زبانیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، عربی زبان میں ہمیں چند الفاظ ایسے بھی ملتے ہیں جن کی اصل ہندوستانی ہے، ان میں سے بعض الفاظ عربوں اور ہندوستانیوں کے درمیان تجارتی تعلقات کی بنا پر داخل ہوئے اور بعض اس زمانہ کی یادگار ہیں جب عباسی خلفاء نے ہندو طبیبوں، نجومیوں اور ریاضی دانوں کو دعوت دیکر بغداد بلایا تھا،

زمانۂ قدیم میں ہندوستان اور ان بڑی سلطنتوں کے درمیان تعلقات قائم تھے جو عہد حاضر کے مشرق وسطیٰ میں واقع تھیں۔ اس حقیقت کی سب سے پہلی شہادت ہٹّٹ (Hettite) بادشاہوں کے کتبوں میں ملتی ہے، جن کا عہد ۱۴ تا ۱۵ صدی قبل مسیح ہے، ان بادشاہوں کے نام آریائی تھے اور وہ ان دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے جن کی آریا پرستش کرتے تھے، اور شکل و شباہت کے اعتبار سے بھی وہ پنجاب کے آریاؤں سے مماثلت رکھتے تھے۔ اُر کے مقام پر چاند کے مندر میں اور بنو خد نصر کے شاہی محل میں چھ صدی قبل مسیح ہندوستانی ٹیک (Teak) کے شہتیر لگائے گئے تھے۔

شالمانصر سوم (۸۰۰ قبل مسیح) کے تعمیر کردہ مینار پر ہندوستانی بن مانس اور بکری نما اونٹوں کی تصویریں کندہ ہیں۔

یہودیوں کی تاریخ کے بیان کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام (۱۰۰۰ قبل مسیح) کے عہد میں ٹائر (Tyre) کے بادشاہ ہیرام نے مشرق کے سفر کے لیے ایک بحری بیڑا روانہ کیا تھا جو واپسی کے وقت اپنے ساتھ سونا، چاندی، ہاتھی دانت، بن مانس، مور اور بہت سے المگ کے درخت اور قیمتی پتھر لے گیا تھا۔ جس بندرگاہ پر یہ سامان جہاز میں لادا گیا اس کا نام "اوپھر" تھا۔ بعض محققین کا کہنا ہے کہ یہ بندرگاہ ہندوستان میں واقع تھی اور غالباً اس کا نام "ابھیرا یا سپترا" ہوگا، مگر اس کی جائے وقوع کے بارے میں وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہ مسلم ہے کہ اوپر جن تجارتی اشیاء کا ذکر کیا گیا ہے ان کے ناموں کے اخذ ہندوستانی ہیں، مثلاً ہاتھی دانت کو یہودیوں کی کتاب میں "شین ہابن" کہا گیا ہے، جو سنسکرت "ابھادانتا" کا لفظی ترجمہ ہے۔ "المگ" سنسکرت یا تامل میں "وال گو" ہے۔ یونانی کا سانتالن (صندل، صندل کی لکڑی) سنسکرت "چندنا" سے ماخوذ ہے۔ بن مانس کے لیے جو لفظ استعمال کیا گیا ہے وہ عبرانی نہیں ہے، اس کیلئے لفظ "کوپھ" استعمال کیا گیا ہے جو غالباً سنسکرت لفظ "کاپی" کی ایک شکل ہے۔ مور کے لیے "تھوکی ام" استعمال کیا گیا ہے، تامل میں "توگئی" ہے۔ ہندوستانی ناموں کے اس استعمال سے واضح ہوتا ہے کہ ان لفظوں کی اصل ہندوستانی ہے۔

دوسری جانب رگ وید اور بدھ مت کے لٹریچر (مثلاً باوِرُو جاتکا، سمندا وانجا جاتکا، سوندری جاتکا وغیرہ) میں بحری سیاحتوں کا جابجا ذکر ملتا ہے، رگ وید اور بدھ مت کے لٹریچر کے جن حصوں میں عربی سیاحتوں کا ذکر ہے، اگرچہ وہ بہت پرانے نہیں ہیں لیکن قدیم روایات کا پتہ ضرور دیتے ہیں، اس میں کسی شک کی گنجایش نہیں کہ بحری تجارت ہندوستانی بندرگاہوں کے ذریعہ ہوتی تھی جن میں سے چند پرانی بندرگاہوں کے نام ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:-

دائیبل، نیرون (موجودہ حیدرآباد سندھ۔ پٹالا (دریائے سندھ کے دہانے پر)

سرپراکا۔ سوپارا - باری گازا۔ بھری گو کچھ، بھڑوچ

پائیٹھان۔ ٹگارا - دھروُز، کالینا (کالین)

سیمولا (چیمبر) موزیرس - نیل کنڈا - سیراسٹرا۔

ادی ایک - موردلیا۔ کوناگرھ - گنج

سکوکندیپ - تمرلپتی

ہندوستانی بحری بیڑے خلیج فارس سے گزرتے ہوئے ادینا، یودائمن، سیراف، قیس (کش)، ہرمز، ستوطرا (سنسکرت "سوکھاترا" عربی "الاسقوطرا" گیڈروسیا) تک پہنچتے تھے۔ پورے تین ہزار سال تک ہندوستان پرانی دنیا کا گویا دل بنا رہا، اور اس کے انداز فکر اور طرز معاشرت پر اثر انداز ہوتا رہا، پرانی دنیا میں بحری تجارت کے لحاظ سے جو ممالک نمایاں اور ممتاز سمجھے جاتے تھے، ہندوستان ان میں کسی سے پیچھے نہ تھا۔ عرب اور سقوطرا میں ہندوستانی تجارتی منڈیاں موجود تھیں، بلکہ عرب اور فارس کے تمام بڑے شہروں اور افریقہ کے ساحلی علاقوں میں بھی اس کی تجارتی منڈیاں موجود تھیں، اور ہندوستان کا تجارتی تعلق نہ صرف ایشیا بلکہ اس وقت کی پوری متمدن دنیا سے تھا، صدیوں تک ہندوستان پوری دنیا کو آرائش کا سامان بہم پہنچاتا رہا، اور اس لحاظ سے وہ ایک انفرادی حیثیت رکھتا تھا،

عرب . ہندوستان کو فرین کن سنس (ایک قسم کی خوشبو جو یہاں کے مندروں میں جلائی جاتی تھی)، بادام، خوشبودار گوند، موتی، کھجور، شراب وغیرہ بھیجا کرتا تھا. اور ہندوستان سے گول مرچ، پان، ہاتھی دانت، دارچینی، تیزپات، ادرک، زمرد، باریک ململ، عطریات، ہاتھی، صندل، لکڑیاں رنگنے کے مسالے، سینگ، آبنوس قیمتی پتھر مثلاً لعل، سنگ سلیمان، لاجورد اور جیسپر (رنگ برنگ کے قیمتی پتھر) وغیرہ، مشرق وسطی اور رومی، یونانی دنیا کو بھیجے جاتے تھے۔

اس طرح مسلمانوں کی فتح ہند سے صدیوں پیشتر مذکورہ بالا بندرگاہوں کے ذریعہ ہندوستانی الفاظ عربی زبان میں داخل ہوئے۔

اب ذیل میں ان عربی لفظوں کی ایک مختصر فہرست دی جاتی ہے جن کی اصل ہندوستانی ہے۔

سنسکرت	عربی
۱- چندن	صندل
۲- تنبولا (پان)	تنبول
۳- مُسکا	مسک
۴- کارپورا	کافور
۵- کانک پھلا	قرنفل
۶- پپلی	فلفل
۷- پوگا پھلا (سپاری)	فوفل
۸- "شرنگا بیرا" یا شرنگا ویرا	زنجبیل (ادرک خشک)
۹- نیلوت پلا	نیلوفر
۱۰- الاچی	ہیل

سنسکرت	عربی
۱۱۔ جاتی پھلا	جائفل
۱۲۔ تبری پھلا	اطریفل
۱۳۔ وی بھی تکا (ہیرا)	بلیلج
۱۴۔ ہری تکی	ہلیلج
۱۵۔ کارپاسا (روئی)	قرفس
۱۶۔ نیلا	نیلج
۱۷۔ پٹا (جوٹ)	فوطہ (دھاری دار کپڑا)
۱۸۔ موچکا	موز
۱۹۔ ناری کیلا	نارجیل
۲۰۔ آمرا (آم)	انبج
۲۱۔ نموکا (لیمو)	لیمون
۲۲۔ تیج پاترا	ساذج ہندی
۲۳۔ ویہا (زہر)	بیش
۲۴۔ کھنڈا	قند (فارسی) نبات (عربی)
۲۵ پلاتنا	فالودج
۲۶۔ شرکرا	شکر (فارسی) سکر (عربی)
۲۷۔ چترنگا	شطرنج (درمیانی پراکرت۔ شترنگ و فنجگین چار انگ یعنی ہاتھی، گھوڑا، رتھ اور گھڑسوار)

سنسکرت	عربی
۲۸ - تشٹا	طشت
۲۹ - وینا	دین
۳۰ - وَنشیکا	ونج (بانسری) اسی سے لفظ ونجک بنا ہے جس کے معنی تار والے ساز کے ہیں۔
۳۱ - مہیشا (بھینس)	جاموس
۳۲ - کاپی	کپی
۳۳ - تاوارارج (سفید شکر)	تبرزد ، طبرزد
۳۴ - ساکھا (درخت کی ٹہنی)	ساج (اصل میں یہ لفظ "ساگ" ہے۔ ایک قسم کی لکڑی جسے ٹیک کہتے ہیں)
۳۵ - تنبورہ	طنبورہ
۳۶ - توکی (مور، تامل)	طوفان ، طوطی ، طنبر ، طاؤس
۳۷ - سری مرا	سمور

جو الفاظ پہلے ہی سے عربی میں داخل تھے بعض اوقات عربوں نے ان میں لفظ "ہندی" کا اضافہ کر کے معرب کر لیا، مثلاً عود ہندی، قسط ہندی، تمر ہندی وغیرہ۔ جہازرانی سے متعلق عربی سیاحت ناموں اور جغرافیہ میں بھی نصف درجن الفاظ ایسے ملتے ہیں جن کی اصل ہندوستانی ہے۔ مثلاً باریجا (جمع بوارج، یعنی بحری ڈاکو) یہ لفظ "بیڑا" کی معرب شکل ہے، اس طرح لفظ ونج (جمع دوانج) ہے جس کے معنے چھوٹی کشتی کے ہیں، ہندوستانی میں یہ لفظ ڈونگی یا ڈینگی ہے۔
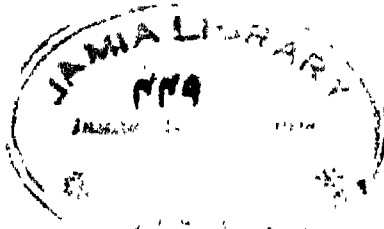
قائم چاندپوری کا تذکرہ
"مخزنِ نکات"

از جناب ڈاکٹر محمد عرفان صاحب لکچرار شبلی کالج اعظم گڈھ

قائم چاندپوری ان شعراء میں سے ہیں جن کی وہ شہرت نہ ہوسکی جس کے وہ مستحق تھے، قائم، میرؔ، سوداؔ، اور دردؔ کے دور کے شعرا میں ہیں، اس لیے ان کی شاعری میں بھی تقریباً وہی خصوصیات ملتی ہیں جو اس دور کا خاصہ تھیں لیکن چند وجوہ کی بناپر نہ ان کو مقبولیت حاصل ہوسکی اور نہ ان کا کلام شائع ہوسکا، قائم نے دیوان کے علاوہ ایک تذکرہ مخزن نکات بھی یادگار چھوڑا ہے، یہ تذکرہ انجمن ترقی اردو سے مولوی عبدالحق صاحب مرحوم نے شائع کیا ہے اس مضمون میں اسی تذکرہ کی نسبت کچھ اظہار خیال کرنا ہے۔

تذکرہ نویسی اپنے ابتدائی دور میں فارسی تذکرہ نویسی کی نقل رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب اردو شعرا کے تذکرے مرتب ہونے لگے تو ان میں نہ صرف اصول تصنیف میں فارسی تذکروں کی تقلید کی گئی بلکہ ان تذکروں کی زبان بھی فارسی ہی رہی، چنانچہ گارساں دی تاسی[1] نے کم و بیش ایسے ۱۱۳ تذکروں اور بیاضوں کا ذکر کیا ہے، ان میں صرف چھ تذکرے ایسے ہیں جو اردو میں لکھے گئے ہیں، باقی سب کی زبان فارسی ہے، ہماری تذکرہ نویسی کی یہ بدقسمتی ہے کہ اس میں شاعری کی طرح نقل و تکرار کی کثرت ہے، ہر دور میں صرف ایک دو تذکرے ایسے نکلتے ہیں جن کو ہم حقیقی معنوں میں اوریجنل کہہ سکتے ہیں، در اصل

---

[1] خطبات گارساں دی تاسی

یہی تذکرے مرکزی اہمیت رکھتے ہیں، ڈاکٹر سید عبد اللہ نے تذکرہ نویسی کے ادوار قائم کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

"اردو تذکرہ نویسی اپنے ارتقائی سفر میں تین بڑے مراحل سے گذرتی ہے، میر تقی میر کا نکات الشعرا پہلا بانگ سیل ہے، دوسرا دور گلزار ابراہیم سے شروع ہوتا ہے جس میں تذکرہ نویسی پر جدید اثرات کا پرتو پڑتا ہے، اس لیے کہ یہ کتاب کسی حد تک جدید ماحول میں لکھی جاتی ہے، اور اس میں بعض ایسی خصوصیات نظر آتی ہیں جو سابقہ تذکروں میں مفقود تھیں، کریم الدین کے تذکرہ شعرا کی اشاعت سے تذکرہ نویسی میں لٹریری ہسٹری کا رجحان پیدا ہوتا ہے (مخزن نکات میں بھی یہ میلان موجود ہے گمر (دھیما) مولانا آزاد کی کتاب آب حیات میں تذکرہ کی خصوصیات کم سے کم پائی جاتی ہیں، اور یہ اردو شاعری کی پہلی حقیقی تاریخ ہے۔"

اردو کے قدیم تذکروں میں اولیت کس تذکرہ کو حاصل ہے، اس سلسلہ میں بہت سے لوگوں نے تحقیق کی ہے، دی تاسی کا خیال ہے کہ "میر تقی میر کے تذکرے سے بھی پہلے کئی تذکرے موجود رہے ہوں گے۔[۲] مولوی عبد الحق صاحب نے پوری تحقیق کے بعد لکھا ہے :۔

"چند تذکرے میر صاحب سے قبل بھی لکھے گئے تھے، مثلاً تذکرہ سید امام الدین خاں بعہد محمد شاہ جس کا حوالہ میر حسن نے اپنے تذکرے میں دیا ہے، تذکرہ خان آرزو مگر یہ تذکرہ فارسی شعرا کا ہے، تذکرہ سودا، اس کا حوالہ دو جگہ قدرت اللہ قاسم نے اپنے تذکرے مجموعہ نغز میں دیا ہے۔"

لیکن اب امام الدین خاں آرزو سودا اور خاکسار کے تذکرے موجود نہیں ہیں، اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت جتنے تذکرے موجود ہیں ان میں تذکرہ نکات الشعرا کو تقدم حاصل ہے، حالانکہ قائم نے مخزن نکات میں اولیت کا دعویٰ کیا ہے[۴]۔

"منتخب نماند کہ تا حال اعلان در ذکر بیان اشعار و احوال شعراے ریختہ کتابے تصنیف نگردیدہ و تا ایں زماں ہیچ انساں از ماجراے شوق، از زمرۂ سخن دراں دریں فن مصطرے تالیف

---

[۱] شعراے اردو کے تذکرے، ص ۱۱ [۲] خطبات ص ۳۰، ۴۸ [۳] دیباچہ نکات الشعرا، ص ۵ [۴] تذکرہ مخزن نکات

درسانیده، بنا برین فقیر مولف محمد قیام الدین عبد کوشش تام وسعیٔ تمام در داوین این اعزا فراہم آوردہ یادۂ ابیات از ہر کدام برسبیل یادگار در ذیل این بیاض کہ بہ مخزن نکات موسوم است بقید قلم در آوردہ"

ڈاکٹر عبد الحق نے قائم کے تذکرے کے دیباچے میں لکھا ہے:-

"اکثر تذکرہ نویسوں نے ان کے تذکرۂ شعرا کا ذکر کیا ہے، جو اب تک نایاب تھا، اور اب شائع کیا جاتا ہے۔ قائم کا دعویٰ ہے کہ اس سے قبل کوئی تذکرہ شعراے ریختہ کے بیان میں نہیں لکھا گیا، یہ دعویٰ صحیح نہیں معلوم ہوتا"

ڈاکٹر عبد الحق نے اپنی تحقیق کی بنا پر میر تقی میر کے تذکرۂ نکات الشعرا کا سن تصنیف ۱۱۶۵ھ بتایا ہے، تذکرۂ ریختہ گویان کا سنہ تصنیف ۱۱۶۶ھ اور مخزن نکات کا سنہ تصنیف ۱۱۶۸ھ بتایا ہے، جو اس کے نام سے نکلتا ہے، مولوی عبد الحق صاحب کی اس تحقیق کو تسلیم کر لینے پر بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قائم کو میر کے تذکرے کی اطلاع نہ تھی تو پھر دونوں تذکروں کی بعض عبارتوں میں یکسانی کہاں سے آگئی ہے، اگر ہم دونوں تذکروں کی شروع کی عبارت کا مقابلہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ جہاں میر تقی میر نے فارسی الفاظ استعمال کیے ہیں وہاں قائم نے عربی الفاظ استعمال کیے ہیں، اس کے علاوہ جس جگہ ریختہ کی تعریف کی گئی ہے اور اس کی اقسام بتائی گئی ہیں وہاں بھی دونوں تذکروں کی عبارتیں ملتی ہیں، اسی لیے غضنفر صاحب نے لکھا ہے

معلوم ہوتا ہے کہ چراغ سے چراغ جلا ہے، خواہ میر صاحب کا تذکرہ پیش نظر ہو یا میر صاحب سے زبانی گفتگو میں یہ بحث منقح ہوئی یا عام طور سے شعرا میں ریختہ کی یہ قسمیں مشہور ہوں[۱]،

قائم کے تذکرے مخزن نکات پر تنقید کرتے ہوئے سعیدی صاحب نے قائم کے دعویٰ اولیت کو نہیں مانتے، ان کا خیال ہے کہ قائم نے اولیت کا جو دعویٰ کیا ہے وہ غلط معلوم ہوتا ہے، کیونکہ دونوں تذکروں کے

---

[۱] معاصر "جنوری و اپریل ۱۹۵۱ء ص ۱۵۹،

مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نکات الشعرا کی تالیف کے وقت بعض شعراء بقید حیات تھے، جو مخزن نکات کی تصنیف کے وقت وفات پاچکے تھے۔ اس لیے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قائم کا تذکرہ میر تقی میر کے تذکرے سے موخر ہے، مگر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قائم اس سے کیوں بے خبر رہے، اور اس صورت میں جب دونوں کی عبارتوں کو ہم یکساں پاتے ہیں، کیسے کہا جاسکتا ہے کہ قائم نے میر کے تذکرہ کو نہیں دیکھا تھا، پھر انھوں نے اپنی اولیت کا دعویٰ کیسے کر دیا، اس سلسلہ میں ہمیں تھوڑی سی قیاس آرائی سے کام لینا پڑیگا، میر اور فتح علی گردیزی کے تذکروں میں زمانی ترتیب کا لحاظ کیے بغیر شعراء کا ذکر کیا گیا ہے، اس لیے قائم انکو بیاض سمجھتے تھے، تذکرہ نہیں مانتے تھے، اس لیے انھوں نے اپنے تذکرہ میں تاریخی ادوار کی ترتیب سے شاعروں کا حال لکھا ہے، اور اس نقطۂ نظر سے انھوں نے اپنے تذکرہ کو اردو کا پہلا تذکرہ مانا ہے، یا پھر یہ مان لیا جائے کہ دونوں تذکرے لکھے جاچکے تھے مگر ان کی اشاعت نہیں ہوئی تھی، اس لیے قائم نے ان سے لاعلمی ظاہر کی، مگر اس کے مقابلہ میں پہلا قیاس درست معلوم ہوتا ہے،

سید صاحب نے اپنے مضمون میں قائم کے تذکرہ پر رائے دیتے ہوئے لکھا ہے:

"کل شاعر جن کی تعداد اس میں درج ہے، ایک سو دس ہے۔"[۲]

لیکن یہ بیان درست نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ مولوی عبدالحق نے تذکرے کے دیباچے میں لکھا ہے" اس میں قائم سمیت ۱۱۴ شعرا کا تذکرہ ہے۔"[۳] ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی یہی لکھا ہے۔[۴] قائم نے اس تذکرہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، طبقۂ اول میں متقدمین کا، طبقۂ دوم میں متوسطین کا اور طبقۂ سوم میں متاخرین کا ذکر ہے، ہر طبقے کے شروع میں اس طبقے کے شعرا کی خصوصیت کا مختصر ذکر ہے، اور ان کی رائے اس بارے میں بہت صحیح، واضح اور صاف ہے، تذکرہ نگاری میں یہ تاریخی احساس سب سے پہلے قائم کو ہوا، اور یہی احساس ادب کی تاریخ نگاری کی جانب ہے، جو آگے چل کر آب حیات کی شکل میں ظاہر ہوا،

---

[۱] نگار ستمبر ۱۹۵۳ء ص ۱۰ [۲] دیباچہ مخزن نکات ص ۹ [۳] شعرائے اردو کے تذکرے ص ۲۶۴

سید محمد صاحب نے گلشن گفتار کے دیباچہ میں لکھا ہے "پروفیسر آزاد نے اسی کتاب کے نونوں کو بھیاکر اپنی عبارت آرائی کی ہے۔"

طبقۂ اول میں قائم نے ابتدا سعدی سے کی ہے اور اختتام میر جعفر پر کیا ہے، طبقۂ اول کے بیشتر شعراء دکنی ہیں، یوں تو میر تقی میر نے بھی دکن کے شعراء کا ذکر کیا ہے، لیکن قائم نے اس کا زیادہ اہتمام کیا ہے۔ انھوں نے عبد اللہ قطب شاہ کے عہد سے شاعری کی ابتدا کی ہے، جو صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس سے پہلے سلطان قلی قطب شاہ اور محمد قلی بڑے شاعر گذر چکے تھے، اگرچہ قائم دکنی ریختے کے زیادہ قائل نہ تھے، لیکن انھوں نے اس کو خاص اہمیت دی ہے۔ انھوں نے طبقۂ اول کی ابتدا سعدی سے کی ہے، اور ایسے بہت سے شعراء کا ذکر کیا ہے جن کو میر تقی میر نے اپنے تذکرہ میں شامل نہیں کیا تھا، یہ سب ابوالحسن تانا شاہ کے معاصر تھے، قائم ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"برشناسائے اسلوب سخن مخفی و محتجب نیست کہ از عہد عبد اللہ قطب شاہ گرفتہ تا زمانۂ بہادر شاہ کسانے کہ شعرائے ریختہ اند سخن کلام ایشاں بسیار مربوط و معقول است ہرچند کہ الفاظ غیر مانوس گوش مردم مستعمل ایشان است لیکن چوں موافق زبان دکنی است درست است۔"[1]

سعدی کے بارے میں لکھا ہے کہ جب وہ گجرات آئے تو یہاں زبان سے واقفیت حاصل کرکے ایک دو غزلیں ریختے میں لکھیں، مگر قائم کی یہ رائے غلط ہے۔ ڈاکٹر عبد الحق اور ڈاکٹر سید عبد اللہ دونوں نے اس سے اختلاف کیا ہے،[2] معلوم ہوتا ہے قائم، سعدی کے سلسلے میں غلط فہمی کا شکار ہو گئے، اور انھوں نے سعدی دکنی کو سعدی شیرازی کے نام سے موسوم کر دیا، ورنہ انھوں نے ہر ایک تذکرہ نگار سے زیادہ دکنی شعراء کو اہمیت دی ہے۔

---

[1] مخزن نکات ص ۔ [2] دیکھیے دیباچۂ مخزن نکات ص ، و شعرائے اردو کے تذکرے ص ۴۳

مخزن نکات کا طبقۂ دوم سخن وران متوسطین کے بیان میں ہے، اس دور کی ابتدا قائم نے شاہ مبارک آبرو سے کی ہے، اور اختتام کمترین پر کیا ہے، کمترین کے متعلق لکھا ہے:۔

"در عالم ہزل گوئی و ہجو پردازی نظیر خود نداشت چنانچہ ہفت صد شعر در مذمت اہل حرفہ بسبیل شہر آشوب از وے یادگار است ہمیں سال از جہاں رفت۔"[1]

طبقۂ سوم شعرائے متاخرین کے بیان میں ہے، اس دور کی ابتدا امیر شمس الدین فقیر سے کی ہے اور اختتام خود اپنی ذات پر کیا ہے، اور خاکساری کی بنا پر اپنے حالات بہت مختصر لکھے ہیں، اپنا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"آلودۂ انواع جرائم فقیر مولف قیام الدین قائم ہر چند از باشندگان قصبۂ چاند پور است اما از بدو شعور تا ایں حال بتوسل نوکری بادشاہی بدار الخلافت شاہجہان آباد گذرانده و لیل و نہار بمقتضائے مناسبت بصحبت سخن سنجان عالی مقدار بسر بردہ۔"[2]

اس تذکرہ میں قائم نے جو انداز اختیار کیا ہے اس کی تعریف مولوی عبد الحق صاحب نے اس طرح کی ہے: "بیان صاف اور سیدھا ہے، عبارت آرائی اور تشبیہ و استعارہ سے کم کام لیا ہے۔"[3]

قائم کے تذکرہ کو تذکرہ نویسی کی تاریخ میں اولیت حاصل نہ سہی پھر بھی اس کو ایک نمایاں مقام ضرور حاصل ہے، ان کے تذکرہ سے ان کی تنقیدی و ادبی صلاحیتوں پر بھی روشنی پڑتی ہے، انھوں نے کسی نمونے کے بغیر تذکرہ نویسی کا کمال بڑی خوبی سے ظاہر کیا ہے، قائم کے تذکرہ کا اگر ہم اس دور کے دوسرے تذکروں سے تقابلی مطالعہ کریں تو قائم کی عظمت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ قائم کے تذکرے میں چند ایسی خوبیاں نظر آتی ہیں جو دوسرے تذکرہ نگاروں کے یہاں مفقود ہیں، مختصر الفاظ میں تنقید اور سیرت نگاری بہت ہی مشکل اور کسی روایت کے بغیر

---

[1] مخزن نکات ص ۲۲ [2] ایضاً ص ۱۱، [3] مقدمہ مخزن نکات ص ۱۔

رائے کا اظہار تنقیدی دیانت کا تقاضا ہے۔ اگر کوئی سیرت نگار یا نقاد اپنے موضوع کی صحیح تصویر کشی نہیں کرسکتا تو بقول ڈاکٹر جانسن اس کو ایسے موضوع کو ہاتھ ہی نہیں لگانا چاہیے، قائم نے اپنے تذکرے میں پوری دیانتداری سے کام لیا ہے، میر تقی میر کی طرح غرور و خودبینی کا شکار ہوکر نہ اپنے معاصروں کا مذاق اڑایا ہے اور نہ انکی تنقید میں طنز و تلخی ہے، دوسری طرف قائم نے فتح علی گردیزی کی طرح جوابی تذکرہ بھی نہیں لکھا ہے اور نہ دوسروں کا شکوہ کیا ہے۔ اور نہ اپنے دوستوں کی بے جا تعریف کی ہے، چنانچہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے میر تقی میر کی تعریف کرتے ہوئے قائم کی اس خوبی کا اعتراف کیا ہے کہ "قائم نے میر کی مخالفت کو اپنا صحیح نصب العین قرار نہیں دیا بلکہ اعتدال اور توازن کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ قائم خود بھی ایک بلند پایہ شاعر تھے، چنانچہ بعض لوگ ان کو سودا پر ترجیح دیتے ہیں، شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے تذکرے میں حسن ذوق کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے"[1]،

قائم کی تنقیدوں سے ان کے غیر جانبدارانہ صحیح ذوقِ تنقید کا پتہ چلتا ہے، یہ چیز نہ صرف اس دور کے تذکروں میں نایاب تھی، بلکہ دوسرے اور تیسرے دور کے تذکرے بھی اس عیب سے پاک نہیں، قائم کی اس سلسلہ میں جتنی تعریف کیجائے کم ہے، انھوں نے صحیح تذکرہ نویسی اور تنقید نگاری کا نمونہ پیش کیا ہے، اور ان کا تذکرہ اس حیثیت سے اردو تذکرہ نگاروں کے لیے مشعل راہ کا کام دیتا ہے، اور اردو تذکرہ نگاری کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز کرتا ہے لیکن افسوس ہے کہ اس دور میں اس تذکرہ کو خاطر خواہ شہرت حاصل نہ ہو سکی، اس لیے کہ اس کا مصنف ایک گمنام شاعر تھا، وہ میر تقی میر کی طرح مشہور عالم نہ تھا،

مخزن نکات کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ قائم نے اردو شاعری اور تنقید کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اپنے تذکرہ میں اردو شاعری کے مختلف ادوار قائم کرکے ہر دور کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے، میر تقی میر نے اپنے تذکرہ میں کچھ نیم تاریخی سی ترتیب رکھی ہے، مگر قائم نے اس معاملہ میں قدم

---

[1] شعرائے اردو کے تذکرے ص ۲۰۴

اصول بندی سے کام لیا ہے، جس کی صراحت ڈاکٹر عبداللہ نے بھی کی ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"قائم نے اس معاملے میں قدرے اصول بندی سے کام لیا ہے، اور ہر دور کے شروع میں اس دور کی خصوصیات بھی بیان کی ہیں، تذکرہ نگاری میں یہ تاریخی احساس تحریری بشری کی طرف رجحان کا پہلا قدم ہے، جو آگے چل کر آب حیات کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے"

قائم کے تذکرے کی یہی خوبی اس تذکرے کو تمام دوسرے تذکروں سے افضل بناتی ہے، اس خوبی نے اللہ تنقید کے میدان میں دوسرے نامور نقادوں کو راہ دکھائی ہے، یہ قائم کی ذہانت تھی کہ انھوں نے اپنے لیے ایسا راستہ نکالا جس پر ہر تذکرہ نگار نے چلنا ضروری سمجھا، قائم کی انفرادیت اور ذہانت کی بدولت تذکرہ مخزن نکات تنقیدی اصول کا نصاب بن گیا، اور جیسے جیسے تنقید کا علم وسیع ہوتا جائیگا اس کی قدر و منزلت بڑھتی جائے گی، اور وہ فن کے لحاظ سے بہترین تذکرہ مسلم ہو جائے گا، اسپرنگر (Sprenger) نے لکھا ہے "The book is the most valuable work for the early history of Hindustani literature"

مخزن نکات کی تیسری خوبی یہ ہے کہ قائم سے پہلے جو تذکرے لکھے گئے تھے، ان میں دکنی شعرا کو وہ جگہ دی گئی تھی جس کے وہ مستحق تھے، ان کے حالات کی فراہمی میں کوئی کاوش نہیں کی گئی تھی، میر تقی میر نے تو شعرائے دکن کو بالکل ساقط الاعتبار قرار دیا ہے فتح علی گردیزی نے اپنے تذکرے میں جو میر تقی میر کے تذکرہ کا جواب ہے، دکن کے ان شعرا کا ذکر نہیں کیا ہے، جن کے تخلص گنا کر میر صاحب نے شعرا کی فہرست طویل کی تھی، قائم نے اپنے تذکرہ میں اس کمی کی تلافی کرنے کی کوشش کی ہے، اور اپنے تذکرہ میں دکنی شعرا پر کافی روشنی ڈالی ہے، اس سے انھوں نے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ اردو شاعری صرف شمالی ہند کے شعرا کی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ اس میں دکنی شعرا کا بھی اہم حصہ ہے، ڈاکٹر عبدالحق مرحوم نے قائم کے تذکرہ کی اس خوبی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے "اگرچہ میر تقی میر نے بھی اپنے نکات الشعرا میں دکن

کے شعرا کا ذکر کیا ہے لیکن قائم نے اس کا زیادہ اہتمام کیا ہے"۔[۱]

قائم کے تذکرے کا میر تقی میر کے نکات الشعرا سے مقابلہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ میر اور قائم کے تذکروں میں مواد کے لحاظ سے زیادہ فرق نہیں لیکن تذکرہ نویسی کے اصول و معیار کے لحاظ سے قائم کا تذکرہ میر کے تذکرہ سے بڑھا ہوا ہے۔ میر کے یہاں وہ غیر جانبداری اور تاریخی شعور نہیں جو قائم کے تذکرے میں ہے، تاہم ایک چیز میں میر تقی میر، قائم سے بڑھے ہوئے ہیں، سیرت کی مصوری میں میر کو جو ید طولیٰ حاصل ہے وہ قائم کو نصیب نہیں، ان کے الفاظ نہایت جامع اور پر معنی ہوتے ہیں۔ فتح علی گردیزی کا تذکرہ صرف ایک جوابی تذکرہ ہے، جو میر تقی میر کے جواب میں لکھا گیا تھا، اس کی کوئی ادبی و تاریخی اہمیت نہیں اس میں بیشتر شعرا کا حال میر صاحب کے تذکرے سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے، اس کو قائم کے تذکرے سے دور کی بھی نسبت نہیں، دوسرے تذکرہ نگاروں کی طرح قائم نے نہ بیجا اعتراض کیا ہے اور نہ بے وجہ مدح سرائی کی ہے، بہت مختصر الفاظ میں شاعر کا تعارف کرایا ہے، اور اس کے کلام کی خوبی اور نقص کو واضح کیا ہے، یہ اختصار اس تذکرہ کی کمی ہے۔ لیکن اس میں قائم کا قصور نہیں اس دور کا چو انداز تھا۔ قائم نے بھی اسے برتا ہے قائم کے بھی دوست اور دشمن تھے۔ مگر انھوں نے اپنے تذکرہ میں دوستی یا دشمنی کی بنا پر کسی کو مقبول یا مردود قرار نہیں دیا ہے، جیسا کہ اکثر جگہ میر تقی میر اور فتح علی گردیزی نے کیا ہے ان خوبیوں کو پیش نظر رکھ کر تمام نقادوں نے مانا ہے کہ قائم کا تذکرہ اردو کے اولین تذکروں میں اپنی منصفانہ تنقید کی وجہ سے ایک نمایاں درجہ رکھتا ہے، یہی حقیقی معنوں میں پہلا تذکرہ ہے اور صحیح تنقید کا پہلا نمونہ ہے۔

---

[۱] دیباچہ مخزن نکات ص ۹

کچھ مطہر کے سلسلے میں

از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے

جناب پروفیسر سید حسن صاحب پٹنہ نے مطہر ہندی مداح فیروز تغلق اور عزالدین مطہر بن عبد اللہ الحسینی مداح شاہ شجاع فرمانروائے شیراز کو ایک ہی شخص ثابت کرنے کے سلسلے میں لکھا ہے:

"جنگ مذکور [وزیر تاج الدین احمد کی بیاض] میں اس [مطہر ایرانی] کا نام عزالدین لکھا ہے، مآثر الامراء اور تاریخ فرشتہ میں عہد فیروز شاہ کے ایک شاعر عزالدین کا نام لیا گیا ہے جس نے ٹھٹھہ کی فتح کے موقع پر بعض سنسکرت کی کتابوں کا نظم میں ترجمہ کرکے سلطان فیروز شاہ کو پیش کیا تھا، گمان ہوتا ہے کہ یہ وہی عزالدین شاعر ہے جس کا تخلص مطہر ہے، مطہر کا ایک قصیدہ بھی موجود ہے جو اس نے فتح کی تہنیت میں لکھا تھا۔"

دو باتیں قابل غور ہیں:۔

(۱) عہد فیروز شاہی کے مترجم شاعر کا نام "اعز الدین خالد خانی" تھا، نہ کہ عزالدین، (اگرچہ طبقات اکبری کے نولکشور ایڈیشن میں یہ نام "عزالدین خالد خانی" (بغیر الف قبل عزالدین) چھپا ہے، مگر تاریخ فرشتہ مطبوعہ نولکشور پریس میں یہ نام اعزالدین بن خالد خانی (باثبات الف قبل عزالدین) طبع ہوا ہے، مولانا عبد الحئی صاحب مرحوم نے بھی نزہتہ الخواطر (ج ۲ ص ۱۰) میں اسے اعزالدین ہی پڑھا ہے،

(۲) سنسکرت کتابوں کے ترجمہ کا واقعہ ٹھٹھہ کی فتح کے سلسلے میں (جس کی تہنیت میں مظہر نے قصیدہ لکھا تھا) پیش نہیں آیا بلکہ نگرکوٹ کی فتح کے موقع پر ظہور میں آیا تھا، چنانچہ تاریخ فرشتہ میں (جس کا پروفیسر صاحب نے حوالہ دیا ہے) لکھا ہے (ج ۱ ص ۱۴۷ - ۱۴۸)

"نگرکوٹ را بنام سلطان محمد تغلق شاہ مرحوم محمد آباد موسوم گردانید.... یکہزار و سی صد کتاب از براہمہ دریں بتخانہ است کہ بجوالا مکھی اشتہار دارد، پادشاہ علمائے آں طائفہ را طلب بعضے ازاں کتب را ترجمہ فرمود از انجملہ اعز الدین بن خالد خانی کہ از شعرائے آں عصر بود کتابے در حکمت طبیعی و شگون و تفاولات در سلک نظم کشیدہ دلائل فیروز شاہی نام کردہ است"

فرشتہ کا ماخذ نظام الدین ہروی کی طبقات اکبری ہے، نظام الدین نے لکھا ہے:-

"[بعد بناء حصار فیروزپور] از انجا بجانب نگرکوٹ توجہ فرمود...... راجہ نگرکوٹ بعد از محاصرہ و مجادلہ با فرزندان خود بخدمت سلطان شتافتہ غاشیۂ عبودیت بر دوش گرفت و سلطان او را نوازش کردہ نگرکوٹ را بنام سلطان محمد مرحوم محمد آباد موسوم گردانید دریں وقت بعرض سلطان رسانیدند کہ..... یکہزار و سی صد کتاب از براہمہ سلف دریں بتخانہ است کہ بجوالا مکھی اشتہار دارد۔ سلطان علمائے آں طائفہ را طلب نمود، بعضے ازاں کتب را ترجمہ فرمود۔ از جملہ عزالدین خالد خانی کہ از شعرائے عصر او بود کتابے در حکمت طبیعی و شگونات و تفاولات در سلک نظم در آوردہ دلائل فیروز شاہی نام کردہ است..... القصہ سلطان بعد از فتح نگرکوٹ بجانب ٹھٹھہ عزیمت نمود"

چونکہ مظہر ہندی نے فتح ٹھٹھہ کی تہنیت میں ایک قصیدہ لکھا تھا، نیز وزیر تاج الدین احمد کی بیاض میں مظہر ایرانی کا نام عزالدین بتایا گیا ہے، اسی لیے پروفیسر صاحب نے مظہر (ایرانی) اور مظہر (ہندی) کو ایک ثابت کرنے کے لیے شعوری یا غیر شعوری طور پر سنسکرت کتابوں کے منظوم ترجمہ کا واقعہ نگرکوٹ کے بجائے ٹھٹھہ کے ساتھ وابستہ کر دیا۔

ادبیات

خطاب بہ مسلم

از
جناب کریم الرضا خان صاحب وکیل شاہجہانپور

مسلم خوابیدہ او زندانیِ رنج و بلا ایک دل تیرا ہے مسکن حسرت و افسوس کا
ایک تو پر سعادت کا نہیں تجھ تک گذر ایک چھائی ہے ترے سر پر نحوست کی گھٹا
اک صلائے عام تھی دنیا کو فیاضی تری آج تو محتاج ہے غیروں کے اک اک جام کا
تیری محفل تک گذر ممکن نہ تھا جن کا کبھی آج تو ہے ان کے سنگِ آستاں پہ جبہہ سا

بے خبر تجھکو خبر ہے گردشِ ایام کی
تیری ہستی ہے اہانت عظمتِ اسلام کی

شوکتِ دیرینۂ مسلم کی بھی ہے تجھکو خبر کیا کبھی اسلاف کی تاریخ پر ڈالی نظر
رو رہے ہیں تجھکو غرناطہ کے ایوانِ کہن نوحہ خوانی کر رہے ہیں تیری ہستی کے کھنڈر
یاد کر وہ شان و شوکت دہلی و بغداد کی یاد کر عباسیوں کی سلطنت کا کرّ و فر
ناز تھا دنیا کو جس پہ ننگِ عالم ہو گیا یہ بھی اک قانونِ قدرت کا کرشمہ ہے مگر

آسماں تیار ہے تیرے مٹانے کے لیے
آج تو تصویرِ عبرت ہے زمانے کے لیے

جب دلوں میں جرأتِ اسکندری رہتی نہیں — قوم رہ جاتی ہے قومی زندگی رہتی نہیں

غیر کے چشمِ کرم پر ہو اگر تیری نظر — بندگی رہتی ہے شانِ سروری رہتی نہیں

مرکزیت قوم کی ہے وحدتِ فکر و عمل — قوم مرکز سے ہٹے تو قوم ہی رہتی نہیں

قوتِ بازوئے مسلم اعتقادِ ذاتِ حق — جب یہ مل جائیں تو مشکل کوئی بھی رہتی نہیں

اتحفند کے ساتھ خوفِ ماسوا او بوالہوس — قلبِ نامسلم میں روحِ حیدری رہتی نہیں

موت سے تیری حیاتِ جاوداں ڈرتا ہے کیوں
موت کے آنے سے پہلے آئے دن مرتا ہے کیوں

غزل

از جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری

قرباں ترے مزاجِ تغافل شعار کے — دل سے بھلا دیئے ہیں ستم روزگار کے

دردِ حیات کے نہ غمِ روزگار کے — مارے ہوئے ہیں ہم دلِ ناکردہ کار کے

بے کیف عمرِ خضر بھی لیکر میں کیا کروں — دو لمحے بھی بہت ہیں ترے انتظار کے

میں دیکھتا ہی رہ گیا حیرت سے چار سو — پردے میں چھپ گیا مجھے کوئی پکار کے

دم بھر میں آشنائے حقیقت بنا دیا — صدقے میں اپنی لغزشِ بے اختیار کے

اپنی تو زندگی ہے ازل سے خزاں نصیب — اپنی بلا سے آئیں اگر دن بہار کے

جوہر نہ پوچھ مرحلۂ پیچ و تابِ عشق
الجھے ہم اور گیسوئے جاناں سنوار کے

غزل

از جناب گویا جہان آبادی

قدم وہ رکھتے نہیں راہیں نشاں کے لیے
زمیں چاہیے اک اور آسماں کے لیے

ہجوم اشک و تبسم، جلوسِ ناز و نیاز
یہ اہتمام خدا جانے ہیں کہاں کے لیے

بشر کو اس لیے بخشا گیا غمِ سجدہ
بنا بھی تھی کوئی مطلوب لامکاں کے لیے

ہے بات ایک نظر کی، نہ کچھ زماں، نہ مکاں
یہ فاصلے ہیں فقط غم کے امتحاں کے لیے

چمن میں کرتے ہیں وہ برق آپ ہی پیدا
جو دل تڑپتے ہیں، تعمیر آشیاں کے لیے

بنا دیا ہے زبانِ جہاں خموشی کو
نوازشیں ہیں عجب اشک بے زباں کے لیے

نہیں ہے حسن و محبت میں کوئی پردہ اور
بس اک حجاب نظر کا ہے درمیاں کے لیے

ہے کس کے راز کی آواز دل کی آہوں میں
ہزاروں ساز ہیں بے صوت اک فغاں کے لیے

دلوں میں ضبطِ تبسم نہ کر سکے غنچے
قدم چمن میں بہار و نے جب خزاں کے لیے

وہ اشک بزمِ نظر میں خموش ہے گویا
زبانِ جلوۂ ساقی ہے جو بیاں کے لیے

باب التقریظ والانتقاد

نئے رسالے اور اخبارات

اقبال ریویو - مرتبہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین و خورشید احمد صاحبان، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت سالانہ ۶ فی پرچہ ۲ پتہ:- اقبال اکاڈمی، پاکستان کراچی،

یہ سہ ماہی رسالہ اقبال اکیڈمی کی جانب سے عرصہ سے نکل رہا ہے، اس کا مقصد ڈاکٹر اقبال کی زندگی، شاعری، حکمت، تعلیم، تاریخ، فلسفہ، ادب، سیاسیات، اخلاقیات، معاشیات، عمرانیات، نفسیات اور اسلامیات وغیرہ سے متعلق ان کے افکار و تصورات کی ترجمانی و تشریح اور ان کے پسندیدہ فنون و موضوعات پر محققانہ مقالات کی اشاعت ہے، اس کے انگریزی اور اردو اڈیشن نکلتے ہیں، اس کا ہر نمبر اقبالیات پر فکر انگیز اور محققانہ مضامین کے علاوہ مختلف النوع علمی و تحقیقاتی مضامین سے بھی مزین ہوتا ہے، اس زمانہ میں ایسے سنجیدہ اور معیاری رسالے بہت کم نظر آتے ہیں، خدا اس کی عمر دراز کرے اور اہل ذوق کو قدردانی کی توفیق دے۔

میثاق - مرتبہ مولانا امین احسن اصلاحی، کاغذ متوسط، کتابت و طباعت بہتر، قیمت سالانہ ۶ فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے، پتہ: منیجر ماہنامہ میثاق، رحمان پورہ، اچھرہ لاہور ۱۲ - ہندوستان میں:- منیجر ہفت روزہ ندائے ملت باغ گونگے نواب، لکھنؤ۔

مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے جماعت اسلامی سے الگ ہونے کے بعد یہ علمی و دینی رسالہ نکالا ہے۔

تدبر قرآن، مطالعہ حدیث، اجتماعیات و سیاسیات، مقالات، تراجم و اقتباسات، سیر و سوانح مراسلہ و مذاکرہ اور افادات فراہی وغیرہ اس کے مستقل عنوانات ہیں، بیشتر مضامین مفید، بلند پایہ اور دینی نوعیت کے ہوتے ہیں، فاضل مرتب کے قلم سے "تزکیۂ نفس" اور "اسلامی قانون" پر بہت مفید اور فاضلانہ مضامین نکل چکے ہیں، فتنۂ انکار حدیث کے خلاف مولانا عبد الغفار حسن کی مہم کامیابی کے ساتھ جاری ہے، اس میں احادیث کی دلنشین انداز میں تشریح بھی ہوتی ہے، اور منکرین حدیث کے اعتراضات اور شکوک کا جواب بھی ہوتا ہے، مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تفسیر نظام القرآن نامکمل ہے، اس لیے صاحب میثاق جو مولانا کے تلامذہ میں سب سے زیادہ ممتاز ہیں "تدبر قرآن" کے نام سے اسی نہج پر تفسیر لکھ رہے ہیں، جو بالالتزام میثاق میں شائع ہوتی ہے، اس طرح یہ رسالہ مختلف حیثیتوں سے مفید علمی و دینی خدمات انجام دے رہا ہے، اور اصحاب علم و دین کے مطالعہ کے لائق ہے۔

جامعہ - مرتبہ جناب عبد اللطیف صاحب اعظمی، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، سالانہ چندہ ستے، فی پرچہ ۵۰ ر، پتہ: رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

یادش بخیر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا یہ پرانا ماہنامہ ۱۳ سال کے بعد اب پھر اپنی سابقہ روایات اور خصوصیات کے ساتھ شائع ہو رہا ہے، اس میں جامعہ کے علاوہ مختلف اصحاب علم و قلم کے علمی تعلیمی، ادبی، ثقافتی اور سیاسی مختلف النوع مسائل و مباحث پر بلند پایہ مضامین شائع ہوتے ہیں، "حالات حاضرہ" کے عنوان سے سیاسی مسائل پر تبصرہ، اور کوائف جامعہ کے عنوان سے جامعہ کے حالات التزام کے ساتھ دیے جاتے ہیں، اہم شخصیتوں مثلاً جمال الدین افغانی، محمد عبدہ، زید رضا، ٹالسٹائی اور ابو الکلام آزاد پر مفید مضامین نکلتے رہتے ہیں، ظاہری نفاست و خوشنمائی سے بھی رسالہ آراستہ ہے، غرض دور اول کے جامعہ کی تمام خصوصیات اس میں موجود ہیں،

اردو نامہ - مرتبہ جناب جوش ملیح آبادی و شان الحق حقی، کاغذ معمولی، طباعت کتابت

خوبصورت ٹائپ، سالانہ قیمت سے ۶ فی پرچہ عہ پتہ: ترقی اردو بورڈ شاہراہ نیشنل پارک ڈاگ روڈ کراچی ۲۹

اردو لغت کی تدوین کے لیے کراچی میں جو بورڈ قائم کیا گیا ہے، اردو نامہ اس کا ترجمان ہے، اس کے لکھنے والے بیشتر مشاہیر اہل ادب ہیں، اس کی ادبی بحثیں بڑی ناقدانہ اور مبصرانہ ہوتی ہیں۔ ادبی و تحقیقی اور سوانحی مضامین کے علاوہ نادرات، شعبہ مطبوعات، شعبہ لغت اور اردو کی ترقی کے مسائل اس کے مستقل عنوانات ہیں، اردو لغت کی تدوین اور اس سے متعلق ادبی مباحث کے کچھ نمونے ہر نمبر میں دیے جاتے ہیں، اور اس سے متعلق اعتراضات و جوابات بھی شائع کیے جاتے ہیں، شعبہ مطبوعات کے عنوان سے کسی اہم ادبی کتاب کا تفصیلی جائزہ لیا جاتا ہے۔ اور "اردو کی ترقی کے مسائل" کے زیر عنوان اردو الفاظ کی رومن املا، اردو املا اور رسم الخط وغیرہ مسائل پر اس کے ماہرین رائے زنی کرتے ہیں، اس حیثیت سے یہ رسالہ اردو میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اور اردو زبان و ادب کے علمی و ادبی مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں کے مطالعہ کے لائق ہے۔

اردو ڈائجسٹ ۔ مرتبہ الطاف حسین قریشی وغیرہ کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، سالانہ چندہ للعہ فی پرچہ عہ پتہ: ۱۶۔ بیڈن روڈ لاہور، ہندوستان میں: ہیندرہ روزہ الحسنات، رام پور (یوپی)

اس کا مقصد نام سے ظاہر ہے، اس میں شعر و ادب، نفسیات و سائنس، تاریخ و جغرافیہ، معاشرت و معیشت، طب و صحت اور مزاح و افسانہ وغیرہ مختلف اصناف ادب کے رنگا رنگ اور دلچسپ معلوماتی مضامین کا انتخاب ہوتا ہے، بعض غیر منقول مضامین بھی ہوتے ہیں، ہر نمبر میں کسی مشہور باکمال سے انٹرویو بھی شائع کیا جاتا ہے جس سے انکی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے متعلق مفید معلومات ملتی ہیں، طب و صحت اور غذائیات کے زیر عنوان بھی مفید اور کارآمد مضامین ہوتے

ہیں، حیوانات کے عنوان سے خشکی یا سمندر کے حیوانات کے متعلق بہت دلچسپ اور حیرت انگیز معلومات دیے جاتے ہیں، غرض یہ رسالہ رنگا رنگ مضامین کا نہایت دلچسپ مجموعہ ہوتا ہے، البتہ شعر و ادب کا معیار نثری مضامین کے مقابلہ میں کمتر ہے، ایک مضمون میں اصغر گونڈوی مرحوم کے متعلق غلطی سے لکھ دیا گیا ہے کہ وہ عرصہ تک دار المصنفین سے وابستہ رہے، مجموعی حیثیت سے یہ رسالہ بہت دلچسپ اور مطالعہ کے لائق ہے۔

نظام ۔ مرتبہ جناب قمر الدین و منظور احمد صاحبان۔ کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر، قیمت سالانہ ہے، فی پرچہ ۳۶ نئے پیسے، پاکستان سے للعہ طلباء سے ستے ر۔ دفتر ماہنامہ نظام ۲/۴۲ کرنیل گنج کانپور۔ پاکستان میں مولانا غلام احمد یزدانی، شادی خاں ضلع کیمبل پور

یہ ایک خالص دینی رسالہ ہے، اس میں اسی نوعیت کے مضامین ہوتے ہیں، مولانا شاہ عبد الغنی صاحب پھولپوری کے ملفوظات التزام کے ساتھ اس میں شائع ہوتے ہیں، جو طالب دین مسلمانوں خصوصاً سالکین طریقت کے لیے مشعل ہدایت کی حیثیت رکھتے ہیں، مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کے کلمات و مواعظ سے بھی رسالہ مزین ہوتا ہے، مظاہر العلوم سہارنپور کے اکابر اور اس سے وابستہ بزرگوں کے سبق آموز حالات بھی شائع ہوتے رہتے ہیں، باب الاستفسار کے مستقل عنوان سے فقہی سوالات کا جواب دیا جاتا ہے، مجموعی حیثیت سے یہ رسالہ دیندار مسلمانوں کے مطالعہ کے لائق ہے، لیکن اپنے مخالف مسلک اشخاص اور جماعتوں پر تنقید کا لہجہ کبھی کبھی زیادہ تیز و تند ہو جاتا ہے جو اس رسالہ کی دینی ثقاہت کے خلاف ہے۔

انوار اسلام ۔ نگراں مولانا ابو محمد امام الدین رام نگری، مدیر محمد قمر الدین رام نگری، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت معمولی، چندہ سالانہ للعہ فی پرچہ ۳ر پتہ: منیجر انوار اسلام رام نگر بنارس۔ پاکستان میں: ڈاکٹر اعجاز حسین قریشی شرعی ڈسپنسری لاہور

اس رسالہ کا خاص مقصد اسلام کی تبلیغ، اس پر کیے جانے والے اعتراضات کا جواب اور مسلمانوں کی گروہ بندی کی مخالفت ہے۔ اسی مقصد کے ماتحت قرآن مجید اور حدیث نبویؐ کی تشریح اور بزرگان دین کے مؤثر حالات شائع کیے جاتے ہیں، اس دور کے غلط اور گمراہ کن رجحانات پر تنقید کیجاتی ہے، اس سلسلہ میں قلم میں کبھی کبھی زیادہ تیزی آجاتی ہے، نظم کی چاشنی بھی ہے، مگر ابھی پھیکی ہے، اس رسالہ کی ایک بڑی خصوصیت غیر مسلموں خصوصاً ہندوؤں کے سامنے اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنا، ان کے شکوک وشبہات اور اعتراضات کو دور کرنا ہے، جو اس زمانہ میں نہایت ضروری ہے، اس سلسلہ میں ہندوؤں کی مشہور مذہبی کتاب ستیارتھ پرکاش کا مستقل جائزہ ہوتا ہے، رسالہ کے فاضل نگراں ہندی زبان و ادب اور ہندو مذہب سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہیں، اس لیے ان مقاصد کے لیے نہایت موزوں ہیں، اور اس حیثیت سے یہ رسالہ بہت مفید ہے، اور ہندوؤں میں اس کی اشاعت کی بڑی ضرورت ہے،

القاسم - مرتبہ مولانا وحید الزماں کیرانوی وغیرہ، کاغذ، کتابت وطباعت قدرے بہتر، قیمت سالانہ ۵ر فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے، پتہ: دفتر القاسم دارالفکر دیوبند۔ پاکستان میں: محمد زاہد صاحب زاہد پریس قلعہ روڈ حیدرآباد سندھ۔

دارالعلوم دیوبند کے قدیم اور مشہور رسالہ القاسم کے نام سے یہ نیا رسالہ جاری کیا گیا ہے، اور قدیم القاسم کی طرح دیوبند کے مسلک کا ترجمان ہے اور اسی نوعیت کے مفید مذہبی اور دینی مضامین شائع ہوتے ہیں، کبھی کبھی مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا تھانوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ (رحمہم اللہ) اکابر کے تحریری تبرکات بھی شائع کیے جاتے ہیں، دینی مذاق رکھنے والوں کے لیے یہ رسالہ مفید ہے۔

المجیب ۔ مرتبہ جناب سید یوسف رضوی و علی احمد قادری وغیرہ، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، سالانہ چندہ صہ، فی پرچہ ۸ر پاکستان و دیگر ممالک سے معہ، پتہ: دار الاشاعت خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ۔

یہ دار الاشاعت خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کا ماہانہ رسالہ ہے، جو علمی، مذہبی اور اخلاقی مضامین پر مشتمل ہوتا ہے، سلسلۂ قادریہ کے بزرگوں اور اکابر کے حالات اور فقہی سوالات کے جواب بھی اکثر شائع ہوتے ہیں، "لمعات بدریہ" کے عنوان سے حضرت امیر شریعت مولانا محمد بدر الدین رحمۃ اللہ علیہ کے علمی و دینی آثار و افاضات کا حصہ خصوصیت کے ساتھ بہت مفید ہوتا ہے۔ ادب کی چاشنی سے بھی خالی نہیں،

المجلس ۔ محمد جیلانی صاحب، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت قدرے بہتر، سالانہ چندہ صہ فی پرچہ ۸ر پتہ: دفتر المجلس نور بھائی لوٹیا بلڈنگ بندر روڈ کراچی ۱

نادر علمی کتابوں کی اشاعت، تبلیغ اسلام اور بعض دوسرے مفید مقاصد کے لیے ایک مخیر تاجر جناب عبد الکریم اسماعیل مرچنٹ کراچی کی سرپرستی میں ادارۂ المجلس کے نام سے ایک ادارہ قائم ہوا ہے، یہ رسالہ اسی کا نقیب اور عام فہم دینی مضامین پر مشتمل ہوتا ہے۔

دیندار ۔ اڈیٹر محمد افضل شریف صاحب، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت قدرے بہتر، زر تعاون حسب استطاعت۔ پتہ: بوین پلی، حیدر آباد ۱۱

اس ماہنامہ کے لائق اڈیٹر کو دعوت و تبلیغ سے بڑی دلچسپی ہے۔ اس لیے اس میں وہ مذہبی و تبلیغی مضامین شائع کرتے ہیں جو عام مسلمانوں کے لیے مفید ہیں۔

اشراق ۔ مرتبہ جناب الیاس احمد صدیقی، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر، سالانہ چندہ صہ فی پرچہ ۸ر پتہ جنرل منیجر ماہنامہ اشراق، سکون منزل، نزد دھوبی مارکیٹ، رنچھوڑ لائن کراچی،

یہ مذہبی رسالہ مسلمانوں کی اصلاح کے لیے جاری کیا گیا ہے، اسی اعتبار سے اس میں اسلامی تعلیم و احکام، مجاہدین و صلحاء کے حالات اور تاریخ اسلام کے سبق آموز واقعات آسان زبان میں شائع کیے جاتے ہیں،

راہنمائے صحت۔ مرتبہ مولانا عبد الرحیم اشرف، کاغذ، کتابت وطباعت متوسط، سالانہ قیمت ۶ر فی پرچہ ۲۰ نئے پیسے، پتہ: منیجر راہنمائے صحت، پوسٹ بکس نمبر ۱ لائل پور

مولانا عبد الرحیم اشرف روشناس صاحب علم و قلم بھی ہیں اور مشہور طبیب بھی، حال میں انھوں نے یہ طبی رسالہ جاری کیا ہے، اس لیے اس میں اسی نوعیت کے مفید مضامین ہوتے ہیں، ہر شمارہ میں کسی فاضل طبیب کا مختصر تذکرہ بھی ہوتا ہے،

حاذق۔ مرتبہ جناب حکیم حبیب اشعر صاحب کاغذ متوسط، کتابت وطباعت بہتر، قیمت سالانہ للعہ ر فی پرچہ ۳۰ نئے پیسے، پتہ: ماہنامہ حاذق اے ۲۲۷۹ فورٹ روڈ حضوری گیٹ، لاہور۔

یہ بھی طبی ماہنامہ ہے جو ایک طبیب اور خوش مذاق ادیب جناب حبیب اشعر کی ادارت میں شائع ہوتا ہے، چنانچہ اس کے مضامین زیادہ تر طبی ہوتے ہیں، لیکن لائق مرتب ادیب بھی ہیں اس لئے طب کی دار و ئے تلخ کو ادب کی چاشنی سے خوشگوار بنا دیتے ہیں،

طبی ڈائجسٹ۔ مرتبہ حکیم محمد صلاح الدین نعمانی۔ کاغذ معمولی، کتابت وطباعت بہتر، قیمت سالانہ سے فی پرچہ ۴ر پتہ: دفتر طبی ڈائجسٹ مارکیٹ روڈ، حیدرآباد، ہندستان میں: پنڈارو زہ مسیحا ۱۰۱ پائیدھونی روڈ بمبئی ۳

یہ بھی طبی رسالہ ہے، اس میں دواؤں اور طبی معلومات کے علاوہ حاذق طبیبوں کے مختصر حالات بھی شائع کیے جاتے ہیں۔

تعلیم القرآن۔ از سید احمد حسین سجاد بخاری، کاغذ معمولی، کتابت وطباعت بہتر،

سالانہ قیمت ۵ر فی پرچہ ۸ر پتہ: دار العلوم تعلیم القرآن، راجہ بازار، راولپنڈی،

یہ مذہبی ماہنامہ اوسط درجہ کے مذہبی مضامین پر مشتمل ہوتا ہے، لیکن غیر مفید بحثوں میں پڑنے کے بجائے اسے صرف مذہبی خدمات سے سروکار رکھنا چاہئے۔

کردار نو۔ مرتبہ جناب رانا ظفر اللہ صاحب وغیرہ، کتابت وطباعت معمولی، سالانہ چندہ ہے طلباء سے للعہ فی پرچہ ۸ر پتہ: جامعہ اسلامیہ منٹگمری پاکستان

جامعہ اسلامیہ منٹگمری کا یہ مذہبی ماہنامہ علم و مذہب کی خدمت انجام دینے کے لیے جاری کیا گیا ہے، دعا ہے کہ دیرپا ثابت ہو۔

زعیم۔ مرتبہ سید شمس الدین حسن صاحب، کاغذ معمولی، کتابت وطباعت بہتر، قیمت سالانہ للعہ فی پرچہ ۸ نئے پیسے، مشیر جان روڈ، اندرون دودھ باولی، حیدرآباد

اس رسالہ میں مذہبی و سیاسی مسائل پر اوسط معیار کے مختصر مضامین شائع ہوتے ہیں۔

پندرہ روزہ اخبارات

بہار کی خبریں۔ مرتبہ جناب ولایت علی اصلاحی، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، سالانہ چندہ ہے فی پرچہ ۲ر پتہ: پی ٹی براے ڈائرکٹر محکمہ تعلقات عوام سکریٹریٹ، پٹنہ ۱ر

یہ حکومت بہار کا پندرہ روزہ اردو اخبار ہے، جس میں حکومت کے انتظامی اور تعمیری کاموں کا حال بھی درج ہوتا ہے، اور ہلکے پھلکے مفید علمی و ادبی مضامین بھی ہوتے ہیں،

مسیحا۔ مرتبہ حکیم محمد مختار صاحب اصلاحی، ڈی، آئی، ایم، ایس (علیگ) سالانہ چندہ ہے فی پرچہ ۵ نئے پیسے، پتہ: دفتر مسیحا، ایا پدھونی روڈ بمبئی۔ پاکستان میں: منیجر ماہنامہ میثاق رحمان پورہ، اچھرہ لاہور۔

اس پندرہ روزہ اخبار کا مقصد طب کی خدمت اور اس کی اہمیت کی جانب توجہ دلانا ہے اور اس میں دواؤں اور طب یونانی کے متعلق مفید مضامین شائع ہوتے ہیں، عام دلچسپی کے لیے دوسرے موضوعوں پر بھی مختصر مضامین ہوتے ہیں،

ہمدرد - اڈیٹر عبد الحمید دہلوی، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت سالانہ ۱۲؎ فی پرچہ ۲ر

پتہ: ہمدرد منزل لال کنواں دہلی ۶

یہ پندرہ روزہ اخبار دیسی طب کا ترجمان اور دیسی دواؤں، جڑی بوٹیوں اور طبی مسائل پر مفید اور دلچسپ مضامین شائع کرتا ہے۔ طب کی ناقدرشناسی کے اس زمانہ میں ان دونوں اخباروں کا وجود غنیمت ہے۔

بصیرت - اڈیٹر جناب ظہیر الدین صاحب، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، سالانہ چندہ ۶؎ر فی پرچہ ۴ر، پتہ: دفتر پندرہ روزہ "بصیرت" ۲۹ بیرون لوہاری دروازہ لاہور ۸

یہ انجمن خادم المسلمین لاہور کا پندرہ روزہ اصلاحی، دینی اور تعلیمی اخبار ہے، اور مفید اور عام فہم اخلاقی و اصلاحی مضامین پر مشتمل ہوتا ہے۔

خاص نمبر

دعوت رحمت عالم نمبر - مرتبہ جناب محمد مسلم صاحب، سائز اوسط، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۲۷۲، قیمت ۱۲ر، پتہ دفتر دعوت ۱۵۲۵ سوئیوالان دہلی ۶

ربیع الاول کے مبارک مہینہ میں مسلمان اپنے اپنے ذوق کے مطابق مختلف شکلوں میں ذات نبوی کے ساتھ اپنی عقیدت کا ثبوت دیتے ہیں، اسی تقریب سعید کے موقع پر "دعوت" نے رحمت عالم کے نام سے یہ خاص نمبر نکالا ہے، اس میں سیرت پاک کے مختلف پہلوؤں پر مشاہیر اہل قلم کے مفید

مضامین جمع کیے ہیں مضمون نگاروں میں مولانا ماجد عالم، مولانا سید ابوالحسن علی، مولانا محمد تقی امینی، میجر جنرل اکبر خاں وغیرہ جیسے مشاہیر کے نام ہیں، مضامین تقریباً سب مفید ہیں، ان میں "اسلام میں رسول کا تصور" حضور کی سماجی زندگی" "ہجرت کا دفاعی نقطۂ نظر" خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر اور لائق مطالعہ ہیں، عبدالباری ایم اے کے قلم سے شجرۂ ممنوعہ کی تحقیق بھی اہل علم کے لیے قابل توجہ ہے، سیرت کے علاوہ اصحاب رسول کی خصوصیات، ازواج مطہرات اور علم حدیث وغیرہ پر بھی مفید مضامین ہیں، ایک مضمون میں آنحضور کے بعد کے ۴۲ مدعیانِ نبوت کا مختصر تذکرہ ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے اتنے گوناگوں اور ہمہ گیر پہلو ہیں کہ ان کا ایک نمبر تو کیا مستقل تصنیفات میں بھی احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اس نمبر میں آپ کی مختلف حیثیات اور خصوصیت کے ساتھ انقلابی حیثیت کو نمایاں کیا گیا ہے،

چٹان سالنامہ - مرتبہ جناب شورش کاشمیری، کاغذ معمولی، کتابت وطباعت بہتر، رنگین و مصور صفحات ۱۰۴ لمبا سائز، قیمت ع۔ پتہ: دفتر چٹان ۸۰ میکلوڈ روڈ۔ لاہور

جناب شورش کاشمیری محض تخلص کے شورش نہیں بلکہ عمل کے بھی شورش ہیں، اور ان کی زندگی عرصہ تک پُرشور رہی ہے، اس لیے ان کو تمام انقلابی لیڈروں خصوصاً مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری سے جو اس گروہ کے سرخیل تھے، بڑی عقیدت ہے، ان کے حالات میں وہ ایک مستقل کتاب لکھ چکے ہیں، اب ان کی یادگار میں چٹان کا یہ خاص نمبر نکالا ہے، حضرت شاہ صاحب کی شخصیت بڑی جامع، انقلاب انگیز اور اسی کے ساتھ دلآویز بھی تھی، ان کے کارنامے بڑے گوناگوں ہیں، اس نمبر میں شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور ان کے کارناموں پر بہت مفید اور دلچسپ مضامین ہیں جن سے ان کا اجمالی نقشہ نگاہ کے سامنے آجاتا ہے، شورش صاحب نے یہ نمبر نکال کر نہ صرف اپنا حق عقیدت بلکہ بہتوں کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر دیا ہے۔ یہ نمبر مختلف حیثیتوں سے پڑھنے کے لائق ہے۔

گل خندان ۱۸۵۷ء نمبر - مرتبہ جناب پیام شاہجہانپوری تقطیع خورد، کاغذ معمولی کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۲۰۲ قیمت ۲؍، پتہ کشمیری بازار لاہور (۸) پاکستان

۱۸۵۷ء کو ہماری ملکی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے، اس کی صد سالہ جوبلی کی یادگار میں مختلف اخبارات و رسائل نے گذشتہ سالوں میں اپنے اپنے خاص نمبر نکالے، یہ نمبر بھی اسی سلسلہ کی کڑی اور مفید مضامین پر مشتمل ہے، اس میں اس انقلاب کی بعض اہم شخصیتوں بہادر شاہ ظفر، ملکہ حضرت محل، عزہ بیگم، شیخ جلال الدین، احمد اللہ شاہ مدراسی اور جنرل بخت خاں وغیرہ کے حالات اور ان کے کارناموں کا ذکر ہے، مختلف شہروں میں انقلاب کی تفصیل بھی دی گئی ہے، شروع میں سرسید کے رسالہ اسباب بغاوت ہند کا کچھ حصہ دیا گیا ہے، اور آخر میں غالب کی زبانی انقلاب دہلی کی سرگذشت بیان کی گئی ہے۔ "بہادر شاہ ظفر عدالت کے کٹہرے میں" اور "شیخ جلال الدین ۱۸۵۷ء کا عجیب کردار" بڑے موثر اور دردانگیز مضامین ہیں، مولانا غلام رسول مہر کے قلم سے جنگ آزادی کے دو اولوالعزم سپاہیوں احمد اللہ شاہ مدراسی اور جنرل بخت خاں کے حالات کی مصوری ہے، ایک مضمون میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے اسباب بیان کیے گئے ہیں، غرض یہ نمبر انقلاب ۱۸۵۷ء کے مختلف معلومات کا اچھا مجموعہ ہے، گو اس کے بہت سے معلومات نئے نہیں ہیں، پھر بھی ان سے اس انقلاب کے بعض اہم واقعات اور گوشے سامنے آتے ہیں،

سماوات - مرتبہ سیفی الاعظمی صاحب، کاغذ اچھا، کتابت وطباعت معمولی، صفحات ۴۴ قیمت ۲۵ نئے پیسے۔ پتہ دفتر سماوات نمبر ۴۸ زیر گولر وارانسی

یہ ایک ہفت روزہ اخبار سماوات کا خصوصی شمارہ ہے، اس میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق دو چار مختصر مضامین اور چند نعتیں ہیں، یہ اخبار بھی ابتدائی منزل میں ہے اور اس کو ترقی دینے کی ضرورت ہے۔

مجلہ سیفیہ ۔ معمور، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت دیدہ زیب، صفحات ۲۳۶ قیمت تحریر نہیں، شائع کردہ، سیفیہ ڈگری کالج بھوپال۔

بھوپال ایک عرصۂ دراز تک علم و ادب کا گہوارہ رہ چکا ہے، اس کی بعض ادبی روایات اب بھی قائم ہیں، اس کا ایک نمونہ سیفیہ ڈگری کالج کا یہ میگزین ہے، کالج نے اس سال اردو، انگریزی اور ہندی تینوں زبانوں کے الگ الگ میگزین شائع کیے ہیں، اردو میگزین عبدالقوی صاحب دسنوی جیسے صاحبِ مذاق کی نگرانی میں مرتب کیا گیا ہے، اور مختلف ادبی، تنقیدی اور سائنسی مضامین، منظومات اور افسانوں پر مشتمل اور ظاہری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ہے، شروع میں ڈاکٹر گیان چند کی ایک فاضلانہ اور محققانہ تقریر دی گئی ہے، جو انھوں نے بزم ادب سیفیہ کالج کے افتتاح کے موقع پر کی تھی، عبدالقوی صاحب کا مضمون "حالی کے شخصی مرثیے" بھی اچھا مضمون ہے، تین مضامین میں انگریزی، ہندی اور عربی زبان و ادب کا مختصر تاریخی جائزہ لیا گیا ہے، مرتضیٰ علی شاد کا ڈرامہ بہت دلچسپ ہے، طلبہ نے بھی اپنی استعداد اور بساط کے مطابق بعض اچھے مضامین تحریر کیے ہیں، "ہماری بڑھتی ہوئی آبادی" البتہ اس میگزین کے مناسب نہ تھا، امید ہے کہ آیندہ بھی یہ مجلہ شائع ہو کر بھوپال کے دیرینہ روایات کو قائم رکھے گا۔

ادبی دنیا ۔ مرتبہ مولانا صلاح الدین احمد و ڈاکٹر وزیر آغا، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۰۶ قیمت عہ پتہ دفتر ادبی دنیا، مال روڈ، لاہور۔

اس سے پہلے ادبی دنیا کے ایک خاص نمبر پر جو ریویو معارف میں نکلا ہے، اسکی اشاعت سے قبل ہی یہ دوسرا خاص نمبر بھی موصول ہو گیا تھا، یہ بھی سابق نمبر کی خصوصیات کا حامل اور ادبی، علمی، سوانحی مضامین، افسانوی خاکوں اور نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے، "بحث و نظر"، "تجزیاتی مطالعہ" اور "آپس کی باتیں" کے مستقل عنوانات اس میں بھی ہیں اور پہلے کی طرح دلچسپ بھی۔

"ض"

مطبوعات جدیدہ

نامعلوم انسان - از ڈاکٹر الکسس کیرل، ترجمہ محمد یوسف کوکن و محمد محی الدین،
صفحات ۳۰۵، ٹائپ۔ پتہ مدراس یونیورسٹی، مدراس، قیمت للعہ

یہ ڈاکٹر الکسس کیرل کی معرکۃ الآرا کتاب "مین دی ان نون" کا اردو ترجمہ ہے، اس میں مصنف نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جدید تمدن اور علوم نے انسان کو زندگی کے اصل مسائل سے حد درجہ غافل اور بے پروا کر دیا ہے، وہ جدید ترقیات اور اپنے خارج کی سطحی چیزوں میں اتنا منہمک ہو گیا ہے کہ اس کو اپنے اندر جھانکنے اور اس کے تقاضوں کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں ملتا، وہ کروروں میل دور خلا میں پرواز کرنے کے منصوبے بنا رہا ہے، مگر اپنے جسم و روح کی قریب ترین دنیا میں وہ سفر نہ کر سکا، بقول مصنف ہماری اندرونی دنیا کے وسیع علاقے ابتک نامعلوم ہیں، اور حقیقت میں ہماری ناواقفیت بہت گہری ہے"۔ گویا مصنف نے اس معلوم مادی انسان کے اندر کے غیر مادی نامعلوم انسان کی کھوج لگانے کی کوشش کی ہے، اور اس مادی انسان کی مجبوریوں اور بے چارگیوں کی نشاندہی کی ہے، مصنف نے اس میں اس حیثیت سے بھی بحث کی ہے کہ انسان کے احساس و شعور اور اخلاق و کردار کا اس کے ظاہری حالات پر کیا اثر پڑتا ہے، اس کتاب کے مطالعہ سے حقیقت شناسی اور ایمان افروز بصیرت حاصل ہوتی ہے، ترجمہ کی زبان نہایت صاف اور شستہ ہے،

صوفیائے پنجاب - از اعجاز الحق قدوسی، صفحات ۷۰۰، کتابت و طباعت عمدہ

ناشر سلمان اکیڈمی ۔ قیمت ۔

ہندوستان میں دعوت دین اور اشاعت اسلام کا سب سے زیادہ کام صوفیائے کرام کے ذریعہ انجام پایا، اور موجودہ دور میں ہندوستان میں اسلام کو زندہ رکھنے اور اس کو ترقی دینے میں بھی ان بزرگوں کی کوشش شمع راہ ہدایت ہوسکتی ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ ان کے حالات اور خصوصیت سے ان کے داعیانہ کارناموں پر زیادہ سے زیادہ مواد فراہم کیا جائے۔ اعجاز الحق صاحب قدوسی قابل تحسین ہیں کہ انھوں نے اس سلسلہ میں کئی قیمتی اور ضخیم کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں ایک صوفیائے پنجاب بھی ہے۔

ساحلی علاقوں کے بعد سندھ و پنجاب ہی دو ایسے صوبے ہیں جہاں سب سے پہلے مسلمانوں کی آبادیاں قائم ہوئیں، اور ان کے ذریعہ دین و ایمان کی روشنی پھیلی، اور عرب و عجم کے بیشمار علما و صوفیا یہاں آکر متوطن ہوئے، اور خود یہاں بھی بڑے بڑے علما و صوفیا پیدا ہوئے، انہی میں شیخ علی ہجویری، مخدوم جہانیاں جہاں گشت، بابا فرید گنج شکر، اور زکریا ملتانی جیسی برگزیدہ ہستیاں ہیں، جنھوں نے تنہا ایک ایک جماعت کا کام کیا ہے، شیخ علی ہجویریؒ کی کشف المحجوب کئی صدی سے عرب و عجم میں ہر جگہ مقبول و معتمد علیہ ہے، ان بزرگوں کی صحبت ہی نہیں بلکہ ان کے ملفوظات اور مکتوبات و حالات میں بھی ایسی تاثیر ہے کہ آج بھی ان کے پڑھنے سے ایمان و یقین میں زیادتی اور سوز و گداز کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، ان بزرگوں کے دم قدم سے نہ صرف ظاہری طور پر اسلام باقی رہا بلکہ ان کی وجہ سے اسلام کی وہ اخلاقی و روحانی زندگی اور اس کی تاثیر بھی زندہ و قائم رہی، جو نبی امی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیں وراثتہً و امانتہً ملی تھی۔ اس کتاب میں پنجاب کے ۳۰ صوفیا کے حالات اور تعلیمات کی تفصیل ہے، کتاب پوری محنت اور تحقیق سے لکھی گئی ہے، مگر اس سلسلہ میں یہ بات عرض کر دینی بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ

حالات و واقعات اور کشف و کرامات کے نقل کرنے میں انتخاب اور موجودہ مذاق کو سامنے رکھنا بھی ضروری ہے، اسی عدم انتخاب کی وجہ سے صوفیہ کی زندگی کی بہت سی خوبیوں پر پردہ پڑجاتا ہے، خاص طور پر ان کے گانے و سماع کے قصوں کے نقل کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے، یہ بھی تعجب ہے کہ یہ کتاب حضرت مجدد الف ثانیؒ کے تذکرے سے خالی ہے اور مصنف نے کوئی معذرت بھی نہیں کی ہے، حالانکہ سرہند میں بیٹھکر حضرت مجددؒ نے نہ صرف پنجاب کو بلکہ پورے ہندوستان کو متاثر کیا، ان باتوں کے باوجود کتاب بار بار مطالعہ کے لائق ہے۔

تواریخ عجیب ۔ از مولانا محمد جعفر صاحب تھانیسری، مرتبہ محمد ایوب صاحب قادری صفحات ۳۰۴، کتابت و طباعت متوسط، ناشر سلمان اکیڈمی، حق نشان نمبر ۳ نیو کراچی، ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی ۵ قیمت للعہ

حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کے بعد جن بزرگوں نے انکی تحریک کو زندہ رکھا اور اس کے لیے ہر طرح کی سختیاں جھیلیں اور قربانیاں دیں ان میں ایک ممتاز شخصیت مولانا محمد جعفر صاحب تھانیسریؒ کی بھی ہے، مولانا محمد جعفر تھانیسری پر انبیلا سازش کیس کے سلسلہ میں انبالہ میں مقدمہ چلا، ۱۲ر ستمبر ۱۸۶۳ء کو ان کی گرفتاری ہوئی اور ۸ ماہ بعد ۲ر مئی ۱۸۶۴ء کو ان کو پھانسی کی سزا ہوئی، چیف کورٹ میں پھانسی کی اپیل کی گئی، اس اثنا میں وہ متعدد جیلوں میں رہے، ۱۶ر ستمبر ۱۸۶۴ء کو چیف کورٹ نے ان کی پھانسی کی سزا کو حبس دوام بعبور دریائے شور میں تبدیل کردیا، وہ تقریباً بیس برس جزائر انڈمان میں رہے، اور وہاں طرح طرح کی صعوبتیں اٹھائیں، ۱۸۸۲ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ رپن جو لبرل جماعت سے تعلق رکھتے تھے "وہابی کیس" کے تمام ملزمان کو رہا کر دینے کا فیصلہ کیا جس کے تحت مولانا محمد جعفر بھی رہا ہوئے، اور زندہ وطن واپس آئے، اور ۱۹۰۵ء تک بقید حیات رہے، رہائی کے بعد دوستوں کے اصرار سے انھوں نے متعدد

قیمتی کتابیں لکھیں، انہی میں ایک تواریخ عجیب بھی ہے، مولانا کی ان کتابوں سے تحریک جہاد کے بعض ایسے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے، جن کا ذکر دوسری کتابوں میں نہیں ملتا، اس کتاب میں انھوں نے جزائر انڈمان کی بیس سالہ زندگی کے حالات لکھے ہیں، گویا یہ ان کا روزنامچہ ہے، اس تحریک کے سلسلہ کی دوسری کتابوں کی طرح اس کتاب کے مطالعہ سے بھی ایمان میں تازگی اور شوق جہاد پیدا ہوتا ہے، سید صاحب کی تحریک کے ذریعہ دین و ایمان کے ساتھ اردو ادب کو جو غیر معمولی فائدہ پہنچا، اس کا ثبوت یہ کتاب بھی ہے، یہ کتابیں لاکھوں کی تعداد میں چھپیں اور گھر گھر پڑھی گئیں، یہ کتاب اس سے پہلے کئی بار شائع ہو چکی ہے، مگر اس کی اشاعت کا اتنا اہتمام اس سے پہلے نہیں ہوا تھا، اس کے لیے مرتب اور ناشر دونوں مبارکباد کے مستحق ہیں۔

آئینۂ سخن فہمی ۔ از سید مسعود حسن رضوی، صفحات ۱۸۶، پتہ کتاب نگر دین دیال روڈ لکھنؤ، قیمت ۶ ؍

سید مسعود حسن کی مشہور کتاب ہماری شاعری جوہر آئینہ اور منظر آئینہ کے نام سے جو تنقیدیں کی گئی تھیں ان کا جواب رضوی صاحب نے مختلف اوقات میں متعدد مضامین کے ذریعہ دیا تھا، انہی مضامین کو انھوں نے اب کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے اور جوہر آئینہ اور منظر آئینہ کی مناسبت سے اس کا نام آئینۂ سخن فہمی رکھ کر خوش مذاقی کا ثبوت دیا ہے، اس مختصر تبصرہ میں تنقید اور جواب تنقید کا تجزیہ مشکل ہے، دونوں نقاد و صاحب نظر ادیب ہیں، اس لیے اس میں بڑی دلچسپ اور دقیق بحثیں آگئی ہیں، جن سے اصحاب ذوق لطف اندوز ہو سکتے ہیں، خصوصاً شعراء اور ادیبوں کے لیے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔

شکستہ لا ۔ از ساغر نظامی، صفحات ۲۰۰، کتابت و طباعت اعلیٰ، ناشر ادبی مرکز ۷۳ پنڈارا روڈ، نئی دہلی ۱۳، قیمت عہ

کالیداس کا شمار ہندوستان کے قدیم ترین شعرا میں ہے، شکنتلا ناٹک ان کا ادبی شاہکار ہے۔ یورپ و ہندوستان کی تقریباً ہر زبان میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے، اردو میں بھی اس کا ترجمہ اس سے پہلے ہو چکا ہے، اب ساغر نظامی نے اس کا منظوم اردو ترجمہ کیا ہے، ترجمہ خود بڑا مشکل کام ہے، پھر نظم میں ترجمہ کرنا اور بھی دشوار ہے، مگر ساغر نظامی صاحب نے اس پر قابو پانے کی کوشش کی ہے۔

دھڑکنیں۔ از ذکی کاکوروی، صفحات ۱۴۴، کتابت و طباعت معمولی، پتہ ذکی کاکوروی ۲۴ وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ۔

یہ ایک نوجوان شاعر ذکی کاکوروی کا مجموعۂ کلام ہے۔ ابھی ان کے کلام میں فکر و خیال کی بلندی اور گہرائی تو نہیں پیدا ہوئی مگر صلاحیت ہے، اور اب بھی اچھی خاصی غزلیں کہہ لیتے ہیں، اگر انھوں نے اپنا مطالعہ اور مشق جاری رکھی تو آگے چل کر ایک کامیاب شاعر ہو سکتے ہیں، ان کے ابتدائیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو نثر پر پوری قدرت ہے، اور ترقی پسندی کے دام تزویر سے بھی انھوں نے اپنا دامن بچائے رکھا ہے، جو فال نیک ہے۔

جذبات حیدر۔ مرتبہ سرشار کسمنڈوی، صفحات ۲۲۴، کتابت و طباعت متوسط ناشر دارالاشاعت تعمیر ادب ۱۸۱ حیدر گنج قدیم، لکھنؤ۔

دکن کے ایک معروف شاعر حیدر علی خاں حیدر مرحوم کا مجموعۂ کلام ہے، جسے سرشار کسمنڈوی صاحب نے مرتب کیا ہے، یہ مجموعہ ان کی زندگی ہی میں مرتب ہو چکا تھا، مگر افسوس ہے کہ اس کی طباعت و اشاعت ان کی وفات کے بعد ہوئی، حیدر نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی اور دونوں اصناف میں بڑی حد تک کامیاب ہیں، ان کے کلام میں لفظی و معنوی دونوں خوبیاں ملتی ہیں، روانی و برجستگی کے ساتھ فکر و نظر کی بلندی، جذبات کی فراوانی اور درد و سوز کی کیفیتیں کثرت سے ملتی ہیں، شروع میں سرشار صاحب اور عبدالشکور صاحب جیسے قدردانوں نے ان کی شخصیت و شاعری کا تعارف کرایا ہے، جس سے ان کی

عظمت کا اندازہ ہوتا ہے، امید ہے کہ ارباب ذوق میں یہ مجموعہ پسند کیا جائے گا۔

امن و آزادی کی جدوجہد۔ از خروشچوف، صفحات ۲۰۰

ستمبر ۱۹۶۰ء میں خروشچوف نے امریکہ کا دورہ کیا تھا، اور اسی ضمن میں انھوں نے اقوام متحدہ کے پندرہویں اجلاس کو بھی خطاب کیا تھا، جس میں امن اور ترک اسلحہ کے مسائل زیر بحث لائے تھے، امن وسکون موجودہ دور کی سب سے کمیاب جنس ہے، اس وقت مغربی ممالک کے رہنما اور خاص طور پر روس کے وزیر اعظم ہر روز امن کا نعرہ بلند کرتے رہتے ہیں لیکن جس وقت ان کی زبان پر یہ نعرہ ہوتا ہے، اسی وقت کسی قوم کو غلام بنانے کے جارحانہ منصوبے بھی بن رہے ہوتے ہیں، کاش اس نفاق سے نکل کر واقعی امن وسکون کی جدوجہد ہوتی، تو موجودہ مادی ترقیاں انسان کے لیے رحمت ثابت ہوتیں، بہرحال اس کتاب سے خروشچوف کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے، یہ کتاب پروپیگنڈے کی خاطر شائع کی گئی ہے، اس لیے اسکی قیمت بھی بہت کم ہے۔

قول طیب۔ از مولانا الیاس برنی مرحوم۔ مرتبہ عبد الحلیم صاحب ایاسی ایم اے صفحات ۲۹۶

کتابت وطباعت معمولی، مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد دکن، قیمت للعہ

مولانا الیاس برنی مرحوم نہ صرف ایک عالم، کامیاب مصنف، معاشیات کے ماہر اور خوش مذاق شاعر تھے بلکہ وہ بادۂ تصوف کے لذت آشنا بھی تھے، اسی کا اثر تھا کہ ان کی کوئی بات حکمت وموعظمت سے خالی نہیں ہوتی تھی، آسمان شہرت و وجاہت کی بلندیوں پر ہوتے ہوئے بھی وہ اپنی عملی زندگی میں ایک فقیر منش تھے، اس کتاب میں مولانا کی انہی پُرعظمت باتوں اور ان کے اخلاق وکردار کی جھلکیوں اور اعتدال پسندانہ طرز عمل کی تفصیل کی گئی ہے۔ یہ کتاب ہر مسلمان اور نامسلمان کے مطالعہ کے لائق ہے۔

"م - ج"

جلد ۹۱ - ماہ شعبان المعظم ۱۳۸۲ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۶۳ء - عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینے دوسری دسمبر کو ہماری پرانی قومی بزم کی ایک اہم یادگار عبدالمجید خواجہ نے انتقال کیا، خواجہ صاحب مرحوم کی شخصیت بڑی جامع تھی، ان کی ذات میں دین و سیاست، قومیت و وطنیت اور اسلامی غیرت و حمیت کا بڑا متناسب اجتماع تھا، انکی پوری زندگی ملک و ملت کی خدمت میں گذری، طرابلس اور بلقان کی جنگ سے لیکر ہندوستان کی آزادی تک ہر قومی و ملی تحریک میں ان کا نمایاں حصہ رہا، اس دور کے لیڈروں میں ان کا ممتاز مقام تھا، ایک طرف وہ پکے قوم پرور اور وطن دوست تھے، مسلمان فرقہ پروروں کا ہمیشہ مقابلہ کرتے رہے، دوسری طرف راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور ان کا دل اسلامی غیرت و حمیت سے معمور تھا، اس لیے ہندوستان کی آزادی کے بعد کے حالات سے بہت بددل تھے، اور اس سلسلہ میں نے ارباب سیاست اور ارکان حکومت کو بہت صاف اور کھری باتیں کہتے تھے، پنڈت جواہر لال تک ان کا لحاظ کرتے تھے، مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ سے بہت قدیم اور گہرا تعلق تھا، جامعہ کے تو معماروں میں تھے، آخر وقت تک اس کے چانسلر رہے، مسلم یونیورسٹی کے بھی رکن رکین تھے، آزادی کے بعد یونیورسٹی میں جو غیر اسلامی رجحانات پیدا ہو گئے ہیں ان کی اصلاح کے لیے برابر کوشش کرتے رہے۔

~~~~~~~~~~

خواجہ صاحب علی گڈھ کے اس دور کی پیداوار تھے جب انگریزیت اور تجدد اس کا طغرائے امتیاز تھا،
~~~~~~~~~~

مقالات

عثمان مختاری

از

جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب صدر شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی حیدرآباد

اس شاعر کا نام اور ولدیت تذکروں میں اس طرح ہے :-

"ابوالمفاخر خواجۂ حکیم سراج الدین ابوعمر عثمان بن عمر (یا محمد) مختاری غزنوی"[1]

دیوان سنائی میں اس شاعر کی مدح میں جو قصیدہ ہے اُس کی سرخی اس طرح ہے :-

"در مدح ابوالمفاخر خواجۂ حکیم عثمان بن عمر مختاری شاعر غزنوی"[2]......

یعنی شاعر کا نام عثمان ضرور ہے، کنیت اور ولدیت (ابوعمرو ابن عمر) خود شاعر نے بتائی ہے :

فردا کمر خدمتِ بوبکرؓ و عمرؓ بند — دیں شعر زمن بندۂ بوعمرو عمر بہ[3]

تقی الدین بن معین الدین اوحدی نے اپنے تذکرۂ عرفات العاشقین (مرتبہ ۱۰۲۳ھ) میں لکھا ہے کہ :-

"...... حکیم مختاری الغزنوی، نام وے عثمان بن محمد است ، در اوائل عثمان تخلص کردے .

بسبب امرے خاص (از آں معنی تنفر زمودہ و مختاری اختیار نمودہ ...... در نسخہ اسے بنظر

---

[1] تاریخ ادبیات در ایران (دکتر ذبیح اللہ صفا) ج ۲ ص ۵۰۰ [2] دیوان سنائی، مرتبہ مدرس رضوی (تہران ۱۳۲۰ھ) ص ۲۰۲ [3] دیوان مختاری ص ۱۲۹ دیوان میں وہ شعر اس طرح تھا :

فردا کمرِ خدمتِ بوعمرو عمر بند — دیں شعر زمن بندہ بعمرو عمر بہ

رسید کہ والد عثمان غزنوی است ... حکیم سنائی را تربیت نمودہ و سلاطین بسیارے را

خدمت فرمودہ ..... وفاتش در عہد بہرام شاہ بن مسعود است بہ غزنین فی سنہ چہار صد

(پنج صد) و سی واند .....“

یہ حوالہ دے کر مطبوعہ دیوانِ مختاری (تہران ۱۳۴۱ھ) کے مرتب[1] نے مختاری کے مندرجۂ ذیل شعر سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ شاعر نے امامیہ مذہب اختیار کر کے عثمان نام ترک کر دیا تھا:

دگر نہ شاہا عثمان کدام سگ باشد | کز و بپیش تو گیرد ثنا سرای تو نام[1]

لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے، کیونکہ شاعر نے اپنا نام ”عثمان“ کئی جگہ (بعد میں بھی) استعمال کیا ہے، مثلاً

از فقر و فنا چو جنید دل عثمان | کز جود فنا خسرو جز داد عمر نیست

فرو اندیش تا درا چہ قادر خاطرے باشد | کہ در معنی و لفظ خوش مسلم کرد عثمانش

دانے چو تو باشد و صلت نہ رسد | جز خرمن زر درکنار عثمان

بیروں نتواں شد ز حد قسمت | شو گر و فضولی بگذر عثمان

اور مختاری تخلص بعد میں نہیں بلکہ شروع ہی سے اختیار کر لیا تھا، جیسا کہ سنائی نے کارنامۂ بلخ (یعنی عشق نامہ، مرتبہ ۴۹۵ھ) میں کہا ہے:

اختیار زمانہ مختاری | آں جوان لطیف دیداری[2]

عثمان مختاری کے دیگر حالات جو اس کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتے ہیں، درج ذیل ہیں:

---

[1] دیوان مختاری، مقدمہ ص ۲۱-۲۲- دیوان کے مرتب نے شاعر کو شیعہ سمجھ کر بعض اشعار میں تحریف بھی کر دی ہے، مثلاً صفحہ ۴، پر ایک شعر یوں کر دیا ہے:- ممدان از پے صلابت را - ہمہ شیعی و پارسا شدہ وگیر۔ حالانکہ مرتب نے خود ہی حاشیے میں لکھا ہے کہ اصل نسخوں میں دوسرا مصرعہ اس طرح تھا:- ہمہ سنی و پارسا شدہ وگیر۔ اسی طرح صفحہ ۳۴۴ میں (مہدی اثری بتا و شیعی) بھی تحریف معلوم ہوتی ہے۔

[2] دیوان مختاری مقدمہ صفحہ ۲۵ - شاعر نے خود بھی (صفحہ ۷۰۱) اپنے متعلق کہا ہے:-

اے بشعر ملقب شدہ مختار | کردہ کلک تو آب کشور تیغ

سلطان ابراہیم غزنوی (م ۴۹۲ھ / ۱۰۹۹ء) نے اپنے بیٹے سیف الدولہ محمود کو ۴۶۹ھ / ۱۰۷۶ء[1] میں والی ہند بنایا تھا، وہ مسعود سعد سلمان (م ۵۱۵ھ / ۱۱۲۱ء) کا ممدوح تھا، ۴۸۰ھ / ۱۰۸۷ء میں محمود کسی شبہ کی بنا پر گرفتار کر لیا گیا، تو مسعود سعد سلمان بھی قید کر دیا گیا، وہ کہتا ہے:۔[2]

هفت سالم کوفت سو و دهک — پس از آنم سه سال قلعهٔ نای

محمود کی جگہ اس کا بھائی مسعود سوم ہندوستان کا والی مقرر ہوا، اور اس کا سپہ سالار نجم الدین زریر شیبانی (پسر بو حلیم) بنایا گیا جس نے خراسان اور عراق میں بھی فتح حاصل کی،[3] اور ہندوستان میں ناراین، مالوہ، کالنجر، طبی (قنوج) وغیرہ پر قبضہ کیا، اس طرح وہ مغرور ہو گیا، آخر کار وہ بھی قلعۂ نای میں قید کر دیا گیا، وہاں مسعود سعد سلمان بھی تھا جو اسے رہائی کی امید دلایا کرتا تھا، وہ کہتا ہے:۔

بده انصاف آنچه می بینی — من نگفتم ترا بقلعهٔ نای

مژده ها دادمت بقوت دل — وعده ها کردمت بصحت رای

عالمے کز من زدم و دیدی — کر نگوید تمام کرد خدای[4]

اسی زمانے میں منصور بن سعید بن احمد بن حسن میمندی، جو غزنین میں مقیم تھا، عثمان مختاری کا

---

[1] دیوان مسعود سعد سلمان، ص ۳۳۳ [2] چہار مقالہ (ترجمۂ براؤن)۔ حواشی قزوینی، ص ۱۱۷

[3] مسعود سعد سلمان نے زریر شیبانی کے غرور کا ذکر کرتے ہوئے دو سرداروں کے نام لیے ہیں، جنھیں عبرتناک سزائیں دی گئی تھیں:۔ نه چند بود دش از حال قتلغ قرلق (؟)۔ نه عبرت افتاد ورا زبے خرد یشان (؟) (ص ۳۴۱)

ایک اور جگہ ہے:۔

نه چرخ گشتم نه نیزه پرداختم — نه قتلغ قرلقم نه یشانم (ص ۲۵۲)

[4] دیوان مسعود سعد سلمان، مقدمہ ص مب - ملہ

ممدوح تھا، اس مدح میں اس کے چھ طویل قصیدے[1] ملتے ہیں، جن میں اسے "عارض لشکر"[2] کہا گیا ہے، مثلاً

عارض لشکر منصور سعید احمد آنکہ تیغ و قلم اوست جہان را معیار

عماد دولت منصور بن سعید کہ اوست نظام ملک و قوام ہدیٰ و زین البشر

عمدۂ ملکی و از رای تو ملکت را فخر صاحب عدری و بے عدد تو مسند را ننگ

از ابر اگر ہوا و نرم است ایچ باک نیست مارا ہوای عارض لشکر کند حزم

لیکن سلطان ابراہیم کی مدح میں مختاری کا کوئی قصیدہ نہیں ملتا، البتہ اس کے بیٹے مسعود سوم کی شاہزادگی کے زمانے کا یہ قصیدہ ملتا ہے

زہے این من آفتابے بہ آری چو رای ملک چہرہ مسعود غازی

زہے مملکت را چو دولت گرامی زہے پادشا را چو دیدی نیازی

رخ مملکت را سبک روح فرخی دل پادشا را گران مایہ رازی[3]

سلطان ابراہیم کے انتقال (۴۹۲ھ / ۱۰۹۹ء) کے بعد مسعود سوم تخت نشین ہوا، تو اس نے اپنے بیٹے (؟) شیرزاد کو اپنی جگہ والیِ ہند بنا دیا، اور خواجہ ابو نصر پارسی کو اس کا سپہ سالار، مسعود سعد سلمان کہتا ہے:-

شاہ را بود نایب کاری کرد شغل سپاہ سالاری[4]

خواجہ ابو نصر سے مسعود سعد سلمان کی پرانی دوستی تھی، اس لیے اس نے موخر الذکر کو جالندھر کا گورنر بنا دیا[5]، لیکن یہ زمانہ قلیل رہا اور وہ خواجہ کے زوال پر ۴۹۳ھ / ۱۱۰۰ء میں پھر قید کر دیا گیا، اور اس مرتبہ قلعۂ مرنج

---

[1] تاریخ بیہقی مجلد سوم، ص ۱۱۰۳ – ۱۱۲۰ (سعید نفیسی) تہران ۱۳۳۲ھ۔ [2] دیوان مختاری کے مرتب رکن الدین ہمایون فرخ نے بکثرت غلط نتائج نکالے ہیں اور قصیدوں کی غلط سرخیاں قائم کی ہیں، یہ قصیدہ بھی انھوں نے محمد دوم (ص ۲۰۰ – مقدمہ ص ۳۰) یعنی محمد خلجی کی مدح میں سمجھ لیا ہے۔ [3] دیوان مختاری، ص ۳۳۷ – ۳۳۸ [4] دیوان مسعود سعد سلمان ص ۵۹۵ [5] ایضاً ص ۲۵۹

میں جہاں ۵۰۰ – ۹ سال محبوس رہا، وہیں محمد بن خطیب بھی قید ہو کر آیا تھا جو توران میں قزدار (قصدار) کا حاکم رہ چکا تھا، مسعود سعد سلمان کہتا ہے:-

چو بنگریم ہمیدون بپی از قضای خدا — بلای ما ہمہ قزدار بود و جالندر...

بحرمت ثقۃ الملک ازین چو دریا دل — بنوص طبع برآرم طویلہ ہای گہر...

عمید مطلق طاہر کہ سروران ہرگز — ندیدہ اند چو او در زمانہ یک سرور

تو گرفتی در حبس و بند محنہ دری — اگر تبرسی ازین بند و بشکری از خطر

منم کہ عشری از عمر شوم من بگذشت — مگر بجنت و در محنتم ہنوز اندر[1]

یعنی شاعر (مسعود سعد) جالندھر کی حکومت کی وجہ سے اور محمد بن خطیب قزدار کی حکومت کے سبب سے محسود و معتوب ہوا، اور موخرالذکر ابھی تو گرفتار (شعر ۴) ہے، مسعود سعد سلمان چونکہ اس مرتبہ سنہ ۴۹۳ھ میں گرفتار ہوا تھا، اس لیے ظاہر ہے کہ اس سال کے بعد ہی یہ قصیدہ لکھا ہوگا، جب کہ ثقۃ الملک طاہر بن علی بن مشکان (شعر ۲–۳) عمید تھا، مسعود سعد سلمان جب جالندھر کا گورنر تھا اس وقت عثمان مختاری نے یہ قصیدہ لکھا ہوگا:-

از کفر ہمہ ہند صاف کردی — زان گوہر صافی چو تو دا یاں

خورشید کی داہی تصدر مجلس — ہرامی و تیری بزم و میدان

ہم صاحب عباد روزگاری — ہم رستم زالی زری بدستان...

دیکھ سخن خود چہ را نگویم — من بے خبر از خاصی کنز خوان

کو بیکسی اندر میان تو شہرے — تنہا ترم از آنکہ در بیابان...

گرتو بیقۃ یابم از بزرگی — در شہر کیے گردم از بزرگان[2]

---

[1] دیوان مسعود سعد سلمان، ص ۱۵۵ – ۱۵۶ [2] دیوان عثمان مختاری، ص ۷۰۲ – ۳۴۹ دیوان مسعود سعد سلمان ۶۳۰ – ۶۳۱، بھی دیکھیں۔

آخری اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ مختاری ہندوستان آکر یہ قصیدہ پیش کر رہا ہے یعنی ۵۰۸ھ کے قریب، پھر اسی زمانے میں وہ قزدار (توران) محمد بن خطیب کے دربار میں گیا ہوگا جب کہ موخرالذکر ابھی قلعہ مرنج میں قید نہیں ہوا تھا، شاعر کہتا ہے:-

چو من بقوت اسلام و نصرت داور	ز بہر خدمت بستم کمر بعزم سفر
مدیح بود مرا رہبر و سخن مونس	امید بود مرا ہمرہ و خرد یار و در
تن از تکلف انجام راہ سست و غمین	دل از تاسف ہجران یار زیر و زبر...
نظام و اصل محامد محمد ابن خطیب	کہ محمدت ز خطابش گرفت زینت و فر...
بہ ہند و سند بر تاختن چو ابر بہار	بجای آب ہمی خون برانی اندر جر
ہوای شرق بزیر غبار مرکب تست	از آں بشرق فروتر بود خسوف قمر
دریں ولایت رسمے بناد خنجر تو	کہ ہر کہ راہ زدی راہ وار گشت امیدر...
ترا بہ حاکمی سند تہنیت چہ کنم	کہ گشت از ہنرت ہند در زمانہ سمر
ہمہ ممالک مشرق سپرد گیر بتو	چہ ہند بر تو نوشتند سند را چہ نظر...
بزرگوار عشق مروت تو مرا	فراق مادر و معشوق داد و ہجر پدر[1]

آخری شعر سے ظاہر ہے کہ مختاری ابھی جوان تھا، اور اس کے والدین بقید حیات تھے، آٹھویں شعر میں حاکمی سندھ سے متعلق تہنیت کا ذکر ہے، یعنی ممدوح کچھ ہی پہلے وہاں حاکم ہوا ہوگا، لیکن اس کی مدح میں شاعر کا مزید کلام نہیں ہے، اس لیے خیال ہوتا ہے کہ شاعر کو زیادہ کہنے کا موقع نہیں ملا! ممدوح جلد قید کر دیا گیا، ہندوستان میں شاعر کی آمد کے سلسلے میں مسعود سوم کی مدح کا یہ قصیدہ ملاحظہ ہو۔

بجان تو کہ اندیا د تو خالی سازی تن را	اگر محمود در دنیا بہ ہمت نیستی حاتش

---

[1] دیوان عثمان مختاری، ص ۱۳۲ - ۱۴۰

سر و ر بزم سالارانِ دو ملت آدمی صفدرا | که سرہنگان گردن کش برند از دیده فرمانش....
اگر در بیشهٔ قنوج با لشکر بہم بودے | بجز پہلوی شیر نر نبودے سفرهٔ نانش....
دگر باره آن ملک مسعود ابراہیم دین پرور | خواہد باژ ہند از ہر عزو دینه یزدانش
بہندستان مکن کارے چنین کاری درباخت | که عبرت نامه سازند قرآن درخراسانش
سنائی را صلہا بخش تا او این چنین شعرے | بپردازد که ہمتا نیست اندر شعر اقرانش
فرو اندیش تا او را چه قادر خاطرے باشد | که در معنی و لفظ خوش مسلّم کرد عثمانش
بسر گردانی و گوزی سزا بوده چون چرخ او را | که دوری داد چشم را ز دیدار تو دورانش
بسوی پتنه راندم تیز بے کندی و بے سستی | از اقبال تو چون امرت نوردیدم بیابانش[۱]

شعر ۱-۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مسعود سوم کا سپہ سالار محمود دراہی تھا، شعر ۴-۵ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری میں مختاری سے سنائی (م ۵۴۵ھ) مستفیض تھے، اور وہ اب[۲] دور کسی جگہ تھے، شعر ۹ سے ظاہر ہے کہ مختاری ہندوستان میں پتنہ (پاک پتن ؟) کی طرف بادشاہ کے حکم سے گیا تھا، ہندوستان میں مختاری کی آمد کی ایک یادگار یہ بھی ہے کہ اس نے ایک ہندی غلام خریدا:

یکے غلامکے ہندی خریدم از بازار | بدان بہا کہ زگفتار آنم آید عار[۳]

---

۱ دیوان عثمان مختاری کا محمد ۱۸۰-۱۸۱ - اسی بحر میں سنائی نے بھی لکھا تھا:- مسلمانان و رد ام کرد صنعی می شنود جانش
در افتادم بدان دردے کہ پیدا نیست درمانش
پھر مسعود و شعرائے یہ زمین اختیار کی۔

مسعود سوم کا ایک وزیر یوسف بن احمد جو سنائی (دیوان ص ۹۲ ببعد) کا ممدوح تھا، اس مدح میں مختاری سے ملتی کا ہے، اساس عالم اقبال یوسف احمد - جمال دفتر علم است و پشت عزت دین (ص ۲۶۲) دیوان میں اس کی مدح کا ایک نامکمل قصیدہ (۳۳۶) بھی ہے۔ ۲ شاید غزنی میں ہونگے۔ سنائی خود (دیوان ص ۳۰۲) کہتے ہیں:

من ز بلخ امتحان شدم مرغزی | با بلاد عناد حشر وہم
کر گنہگار نیستی ابنا ستی | بسوی غزنوی بساحل یم

۳ ایضاً ص ۶۰-۶۱

اس غلام نے ہماری زبان کے دو لفظ "چوں" اور "مار" استعمال کیے :-

زمن بدید یادی بجستہ گفتہ چوں ۔۔۔ کس بدیدے بمن نشستہ گفتہ مار

ہندوستان سے واپسی پر مختاری ۵۱۲ھ کے قریب بلخ جاتا ہے، جبکہ وہاں سنائی نے اپنی مثنوی عشق نامہ (کارنامۂ بلخ) لکھی تھی، اس میں مختاری کا ذکر اس طرح آتا ہے :-

اختیار زمانہ مختاری ۔۔۔ آں جوانِ لطیف دیداری

آں چو گل سپکوئی بر او زادہ ۔۔۔ وآں چو سوسن شگرف آزادہ

نظم او تا بہ شاعری پرداخت ۔۔۔ نظم او کس ز ساحری نشناخت

اس مثنوی میں سنائی نے ثقۃ الملک طاہر بن علی بن مشکان، ابوحنیفہ اسکافی اور عبدالحمید بلخی (صاحب مقامات حمیدی) وغیرہ کا ذکر کیا ہے، جو اس وقت بلخ میں تھے[۱]۔

غالباً اسی زمانہ میں مختاری ایک ممدوح شاہنشاہ ابن سلطان شاہ ابن ابراہیم سے متعلق ہو جاتا ہے، جو پہلے "فخر الامراء" تھا :-

شاہنشہ سلطان شہ آں بزرگے ۔۔۔ کز ماہ سپہرست گاہ وزیں را

فخر الامراء آنکہ فخر زدانش ۔۔۔ آورد زیر دست ماہ وطیں را...

بر شیر فلک شیر رایت او ۔۔۔ صندوق پر آتش کند عریں را[۲]

ایک ترجیع بند میں اس ممدوح کے متعلق یہ اشعار آتے ہیں :-

پر آب حیات گوار اب بگو نش ۔۔۔ گوئی اگر بجز جام امیر الامرا نیست

---

[۱] تفصیل کے لیے دیکھیں حکیم سنائی از خلیل اللہ، ص ۸۹، دیوان مختاری کا مقدمہ ص ۲۵

[۲] دیوان مختاری، صفحہ ۵۵۔ غزنوی اور سلجوقی سلاطین کے علم میں شیر کی تصویر تھی، دیکھیے تاریخ بہرام شاہ از ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ص ۲۲۰-۲۳۰

بیرسٹری کی تعلیم کے سلسلہ میں ان کا قیام عرصہ تک لندن میں رہا، لیکن ان کا مزاج ابتدا سے مذہبی تھا، اس لیے
وہ ہر دور میں عملاً مسلمان اور پابند مذہب رہے، اور عمر کے ساتھ ساتھ ان کی مذہبیت بڑھتی گئی تھی، انکا
مذہبی مطالعہ وسیع تھا، مذہبی گفتگو میں آیات و احادیث ان کے نوک زبان رہتی تھیں، علمی اور ادبی مذاق
بھی ستھرا رکھتے تھے، طبعاً بڑے خلیق اور شگفتہ مزاج تھے، پرانے بزرگوں کی تمام وضعداریاں ان میں جمع تھیں،
وہ موروثی طور پر صاحب ثروت تھے، اس لیے بیرسٹری عرصہ سے ترک کر دی تھی اور زیادہ وقت قومی کاموں میں
صرف کرتے تھے، ادھر چند برسوں سے ضعف پیری اور امراض کی وجہ سے بالکل عزلت نشین ہو گئے تھے، مولانا
محمد علیؒ و شوکت علی کے ہم قافلہ مسافروں میں صرف دو بزرگ رہ گئے تھے، خواجہ صاحب مرحوم اور ڈاکٹر سید محمود صاحب
خواجہ صاحب نے جنت کی راہ لی، ڈاکٹر صاحب کا حال یہ ہے کہ "اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے"، لیکن انکا
وجود بہت غنیمت ہے، اللہ تعالیٰ ان کا سایہ عرصہ تک قائم رکھے اور خواجہ صاحب مرحوم کو اپنی رحمت و مغفرت
اور عالم آخرت کی خواجگی سے سرفراز فرمائے۔

~~~~~~~~~~~~

ہندوستان میں دین و مذہب کی جو روشنی بھی نظر آتی ہے وہ سب عربی مدارس کا فیض ہے، یہ بوسیدہ جھونپڑے
درحقیقت دین و دینی علوم کے محافظ قلعے ہیں، انہی کی بدولت ہندوستان میں دین کا چراغ روشن ہے، ان کا وجود
نہ صرف دینی بلکہ تعلیمی نقطۂ نظر سے پہلے سے بھی زیادہ ضروری ہو گیا ہے، جدید تعلیم اس قدر گراں ہے کہ بہت سے غریب مسلمانوں
کے لیے اس کا حصول دشوار ہے، پھر نیا نظام تعلیم مسلمانوں کے مذہب اور انکی روایات سے بالکل مختلف ہے،
دوسری دشواریاں اس پر مستزاد ہیں، ان حالات میں عربی مدارس ہی ایسا ذریعہ ہیں جو غریب اور نادار مسلمانوں
کو کم سے کم خرچ میں تعلیم سے آراستہ کر دیتے ہیں، جدید تعلیم گاہوں کے مقابلہ میں عربی مدارس کے اخراجات بہت کم
ہیں، بڑے بڑے مدارس کے لائق اساتذہ جس ایثار سے کام لیتے ہیں اور جیسی سادہ زندگی بسر کرتے ہیں، اس کی مثال مسلم اسکولوں
کے اعلیٰ درجہ کے ٹیچروں میں بھی نہیں مل سکتی، لیکن اس وقت مسلمانوں کی بے توجہی سے اس کا انتظام بھی دشوار
~~~~~~~~~~~~

ہو رہا ہے، اور عربی کے اکثر مدارس مالی مشکلات میں مبتلا ہیں۔

~~~~~~~~~~~~~~~~

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے خدمات اہل ملک کے سامنے ہیں، اس زمانہ میں بھی جبکہ عربی کے اکثر مدارس کی زندگی دشوار ہو رہی ہے، الحمدللہ ندوہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت، ان کے اخلاص اور للّٰہیت نے اس کو جس درجہ تک پہنچا دیا ہے، اس کی مثال اس کی گذشتہ تاریخ میں نہیں ملتی، وہ تعلیمی، علمی اور تعمیرات ہر حیثیت سے روز افزوں ترقی پر ہے، اور نہ صرف ہندوستان بلکہ اسلامی دنیا کا ایک ممتاز تعلیمی مرکز بن گیا ہے، اس وقت ندوہ میں مختلف اسلامی ملکوں کے طلبہ زیر تعلیم ہیں، اس وسعت و ترقی کے ساتھ قدرتی طور پر اس کے مصارف میں بھی اضافہ ہو گیا ہے، غیر معمولی گرانی نے بھی مصارف بڑھا دیے ہیں، اسلیے اس کی موجودہ آمدنی اس کے مصارف کے لیے بالکل ناکافی ہے، اقامتی طلبہ کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ ان کے لیے ایک نئے دار الاقامہ کی شدید ضرورت تھی، اسکی ایک وسیع و شاندار دو منزلہ عمارت تعمیر ہو رہی ہے، جو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے دور معتمدی و نظامت کا ایک بڑا کارنامہ ہے، بعض اور ضروری تعمیرات بھی زیر تجویز ہیں، ان کی تکمیل کے لیے بڑے سرمایہ کی ضرورت ہے، ان خدمات کے مقابلہ میں مسلمانوں کے بھی کچھ فرائض ہیں، ندوہ کے کارکن تو پورے اخلاص اور مستعدی کے ساتھ اپنے فرائض ادا کر رہے ہیں، اب مالی فرض ادا کرنا مسلمانوں کا کام ہے، رمضان المبارک کا خیر و برکت کا مہینہ قریب ہے، ہم کو توقع ہے کہ صاحب ثروت مسلمان خصوصاً بڑے تاجر اس موقع پر دار العلوم ندوۃ العلماء کو فراموش نہ کریں گے، جہاں اس کے سفراء نہ پہنچ سکیں وہاں کے اصحاب خیر امدادی رقم ناظم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے نام بھیج سکتے ہیں۔

~~~~~~~~~~~~~~~~

آں دولت و تخت و نسب سلجوق دو پیہ | یک رویہ شدہ عالمش از تیغ دو رویہ...
خونابہ شدہ ست ایں دلم از درد و لیکن | خرسندیم از دولت شاہنشہ لوئی ست...
گوئی خرد و نقش نجوم و فلک و طبع | شاہنشہ بے مثل فنا خسرو غازی ست[1]

ان اشعار میں ممدوح شاہنشاہ کو "فنا خسرو" بھی کہا ہے اور سلجوق دوپیہ بھی،

ایک قصیدے میں شاعر کہتا ہے :-

شعر پرور دن و عطا دادن | پیشۂ شاہ و شاہزادۂ ماست
میر شاہنشہ آنکہ خاطر او | آسماں قدر و آفتاب ضیاست....
پادشاہا بفضل و ہمت تو | در جہاں شاہ و پادشاہ کجاست
آسمانی و آسماں ذرہ است | آفتابی و آفتاب ہباست
دل و ہوشت چو نفس ناصر دیں | بستہ علم و دفینۂ دانا ست....
بندہ داند کہ پیش صدر ملوک | چند کار است کاں صوابش خطاست
نکند آنچہ آں نباید کرد | عذر او نیز زو بباید خواست
عذر او را قبول باید کرد | عذر او نیز زو بباید خواست
وگر آید خطائے از بندہ | پاسبان از درہزار تعاست[2]

پہلے شعر سے ظاہر ہے کہ ممدوح اور اس کا باپ (؟) بھی اس وقت موجود تھا، آخری اشعار میں شاعر نے ممدوح کے دل میں اپنے متعلق شبہات کی طرف اشارہ کیا ہے، چوتھے شعر میں ممدوح کے اسلاف میں سے ناصر دیں (مسعود بن محمود غزنوی ۔؟) کے متعلق اشارہ معلوم ہوتا ہے[3]

---

[1] دیوان مختاری ص ۷۵۳ بعد، مطبوعہ دیوان میں ہر جگہ اور مقدمہ میں اس ممدوح کو پوپیہ لکھا گیا ہے لیکن وہ بوبیہ ہے جیسا کہ آگے عرض کیا جائیگا [2] ایضاً ص ۷۷-۷۸ [3] دیوان ابوالفرج رونی (چاپ کین) ص ۵-۲۰،

اس ممدوح کے متعلق کچھ تفصیل یوں بھی ہے :-

گو ز بدحالی میندیش و ز بے برگی مترس   جانِ شاہنشاہ سلطان شاہ ابراہیم خواہ

آنکہ ہم پروردۂ ملک است و ہم پیوند ملک   ہم برادرزادۂ شاہ است و ہم فرزند شاہ[1]

پہلے شعر میں ممدوح کو شاہنشاہ ابن سلطان شاہ ابن ابراہیم (غزنوی؟) کہا گیا ہے اور دوسرے میں "سلجوق و بوریہ" (جس کا ذکر اوپر کے اشعار میں ہے) کے رشتے کا اظہار بھی ہے، اور یہ کہ وہ شاہ (مسعود سوم؟) کا بیٹا بھی ہے اور بھتیجا بھی، ایک قصیدے میں مزید تفصیل ہے :-

بازوی دولت مغیث الدین فناخسرو کہ ہست   حدِ شمشیرش فنای خسروانِ روزگار

شمس ملت، شاہ شاہنشاہ بوی آنکہ ہست   بوی خلق و نور رایش مشک و شمسِ روزگار

زاں شہاب خویش خواندا ورا امیرالمومنین   کو برآورد از سرودیوان مستنصر دمار

ساخت رمحش پوست را بر قالب محمد تقفس   کرد کلکش چشم را بر دیدۂ مشرک حصار ...

دین و دولت را عظیم اصلے است اندر تیغ تو   شادباش ای از عظیم الدولہ دین را یادگار ...

ہر جواں کاندر جہان ست اے خداوند جہاں   کو بہ نثر اندر مسیر است و بہ نظم اندر مسار

من ہمی دعوی کنم کاندر طریق شاعری   آتش و آبم من و ایشان خانند و شرار

ور کسے گوید کہ ایں دعوی بمعنی راست نیست   گو چنیں وصفے بپرداز و چنیں معنی بیار

چند گویند ایں جواں را پیش بخت پادشاہ   بود بوسعد و بداں از شہر خود کرد افتخار

زیں نیاید لیسند کایں شاہ جواں را در پناہ   بندہ زیبد کش چو من شاگرد باشد صد ہزار

آخر افتد بر گذر شیرے چو پیل بند و بگور   تا قیامت بے شکے خالی نماند مرغزار

خسروا سالے مرا فرمودہ اینجا باش   تا جنانت باز گردانم کہ گردی کامگار

اندریں سالے بکوشم کاز مزاج طبع خویش   بیت معنی مدح خوانم ہرچہ در شاہوار[2]

---

[1] دیوان مختاری ص ۳۲۲

آخری دو شعروں سے ظاہر ہے کہ شاعر ابھی اس ممدوح کے یہاں پہنچا ہے، جو اسے ایک سال رہنے کے لیے کہتا ہے۔ شروع کے دو شعروں میں ممدوح کے نام اور القاب ہیں، فنا خسرو کی رعایت سے "فنای خسروان" اور "بوعلی" کی رعایت سے "بوعلی خلق" الفاظ استعمال کیے ہیں، تیسرے شعر میں ہے کہ امیر المومنین (القائم بامر اللہ) نے مستنصر فاطمی[1] کی شکست کے بعد ممدوح کو "شہاب خویش" کہا ہے، پانچویں شعر میں ممدوح کو عظیم الدولہ کی یادگار کہا گیا ہے، اور نویں شعر میں ہے کہ بادشاہ کے دربار میں کوئی ابو سعد شاعر تھا، جو وہاں اپنے شہر پر فخر کیا کرتا تھا،

ان تمام تاریخی اشارات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ظن غالب ہے کہ یہ ممدوح عزو شیرزاد ہوگا جو مسعود سوم کا بیٹا سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت میں وہ اس کا بھتیجا ہوگا، جیسا کہ اوپر ایک شعر میں آیا ہے کہ

ع ہم برادر زادۂ شاہ است وہم فرزند شاہ

طبقات ناصری (طبع کلکتہ ۱۸۶۴ء ص ۱۹ ح) میں سلطان ابراہیم غزنوی کا ایک بیٹا سلطان شاہ بھی مذکور ہے، بو یہ اغلب ہے کہ باد سے ہے جو طبرستان کے اسپہبد کا جد امجد تھا، اور اس خاندان میں حسام الدولہ (شہریار بن قارن)۔ علاء الدولہ (علی بن شہریار) وغیرہ القاب رائج تھے، اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ عظیم الدولہ (شاد باش ای عظیم الدولہ دین را یادگار) بھی اس خاندان میں اسلاف میں سے کسی کا لقب ہوگا جس کا رشتہ مختاری کے ممدوح شاہنشاہ ابن سلطان شاہ ابن ابراہیم تک پہنچتا ہو؟

[1] مستنصر فاطمی نے مصر و شام اور کچھ حصہ عراق کا زیر تسلط کر لیا تھا، اور خلیفہ القائم بامر اللہ (م ۴۶۷ھ / ۱۰۷۵ء) کو قید کرا دیا تھا، طغرل (محمد) ۴۴۷ھ میں (وزارت در عہد سلجوقی ص ۱۴-۱۵) بغداد پہنچا اور خلیفہ القائم کو قید سے آزاد کرایا، (ذبیح اللہ صفا نے تاریخ ادبیات در ایران، ج ۲ ص ۵۰ میں لکھا ہے کہ شوال ۴۵۰ھ سے ذیقعدہ ۴۵۱ھ تک بغداد میں مستنصر کا خطبہ اور سکہ جاری رہا، اس کے بعد طغرل نے خلیفہ القائم کو بحال کرایا)۔ بہرحال اس وقت شیرزاد تو کیا اس کے کسی بزرگ نے خلیفہ القائم کی مدد کی ہوگی، اور اس کو شہاب کا خطاب ملا ہوگا، (مسعود بن محمود غزنوی کو البتہ شہاب الدولہ کا خطاب ملا تھا (دیکھیں، محمود غزنوی از ڈاکٹر ناظم ص ۱۲۰)

اب یہ عقدہ اس طرح حل ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ممدوح شیرزاد ہوگا جو مسعود سوم کی وصیت کے مطابق ۵۰۸ھ ۱۱۱۵ء میں غزنی میں تخت نشین ضرور ہوا لیکن ملک ارسلان وغیرہ کی خانہ جنگیوں سے وہ طبرستان بھاگ گیا اور اسپہبد علاء الدولہ علی ابن شہریار ابن قارن کے دربار میں پناہ گزیں ہوا جس نے اسے حج کے لیے اس کی فرمائش پر بھجوا دیا، لیکن حج سے واپسی پر جب وہ (شیرزاد) غزنین پہنچا تو ۵۰۹ھ ۱۱۱۶ء میں ملک ارسلان نے اسے قتل کرا دیا، بہرحال شیرزاد کا اسپہبد کے یہاں پہنچنا محض رشتہ داری کی وجہ سے ہوگا۔

اس ممدوح (شیرزاد) کو سلجوق و بویہ (آن دولت و تخت و نسب سلجق و بویہ) اس لیے کہا ہوگا کہ شاید اس کے والد سلطان شاہ کی شادی بویہ خاندان میں ہوئی ہوگی اور اس کے انتقال کے بعد اس کی بیوہ (شاہنشاہ کی والدہ) مسعود سوم کے نکاح میں آگئی ہوگی (ہم برادرزادۂ شاہ است وہم فرزند شاہ)۔ مختاری نے ابوسعد کا ذکر بھی کیا ہے (بود بوسعد وبداں از شہر خود کرد افتخار) جو ممکن ہے ابوسعد بابو ہو[۲] - اور اس کے شہر سے مراد لاہور (؟) ہو۔

اس ممدوح[۳] (شیرزاد) کے یہاں مختاری اسکے آخری دور میں پہنچا ہوگا، ایک قصیدے میں ہے:۔

---

[۱] تفصیل کیلیے دیکھیں تاریخ بہرام شاہ از ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں ص ۱۱ [۲] ابوالفرج رونی اس کے متعلق کہتا ہے:۔

صدر بابوئیان سزا باشد کاندر او عقل را سرا باشد...

کنیت شہریار و نام رسول (مسعود) عرض او را همی عطا باشد (ص ۳۴)

ایک اور جگہ کہتا ہے:۔ عمید مملکت بوسعد بابو کہ از بہیتش با بہ ست شکل (ص ۷۱)

مسعود سعد سلمان نے بھی (ص ۲۵۰ - ۴۸۱ - ۵۹۴) اس کی مدح کی ہے۔ [۳] مسعود سعد سلمان نے شیرزاد کے والی ہند ہونے پر قصیدہ (ص ۵۰) لکھا، اسکی سپہ سالاری کا ذکر (ص ۷۲۰) بھی کیا، مختاری کی طرح اس نے بھی اسے "بازوئے دولت" (ص ۲۲۶ - ۲۴۲) اور عضد الدولہ (ص ۵۸۳) کہا ہے، ابوالفرج رونی نے بھی (ص ۹۲۶) اسے عضد الدولہ کہا ہے۔

شاہنشہ بویہ عضد الدولۂ عالی شاہے کہ جہان را بر او ہیچ خطر نیست...

از فقر و فنا چون نہ نہ بیند دلِ عثمان کز جود و فنا خسرو جز و ادغم ز نیست

اندر دل من تا وطن دوستی قسمت باللہ کہ غم دختر و تیمار پسر نیست[1]

اس آخری شعر میں شاعر اپنی بیٹی اور اپنے بیٹے کے جدا ہو جانے کا ذکر کرتا ہے، اور ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ ۴۹۳ھ کے قریب اس نے حاکم قزدار کی مدح والے قصیدے میں اپنے ماں باپ کے فراق کا ذکر کیا تھا، اس کے بعد وہ ۴۹۵ھ میں بلخ میں تھا، اس لیے ظاہر ہے کہ عضد الدولہ (شیرزاد) سے اس کا تعلق ۴۹۵ھ کے بعد ہوا ہوگا، اور وہ زمانہ غالباً ۵۰۸ھ / ۱۱۱۵ء کے قریب ہوگا۔ جب کہ مسعود سوم کے انتقال پر شیرزاد اور اس کے بھائی ملک ارسلان اور بہرام شاہ وغیرہ کی خانہ جنگیاں ہوئی تھیں، اور ۲ شوال ۵۰۹ھ (۲۲ فروری ۱۱۱۶ء) کو جب ملک ارسلان تخت نشین ہوا تھا[2]، اس موقع پر عثمان مختاری رے میں ہوگا، وہ کہتا ہے:-

بہ نجستہ خیز کہ آراستے چراغ رے تا بر چینم گوہر شادی ز گنج مے

در خدمت رکاب خداوند شرق و غرب ذکرے دگر کنیم و جہانے کنیم طے

بنگر کہ تا دو مہ بہ چہ عدت بود سپاہ سلطان ابو الملوک ملک ارسلان بہ رے[3]

---

[1] دیوان مختاری۔ ص۔ ۱۰۰-۱۰۱، ایک قصیدے میں مختاری نے اس ممدوح کی ایک ہفتہ بیماری (ص ۵۲) کا ذکر کیا ہے جس سے بادشاہ فکرمند تھا، ایک اور قصیدے میں (ص ۲۹۶) ممدوح سے کہتا ہے کہ ع ساقے چو اشعر فرستم بجا ر قب

[2] تفصیل کیلئے دیکھیں تاریخ بہرام شاہ (از غلام مصطفیٰ خاں۔ ص ۱۱-۱۴) [3] مونس الاحرار، جیب گنج ص ۱۹۹ مطبوعہ دیوان مختاری (ص ۳۳۵) میں یہ اشعار مسخ شدہ ہیں۔ ملک ارسلان کی تخت نشینی پر خلیفہ بغداد (المستظہر باللہ) نے اسے سرا ہا تھا:- سوے ملک خلیفۂ پیغمبر خدای ⁂ نامہ نوشت و خویشتن اندر میان نہاد (مختاری ص ۳۲۳) ایک اور قصیدے میں خلیفہ کا ذکر ہے: جو شانِ عزیزہ بباغ مستظہر ⁂ ستایش تو کنم عندلیب را تلقین (ص ۳۵۵)

(باقی حاشیہ ص ۱۸ پر)

پہلے شعر میں بہمنجنہ یعنی بہمن کی دوسری تاریخ کا ذکر ہے، یعنی شوال ۵۰۹ھ (فروری ۱۱۱۶ء) جب کہ ملک ارسلان تخت نشین ہوا تھا، اس موقع پر شاعر کا غزنین سے دور رہنا اور رے میں قیام کرنا غالباً شیرزاد سے تعلق کی وجہ سے تھا، یہیں سے مختاری کرمان گیا ہوگا، اور اس تعلق کی وجہ سے اسے جو ملک ارسلان سے خوف پیدا ہوا ہوگا، اس کا ذکر وہ اس طرح کرتا ہے :-

خدا یگانا امروز بندہ مختاری	نمودنی سخنی چند مختصر دارد
یکی حکایت ہائل گوش بندہ رسید	کہ جان بندہ از آں روی در خطر دارد
حدیث رفتن جلے کز اں گریختہ ام	وزیر بے بدل تو از اں خبر دارد
زبسکہ بر سر ایشاں زدم ترا گفتند	کہ او یکے نبرد گر ہزار سر دارد
خدای داند اگر نزد والی کرمان	بدر ور یختن خون من حذر دارد
بہ نعمت تو کہ ایں بندہ خاک درگہ تو	ز ملک کرمان بسیار دوست تر دارد[۱]

اسی خوف کی وجہ سے خوشامدانہ طریقہ پر وہ ملک ارسلان سے بلخ پر حملہ کرنے کے لیے کہتا ہے جہاں وہ رہ چکا تھا اور گو کہ اب وہ کرمان میں ہے :-

رکاب عالی اگر سوئے بلخ بجز امد	چہ حاجت ست بہ تیغ وسنان و تیر و کمان

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷) شاید رے کے قیام کے زمانے میں مختاری نے احمد نحاس (ابو المعالی، المتوفی ۵۱۲ھ) سے تعلق پیدا کر لیا تھا، کہتا ہے:

چند لا حول گویم از وسواس	از غم ہجر احمد نحاس ...
دیدگاں چوں لوائے مستنصر	وز چوں کسوت بنی عباس ...
ہم ایں جا جہاں خوش افتادہ ست	کز فراق غمی شوم بہ قیاس
واں گگفتی کہ ماندہ است مرا	نرم و سیرم ز بو علی الیاس (ص ۱۹۵-۱۹۶)

دوسرے شعر میں المستنصر باللہ علوی مصری کے سفید لوا کے متعلق تلمیح ہے اور بنی عباس کے سیاہ لوا کے بارے میں بھی ہے، شاعر احمد نحاس نے اس مستنصر تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ (دیکھیں مجمع الفصحا، ج ۱ ص ۱۹۵، راحت الصدور ص ۱۳۶ ا ح

درم خریدۂ جد تو اند و بندۂ تو　　همه سران و یلان سپاہ سلجقیان
همه ممالک دنیا تراست مستخلص　　چنانکہ خواہی گیر و چنانکہ خواہی ران
جہان ستانا زاقبال مدحت تو مرا　　سخن شناساں بر دیدہ ساختند مکان
زبندگی و ہوا خواہی تو آں گیر دم　　کہ صدر شاں را بمن تباہ گشت گمان
خدای داشت بمن خدمت تو ارزانی　　کہ ہست اگر ملکانش بجاں خرند از آن
بہ نعمت تو کہ جز آستانۂ تو مرا　　ہزار بار بہ از ملک کشور کرمانؔ[^۱]

بلخ میں مختاری ۹۵ھ کے قریب گیا تھا، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، لیکن وہ ان اشعار میں (۱۵ھ کے قریب) بلخ پر[^۲] حملہ کرنے کی جو ترغیب دیتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ وہ ابھی کچھ پہلے تک وہاں سے تعلق رکھتا تھا،

ملک ارسلان کی مدح کے ایک قصیدے میں اس کے وزیر یوسف بن یعقوب کا ذکر آتا ہے:-

سلطان ابوالملوک ملک ارسلاں کہ چرخ　　ایوان اُبدیدہ نہادہ ست بر کنار....
رای بلند او بہ وزیرے سپرد ملک　　کز رای اوست گوہر اسلام را عیار
آں یوسفے کہ دیدۂ یعقوب بد ضریر　　اوکردہ بود بے پیرہن یوسفش نثار....
اے شاہ تاجداراں و اندر سرایں　　تیر تو گو زن را زبود سخت خواستار....
آں صبحدم چہ بود کہ از کوہ جنگواں　　سر بر زد آفتابے اندودہ رخ بہ قار....
ابرے زگرد و لشکر سر در ہوا نہاد　　بر فرق آں گروہ ببارید ذوالفقارؔ[^۳]

یہاں شاعر نے کوہ جنگواں والی فتح کا ذکر کیا ہے، جو غالباً نگین آباد کے قریب تھا، جہاں

[^۱]: دیوان مختاری ص ۵۶۔ [^۲]: ایضاً ص ۵۳ - ۵۶۔ ملک ارسلان کے بیٹے[^۳] خسرو ملک کی مدح میں بھی ایک قصیدہ ملتا ہے (ص ۳۰۳)

ملک ارسلان نے اپنے بھائی بہرام شاہ کو شکست دی تھی، اسی ممدوح کے متعلق یہ اشعار ہیں:

سرِ سالِ نو ملک است و مہ فرودیں	خیز و پیش آر مئی تلخ و لبانِ شیریں
جاں دہد پیکر بہرام بشاخ بادام	جاں دہند انجم نسرین بہر گل نسریں
یوسف یعقوب اجلِ کرم وقبلۂ ملک	صاحب عادل شمس الوزرا نطب الدین

اوپر کے دوسرے شعر میں بہرام شاہ کے متعلق اشارہ ہے، یوسف بن یعقوب کو نظام ملک بھی کہا گیا ہے:-

ایزد دو یوسف از دو گروہ اختیار کرد	بر مقتضاے قوتِ دین و قوام ملک
آں را لقب نہاد بمغرب عزیز مصر	دیں را خطاب کرد بمشرق نظام ملک[۱]

اسی زمانے میں ملک ارسلان نے کسی فتح کے بعد شتام میں جو پٹیالہ کے قریب ہے، ایک قلعہ تیار کرایا تھا، شاعر نے کرمان سے یہ قصیدہ بھیجا ہوگا،

ترا بشارت باد اے ولایت کرمان	بفتح نامۂ شاہ از دیار ہندستان
خدایگانِ سلاطین علاء دولت و دیں	نظام دنیا مولی الملک شاہِ جہاں
سپہ بکشور ہندستاں کشید بغزو	برای روشن و تدبیر پیر و بخت جوان....
خدایگان جہاں جان او بد بخشید	ز نور اختر عفوش نمود ظلِ اماں
بفتح باد ہمہ روزگار شاہ چنیں	ز عجز باد ہمہ گنج دشمنانش جناں
خبر رسید کہ اندر نواحی شتام	سر حصار کردہ ست با ستارہ قراں....
ترا جہاں ز دو شاہ بزرگ موروث است	کہ یافت دوراں اندر زمان ہر دوا ماں

۱؎ دیوان مختاری ص ۴۴-۲۶۳ ۲؎ ایضاً ص ۱۹۷، ایک قصیدہ میں جو اس کے متعلق کہا ہے:-

اے خداوند وزیران و سپہ سالاران

یکے ز سلطان محمود سومنات کشای — یکے ز سلطان داؤد خالدات ستاں .....

در این زمانہ چہ ہمت ملوک زمین — شکار و گوی و سماع ست بادۂ بتاں

ہمیشہ پیشۂ سلطان اعظم این بودہ ست — بہ غزو تاختن و حفظ کردن قرآں ....

بروز بار ز ملک بہرہ یابد از لب حور — دہان تاجوراں را خجستہ شاد رواں

دو دیدہ در سر این بندۂ ثنا گستر — نیافت روشنی الا ز گرد آں میزاں

اگر چہ حرمتکے ہست بندہ را این جا — بدانچہ دارد از آں حضرت بلند نشاں

خدای داند اگر ملک این ولایت بہ — بچشم بندہ در این قصر خوب لاتر ماں

اگر بہ عز قبول این فراق یافتہ را — بشارتے رسد از بخت سعد ناگاہاں

ز خاک تیرہ گر آید بہ روضۂ فردوس — ز ریگ تفتہ بر آید بہ چشمۂ حیواں[1]

دوسرے شعر میں "علاء الدولہ و دیں" کے القاب سے خیال ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ شاید مسعود سوم کی مدح میں ہوگا، لیکن ساتویں اور آٹھویں شعر میں وضاحت ہو جاتی ہے کہ وہ ملک ارسلان سے متعلق ہے، جو سلطان محمود غزنوی اور سلطان داؤد کی نسل سے ہے، کیونکہ اس کی ماں جغری بیگ ابو سلیمان داؤد بن میکائیل ابن سلجوق کی بیٹی تھی، نویں دسویں شعر میں دوسرے سلاطین کے مقابلے میں ملک ارسلان کی عادت کا ذکر ہے کہ وہ جہاد اور حفظ قرآن کا شایق ہے، آخری اشعار

---

[1] دیوان مختاری ص ۲۴۴ - ۲۵۲ - ملک ارسلان کی مدح کے ایک قصیدے میں میر فاضل (سپہ سالار؟) کا ذکر بھی ہے،

میر فاضل کز نفس پروردۂ اوست — تا در مصر پادشاہ گیر

چون عصای کلیم نیزۂ او — در صف دشمن اژدہا شدہ گیر (ص ۳۴)

ملک ارسلان کی مدح کے ایک قصیدے میں خلیفہ مستظہر (۴۸۷ھ تا ۵۱۲ھ) کا ذکر ہے:

بوستان عزیز دباغ مستظہر — ستایش تو کنم عندلیب را کلفین (ص ۱۵۸)

میں شاعر غزنیں سے اپنی دوری کا ذکر کر رہا ہے[1]۔

والی کرمان (جس کا ذکر اوپر کے قصیدے میں آچکا ہے" خدای داند اگر بزدوالی کرمان ..... وارد)

یعنی ابوالحارث ارسلان شاہ ابن کرمان شاہ ابن قاورد (۴۹۵ھ تا ۵۳۶ھ) کی مدح میں

جو قصیدہ ہے اس میں شاعر نے غزنیں سے (رہتے ہوتے ہوئے؟) وہاں تنے کا ذکر کیا ہے:۔

رفتم براہ غزنیں بر آب آہنیں	خفتم بحد کرماں در آتشیں سراب
لیکن مرا نمود چو داؤد و چون خلیل	آہن بری ز قوت و آتش تہی ز تاب ....
دارای بر و بحر و نگہبان داد و دیں	خورشید تاج و تخت و خداوند تیغ و خطاب
بوالحارث ارسلان شہ کرمان شہ آنکہ ہست	اورا معز دولت و دیں از فلک خطاب[2]

ایک اور قصیدے میں ہے:۔

سید سلجوقیان فخر شہان روزگار	مفخر قاوردیان صدر ملوک استان
ارسلان شہ ابن کرمان شاہ شاہ بحرو بر	مایۂ ملک زمین و مادۂ عمر زمان[3]

تیسرے قصیدے میں ہے:۔

دی قاصد یار آمد نزدیک من از غزنیں	زاں سروری بیکر دوآں ماہ بدیع آئیں ....
گہ کہ بکند خوارم والکہ بدل دارم	کز دست نہ بگذارم درگاہ معزالدیں
بوالحارث بے ہمتا شاہ فلک و دنیا	کیں مملکتش با وا پیوستہ بیوم الدین
شاہنشہ بحر و بر کز تیغ فلک پیکر	زی خان رود و قیصر فرمانش بروم و چیں
خواہد شدن از دولت قزدیل در مملکت	زیں روی و رم جنت ایں جا لقب قزدیں[4] (باقی)

---

[1] بہرام شاہ جو ملک ارسلان کے مقابلے پر سنجر کی مدد سے ۵۱۱ھ میں غزنیں میں تخت نشین ہوا تھا اس کی مدح میں مختاری کا صرف ایک قصیدہ ملتا ہے:۔ شاد باش اے کعبۂ کیخسروان روزگار ، ویزدی اے قبلۂ اسکندران تاجدار

[2] دیوان مختاری ص ۱۵-۱۶ [3] ایضاً ص ۵۰۷ [4] ایضاً ص ۴۱۳

اسلامی ہند کے نصف اول میں علوم عقلیہ کا رواج

از

جناب شبیر احمد خانصاحب غوری ایم اے

جناب مولانا ابو محفوظ الکریم المعصومی (محاضر التاریخ الاسلامی، مدرسہ عالیہ کلکتہ) نے "انڈو ایرانیکا" کی گذشتہ اشاعت میں "صدر الدین الشیرازی حیاتہ وآثارہ" کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے، اس کے اول و آخر میں ملا صدرا کی ہندوستان میں مقبولیت پر زور دیا ہے، آخر مقالہ میں تو صدرا (شرح ہدایۃ الحکمۃ از صدر الدین الشیرازی) کے کوئی چوبیس حاشیوں کا ذکر کیا ہے جو علمائے ہند نے اس کتاب پر لکھے ہیں، افتتاحیہ میں فرمایا ہے:-

وصلت کتب العلامۃ محمد بن ابراہیم	ملا صدرا کی تصنیفات ہندوستان پہنچیں تو
الشہیر بملا صدرا الی اقطار الہند	یہاں کے ممتاز علمی حلقوں نے ان کی طرف
فاقبلت علیہا الاوساط العلمیۃ	بڑی توجہ کی، ان کی نشر واشاعت میں اہتمام
بہا وعکفت علی نشرہا ودراستہا	اور انھیں درس میں شامل کیا، چنانچہ بعض
واحتل بعضہا مکانۃ خاصۃ	کتابوں کو درس نظامیہ کے نصاب میں
فی منہج الدرس النظامی	بڑی اہمیت اور خصوصیت حاصل ہوگئی۔

اور اس مقبولیت کی تمہید میں لکھا ہے:-

ولقد سجلت لنا صفحات التاریخ	صفحات تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان

ان الروابط العلمية بين المملكتين	ملکوں کے درمیان علمی تعلقات ہمیشہ مستحکم رہے
لم تزل متاكدة بتتابع اعلاة الحكمة	اور اس کی وجہ مغلیہ دربار سے حکمت اور
والفنون الى البلاط المغولي ثم رحلة	فنون کے ماہرین کی مسلسل وابستگی اور بعض شائقین
بعض المغرمين بالحكمة الى بلاد العجم"	حکمت کا سفر عجم (ایران) تھی،

ہندوستان اور ایران کے درمیان علمی و ثقافتی (اور اسی طرح سیاسی) روابط کا وجود ایک حقیقت ہے، جو بہر حال متحقق ہے، مگر یہ اس قسم کے روابط نہ تھے جس طرح آجکل کے خیر سگالی کے مشن ہر دو ملکوں کے درمیان بنا دیا کرتے ہیں، اس قسم کی متکلفانہ "روابط سازی" کا موضوع جب حقیقی روابط علمیہ کو بنایا جاتا ہے تو بات بڑی مضحکہ خیز ہو جاتی ہے، اور بڑے بڑے مدعیان تاریخ دانی بھی اس تکلف میں آکر سطحیت کا شکار ہو جاتے ہیں،

لیکن اگر مخلصانہ طور پر ان روابط علمیہ پر زور دینا تھا تو ان کی تفصیل کو پہلی صدی ہجری سے لے کر بارھویں صدی تک (جو ایک تاریخی حقیقت ہے) بیان کرنا چاہیے تھا، اور اگر اختصار مانع تھا تو کم از کم

(۱) نویں صدی ہجری سے قبل علوم عقلیہ کی اہمیت سے انکار نہیں کرنا چاہیے تھا، اور

(۲) نہ ان ثقافتی روابط کو "بلاط مغول" کی حد بندی سے محدود کرنا تھا،

کیونکہ یہ تو اپنے ہی موقف کی تردید ہے، لیکن معصومی صاحب کا فرمانا ہے

ويظهر من تتبع تاريخ الثقافة الاسلامية	ہندوستان کی اسلامی ثقافت کی تاریخ
في الهند ان الفنون العقلية لم تحظ	کے مطالعہ و تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ
بيانع التقدير في برنامج الدروس	نویں صدی ہجری کے آخر تک یہاں کے
السائدة الى نهاية القرن التاسع	مروجہ نظامہائے درس میں علوم عقلیہ
الهجري، وانهم ما تجاوزوا في درسهم	پوری طرح رائج نہ ہو سکے تھے اور

طیلۃ ھذہ المدۃ عن الرسالۃ الشمسیۃ فی المنطق وعن بعض الشروح علی کتاب الصحائف فی الفلسفۃ والکلام

اس طویل مدت میں منطق میں رسالہ شمسیہ اور فلسفہ و کلام کے بعض شروح جیسے شرح کتاب الصحائف سے انکے قدم آگے نہیں بڑھے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں :-

وفی اواخر القرن التاسع ریثما اعتلی السلطان سکندر اللودی (۸۹۴ھ - ۹۲۳ھ) علی عرش المملکۃ تطورت الحرکۃ العلمیۃ بنوع خاص واتسع المجال للعلوم العقلیۃ من ذی قبل ..... ونقرأ خاصۃ عن الشیخین عبد اللہ وعبد العزیز (؟ عزیز اللہ) التلنبیین انہما وفدا علی السلطان فاقبل علیہما بحفاوۃ بالغۃ وامدھما بہیبۃ وتوالہ حتی تکللت مساعیہما العلمیۃ بنجاح باھر؛ وھما یعتبران بحق صاحبی آیات فی نشر الدرس للفلسفۃ فی شمالی الھند۔

نویں صدی کے آخر میں جب سکندر لودی (۸۹۴ھ - ۹۲۳ھ) تخت حکومت پر بیٹھا علم و فن میں خاص طرح کی ترقی ہوئی اور پہلے کے مقابلہ میں علوم عقلیہ کا میدان وسیع ہوا ..... شیخ عبد اللہ و عبد العزیز (؟ عزیز اللہ) تلنبی کے متعلق خاص طور سے کہا جاتا ہے، کہ یہ دونوں بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ بڑے اعزاز و اکرام سے پیش آیا اور انھیں انعامات و تحائف سے نوازا، ان دونوں کی علمی کوششیں بڑی بارآور ہوئیں، اور شمالی ہند میں فلسفہ کی تعلیم کی اشاعت میں وہ نہایت نمایاں اور ممتاز سمجھے جاتے ہیں۔

اس کے بعد مغل عہد کے علمی و ثقافتی تغیرات کے بارے میں فرمایا ہے :-

تغیرت الظروف السیاسیة فی الهند	جب ہندوستان کے سیاسی حالات میں تبدیلی
واعتلت الاسرة التیموریة	ہوئی اور تیموری خاندان نے تخت حکومت
علی عرش المملکة نعند ئذٍ دخلت	پر قبضہ کیا تو ۱۹۹۱ھ میں خصوصاً جنوبی ہند
الفلسفة فی طور جدید من	سے سید فتح اللہ شیرازی (م ۹۹۷ھ)
الاز دهار وخاصة بقد دم	کی آمد سے فلسفہ نئے دور میں داخل ہوا
السید فتح اللہ الشیرازی (م ۹۹۷ھ)	اور اس کی مقبولیت میں غیر معمولی ترقی
من جنوبی الهند سنة ۹۹۱ه وهو	ہوئی، وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے متاخرین
اول من نشر فی الاصقاع الشمالیة	شاہیرایران کی کتابوں کو شمالی ہند
کتب المتاخرین من اعلام ایران	میں رائج کیا،

معصومی صاحب کا ماخذ جیسا کہ انھوں نے حاشیہ میں فرمایا ہے، میر غلام علی آزاد کا تذکرہ مآثر الکرام ہے، آزاد نے مولانا عبداللہ تلبنی کے حال میں لکھا ہے:-

آخر الامر از خرابی ملتان او و شیخ عزیز اللہ تلبنی رخت رحلت بدار الخلافہ دہلی کشیدند وعلم معقول را دریں دیار مروج ساختند و پیش ازیں غیر شرح شمسیہ و شرح صحائف از علم منطق وکلام در ہند شائع نبود۔"

اور مآثر الکرام کا ماخذ ملا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ ہے، بدایونی نے سلطان سکندر کے تذکرہ میں لکھا ہے:۔

واز جملہ علمائے کبار در زمان سلطان سکندر شیخ عبداللہ طلبنی در دہلی و شیخ عزیز اللہ طلبنی در سنبھل بودند، ایں ہر دو عزیز ہنگام خرابی ملتان بہندوستان آمدہ علم معقول را دراں دیار رواج دادند و قبل ازیں بغیر از شرح شمسیہ و شرح صحائف از علم منطق وکلام در ہند شائع نبود۔"

اگر فاضل مقالہ نویس آزادہی کے حوالے پر اکتفا فرماتے تو بات گمراہ کن نہ ہوتی، آخر انھوں نے ملا صدرا کی بعض مصنفات کے بارے میں بھی تو "والعہدۃ علی ہواکلمان" لکھ کر خود کو بری الذمہ کر لیا ہے۔ مگر خدا جانے یہاں کس خیال کے ماتحت انھوں نے اس بات کے "تاریخی حقیقت ثابتہ" ہونے کا ادعا فرمانا مناسب سمجھا کہ

یظہر من تتبع تاریخ الثقافۃ	ہندوستان کی اسلامی ثقافت کی
الاسلامیۃ فی الھند ان الفنون	تاریخ کے مطالعہ و تتبع سے ظاہر
العقلیۃ لم تحظ ببالغ التقدم	ہوتا ہے کہ نویں صدی ہجری کے آخر تک
فی مناہج الدروس السائدۃ	یہاں کے مروجہ نصاب درس میں علوم عقلیہ
الی نہایۃ القرن التاسع الھجری	پوری طرح رائج نہ ہو سکے تھے۔

اس قسم کا دعوی اگر کسی جدید تعلیم یافتہ کے قلم سے نکلتا تو کچھ مستبعد نہ ہوتا لیکن قدیم درسگاہوں کے فضلاء جن سے بجا طور پر توقع کی جاتی ہے کہ وہ اسلامی علوم کے تعلق باہمی سے کما حقہ واقف ہونگے اگر اس قسم کا استدلال کریں کہ چونکہ نویں صدی سے پیشتر منطق میں "شمسیہ" (؟ شرح شمسیہ یا قطبی) اور کلام میں "شرح الصحائف" سے زیادہ کا رواج نہ تھا، اس لیے قبل مغل اسلامی ہند میں معقولات کا معیار کچھ اونچا نہ تھا، تو بڑا افسوس ہوتا ہے،

نیز یہ استدلال اور سطحیت اس دیرینہ غلط فہمی کے استناد کا موجب ہو سکتے ہیں جو قبل مغل عہد کے ہندوستانی علماء کی مساعی فکریہ کے متعلق مخالفوں کے ذہن میں جاگزیں ہیں کہ

"ان کی سرگرمیاں صرف مذہبی رسوم کی جزئیات کے التزام میں محدود رہیں، انھوں نے علم و حکمت کی ترقی میں کوئی حصہ نہیں لیا"

اور جس کے ازالے کی طرف ڈاکٹر اقبال نے علامہ سید سلیمان ندوی کی توجہ دلائی تھی۔

"دارالمصنفین سے ہندوستان کے حکماے اسلام پر ایک کتاب نکلنی چاہیے، اس امر کی سخت ضرورت ہے، عام طور پر یورپ میں سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی کوئی فلسفیانہ روایات نہیں ہیں۔" (مکتوب اقبال بنام سید سلیمان ندویؒ، معارف اکتوبر ۱۹۵۵ء ص ۳۱۴)

اس لیے اس قسم کی گمراہ کن غلط فہمیوں کے ازالے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، بہرحال نہ تو

(۱) علوم عقلیہ محض منطق اور کلام میں محدود ہیں، جیسا کہ معصومی صاحب نے سمجھا ہے کہ

ان الفنون العقلیہ	فنون عقلیہ ...... اس طویل مدت
ما تجاوزت وافی دروسهم	میں منطق میں رسالۂ شمسیہ اور فلسفہ و
طیلة هذه المدة عن الرسالة	کلام کے بعض شروح جیسے شرح کتاب
الشمسیة فی المنطق وعن بعض	الصحائف سے لوگوں کے قدم آگے
الشروح علی کتاب الصحائف	نہیں بڑھے۔
فی الفلسفة والکلام	

(۲) نہ علمی روابط صرف "بلاط مغولی" ہی کے ساتھ مختص تھے، جیسا کہ فاضل مقالہ نگار نے دعویٰ کیا ہے:

ان الروابط العلمیة بین	دونوں ملکوں کے درمیان علمی تعلقات
المملکتین لم تزل متاکدة بتتابع	ہمیشہ مستحکم رہے اور اس کی وجہ مغلیہ
اعلام الحکمة والفنون	دربار سے حکماء اور ماہرین فن کی
الی البلاط المغولی	مسلسل وابستگی تھی۔

(۳) نہ نویں صدی سے پیشتر ہندوستان میں علوم عقلیہ کی وہ کساد بازاری تھی جس کے ثابت کرنے پر معصومی صاحب اس درجہ مصر ہیں۔

(۱) علوم عقلیہ

اسلامی علوم کی مختلف تقسیمیں کی گئی ہیں جن کی تفصیل موجب تطویل ہوگی، ویسے عام طور پر انھیں منقول اور معقول میں تقسیم کیا جاتا ہے، منقول میں علوم دینیہ (تفسیر، حدیث، فقہ) اور علوم ادبیہ آتے ہیں، اور معقول میں منطق، فلسفہ، ریاضی وطب وغیرہ، جنھیں مجموعی طور پر "حکمت" کہتے ہیں، کبھی کبھی کلام کو اور کبھی کبھی اصول فقہ کو بھی معقول ہی میں محسوب کر لیا جاتا ہے، کیونکہ ان دونوں میں بھی محض شواہد شرعیہ پر اکتفا نہیں کیا جاتا، عقلی دلائل بھی دیے جاتے ہیں۔

فلسفہ یا حکمت کی دو بڑی قسموں میں تقسیم کی جاتی ہے: حکمت نظری اور حکمت عملی۔ اول الذکر کی تین قسمیں ہیں طبیعیات، ریاضیات اور الٰہیات، آخر الذکر کی بھی تین قسمیں ہیں: اخلاق، تدبیر منزل اور سیاست مدن۔

حکمت عملی کی تینوں قسموں کی تعلیم کا کبھی کوئی رواج نہیں رہا، نہ ہندوستان میں اور نہ عراق و ایران میں، اگرچہ بعض یونانیت پسندوں نے ارسطو کی "کتاب الاخلاق" اور افلاطون کی "کتاب السیاسۃ" (Republic) کے ساتھ ترجمہ وتفسیر کے ذریعے اعتنا کیا، نیز ان کی تقلید میں مستقل تصانیف مرتب کیں، مگر عام علمی حلقوں میں انھیں مقبولیت نصیب نہ ہو سکی، اس کی وجہ مولانا فضل حق خیرآبادی نے "ہدیہ سعیدیہ" میں لکھی ہے:-

والحکمۃ العملیۃ... وقد ضرب	حکمت عملیہ کی مزاولت سے لوگوں نے
الناس صفحا عن مزاولتہا و	صرف نظر اور چند اشخاص کے علاوہ اس کے
اعرضوا الا قلیلا عن محاولتہا	حصول سے اعراض کیا، کیونکہ دین حنیف
فان الملۃ الحنیفیۃ البیضاء	اور شریعت مصطفوی نے اس کی ضرورت

والشریعۃ المصطفویۃ لما کانت قد تضمنت الوطر عنہا علی وجہ ہو اتم تفصیلا والوحی الالٰہی الربانی قد اغنی عن اعمال الفکر الانسانی فیہا بما ہو اکثر نفعا واکبر تفضیلا۔

بدرجۂ کمال پوری کردی اور وحی الٰہی نے فکر انسانی کے اعمال سے کہیں زیادہ نفع بخش اور افضل و برتر شے عطا کر کے اس سے بے نیاز کردیا۔

طبعیات کے اصول طب کی کتابوں کے تمہیدی مقدمات میں آتے ہیں اسلیے ان پر واقف ہوئے بغیر طب کے اصول کا سمجھنا ناممکن ہوتا ہے، لہذا طب کی تعلیم کے لیے طبعیات کی تعلیم ضروری ہے،

ریاضیات کے چار شعبے ہیں :- حساب، ہندسہ، ہیئت اور موسیقی، حساب اور اس کی مختلف شاخوں سے واقفیت دیوانِ کتابت کے کتاب اور دبیروں کے لیے ضروری تھی، اس لیے اس کا رواج ہر زمانہ میں ناگزیر تھا، ہندسہ مساحت کے لیے لابدی ہے، اور مساحت تشخیص خراج کے واسطے ازبس ضروری ہے، بالخصوص ہندوستان جیسے ملک میں جہاں کی معیشت کا دارومدار زرعی اقتصادیات پر ہے، نیز فن تعمیر میں مہارت کے لیے بھی ہندسہ دانی شرط ہے، اس لیے ہر ترقی یافتہ ملک میں فن تعمیر کے ضمن میں ہندسہ کی ترقی فطری ہے، ہیئت کا جاننا نجوم میں حذاقت کے لے ازبس ضروری ہے، لہذا جہاں نجوم کا چرچا ہوگا (جیساکہ ہندوستان میں) وہاں لوگ ہیئت سے ضرور واقف ہوں گے، رہی موسیقی تو ہر تہذیب میں اس کا مخصوص مقام ہوتا ہے،

الٰہیات کے مسائل کا مسائل کلامیہ سے تصادم ناگزیر ہے۔ اس لیے علم کلام کے افہام و تفہیم کے لیے فلسفہ الٰہیات میں تبحر ضروری ہے، چنانچہ شیوخ معتزلہ نے جو علم کلام کے بانیوں میں تھے، شروع ہی سے خود کو فلسفہ سے آشنا بنانے کی سرگرم کوشش کی، شہرستانی نے "الملل والنحل" میں لکھا ہے :-

ثم طالع بعد ذلك شیوخ المعتزلة كتب الفلاسفة حين فسرت ايام المامون فخلطت مناهجها بمناهج الكلام...... فكان ابو الهذيل العلاف شيخهم الاكبر وافق الفلاسفة..... ثم ابراهيم بن سيار النظام فی ایام المعتصم كان اعلى فی تقرير مذاهب الفلاسفة.... ثم ظهرت بدع بشر بن المعتمر...... والميل الى الطبيعيين من الفلاسفة"

اس کے بعد جب مامون کے زمانہ میں فلاسفہ کی کتابوں کی تشریح کی گئی تو شیوخ معتزلہ نے ان کا مطالعہ کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فلسفہ کلام کے ساتھ خلط ملط ہو گیا...... اور معتزلہ کا سرخیل ابو الہذیل علاف فلاسفہ کا ہم خیال ہو گیا...... پھر معتصم کے زمانہ میں مذاہب فلاسفہ کے اثبات میں ابراہیم بن سیار نظام سب سے بہتر تھا، ...... پھر بشر بن معتمر نے نئے خیالات ظاہر کیے..... اور فلاسفۂ طبیعین کی جانب لوگوں کا میلان بڑھا،

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فلسفہ کلام کے ساتھ خلط ملط ہونا شروع ہو گیا، چنانچہ علامہ تفتازانی نے شرح عقائد نفسی میں لکھا ہے:۔

لما نقلت الفلسفة عن اليونانية الى العربية وخاض فيها الاسلاميون وحاولوا الرد على الفلاسفة فيما خالفوا فيه الشريعة خلطوا بالكلام كثيراً من الفلسفة ليتحققوا مقاصدها فيتمكنوا من ابطالها۔

پھر جب یونانی زبان سے عربی زبان میں فلسفہ منتقل کیا گیا اور علمائے اسلام نے اس کی جانب توجہ کی اور فلاسفہ کی مخالف شریعت باتوں کے رد کا ارادہ کیا تو اس مقصد کے حصول اور فلسفہ کے ابطال کے لیے کلام اور فلسفہ کے اکثر حصے ایک دوسرے سے خلط ملط کر دیے

اور یہ اختلاط متاخرین متکلمین کے یہاں اپنی انتہا کو پہنچ گیا، چنانچہ ابن خلدون نے لکھا ہے :-

ثم توغل المتاخرون من بعدهم	پھر متاخرین کتب فلسفہ کو خلط ملط کرنے
فی مخالطة کتب الفلسفة	میں حد سے زیادہ بڑھ گئے ..... اور کلام
والتبست مسائل الکلام بمسائل	وفلسفہ کے مسائل اس قدر گڈمڈ ہوگئے کہ
الفلسفة بحیث لا یتمیز احد الفنین	ایک فن کا دوسرے سے امتیاز کرنا مشکل
من الآخر۔	ہوگیا،

پھر بات علم کلام تک ہی محدود نہیں رہی، کلام سے بڑھ کر اصول فقہ تک علوم عقلیہ سے متاثر تھا، کیونکہ دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے، اصول فقہ کی بنیاد بھی اسی شخص نے ڈالی تھی جو باتفاق علم کلام کا بانی سمجھا جاتا ہے یعنی واصل بن عطا، ابو ہلال العسکری نے اس کے بارے میں لکھا ہے،

وهو اول من قال الحق یعرف من	وہ پہلا شخص ہے جس نے کہا کہ معرفت حق
وجوه اربعة کتاب ناطق وخبر	کے چار ذرائع ہیں، کتاب ناطق، متفق علیہ
مجتمع علیه وحجة عقل واجماع	روایت، دلیل عقلی اور اجماع،
من الامة (کتاب الاوائل ص ۹۵)	

واصل کا شاگرد عثمان بن خالد الطویل تھا، اور اس کا شاگرد ابو الہذیل العلاف، ابو الہذیل کی شاگردی مدتوں امام شافعی نے کی تھی، اور انداز استدلال واستنباط انہی متکلمین سے سیکھا تھا، امام شافعی ہی عام طور پر پہلے مصنف سمجھے جاتے ہیں جنھوں نے اصول فقہ پر رسالہ لکھا، بعد کے لوگ ان ہی کے نقش قدم پر چلے، اس لیے اصول فقہ کا علم کلام سے متاثر ہونا فطری تھا، متاخرین شوافع (امام الحرمین اور امام غزالی) نے اصول فقہ کی کلاسیکی کتابیں لکھیں،

کچھ لوگ اس اولیت کا شرف امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگرد رشید امام ابو یوسف کو دیتے ہیں لیکن

امام صاحب فقہ کو اپنانے سے پہلے عمر گرامی کا بڑا حصہ علم کلام میں صرف کر چکے تھے، اس لیے ان کے سلسلے میں معقولیت کا آنا فطری تھا، اور فقہائے حنفیہ اصول فقہ کے دو مسلکوں میں سے ایک مسلک (فقہی) کے ترجمان سمجھے جاتے ہیں،

بہر حال اصول فقہ کے دو مسلک ہیں: ۔متکلمانہ اور فقیہانہ ۔مقدم الذکر میں زیادہ اعتنا، قواعد کے ساتھ کیا جاتا ہے، اور پختگی استدلال نیز ایراد و دفع اعتراضات پر زور دیا جاتا ہے، موخر الذکر میں قواعد کے ساتھ ان کے امثلہ و نظائر بھی بیان کیے جاتے ہیں، اور فقہی نکات سے مسائل کی تفریع کی جاتی ہے۔

کلامی انداز پر لکھنے والوں کی دو جماعتیں ہیں، معتزلہ اور اشاعرہ

معتزلہ نے شروع سے اس موضوع پر کتابیں لکھیں، مگر زیادہ شہرت دو کتابوں کو ہوئی: عبدالجبار معتزلی کی "کتاب العمد" اور ابوالحسین البصری کی "شرح کتاب العمد"۔

اشاعرہ (شوافع) کی بھی دو کتابیں کلاسیکی حیثیت رکھتی ہیں، امام الحرمین کی "کتاب البرہان" اور امام غزالی کی "مستصفی الاصول"

بعد میں امام رازی نے چاروں کتابوں کو "کتاب المحصول" میں ملخص کیا۔ کتاب المحصول کا اختصار سراج الدین ارموی نے "محصل" کے نام سے اور تاج الدین ارموی نے "حاصل" کے نام سے کیا،

کتب اربعہ (العمد، شرح العمد، برہان، مستصفی کا دوسرا ملخص سیف الدین آمدی نے "کتاب الاحکام" میں کیا، امام رازی نے محصول میں استدلال و احتجاج پر زیادہ زور دیا تھا۔ آمدی نے تحقیق مذاہب و تفریع مسائل پر زیادہ توجہ دی،

امام رازی کی "کتاب المحصول" اور سیف الدین آمدی کی "کتاب الاحکام" کے مقدمات کو کچھ اضافوں کے ساتھ شہاب الدین قرافی نے "تنقیحات" میں مدون کیا، اسی طرح امام بیضاوی نے انکی مدد سے منہاج الاصول لکھی

آمدی کی کتاب الاحکام کی ابن حاجب نے پہلے "المختصر الکبیر" میں اور پھر "المختصر الصغیر" میں تلخیص کی، جو اپنے وقت میں اس فن کی اہم کتاب سمجھی جاتی تھی۔

احناف نے اپنے رنگ میں متعدد کتابیں لکھیں، سب سے مشہور ابوزید دبوسیؒ کی تقویم الادلہ ہے، کچھ دن بعد فخر الاسلام بزدوی نے "کشف الاسرار" لکھی جو "اصول بزدوی" کے نام سے عرصہ دراز تک قبل مغل ہندوستان کے نصاب میں مشمول رہی، بلکہ بزدوی جو "العالم الالمعی والفاضل اللوذعی" کا مترادف سمجھا جاتا تھا،

بعد ازاں ابن الساعاتی نے آمدی کی کتاب الاحکام اور کشف بزدوی کے مسائل کو "کتاب البدیع" میں جمع کر دیا، اس طرح یہ کتاب کلامی اور فقہی دونوں مسلکوں پر حاوی ہو گئی، کتاب البدیع کی توضیح مع بیش از ابن الہمام نے "التحریر" میں کی،

صدر الشریعہ نے توضیح میں کشف بزدوی کی وضاحت کی، بعد میں علامہ تفتازانی (شافعی) نے توضیح کی شرح (اور بقول بعض جرح) تلویح کے نام سے کی،

اس مختصر سے تاریخی جائزے سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اصول فقہ پر کلام کا کس درجہ اثر تھا، یہی نہیں بلکہ بعض ابحاث کلام اور اصول فقہ میں مشترک ہیں، مثلاً "مباحث نظر" یا "مسئلہ حسن و قبح افعال"۔ کلام کے توسط سے اول الذکر منطق تک پہنچتا ہے اور آخر الذکر فلسفۂ الٰہیات تک، اس لیے اصول کی کماحقہ تعلیم کے لیے جو قبل مغل عہد کے درسی نصاب کا جزو اشرف تھی، معقولات کی تعلیم ضروری تھی،

اور پانچویں صدی کے بعد سے تو منطق اصول فقہ کے لیے شرط اولین بن چکا تھا، اس سے پہلے فلاسفہ میں منطق کا اور متکلمین میں جدل کا رواج تھا، جسے وہ استدلال و استنباط کے لیے استعمال کرتے تھے، مگر پانچویں صدی کے آخر میں امام غزالی نے جہاں فلسفہ و معقولات کو عمومی درس میں شامل کیا منطق کو اصول فقہ کا جزو لاینفک بلکہ مدار علیہ بنا دیا، چنانچہ حافظ ابن تیمیہ نے "الرد علی المنطقیین" میں لکھا ہے:-

واول من خلط منطقهم باصول المسلمين ابو حامد الغزالي و تكلم فيه علماء المسلمين بما يطول شرحه

منطق کو مسلمانوں کے اصول فقہ سے خلط کرنے والے پہلے شخص ابو حامد غزالی ہیں، علمائے اسلام نے اس پر جو بحث کی ہے اس کی شرح طویل ہے۔

دوسری جگہ وہ "الامام الغزالی وعلم المنطق" کے زیر عنوان لکھتے ہیں:۔

وانما كثر استعمالها من زمن ابي حامد فانه ادخل مقدمة في المنطق في اول كتابه المستصفى وزعم انه لا يثق بعلمه الا من عرف هذا المنطق وصنف فيه معيار العلم ومحك النظر

منطق کا استعمال ابو حامد کے زمانہ سے زیادہ ہوا، انھوں نے اپنی کتاب المستصفی کے شروع میں منطق پر ایک مقدمہ لکھا ہے ان کا خیال ہے کہ جس شخص کو اس منطق سے واقفیت نہ ہو اس کے علم کا کوئی اعتبار نہیں اور انھوں نے منطق میں معیار العلم [illegible]

مثلاً حد (تعریف) کے متعلق امام غزالی سے پہلے جمہور متکلمین کا خیال تھا کہ اس کا فائدہ یہ ہے کہ جس چیز کی تعریف مقصود ہے اسے دوسری چیزوں سے ممتاز کر دے، اس کے برخلاف اہل منطق کا اصرار تھا کہ وہ اس کی تصویر کھینچ دے اور حقیقت کو متعارف کرا دے، مگر امام غزالی نے متکلمین کا مسلک چھوڑ کر منطقیوں کا مسلک اختیار کیا اور اس کی خاطر "مستصفی الاصول" میں ایک منطقی مقدمہ کا اضافہ کیا، حافظ الامام ابن تیمیہ نے لکھا ہے:۔

المحققون من النظار يقولون ان الحد فائدته التمييز بين المحدود وغيره كالاسم وليس فائدته

محققین متکلمین کہتے ہیں کہ حد کا فائدہ اسم کی طرح محدود کو دوسری چیزوں سے ممتاز کرتا ہے، نہ کہ محدود کی تصویر کھینچنا، اور

تصوير الحد و دون تعريف
حقيقته وانما يدعي هذا
اهل المنطق ... وانما دخل
هذا في كلام من تكلم في اصول
الدين و (اصول) الفقه بعد
ابي حامد (الامام الغزالي)
في اواخر المائة الخامسة
واوائل المائة السادسة
فاما ابو حامد فقد وضع
مقدمة منطقية في اول
المستصفى وزعم ان من لم
يعرف بها علما فلا ثقة له
بشيء من علوم وصنف في
ذالك محك النظر ومعيار
العلم ولما اشتدت به ثقته
...... وهؤلاء الذين
تكلموا في الاصول بعد ابي حامد
الذين تكلموا في الحد و بطريق
اهل المنطق اليوناني

اس کی حقیقت ظاہر کرنا، یہ تو منطقیوں
کا دعویٰ ہے......... اور یہ
چیز اصول دین اور اصول فقہ
میں کلام کرنے والوں کے یہاں
امام غزالی کے بعد پانچویں صدی
کے اواخر اور چھٹی صدی کے اوائل
میں داخل ہوئی ہے، انھوں نے
مستصفی کے شروع میں ایک منطقی
مقدمہ لکھا ہے، اور ان کا خیال ہے
کہ جس شخص کو اس سے واقفیت
نہ ہو اس کی کسی علم میں مہارت کا
اعتبار نہیں، اس موضوع پر ابو حامد
نے محک النظر و معیار العلم تصنیف
کی، جس پر ان کو بڑا اعتماد تھا۔
ابو حامد کے بعد جن لوگوں نے
اصول پر بحث کی ہے ان ہی نے
یونانی منطق والوں کے طرز پر
حدود میں بحث کی ہے۔

ہندوستان میں اس عہد کے اندر امام فخر الاسلام بزدوی کی کشف الاسرار (اصول بزدوی) اور امام حسام الدین کی حسامی مروج تھیں، مگر ان کتابوں کی کما حقہ تعلیم کے لیے اصول فقہ کی دوسری مستند کتابوں پر نظر ضروری تھی اور مستصفی بغیر منطق میں ید طولیٰ حاصل کیے حل نہیں ہو سکتی تھی،

پھر شرح شمسیہ قطب الدین رازی کی تصنیف ہے، جو غالباً آٹھویں صدی میں لکھی گئی اور شاید آٹھویں صدی کے آخر میں بعہد فیروز شاہ تغلق ہندوستان میں مروج ہوئی، اسی طرح شرح صحائف بھی، حالانکہ عربی مدارس ہندوستان میں چھٹی صدی کے آخر سے قائم ہونا شروع ہو گئے تھے (تفصیل آگے آئیگی)، سوال یہ ہے کہ آٹھویں صدی سے پہلے بغیر شرح شمسیہ اور شرح صحائف کے اصول بزدوی (جو پہلے بھی متداول تھی) کس طرح پڑھی پڑھائی جاتی ہوگی، کلام کے سلسلے میں تو معلوم ہے کہ ابتدائی زمانہ میں "تمہید ابو شکور سلمی" کا رواج تھا، مگر منطق و معقولات کی کسی کتاب کے نام کی صراحت نہیں ملتی، حالانکہ منطق و فلسفہ اصول فقہ کی رگ و پے تک میں سرایت کر گئے تھے اور اس لیے اس کی کما حقہ تعلیم و تدریس (بزدوی خواں بننے کے لیے) کے واسطے ان علوم پر علی وجہ البصیرۃ نظر ناگزیر تھی،

لیکن تاریخ شاہد ہے کہ قبل مغل عہد کے ہندوستان میں علوم عقلیہ کی بھی گرم بازاری تھی، مگر اس کی تفصیل سے پیشتر ان اہم تاریخی اوقات کا تعین مستحسن ہے، جو وقتاً فوقتاً یہاں کی علمی سرگرمیوں کو عموماً اور معقولات کی تعلیم کو خصوصاً سریع سے سریع بنانے کے محرک ہوا کیے ہیں،

(باقی)

عرب و ہند کے قدیم تجارتی تعلقات

از

جناب قاضی اطہر صاحب مبارک پوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

اس موضوع پر اس سے پہلے بھی لکھا جا چکا ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بھی "عرب ہند کے تعلقات" میں دونوں ملکوں کے تجارتی تعلقات دکھائے ہیں، لیکن وہ اجمالی ہیں، اس مضمون میں تفصیلی اور بعض نئے معلومات ہیں، اور اس پہلو کو خصوصیت کے ساتھ دکھایا گیا ہے کہ یہ تجارتی تعلقات عہد رسالت میں بھی قائم تھے، اور اس زمانہ میں عرب میں ہندوستانی چیزوں کا استعمال عام تھا، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام بھی ان کو استعمال فرماتے تھے۔

ہندوستان کے کس مقام سے کیا چیز عرب میں جاتی تھی؟

عہدِ رسالت اور اس کے بعد تک عرب و ہند کے درمیان گوناگوں تعلقات تھے، مگر تجارتی تعلق سب سے زیادہ قدیم اور اہم تھا، ہندوستان کے مختلف علاقوں سے مختلف قسم کی تجارتی اشیاء، عرب جایا کرتی تھیں، اور پھر وہاں کے مختلف بازاروں اور دوسرے ملکوں میں جاکر فروخت ہوتی تھیں، ہم ان کی اجمالی فہرست قدیم جغرافیہ نویس ابن خرداذبہ کی کتاب المسالک والممالک سے پیش کرتے ہیں۔

ابن خرداذبہ نے پہلے اجمالی طور سے بتایا ہے کہ ہندوستان سے ہر قسم کا عود، صندل، کافور، ماخور، جوزبوا، قرنفل، قاقلہ، کبابہ، نارجیل، نباتاتی کپڑے، روئی کے مخملی کپڑے اور ہاتھی دیار عرب میں جاتے تھے، سرندیپ سے ہر قسم اور ہر رنگ کے یاقوت، موتی، بلور، سنبادج

ملی اور سنجان (سندان) سے فلفل، کلہ سے رصاص قلعی، جنوب سے بقم اور وادی یعنی تاڑ ملی،
اور سندھ سے قسط، بانس اور بید کی لکڑیاں عرب میں بھیجی جاتی تھیں۔[۱۵]

اس کے بعد تفصیل سے جس مقام سے جو چیز جاتی تھی۔ اس کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ سندھ میں قسط، بانس اور بید ہوتے ہیں، دریا سے سندھ سے اوتکین تک چار دن کی مسافت ہے، اس پورے علاقہ کے پہاڑوں میں بانس کی پیداوار ہوتی ہے، سندان میں ساگوان اور بانس ہوتے ہیں، کم کم (کوکن) ساگوان کا ملک ہے، جزیرہ رامی میں گینڈے اور بید پیدا ہوتے ہیں، کلہ میں بھی بید کے جنگل ہیں، باتن، سنجلی اور کیشکان میں چاول ہوتا ہے، کنجہ اور لوا میں چاول اور گیہوں دونوں ہوتے ہیں، نیز سمندر، بالوس اور قمار میں چاول زیادہ ہوتا ہے، شلاہط (سلہٹ) میں قرنفل یعنی لونگ ہوتی ہے، کامرون وغیرہ سے عود مقام سمندر میں لائی جاتی ہے، سرندیپ کے پہاڑوں پر عود پیدا ہوتی ہے، (رہمی (بنگال) میں روئی کا مخملی کپڑا، اور عود ہندی ہوتا ہے، جزیرہ تیومہ، قمار اور صنف میں بھی عود ہوتا ہے، عود قماری سے بہتر عود صنفی ہوتی ہے، یہ عمدہ اور وزنی ہونے کی وجہ سے پانی پر تیرتی نہیں بلکہ ڈوب جاتی ہے، نیز سرندیپ میں مشک اور زباد ہوتے ہیں، زانج کے پہاڑوں میں کافور ہوتا ہے، تیومہ میں بھی کافور ہوتا ہے، اور جزیرہ بالوس کا کافور بہت ہی عمدہ ہوتا ہے، سرندیپ میں عطر اور قسم قسم کی خوشبوئیں ہوتی ہیں۔ جابہ عطر کا دیس ہے، شلاہط میں صندل اور سنبل ہوتا ہے، کلہ میں رصاص قلعی کی کان ہے، جزیرہ رامی کے باشندے سمندر میں تیر کر اور کشتیوں پر عرب تاجروں کے جہاز تک آتے ہیں، اور لوہے کے بدلے عنبر فروخت کرتے ہیں، جزیرہ نکبالوس کی دولت لوہا ہے، سرندیپ کے پہاڑوں پر اور ان کے اطراف میں ہر قسم اور ہر رنگ کے یاقوت پائے جاتے ہیں، اور اس کی

---

۱۵ المسالک والممالک ص ۱۷

وادیوں میں الماس اور پہاڑوں میں عود، فلفل، عطر، خوشبو، مشک، زباد کے جانور، نارجیل اور صنادج کی کثرت ہے، یہاں کے دریاؤں میں بلور ہے، اور اطراف میں سمندر سے موتی نکلتے ہیں، جزیرہ رامی میں بید، بقم اور سم وساہ پائے جاتے ہیں، اس تریاق کو مسافروں نے سانپ کے زہر میں آزمایا ہے، اور نشین میں ہاتھی، چوپائے بھینسیں اور دیگر اشیاء پائی جاتی ہیں، اس کے آگے ابینہ میں ہاتھی پایا جاتا ہے، رامی میں گینڈا ہوتا ہے، قامرون کے علاقہ میں گینڈا اور سونا بہت زیادہ ہے، زابج کے پہاڑوں میں سانپ اور اژدہے پائے جاتے ہیں،[۱]

عرب جانے والی ہندوستانی اشیاء کی یہ فہرست مکمل نہیں ہے، بلکہ مذکورہ اشیاء کے علاوہ بھی بہت سی تجارتی چیزیں یہاں سے جاتی تھیں، مثلاً ہندی تلواریں، سندھ سے سندھی کپڑے، سندھی مرغی، بالہ اونٹ (فالج) جس کی نسل سے عرب کا مشہور بختی اونٹ ہوتا ہے، مندل سے عود ہندی، بروص (بھڑوچ) سے بھڑوچی نیزے اور ان کے بانس، کھنبائت اور سندان سے نعال کنبایتہ یعنی کھمبائت کے جوتے اور نارجیل، تھانہ سے عمدہ کپڑے، اور اسی طرح مختلف مقامات کی مختلف چیزیں عرب میں جایا کرتی تھیں،

عرب میں ہندستانی مال کی تین ساحلی منڈیاں ابلہ صحار اور عدن یوں تو پورے عرب میں ہندوستان کے مال کی کھپت ہوتی تھی، اور دورِ جاہلیت کے ہر بازار میں یہاں کی چیزیں فروخت ہوتی تھیں، مگر انکی چند خاص منڈیاں بھی تھیں، جہاں یہ چیزیں بھاری مقدار میں رہا کرتی تھیں، گویا یہ ہندوستانی اشیاء کے گودام تھے، جیسے ابلہ، صحار اور عدن وغیرہ، جہاں عرب کے ساحلی شہروں کے علاقوں سے بلکہ ہندوستان اور چین تک سے تجارتی جہاز اور کشتیاں لنگر انداز ہوتی تھیں، ابلہ قدیم زمانہ سے ارض الہند اور فرج الہند والسند کے لقب سے مشہور تھا، حضرت عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ

[۱] المسالک والممالک ص ۶۰ تا ۶۵

نے جب ۱۴ھ میں ابلہ کو فتح کیا تو اس کی مرکزیت کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جو مکتوب لکھا اس میں تحریر تھا،

امابعد فان اللہ ولہ الحمد	اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں ابلہ پر
فتح علینا الابلہ وھی مرفئ	فتح دی ہے، یہ مقام عمان، بحرین،
سفن البحر من عمان والبحرین	فارس، ہندوستان اور چین سے
وفارس والھند والصین	آنے والے جہازوں کا بندرگاہ ہے،

جب ابلہ کے قریب ۱۴ھ میں بصرہ آباد ہوا تو اس کی تجارتی مرکزیت کی وجہ سے بعض صحابہ نے یہاں تجارتی کاروبار کرنے کا ارادہ کیا، چنانچہ حضرت نافع بن حارث بن کلدہ ثقفی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا:

یا امیر المومنین انی قد ابلیت	اے امیر المومنین! میں نے بصرہ میں
فلاء بالبصرۃ واتخذت	ایک جگہ اپنے لیے گھیر رکھی ہے اور
بھا تجارۃ [۱]	اور وہاں پر تجارتی کاروبار شروع کر دیا ہے،

حضرت عمرؓ نے حضرت عتبہ بن غزوان کو اس بارے میں ایک سفارش لکھ دی۔

ابلہ کے بعد خلیج عربی کے سواحل پر ظفار اور صحار ہندوستانیوں کی بحری تجارت کے قدیم مرکز تھے، فجر الاسلام میں ہے:

وفی شرقی حضرموت ظفار	حضرموت کے مشرق میں ظفار قدیم
وھی من قدیم مصدر للتوابل	زمانہ سے گرم مسالوں، خوشبوؤں اور
والطیب وبخور المعابد	عبادت گاہوں کے بخور کی منڈی ہے۔

---

[۱] الاخبار الطوال ص ۱۱۷

ولا یزال الی الیوم یرسل منہا الی الھند۔[1]	اور آج بھی یہاں سے ہندوستان سے یہ مال بھیجا جاتا ہے۔

جاہلی دور کے خاص خاص بازاروں میں عمان کے سوق صحار اور سوق دبا (دوبئی) بہت مشہور تھے، جن میں سندھ، ہند، چین اور مشرق و مغرب کے غیر ملکی تاجر جمع ہوتے تھے۔ ان کا نگراں مقامی حاکم جلندی بن مستکبر تھا، جو تاجروں سے عشر لیتا تھا۔[2]

جنوبی عرب میں ہندوستانیوں کی بحری تجارت کا اہم مرکز یمن تھا، جس میں صنعاء، تعز، عمدان، مآرب، نجران اور عدن جیسے بڑے بڑے شہر شامل تھے، ابن خرداذبہ نے عدن کے بارے میں لکھا ہے:-

وبہا العنبر والعود والمسک	یہاں پر عنبر، عود، مشک ملتا ہے،
ومتاع السند والھند والصین	اور سندھ، ہندوستان، چین، زنگ،
والزنج والحبشۃ وفارس	حبشہ، فارس، بصرہ، جدہ اور بحر قلزم
والبصرۃ وجدۃ وقلزم[3]	کے سامان اور مال رہتے ہیں۔

یمن کی قدیم تجارت میں ہندوستانی اشیاء کی کثرت اور ان کی نکاسی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے:-

کانت التجارۃ قدیما فی ید	قدیم زمانہ میں تجارت اہل یمن کے ہاتھ
الیمنیین وکانوا ھم العنصر	میں تھی، اور یہ لوگ تجارت میں غالب عنصر
الظاھر فیہا فعلی یدھم کانت	تھے، ان کے ہاتھوں حضر موت اور
تنقل غلات حضرموت و	ظفار کے مال اور ہندوستان کی چیزیں

---

[1] فجر الاسلام ج ۱ ص ۱۲ [2] کتاب المحبر ص ۲۶۶ طبع حیدرآباد اور کتاب الامکنہ والازمنہ ج ۲ ص ۱۶۳ طبع حیدرآباد
[3] المسالک والممالک ص ۶۱

وظفار و واردات الہند الی الشام و مصر[1] شام اور مصر جایا کرتی تھیں۔

اندرون عرب کا سب سے اہم تجارتی مرکز مکہ مکرمہ

یمن اور عدن مشرقی دنیا کے تجارتی مال کی قدیم منڈی تھے، یہاں سے دوسرے ممالک میں عرب تاجروں کے ذریعہ مال جایا کرتا تھا، مگر بعد میں ایرانیوں اور رومیوں کے عمل دخل کی وجہ سے یہاں کی تجارت پر زوال آگیا، بحر احمر پر رومیوں کے غلبہ کے بعد جب یمنیوں کی تجارت کمزور پڑنے لگی تو اہل یمن نے بحری راستہ کے بجائے اندرون عرب کے بری راستوں سے غیر ملکوں کا تجارتی سفر شروع کیا، یہ راستہ حضرموت سے شروع ہوتا ہے اور بحر احمر کے اوپر صحرائے نجد سے بچتا ہوا مکہ مکرمہ تک جاتا تھا، جس کی وجہ سے مصر و شام اور یمن کے درمیان مکہ بہت بڑی منڈی بن گیا، اور حجازیوں میں تجارت خوب چلی، خاص طور سے قریش نے جنوب میں یمن کا اور شمال میں شام کا تجارتی سفر شروع کیا، قرآن حکیم نے رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ میں ان ہی تجارتی اسفار کو بیان کیا ہے، اطراف عرب سے لوگ حجاز کے تجارتی اور مرکزی شہر مکہ میں آتے اور ہر قسم کے ملکی اور غیر ملکی سامان آسانی حاصل کرتے، مکہ کا سب سے بڑا سالانہ بازار عکاظ میں ہوتا تھا، جو طائف کے راستہ میں ایام حج کے قریب لگتا تھا، اور اسی کے قریب ایام حج میں ذو المجاز کا بازار لگتا تھا، اور مکہ سے بڑے بڑے تجارتی قافلے باہر جاتے تھے، طبری کی تشریح کے مطابق بعض اوقات ان قافلوں میں ۱۵۰۰ بار بردار اونٹ ہوا کرتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی بعض اوقات ان تجارتی قافلوں میں نکلتے تھے۔ چنانچہ آپ نے پہلی مرتبہ بارہ سال کی عمر میں اور دوسری مرتبہ ۲۵ سال کی عمر میں ملک شام کا تجارتی سفر فرمایا،

کانت مکۃ محطا لجنا القوافل کہ جنوب عرب سے آنے والے قافلوں کی

---

[1] فجر الاسلام ج ۱ ص ۱۴

الآتية من جنوب العرب تحمل
بضائع الهند واليمن الى الشام
ومصر ينزلون بها وليستقون
من بئر شهيرة بها تسمى بئر
زمزم ويأخذون منها
حاجتهم من الماء[1]

منزل تھا، یہ قافلے ہندوستان اور یمن کے
سامان تجارت شام اور مصر لیجاتے تھے
اور مکہ میں قیام کرکے وہاں کے مشہور کنویں
زمزم سے سیراب ہوتے اور آگے کے لیے
بقدر ضرورت پانی لیتے تھے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے کچھ پہلے جزیرۃ العرب ایرانی اور بزنطینی طاقتوں کا مرکز بن گیا تھا، بزنطینی اقتدار حبشہ کے تعاون سے اپنا اثر بڑھا رہا تھا، اور ایرانی حکومت اپنا کام کر رہی تھی، اس کشمکش میں شامی علاقہ کی تجارت خراب ہونے لگی، اور بزنطینی اقتدار کے لیے عرب کے بازاروں سے عمدہ عمدہ اشیا نایاب ہونے لگیں، خاص طور سے یورپ کے گرجاؤں اور پادریوں کے لیے ہندوستان کے عمدہ ریشمی کپڑوں کا قحط پڑ گیا، اس لیے رومیوں نے بحر احمر کی راہ سے حضرموت اور یمن وغیرہ کی منڈیوں پر قبضہ جمایا، اور چونکہ حبشہ اور روم کا مذہب مسیحی تھا، اس لیے مذہب کے نام پر حبشہ کے بادشاہ اور عوام کو رومیوں نے اپنی مدد کے لیے آواز دی،

وارسل الامبراطور البيزنطي
جستنيان (۵۲۷ء - ۵۶۵ء)
سفيرا الى ملك الحبشة اهاب
باسم الدين والمصلحة ان
يقوم هو والسميفع حاكم حمير

بزنطی (رومی) شہنشاہیت نے جستنیان
نامی ایک سفیر کو شاہ حبشہ کے پاس بھیجا،
اور دین و مصلحت کے نام پر کہا کہ وہ اور
حمیر کا بادشاہ سمیفع دونوں ایرانیوں
سے ہماری طرف سے جنگ کریں اور یہ کہ

---

[1] المجمل فی تاریخ الادب العربی ص ۷۰ مطبعہ امیریہ قاہرہ

يقتال الفرس وان يتولى التجاش	حبشہ کے تاجر ہندوستانیوں سے ریشمی
شراء الحرير من الهنود، ثم	کپڑے خریدیں اور روم کا تجارتی سفر
يبيعونه بدراهم الى بيزنطة	کرکے ان کو بھاری نفع پر فروخت
فيجنون ارباحا طائلة	کریں،

اس صورت حال سے مکہ کے لوگوں نے[1] فائدہ اٹھایا اور براہ خشکی یمن و عدن سے تجارت شروع کردی، قریش نے اس سلسلہ میں دو تجارتی سفروں کا طریقہ اختیار کیا۔ مال کی خریداری کے لیے جاڑے میں یمن اور حبشہ کا سفر اور فروخت کے لیے گرمی میں شام کا سفر،

ابتدا میں قریش میں تجارتی کاروبار قریش بنی مخزوم کیا کرتے تھے، بعد میں جب ترقی ہوئی تو بنی ہاشم نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بچپن تک مکہ کا تجارتی مرکز پورے طور پر قائم تھا،

مکہ چونکہ تجارتی مرکز بن گیا تھا، اس لیے یہاں کی تمدنی زندگی میں بھی بڑی ترقی ہو گئی تھی۔ ۔ ۔ زبان میں بھی وسعت پیدا ہو گئی تھی، اور قریش کی یہی زبان قرآن اور اسلام کی زبان قرار پائی، چنانچہ قرآن و حدیث میں بہت سے ہندوستان میں بولے جانے والے الفاظ پائے جاتے ہیں، قرآن میں کافور (کپور)، زنجبیل (زنجابیر) مسک (موشکا) وغیرہ ہندوستانی الفاظ ہیں، جن کو قریش نے اپنے طور پر معرب کر لیا تھا، احادیث میں قسط (کُٹھ)، زط (جاٹ) عود ہندی، مشک وغیرہ کے نام ملتے ہیں، جو ہندوستانی نام ہیں، نیز مکہ میں ہندوستان کے لوگ رہتے تھے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جاٹوں کا تذکرہ ہے اور حضرت کعب بن مالک کے ایک شعر میں ہندوستان کے لوہے کا ذکر ہے،

عرب میں ہندوستانی تجارت کے مراکز | ہندوستانی تجارت کے ان بڑے بڑے مرکزوں کے ہندستان کی خاص خاص چیزوں کے چند اہم مراکز

[1] تاریخ العرب، ازبروکلمن بحوالہ مجلۃ العربی کویت ذوالحجہ ۱۳۸۲ھ

علاوہ بعض بعض علاقوں میں ہندوستان کی چیزیں اس قدر مشہور ہوگئی تھیں کہ ان ہی علاقوں کے نام سے منسوب تھیں، حالانکہ وہ ہندوستانی ہوتی تھیں، مثلاً خطی ان نیزوں کو کہتے تھے جو ارض خط کی طرف منسوب تھے، حالانکہ وہ دراصل ہندوستان کے بید اور بانس سے بنتے تھے۔ خط بحرین اور عمان کے پورے ساحل کو کہتے ہیں جس میں قطیف، عقیر اور قطر جیسے بڑے بڑے علاقے شامل تھے، ان علاقوں میں ہندوستان کے بید اور بانس سے بھری ہوئی کشتیاں جاتی تھیں، اور ان سے نیزے بنائے جاتے تھے[1]۔ اسی طرح سمہری نیزہ جو عرب میں بہت مشہور رہے وہ بھی اسی علاقۂ خط میں تیار ہوتا تھا، اور سمہر نامی ایک شخص ان کو ہندوستان کی لکڑیوں سے تیار کرکے فروخت کرتا تھا[2]۔

نیز بحرین کے علاقہ میں دارین نام کی ایک مشہور بندرگاہ تھی، جہاں کا ہندوستانی مشک سارے عرب میں مشہور تھا، عربی ادبیات و اشعار میں مسک دارین اور دارینی کے نام سے اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ لسان العرب میں خطی نیزے کے بیان کے ضمن میں ہے:-

كما قالوا مسك دارين، وليس هنالك مسك، ولكنها مرفأ السفن التي تحمل المسك من الهند[3]۔	جیسے مشک دارین کہتے ہیں، حالانکہ مقام دارین میں مشک نہیں ہوتا، بلکہ وہ ان کشتیوں کی بندرگاہ ہے جو ہندوستان سے مشک لاتی ہیں،

اس کا مطلب یہ ہے کہ پورا علاقۂ خط اور علاقۂ دارین ہندوستان کے تجارتی مال کے لیے مشہور تھا، اور یہاں پر ہندوستان سے آئے ہوئے بید اور بانس اور مشک اندرون عرب جاتے تھے، اور ان کی بھاری مقدار یہاں ہر وقت موجود رہتی تھی،

---

[1] لسان العرب جلد ۷، ص ۲۹۰ [2] لسان العرب ج ۴ ص ۱۰۳ [3] العباب ج ۷ ص ۲۹۰

عرب کے بڑے بڑے موسمی اور مقامی بازار | البتہ صحار اور یمن و عدن ہندوستانی مال کی خاص منڈی تھے، جہاں سے پورے عرب اور ایران، مصر اور روم تک اس کا مال جاتا تھا، ان کے علاوہ اندرون عرب جو بازار خاص خاص موسموں میں ہوا کرتے تھے، ان میں بھی ہندوستانی مال کی کثرت سے خرید و فروخت ہوتی تھی، علامہ ابو علی مرزوقیؒ نے کتاب الازمنہ والامکنہ میں اسواق عرب کا نہایت تفصیل سے ذکر کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عرب میں کل تیرہ بڑے بڑے بازار لگتے تھے، جن کے نام ترتیب وار یہ ہیں :- (۱) دومۃ الجندل (۲) صحار (۳) دبا (۴) شحر (۵) رابیہ حضرموت (۶) ذو المجاز (۷) نطاۃ خیبر (۸) مشقر (۹) حجر (۱۰) منیٰ (۱۱) عکاظ (۱۲) عدن (۱۳) صنعاء،

دومۃ الجندل کا بازار اپنے محل و قوع کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا تھا، یہاں سے مدینہ اور کوفہ تیرہ تیرہ مرحلے پر تھے، اور دمشق دس مرحلے پر تھا، یہ بازار غرۂ ربیع الاول سے شروع ہو کر نصف ماہ تک پورے زور پر رہتا تھا، اور آخر مہینہ تک چلا جاتا تھا، اس کے قریب بنو کلب، بنو جدیلہ اور بنو طے آباد تھے، اور دو حکمراں اکیدر عبادی اور قنافہ کلبی یہاں پر ٹیکس وصول کرتے تھے، اور ان ہی سے اس کا افتتاح ہوتا تھا،

مشقر مقام ہجر (بحرین) میں واقع ہے، دومۃ الجندل سے تاجر اور خریدار اٹھکر یہاں آتے تھے، یہ بازار پہلی جمادی الاخریٰ سے آخر مہینہ تک لگتا تھا، اس کے اطراف میں بنو عبد القیس، اور بنو تمیم آباد تھے، بنو تمیم جو منذر بن ساوی سے تعلق رکھتے تھے، یہاں کا نظم و نسق سنبھالتے تھے، ان کی حیثیت شاہان فارس کے نائب کی تھی، اس بازار میں اہل فارس براہ خشکی بڑی کثرت سے آتے تھے، اور ان کی تجارت خوب چلتی تھی،

صحار کا بازار پہلی رجب سے بیس رجب تک لگتا تھا، اور مشقر کی ساری رونق یہاں سمٹ آتی تھی جو لوگ کسی وجہ سے پہلے دونوں بازاروں میں شریک نہیں ہو سکتے تھے، وہ سوق صحار میں

شریک ہوتے تھے، یہاں عرب حکمراں جلندی عشر وصول کرتا تھا،

دبا (دبیٰ) کا بازار صحار کے بعد لگتا تھا، یہ مقام ہندوستان کے تجارتی جہازوں کے لیے بہت بڑی بندرگاہ تھا، ہندوستان، سندھ اور چین غرض کہ مشرق و مغرب کے تاجر یہاں جمع ہوتے تھے،

وكانت احدى فرض الهند	دبا ہندوستان کی بندرگاہ تھی، جہاں ہندوستان
يجتمع بها تجار الهند والسند	سندھ اور چین بلکہ مشرق مغرب کے تاجر جمع
والصين واهل المشرق والمغرب[1]	ہوا کرتے تھے،

سوق دبا کی ابتدا رجب کے آخری دن ہوتی، یہاں بھی ہر قسم کے مال کی بڑی خرید و فروخت ہوتی تھی، شحر مہرہ کا بازار اس پہاڑ کے درمیان میں لگتا تھا جس پر حضرت ہود علیہ السلام کی قبر ہے، سوق دبا کے بری اور بحری تاجر اٹھکر یہاں آجاتے، اس کا وقت نصف شعبان تھا، یہاں عشر وغیرہ نہیں لیا جاتا تھا، پھر شحر مہرہ سے تاجر اور خریدار اٹھکر عدن آتے تھے، بحری تاجروں میں وہی لوگ یہاں پر آتے جن کا تمام مال پہلے بازاروں میں فروخت ہوتا تھا، وہ یہاں آکر باقی مال فروخت کرتے تھے، اسی طرح خریداروں میں بھی وہی زیادہ ہوتے جو دوسرے بازاروں میں نہیں پہنچ سکتے تھے، سوقِ عدن پہلی رمضان سے بیس تک رہتا تھا، یہاں کے منتظم ملوک حمیر تھے جو عشر لیتے تھے، آخر میں ابنائے فارس یہ رقم وصول کرنے لگے تھے، ان کے حسن انتظام کی دھوم دھام ہندوستانی تاجروں میں اس قدر تھی کہ پورے ہندوستان میں اس کا چرچا تھا،

حتى ان تجار البحر لترجع	بحری تاجر یہاں کے حسن کارکردگی
بالطيب المعمول تفخر به	کا فخریہ تذکرہ سندھ اور ہندوستان میں
في السند والهند وتحمل[1]	کرتے تھے، اور بری تاجر اسے پوشے

[1] کتاب الازمنہ والامکنہ مرزوقی ج ۲ ص ۱۶۲، طبع حیدرآباد اور کتاب المحبر ص ۲۶۶ طبع حیدرآباد

تجار الیمن الی فارس[۵] فارس میں جا کر بیان کرتے تھے

عدن کے بعد صنعا کا بازار نصف رمضان سے شروع ہو کر آخر تک رہتا تھا، یہاں کپڑے لوہے، روئی، زعفران اور مختلف رنگوں کی تجارت خوب ہوتی تھی۔

پھر صنعا کا یہ بازار ختم ہو کر دو بازاروں میں منقسم ہو جاتا تھا، یعنی سوقِ رابیہ حضرموت اور سوقِ عکاظ، یہ دونوں بازار ایک ہی وقت میں نصف ذی قعدہ میں لگتے تھے، چونکہ رابیہ حضرموت کے بازار کا منتظم اور نگراں کوئی حکمراں نہیں ہوتا تھا، اس لیے تاجر اس کی طرف کم توجہ کرتے تھے، سوقِ عکاظ نجد کے بالائی علاقہ میں عرفات کے قریب لگتا تھا، یہ پورے عرب کا سب سے بڑا بازار تھا، اس میں قریشِ مکہ، ہوازن، غطفان، خزاعہ، اور احابیش یعنی حارث بن عبد مناۃ، عضل، مصطلق اور دوسرے عرب قبائل آتے تھے، نصف ذی قعدہ سے غرۂ ذو الحجہ تک رہتا تھا، یہاں کسی قسم کا ٹیکس نہیں تھا، اس میں نہایت عمدہ اور نایاب سامان فروخت ہوتا تھا، جو عرب کے کسی بازار میں نہیں ملتا تھا، ملوکِ یمن اور ملوکِ حیرہ یہاں پر عمدہ تلواریں، نفیس حلے، قیمتی سواریاں، مشک، عود اور دوسری قیمتی چیزیں تجارت کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ عربوں میں جو ان کی بولی بولتا اور اس کو خریدتا، وہ بہت ہی معزز سمجھا جاتا، اور اسے ان بادشاہوں کے دربار میں باریابی کا شرف حاصل ہوتا۔

ذو الحجہ کا چاند دیکھتے ہی عکاظ کا بازار ٹوٹ کر ذو المجاز میں منتقل ہو جاتا تھا، اور یہاں کے تمام تاجر وہاں پہنچ کر خرید و فروخت میں مشغول ہو جاتے، یہ مقام عکاظ سے بہت قریب ہے، ذو المجاز میں لوگ یوم ترویہ تک مقیم رہتے۔ عرب کے حجاج اور دوسرے بازاروں میں نہ شریک ہونے والے افراد عام طور سے سوق ذو المجاز میں شریک ہوتے تھے۔ ان بازاروں کے

---

[۵] کتاب الازمنہ والامکنہ ج ۲ ص ۱۶۴

علاوہ سوق نطاۃ خیبر اور سوق حجر یمامہ میں خرید و فروخت کی سرگرمیاں ہوا کرتی تھیں، بعضوں نے مجنہ کو بھی اسواقِ عرب میں شمار کیا ہے، یہ مقام ذو المجاز اور عکاظ سے قریب حضرموت کے پیچھے واقع ہے۔ سوق دیر ایوب بھی ایک بازار تھا، اور سوق بصریٰ بھی ۲۵ دن تک ہوتا تھا، جو بنو امیہ کے زمانہ تک جاری رہا، اور چالیس دن تک رہتا تھا، نیز سوق اذرعات پانچویں صدی تک جاری رہا، یہ اس دور میں عرب کے بازاروں میں سب سے بڑا بازار ہوتا تھا،[۱]

عربی ادبیات میں ہندوستان کی اشیا کا ذکر

جیسا کہ گذشتہ بیان سے معلوم ہوگیا، عرب میں قدیم زمانہ سے ہندوستان کی بہت سی چیزیں کثرت سے استعمال ہوتی تھیں، اور عربوں کی زندگی میں ان کو بڑی اہمیت حاصل تھی، اس کا اندازہ عرب شعراء کے کلام سے بھی ہوتا ہے، جنھوں نے اشعار میں ہندوستان کی چیزوں کا تذکرہ کیا ہے، اس سلسلے میں چند چیزوں کے نمونے کافی ہیں،

ہندی تلوار

ہندی تلوار عربوں کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہے، اور قدیم زمانہ سے ہندوستان کی تلواریں عربوں کی بہادری میں چار چاند لگاتی ہیں، اس کے کئی نام ہیں، سیف، ہند، ہندی، مہنّد، ہندوانی اور ہُندوانی اور قلعی،

شریف ادریسی نے نزہۃ المشتاق میں لکھا ہے کہ جنوبی ہندوستان کے بلاد سفالہ اور بلاد زنج میں لوہے کی کانیں ہیں، مگر یہاں کے باشندے تمام لوہا فروخت کرتے ہیں اور ہندوستان کے لوگ اس کی تلواریں بناتے ہیں،

ولکن الهند یین یحسنون	ہندوستانی ان دواؤں کی ترکیب
تراکیب اخلاط الادویة	اچھی جانتے ہیں جن سے نرم لوہا پگھلایا
التی یسبکون بها الحدید	جاتا ہے جس کے بعد اسے ہندی لوہا

---

[۱] اسواقِ عرب کی تفصیل کے لیے کتاب الازمنہ والامکنہ مرزوقی ج ۲ ص ۱۶۲ و ۱۶۶ ملاحظہ ہو،

اللذين فيعود هندياً ينسب	کہنے لگتے ہیں، اور یہاں تلوار بنانے کے
الى الهند وبها دور الضرب	کارخانے ہیں، اور کاریگر ہر ملک کے لوگوں
للسيوف وصُنّاعهم مجيدون	سے اچھی تلوار بناتے ہیں، اسی طرح
فضلاً على غيرهم من الامم	سندھی لوہا، سرندیبی لوہا اور بیلمانی
وكذلك الحديد السندى	لوہا آب و ہوا کی مناسبت، بناوٹ
والسرنديبى والبيلمانى	اور ڈھلائی صیقل گری اور صفائی وغیرہ
كله يتفاضل بحسب هواء	کی وجہ سے ہر جگہ سے عمدہ ہوتا ہے،
المكان وجودة الصنعة	ہندوستان کے لوہے سے زیادہ تیز
واحكام السبك والضرب	اور کاٹ میں عمدہ کوئی لوہا نہیں ہوتا
وحسن الصيقل والجلاء	اور اس حقیقت کے انکار کی گنجائش
ولا يوجد شئ من الحديد	نہیں ہے،
امضى من الحديد الهندى	
وهذا شئ مشهور لا يقدر	
احد على انكار فضيلته[1]	

عربی شاعری میں ہندی تلوار کا تذکرہ اس کثرت سے آیا ہے جس کثرت سے خود ہندی تلوار استعمال ہوتی تھی، چند مثالیں ملاحظہ ہوں،

زہیر بن ابی سلمی نے کہا ہے

کالهندوانى لا يخزيك مشهده   وسط السيوف اذا ما تضرب البهم

دوسری تلواروں کے درمیان میں ہندی تلوار کو میدان جنگ میں ناکام نہیں کرسکتی ہو جبکہ اسلحہ بند لشکر میں جنگ ہو،

---

[1] وصف الهند وما يجاورها من كتاب نزہتہ المشتاق ص ۲ مطبوعہ علی گڑھ

طرفہ بن عبد نے اپنے معلقہ میں کہا ہے:

وظلم ذوی القربی أشد مضاضۃ علی المرء من وقع الحسام المهند

آدمی کے لیے اپنوں کا ظلم ہندی تلوار سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے،

درید بن صمہ نے کہا ہے:

وتخرج منہ ضرۃ القیظ جزأۃ وطول السری دریۃ عضب المهند

سردی کی شدت ٹکڑے ٹکڑے کر کے نکالتی ہے اور اس حالت میں رات کا طویل سفر ہندی تلوار کی کاٹ توڑ

ایک شاعر نے کہا ہے

أعن لی علی الهندی مهلا وکرۃ لدی برۃ حتی تدور الدوائر [1]

میری ہندی تلوار کو زنگ سے بچاؤ اور صیقل کرتا کہ برک (ماہ ذوالحجہ) میں لڑائیاں چھڑ جائیں۔

فرزدق نے قلعی یعنی مقام کلہ کی بنی ہوئی عمدہ تلواروں کا ذکر یوں کیا ہے،

متقلدی قلعیۃ وصوارم هندیۃ، وقدیمۃ الاثار

آل مہلب کی کمر میں قلعی تلواریں اور تیز ہندوستانی قدیم تلواریں بندھی رہتی ہیں،

ہندی تلوار پر عہد رسالت میں بھی بہت کچھ کہا گیا ہے اور اسلامی ادبیات میں اس کا ذکر بہت شاندار طریقہ پر آیا ہے، اس کی مثالیں اپنے موقع پر آئیں گی،

(باقی)

---

[1] کتاب الازمنۃ والامکنۃ ج ۱ ص ۳۰۳

خواجہ میر دردؔ اور آب حیات

از جناب مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کی آب حیات ادب و تنقید کا مرقع بھی ہے اور تذکرۂ شعرا بھی، ادبی حیثیت سے اس کا شمار ادب عالیہ میں ہے، اور اس حیثیت سے وہ ہمیشہ زندہ رہے گی اور اس فضل میں ان کے معاصرین میں کوئی دوسرا ان کا شریک و سہیم نہیں ہے لیکن تذکرہ و تحقیق کی حیثیت سے اس میں بہت سی ایسی خامیاں ہیں جن کی وجہ سے اس کی تاریخی اور تحقیقی حیثیت ہمیشہ مجروح رہی، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ آزاد کا مزاج ادبی زیادہ اور تاریخی اور تحقیقی کم تھا، اس کے ساتھ انکی طبیعت میں جانب داری اور افسانہ طرازی بھی تھی، اس بنا پر وہ صحیح واقعات میں بھی کبھی اپنے مزاج کی افتاد اور کبھی ادبی چٹخارہ کے لیے بازاری گپوں اور طبع زاد باتوں کا اضافہ کر دیتے ہیں، جن سے ان کا تاریخی معیار گر جاتا ہے، انکی اسی افتادِ مزاج کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ وہ بہت سی جگہ تضاد بیانی کا شکار ہو جاتے ہیں، علامہ شبلیؒ نے ان کی کتاب دیکھ کر بالکل صحیح کہا تھا کہ

"آزاد کی کتاب آئی، جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں ہے، تاہم ادھر ادھر کی گپیں بھی ہانک دیتا ہے تو وحی معلوم ہونے لگتی ہے"

جب کسی کی تعریف کرتے ہیں تو معائب کو بھی محاسن بنا دیتے ہیں اور جب مذمت پر آتے

ہیں تو ایسی ہجو ملیح کرتے ہیں کہ شریف سے شریف آدمی کا دامن عصمت بھی داغدار کر ڈالتے ہیں،

اور اس سلسلہ میں ایسا لطیف طنزیہ پیرایۂ بیان اختیار کرتے ہیں کہ سرسری نظر میں مذمت و تحقیر

تحسین و تعریف معلوم ہونے لگتی ہے، اس کا مظاہرہ انھوں نے اپنی دوسری کتابوں میں بھی کیا ہے،

چنانچہ دربار اکبری میں ملا عبد القادر اور دوسرے علما کی بڑی تضحیک کی ہے، اور جو لوگ جتنی تعریف

کے مستحق نہیں تھے، اس سے زیادہ ان کی تعریف و تحسین کی ہے، اس وقت صرف ہم کو آب حیات

سے بحث ہے، اگر اس میں ولی، شاہ نصیر، میر ضاحک، مومن، مرزا مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد

کے حالات اور کلام پر تبصروں پر سرسری ناقدانہ نظر بھی ڈال لی جائے تو اس کا بخوبی اندازہ ہو جائیگا،

۱۔ مرزا مظہر جان جاناںؒ کے حالات میں متعدد ایسی بے سر و پا باتیں لکھی ہیں جن کا مرزا صاحب

جیسے فرشتہ صفت انسان کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، حتیٰ کہ ان کے واقعۂ شہادت اور

اور نام میں بھی ایک طنزیہ پہلو نکال لیا ہے، یکرنگ جو مرزا صاحب کے شاگرد تھے، اور خود آزاد کو بھی

ان کی شاگردی مسلّم ہے، مگر شاگرد کو دور اول میں اور استاد کو دور سوم میں شمار کیا ہے،

۲۔ آب حیات کے پہلے اڈیشن میں میر ضاحک اور مومن کو نظر انداز کر گئے تھے، اور وجہ یہ بیان

کی تھی کہ ان کے حالات نہ مل سکے، حالانکہ ان دونوں کا شمار اساتذہ میں ہوتا تھا، اور وہ مشاعروں

میں شریک ہوتے تھے، اور خاص طور پر مومن کی غزلیں تو دلی کے مشاعروں میں انھوں نے خود انکی

زبان سے سنی تھیں، اس کے باوجود حالات نہ ملنے کا عذر کس قدر بارد ہے، لوگوں کی تنقید اور اصرار

سے دوسرے اڈیشن میں مومن کے حالات لکھے بھی تو جبراً قہراً، معذرت کے الفاظ ملاحظہ ہوں، میر ضاحک

کے حالات میں لکھتے ہیں:۔

بے درد بے انصاف کہ اصول فن سے بے خبر ہیں، کیا جانیں، انھیں اپنے مضامین اخباروں میں چھپانے

کے لیے روشنائی ہاتھ آئی "

مومن کے تذکرہ میں لکھتے ہیں :-

"دنیا کے لوگوں نے اپنے اپنے حوصلہ کے بموجب جتایا کیا، آزاد نے سب کی عنایتوں

شکریہ کا دامن پھیلا کر لے لیا"

کاش ان تنقید نگاروں کے نام اور تنقیدوں کا پورا مواد مل جاتا تو اردو ادب میں ایک

بیش بہا اضافہ ہوتا، مگر نواب ضیاء الدین کے علاوہ کسی اور کی تنقید کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

۳- خواجہ میر درد جن کی شاعری اور فضل و کمال کے بارے میں کسی عہد میں بھی دو رائے

نہیں ہوئی، ان کے بارے میں بھی متعدد بے سرو پا باتیں پورے وثوق کے ساتھ لکھ ڈالی ہیں، اور

اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کی شاعرانہ حیثیت کو بھی مجروح کرنے کی کوشش کی ہے۔

آب حیات کے ادبی مرتبہ اور آزاد کی ادبی عظمت کے سلسلہ میں ہمیں پروفیسر حافظ محمود

شیرانی کی اس رائے سے پورا اتفاق ہے:

مولانا آزاد صاحب طرز ہیں، ان کی طرز نہ ان سے پہلے وجود میں آئی نہ ان کے بعد، فارسی میں

ابو الفضل اور ظہوری کے مقلد پیدا ہو گئے، مگر آزاد کا ابھی تک کوئی مقلد پیدا نہیں ہوا . . .

. . . . اردو کیا فارسی میں بھی اس طرز کی کوئی کتاب موجود نہ تھی جس میں اردو و فارسی دونوں

کا مزہ موجود ہو، ان کی سادہ نثر، چھوٹے چھوٹے فقرے، ہلکی رنگ آمیزی، عبارت کا

بانکپن، بیان کی شوخی، لطیفوں اور چٹکلوں کی بہتات، تاریخ میں افسانہ کے ڈھنگ

اور نثر میں نظم کا لطف، ایسی خصوصیات تھیں جن سے دنیا اس کی گرویدہ ہو گئی"[1]

لیکن آزاد کے اس ادبی کمال کے اعتراف کے باوجود جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، ان کے

"تاریخ میں افسانہ کے ڈھنگ" پر ہر زمانہ میں تنقید کی گئی، اس تنقید کرنے والوں میں نواب ضیاء الدین

[1] اورینٹل میگزین اگست ۱۹۲۰ء

حکیم عبد الحئی مرحوم صاحب گل رعنا، مولانا عبد السلام ندوی مرحوم، ڈاکٹر عبد الحق مرحوم، مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی مرحوم، اور خود پروفیسر شیرانی مرحوم بھی شامل ہیں، بلکہ پروفیسر شیرانی تو بہت ہی بادلِ ناخواستہ ان کے تنقید نگاروں میں شامل ہوئے ہیں، وہ لکھتے ہیں:-

"راقم آب حیات کے تنقید نگاروں میں بادلِ ناخواستہ شامل ہوا ہے"

خاص طور پر نکات الشعراء، اور ذکر میر کی اشاعت کے بعد آب حیات پر بڑی سخت تنقیدیں ہوئی ہیں، مگر افسوس ہے کہ میر درد کے بارے میں انھوں نے جو گپیں ہانکی ہیں، ان پر کسی نے توجہ نہیں کی، حتیٰ کہ مولانا عبد الحئی صاحب بھی دو چار جملوں سے زیادہ کچھ نہ لکھ سکے۔

آب حیات پر جو تنقیدیں ان کے زمانہ میں ہوئیں ان کی روشنی میں آزاد نے طبع دوم میں بعض مقامات کی بادلِ ناخواستہ تصحیح بھی کی اور نظر ثانی بھی، مگر تصحیح و نظر ثانی انہی بیانات و واقعات پر کی جن پر سخت سے سخت تنقیدیں کی گئیں، خود انھوں نے اپنی تلاش و تحقیق کی بنا پر واقعات و بیانات میں کم ہی تبدیلی کی، یہی وجہ ہے کہ بہت سے شعراء اور خاص طور پر مرزا مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد جیسے مردانِ باصفا کے بارے میں انھوں نے جو غلطیاں اور افسانہ طرازیاں کی ہیں، وہ آج بھی جوں کی توں موجود ہیں، اور یہ غلطیاں ایسی نہیں ہیں جن کے بارہ میں مواد کی کمی یا تسامح کی معذرت کردی جائے، اگر واقعی ایسا ہوتا تو اس کی تلافی بھی ممکن تھی، اور اس لیے بھی اس کی اہمیت کم ہوجاتی کہ اس طرح کی غلطیاں ہر مصنف سے ہوجایا کرتی ہیں، لیکن راقم کے خیال میں آزاد نے خواجہ میر درد اور ان جیسے صفا کیشوں کے بارے میں اس طرح کی غلطیاں قصد و ارادہ سے کی ہیں، اس وجہ سے ان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اس وقت آب حیات پر کوئی مفصل تبصرہ لکھنا مقصود نہیں ہے، بلکہ محض اس کی ان غلطیوں کی تصحیح اور نشاندہی کرنی مقصود ہے جو انھوں نے خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح حیات

اور شاعری کے بارے میں کی ہیں، اور یہ چند تمہیدی سطریں لکھ دینے کا منشاء یہ دکھانا ہے کہ کیسے کیسے صاحب فضل و کمال آزاد کی ستم ظریفیوں کے زخم خوردہ ہیں،

خواجہ صاحب کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں،

"باوجود اس کے سودا اور میر تقی میر کی غزلوں پر غزلیں لکھیں ہیں، ہرگز ان سے کم نہیں"، (ص۱۰)

پھر آگے لکھتے ہیں۔ خصوصاً چھوٹی چھوٹی بحروں میں جو اکثر غزلیں کہتے ہیں گویا تلوار دوں کی آبداری نشتر میں بھر دیتے ہیں،

"مگر یہ قصیدہ ابھی کمل نہیں ہوا ہے، یہ تشبیب ہے، گریز یہاں سے شروع ہوتا ہے،

" میر صاحب ان کو آدھا شاعر کہتے تھے۔" (ص۱۷۱)

اس اجمال کی تفصیل انھوں نے اور کئی جگہ کی ہے، میر کے حالات میں لکھتے ہیں:۔

"لکھنؤ میں کسی نے پوچھا کیوں حضرت آج کل شاعر کون کون ہیں، کہا ایک تو سودا دوسرا خاکسار، اور کچھ تامل کے بعد کہا، آدھے خواجہ میر درد" (۳۰۱)

آزاد کی پہلی عبارت "باوجود اس کے کہ سودا اور میر تقی میر کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں ہرگز ان سے کم نہیں"۔ سے بظاہر خواجہ صاحب کی تعریف معلوم ہوتی ہے، مگر یہ ایسی تعریف ہے جس میں تحقیر کے بڑے ہی نازک نشتر چھپے ہوئے ہیں، یہ لکھکر انھوں نے حقیقت میں خواجہ صاحب کی شاعرانہ عظمت اور استادانہ حیثیت کو مجروح کرنے کی کوشش کی ہے، "باوجود اس کے" کے الفاظ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ میر و سودا میدان شاعری میں خواجہ صاحب کے پیش رو اور ان سے ممتاز تھے۔ اور خواجہ صاحب نے حریف بنکر ان کی غزلوں پر غزلیں کہنے کی جرأت کر کے ایک زبردست خطرہ مول لے لیا تھا، مگر خیریت ہوئی کہ اتفاق سے کامیاب رہے، بے نیازی اور بلندی فکر و نظر اور دوسرے دلائل سے قطع نظر خواجہ صاحب کی بے ہمہ

استغنا و طبیعت سے یہ بات بعید ہے کہ وہ اپنے معاصرین کی غزلوں پر غزلیں لکھنے کی کوشش کرتے، معاصرین کی غزلوں پر غزلیں کہنے کی کوشش وہ شخص کرتا ہے جس کے دل میں رشک و حسد کی آگ بھڑکتی ہو یا اسے شہرت و عزت کی خواہش بے چین رکھتی ہے، یا پیشۂ شاعری کو اس نے دریوزہ گری کی صدا بنا رکھی ہو، خواجہ صاحب ان سب سے بے نیاز اور صاف دل تھے، وہ تو یہ فرمایا کرتے تھے

"شاعری چنداں کمالے نیست کہ مرد آدمی آنرا پیشۂ خود سازد و بداں نازد"

ان کی شاعری آورد نہیں سراپا آمد ہوتی تھی، وہ محض خارجی اسباب کی بناء پر نہیں، بلکہ دردِ دل، سوزِ جگر اور احساسِ دروں کی بناء پر شعر کہتے تھے، وہ فرماتے ہیں،

بندہ گاہے شعر بے آمد و وردِ دل
بقصد آورد موزوں نمودہ و ہیچ گاہ
مدح و ہجو کسے نکردہ و حسب فرمائش
شخصے و آزمائش کسے چیزے نگفتہ

بندہ نے کبھی شعر آمد کے بغیر محض اہتمام
آورد سے موزوں نہیں کیا اور نہ تکلف
شعر و سخن میں مستغرق نہیں ہوا، کسی کی مدح
اور ہجو نہیں لکھی، اور کبھی کسی کی فرمائش اور
آزمائش سے متاثر ہو کے شعر نہیں کہا،

پھر یہ بات اس حیثیت سے بھی قابلِ غور ہے کہ میر و مرزا کی غزلوں پر غزلیں کہنا اس وقت ممکن ہو سکتا ہے جب میر و مرزا کو اپنی شاعرانہ حیثیت اور شہرت کے اعتبار سے خواجہ صاحب پر تقدم حاصل ہو، اور یہ بات ثابت شدہ ہے کہ خواجہ صاحب جب مرجع خلائق اور صاحب تصنیف ہو چکے تھے، اس وقت میر اپنی ابتدائی تعلیم بھی مکمل نہیں کر سکے تھے، اور مرزا سپاہی پیشہ بنے گھوم رہے تھے، عمر کے لحاظ سے میر تقی خواجہ صاحب سے دو تین برس چھوٹے اور سودا ہم عمر تھے، خواجہ صاحب ۱۵ برس کی عمر میں رسالہ اسرار الصلوٰۃ کے مصنف ہو چکے تھے، اور میر ۱۵ برس تک اپنی تعلیم بھی مکمل نہیں کر پائے تھے،

اور پھر نکات الشعراء کے بیان سے تو پتہ چلتا ہے کہ میر صاحب خواجہ کی مجلس شعر و سخن کے خوشہ چین اور اس میں شرکت کو سرمایۂ افتخار سمجھتے تھے۔ سودا جن کی زبان درازی سے کوئی نہ بچ سکا وہ بھی خواجہ صاحب دو بدو ہونا پسند نہ کرتے تھے۔

سودا بدل کے قافیہ تو اس غزل کو لکھ

اے بے ادب تو درد کے بس دو بدو نہ ہو

خود مرزا صاحب جب خواجہ صاحب کی غزلوں پر غزلیں کہنے کو بے ادبی سمجھتے تھے تو یہ کہنا کہ خواجہ صاحب خود اس کی کوشش کرتے تھے، مدعی سست گواہ چست کا مصداق ہے۔

اور طرفہ تماشہ یہ ہے کہ خود آزاد نے سودا کا یہ شعر نقل کیا ہے۔ (آب حیات ص ۱۶۴) اور سودا تو خواجہ صاحب کے خاندان کے کئی پشت سے مداح چلے آتے ہیں، ان کے پرنانا نواب میر احمد خاں شہید کی مدح کے اشعار بھی آج کلیات میں موجود ہیں،

آزاد نے دوسری افسانہ طرازی یہ کی ہے کہ میر صاحب خواجہ صاحب کو آدھا شاعر کہتے تھے، اس فقرے کو انھوں نے کتاب میں کئی جگہ دہرایا ہے، آزاد کے علاوہ کسی قدیم و جدید تذکرہ نگار نے میر کی یہ رائے نقل نہیں کی ہے، اور یہ رائے ایسی نہیں تھی کہ تذکرہ نگار نظر انداز کر جاتے، خواجہ صاحب کے معاصرین میں قائم، میر حسن، مصحفی، گردیزی وغیرہ کے تذکرے اور اس کے بعد "گلشن بیخار" "گلزار ابراہیم" وغیرہ تذکرے ہمارے سامنے ہیں، ان میں سے کسی نے بھی اس افسانہ کا ذکر نہیں کیا ہے، پورے ایک سو سال بعد آزاد کو معلوم نہیں کس معتبر راوی کے ذریعہ . . . . میر کی یہ رائے پہنچ جاتی ہے، میر نے بہت سے شعراء پر تنقید کی ہے اور بے لاگ تنقیدیں کی ہیں، مثلاً ثاقب کے بارے میں لکھتے ہیں

"قدیم چند دست دارد و بیچ نمی دارد"

شیخ حاتم کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"مردیست جاہل و متکبر و مقطع وضع دیر آشنا"

انعام اللہ خاں یقین کے بارے میں لکھتے ہیں

"بعد ملاقات ایں قدر، خود معلوم شد کہ ذائقہ شعر فہمی مطلق نہ دارد"

لیکن خواجہ میر درد کو وہ آدھا شاعر کیا کہتے، ان کے بارے میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں لکھا ہے جس سے ان کی شاعری یا ان کے علم و فضل اور اخلاق و کردار پر حرف آتا ہو بلکہ انھوں نے ان کے علم و فضل اور ان کی شاعرانہ عظمت کا جن شاندار الفاظ میں تذکرہ کیا ہے اس کی بنا پر گارساں دتاسی وغیرہ کو یہ شبہہ ہو گیا کہ میر تقی میر خواجہ صاحب کے شاگرد ہیں، اور یہ بات اس حد تک صحیح بھی ہے کہ میر کی شاعرانہ صلاحیت کو اجاگر کرنے میں خواجہ کا بھی کسی حد تک دخل ہے، جیسا کہ خود میر صاحب نے نکات الشعراء میں لکھا ہے، نکات الشعراء کا پورا بیان ملاحظہ ہو انکی شاعری کا تذکرہ کس جوش بیان سے کرتے ہیں:

"جوش بہار گلستان سخن، عندلیب خوش خوان چمن این فن ...... مصرع نوشتہ اش بر صفحۂ کاغذ از کاکل صبح خوشنما طبع سخن پرداز، او سرو مائل چمنستان انداز ست ..... در چمن شعرش نغط رنگیں چمن چمن گلچیں خیال او و رنگ معنی دامن دامن شاعر زور آور ریختہ"

میر نے جس کو شاعر زور آور ریختہ کہا ہو، جس کی شاعری کو از کاکل صبح خوشنما، در چمن شعر نغط رنگیں چمن چمن لکھا ہو، جس کے تخیل کی خوشہ چینی کرنے والوں کو اپنا دامن شاعری گل معنی سے بھرنے والا بتلاتے ہوں، کیا یہ ممکن ہے کہ اس کے بعد وہ اسے آدھا شاعر کہیں، اور اگر ان کی رائے یہی تھی تو نکات الشعراء میں ذکر کرنے میں کونسی چیز مانع تھی،

آزاد کو چونکہ اس طرح کی طبع زاد باتوں کے لکھنے میں لطف آتا ہے، اس لیے وہ یہ باتیں

کرنے سے ہچکتے نہیں، چنانچہ میر سوز کے بارے میں بھی انھوں نے لکھا ہے کہ میر صاحب ان کو پاؤ شاعر انتے تھے، اور میر صاحب نے ان کا تخلص پسند کر لیا مگر خود نکات الشعراء کا بیان اس کے برخلاف ہے میر صاحب کا یہ بیان ابھی یہیں ختم نہیں ہوتا، وہ اپنی نیازمندی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"فقیر را بخدمت او بندگی خاص است"

دلی میں جب میر کی ابھی کوئی حیثیت قائم نہیں ہوئی تھی حتی کہ ان کے ماموں سراج الدین خاں آرزو کے یہاں بھی ان کو پناہ نہیں ملی تو قسمت کی یاوری سے یہ ناکام اور تشنہ کام خواجہ صاحب کے چشمۂ فیض تک پہنچے، خواجہ صاحب نے جوہر قابل سمجھکر ان کی دلجوئی کی، اور ان پر فیض و کرم کی ایسی بارش کی کہ وہ خود دریائے فیض بن گئے، خود امتنان و تشکر کے انداز میں لکھتے ہیں،

" ایامے کہ فقیر بخدمت آں بزرگوار شرفت اندوز میشد از زبان مبارکش میفرمود کہ میر محمد تقی میر مجلس خواہی شد "

پھر کہتے ہیں کہ میری شاعرانہ حیثیت اسی دعا کے نتیجہ میں ہے،

" الحمد للہ والمنۃ کہ حرف آں سلسلۂ خدا پرستاں موثر افتاد یا طن آں قافلۂ اہل عرفاں کہ از ظاہرش ظاہر ترست زود کار کرد "

خواجہ صاحب نے میر صاحب کی اتنی ہمت افزائی کی کہ وہ مجلس ریختہ جو ہر مہینہ کی پندرہ تاریخ کو ان کے گھر پر ہوتی تھی، جب گردشِ روزگار سے وہ برہم ہوئی تو میر کو اپنے گھر پر منعقد کرنے کا حکم دیا، چنانچہ میر صاحب لکھتے ہیں :-

مجلس ریختہ کہ بتخانۂ بندہ بتاریخ پانزدہم ہر ماہ مقرر است واللہ بذات ہمیں بزرگ است زیرا کہ پیش ازیں ایں مجلس بخانہ اش مقرر بود از گردش روزگار بہم برہم خورد آنزمیں کہ بایں احقر اخلاص دلی داشت گفت کہ ایں مجمع را شما اگر بخانۂ خود معین کنید

"مبرا ست نظر بر اخلاص آں مشفق عمل کردہ آمد" (ص ۴۸)

جس نے خواجہ صاحب کی مجلس فیض سے برسوں استفادہ کیا ہو، جو اپنی شاعری کو ان کا فیض معنوی تصور کرتا ہو، جو ان کی شاعری کو سند مانتا ہو، کیا وہ اپنی زبان سے ان کو آدھا شاعر کہنے کی جرأت کر سکتا ہے؟ یہ افسانہ جیسا کہ آزاد کے بیان سے بھی مترشح ہوتا ہے، لکھنؤ کے بازاروں میں گڑھا گیا ہے، جس کی کوئی اصلیت نہیں ہے،

یہ تفصیلات اس حیثیت سے پیش کی گئی ہیں کہ میر صاحب کی طرف اس جملہ کی نسبت صحیح نہیں ہے، ورنہ ان کی شاعرانہ عظمت کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے اور وہ اس طرح کی حرف گیریوں کے لئے خود برہان قاطع ہے۔

آزاد نے ایک اور غلط بیانی یہ کی ہے کہ خواجہ صاحب کے مکان پر مہینے میں دو بار باقاعدہ مجلس سماع منعقد ہوتی تھی، اور اس میں ہر طبقہ کے آدمی شریک ہوتے تھے، لکھتے ہیں:-

"چنانچہ معمول تھا کہ ہر مہینے کی دوسری اور ۲۴ کو شہر کے بڑے بڑے کلاونت، ڈوم، گویے اور صاحب کمال اہل ذوق جمع ہوتے تھے، اور معرفت کی چیزیں گاتے تھے، یہ دن ان کے کسی بزرگ کی وفات کے ہیں، محرم غم کا مہینہ ہے، اس میں سرکو بجائے گانے کے مرثیہ خوانی ہوتی تھی، مولانا شاہ عبد العزیز صاحب کا گھرانہ اور یہ خاندان ایک محلہ میں رہتے تھے، شاہ صاحب عالم طفولیت میں تھے کہ ایک دن اس جلسہ میں چلے گئے اور خواجہ صاحب کے پاس جا بیٹھے، ان کی مرید بہت سی کنچنیاں تھیں اور چونکہ اس وقت رخصت ہوا چاہتی تھیں، اس لیے سب سامنے حاضر تھیں، باوجودیکہ مولوی صاحب اس وقت بچے تھے، مگر انکا تبسم اور طرز نظر دیکھکر خواجہ اعتراض کو پا گئے اور کہا کہ فقیر کے نزدیک تو یہ سب ماں بہنیں ہیں مولوی صاحب نے کہا ماں بہنوں کو عوام الناس میں لیکر بیٹھنا مناسب ہے، خواجہ صاحب

خاموش ہو رہے - (۱۴۳)

اس بیان کا کوئی ایک جزء بھی صحیح نہیں ہے، رشد و ہدایت اور علم و فضل کے ساتھ خواجہ صاحب کی تہذیب و شرافت اور متانت و سنجیدگی بھی ضرب المثل تھی، ان کی مجلس ایسی باوقار ہوتی تھی کہ بادشاہ کو بھی شرکت کی اجازت لینی پڑتی تھی، خود آزاد نے لکھا ہے:

"شاہ عالم نے خود ان کے یہاں آنا چاہا اور انھوں نے قبول نہیں کیا"

جس شخص کی مجلس میں بادشاہ وقت بھی اجازت کے بغیر نہ آسکتا ہو، کیا اس میں ڈوم، ڈھاڑیوں اور کچنیوں کے برملا آنے کی اجازت ممکن ہے؟ خواجہ صاحب خواص سے بھی کم ہی ملتے تھے، مگر آزاد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک عامی آدمی کی طرح ہر طبقہ کے آدمیوں سے خلا ملا رکھتے تھے، حتیٰ کہ بازاری عورتیں بھی ان کے یہاں ماں بہنیں بن گئی تھیں، آزاد کا معاملہ یہ ہے کہ اذا لم تستحی فاصنع ما شئت

یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ ان کے یہاں بالالتزام دو دن مجلس سماع ہوتی تھی، یہ بھی غلط ہے کہ یہ تاریخیں ان کے کسی بزرگ کے انتقال کی ہیں، یہ بھی بالکل بے بنیاد بات ہے کہ ۲۴ تاریخ کو ان کے یہاں مرثیہ خوانی ہوتی تھی، ان باتوں کا ذکر نہ تو کسی تذکرہ نگار نے کیا ہے اور نہ خود خواجہ صاحب نے، حالانکہ خواجہ صاحب نے اپنی کتابوں میں اپنی مجلس کے پند و وعظ، سماع، معاشرت اور اس طرح کی تمام باتوں کا ذکر کیا ہے، مگر ان میں کہیں ان باتوں کا ذکر نہیں ملتا، سب سے پہلے مصحفی نے ۲ تاریخ کی مجلس سماع کا ذکر کیا ہے، نہ جانے مصحفی کا ماخذ کیا ہے، غالباً اسی بیان کی بنیاد پر آزاد نے اپنے افسانہ کی اتنی بلند عمارت اٹھا دی،

دلائل و شواہد سے قطع نظر، اگر اس وقت کے طرز معاشرت، آداب مجلس اور خود دور بزرگوں کے تعلقات پر ایک سرسری نظر بھی ڈال لیجائے تو ان باتوں کو باور کرنا مشکل ہوگا،

جس عہد کا ذکر آزاد نے کیا ہے، اس میں بزرگوں کا لحاظ و پاس اور ادب و تہذیب معاشر کی جان تھی، جس میں خوردوں کو پہلا سبق یہ دیا جاتا تھا کہ خطائے بزرگاں گرفتن خطا است،
خواجہ صاحب شاہ عبدالعزیز صاحب کے والد بزرگوار حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے نہ صرف ہمعصر بلکہ ان کے ہم پلہ اور ہم مرتبہ تھے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر شاہ ولی اللہ صاحب ان کو زبان سیکھنے کے لیے خواجہ صاحب کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے، خواجہ صاحب کے نواسے سید ناصر فراق لال قلعہ کی ایک جھلک میں لکھتے ہیں:

"شاہ صاحب (عبدالعزیز) اپنے والد ماجد (شاہ ولی اللہ) کے حکم کے بموجب اردو زبان سیکھنے کے لیے خواجہ میر درد کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، اور پوری توجہ سے خواجہ صاحب کی تقریر سنتے تھے، محاورات پر پوری نظر و توجہ رکھتے تھے، شاہ ولی اللہ صاحب اپنے بچوں سے کہا کرتے تھے کہ جس طرح اصول حدیث اور اصول فقہ فن ہیں، اسی طرح اصول زبان بھی ایک فن ہے، اور اردو زبان کے موجد و مجتہد خواجہ میر درد ہیں، آپ کی صحبت کو اس فن کے واسطے غنیمت سمجھو، کیونکہ خواجہ صاحب چراغ سحری ہیں"

ادب و تہذیب کے ساتھ شاہ صاحب خواجہ صاحب کے سلسلۂ تلمذ میں بھی داخل ہیں، کیا ایسی صورت میں یہ ممکن تھا کہ شاہ عبدالعزیز صاحب خواجہ صاحب پر اعتراض کے انداز میں تبسم فرماتے اور خواجہ صاحب ان کو یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کرتے کہ یہ ماں بہنیں ہیں، اور شاہ صاحب غیر مطمئن ہو کر جواب میں یہ کہتے کہ ماؤں بہنوں کو عوام الناس میں لیکر بیٹھنا کیا مناسب ہے، اور پھر ایک بچہ کا بڑوں کی طرح معترضانہ تبسم فرمانا اور نگاہیں اس طرح کرنا کہ طرز نظر سے خواجہ صاحب اعتراض کو بھانپ جائیں، خود ہی اس کی صحت کی تکذیب کر رہے ہیں،

آزاد نے خواجہ صاحب کے سماع سننے کا ذکر جس انداز سے کیا ہے، تو یہی قرائن سے قطع نظر

خوان کے بیان سے اس کی تردید ہوتی ہے، خواجہ صاحب سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے شیوخ میں تھے جن میں
سماع کا رواج بالکل نہیں تھا، خواجہ صاحب کے عہد میں چشتیت کے اثر سے عام طور پر کچھ قیود و شرائط
کے ساتھ حلقۂ صوفیہ میں سماع کا رواج ہوگیا تھا، اس وجہ سے خواجہ صاحب کی مجلس میں بھی اہل سماع
آجایا کرتے تھے، اور گاہے بگاہے سماع کی مجلس ہو جاتی تھی، مگر یہ کہنا کہ ان کے یہاں ہر ماہ کی ۲ اور ۲۴
کو بالالتزام مجلس سماع ہوتی تھی، بالکل بے بنیاد بات ہے، خواجہ صاحب کے اس گاہے بگاہے سماع
سن لینے پر بھی کچھ لوگوں کو اعتراض ہوا، تو ان کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"درحق ایں امر ہمہ وقت گواہ کہ خود بخود گویندگان می آیند و ما دام میخوانند می سرایند
نہ آنکہ ایں فقیر آنہا را می طلبد و شنیدن سرود رچوں دیگراں عبادت می فہمد بلکہ ہمہ معاملہ
نہ انکار می کنم و نہ ایں کار می کنم در پیش است، و عقیدہ ہمان است کہ عقیدہ بزرگان من است"

پھر ندامت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اما چوں دریں ابتلا گرفتارم ناچار خدا را بیامرزد و فتوی اباحت ایں کار بیاران خود
ندادہ ام و بنیاد سلوک بر سماع ننہادہ ام"

اعتراض کرنے والوں کو خطاب کرکے کہتے ہیں

"اے کرم فرمایاں ایں ہمہ غصہ عبث نباید کرد"

پھر آہ سرد میں جو ان کی آخری عمر کی کتاب ہے، اس میں لکھتے ہیں،

"مرا ہر چند از شوق ایں امر ست کہ مستغرقان ایں کار باشد و نہ آں ہمہ ایں عمل
نیک می شمارم کہ اہل سماع از صوفیاں می پندارند"

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ خواجہ صاحب بغیر قصد و ارادہ کے سماع سے
شغل کرتے تھے، مگر نہ تو خود اس کے لیے کوئی مجلس منعقد کرتے تھے، اور نہ انکو اس کا وہ اہتمام و شوق تھا،

جس کا نقشہ آزاد نے کھینچا ہے، لکھتے ہیں:

"بہر حال ایں را خدا می داند کہ من از خود خوانندگان را می طلبم و نہ مژدے با ایشاں می دہم و اگر تمام عمر بیایند ہرگز مرا خطرۂ شنیدن ایشاں نیاید (ص ۸۵)

سب سے بڑھکر آزاد کی ظرافت یہ دیکھئے کہ انھوں نے ایک طرف تو ان کو سماع و غنا کا ایسا رسیا دکھایا ہے کہ ڈوم ڈھاریوں سے بھی پرہیز نہیں تھا، اور دوسری طرف یہ بھی لکھا ہے:

"ایک رسالہ حرمت غنا میں ان سے یادگار ہے (۱۸۱)

یہ تضاد بیانی آزاد نے کئی جگہ کی ہے، اوپر ذکر آچکا ہے کہ خواجہ صاحب کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ ان کی مجلس ایسی باوقار ہوتی تھی کہ بادشاہ بھی اجازت لیکر آتے تھے، دوسری طرف یہ لکھ دیا کہ وہ کنچنیوں سے برملا خلا ملا رکھتے تھے۔

خواجہ صاحب کے بارے میں آزاد کی جتنی معلومات ہیں وہ سب سماعی معلوم ہوتی ہیں، ادھر ادھر سے جو کچھ سن لیا لکھ دیا، حتیٰ کہ انھوں نے خواجہ صاحب کا پورا دیوان بھی غالباً دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے، ان کی سماعی معلومات کا ایک نمونہ یہ ہے کہ خواجہ صاحب کی تصانیف میں ایک کتاب واقعات درد کا بھی ذکر کیا ہے جس کا کوئی وجود نہیں، دوسرے ان کے والد کی کتاب نالۂ عندلیب کو ایک رسالہ لکھا ہے، جبکہ وہ دو جلدوں میں ایک ہزار صفحے سے زیادہ ضخیم کتاب ہے، خواجہ ناصر عندلیب کی شاعری کے بارے میں لکھا ہے کہ

"چونکہ اس زمانہ کے خاندانی خصوص اہل تصوف کو شاعری واجب تھی، اس واسطے ان کے والد کا بھی ایک دیوان مختصر ہے اس کی شرح کے ..... موجود ہے (ص ۱۰)

آزاد نے معلوم نہیں کن خاندانی لوگوں اور اہل تصوف کی طرف اشارہ کیا ہے، اگرچہ یہ بات خواجہ ناصر کے ضمن میں کہی گئی ہے، اس لیے اس کی وضاحت ضروری ہے۔

خواجہ ناصر کی شاعری تصوف کی رواجی شاعری نہیں تھی، بلکہ انکا کلام نہایت ہی پُرسوز و پُر اثر ہوتا تھا، نالۂ عندلیب میں ان کی غزلوں، رباعیوں اور مثنویوں کے نمونے کثرت سے موجود ہیں، ان کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو فارسی شاعری پر استادانہ قدرت تھی، روز روشن کے مصنف نے فارسی شعراء کے ضمن میں ان کا شمار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

خواجہ ناصر بلبل خوشنوائے گلستان سخن بود

نالۂ عندلیب کی پہلی ہی غزل کا مطلع ملاحظہ ہو :

عندلیبم داستانِ گلستان آوردہ ام غنچہ ساں در یک دلیہا صد زباں آوردہ ام

ایک دوسری غزل کا شعر ہے :

یار در خانۂ خود دارم و آرامم نیست حکمِ دیدۂ من حلقہ بیرون دراست

کیا یہ رواجی شاعری کرنے والے کا انداز ہو سکتا ہے، ان کی شاعرانہ خصوصیات کی تفصیل انشاء اللہ زیر ترتیب کتاب میں آئے گی، آزاد نے یہ بھی غلط لکھا ہے کہ ان کے والد کا بھی ایک دیوان مع شرح کے موجود ہے۔ دیوان کی شرح ایک بے معنی بات ہے، غالباً آزاد سے کسی نے نالۂ عندلیب کا ذکر کیا تھا۔ جس میں مطالب کی توضیح میں انھوں نے جابجا اپنی غزلوں اور رباعیوں اور مثنویوں سے استدلال کیا ہے اسی کو آزاد نے دیوان کی شرح قرار دیا ہے۔

آزاد نے خواجہ صاحب کی زبان و بیان کی غلطیاں بھی دکھائی ہیں، مثلاً اس شعر

چلئے کہیں اس جا کہ ہم تم ہوں اکیلے گوشہ نہ ملے گا کوئی میدان ملے گا

کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"جا کہ کے علاوہ اکثر جگہ کی، کے اور ہے وغیرہ دب دب کر نکلتے ہیں"

ایک لحظہ اور بھی وہ اٹھتا چمن کا وہ زحمت نہ دی زمانے اتنی شرار کو

پھر لکھتے ہیں، اس سے اعتراض مقصود نہیں، وقت کی زبان یہی تھی، سید انشاؔ نے بھی لکھا ہے کہ خواجہ میر اثرؔ مرحوم مثنوی میں ایک جگہ دیسا بھی کہہ گئے ہیں اور بڑے بھائی تلوار کو تروار کہا کرتے تھے،

جہاں تک پہلے شعر میں "جاگہ" کے لفظ کا تعلق ہے وہ ضرور دب کر نکلتا ہے، مگر جیسا کہ آزادؔ نے لکھا ہے، "وقت کی زبان یہی تھی"۔ پھر یہ شعر تذکرہ جاگہ کے لفظ تک تو پہنچا ہے، اور دوسرے نسخوں میں اس جا پہ ہے جس سے یہ اعتراض رفع نہیں ہوتا، تو ہلکا ضرور ہو جاتا ہے۔

لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اونٹ نگل کر آزادؔ کو مچھر چھاننے کی ضرورت کیوں پیش آئی، اب رہا انشاؔ کا مقولہ تو معلوم نہیں انشاؔ نے یہ بات کہاں لکھی ہے اور لکھی بھی ہے یا نہیں، البتہ دریائے لطافت میں تو انھوں نے خواجہ صاحب اور مرزا مظہر جان جاناں وغیرہ کا ذکر کر کے لکھا ہے:

"غرضیکہ پاک کنندۂ چمنستانِ ریختہ از خار وخس عیوب ہمیں صاحبان اند" (۲۴)

انشاؔ کی طرف اس اعتراض کی نسبت اسی طرح تو نہیں ہے جیسی کہ انھوں نے ولی کے سلسلہ میں لکھ دیا ہو کہ میرؔ نے انھیں شیطان سے زیادہ مشہور کہا ہے، میرؔ نے اثرؔ پر جو اعتراض کیا ہے اس سے بحث نہیں ہے مگر ایسا تو نہیں ہے کہ دیسا کا مفہوم جو آزادؔ نے سمجھا ہے، میر اثرؔ نے اس معنی میں نہ لیا ہو۔ دیسا کے معنی برسی کے بعد کے فاتحہ کے بھی ہوتے ہیں،

اور شاہ ولی اللہ صاحب کا مقولہ کہ اردو زبان کے موجد و مجتہد خواجہ میر دردؔ ہیں، کے علاوہ میرؔ صاحب نے نکات الشعراء میں اکثر شعراء پر اعتراضات کیے ہیں، ...... خواجہ صاحب کے اغلاط پر ایک حرف نہیں لکھا ہے۔ اسی طرح دوسرے تذکرہ نگاروں کا حال بھی ہے، خود آزادؔ کے ممدوح اور استاد شیفتہ تو یہ لکھ گئے ہیں:

فکرش صحیح و نظمش فصیح گفتارش از رکاکت و اغلاط پاک و در جیب گلہائے خیالش گلہائے چمن ہم از خس و خاشاک۔

آزاد نے ایک اعتراض یہ کیا ہے :-

"لیکن اس سے قطع نظر کرکے دیکھا جاتا ہے تو بعض الفاظ پر تعجب آتا ہے، چنانچہ خواجہ میر درد کی ایک پرزور غزل کا مطلع ہے:

مدرسہ یا دیر تھا، کعبہ یا بت خانہ تھا

ہم سبھی مہمان تھے تو آپ ہی صاحب خانہ تھا

گویا بتخانہ کو کثرت استعمال کے سبب ایک لفظ تصور کیا کہ دیر کے حکم میں ہوگیا ورنہ ظاہر ہے کہ یہ قافیہ صحیح نہیں ہے"

آزاد کیا کہنا اور اعتراض کرنا چاہتے ہیں یہ واضح نہیں ہوتا، اگر وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ لف ونشر مرتب کے قاعدہ سے دیر کے مقابلہ میں اس کا مرادف بتخانہ لانا صحیح نہیں ہے تو پھر دیر کے ساتھ بتخانہ کا قافیہ صحیح نہ ہونے کے کیا معنی، اور پھر بتخانہ انھوں نے دیر کے مقابلہ میں مرادف کے طور پر استعمال نہیں کیا ہے، بلکہ تنوع مقصود ہے، اور ان کے شعر کا سارا حسن اسی تنوع میں پوشیدہ ہے، اور اگر وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بتخانہ مرکب لفظ ہے، اس لیے اس کا قافیہ مفرد مرادف الفاظ کے ساتھ لانا صحیح نہیں ہے تو یہ اعتراض بھی درست نہیں ہے، اس لیے کہ اسی شعر میں انھوں نے صاحب خانہ اور اس غزل کے دوسرے شعر میں خلوت خانہ استعمال کیا اور یہ دونوں لفظ مرکب ہی ہیں، اور پھر مفرد قوافی کے ساتھ میخانہ کے استعمال کو کیا کہیں گے، جب کہ عام ہی شعرا اس کا استعمال کرتے ہیں، آزاد کے ملک الشعرا سودا نے بھی مدرسے کے ساتھ دیر اور دیر کے ساتھ مرکب قافیہ میخانہ کا استعمال کیا ہے :-

کل تو مست اس کیفیت سے تھا کہ آئے دیر سے

پھر نظر جو مدرسے دیکھا تو وہ میخانہ تھا

خواجہ صاحب کے شعر میں تنوع کے لیے مدرسہ کے مقابلہ میں دیر اور کعبہ کے مقابلہ میں بت خانہ استعمال ہوا ہے، ویر و بتخانہ کے ہم قافیہ و مقابل ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے، آزاد نے جس طنطنے سے یہ اعتراض کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب سے زبان وبیان کی کوئی غیر معمولی غلطی ہوئی ہے، مگر ان کا اعتراض بے معنی معلوم ہوتا ہے،

آزاد کو خواجہ صاحب کے دامن فضل وکمال کو داغدار بنانے اور ان کی شاعرانہ عظمت کو مجروح کرنے کے لیے جو مواد بھی ہاتھ آیا ہے وہ داد وتحسین کے بڑے ہی خوبصورت پردوں میں چھپا کر پیش کرتے ہیں، حتی کہ اس سلسلہ میں ان کو بعض لایعنی باتوں کے ذکر کرنے میں بھی باک نہیں ہوتا، لکھتے ہیں:-

" ان کے یہاں ایک صحبت خاص ہوتی تھی، اس میں خواجہ صاحب نالۂ عندلیب ... باپ والد کی تصنیفات اور اپنے کلام کا کچھ کچھ حصہ بیان کرتے تھے، ایک دن مرزا رفیع (سودا) سے سرراہ ملاقات ہوئی، خواجہ صاحب نے تشریف لانے کے لیے فرمایش کی، مرزا نے کہا صاحب مجھے یہ نہیں بھاتا کہ سو کوے کائیں کائیں کریں اور بیچ میں ایک پدا بیٹھا چوں چوں کرے،

پہلی بات یہی صحیح نہیں ہے کہ نالۂ عندلیب اور اپنے کلام کا بیان کرنے کے لیے ان کے یہاں کوئی مجلس خاص منعقد ہوتی تھی، اور اگر یہ ہوتی بھی تو یہ بزم عرفان معرفت وحقیقت کے بیان کے لیے ہوتی تھی، نہ کہ یہ مجلس شعر وسخن تھی کہ خواجہ صاحب مرزا سودا کو اس میں مدعو کرتے، دو ... سرراہ، گویا سودا کی طرح خواجہ صاحب بھی کوچہ و بازار میں پھرا کرتے تھے، کہ اثنائے راہ میں ملاقات ہوگئی، اور انھوں نے ان کو مجلس خاص میں آنے کی دعوت دے دی،

اس سے قطع نظر اگر یہ مجلس ہوتی بھی تھی تو سودا کو اس میں مدعو کرنے کا کوئی موقع ہی سرے سے تھا ہی نہیں، اس لیے کہ خواجہ صاحب کی یہ مجلس ان کے والد کے انتقال اور ان کے سجادہ نشین ہونے کے بعد ہی ہوتی ہوگی، اور ان کے والد خواجہ ناصر کا انتقال ۱۱۶۳ھ میں ہوا، اور سودا ۱۱۶۵ھ کے پہلے ہی دلی چھوڑ چکے تھے، اور فرخ آباد، پھر فیض آباد اور لکھنؤ میں قسمت آزمائی کر رہے تھے، آزاد نے یہ بھی غلط لکھا ہے کہ سودا نے ۶۰ یا ۶۶ برس کی عمر میں دلی چھوڑی،

خواجہ صاحب کا فضل و کمال چونکہ مسلم تھا، اس لیے اپنی اس افسانہ طرازی کو اس جملہ میں چھپانے کی بھی کوشش کی ہے،

اس زمانہ کے بزرگ ایسے صاحب کمالوں کی بات کا تحمل اور برداشت کرنا لازمۂ بزرگی سمجھتے تھے، آپ مسکرا کر چپ ہو رہے"

خواجہ صاحب کے سلسلہ میں بعض اور چھوٹی چھوٹی فروگذاشتیں آزاد سے ہوئی ہیں، مگر ان کو اس لیے نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ ان سے خواجہ صاحب کی شخصیت یا شاعری پر کوئی حرف نہیں آتا،

آل انڈیا مسلم مجلس

مکتوب خواجہ عبدالمجید مرحوم بنام مولانا سید سلیمان ندویؒ

مجی المحترم السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ

آپ کا عنایت نامہ میرے عریضہ کے جواب میں موصول ہو کر کاشف حالات ہوا تھا، آپنے تحریر کی زحمت گوارا فرمائی اس کا شکریہ، آپکے خیالات کا اظہار میرے لیے تازیانۂ تفکر ہوا، ارادہ کرتا رہا کہ آپ کو پھر لکھوں، لیکن جس قحط الرجال نے مجھ جیسے مریض و ناکارہ کو ایسی اہم خدمت سپرد کیے جانے پر دوستوں کو آمادہ کیا وہی اس جماعت کے کاموں میں مشکلات پیدا کر رہا ہے، باوجود کوشش کے مرکزی دفتر کے لیے کوئی معقول انتظام نہیں ہو سکا، مجھے بعض دوستوں نے دیوانہ کہا ہے، میں چاہتا ہوں کہ دو چار دیوانے مجھے اور مل جائیں تو یہ کام اچھی رفتار سے چل پڑے، ابتک جو کچھ ہو گیا ہے وہ ایک دیوانہ کا کام نہیں، بلکہ اس میں تائید غیبی ہر ہر قدم پر شامل حال رہی ہے،

ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری سے مفصل گفتگو کی اور یقین ہو گیا کہ کچھ نو عمری کچھ مذاق اور کچھ خاموشی کی وجہ سے ان کے متعلق غلط فہمیاں پھیل گئی ہیں، ورنہ ان کو اشتراکی جماعت سے کوئی تعلق نہیں ہے، عقائد کا اثر مختلف طبیعتوں پر مختلف طریقہ سے ظاہر ہوتا ہے، میں روانگی یورپ سے پہلے ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک اپنے شیخ کی خدمت میں جب حاضر ہوا کرتا تھا، اور جب ہم مریدانِ حلقہ بگوش ایک ہی عقیدہ کے ماتحت حلقہ میں نقشبندیہ طریق پر بیٹھا کرتے تھے تو میں دیکھا کرتا تھا کہ ایک ہی جماعت پر ایک ہی شخص کی توجہ کا اثر مختلف ہوا کرتا تھا، اس لیے مجلس کے ہر ممبر کے متعلق وثوق کے ساتھ کوئی عام حکم لگا دینا تو مشکل ہے، مگر اگر اس جماعت پر میرے عقائد کا بھی

خیالات کا کوئی اثر پڑ سکتا ہے تو میں صداقت سے یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ میں عمر اور زندگی کی جس منزل پر پہنچ گیا ہوں، نہ صرف باعتبار سن بلکہ باعتبار مرض قلب اس میں اپنے ضمیر کو دھوکہ دینے کا مقام و محل نہیں رہا، میرا ایک شعر ہے ؎

میں تجکو دمِ واپسیں ڈھونڈتا ہوں — گماں مٹ رہا ہے یقیں ڈھونڈتا ہوں

عمر کا ایک بڑا حصہ سیاسی جد و جہد میں گذارنے کی وجہ سے ممکن ہے کہ مجکو یہ طریقۂ خدمت یاد الہٰی ہی کا ایک طریقہ محسوس ہوتا ہے، اللہ ہی کو خبر ہے کہ یہ میرے نفس کا دھوکہ ہے یا فرائض کا صحیح احساس، آپ بھی دعا فرمائیے کہ میں گمان کی کشمکشوں سے آزاد ہو کر اپنے اس شعر کا مصداق ہو جاؤں،

سمایا ہے جو نور میری نظر میں — اسی کو یہ عین الیقیں ڈھونڈتا ہوں

علی گڑھ وغیرہ آنا ہو تو مجھ سے ملنے کا وعدہ میرے لیے تسلی بخش نہیں ہو سکتا۔

آپنے ورکنگ کمیٹی کی شرکت سے انکار کر دیا، وہ مستقل اور مسلسل کام تھا، ۱۷، ۱۸ اگست کو جو کانفرنس ہو رہی ہے اس کا دعوت نامہ ملفوف ہے، میری ذاتی آرزو بھی اسی میں شامل ہے کہ اسی موقع ایک ملاقات کا ہو جائے۔

مجلس کے متعلق عارضی طور پر جو قواعد بنائے ہیں اور جو خاکہ عملی پروگرام کا مرتب کیا ہے، اور نیز قرطاس رنگینت اور ایک گشتی مراسلہ جس کی آخری سطریں آپ کی توجہ کی مستحق ہیں، ملفوف ہیں، ان سے مجلس کے اغراض و مقاصد کی کچھ مزید وضاحت ہو گی، کم از کم ہمارے اور میرے عقائد کی جھلک آپ کو ملے گی، اگر ان میں کہیں اصلاح کی ضرورت ہو تو اس کے متعلق ہدایات سے مرہون منت فرمائیں،

خدا کرے آپ بہمہ وجوہ بخیر ہوں، مولوی مسعود علی ندوی نے بھی آخری منزل پر کج رخی برتنی جائز سمجھی ہے، خیر ہم تو دعاگو ہیں، دعا کیے جائیں گے، والسلام ۲۸ جولائی ۱۹۴۴ء

ادبیات

حقایق و معارف

از جناب افقر موہانی

رندوں کی جب زبان پہ مرا نام آگیا ساغر بدست ساقیِ گلفام آگیا

اندیشہ جس کا تھا وہی ہنگام آگیا شامِ فراق موت کا پیغام آگیا

رکھا ہی اور کیا تھا جہانِ خراب میں جامِ شکستہ بھی تو بہت کام آگیا

ان کو نگاہِ شوق نے دیکھا ضرور تھا مجھ پر بس اتنی بات پر الزام آگیا

اے شیخ کیا خیال ہے اس مے کے باب میں محفل میں بے طلب جو کبھی جام آگیا

مستِ خرامِ ناز کی اللہ رے سرخوشی کیفِ نظر سے رقص میں خود جام آگیا

جلتا رہا چراغِ شبِ ہجر دل کے ساتھ یہ بھی مریضِ غم کے بڑے کام آگیا

شیخِ حرم کے جب سے قدم آئے دیر میں بُت خانہ کی حدود میں اسلام آگیا

وحدت پرستیوں میں بھی زاہد خدا گواہ اکثر خیالِ سجدۂ اصنام آگیا

خوابِ گراں سے کس گھڑی افقرؔ کھلی ہے آنکھ جب آفتابِ عمر لبِ بام آگیا

سازِ دل

از پروفیسر نکہت شاہجہانپوری، صدر شعبۂ فارسی و اردو جی اف کالج شاہجہانپور

ہائے کیا رنگین او اہے سازِ دل کوئی سنتا ہے مگر آوازِ دل

کائناتِ زندگی ہے سازِ دل فرش سے تا عرش ہے آوازِ دل

عشق والفت کے سوا کچھ بھی نہیں — کوئی سمجھے یا نہ سمجھے رازِ دل

اللہ اللہ! نغمہ زارِ زندگی — جیسے کوئی سن رہا ہو سازِ دل

ذرہ ذرہ اک جہانِ حسن ہو — کیسے جلوے بن گئے ہمرازِ دل

چھوڑ دیجئے بھی قصۂ دیر وحرم — چھیڑ دیجئے بھی نغمہ ہائے سازِ دل

اب کہاں نکہت کہاں سیرِ چمن
لالہ و گل تھے کبھی دمسازِ دل

شیرازۂ برہم

از

جناب لطیف انور لاہور

(۱)

سمجھ سکا نہ محبت کے فیضِ عام کو تو — نہ تیرے دل میں حرارت نہ آنکھ میں آنسو

نہ آدمی کا لہو دے اسے خدا کے لیے — زمیں کو راس نہ آئے گا آدمی کا لہو

(۲)

تری نگاہ کا اب تک کوئی اصول نہیں — مذاقِ دید کو آوارگی قبول نہیں

ذرا سنبھل کے یہاں دامنِ نظر پھیلا — چمن میں کانٹے بھی ہوتے ہیں صرف پھول نہیں

(۳)

مذاقِ نغمہ کو ناکام میں نے دیکھا ہے — چمن میں دانہ تہِ دام میں نے دیکھا ہے

مری نظر سے الجھتے ہیں کس لیے کانٹے — شگفتہ پھولوں کا انجام میں نے دیکھا ہے

(۴)

دلوں کے زخم کبھی اس طرح شمار کرو — ہر ایک لب پہ تبسم کا انتظار کرو

مری نگاہ کی افسردگی کو بھیک نہ دو — نہ مجھ سے پیار کرو، زندگی سے پیار کرو

(۵)

کسی کے چہرے پہ غازہ کسی کی آنکھ میں دھول — کسی کے پاؤں میں کانٹا کسی کے ہاتھ میں پھول

یہی رہے گا کہاں تک جہان کا معمول — کہ جیسے بند دریچوں پہ دستکوں کا نزول

مطبوعات جدیدہ

یادگار امجد ۔ مرتبہ محمد اکبرالدین صاحب صدیقی، عثمانیہ یونیورسٹی، صفحات ۱۹۲

کتابت و طباعت متوسط، پتہ: چار قندیل، آغا پورہ، حیدر آباد ۔ قیمت :- عہ

سید احمد حسین صاحب مرحوم جو امجد حیدر آبادی کے نام سے ہند و پاک میں معروف ہیں، نہ صرف مشہور رباعی گو شاعر تھے، بلکہ بحیثیت انسان بھی وہ یادگار سلف تھے، شرافت، اور محبت و شفقت کا وہ نمونہ تھے، نیک نفسی اور پاک طینتی ان کی سرشت میں تھی، ان کے شاعرانہ کمالات اور بلندیوں سے تو عام طور پر اہل علم واقف ہیں، مگر ان کی شخصیت کا تعارف ان کے ملنے والوں اور دوستوں کے حلقہ سے باہر بہت کم تھا، ان کی شخصیت بھی ان کی شاعری کی طرح بہت بلند و پاکیزہ تھی، اس لیے ضرورت تھی کہ ان کی شخصیت کا بھی تعارف کرایا جائے، اس فرض کو محمد اکبرالدین صاحب نے ادا کیا ہے، اس مجموعے میں امجد مرحوم کے دوستوں اور نیازمندوں کے وہ مضامین جمع کر دیے گئے ہیں، جو انھوں نے ان کی زندگی یا وفات کے بعد لکھے تھے، تقریباً سبھی مضامین سنجیدہ اور مطالعہ کے لائق ہیں، خاص طور پر مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کا مضمون بڑا ہی پر اثر و پرکیف ہے، ان مضامین سے ان کی شخصیت کا پورا تعارف ہو جاتا ہے، ان کی زندگی کا مطالعہ کرکے یہ کہنے کا جی چاہتا ہے کہ کتنا ہی برا زمانہ کیوں نہ ہو، دنیا اچھوں سے خالی نہیں ہوتی، کتاب کا ہر مضمون بار بار مطالعہ کے لائق ہے۔

الوطن العربی (عربی) از [illegible] الرفاعی، صفحات [illegible]، [illegible] الثقافۃ [illegible] (شام)

شامی حکومت کی وزارت ثقافت کے شعبہ تالیف و ترجمہ کی طرف سے عرب قومیت اور عربی عصبیت کے پروپیگنڈے کے لیے ادھر چند برسوں میں جو کتابیں اور رسالے شائع ہوئے ہیں انہی میں یہ کتاب بھی ہے، اس میں عرب ملکوں کا جغرافیائی جائے وقوع، ان کے دریا، معدنی وخام پیداوار، مصنوعات، ذرائع آمدنی اور آبادی وغیرہ کی تفصیل کی گئی ہے، جہاں تک نفس موضوع کا تعلق ہے وہ ایک جغرافیائی، تاریخی اور علمی موضوع ہے، اور اس حیثیت سے یہ کتاب مفید بھی ہے، مگر چونکہ یہ کتاب ایک خاص سیاسی مقصد سے لکھی گئی ہے، اس لیے عرب قومیت اور عربی عصبیت کے جاہلی تصور کی ہر جگہ تبلیغ کی گئی ہے، مگر پوری کتاب میں مثبت طور پر ایک جگہ بھی شاید اسلام کا نام نہیں آیا ہے، ترکوں کی عرب دشمنی کا کھل کر اظہار کیا گیا ہے۔ اسلام سے پہلے کی عربی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے، مگر اس بات کا ایک جگہ بھی ذکر نہیں آیا ہے کہ اسلام نے عربوں کو کیا دیا اور اس نے کس طرح ان صحرانشینوں اور گلہ بانوں کو تہذیب و تمدن کا مالک اور دنیا کا امام بنا دیا، یہ کتاب اس وقت شائع ہوئی تھی جب شام عرب جمہوریہ میں شامل تھا، اب ناصر کے دام ہم رنگ زمیں سے نکلنے کے بعد ممکن ہے کہ اس ذہنیت میں کوئی تبدیلی آئی ہو، یہ کتاب عام معلومات کے نقطۂ نظر سے مطالعہ کے لائق ہے۔

وکرم اروشی۔ از کالی داس ترجمہ ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی صفحات ۲۱۶، مجلس روابط ایران و ہند، نئی دہلی،

کالیداس کا سب بڑا ادبی کارنامہ شکنتلا ہے، اس کے علاوہ بھی ان کی متعدد ادبی یادگاریں ہیں، انہی میں ان کی کتاب وکرم اروشی بھی ہے جس کا اردو ترجمہ عزیز مرزا صاحب نے آج سے پچاس پچپن سال پہلے کیا تھا، اور اس پر انھوں نے ایک مبسوط مقدمہ بھی لکھا تھا، اسی اردو ترجمہ کو ڈاکٹر امیر حسن صاحب نے بڑی عمدگی اور سلیقہ سے فارسی کے قالب میں ڈھالا ہے، ترجمہ سلیس اور

رواں ہے، اس کا ترجمہ انگریزی اور جرمنی اور یورپ کی دوسری زبانوں میں بھی ہو چکا ہے، اسکی اشاعت سے ادبیات فارسی میں ایک قصۂ خوانی کا اور اضافہ ہوا ہے۔

خلافت علی وشہادت حسین۔ از سید اقبال احمد جونپوری صفحات ۲۰۲، کتابت و طباعت معمولی، پتہ محلہ رضو سجان ۳۴۹ جونپور۔

محمود عباسی صاحب نے خلافت معاویہ و یزید میں اپنی جو تحقیقات پیش کی ہیں، اس پر ہند و پاک میں بڑا شور و غوغا ہوا، اور اس کے جواب میں درجنوں کتابیں لکھی گئیں اور اس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے، انہی کتابوں میں زیر تبصرہ کتاب بھی ہے، محمود عباسی صاحب نے اپنی کتاب میں کہیں افراط اور کہیں تفریط سے ضرور کام لیا ہے اور اس سلسلہ میں انھوں نے بعض تاریخی واقعات کو توڑ مروڑ کر اپنے نقطۂ نظر کے مطابق بنانے کی کوشش بھی کی ہے، مگر اس کے باوجود اس کے بعض مندرجات افادیت سے خالی نہیں ہیں، خاص طور پر انھوں نے بنی امیہ اور بنو ہاشم کے تعلقات کی خوشگواری پر جو کچھ لکھا ہے وہ بہت ہی قابل قدر ہے، اس کتاب پر جن لوگوں نے جذباتیت سے بلند ہو کر محققانہ انداز میں تنقید کی ہے وہ قابل تحسین ہیں، انہی لوگوں کی دوسری صف میں سید اقبال احمد صاحب بھی ہیں،

الوحی المحمدی۔ از علامہ رشید رضا مصری، ترجمہ سید رشید احمد ارشد، صفحات ۴۸۱، کتابت، طباعت متوسط ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، قیمت عہ

الوحی المحمدی علامہ رشید رضا مصری کی بڑی معرکۃ الآرا کتاب ہے، اس میں انھوں نے ناقابل تردید دلائل سے قرآن پاک کو خدا کا کلام ثابت کیا گیا ہے، یہ کتاب ان تمام مستشرقین کا جواب ہے جو قرآن کی عظمت اور اس کے انقلابات کے قائل ہوتے ہوئے بھی اسے وحی خداوندی تسلیم نہیں کرتے۔

اس کتاب کے پہلے اڈیشن کا ترجمہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے بھی کیا تھا، اب اس کے آخری اڈیشن کا ترجمہ سید رشید صاحب نے کیا ہے، اس کتاب کے ترجمے دنیا کی تمام ممتاز زبانوں

میں ہو چکے ہیں، اس کے ترجمے سے اردو داں طبقہ کو ایک قابل قدر کتاب کے مطالعہ کا موقع ملیگا، ترجمہ نہایت ہی سلیس اور شگفتہ ہے۔

انوار الباری۔ مرتبہ مولانا سید احمد رضا صاحب، صفحات ۴۴۰، ناشر مکتبہ نشر العلوم دیوبند، قیمت مجلد ۲ر

مولانا انور شاہ صاحب کشمیری اپنے عہد کے زبردست محقق اور حدیث کے مسلّم استاد تھے، انھوں نے ایک مدت تک بخاری شریف کا درس دیا، یہ سلسلہ اس لیے شروع کیا گیا ہے کہ شاہ صاحب کے افادات سے اردو داں طبقہ کو روشناس کرایا جائے۔ یہ اس سلسلہ کی پہلی جلد ہے جس میں امام صاحب اور ان کے تلامذہ اور اکابر محدثین کا تذکرہ ہے، آیندہ جلدوں سے شاہ صاحب کی افادیت کا ذکر ہوگا۔

فردوس ہند۔ از صفدر آہ، صفحات ۱۹۲، کتابت وطباعت معمولی، ناشر کتاب کدہ ۱۳۰ والکیشور روڈ بمبئی ۲۶ قیمت ع ر

مرثیہ نگاری کے استاد کل میرانیس کے ایک شاگرد سید محمد افضل فارغ بھی تھے، جو اس صنف میں استاد کے نقش ثانی تھے، یوں تو ہر مرثیہ میں ایک ڈرامائی انداز ہوتا ہے، مگر خاص طور پر فارغ کے مرثیے اس حیثیت سے ممتاز تھے، اس کتاب میں فارغ کی سوانح حیات اور انکی مرثیہ نگاری کی خصوصیات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، کتاب محنت سے لکھی گئی ہے، زبان وبیان کی خوبی کے ساتھ یہ کتاب اس حیثیت سے بھی قابل قدر ہے کہ اس کی مصنفہ ان کی نواسی ہیں جنھوں نے ہر بات تحقیق سے لکھی ہے۔

شہر آرزو۔ از باقر مہدی صفحات ۱۹۲، کتابت طباعت عمدہ مع گردپوش، قیمت للعہ ر ناشر خلیل احمد خاں، گوشۂ ادب ۱۲۱ ارکیڈیا بلڈنگ بمبئی ۲۰

شہر آرزو ایک جواں سال شاعر باقر مہدی کا مجموعۂ کلام ہے، جو دوسری بار شائع ہوا ہے، باقر مہدی کی شاعری کی عمر گو بہت زیادہ نہیں ہے، مگر انھوں نے ذہن رسا کے ساتھ دل درد آشنا بھی پایا ہے، اسلیے انکے کلام سے متانت اور تاثیر نمایاں ہے، ترقی پسندی کے اس سطحی دور میں ان کا سنجیدہ مجموعۂ کلام یقینا قابل قدر ہے

غم و آلام کے ہجوم اور مایوسی و یاس کے نشیب و فراز سے آدمی اکتا نہ جائے تو یہ زندگی کی کامیابی کی علامت ہے، ہاشمی اس صبر آزما زندگی سے ہم کنار ہوئے ہیں، اس لیے ان کے کلام میں بھی اس کے اثرات اور کیفیات کی جھلک موجود ہے۔ اگر انھوں نے کچھ دن غم حیات کو اسی طرح گلے لگائے رکھا تو وہ ایک ممتاز شاعر بن جائیں گے، انھوں نے اپنے بہت سے اشعار میں کنایۃً و صراحۃً اس غم حیات کا ذکر کیا ہے:

غم حیات میں سب کچھ لٹا کے بیٹھے ہیں نہ کوئی راہ گذر ہے نہ کوئی ویرانہ
خبر نہیں کہ کہاں آج آ کے بیٹھے ہیں جنوں کی حد ہے کہ ہوش و خرد کی منزل ہے

جدید اردو شاعری کے ذخیرہ میں شہر آرزو ایک قیمتی اضافہ ہے۔ "م - ج"

مجموعۂ اشعار - از مولانا مظفر شمس بلخی بتصحیح و تحشیہ پروفیسر سید حسن ایم اے صفحات ۹۶، کتابت و طباعت بہتر، ناشر ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ،

مولانا برہان الدین مظفر شمس بلخی حضرت مخدوم شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے بڑے ممتاز خلیفہ تھے، اسلیے انکا شمار فردوسیہ سلسلہ کے اہم بزرگوں میں ہوتا ہے، انکا سلسلۂ نسب حضرت ابراہیم ادہم سے ملتا ہے جنھوں نے بلخ کے شاہی تخت کو چھوڑ کر درویشی اختیار کی، مولانا مظفر کے والد بزرگوار سلطان شمس بلخی بھی بلخ کے حکمراں تھے لیکن اپنے جد امجد کی سنت کے مطابق تاج و تخت کو ٹھکرا کر راہ سلوک اختیار کی، اور اپنے پورے خاندان کو لیکر ہندوستان آ گئے، پہلی بار دہلی میں سکونت پذیر ہوئے، پھر بہار آکر حضرت شیخ احمد چرم پوش منیری سے بیعت ہوئے، اور انہی سے وابستہ ہو کر زندگی گذاری، حضرت مولانا مظفر انکے بڑے صاحبزادے تھے، انکی وفات ۷۸۸ھ میں ہوئی، حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کو ان سے بڑی محبت رہی، ان کو جان شرف الدین کہا کرتے تھے، عارف باللہ ہونے کے علاوہ وہ فارسی کے شاعر بھی تھے، مجموعۂ اشعار انکے عارفانہ کلام کا مجموعہ ہے، ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ نے اسکو شائع کرکے ایک مفید علمی خدمت انجام دی ہے، شروع میں انگریزی میں فاضل مرتب پروفیسر سید حسن کا ایک مختصر لیکن پرمغز مقدمہ ہے جسمیں مولانا مظفر بلخی اور انکی شاعری کا پورا تعارف ہے، فاضل مرتب اب ادارہ کے نگراں بھی ہیں، وہ اپنی صلاحیت اور استعداد کے لحاظ سے بہار میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں، اسلیے امید ہے کہ آئندہ انکی نگرانی میں اس علمی ادارہ سے عربی و فارسی کی قابل قدر کتابیں برابر نکلتی رہیں گی۔ "ص، ع"

جلد ۹۱ ماہ رمضان المبارک ۱۳۸۲ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۶۳ء عدد ۲

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

آج سے دو سال پیشتر جب جامعہ ملیہ کو یونیورسٹی کا درجہ دینے کا بل پارلیمنٹ میں پیش ہونے والا تھا، ہم نے اسکے بارہ میں اپنے خیالات ظاہر کیے تھے، اور لکھا تھا کہ "جامعہ کے خدمات کا سب سے بڑا صلہ اور اس کی سب سے زیادہ قدر دانی یہ ہے کہ اس کو اردو یونیورسٹی بنا دیا جائے، اس سے کسی نہ کسی حد تک اسکی خصوصیات قائم رہیں گی، اردو والوں کی اشک شوئی بھی ہو جائیگی، جامعہ عثمانیہ کا خونبہا بھی ادا ہو جائیگا اور حکومت کی رواداری اور اس کی سیکولرزم کا بھی یہ ایک نشان ہوگا،، (معارف فروری ۱۹۶۹ء)

جس وقت یہ تجویز پیش کی گئی تھی، اس وقت اس کے عمل میں آنے کا مشکل سے تصور کیا جا سکتا تھا، مگر اب ایسی صورت پیدا ہوگئی ہے کہ یہ تجویز عملی شکل اختیار کر سکتی ہے، جامعہ کو یونیورسٹی بنانے کا مسئلہ طے ہو چکا ہے، اور جلد ہی اس پر عمل شروع ہو جائیگا، مرکزی وزارت تعلیم صوبائی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی حمایت میں ہے اور یہ باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اگر جامعہ میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا گیا تو حکومت اسکی بھی حمایت کرے گی، ہندوستان کی سرکاری درسگاہوں سے اردو قریب قریب ختم ہو چکی ہے، اور جہاں اس کا وجود باقی ہے، کچھ شعبۂ تعلیم کی بے مہری اور کچھ خود اردو والوں کی غفلت سے برائے نام ہی ہے، اور بظاہر ان تعلیم گاہوں میں اردو کا کوئی مستقبل نہیں ہے، ایسی حالت میں ہندوستان میں اردو کی یونیورسٹی کے قیام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، مگر حسن اتفاق سے ایک ایسی صورت پیدا ہوگئی ہے کہ اگر اس سے فائدہ اٹھایا جائے تو اردو یونیورسٹی کا خواب پورا ہو سکتا ہے۔

مرحوم جامعہ عثمانیہ اس راہ کی دشواریاں دور کر کے اس کا عملی نمونہ قائم کر چکی ہے، اس کا متروکہ علمی و تعلیمی ذخیرہ بہت کچھ جامعہ کے کام آسکتا ہے اور ضرورت کے مطابق اس میں نیا اضافہ بھی ہو سکتا ہے، اور آ جامعہ کے پاس ایسے مالی ذرائع بھی ہوگئے ہیں کہ وہ اس کام کو آسانی سے انجام دے سکتی ہے، اس کے پاس ماہرین تعلیم کی کمی نہیں ہے، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کو اگرچہ اب جامعہ سے کوئی ضابطہ کا تعلق نہیں رہ گیا ہے لیکن اس سے ان کی روحانی اور اخلاقی وابستگی ناقابلِ انقطاع ہے، شیخ الجامعہ مجیب صاحب اور ڈاکٹر عابد حسین صاحب بھی تعلیم و ترجمہ کے ماہر ہیں، ان کے علاوہ بھی جامعہ میں ماہرین تعلیم کی ایک جماعت موجود ہے، اس لیے خود اہل جامعہ اردو یونیورسٹی کا خاکہ بنا کر اس کو چلانے کے لیے کافی ہیں، اور اگر ضرورت ہو تو جامعہ عثمانیہ، اس کے دارالترجمہ کے باقیات صالحات اور مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ سے بھی مدد لیجا سکتی ہے، آدمیوں کی کمی نہیں ہے، صرف ہمت و عزیمت کی ضرورت ہے۔

حیدرآباد کے اردو دوستوں نے بے سروسامانی کے باوجود ایک اردو کالج قائم کر لیا جس کو جامعہ عثمانیہ نے بھی تسلیم کر لیا ہے، ایسی حالت میں جامعہ کو جسے حکومت کی امداد و سرپرستی کی وجہ سے ہر قسم کی سہولتیں حاصل ہیں اور اردو کے ذریعۂ تعلیم بنانے پر حکومت کو کوئی اعتراض نہیں ہے، اردو یونیورسٹی بنا دینا دشوار نہیں ہے، اگر یہ کام انجام پا جائے تو یہ جامعہ کے کارکنوں کا بہت بڑا کارنامہ ہوگا، اور ان کا نام اردو کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا، اور جس طرح آج جامعہ آزاد قومی تعلیم کی ایک اہم یادگار ہے، اسی طرح وہ اردو کی اعلیٰ تعلیم کی ایک زندہ یادگار بن جائے گی، اگر یہ موقع ہاتھ سے جاتا رہا تو پھر اردو یونیورسٹی کا قیام محال ہوگا، اس لیے ہم کو توقع ہے کہ ارباب جامعہ ہمارے ان معروضات پر سنجیدگی سے غور کریں گے اور یقین ہے کہ یہ مسئلہ خود ان کے سامنے بھی ہوگا،

حافظ ابوبکر عبداللہ بن زبیر کی المتوفی ۲۱۹ھ اپنے دور کے نامور حافظ حدیث، امام شافعی کے اصحاب خاص اور امام بخاری کے شیوخ میں تھے، انھوں نے ایک مسند مرتب کی تھی جو مسند حمیدی کے نام سے مشہور ہے، یہ مسند قدیم ترین کتب مسانید میں ہے، مگر اس قدامت اور اہمیت کے باوجود ابتک اسکی طباعت کی نوبت نہیں آئی تھی، اس کے قلمی نسخے بھی کمیاب تھے، اب فاضل محترم مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے اسکے کئی قدیم نسخے اور بعض اہم نسخوں کے فوٹو فراہم کر کے انکی مدد سے، مقابلہ، تصحیح، تحشیہ وغیرہ ترتیب و تہذیب کے جملہ لوازم کیساتھ اس کو مرتب کیا اور مجلس علمی ڈابھیل نے خوبصورت ٹائپ میں اس کا پہلا حصہ شائع کیا ہے، کتاب کے شروع میں فاضل مرتب کے قلم سے مسند حمیدی کے مختلف نسخوں کا ذکر، مصنف کے حالات اور کتاب کی ترتیب و تصحیح وغیرہ کی تفصیل ہے، حواشی میں مسند کی حدیثوں کی تخریج، اسکے مشکل الفاظ کی تشریح اور اختلاف نسخ کی وضاحت کی گئی ہے، مسانید کی مروجہ فہرست اسماء کے علاوہ فقہی ابواب پر بھی احادیث کی ایک فہرست بنادی گئی ہے، اسماء و اعلام کا بھی انڈکس ہے، غرض یہ کتاب "ایڈیٹ" کے جملہ لوازم و شرائط کے اعتبار سے مکمل اور "اپ ٹو ڈیٹ" ہے۔ یہ اس کتاب کا اجمالی تعارف ہے، فاضل مرتب کی تلاش و تحقیق اور محنت و دیدہ ریزی کا پورا اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی سے ہوسکتا ہے، وہ اس اہم علمی و دینی خدمت کے لیے اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں، ملنے کا پتہ: مجلس علمی سملک ڈابھیل، سورت۔

دوسری قابل ذکر کتاب حافظ ابوالولید عبداللہ بن محمد بن یوسف آزدی، المعروف بابن الفرضی، المتوفی ۴۰۳ھ کی "تاریخ العلماء والرواۃ بالاندلس" ہے، یہ اندلس کی علمی تاریخ پر بڑی اہم کتاب ہے، اس میں اندلس کے علماء و محدثین، شعراء و ادباء اور مختلف طبقوں کے اہل علم اور ارباب وجاہت کا تذکرہ ہے، اور اس ضمن میں اندلس کے متعلق بڑے مفید اور دلچسپ اور مختلف النوع معلومات آگئے ہیں، اس لحاظ سے اندلس کی تاریخ کا بڑا اہم ماخذ ہے، یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۸۹۰ء میں میڈرڈ (اندلس) میں چھپی تھی، مگر اب کمیاب بلکہ نایاب تھی، اس لیے سید عزت العطار الحسینی مدیر مکتبہ نشر الثقافۃ الاسلامیۃ قاہرہ نے دوبارہ شائع کیا ہے، کتاب دو ضخیم جلدوں میں ہے،

مقالات

کیا حسابِ تقویم کی رو سے سنہ ہجری کے دن اور تاریخ کا تعین ہو سکتا ہے؟

از جناب مولانا محمد عبد الرشید صاحب نعمانی

فرنگیوں کے دور اقتدار سے پہلے ہمارے یہاں سنہ ہجری نبوی کا عام رواج تھا، اور روزمرہ کی زندگی میں تمام چھوٹے بڑے واقعات کے سلسلہ میں ہم اسی سنہ کے ماہ و تاریخ کو استعمال کیا کرتے تھے، چنانچہ اسی دستور کے مطابق تمام مسلمان مورخین واقعہ نگاری کے سلسلہ میں ہر دن کی وہی تاریخ قلمبند کرتے تھے جو اس روز ان کے یہاں رویت ہلال کے شرعی ثبوت کی بنا پر ہوتی تھی، لیکن فرنگیوں کے عہد اقتدار میں ہمارے ملک میں سنہ عیسوی میلادی کا اتنا رواج ہوا کہ اس نے ہماری روزمرہ کی زندگی میں وہی جگہ لے لی جو اس سے پہلے ہمارے یہاں سنہ ہجری نبوی کی تھی، اور اسی انقلاب کا اب یہ اثر ہے کہ ہمارے مصنفین جب گذشتہ واقعات کی تاریخ لکھنے بیٹھتے ہیں تو پہلے دن اور تاریخ کا تعین سنہ مسیحی میلادی سے کرتے ہیں، پھر اگر ضرورت ہوتی ہے تو کسی تقویم کی مدد سے جو اسی کلیۂ حسابی پر مبنی ہوتی ہے، جو سنہ مسیحی میلادی کے اعتبار سے دن اور تاریخ کے استخراج کے لیے وضع کیا گیا ہے،

سنہ ہجری نبوی کے دن اور تاریخ کو مطابق کردیتے ہیں، اس طرز عمل سے بعض لوگوں کو یہاں تک غلط فہمی ہوگئی ہے کہ مسلمان مورخین نے واقعات کے سلسلہ میں جس دن اور تاریخ کا ذکر کیا ہے اگر وہ اس تقویم اور کلیۂ حساب کے مطابق نہ ہوں تو قطعاً غلط ہیں، اسی غلط فہمی میں انھوں نے بہت سے مسلّمہ تاریخی حقائق کا نہایت شد ومد سے انکار کیا ہے، جو سراسر ان کی نادانی اور علم تقویم سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔

ہر مسلمان جانتا ہے کہ "تاریخ ہجری" میں مہینوں کا شمار "رویت ہلال" سے ہوتا ہے، نہ کہ نجوم کے حساب وشمار سے، اس لیے تمام مسلمان مورخین واقعات کی تفصیلات بتاتے وقت اسی دن اور تاریخ کا ذکر کرتے ہیں جو رویت ہلال کے حساب سے اس وقت ان کے یہاں ہوتی ہے، اور اہل علم یہ بھی جانتے ہیں کہ اختلاف مطالع کے اعتبار سے چاند دیکھنے میں مختلف ملکوں کے اندر ایک دو دن کا فرق ہوجانا معمولی بات ہے، اس لیے ایک دو دن کے معمولی فرق کی بنا پر مورخین کی تکذیب کرنا دانشمندی نہیں ہے۔

رویت ہلال سے تعیین اوقات "رویت ہلال" سے تعیین اوقات کی تعلیم خود قرآن عظیم میں موجود ہے:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۗ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ

آپ سے لوگ نئے چاندوں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ وہ لوگوں کے لیے اور حج کے لیے مقررہ اوقات ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ دنیاوی معاملات یا شرعی حسابات سب میں دنوں، مہینوں اور سالوں کی تاریخوں کا حساب رویت ہلال سے ہوگا، ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی تفسیر بحر مواج میں آیت بالا کی تفسیر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:-

معنی آنست، بگو ماہہائے نو از بدائع مخلوقات است، مر مردمان را علامات اوقات است کہ بداں تقدیر مناسبہائے

معنی یہ ہیں کہ آپ فرمائیے، ماہہائے نو بدائع مخلوقات میں سے ہیں، یہ لوگوں کے لیے اوقات کی نشانیاں ہیں جن کے ذریعہ

طول دینا و مدت عمرہا و مدت زنان در
مدت حمل و اوضاع ایشان و ماہ رمضان
کہ ماہ صیام است و ماہ عید کہ از شعائر
اسلام است و اطلاق حول کہ شرط وجوب
زکوٰۃ است و مانند آں بدانند، و اقامت
وظائف دنیا و دین و معرفت شہور و سنین
بجا آوردن و محافظت کردن توانند

و علامت وقت حج و زیارت بیت حرام
کہ از معظمات ارکان اسلام است
دو ماہ شوال و ذی القعدہ و دہ روز
ذی الحجہ از غرۂ شوال یعنی از عید فطر
تا عید اضحیٰ، و درد سے اعمال حج از سنن
و واجبات و فرائض مودی شود[1]

قرضوں کی میعاد کے مناسب اندازے، عمروں
کی مدت، عورتوں کی عدت، ان کے خاص
حالات، حمل کی مدت، ماہ رمضان جو روزوں
کا مہینہ ہے، ماہ عید جو شعائر اسلام میں سے ہے،
سال کا اتمام جو زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے
مشروط ہے، اور اسی طرح دوسری چیزیں معلوم
کرتے ہیں اور دین و دنیا کے کاروبار، مہینوں
اور سالوں کا پہچاننا اور انکی نگہداشت کرنا
انہی کی بدولت ان کے لیے ممکن ہوتا ہے،

نیز یہ حج و زیارت بیت اللہ کے وقت
کی علامت ہیں، جو اسلام کے بڑے ارکان
میں سے ہے یعنی شوال اور ذیقعدہ کے
دو مہینے اور ذی الحجہ کے دس دن جو غرۂ شوال
یعنی عید فطر سے لیکر عید قرباں تک کا زمانہ ہے
اسی زمانہ میں حج کے اعمال اور اس کے سنن و
واجبات و فرائض ادا کیے جاتے ہیں۔

---

[1] تفسیر بحر مواج، ج ۱ ص ۳۰۹ طبع نولکشور ۱۲۹۵ھ، اس کتاب کے قلمی نسخے ہند و پاک کے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں، نہایت عمدہ تفسیر ہے، اور ہندستان کی علمی کارناموں میں ایک شاندار کارنامہ ہے، کاش کوئی علمی ادارہ اس اہم تفسیر کو شائع کرنے پر آمادہ ہو جاتا، طبع نولکشور میں اسکی صرف پہلی جلد چھپی ہے اور وہ بھی اغلاط سے مملو ہے، پوری کتاب چار ضخیم جلدوں میں ہے۔

اگرچہ مواقیت کے عموم میں حج بھی آجاتا ہے لیکن خاص طور پر اس کا دوبارہ اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عربوں نے حساب شمسی کے مطابق حج کرنا شروع کر دیا تھا، اور حساب شمسی سے مطابقت کی غرض سے نسئی (لوند) سے کام لیکر قمری مہینوں میں ادل بدل کر دیا کرتے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ حج کے بارہ میں بھی انھیں رویت ہلال سے حساب لگانے کا پابند بنا دیا، علماء نے تصریح کی ہے کہ رویت ہلال کا اہتمام و انضباط فرض کفایہ ہے، تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے اپنے تمام کاروبار میں ماہ و سال اور دن اور تاریخ کی تعیین کے لیے ہمیشہ "رویت ہلال" کا اعتبار کیا ہے، موجودہ زمانے میں ہمارے ملک میں سنہ عیسوی شمسی رائج ہے، یہ انگریزوں کے دور کی بری یادگار ہے، اور عام مسلمانوں کا بلا ضرورت سنہ ہجری قمری اسلامی کو چھوڑ کر سنہ شمسی مسیحی کو اختیار کر لینا بڑے افسوس کی بات ہے،

امت مسلمہ کے تمام فرقوں کا (باستثناء شیعہ اسماعیلیہ) اس امر پر اتفاق ہے کہ تمام احکام شرعیہ کا دارومدار "رویت ہلال" پر ہے، نہ کہ حرکت قمری کے حساب و شمار پر، علامہ مؤرخ مقریزی اپنی مشہور کتاب المواعظ والاعتبار فی ذکر الخطط والآثار میں لکھتے ہیں :-

وقد عرفت ان شهور تاريخ	اور تم جان چکے ہو کہ تاریخ ہجرت کے مہینے قمری
الهجرة قمرية وايام كل سنة	ہیں، اور اس کے ہر سال کے ایام کی تعداد
منه عدتها ثلاث مائة واربعة	تین سو چون (۳۵۴) دن اور ایک خمس (۱/۵) اور
وخمسون يوماً وخمس وسدس	ایک سدس (۱/۶) دن ہے، اور سارے
يوم وجميع الاحكام الشرعية	اسلامی فرقوں کے نزدیک تمام احکام شرعیہ
مبنية على رؤية الهلال عند	چاند دیکھنے ہی پر موقوف ہیں سوائے شیعہ
جميع فرق الاسلام ما عدا الشيعة	(باطنیہ) کے کہ ان کے یہاں احکام شرعیہ
فان الاحكام مبنية عندهم	کا دارومدار سال کے ۱۲

على كل شهور السنة بالحساب
على ما ستراه فى ذكر القاهرة
وخلفائها۔
ثم لما احتاج منجموا الاسلام
الى استخراج ما لابد منه من
معرفة الاهلة وسمت القبلة
وغير ذالك بنوا زياجهم على
التاريخ العربى، وجعلوا شهور
السنة العربية شهراً كاملا و
شهراً ناقصا وابتدؤا بالمحرم قدوةً
بالصحابة فجعلوا المحرم ثلاثين
يوماً وصفر تسعة وعشرين يوماً
وربيع الاول ثلاثين يوماً وربيع
الآخر تسعة وعشرين يوماً
وجمادى الاولى ثلاثين يوماً
وجمادى الآخرة تسعة وعشرين
يوماً ورجب ثلاثين يوماً، وشعبان
تسعة وعشرين يوماً، ورمضان
ثلاثين يوماً، وشوال تسعة و

مہینوں پر جو حساب سے بنتے ہیں جیسا کہ
قاہرہ اور وہاں کے خلفاء کے تذکرہ میں
تمکو معلوم ہوگا،
پھر جب منجمین اسلام کو ضروری چیزوں کے
دریافت کرنے کی حاجت پیش آئی، جیسے
ہلالوں کا معلوم کرنا یا سمت قبلہ وغیرہ کا
پتہ چلانا تو انھوں نے اپنی زیچوں (تقویموں)
کی بنا تاریخ عربی پر رکھی اور عربی سال کے
مہینے اس طرح قرار دیے، کہ ایک مہینہ کامل
(یعنی تیس دن) اور ایک مہینہ ناقص
(یعنی انتیس دن کا) اور سال کی ابتداء
صحابہ رضی اللہ عنہم، کی اقتداء میں محرم سے رکھی،
چنانچہ محرم کو تیس دن کا قرار دیا اور صفر کو انتیس
دن کا، اور ربیع الاول کو تیس دن کا اور ربیع الآخر
کو انتیس دن کا، اور جمادی الاولیٰ کو تیس دن کا
اور جمادی الآخر کو انتیس دن کا، اور رجب
کو تیس دن کا اور شعبان کو انتیس دن کا،
اور رمضان کو تیس دن کا اور شوال
کو انتیس دن کا، اور ذیقعدہ کو تیس دن کا

عشرین یوماً، وذا القعدة ثلاثین
یوماً، وذا الحجة تسعة وعشرین
یوماً، وزادوا من اجل کسر الیوم
الذی ھو خمس وسدس یوماً
فی ذی الحجة اذا سلو ھذا الکسر
اکثر من نصف یوم فیکون شھر
ذی الحجة فی تلک السنة ثلاثین
یوماً، ویسمون تلک السنة کبیسة
ویصیر عددھا ثلاث مائة و
خمسین، ویجتمع فی کل ثلاثین سنة
من الکبیس احد عشر یوماً،
واللہ تعالیٰ اعلم۔[1]

اور ذی الحجہ کو انتیس دن کا، اور ایک
دن کی اس کسر کی بنا پر جو ایک خمس (⅕)
اور ایک سدس (⅙) کی وجہ سے ہوتی
ہے، ذی الحجہ میں ایک دن کا اضافہ اس طریقہ
سے کرو کہ جب یہ کسر نصف دن سے زیادہ
ہو جائے تو اس سال کا ذی الحجہ تیس
دن کا ہوگا اور اس سال کو "سال کبیسہ" کہتے
ہیں، اور یہ سال تین سو پچپن دن کا
ہوتا ہے، اور ہر تیس سال میں کبیسہ
کے کل دن گیارہ ہوتے ہیں،
واللہ تعالیٰ اعلم۔

منجموں کے اصول پر تقویم سازی کا طریقہ اس تفصیل سے ناظرین کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ منجمین نے جس اصول پر اپنی تقویم کو مرتب کیا ہے وہ اور ہے اور مسلمانوں میں جس اصول پر مہینوں کا شمار ہے وہ اور ہے، اسلامی شریعت کے اعتبار سے سال کا ہر مہینہ ایک رویت ہلال سے شروع ہو کر دوسری رویت ہلال پر ختم ہو جاتا ہے لیکن منجموں کے یہاں قمر کے بارہ دوروں کی مجموعی مدت کو جو تین سو چون ۳۵۴ دن اور ایک خمس اور ایک سدس دن پر مشتمل ہے بارہ حصوں میں تقسیم کرکے ان کے بارہ مہینے بناتے ہیں، اور چونکہ اس مدت کی تقسیم بارہ مساوی حصوں پر بغیر کسر کے نہیں ہو سکتی اس لیے اس کسر کو دور کرنے کے لیے

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب مذکور عنوان "تاریخ العرب" ص ۳۰۵ و ۳۰۶

انہیں پورے تیس سال کا حساب لگانا پڑتا ہے، اور پھر تیس سال کے مجموعۂ ایام کو حسب قاعدہ سابقہ اس طرح تقسیم کرتے ہیں کہ پہلا مہینہ ہمیشہ تیس دن کا شمار کرتے ہیں اور دوسرا ہمیشہ انتیس دن کا، البتہ سال کبیسہ میں ذی الحجہ کو بھی تیس ہی دن کا مانتے ہیں اسکی تفصیل ابو ریحان بیرونی کے الفاظ میں حسب ذیل ہے، وہ لکھتے ہیں:-

واما تاریخ الهجرة فی الاسلام	اور اسلامی تاریخ ہجرت جب ہمیں مطلوب
فانا اذا اردنا ان نقسم ایامه	ہو تو اس تاریخ کے ایام محصلہ[1] کو قمر کے
المحصلة علی سنة القمر الوسطی	سنہ وسطی پر جو تین سو چون دن اور ایک
وهی ثلاثمائة واربعة وخمسون	خمس اور ایک سدس دن کا ہوتا ہے،
یوما وخمس وسدس بان نضربها	ہم تقسیم کردیں گے، اس طریقہ پر کہ پہلے انکو
فی ثلاثین، وهو اقل عدد له	تیس میں ضرب دیں گے، کیونکہ تیس ہی وہ سب سے
خمس وسدس ونقسم المجتمع	چھوٹا عدد ہے جس میں خمس بھی ہے اور سدس بھی،
علی عشرة آلاف وستمائة	اور پھر دس ہزار چھ سو اکتیس کے مجموعہ کو جو
واحد وثلاثین وهو مضروب	تین سو چون کو تیس میں ضرب دینے سے حاصل
ثلاثمائة واربعة وخمسین فی	ہوتا ہے، مع ان گیارہ دنوں کے جو خمس
ثلاثین مضافا الی ما اجتمع	اور سدس کا مجموعہ ہیں) تقسیم کردیں گے۔
احد عشر التی هی مجموع خمسها	اب جو خارج قسمت ہوگا وہ مکمل قمری
وسدسها فما خرج فسنون	سال ہوں گے، اور جو باقی بچے گا وہ
تامة قمریة وما بقی فایام	دن ہوں گے جو تیس میں ضرب دینے سے

---

[1] ایام محصلہ سے مراد آغاز تاریخ سے لیکر یوم مطلوب تک کے دنوں کی مجموعی تعداد ہے۔

مضروبة فی ثلاثین فاذا قسمناها
علی ثلاثین عاد القسم ایامًا
فناخذ منها الشهر ثلاثین یومًا
والشهر تسعة وعشرین ومبتدئًا من
المحرم، وما بقی لا یتم مثلها
فهو ما مضی من ذلك الشهر
وعلی هذا العمل فی استخراج التواریخ
فی الزیجات فان سلك فیه طرق
مختلفة فهی راجعة الی معنی واحد

فاما علی رؤیة الهلال فیمکن
ان یتوالی فیه شهران ناقصان
وثلاثة اشهر تامة ویمکن
ان تزید سنة القمر علی المقدار
المذکور وتنقص منه بسبب
اختلاف الحرکة (الآثار الباقیة
عن القرون الخالیة ص ۱۴۲)

حاصل ہوتے تھے، پھر جب ہم نے ان کو
تیس پر تقسیم کر دیا تو تقسیم سے دن بچ گئے
اب ایک ماہ کے لیے تیس دن لیں گے اور
دوسرے ماہ کے لیے انتیس، اور محرم
سے شروع کریں گے اور جو باقی پورا
مہینہ نہیں بنتا تو وہ اس مہینہ کا گذرا ہوا
حصہ ہے، زیجوں (تقویموں) میں تاریخوں
کے نکالنے کے لیے اسی قاعدہ پر عمل کیا جاتا ہے،
اور گو اس سلسلہ میں مختلف طریقے استعمال
میں لائے جائیں لیکن ان سب کا مرجع یہی ایک اصول ہے

لیکن رویت ہلال پر یہ ممکن ہے کہ دو مہینے
مسلسل انتیس انتیس دن کے ہوں اور
تین مہینے مسلسل تیس تیس دن کے، تو
بھی ممکن ہے کہ حرکت قمر کے اختلاف کے
باعث سال قمری مقدار مذکور
سے زائد یا کم ہو جائے۔

ابوریحان بیرونی علم ہیئت و ریاضی کا مسلمہ امام ہے، اس کی اس تصریح سے ثابت ہوتا ہے کہ تقویم کا یہ حساب نہ تو رویت ہلال کے حساب کے موافق ہے اور نہ قمر کی حقیقی حرکت کے مطابق ہے۔

بلکہ اس حساب میں تیس سال کے مجموعۂ ایام کو بغیر اس کے کہ ان میں رویت ہلال کا یا قمر کی حقیقی حرکت کا لحاظ رکھا جائے محض اپنی سہولت کے خاطر فرضی طور پر اس طرح تقسیم کر دیا گیا ہے کہ ہر طاق مہینہ ہمیشہ تیس کا مانا جائے گا، اور ہر جفت مہینہ ہمیشہ انتیس کا، بجز ذی الحجہ کے کہ وہ سال کبیسہ میں باوجود جفت ہونے کے تیس ہی کا شمار ہوگا، اس طرح ہر تیس سال میں انیس سال بسیط تین سو چون (۳۵۴) دن کے ہوں گے، اور گیارہ سال کبیسہ تین سو پچپن (۳۵۵) دن کے،

شریعت میں منجمین کے حساب کا کیوں اعتبار نہیں،

ابوریحان بیرونی کی اس تفصیل سے شریعت مطہرہ کی یہ حکمت بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس نے سال کے بارے میں منجمین واہل تقویم کے حساب کا کیوں اعتبار نہیں کیا، اور اس کی بجائے رویت ہلال کو مدار تاریخ ٹھہرایا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف لفظوں میں اعلان فرمایا کہ

جعل الله الاهلة موا	اللہ تعالیٰ نے ہلالوں کو لوگوں کے لیے
قيت للناس فصوموا	اوقات کی تعیین کا ذریعہ بنایا ہے، لہذا
لرؤيته وافطروا لرؤيته	چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر
فان غم عليكم فعدوا	افطار کرو، اور جب مطلع ابر آلود ہو تو
ثلاثين يوماً [1]	تیس دن شمار کرو،

[1] یہ حدیث مصنف عبدالرزاق میں اس اسناد کے ساتھ منقول ہے: عن عبدالعزیز بن ابی رواد عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۲۲۵) اور محدث حاکم نیشاپوری اپنی مشہور کتاب المستدرک علی الصحیحین میں اس کو نقل کر کے لکھتے ہیں "صحیح الاسناد" یہ بھی واضح رہے کہ حافظ ذہبی نے تلخیص المستدرک میں حاکم کی تصحیح کو بلا چون وچرا تسلیم کر لیا ہے، ملاحظہ ہو المستدرک اور اس کی تلخیص ج ۱ ص ۴۲۳ طبع دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام دین فطرت ہے، اس لیے وہ حقائق سے قطع نظر کر کے منجموں کے فرضی حساب کا کیوں پابند ہوتا، دین اسلام میں اوقاتِ عبادات کی بنا ان حقائق ثابتہ پر رکھی گئی ہے جن کے معلوم کرنے میں سب کے لیے سہولت ہو۔ اسلام کا قانون عدل ومساوات اس بات کا روادار نہیں کہ عبادت کی بجا آوری تو سب پر یکساں فرض ہو مگر ان کے اوقات کا معلوم کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہ ہو بلکہ خاص منجمین اور موقتین کا حصہ ہو، اسی حکمت کی بنا پر شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نے اوقاتِ نماز کا تعین آفتاب کی گردش سے متعلق کیا ہے، اور سال وماہ وروزہ کی تعیین رویت ہلال سے کی ہے، ورنہ اگر ہماری شریعت میں بھی دوسرے مذاہب کی طرح شمسی حساب کا اعتبار ہوتا یا قمری سال کی بناء رویت ہلال کی بجائے تقویم پر رکھی جاتی تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ ساری امت اپنے فرائض مذہبی کی بجا آوری میں منجمین وموقتین کی محتاج ہو کر رہ جاتی، جو حساب ان کو اوقات عبادات بتایا کرتے، اور عید بقر عید، روزہ اور حج وغیرہ کے ایام کا پہلے سے تعین کر دیا کرتے، اس طرح مذہبی ارکان کی ادائیگی کی اجارہ داری ایک خاص طبقہ کے ساتھ مخصوص ہو جاتی، اور اسلام میں برہمنیت اور پاپائیت کا ایک سلسلہ چل پڑتا، جیسا کہ دوسرے مذاہب میں ہے اور جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے،

تقویم کا حساب فرضی ہے ہم نے تقویم کے حساب کو جو فرضی کہا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ تمام اجرام سماوی میں چونکہ آفتاب و ماہتاب سب سے زیادہ نمایاں ہیں، اس لیے دنیا کی تمام قوموں نے ماہ وسال کا شمار ان ہی دونوں کی گردش پر اس طریقے سے رکھا کہ شمس کی نسبت سے قمر کے ایک دورہ ضعفی کو قمری ماہ مان لیا یعنی شمس کے ساتھ جو قمر کی ایک وضع معین اور صورت خاص ہو مثلاً اجتماع یا ہلال یا استقبال اس کو ماہ قمری کا مبدا اور دوبارہ اسی وضع معین اور صورت خاص پر قمر کے آجانے کو اس کا منتہا اور ان دونوں اجتماعوں یا دونوں ہلالوں یا دونوں استقبالوں کے درمیانی زمانہ کو ماہ قمری سے موسوم کیا، جس طرح ہماری شریعت میں ایک ہلال سے ماہ کا آغاز قرار دیا گیا اور دوسرے

ہلال پر اس کا اختتام اور ان دونوں ہلالوں کی درمیانی مدت کو خواہ وہ تیس دن میں تمام ہو یا انتیس دن میں ایک ماہ شمار کیا ہے، پھر اسی طرح بارہ قمری مہینوں کو ایک سال کہنے لگے۔ اور شمس کی ایک گردش یعنی منطقۃ البروج کے ایک نقطۂ معینہ مثلاً اول برج حمل سے جدا ہو کر دوبارہ اسی نقطہ پر آفتاب کے آجانے کو سال شمسی قرار دیا، اور چونکہ آفتاب کی گردش بارہ برجوں پر منقسم ہے، اس لیے ہر برج کے طے کرنے میں آفتاب کو جو عرصہ لگتا ہے اس کو ماہ شمسی بنایا، پھر منجموں نے تقویم بنانے کے لیے اپنی سہولت کی خاطر ہر ماہ و سال کی خواہ وہ قمری ہوں یا شمسی، دو قسمیں قرار دیں، ایک حقیقی دوسری اصطلاحی جس کو وسطی بھی کہا جاتا ہے، حقیقی وہ ہے جس میں شمس و قمر کی گردش کا پوری طرح لحاظ ہو، اور ان کی وضع خاص اور برج کی تقسیم اور حرکت کے اعتبار سے مدت کی تعیین ہو، مثلاً ماہ حقیقی قمری وہ ہے جس میں دونوں ہلالوں کے درمیانی زمانہ میں ایک ساعت یا ایک دقیقہ کی بھی کمی بیشی نہ ہو، جس طرح ہماری شریعت میں ماہ کا شمار ہوتا ہے، اور سال حقیقی قمری وہ ہے جو بارہ ماہائے حقیقی قمری سے ذرا کم و بیش نہ ہو، جیسا کہ ہماری شریعت میں ہے، اسی طرح ماہ حقیقی شمسی وہ ہے جس کا زمانہ آفتاب کے ایک برج معین میں رہنے کے بالکل برابر ہو، اور سال شمسی حقیقی وہ مدت ہے جو آفتاب کے ایک مکمل دورہ کے عین مطابق ہو، اور ماہ اصطلاحی وہ ہے جس میں شمس و قمر کی گردش حقیقی کا محاظ نہ ہو بلکہ ہر مہینہ کے لیے ایام معینہ کی ایک تعداد مقرر کر دی جائے، مثلاً کسی مہینہ کو انتیس کا اور کسی کو تیس کا اور کسی کو اکتیس کا مقرر کر دیا جائے، ظاہر ہے کہ مہینہ کی یہ تعداد کبھی ماہ حقیقی سے زیادہ ہوگی اور کبھی کم، اور جو سال ان بارہ اصطلاحی مہینوں سے مرکب ہو وہ سال اصطلاحی کہلاتا ہے[1]

اس تفصیل کے بعد اب آپ ابوالفضل کا یہ بیان پڑھیے :-

و اہل حساب رویت را نظر انداختہ ماہ قمری	اور اہل حساب نے رویت کو نظر انداز کرکے ماہ قمری
را بر دو گونہ ساختہ اند، حقیقی و آں از ہنگام	کی دو قسمیں کی ہیں، ایک حقیقی جو چاند کے آفتاب

---

[1] اس تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو زیچ بہادر خانی مولفہ مولوی غلام حسین جونپوری ص ۲۶ ، طبع بنارس ۱۲۵۷ھ

دوری ماه از وضع معین با آفتاب چون اجتماع
یا استقبال یا جز آن تا باز بدان رسد
و اصطلاحی چون حرکات قمر مختلف باشد
ضبط آن دشوار و همچنان شکلها، پس
بحرکت وسطی قرار دادند و لختے کار آسان
شد[1]

سے ایک وضع معین جیسے (ایک برج میں دونوں کا
اجتماع یا بالکل مقابل برجوں میں دونوں کے
آمنے سامنے ہونے یا کسی اور وضع معین سے
دور ہو کر پھر اسی وضع معین پر آجانے کا نام ہے
دوسرے اصطلاحی چونکہ چاند کی گردش مختلف
ہوا کرتی ہے اور اسکا پوری طرح حساب کرنا
اور اس کی شکلوں کو محفوظ رکھنا دشوار ہے
اس لیے حرکت وسطی سے اس کا حساب لگا کر
کچھ کام آسان ہو گیا،

اس کے بعد ابوالفضل نے زیچ بنانے کا وہی قاعدہ بتایا ہے جو مقریزی اور بیرونی کے بیانات میں ابھی آپ کی نظر سے گذرا،

اب ظاہر ہے کہ اہل حساب نے جب اپنی تقویموں میں رویت کو نظر انداز کیا اور ماہ و سال حقیقی کو سرے سے چھوڑ دیا اور شمس و قمر کی گردش کا خیال نہ کیا تو ان کا حساب فرضی نہ ہوا تو کیا ہوا، در باب تقویم کے اس حساب کی حقیقت بس اتنی ہے کہ تیس سال میں قمر کے تیس دورے پورے ہو جاتے ہیں، اور ان تیس سالوں میں انیس سال تین سو چون (۳۵۴) دن کے ہوتے ہیں اور گیارہ سال تین سو پچپن (۳۵۵) دن کے، لیکن ان میں کونسا قمری سال ۳۵۴ دن کا ہوگا، اور کونسا ۳۵۵ دن، اسکی تعیین ان کے بس کی بات نہیں، اور یہ جو زیچ نگار دن نے ان گیارہ سالوں کی اس طرح تعیین کی ہے کہ:-

---

[1] آئین اکبری ص ۳۰۲ طبع دہلی ۱۲۷۲ھ بہ تصحیح سر سید احمد خان،

" دو رہبری سال یا ذو بادذی الحجہ راسی روز گیرند واین سال لہاما سال کبیسہ نامند

واین سالہا ۲ و ۵ و ۷ و ۱۰ و ۱۳ و ۱۵ و ۱۸ و ۲۱ و ۲۴ و ۲۶ و ۲۹ است "[1]

وہ محض فرضی ہے کوئی ضروری نہیں کہ ان ہی سالوں کے ایام ۳۵۵ دن کے ہوں جیسا کہ ذی الحجہ کا ان سالوں میں تیس دن کا ہونا قطعاً ضروری نہیں، بہت ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی سال ۳۵۴ دن کا ہو اور بقیہ انتیس میں سے کوئی ۳۵۵ کا جس طرح کہ تقویم میں جن مہینوں کو تیس دن کا بتایا ہے، ان کا تیس ہی دن کا ہونا یا جن کو انتیس دن کا بتایا ہے، ان کا انتیس ہی دن کا ہونا ضروری نہیں ہے، اسی لیے امام فن بیرونی نے تقویم سازی کا اصول بتاتے ہوئے آخر میں تصریح کر دی ہے کہ

رویت ہلال کے اعتبار سے ممکن ہے دو ماہ مسلسل انتیس انتیس دن کے ہوں یا تین ماہ مسلسل تیس تیس دن کے اور بالکل ممکن ہے کہ حرکت قمر کے اختلاف کے باعث سال قمری مقدار مذکور سے (جو تقویم میں قرار دی گئی ہے) زائد یا کم ہو جائے "

تقویم کا حساب حقیقی جب ہوتا جبکہ چاند کی حقیقی حرکت کا انضباط منجمین کے لیے آسان ہوتا، حالانکہ ابو الفضل کا یہ اعتراف ابھی آپ کی نظر سے گذرا کہ

" حرکات قمری مختلف باشد ضبط آن دشوار، و مجہان مشکلہا "[2]

ابو الفضل کے اعتراف عجز کی وجہ بیرونی سے سنئے جو اپنی مشہور کتاب الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ میں شیعہ اسماعیلیہ کے حساب تقویمی کا محاسبہ کرتے ہوئے اس طرح رقمطراز ہے

ویبتدئون بالشھور من عند رؤیۃ الھلال وکذلک شرع	اور عرب مہینے کی ابتدا رویت ہلال سے کرتے ہیں اور اسی طرح اسلام میں مشروع

[1] تاریخ بہادر خانی ص ۵۰ [2] آئین اکبری ص ۲۰۰،

في الاسلام كما قال الله تعالى
يسئلونك عن الاهلة قل
هي مواقيت للناس والحج

چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے "لوگ آپ
سے چاند کے بارے میں دریافت کرتے ہیں
آپ فرما دیجئے کہ یہ لوگوں کے لیے اور حج
کے لیے اوقات مقررہ ہیں"

ثم منذ سنين نبتت نابتة
ونجمت ناجمة ونبغت فرقة
جاهلية فنظروا الى اخذهم
بالتاويل وولوعهم بسبب
الآخذين بالظاهر بزعمهم
الى اليهود والنصارى فاذالهم
جداول وحسابات يستخرجون
بها شهورهم ويعرفون منها
صيامهم والمسلمون مضطرون
الى رؤية الهلال وتفقد ما
اكتساه القمر من النور واشترك
بين نصفه المرئي ونصفه
المستور ووجدوهم شاكين
في ذلك مختلفين فيه مقلدين
بعضهم بعضا بعد استفراغهم

پھر چند سال سے ایک نئی پود نکل آئی ہے،
اور ایک نمایاں جماعت نمودار ہوئی ہے
اور ایک جاہلی فرقہ ابھرا جو اپنے خیال میں
ظاہر پر عمل کرنے والوں کے سبب تاویل کو
اختیار کرتے ہیں اور اس پر فریفتہ ہیں،
ان لوگوں نے یہود و نصاری کو دیکھا کہ ان کے
پاس تو گوشوارے اور حسابات موجود ہیں
جن کے ذریعہ وہ اپنے مہینوں کو نکالتے
ہیں، اپنے روزوں کو معلوم کرتے ہیں اور مسلمان
رویت ہلال پر مجبور ہیں اور چاند میں روشنی
آجانے کی تلاش میں رہتے ہیں کہ قمر کے نصف
مرئی اور نصف مستور میں کس قدر اشتراک
نور ہوا ہے، اور پھر باوجود اس کے کہ وہ
اپنی پوری کوشش چاند کے مقامات پر
غور کرنے کے اور اس کے مغارب دیکھ لیتے

اقصى الوسع فى تأمل مواضعه
وتفحص مغاربه ومواقعه ثم
رجعوا الى اصحاب علم الهيئة
فالفوا زيجاتهم وكتبهم
مفتتحة بمعرفة اوائل ما يراد
من شهور العرب بضروب
الحسابات وانواع الجداول
فظنوا انها معمولة لرؤية
الاهلة واخذوا بعضها
ونسبوه الى جعفر الصادق
عليه السلام وزعموا انه
سر من اسرار النبوة ،
وتلك الحسابات مبنية
على حركات الوسطى دون المرئية
اعنى المعدلة ومعمولة على
ان سنة القمر ثلاثمائة و
اربعة وخمسون يوما وسدس
(كذا) وان ستة اشهر
من السنة تامة وستة ناقصة

کے ڈھونڈنے میں صرف کر دیتے ہیں، پھر بھی
ان میں شک اور اختلاف رہتا ہے اور اسی میں
وہ ایک دوسرے کی تقلید کرتے ہیں، اس لیے
انھوں نے اصحاب علم ہیئت کی طرف رجوع
کیا، جنھوں نے اپنی زیچوں اور کتابوں کو
طرح طرح کے حسابات اور مختلف گوشواروں
کے ساتھ اس طرح مرتب کیا تھا کہ ان کے
آغاز ہی میں عربی مہینوں کے اوائل کی
معرفت کا بیان ہے، اس لیے انھوں نے
یہ سمجھا کہ یہ زیچیں رویت ہلال کے لیے بنائی
گئی ہیں، چنانچہ انھوں نے اُن میں سے
بعض حسابات اور گوشواروں کو لیکر حضرت
جعفر صادق علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا
اور یہ خیال قائم کیا کہ یہ بھی اسرار نبوت میں سے
ایک راز ہے، حالانکہ یہ سب حسابات شمس و قمر
کی حرکات وسطی (یعنی حرکات اصطلاحی غیر حقیقی)
پر مبنی ہیں، نہ کہ حرکات مرئیہ پر جو حقیقی ہیں، نیز یہ
زیچیں اسی اصول پر بنائی گئی ہیں کہ سال قمری
تین سو چوّن ۳۵۴ دن اور ایک خمس اور سدس دن کا ہوتا ہے،

وان کل ناقص منها فهو تال تام
علی ما عمل علیه فی الزیجات،
وذکر فی الکتب المنسوبة
الی عللها

فلما قصدوا استخراج اول الصوم
واول الفطر بها خرجت قبل
الواجب بیوم فی اغلب الاحوال
.... قالوا ان شهر رمضان
لا ینقص من ثلاثین
فاما اصحاب الهیئة ومن تامل
الحال بعنایة شدیدة فانهم
یعلمون ان رؤیة الهلال
غیر مطرد علی سنن واحد
لاختلاف حرکة القمر المرئیة
بطیئة مرة وسریعة اخری
وقربه من الارض وبعده
وصعوده فی الشمال والجنوب

اور سال کے چھ مہینے کامل تیس دن کے
اور چھ مہینے ناقص (یعنی ۲۹ دن کے) ہوتے ہیں
اور ہر ناقص مہینہ کامل کے معاً بعد ہوتا ہے جیسا کہ
زیجوں میں معمول ہے، اور ان کتابوں میں
مذکور ہے جو علل زیج کی طرف منسوب ہیں (یعنی جن
زیج تیار کرنے کے وجوہ بیان ہوتے ہیں)،
پھر جب ان لوگوں نے اول رمضان یا عید
کو معلوم کرنا چاہا تو اکثر حالات میں اس کے
واجب ہونے سے ایک دن پہلے کا دن
نکلا تو انھوں نے کہہ دیا کہ ماہ رمضان
تیس دن سے کم کا نہیں ہوتا،
لیکن اصحاب ہیئت اور جن لوگوں نے
پوری توجہ کے ساتھ اس مسئلہ پر غور کیا ہو وہ
جانتے ہیں کہ رؤیت ہلال ہمیشہ ایک طریقہ پر ممکن
نہیں، کیونکہ قمر کی حرکت مرئیہ کبھی آہستہ
ہوتی ہے اور کبھی تیز اور کبھی وہ زمین سے
قریب ہوتا ہے اور کبھی دور اور کبھی
وہ شمال و جنوب میں حالت صعود میں
ہوتا ہے اور کبھی حالت ہبوط میں

وجود طه فيها وحدوث كل واحد
من هذه الاحوال لسائر كل نقطة
من فلك البروج ثم بعد ذلك
لما يعرض من سرعة غروب
القطع من فلك البروج وبطء
بعض وتغير هذه على اختلاف
عروض البلدان واختلاف
الاهوية اما بالاضافة الى
البلاد الصافية الهواء بالطبع
والكدورة المختلطة بالبخارات
دائما والمغبرة في الاغلب واما
بالاضافة الى الازمنة اذا
غلظ في بعضها ورق في بعض و
تفاوت قوى بصر الناظرين اليه
في الحدة والكلال وان ذلك
كله على اختلافه يجمعونه
الاقترانات كانت كل اول
شهر من رمضان وشوال على
اشكال غير محدودة واحوال

اور یہ سب حالات فلک البروج کے ایک ایک
نقطہ پر اس میں پیدا ہوتے رہتے ہیں اور مستزاد
یہ ہے کہ فلک البروج کے بعض قطعے جلدی
غروب ہو جاتے ہیں اور بعض دیر میں اور
عرض البلد کے اعتبار سے بھی اس میں تغیر
ہوتا رہتا ہے اور ہواؤں کے اختلاف سے بھی
کیونکہ بعض ملکوں کی ہوا طبعی طور پر
صاف ہوتی ہے، اور بعض میں ہمیشہ بخارات
کے اختلاط کی وجہ سے کدورت رہتی ہے۔
اور بعض کی فضا اکثر غبار آلود رہتی ہے، نیز
موسم کے لحاظ سے بھی ہواؤں میں اختلاف
ہوتا ہے کسی موسم میں اس میں کثافت آجاتی
ہے کسی موسم میں رقت رہتی ہے، نیز دیکھنے والوں
کی نگاہ میں بھی تیزی اور درماندگی کے لحاظ
سے تفاوت ہوتا ہے۔ اور قمر کے یہ سب مختلف
احوال اور طرح طرح کے تغیرات ہر ماہ
رمضان و شوال کی ابتدا میں بے شمار اشکال
اور غیر محدود احوال پر ہوتے رہتے ہیں،
یہی وجہ ہے کہ کبھی ماہ رمضان انتیس دن کا

غیر محدودة فیکون لذلک شهر
رمضان ناقصا مرة وتاما اخرى
وان ذلک کله ما یتغایر بتغایر
عروض البلدان فیکون تاما فی
الشهر تاما فی البلدان الشمالیة
مثلا ودونا ناقصا هو بعینه فی الجنوبیة
منها وبالعکس ثم لا یجری ذلک
فیها علی نظم واحد بل یتفق فیها
ایضا حالة واحدة بعینها الشهر
واحد مرارا متوالیة وغیر
متوالیة

فلو صح عملهم مثلا بتلک الجداول
والحسبانات واتفق مع رؤیة
الهلال او تقدمه یوما واحدا
کما اصلوا لاحتاجوا الی افرادها
لکل عرض علی ان اختلاف الرؤیة
لیس متولدا من جهة العرض
فقط لکن لاختلاف احوال البلدان
فیها او فو نصیب لانه ربما الرین

ہوتا ہے اور کبھی تیس دن کا، اور یہ سب
حالات عرض البلد کے گھٹنے بڑھنے کے
اعتبار سے مختلف ہوتے رہتے ہیں، چنانچہ
کبھی شمالی ملکوں میں ایک مہینہ تیس دن
کا ہوتا ہے، اور وہی مہینہ جنوبی ممالک میں
انتیس کا، اور کبھی اس کے بالکل برعکس،
پھر یہ بھی ہمیشہ ایک نظم پر نہیں چلتا،
بلکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک
مخصوص مہینہ بارہا مسلسل یا غیر مسلسل
ایک ہی حالت پر چلتا رہتا ہے،

اگر ان گوشواروں اور حسابات کے لحاظ
سے ان کا عمل صحیح بھی ہوا اور وہ رویت
ہلال سے متفق ہو جائے یا ان کے اصول پر
ایک دن پہلے بنے تب بھی ان کے لیے ضروری
ہے کہ ہر عرض البلد کے لیے ایک علیحدہ
نقشہ بنائیں، اگرچہ رویت ہلال میں اختلاف
محض عرض البلد ہی کی بنا پر نہیں ہوتا
بلکہ طول البلد کو بھی اس اختلاف میں

فی بعض البلاد و ترى فی مکان
اقرب منه الى المغرب و ربما
اتفق ذلك فيهما جميعا و ذلك
مما يحوج ايضا الى افراد الحساب
والجداول لكل واحد من اجزاء
الطول فاذن لا يمكن ما ذكروه
من تمام شهر رمضان ابدا
و وقوع اوله و آخره فی جميع
المعمور من الارض متفقا
كما يخرجه الجدول الذی
يستعملونه (ص ۶۴ تا ۶۶ طبع لیپزگ ۱۹۲۳ء)

بہت بڑا دخل ہے، کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا
ہے کہ بعض ملک میں چاند نظر نہیں آتا اور جو ملک
اس سے مغرب میں قریب ہوتے ہیں وہاں نظر
آجاتا ہے اور کبھی دونوں جگہ دیکھنے کا اتفاق
ہوتا ہے، اس بنا پر ان کے لیے یہ بھی ضروری
ہے کہ طول البلد کے ہر جزء کے لیے مستقل حسابات
اور نقشے تیار کریں، غرض ایسی صورت میں
ان لوگوں کا دعویٰ کہ رمضان کا مہینہ ہمیشہ
تیس ہی دن کا ہوتا ہے اور تمام معمورۂ ارض میں
اس کا اول و آخر ہمیشہ یکساں ہی ہوتا ہے
جیسا کہ انکا گوشوارہ بتاتا ہے، صحیح نہیں ہے،

آگے چل کر اسی کتاب میں جہاں ہجری قمری مہینوں کے اوائل کو معلوم کرنے کا قاعدہ بیان کیا ہے، یہ بھی لکھا ہے کہ

فاما رؤية الهلال ففی تحقيقه من الطول
والصعوبة ما يحتاج معه الى اعمال
صعبة وجداول كثيرة و يكتفى منه
بما فی زیج محمد بن جابر البتانی
و زیج حبش الحاسب فليقصدهما
ان احتاج اليهما (ص ۱۹۲)

لیکن (ریاضی کے اصول پر) رؤیت ہلال کی تحقیق میں
بڑی طوالت اور دشواری ہے، اس کے لیے سخت اعمال
اور بہت سے گوشواروں کی ضرورت ہے، اس لیے جو کچھ
محمد بن جابر بتانی اور حبش حاسب کی زیچ میں
ہے اس پر اکتفا کیا جائے اور ضرورت کے وقت
اس کی طرف رجوع کیا جائے،

(باقی)

اسلامی ہند کے نصف اوّل میں علوم عقلیہ کا رواج

از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے

(۲)

ہند و ایران کے روابط علمیہ ہندوستان اور ایران کے ثقافتی روابط بہت قدیم ہیں، بعثت اسلام سے قبل بھی ان کی تفصیل ملتی ہے، مثلاً حکیم برزویہ سنسکرت ادب و اخلاق کی کتاب کلیلہ و دمنہ (کرٹک دمنک) کے لیے ہندوستان آیا تھا، اس سے پہلے اردشیر اور شاپور کے زمانہ میں طب، فلسفہ وغیرہ کی کتابیں سنسکرت سے پہلوی میں ترجمہ ہوئیں، دوسری طرف یونانی ریاضی و ہیئت پہلے ایران اور باختر پہنچی، چنانچہ اولیری "یونانی علوم کی عربوں میں منتقلی" میں لکھتا ہے:

("مرو، باختر اور صغد یونانی ثقافت کے مرکز بن گئے تھے۔" (کتاب مذکور صفحہ ۱۱)

اور وہاں سے ہندوستان جہاں اس نے مقامی نجوم و ہیئت کو متاثر کیا، اولیری اسی کتاب میں (ص ۱۰۴) لکھتا ہے:-

"گپتا خاندان کے عہد میں شہر پاٹلی پتر علمی مطالعہ کا مرکز بن گیا تھا، بالخصوص ہیئت و ریاضیات کا، ان دونوں پر قطعی طور پر اسی قسم کا یونانی اثر نمایاں ہے، جو اسکندریہ کے معاصر مدارس میں رائج تھا۔"

مگر بعثت اسلام سے پہلے کے ہندی ایرانی روابط علمیہ موضوع زیر بحث سے باہر ہیں، عہد اسلام میں بھی یہ دوطرفہ روابط قائم رہے۔

۱۔ ۱۵۶ھ میں سندھ کا ایک علمی وفد "برہم سدھانت" کا نسخہ لیکر بغداد پہنچا، جہاں منصور عباسی کے ایما سے محمد بن ابراہیم الفزاری اور یعقوب بن طارق نے اسے عربی میں منتقل کیا، یہ ترجمہ عرصے تک "السندھند الکبیر" کے نام سے مسلمان ہیئت دانوں میں مشہور رہا، بعد میں اسی کی بنیاد پر محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے اپنی زیچ مرتب کی جو "اسلامی ہیئت" کا سنگ بنیاد سمجھی جاسکتی ہے، ہیئت کے علاوہ ہندوستان کا مخصوص علم الحساب بھی عربوں میں پہنچا اور عرصہ تک "الحساب الہندی" کے نام سے مسلمان ریاضی دانوں کی تصنیفی کوششوں کا موضوع بنا رہا، ہندوستان ہی سے وہ مخصوص ترقیم اعداد کا طریقہ مسلمانوں تک پہنچا، جسے وہ الارقام الہندیہ" مگر یورپ والے Arabic Numerale کہتے ہیں، حساب و ہیئت کے علاوہ ہندو طب کی بہت سی کتابیں بھی برامکہ کے زیر سرپرستی عربی میں ترجمہ ہوئیں، ابن الندیم نے کتاب الفہرست میں ان کی ایک مبسوط فہرست دی ہے، ان تراجم سے عرب اطباء نے بہت کچھ استفادہ کیا، چنانچہ قدیم ترین ایرانی طبیب علی بن ابن الطبری اپنی کتاب "فردوس الحکمۃ" میں جس طرح یونانی اطبا کے حوالے دیتا ہے، اسی طرح ہندوستانی اطباء سشرد اور ندان وغیرہ کے بھی حوالے دیتا ہے، ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے کہ ابوبکر بن زکریا الرازی نے اپنی تصانیف، بالخصوص کتاب الحاوی" میں جابجا چرک اور دوسرے ہندو اطبا کے حوالے دیے ہیں،

اسی کے ساتھ بہت سے ہندی و سندی فضلاء نے عراق و ایران جاکر علوم دینیہ اور شعر و شاعری میں درجۂ امامت حاصل کیا، امام اوزاعی کے متعلق ایک رائے یہ ہے کہ وہ سندی الاصل تھے، اسی طرح عمرو بن عبید جو معتزلی علم کلام کے بانی واصل بن عطاء کا دست راست تھا، بقول مسعودی سندی الاصل تھا، ابوعطا بن یسار جس کے کلام کا اقتباس ابوتمام نے حماسہ میں دیا ہے، سندی تھا،

ب۔ دوسری طرف عرب اور بغداد کے علماء و فضلاء سندھ اور ملتان اور بعد میں ہندوستان کے دوسرے حصوں میں جاکر یہاں کی علمی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے۔ ان میں قدیم ترین نام جس کو تاریخ نے محفوظ رکھا ہے، قاضی موسیٰ بن یعقوب الثقفی کا ہے جنھیں محمد بن قاسم اپنے ہمراہ لایا تھا، اور فتح سندھ (۹۳ھ) کے بعد یہاں کا قاضی القضاۃ مقرر کیا، بعد کے لوگوں میں قاضی ابن ابی الشوارب اور شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے مورث اعلیٰ خاص طور سے قابل ذکر ہیں، ان کے اخلاف مغربی ہندوستان کے علمی خاندانوں میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے، پانچویں صدی کے آغاز میں ابوریحان البیرونی ہندوستان آیا، اس نے یہاں آکر ہندو فلسفہ و ہیئت ہی نہیں سیکھا، بلکہ ہندوؤں کو بھی مسلم ریاضی و ہیئت سکھائی،

اس کے بعد تو یہ دو طرفہ علمی روابط اور بھی مستحکم ہو گئے، بالخصوص ملوک سلاطین کے تخت دہلی پر متمکن ہو جانے کے بعد، اس کی تفصیل آگے آرہی ہے، بہرحال یہ ایک عام تاریخی واقعہ رہا ہے کہ ہر وہ ثقافتی تحریک جو ایران میں ظہور پذیر ہوئی، ہندوستان پر بھی اثر انداز ہوئی، مگر یہاں صرف ہند و ایران کے علمی روابط کے ان اہم اوقات کی مختصر طور پر نشاندہی کرنا مقصود ہے جنھوں نے یہاں کے علمی حلقوں میں منطق و حکمت کی تعلیم کو خصوصیت سے متاثر کیا۔

تیسری صدی تک ہندوستان میں فلسفہ و معقولات کی تعلیم کی تفصیلات ہنوز دستیاب نہیں ہوسکی ہیں، خود عراق و ایران میں یہ فنون عام طور پر مروج نہ تھے، صرف حدیث و فقہ کا چرچا تھا، اور ہندوستان (سندھ و ملتان) کے اکثر لوگ حدیث ہی کے تعلم و تعلیم میں نظر آتے ہیں،

عراق پر علوم تسمیہ کی ترقی خاص طور سے تیسری صدی کے آغاز سے شروع ہوتی ہے، یہ مامون الرشید کی عقلیت پرستی اور "علوم الاوائل" (یونانی حکمت) کے ساتھ غیر معمولی شغف کا نتیجہ تھا، اس کے بعد بھی لوگوں کا اعتناء علوم عقلیہ کے ساتھ برقرار رہا، تاآنکہ متوکل باللہ کے زمانہ میں مدرسہ فلسفہ جو حضرت عمر بن عبد العزیز کے عہد خلافت میں اسکندریہ سے انطاکیہ میں منتقل ہو آیا تھا، حران پہنچا،

بعد میں جب اضمحلال خلافت سے فکری بے راہ روی بڑھنے لگی تو کھلے بندوں عقلی علوم بغداد میں داخل ہو گئے، یہ معتضد باللہ (۹۰۲ء۔۲۸۹ھ) کا زمانہ تھا، اور اگلی صدی سے فلسفہ و معقولات دیگر اسلامی ممالک بالخصوص ہندوستان تک پہنچنے لگے اسکی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

۱۔ تیسری صدی کے سرے پر باطنی (اسماعیلی یا قرمطی) تحریک ظہور میں آئی، اس سے فلسفہ و دیگر علوم عقلیہ کی اشاعت کو غیر معمولی مدد ملی، اس تحریک کا مقصد اسلام اور عرب حکومت کی بیخ کنی اور مجوسیت اور ایرانی سلطنت کا احیا تھا، اس حیثیت سے یہ ایک انقلابی و سیاسی تحریک تھی، مگر اس نے خود کو مستحکم اور پائدار بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے اپنی آئیڈیالوجی فلسفہ پر قائم کی، چنانچہ شہرستانی نے قدماء باطنیہ کے بارے میں لکھا ہے:۔

ثم ان الباطنية القديمة قد	پھر قدیم باطنیوں نے اپنے کلام کو فلاسفہ
خلطوا كلامهم ببعض كلام	کے بعض کلام سے مخلوط کر دیا، اور اپنی
الفلاسفة وصنفوا كتبهم	کتابیں اسی طرز پر تصنیف کیں،
على ذالك المنهاج	

اور وہ فلسفیوں کو بڑی آؤ بھگت کے ساتھ اپنی تحریک میں شامل کرتے تھے، چنانچہ عبد اللہ بن الحسن القیروانی نے ابو سلیمان الجنابی کو جو رسالہ بھیجا تھا، اس میں لکھا تھا،

واذا ظفرت بالفلسفی فاحتفظ	جب تم کو کوئی فلسفی مل جائے تو اس کو اپنے
به فعلى الفلاسفة معولنا وانا	قبضہ میں لے لو کیونکہ فلاسفہ پر ہمارا اعتماد ہے
واياهم مجمعون على القول بقدم	ہم اور وہ قدم عالم کے عقیدے پر
العالم	متفق ہیں،

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ اپنے دعاۃ کو فلسفہ اور دیگر علوم عقلیہ بالخصوص ریاضیات کی خاص طور سے تعلیم

دیتے تھے، ابو عبداللہ بن رزام سے جو اس تحریک کا قدیم ترین مورخ ہے، ابن ندیم نقل کرتا ہے:

ومن شان دعاتھم ان یتنقلوا		ان داعیوں کا یہ طریقہ تھا کہ وہ روئے زمین
فی الارض ..... وان یتحلی بطلب	ترجمہ	کی سیاحت کرتے تھے، اور نجوم، ہیئت
من الهندسة دسعان من تعاولیل		ہندسہ اور فلسفہ سے واقفیت رکھتے تھے

چنانچہ اس تحریک کے اولین بانی خود فلسفہ اور نجوم کے ماہر تھے، ابوالفضائل ہمدانی نے بانی باطنیت عبداللہ بن میمون القداح کے بارے میں لکھا ہے:-

وکان الملعون عارفاً بالنجوم		یہ ملعون فلسفہ کا ماہر تھا، اور ان احبار
وکان من احبار الیهود داهل	ترجمہ	یہود اور فلاسفہ میں تھا جو فلسفہ کے
الفلاسفة الذین عرفوا جمیع		تمام مذاہب سے واقفیت رکھتے تھے۔

اسی طرح محمد بن الحسین زیدان کے بارے میں ابن ندیم لکھتا ہے:-

وکان هذا الرجل متفلسفاً حاذقاً بعلم النجوم	یہ شخص فلسفی اور علم نجوم میں ماہر تھا۔

ابوالفضائل نے حمدان قرمط کو بھی نجوم کا ماہر اور ابوسعید الجنابی کو فیلسوف بتلایا ہے، بہرحال باطنیوں نے اپنی تحریک کو فلسفہ پر استوار کیا اور ان کے دعاۃ اپنے متبعین کو دعوت کے آخری منازل میں یونانی فلسفہ سے آشنا بنانے کی خصوصیت سے تعلیم دیتے تھے، چنانچہ مقریزی نے باطنی دعوت کی منازل میں سے چھٹی منزل کے بارے میں لکھا ہے:

نقله الداعی الی الکلام فی	اس کو داعی نے فلسفہ میں بحث و نظر کی طرف
الفلسفة وحرصه علی النظر	متوجہ کیا اور افلاطون، ارسطو، فیثاغورث
فی کلام افلاطون وارسطو	اور ان کے قبیلہ کے دوسرے فلاسفہ کے
وفیثاغورث ومن فی معناهم	اقوال پر غور و فکر پر آمادہ کیا۔

اور آخری منزل میں تو اسے فلاسفہ کی کتابیں اور علوم فلسفیہ کے پڑھنے ہی کی تلقین کی جاتی تھی،

احالہ علی ما تفرقہ فی کتب الفلاسفۃ	اس کو ان چیزوں پر آمادہ کیا جو فلاسفہ
من علوم الطبیعیات وما بعد	کی کتابوں میں ثابت ہیں یعنی علم طبعیات
الطبیعۃ والعلوم الالٰھی وغیرہ	ابعد الطبیعات، علم الٰہی اور ان کے علاوہ
ذلک من اقسام العلوم الفلسفۃ	دوسری قسم کے علوم فلسفہ

اس طرح سے اسماعیلیت اور قرمطیت خود فلسفہ کی اشاعت کا قوی سبب بن گئی، ان کے مذاکرات کا محور مسائل فلسفیہ ہی ہوا کرتے تھے، چنانچہ ابن سینا اپنے باپ کے بارے میں لکھتا ہے :-

وکان ابی ممن اجاب داعی المصریین	میرے والد نے مصریوں کے داعی کی دعوت
ویعد من الاسماعیلیۃ	قبول کی اور ان کا شمار اسماعیلیہ میں
ویجرون علی السنتھم ذکر	ہوتا ہے ..... ان لوگوں کی زبان پر
الفلسفۃ والھندسۃ و	فلسفہ، ہندسہ اور ہندی حساب
حساب الھند	کا ذکر رہتا ہے،

تفلسف اور قرمطیت کے اس باہمی لزوم کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرہ میں "فلسفی" بھی اتنا ہی مبغوض سمجھا جانے لگا جتنا کہ ایک اعدامی (آمدہ برائے ہلاکت) قرمطی، بالخصوص ہندوستان میں، اس لیے فلاسفہ اپنے کو فلسفی نہیں کہتے تھے، ابن سینا اور اس کے تلامذہ تو فقہا کی طرح رہتے تھے، اور خود کو فقیہ ہی کے نام سے موسوم کرتے تھے، ہندوستان میں علوم حکمیہ (معقولات) کے ماہرین "دانشمند" کہلاتے تھے، اس لئے لوگوں کو شبہہ ہوا کہ اکبر کے دین الٰہی سے پہلے ہندوستان میں فلسفہ کی تعلیم کا رواج ہی نہ تھا، اس کی تفصیل آگے آئے گی،

بہرحال فلسفہ وحکمت میں اپنے دعاۃ کی تربیت کرنے کے بعد اسماعیلی تحریک کے بانیوں نے

انھیں ساری اسلامی دنیا میں پھیلا دیا، اس لیے غالباً چوتھی صدی کی ابتدا ہی سے ہندوستان (سندھ و ملتان) میں بھی اسماعیلی دعاۃ کی آمد و رفت شروع ہوگئی اور انھوں نے انقلاب کے لیے یہاں زمین ہموار کرنا شروع کی،

پہلے ملتان میں کامیابی ہوئی جہاں ۳۰۰ھ سے بنو منبہ کی سنی حکومت قائم تھی، اور جو ۳۷۰ھ کے قریب تک رہی، کیونکہ جب ۳۶۷ھ میں ابن حوقل یہاں آیا تو اس نے سنی مذہب ہی پایا، ۳۷۲ھ کے بعد عضد الدولہ دیلمی کی وفات پر فاطمی خلیفہ العزیز باللہ نے دیگر اقطار عالم کی طرح ایک شخص جلم بن شیبان کو ملتان بھیجا، یہ علاقہ پہلے ہی سے انقلاب کے لیے تیار تھا، اس لیے جلم نے ۳۷۵ھ سے پہلے یہاں اسماعیلی حکومت قائم کر لی، کیونکہ جب مقدسی یہاں آیا تو اس نے ملکی مذہب تشیع پایا، جلم نے ملتان میں قابض ہو کر یہاں کے مشہور بت کو توڑ ڈالا، چنانچہ البیرونی نے "کتاب فی تحقیق ما للہند من مقولۃ" میں لکھا ہے:

فلما استولت القرامطة علی	جب قرامطہ ملتان پر قابض ہوگئے تو جلم
المولتان کسر جلم بن شیبان	ابن شیبان نے یہاں کے بت کو توڑ
المتغلب ذالك الصنم و	ڈالا اور اس کے پجاری کو قتل
وقتل سدنته	کر دیا،

مگر جلم کے جانشین لائق نہ تھے، ادھر خراسان میں محمود غزنوی ۳۸۸ھ میں بادشاہ ہوا جو قرامطہ کا دشمن تھا، اس نے داؤد حاکم ملتان کی معاندانہ و سیہ کاریوں سے تنگ آکر [تفصیل آگے آرہی ہے] ۴۰۱ھ میں حملہ کر کے اسے تہس نہس کر ڈالا، یہاں سے ناکام ہو کر اسماعیلی منصورہ (سندھ) پہنچے، جو غالباً انقلاب کے لیے تیار ہو چکا تھا، اور وہاں اسماعیلی حکومت قائم کر لی، مگر ۴۱۶ھ میں محمود نے خفیف والی منصورہ کو شکست دیکر سندھ کو بھی فتح کر لیا،

مگر ملتان سے اس حکومتی انخلال سے قرامطہ کا زور ختم نہیں ہوا، کیونکہ جب پانچویں صدی کے آخر میں غزنوی حکومت کمزور ہوگئی تو انھوں نے پھر ملتان پر قبضہ کر لیا، پھر انہی قرامطہ سے ۵۷۱ھ میں محمد غوری نے ملتان کو چھینا، لیکن وہ بھی ان کا پورے طور پر استیصال نہ کر سکا، کیونکہ یہیں کے ایک فدائی کے ہاتھ سے وہ ۶۰۲ھ میں شہید ہوا، بعد میں قرامطہ کی سرگرمیاں دہلی تک پہنچ گئیں، اور رضیہ کے عہد میں ترک کے زیر قیادت انھوں نے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی، اور اگرچہ اس میں وہ ناکام رہے۔

غرض جنوبی مغربی ہندوستان میں عراق وایران کی قرمطی تحریک کا اثر چوتھی صدی کے آغاز سے چھٹی صدی کے آخر تک رہا، اور چونکہ اسمٰعیلی تعلیم میں فلسفہ وحکمت کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، اس لیے یہ باور کرنے کے کافی وجوہ ہیں کہ اسماعیلیوں کی دعوتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اس علاقے میں فلسفہ وحکمت کی تعلیم کی بھی گرم بازاری ہوئی ہوگی، اگرچہ خفیہ طور پر، اسی لیے اس کی تفصیلات دیگر خفیہ تحریکوں کی طرح پردۂ خفا میں ہیں۔

۲۔ پانچویں صدی کے آغاز میں ایران میں اسلامی فلسفہ کی مثل اعظم شیخ بوعلی سینا کا ظہور ہوا، مشرق میں فلسفہ اور شیخ بوعلی سینا مترادف الفاظ ہیں، شیخ کا شاگرد رشید بہمنیار اور اس کا شاگرد ابو العباس اللوکری تھا، ابو العباس اللوکری ہی سے خراسان میں فلسفہ کی تعلیم پھیلی، بیہقی نے تتمہ صوان الحکمۃ میں لکھا ہے:

ومن الادیب ابو العباس انتشرت	اور ادیب ابو العباس کے ذریعہ خراسان میں
علوم الحکمۃ بخراسان	علوم حکمت پھیلے،

اس وقت لاہور آخری دور کے غزنوی سلاطین کا مستقر حکومت تھا، اور جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا یہاں دیوان کتابت کے امیدوار عہدیداروں کی تعلیم کے لیے فلسفہ وحکمت کا بھی

رواج تھا۔ لہٰذا جب خراسان میں ابوالعباس اللوکری کی توجہ سے فلسفہ وحکمت کی گرم بازاری ہوئی تو اس نے لاہور اور ہندوستان کے دوسرے خطوں کی تعلیمی سرگرمیوں کو بھی متاثر کیا، مگر افسوس اس عہد کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا، البتہ عوفی نے شعراء میں ایک مشہور کاتب یوسف بن محمد دربندی کا ذکر کیا ہے، جو جمال الفلسفہ کہلاتا تھا، جس کے معنی یہ ہیں کہ اس عہد کے لاہور میں اور بھی فلاسفہ تھے، جن کے گل سرسبد یوسف بن محمد دربندی تھے، معقولات کے دوسرے فضلا کے نام آگے آرہے ہیں،

۳۔ چھٹی صدی کا آخر امام رازی کا زمانہ ہے، جو معقولات (علم استدلالی) کے مظہر اتم سمجھے جاتے تھے، اسی پر طنز کرتے ہوئے مولانا روم نے فرمایا تھا،

گر بعقل و رائے کار دیں بدے   فخر رازی راز دار دیں بدے

اقصائے عالم سے لوگ آکر ان کے درس میں شریک ہوتے تھے، ساتویں صدی میں ان کے تلامذہ عالم اسلامی میں پھیلنا شروع ہوئے، سیاسی حالات بھی اسی کے مقتضی تھے، تاتاریوں کی چیرہ دستیوں سے دنیائے اسلام میں قیامت برپا تھی، مغرب میں صرف مصر اور مشرق میں ہندوستان بچا ہوا تھا، اس لیے ان کے بہت سے تلامذہ ہندوستان آئے اور یہاں آکر حکمت و معقولات کی تعلیم کو ترقی دی، اس کی تفصیل آگے آئے گی،

۴۔ ساتویں صدی کے وسط میں ایران میں ایک اور عبقری پیدا ہوا، یہ محقق طوسی تھے، جنھوں نے بوعلی سینا کے فلسفہ کی تجدید کی، بقول صاحب مجالس المومنین:-

"جامع تحقیقات ابوعلی را کہ بتصادم شبہات ابوالبرکات یہودی و تشکیکات فخرالدین رازی باندراس رسیدہ از غایت علو حکمت و کمال ادراک واستدراک نمود۔"

محقق طوسی کی "تجرید فی الکلام" معقولات میں ایک بلند مقام رکھتی ہے، علمائے عجم نے شرح و تحشیہ

کے ذریعے اس کے ساتھ غیر معمولی اعتنا کیا، اور نویں صدی میں انھوں نے ہندوستان میں مقبولیت حاصل کرلی، اس کی تفصیل آگے آئے گی، مگر آٹھویں صدی میں محقق طوسی کے تلامذہ کے شاگردوں نے ہندوستان آکر نہ صرف یہ کہ یہاں کی ثقافتی سرگرمیوں میں حصہ لیا، بلکہ معقولات کی تعلیم کا بازار بھی گرم کردیا، محقق طوسی کے شاگرد قطب الدین شیرازی کے شاگرد قطب الدین رازی تھے، امام الدین ریاضی لکھتے ہیں:

"شمس فلک المحققین و نیر کوکبہ المدققین العلامۃ قطب الدین محمد بن مسعود مصلح الشیرازی ...... در حکمت شاگرد خواجہ نصیر الدین طوسی است ...... عامر الخافقین ظاہر القطبین محور فلک الحکمۃ والدین المولی قطب الدین الرازی ...... علم از علماے کبار اخذ نمود از انجملہ است مولانا قطب الدین علامہ شیرازی"

قطب الدین رازی کے شاگرد مولانا جلال الدین رومی تھے، جو ہندوستان آکر فیروز تغلق کے مدرسہ کے صدر ہوئے، انہی نے یہاں "شرح شمسیہ" کو داخل درس کیا، ان کے تلامذہ میں شیخ یوسف ابن جمال ملتانی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، اس عہد کے ایک دوسرے فاضل مولانا نجم الدین سمرقندی تھے، جنھیں فیروز تغلق نے بالابند سیری کے مدرسہ کا صدر مقرر کیا تھا۔

۵۔ آٹھویں صدی کے فضلائے شیراز کے گل سرسبد قاضی عضد الدین ایجی تھے، جو ابو اسحاق والی شیراز کے دربار کے پانچ نورتنوں میں سے ایک تھے، حافظ کہتے ہیں:

دگر شہنشہ دانش عضد کہ در تصنیف　　بنائے کار مواقف بنام شاہ نہاد

یہ محمد تغلق (۷۲۵ھ - ۷۵۲ھ) کا زمانہ تھا، وہ دل وجان سے چاہتا تھا کہ دربار ابو اسحاق کا یہ گوہر درخشاں اس کے دربار کی زینت بنے، اس لیے اس نے مولانا معین الدین عمرانی کو انھیں بلانے کے لیے شیراز بھیجا، مگر ابو اسحاق کے احسانات قاضی عضد پر اتنے عظیم تھے کہ وہ نہ آسکے مولانا غلام علی آزاد نے

"سبحۃ المرجان" میں لکھا ہے:۔

ان سلطہ (مولانا معین الدین العمرانی)	سلطان محمد بن تغلق بادشاہ ہندوستان نے
السلطان محمد بن تغلق شاہ دہلی	مولانا معین الدین عمرانی کو بے شمار ہدایا
الھند ... الی القاضی عضد الدین	وتحائف کے ساتھ قاضی عضد الدین
الایجی بشیراز واتحف الیہ	الایجی کے پاس شیراز بھیجا، اور ان سے
ھدایا غیر محصورۃ والتمس	ہندوستان آنے کی درخواست کی
بالھند قدومہ ... فامسکہ	لیکن سلطان ابواسحاق نے ان کو
السلطان ابواسحٰق ونجم تقییدہ	احسانات سے گرانبار کر کے
بسلسلۃ الاحسان علی الاطلاق	روک لیا،

قاضی عضد المواقف فی الکلام کے مصنف ہیں، جو اس فن کی ادبیات عالیہ میں محسوب ہوتی ہے، اکثر سلاطین وقت اسے اپنے نام پر معنون کرانا چاہتے تھے، چنانچہ وہ اس کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:۔

"کم من ابکار الجنان ..... وکنت برھتہ من الزمان .... اشار ذوی النہی من اعدتائی مع تعدد خاطبیھا"۔

ان "طلبگاروں" میں محمد تغلق بھی تھا کیونکہ میر سید شریف "خاطبیھا" کی شرح میں لکھتے ہیں "ومن جملۃ خاطبیھا سلطان الہند محمد شاہ جونہ"۔

قاضی عضد تو ہندوستان نہ آسکے لیکن ایران کے اور فضلا یہاں تشریف لائے، ان میں مولانا صدر شریعت سمرقندی خاص طور سے قابل ذکر ہیں، وہ علوم حکمیہ بالخصوص ہندسہ وہیئت میں ید طولیٰ رکھتے تھے، اور اسی وجہ سے "منجم" کہلاتے تھے، وہ سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی کے زمانہ میں دکن آئے، اور عرصہ تک صدر مملکت کے عہدہ پر رہے،

۵۔ قطب الدین رازی کے مشہور شاگرد تفتازانی (المتوفی ۷۹۲ھ) تھے، جو بعد میں تیمور کے دربار کی زینت بن گئے تھے، وہ اپنے علم و فضل کی بنا پر علامہ کہلاتے ہیں، انکے اکثر شاگرد ہندوستان میں آئے ان میں میر فضل اللہ انجو زیادہ مشہور ہیں، جو فیروز شاہ بہمنی کے استاد تھے، ان ہی سے اس نے معقولات و ریاضیات کا ذوق اخذ کیا تھا، فیروز شاہ بہمنی کے دربار میں اور بھی ایرانی فضلا آئے، ان میں حسن بن علی گیلانی اور سید محمود گاذرونی کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، انہی کی تولیت میں فیروز شاہ بہمنی نے بالاگھاٹ پر رصدگاہ تعمیر کرانے کا انتظام کیا تھا جو ہندوستان میں پہلی رصدگاہ تھی۔

علامہ تفتازانی کے دوسرے مشہور شاگرد مولانا موسیٰ الجبری تھے، جو دہلی تشریف لائے، ان سے مولانا فتح اللہ ملتانی نے تعلیم حاصل کی تھی۔

تیسرے مشہور شاگرد مولانا ثناء الدین ملتانی تھے، وہ علامہ کے فضل و کمال کا شہرہ سن کر ان سے پڑھنے ایران گئے تھے، وہاں سے واپس ہوکر معقولات کی تعلیم پر خصوصیت سے توجہ دی، ان کے شاگرد مولانا سماء الدین اور مولانا فتح اللہ تھے، موخر الذکر کے شاگرد مولانا عبد اللہ اور مولانا عزیز اللہ تھے، جنھوں نے دہلی جاکر معقولات کی تعلیم کو خصوصیت سے ترقی دی، مولانا عزیز اللہ کے شاگرد میاں حاتم سنبھلی تھے، جو اپنے وقت میں معقول و منقول دونوں میں مشارالیہ سمجھے جاتے تھے۔

۷۔ قاضی عضد کے شاگرد رشید میر سید شریف تھے، جو اپنی "شرح المواقف" کے لیے مشہور ہیں" اس زمانہ میں پنجاب کے ایک مشہور عالم کمال الدین تھے، جن کے اخلاف میں آگے چل کر مولانا الہداد سلطانپوری بہت مشہور ہوئے، مولانا کمال الدین میر سید شریف سے پڑھنے گئے اور واپس آکر معقولات کی تعلیم کو نیا رواج دیا۔

۸۔ نویں صدی کے آغاز میں محقق دوانی کے علم و فضل کی شہرت تھی، جنھیں محقق طوسی کے بعد قوم نے محقق کے خطاب سے مخاطب کیا، انھوں نے شرح تجرید قوشجی پر تین حاشیے لکھے قدیمہ

جدیدہ اور اجد۔ ان میں سے حاشیہ قدیمہ ایران و ترکی کے علاوہ ہندوستان میں بھی بہت زیادہ مقبول ہوا اور اکثر علما نے تدریس و تحشیہ کے ذریعہ اس سے اعتنا کیا،

مگر محقق دوانی کا ہندوستان میں معقولات کی نشر و اشاعت پر خاص احسان ہے، یہاں کے اکثر علمی خاندانوں کا سلسلۂ تلمذ محقق دوانی تک پہنچتا ہے، ان کے متعدد شاگرد یہاں تشریف لائے جن کی وجہ سے اس ملک میں معقولات کا بہت زیادہ رواج ہوگیا،

محقق دوانی کے دو شاگرد ابوالفضل گازرونی اور ابوالفضل استرآبادی گجرات آئے، ابوالفضل گازرونی کے شاگرد شیخ مبارک اور ابوالفضل استرآبادی کے شاگرد وزیر آصف خاں (عبدالعزیز الگجراتی) تھے، تیسرے شاگرد ملا عماد طارمی تھے، وہ بھی گجرات آئے، ان کے شاگرد مولانا وجیہ الدین گجراتی تھے، جو ایک کثیر الدرس اور کثیر التصنیف عالم تھے، علوم دینیہ وادبیہ کے علاوہ انھوں نے فلسفہ و حکمت اور ریاضی و ہیئت کی متعدد کتابوں پر بھی شروح و حواشی لکھے، تفصیل آگے آئے گی،

ایک اور شاگرد میر رفیع الدین صفوی تھے، مگر انھوں نے حدیث کے ساتھ اعتنا کیا، بعد میں صفویوں کے مظالم سے تنگ آکر ہندوستان چلے آئے جہاں وہ آگرہ میں حدیث کا درس دیتے تھے،

محقق دوانی کے شاگرد رشید خواجہ جمال الدین محمود الشیرازی تھے، وہ بھی صفویوں کے مظالم سے تنگ آکر مکہ معظمہ ہوتے ہوئے آخر کار میر رفیع الدین کے ہمراہ ہندوستان چلے آئے، خواجہ جمال الدین محمود کے شاگرد مرزا جان شیرازی تھے جن سے وہ سلسلہ چلا جس میں میر زاہد اور شاہ ولی اللہ منسلک ہیں۔

خواجہ جمال الدین محمود کے دوسرے شاگرد امیر فتح اللہ شیرازی تھے، جو بعد میں میر غیاث الدین منصور کے شاگرد ہوگئے تھے، انھوں نے مولانا کمال الدین مسعود شیرازی اور مولانا کردسے بھی کسب فیض کیا تھا، پہلے امیر فتح اللہ کے شاگرد امیر عنایت اللہ دکن آئے اور علی عادل شاہ کے مقرب خاص ہوگئے، بعد میں ان کے ایماء پر امیر فتح اللہ بھی دکن چلے گئے، جہاں بادشاہ نے وکیل در بنا دیا، مگر کچھ دن بعد سیاسی انتشار سے پریشان ہو کر پہلے عبدالرحیم خانخاناں کے پاس گجرات گئے، پھر اکبر کی طلب پر ۹۹۱ھ میں لاہور پہنچے، اکبر نے بڑے

عزت و احترام سے انھیں نوازا، امیر فتح اللہ ہی نے علمائے ولایت کی کتب معقولات کو ہندوستان میں رواج دیا، آزاد بلگرامی نے لکھا ہے :۔

" تصانیف علماے متاخرین ولایت مثل محقق دوانی و میر صدر الدین و میر غیاث الدین منصور و مرزاجان را امیر بہند وستان درحلقہ درس انداخت "

محقق دوانی کے ایک اور شاگرد میر حسین میبذی تھے، انھوں نے اثیر الدین ابہری کی "ہدایۃ الحکمۃ" کی شرح لکھی تھی، جو بعد میں "میبذی" ہی کے نام سے مشہور ہوگئی، وہ خود تو ہندوستان تشریف نہیں لائے مگر ان کی "میبذی" آجتک یہاں داخل درس ہے، اور اکثر علما نے اس پر حواشی و تعلیقات لکھے ہیں،

۹۔ آٹھویں صدی میں تیمور برق باد بن کر اٹھا، اور ہندوستان سے روم تک تہلکہ مچا دیا، مگر باہمہ کشور کشائی و ملک گیری اس نے علم و ہنر کی سرپرستی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور سمرقند کو مجمع فضلاے دہر بنا دیا، انھیں فضلا میں علامہ تفتازانی اور میر سید شریف بھی تھے، علم و فضل کی یہ سرپرستی اس کی اولاد میں بھی باقی رہی، اس کا پوتا الغ بیگ ریاضی و ہیئت کا زبردست عالم تھا، اس نے سمرقند کی مشہور "رصدگاہ الغ بیگ" تعمیر کرائی، اس زمانہ میں معقولات کے ساتھ اعتنا عام ہوگیا تھا، اور نویں صدی میں اس کا چرچا اور بڑھ گیا، اس عہد کے خراسان و ماوراء النہر کے فضلا میں مولانا عصام الدین ابراہیم محمد سرخ اور احمد جند وغیرہ مشہور ہیں، ماوراء النہر کے اکثر فضلاء ہندوستان تشریف لائے، جیسے مولانا یونس سمرقندی جو علوم حکمیہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے، وہ سندھ تشریف لائے جہاں مرزا شاہ حسین نے ان سے شرح مواقف پڑھی۔

۹۳۲ھ میں جب بابر نے ابراہیم لودی کو شکست دے کر یہاں مغل سلطنت قائم کی تو ماوراء النہر کے علماء جوق در جوق آنے لگے، عہد بابری کے مشاہیر علماء میں زین الدین خوافی، مولانا

محمد سعید خراسانی، مولانا محمد سعید ترکستانی اور مولانا ابوالبقا خراسانی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں، مولانا محمد سعید ترکستانی معقولات میں باکمال تھے،

بابر کے بعد ہمایوں تخت نشین ہوا، جو خود ریاضی و ہیئت میں دستگاہ عالی رکھتا تھا، اور اس فن کے ماہرین کا جویا رہتا تھا، اس لیے اس نے اردبیل سے مولانا الیاس اردبیلی کو بلایا، اسی زمانہ میں ایک اور فاضل نورالدین سعیدی آئے اور بہت جلد بادشاہ کے مقرب خاص ہوگئے، دوسرے آنے والوں میں شیخ محمد بن علی سمرقندی اور میر عبداللطیف قزوینی مشہور ہیں، مقدم الذکر نے محمد بن محمود آملی کی "نفائس الفنون" کے انداز پر "جواہر العلوم" لکھ کر ہمایوں کے نام معنون کی،

اسی عہد میں ماوراء النہر میں کچھ ایسے واقعات ہوئے کہ وہاں کے فضلائے معقولات ترک وطن کرنے پر مجبور ہوئے، ایران جا نہیں سکتے تھے، کیونکہ سنی تھے، اس لیے ہندوستان کا رخ کیا، تیموریوں کے بعد ماوراء النہر میں ازبک خاندان کی حکومت قائم ہوئی، خدا جانے ان کا دل علماء سے صاف نہ تھا، یا علماء و مشائخ کی چشمک تھی یا واقعی ان معقولیوں نے معقول کو نامعقول حد تک پہنچا دیا اس لیے خواجہ عزیزان بخارائی کے ایما سے عبداللہ خاں ازبک نے ملا عصام الدین اسفرائینی اور ان کے تلامذہ کو توران سے نکال دیا، اور منطق و معقولات کی تعلیم پر پابندی لگا دی بدایونی نے لکھا ہے:-

"و باعث بر انداختن عبداللہ خاں پادشاہ توران زمین فن منطق و علم جدل را و اخراج ملا عصام الدین اسفرائینی مع جماعت طلبہ از ماوراء النہر (دو خواجہ عزیزان بخارائی) شدہ بود بایں تقریب کہ چوں ایں علم در بخارا و سمرقند شائع شد خبائث شریہ برجاہلے سلیم الطبع وا میدیدند گفتند کہ ایں حمار است چرا کہ لاحیوان از و مسلوب است و چوں انتفاے عام مستلزم انتفاے خاص است سلب انسانیت نیز لازم می آید و امثال

این مغالطات چوں کثیر الوقوع و الشیوع شد، عزیزان روایت فقہی نوشتہ عبد اللہ خاں
را تحریص و ترغیب بر اخراج این جادہ نمود و نا مشروعیت تعلم تعلیم منطق و فلسفہ بدلائل
ثابت کردو نیز روایتے نمود کہ اگر بکاغذے کہ منطق در آں نوشتہ باشد، استنجا نمایند
باکے نیست۔"

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر علماء ماوراء النہر ہندوستان چلے آئے، جیسے قاضی نظام بدخشی،
حافظ کوکی، مرزا مفلس ازبک، قاضی عبد السمیع وغیرہم۔

(باقی)

عثمان مختاری

از جناب ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب صدر شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی حیدرآباد

(۲)

اسی ممدوح کا وزیر حسین حمزہ ہوگا، جسکی مدح میں مختاری کہتا ہے کہ وہ ۲½ سال (شعبان) سے اس کے یہاں ہے:-

بخواب دیدم دوش آں فراق یافتہ را · رخش چو چشم تر نہ و قدش چو زلف دوتا ....
رمیدہ ہوش مرا دید دور مید ز عہد · شکستہ وار بمن گفت اے شکستہ وفا
ز روز رفتن وجائے وداع یار اندیش · فرو نگر کہ چہ گفتم ترا در آں صحرا
کہ گر بحضرت کرمان ہمی کشانی کام · مروتے کن و از بند خود برآر مرا
کہ ہر کہ رفت بداں ملک و آں ولایت دید · زدی دژم بودش جان وخرم از فردا ....
دو سال و شش مہ بوسیدم ایں خجستہ بنا · کہ نور چشمۂ روزاست وآفتاب سہا
بلطف خویش مرا گفت پادشاہ جہاں · کہ اے کشادہ بفرمان من زبان بہ ثنا
ہمیت باز فرستم بحضرت سلطان · مباش مشغول الّا بہ بندگی و دعا
کنوں برآنم کایں اجرا بشاہ برد · زمہر و مرحمت خویش صاحب دنیا
مجیر دولت و صدر ہدیٰ ظہیر ملوک · حسین حمزہ خداوند سید الوزرا[1] ...

---

[1] دیوان مختاری ص ۱۲ - ۱۳

ایک قصیدہ میں اس کے القاب یہ آئے ہیں :-

ظہیر ملوک آفتاب خلافت ——— مجیر دول قطب دینِ پیمبر

نظام ملوک و کمال کفایت ——— نبات حیات و ظفر بو المظفر

حسین آنکہ صدر وزارت ز دانش ——— ہمی نور بخشد بہر معو مد [1]

ایک اور قصیدہ میں شاعر کہتا ہے :-

ابو المظفر کز نقش اوست امن و امان ——— حسین حمزہ کہ از جان اوست جان امل [2]

غالباً اس کے بعد اس کا بیٹا میر محمد وزیر ہوا تھا (شعر ۳-۵)

اے کردہ بہ کرمان سخن صافی تسلیم ——— از فقر مصافی و از من مسلم

گفتند کہ مختاری مکرم شد و منعم ——— از میر محمد پسر صاحب مکرم ......

نا ید بوزارت بہ محل پدرت کس ——— مرکب نشود مہتاب از گفتۂ شولم

چون صاحب کرم نتوان شد بہ تکلف ——— معراج پیمبر نتوان یافت بہ سلم

بود او پدرت صاحب مکرم تو خداوند ——— وز ملک ملک زود شود صاحب اکرم

این مژدہ علی الحال بخواہند بہ غزنین ——— در بارگہ شاہ جہان خسرو اعظم

من بشنوم این فضل کہ در حضرت کرمان ——— ہر فتح مہیا شد و ہر کام مقوم ......

کرمان کے ایک خازن عضد الدین لاچین کی مدح میں بھی مختاری نے ایک قصیدہ لکھا تھا ،

اے کردہ گل از سنبل پرچین تو پرچین ——— رو دے بت چین از پے پرچین تو پرچین

ہر چند کہ پیش از لب و او ی تو در آفاق ——— در سم شکر و لعل نبود و لب شیریں

چونانکہ نبود ابر چو برق و کہ چون باد ——— الا ز پس خازن خورشید سلاطین

---

[1] دیوان مختاری ص ۵۴۰، [2] ایضاً ص ۲۱۲ [3] ایضاً ص ۲۴۲ - ۲۴۴

کانِ کرم و بحرِ سخا و فلک فضل | عینِ دول و آفتاب پناہ و عضد دین
لاچین کہ چو او لعب نماید بجلا عب | آید اجل اندر دل اعدای ملاعین
از ہیبت محشر بربد روز قیامت | ہر خصم کہ لاشے شود از خنجر لاچین
احرار در ود تو فرستند بہ کرمان | آں روز کہ ایں شعر بخوانند بہ غزنین[1]

معلوم ہوتا ہے کہ کرمان سے مختاری سیستان گیا ہوگا کیونکہ اسی زمانے میں خلیفہ المستظہر باللہ (۴۸۷ھ/۱۰۹۴ء - ۵۱۲ھ/۱۱۱۸ء) تھا، جس کا ذکر حاکم سیستان تاج الدین ابوالفضل نصر بن خلف کی مدح والے قصیدے میں اس طرح ہے :-

پادشہ نصر خلف بوالفضل شاہ نیمروز | آنکہ ہر شب خاک درگاہش بہ علیین برند.....
شادی مستظہر و رامش مولی الملوک | ہر خبر کز رشد او بنداد تا غزنین برند[2]

تاج الدین کی مدح میں ایک اور قصیدہ ہے :-

تو آن بلند نظر خسروی کہ قوت عدل | ز سیستان برساینده بدریا بار
ہمی ملک ہمہ بینند بر سبیل شگفت | بیک دگر ز پس و پیش بر یمین و یسار
کہ تاج دین ملک نیمروز نصر خلف | بدست و تیغ جہاں را قرار داد قرار[3]

---

[1] تاریخ بیہقی، مجلد سوم (سعید نفیسی) ص ۱۲۷۵-۱۲۷۷ [2] دیوان مختاری ص ۵۱. لیکن اس مطبوعہ دیوان اور پنجاب یونیورسٹی کے خطی نسخے میں بھی پہلے شعر کے پہلے مصرع میں ابوالفتح ہے، ہم نے عام تاریخوں کے مطابق متن میں بوالفضل لکھ دیا ہے، خطی نسخے میں دوسرے شعر کا پہلا مصرع اس طرح ہے :- شادی مستنصر ست و رامش مولی الملوک، اس مصرع میں مولی الملوک سے مراد غالباً ملک ارسلان ہے کیونکہ اسکی مدح میں مختاری پہلے بھی اس طرح کہہ چکا ہے:

خدایگان سلاطین علاء دولت و دین | نظام دنیا مولی الملوک شاہ جہاں (ص ۲۴۶)

[3] دیوان مختاری ص ۲۰۴

سیستان ہی سے اس نے ملک ارسلان کے وزیر ابوالمظفر مسعود بن ابوالفتح کی مدح میں کچھ قصیدے بھیجے ہوں گے جیسا کہ اس قصیدے (شعر ۲) سے ظاہر ہوتا ہے:-

جہاں غنی شدہ گوئی ہمی بہ مختاری ۔۔۔ ابوالمظفر بوالفتح کار دان آید.....

ز بُست آمد شعر بہار و شعر خزاں ۔۔۔ اگر خدای بخواہد ز سیستان آید

رخان دمان خود اکنوں برفت بندۂ تو ۔۔۔ خدای داند تا کے بجان و مان آید[1]

آخری دو شعروں میں شاعر نے اپنے کنبے کا ذکر کیا ہے، جو ظاہر ہے کہ غزنین میں چھوڑ آیا ہوگا، اسی ممدوح سے متعلق ایک قصیدے میں صراحت ہو کہ وہ غزنین میں صدر تھے (شعر ۲-۳):-

باغ زایر آں جمال یافت کہ مسند ۔۔۔ از پسر کہ خدای لشکر سلطان

قاعدۂ فخر بوالمظفر بوالفتح ۔۔۔ آں بشرف صدر و دبیر مجلس و دیوان

مفتخر اہل علم حضرت غزنین ۔۔۔ سرور اہل فضل ملک خراسان.....

نامش مسعود ذات آفرین خلایق ۔۔۔ ذاتش مقصود آفرینش انسان[2]

پھر شاعر عراق (بغداد) جا کر وہاں کے عمید رئیس (دبیر) ابوالحسن علی ابن محمد ابن حسین

---

[1] دیوان مختاری ص ۲۲۷-۳۷، اس میں دوسرے شعر کا پہلا مصرع اس طرح ہے:-
"ز بست آمد شعر بہار و شعر خزاں" لیکن میں نے متن میں اسے بدل دیا ہے۔

[2] ایضاً ۲۹۹، اس کی مدح میں اور بھی قصیدے ہیں، صفحات ۴۸، ۹۱، ۱۰۸، ۱۱۲، ۳۰۳، ۳۴۳ دیکھیں ص ۴۰۹ میں اس ممدوح کے بیٹے محمد کی ولادت پر مبارکباد بھی ہے،
مختاری کے ایک قصیدے میں (۱۹۲-۱۹۳) احمد ابن محمد ابن اسحٰق کی مدح ہے جو خراسان میں کسی جگہ ہے، اور وہاں سے مختاری عراق جانا چاہتا ہے:-

مرد باید کہ اندرون قبا ۔۔۔ ہمہ ایثار باشد و انفاق

تا چو من شاعریش بستاید ۔۔۔ بطریق وجوب و استحقاق

چوں ندیم خدایگان عجم ۔۔۔ احمد ابن محمد اسحاق

چوں خراسان بماند دیگر شد ۔۔۔ از خراسان خبر کنم بعراق

کی مدح کرتا ہے :-

سعادتے چہ بزرگ ست وگوہرے چہ نفیس	ملوک را ہنرے خواجۂ عمید رئیس
ابوالحسن علی ابن محمد ابن حسین	کہ پیش رایش گردون خس ست و دہر خسیس
سپہر قصد کا ندر خلاف خدمت اوست	نحوست کیوان وسعادت برجیس
زہے دبیرکہ آید بجا صیت ز دولت	ز عرش علم چو آہن بہ سنگ مقناطیس ...
کنوں کہ چتر ملک سایہ گسترد بہ عراق	رہا کنند پلنگان و ہژبر بر آن حبیس
ائمہ را عز زبد لہائے تست امام	ملوک را نکہت نامہائے تست انیس
میان رحل دبیران فحل در بغداد	ز نامہ ہائے تو باشد سفینہ ہائے نفیس .....
چناں بود سخن من بمجلس تو کہ بود	دو خشت پیش سلیمان نہادن بلقیس
سہ سالہ برد بہ کرمان نہ دانم این کہ را	بہ ہدیہ خر ما بردن خطا بود بہ خبیس[1] ..

آخری شعر سے واضح ہے کہ شاعر کرمان میں قریب تین سال رہ چکا ہے، ایک اور قصیدے میں شاعر نے اسی ممدوح کے متعلق کہا ہوگا :

امیر سید عالم کہ بر عمد در عراق	مقدم است چو بر جملۂ بروج حمل
یکے دو ماہ بقر مجالسات مرا	عزیز کرد و مراد او بہ سپہر محل
بہشت بود مرا راحت افادت او	کز آں حیات من آراستہ شدے بمحل[2]

---

[1] مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی، مطبوعہ نسخہ (ص ۱۹۸ - ۱۹۹) میں اشعار کم ہیں لیکن اس کے صفحہ ۱۹۲ میں خواجہ ابوشجاع کی مدح ملتی ہے، یہ ابوشجاع ممکن ہے کہ وہی محمد بن حسین (دستور الوزراء ص ۸۸) ہو جس کو خلیفہ المقتدی باللہ (م ۴۸۷ھ) نے وزیر مقرر کیا تھا، مختاری نے شاید اسی کے بیٹے ابوالحسن علی ابن محمد ابن حسین کی مدح کی ہے، ابوالفرج رونی کا بھی ایک ممدوح (ص ۱۳۱) ابوالحسن علی ہے۔ [2] دیوان مختاری ص ۲۱۸ - ۲۱۹

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ شاعر ۴۹۵ھ (۱۱۰۱ء) میں رے میں تھا، پھر وہ کرمان گیا اور قریب تین سال وہاں رہا، یعنی ۵۰۲ھ (۱۱۰۸ء) تک رہ کر وہاں سے وہ سیستان گیا اور وہ زمانہ المستظہر باللہ (م ۵۱۲ھ / ۱۱۱۸ء) کا تھا جس کا ذکر حاکم سیستان کی مدح والے قصیدے میں ہم دیکھ چکے ہیں۔ سیستان سے عراق غالباً المسترشد باللہ (م ۵۲۹ھ / ۱۱۳۵ء) کے زمانۂ خلافت کے اوائل میں گیا ہوگا، اور بہت ممکن ہے کہ وہیں سے حج کے لیے بھی گیا ہوگا، بہرحال وہاں سے واپسی پر اور غالباً ۵۲۰ھ کے قریب اس نے خاقانِ ماوراء النہر ارسلان خان محمد بن سلیمان بن داؤد بن بغرا خاں کی مدح میں یہ قصیدہ بھیجا ہوگا:-

خرگہِ خاقانِ ترکستان شہِ مالک رقاب — آسمان است و جمال ارسلان خاں آفتاب ....

از تکلف دور بزم خسرو عالی چناں — کز بہشت آں بزم را اکنوں بہشت آمد خطاب

حاضر و دیدار سید صاحبِ رود و سرود — مختصر تماج و بغراخانی و جام شراب

ساقیانِ نادرہ گوینده و شیریں ادا — مطربانِ چابک طمغاجی و حاضر جواب

بندہ مختاری اگر تشریف مجلس یافتے — جاں برافشاندے و بودے از فروغش کامیاب

گرچہ اندر آرزوئے خدمتِ ایں مجلس اند — پادشاہانے کہ اختر بوسد ایشاں را رکاب

تا جہاں باشد محمد خاں علاء الدولہ باد — بزم خواہ و بادہ نوش و رزم جوی و فتح یاب[1]

---

[1] دیوان مختاری ص ۱۸۰-۹۔ لیکن ہم نے سعید نفیسی کے حواشی (تاریخ بیہقی مجلد سوم ص ۱۲۷۹) کی قرأت کو مقدم رکھا ہے، سعید نفیسی نے ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ آخری شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ ارسلان خاں محمد کا بیٹا علاء الدولہ محمد تھا، لیکن یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ سعید نفیسی نے صفحات ۱۲۹۱-۱۲۹۳ میں اسی ارسلان خان کا لقب اور کنیت (معزی کے حوالے سے) علاء الدین ابو الفتح لکھی ہے اور قدر خاں بھی۔ یہی وہ حکمران تھا، جس کو ملک شاہ اور سنجر نے بھی شکست (ص ۱۲۹۱) دی تھی۔

پانچویں شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر نے یہ قصیدہ خود پیش نہیں کیا بلکہ بھیجا ہے۔ ارسلان خان محمد جو طمغاج خان بھی کہلاتا تھا، [1] ۵۰۹ھ/۱۱۱۵ء میں حکمران ہوا تھا، پھر ۵۲۴ھ/۱۱۳۰ء سے ۵۳۰ھ/۱۱۳۶ء تک سنجر کی قید میں رہا [2] یعنی ۵۲۴ھ سے پہلے مختاری نے یہ قصیدہ لکھا تھا۔ غالباً اسی طمغاج خان کے صدر شرف الملک کی مدح میں مختاری کہتا ہے:۔

از مدح دو صاحب قیمت صدرت ‌‌‌ ‌‌‌ جیش است در جهان شرف الملک و الفخر...

صدر ملوک را لطف است از چو تو رسول ‌‌‌ ‌‌‌ خاک بلاد را شرف ست از چو تو خلف...

برخیره نیست، ملک سمرقند از او شریف ‌‌‌ ‌‌‌ بیهوده نیست شاه جهان را برا وصلف

من در عراق و کرمان بسیار دیده ام ‌‌‌ ‌‌‌ هر ساعتی به بذله او در فرح را شغف

هرگز چو او ندیم کافزون همی بود ‌‌‌ ‌‌‌ احرار نغز بذله و رقاص پر طرف...

ای پیشوای دولت طمغاج خان برای ‌‌‌ ‌‌‌ دی پیشگاه زمرهٔ آزادگان بکف [3]

---

[1] ترکستان (بارتولڈ) ص ۳۱۹ ح۔ مقدمۂ دیوان مختاری ص ۷۷۔ طمغاج دراصل ترکستان کے ایک شہر کا نام ہے۔ (بارتولڈ ص ۳۰۷) پھر طمغاج خان (= خاقانِ طمغاج) ایک لقب ہو گیا۔ بغرا خان اور اس کے اخلاف و اعزاء میں کئی کا یہ لقب تھا (بارتولڈ ص ۳۰۴، ۳۲۴-۳۲۳ ح۔ ۳۳۳ وغیرہ)

[2] حواشی تاریخ بیہقی۔ مجلد سوم ص ۱۲۷۹ لیکن بارتولڈ (ترکستان ص ۳۲۱) نے لکھا ہے کہ وہ ۵۲۴ھ/۱۱۳۰ء ہی میں فوت ہو گیا تھا۔

[3] دیوان مختاری ص ۱۸۹ - ۱۹۰ لیکن آخری شعر اس میں نہیں ہے، جو قلمی دیوان پنجاب یونیورسٹی میں موجود ہے۔ حواشی تاریخ بیہقی (مجلد سوم ص ۱۲۹۳) میں ہے کہ معزی نے ایک قصیدہ طمغاج خان ارسلان خان محمد بن سلیمان کو کسی شرف کے توسط سے پیش کیا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ یہی شرف الملک ہو جس کی مدح میں مختاری کے اشعار ہیں۔

طغان خان کا ایک وزیر نظام الملک علی خطیبی تھا جس کی مدح میں مختاری کہتا ہے:-

خدای داد دو ملک تمام را دو نظام	یکے جلال وزیران یکے رضی انام
یکے بخدمت سلجوقیاں رسیدہ بفر	یکے بخدمت طغان خان رسیدہ بکام
ہمیشہ ملک خراسان و ماوراء النہر	ز بو علی بہ نظام آمدہ و علی نظام
بداں ستودہ ہمہ دودہ سحاقی فخر	وزیں گرفتہ ہمہ گوہر خطیبی نام[1]

یہاں دو نظام مذکور ہیں، ایک نظام الملک ابو علی حسن (بن ابو الحسن علی بن اسحٰق) طوسی (وزیر الپ ارسلان و سنجر، المتوفی ۴۸۵ھ) اور دوسرا یہ نظام الملک علی خطیبی جو طغان خان کا وزیر تھا۔

ایک اور وزیر فخر الدین سعد الملک خواجہ عبد السید کی مدح بھی ملتی ہے، جو ترکستان کے اسی ممدوح سے متعلق ہوگا:-

ماہ ترکستان طراز از مشک بر دیبا کشید	مشک و دیبا را بقدر قیمت اعلا کشید......
ایں غزل چنداں سعادت یافت کو را در فخر	پیش سعد الملک فخر الدین والدنیا کشید
خواجہ عبد السید آں دریا کہ وصف دست او	در قلادہ خاطر من لولوی لالا کشید......
کو نتواند کشید آں بار کاندر ہفت سال	در ہمہ ملک خاقاں رای مولانا کشید
او بروں آمد و از آہن چتر ملک شاہ را گہ	فی المثل سیمرغ بود و فہم شاہ آنجا کشید[2]

---

[1] دیوان مختاری ص ۵۴۲-۵۴۳ و لیکن آخری تین اشعار قلمی دیوان پنجاب یونیورسٹی سے لیے گئے ہیں، طغان خان کی مدح میں ایک اور قصیدہ حواشی تاریخ بیہقی (جلد سوم ص ۱۲۰۸) میں ہے۔ [2] قلمی دیوان، پنجاب یونیورسٹی، مطبوعہ دیوان مختاری (ص ۱۴۳) میں پانچویں شعر کا پہلا مصرع نہیں ہے اور چوتھے شعر کا پہلا مصرع اس طرح ہے:
کو نتواند کشید آں بار کاندر ہفتاد سال ـــ یہاں ہفتاد سال صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ ارسلان خان محمد ۴۹۵ھ سے ۵۲۴ھ تک حکمران رہا تھا۔

پھر حسن تکین (تلیج طمغاج خاں ابو المعالی حسن بن علی بن عبد المومن) کی مدح میں بھی ایک قصیدہ ہے جو ارسلان خاں محمد کی قید کے زمانے میں (۲۴ ۵ھ تا ۵۲۶ھ) سمرقند کا حکمراں تھا:-

ہم خان ترک از بسر اندکشیدہ ترک	ہم شاہ چین از او بہ رخ اندر فگندہ چین ....
گفتم کہ آں سپہر نوال از قیاس ہست	دست شہاب دولت عالی ملک تکین [۱]

اس ممدوح کی مدح سے ظاہر ہے کہ مختاری ۵۲۵ھ کے قریب ضرور سمرقند رہا ہوگا،

ایک ممدوح "سید کتاب" اسحق معمر بھی ہے جو خان سمرقند کے یہاں ہوگا:-

حیت آں دریا کہ چوں پر گشتش از گوہر دہاں	زرد روئی برگرفت او راز گل پرنیاں ....
آنچہ او در بحر بستاں با صدف کردہ ست وگل	اندریں ملک از کفایت با خرد کردہ ست خاں
نظم ونثر قبلۂ احرار و صدر روزگار	دست و ملک سید کتاب و فخر دودماں
نور ملک اسحق معمر زین دیں معمار فضل	آنکہ ز دعمر ہنر معمور شد تا جاوداں [۲]

بعض ممدوح اور بھی ہیں، جن کے متعلق تحقیق نہیں ہو سکی مثلاً محمد بن عبد السلام (ص ۳۸) ابو منصور مستوفی (ص ۱۰۱) عثمان عبد اللہ اسمٰعیل (ص ۱۰۳) شاہ عبید اللہ ابو طاہر (ص ۱۶۰) جلال ملت (ص ۲۷۹) مسعود خسرو شاعر (ص ۱۰۲) خواجہ اسعدی شاعر (ص ۳۰۹) حسن خزانہ دار (ص ۳۶۶) وغیرہ وغیرہ، [۳]

---

[۱] دیوان مختاری ص ۲۸۲-۲۸۳ [۲] ایضاً ص ۲۸۶-۲۸۷، حواشی تاریخ بیہقی (مجلد سوم ص ۱۲۷۰) میں مختاری کا ایک قصیدہ ایک اور سید الکتاب طمغاج خاں محمود کے متعلق ہے؛-

سدید دولت طمغاج خاں مؤید ملک	عمید مطلق محمود سید الکتاب

پنجاب یونیورسٹی والے مخطوطے میں بھی یہ قصیدہ ہے، حواشی تاریخ بیہقی (ایضاً ص ۱۲۷۲) کے مرتب کا خیال ہے کہ یہ محمود شاید دربار سلجوقی سے متعلق ہوگا [۳] فہرست برٹش میوزیم (ج ۲ ص ۵۴۲-۵۴۳) میں مثنوی شہریار نامہ کا

(باقی ص ۱۲۹ پر)

جامعۂ عثمانیہ (حیدر آباد دکن) کے مخطوطہ نمبر ۸۰۷ کے ورق ۳۴۲ (الف) میں شاہ طغانخاں کی مدح میں بھی اشعار ملتے ہیں :-

بجاہ شاہ طغانخاں کو اکب گردوں ۔۔۔ شدند کوکب رایات صاحب میمون

بسعی اوست زدہ تکیہ بر سر بر سر دد ۔۔۔ شہے بچہر فریدون و فر افریدون

لباب الالباب (جلد اول ص ۵۴) میں اسے یبغو ملک[۱] (برادر جغری و طغرل سلجوقی) کا خسر کہا گیا ہے، یعنی وہ پانچویں صدی ہجری کے وسط میں رہا ہوگا، اگر یہ اشعار مستند ہیں[۲] تو پھر عثمان مختاری کی شاعری کا زمانہ بہت طویل قرار پائے گا یعنی ۴۴۵ھ سے ۵۲۵ھ تک۔ اور یہ بات اس لیے صحیح نہیں ہے کہ کارنامۂ بلخ (عشق نامہ) کی تصنیف کے وقت یعنی ۴۹۵ھ میں سنائی نے اسے جوان کہا تھا (آں جوان لطیف دیداری)۔ بہرحال ۴۹۰ھ سے پہلے اور ۵۲۵ھ کے بعد اس شاعر کا کوئی کلام متحقق نہیں اور ہو سکتا ہے کہ اس (۵۲۵ھ) کے بعد ہی اس کا انتقال ہوا ہو۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۲۸) ذکر ہے کہ وہ مختاری سے منسوب کی جاتی ہے، اور وہ کسی مسعود شاہ ابن محمود شاہ کے لیے لکھی گئی تھی، لیکن چونکہ اس فہرست کے مرتب کو بھی اس کے انتساب پر شبہہ ہے اس لیے ہم بھی مزید بحث کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

[۱] لباب الالباب میں بیغو ملک ہے لیکن "وزارت در عہد سلاطین بزرگ سلجوقی" (عباس اقبال ص ۱۱) میں اسے بیغو اور جبغو کہا گیا ہے۔ [۲] جامعہ عثمانیہ کے اسی مخطوطے کے ورق ۳۴۹ (الف) میں کچھ اشعار ہیں جو عثمان مختاری نے ۵۰ سال کی عمر میں اپنے بیٹے محمد کے انتقال پر لکھے ہوں گے :-

اے محمد بدست و خنجر تو ۔۔۔ کرد اخنجر غم تو بخست

بند ہاے تنم زہم بشکست ۔۔۔ رنجہاے دلم بہم پیوست

بجر ددی و پنج من در زد ۔۔۔ ضعف پنجاہ و ناتوانی شصت

عرب و ہند کے قدیم تجارتی تعلقات

از

جناب قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

(۲)

خطی اور سمہری یعنی ہندستانی نیزے | عرب میں ہندی تلواروں کی طرح ہندی نیزے بھی بہت مشہور تھے، جو عموماً عمان سے لیکر بحرین تک کے علاقہ میں تیار کیے جاتے تھے، جسے خط کہتے تھے، اسکے لیے سندھ، گجرات اور بھروچ سے بانس اور بید آتے تھے، پھر ان کو یہاں نیزے کی شکل دیجاتی تھی، خطی اور سمہری نیزے خالص ہندوستانی لکڑی کے بنتے تھے، لسان العرب میں ہے:

وقد کثر مجیئھا فی اشعارھا — اشعار عرب میں اس کا ذکر بہت کثرت سے آیا ہے

ابو زبید طائی (حرملہ بن منذر) نے لکھا ہے:-

مسنفات کانھن قنا الهند — لطول الرجیف جذب المرود [1]

چارہ ڈھونڈنے والے کے دیر کرنے کی وجہ سے اونٹنیاں اس طرح سوکھی ہوئی تھیں جیسے ہندستان کے بانس باندھے ہوئے ہیں.

ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے:

وهل ینبت الخطی الا وشیجه — ویغرس الا منابتها النخل [2]

خطی نیزہ سے نیزہ ہی اگتا ہے اور کھجور کے درخت نخلستان میں لگائے جاتے ہیں،

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۷۸ [2] لسان العرب ج ۹ ص ۱۹۰.

حاتم طائی نے کہا ہے :-

ساذخر من مالی دلاصا وسابحا و اسمر خطیا و عضبا مهندا[1]

میں اپنے مال میں سے عمدہ عمدہ زرہیں، گھوڑے، گندم کے خطی نیزے اور تیز ہندی تلوار محفوظ رکھوں گا۔

ابو عطاء سندھی نے کہا ہے :-

ذکرتك والخطی یخطر بیننا وقد نهلت منا المثقفة السمر

میں نے تم کو ایسے نازک وقت میں بھی یاد کیا ہے جبکہ میدان جنگ میں خطی نیزے جانبین سے گذر رہے تھے اور سرخ رنگ کے مضبوط نیزے ہمارے خون سے سیراب ہو رہے تھے،

فضل بن عبد الصمد نے کہا ہے :-

انعت قوسا ذی انتقاء جاء بها جالب بروصاء

اس صاف ستھری کمان کی میں نے تعریف کی ہے جسے بھروچ سے منگانے والے نے منگایا ہے،

نیز اسی نے کہا ہے :-

من شقق خضر بروصیات صفر اللحاء والخلو قیات

زرد، سبز بھروچی بانس جن کے چھلکے بھی زرد ہیں

مشک | مشک ہندوستان کی مشہور خوشبو ہے، جو یہاں کے مختلف مقامات سے عرب میں جاتی تھی، عرب میں اس کی خاص منڈی بحرین کی بندرگاہ دارین تھی، اسی لیے مشک کا دوسرا نام داری پڑ گیا تھا،

مشہور عربی شاعر امرء القیس نے اپنے معلقہ میں کہا ہے :-

اذا قامتا تضوع المسك منهما نسیم الصبا جاءت بریا القرنفل

جب وہ دونوں کھڑی ہوتی ہیں تو ان سے مشک کی مہک اس طرح پھیلتی ہے جیسے نسیم صبح لونگ کی خوشبو لیکر آتی ہو

[1] دیوان حاتم ص ۳۸ طبع بیروت

نابغہ ذبیانی نے اپنے ممدوح نعمان بن منذر شاہ حیرہ کی تعریف میں یہ دعائیہ شعر کہا ہے:-

وتسقی اذا ماشئت غیر مصرد بزوراء فی حافاتھا المسک کارع

جب تم ارادہ کرو تو پوری طرح سیراب کیے جاؤ، زوراء کے محل میں جس کے شراب کے ظروف میں مشک تمہارا استقبال کرتا ہے

نابغہ جعدی نے کہا ہے:-

أنیخ فیہ فلحان من مسک دارین من فلفل حرم

اس نے دارین کے مشک اور تیز خوشبو کی مرچ کی لادش کی

ایک اور شاعر نے کہا ہے:-

مسائح فودی راسہ مسبغلۃ جری مسک دارین الاحم خلالھا

اس کے سر کے اطراف میں دارین کے بہترین مشک کی بہتات ہے۔

فرزدق نے کہا ہے:-

کان تریکۃ من ماء مزن ودارِی الذکی من المدام

گویا صاف و شفاف پانی اور دارین کے بہترین مشک کی شراب کا چشمہ ہے،

کثیر نے کہا ہے:-

افید علیھا المسک حتی کانھا لطیمۃ داری تفتق فارھا [1]

اس پر مشک یوں لگایا گیا ہے جیسے وہ دارین کے مشک سے لدی ہوئی اونٹنی ہے جس کا نافہ اپنی خوشبو پھیلا رہا ہے،

اعشیٰ نے اپنی محبوبہ کے لعاب کی لذت بیان کرتے ہوئے کہا ہے:-

کان القرنفل والزنجبیل باتا بفیھا واریا مشورا [2]

شہد کی مٹھاس کے ساتھ گویا لونگ اور سونٹھ دونوں نے اس کے منہ کے اندر مشک داری میں رات بسر کی ہے

---

[1] لسان العرب ج ۱۳ ص ۱۵۴ [2] ایضاً ج ۱۱ ص ۱۳۳

جران العود نے کہا ہے :-

لقد عاجلتنی بالسباب وثوبها جدید ومن اردانها المسك ینفح

اس نے مجھے برا بھلا کہنے میں اس قدر جلدی کی کہ ابھی اس کے عروس کے کپڑے نئے تھے اور اس کی آستینوں سے مشک کی خوشبو آرہی تھی۔

رؤبہ نے کہا ہے :-

ان تشف نفسی من ذبابات الحسك أحر بها أطیب من ریح المسك[1]

اگر میری روح برچھیوں کی دھار سے شفا پائے تو پھر اس کے لیے مشک سے بھی اچھی خوشبو مناسب ہے

فارۃ المسک یعنی نافۂ مشک کا تذکرہ ایک شاعر نے یوں کیا ہے :-

لها فارۃ ذفراء کل عشیة کما فتق الکافور بالمسك فاتقه

اس کے لیے ہر شام نافہ کی ایسی خوشبو ہے جیسے کسی نے کافور کو مشک کے ساتھ ملا کر خوشبو اڑائی ہے۔

نابغہ بنی شیبان نے کہا ہے :-

اذا ما جری الجادی فوق متونها ومسك ذکی جففتها المجامر

جب زعفران اور مشک اس پر بہہ پڑتے ہیں تو انگیٹھیاں ان کو سکھانے لگاتی ہیں۔

قد عبق العبیر بها ومسك یخالطه من الهندی عود

اس کے جسم زعفرانی پر خوشبو اور عود ہندی میں ملا ہوا مشک لپٹا ہوا ہے۔

کان علی انیابها بعد هجعة صبابة ماء الثلج بالعسل المحض

فلما عی تنانفح المسك جیبها اذا انتفضت کادت تمیل من النحض

بیداری کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محبوبہ کے دانت پر برف کے پانی کے قطرے ہیں جو خالص شہد لیے ہوئے ہیں اور جب جب وہ ہمارے سامنے آتی ہے تو اس کے گریبان سے مشک بکھرتا ہے اور جب اٹھنا چاہتی ہے تو نزاکت کی وجہ سے وہیں جھک پڑتی ہے۔[2]

---

[1] لسان العرب ج ۱۰ ص ۴۸۶

بشر بن ابی حازم نے کہا ہے:-

فقد ادنرن من قسط و رند ومن مسك اجم ومن سلاح

وہ کشتیاں قسط، خوشبو، مشک اور سامان جنگ بہت زیادہ لائی ہیں،

یزید بن قیس کلابی نے عہد فاروقی کے ایک عامل کی شکایت کرتے ہوئے کہا ہے:-

اذا التاجر الهندی جاء بفارة من المسك صحت فی سوالفهم تجری[1]

جب ہندوستانی تاجر نافۂ مشک لاتا ہے تو ان کی گردنوں میں گویا خوشبو کا دریا بہنے لگتا ہے

فتوح البلدان میں اذا التاجر الدارى ہے[2]

عود | عود (اگر) ہندوستان کی مشہور لکڑی، اور عربوں کی مرغوب ترین خوشبو ہے، اس کو عود ہندی، عود صنفی، عود قماری، عود مندلی، عود کلبی کے ناموں سے یاد کرتے ہیں، بلکہ کبھی صرف ہندی، قماری اور مندلی کی نسبت سے عود مراد لیتے ہیں، عدی بن رقاع نے لکھا ہے:-

رب نار بت ارمقها تقضم الهندی والغارا

ایسی آگ کو دیکھ دیکھ کر میں نے رات بسر کی ہو جو عود ہندی اور غار کے درخت کو کھائے جا رہی تھی،

نابغہ شیبانی نے کہا ہے:-

قد عبق العبیر بها ومسك یخالطه من الهندی عود

اس کے جسم پر زعفرانی خوشبو اور عود ہندی میں مخلوط مشک لپٹا ہوا ہے۔

عمرو بن طنابہ جاہلی کہتا ہے:-

اذا ما مشت نادی بانی ثیابها ذکی الشذا والمندلی المطیر

جب محبوبہ چلتی ہو تو اس کے حسن کی منادی تیز خوشبو اور اڑنے والی مندلی عود کیا کرتی ہے،

---

[1] الاصابہ ج ۳ ص ۱۱۹ و ایضاً ج ۳ ص ۶۳۲ [2] فتوح البلدان ص ۳۷۷

ابراہیم بن علی ابن ہرمہ نے کہا ہے :-

کأن الرکب اذ طرقتک باتوا بمندل او بقارعتی قمارا

اہل قافلہ جب رات کو تیری طرف پہنچے تو تیری ایسی خوشبو محسوس ہوئی جیسے وہ مندل یا قمار میں ہیں،

کافور: کافور عربی زبان میں کئی طرح سے استعمال ہوتا ہے، کافور، قفور اور قافور، یہ ہندی لفظ کپور کا معرب ہے، یوں تو کافور عرب کے ہر بڑے بازار میں فروخت ہوتا تھا، لیکن دارین جس طرح ہندی مشک کی بہت بڑی منڈی تھا، اسی طرح کافور کا بازار بھی تھا، اور یہیں سے دوسرے علاقوں میں کافور جاتا تھا،

نابغہ شیبانی نے کہا ہے :-

کأن رضاب المسک فوق لثاتها وکافور داری وراحا تصفق

اس کے مسوڑھوں کے اوپر گویا دارین کا کافور اور شراب دونوں مخلوط ہیں۔

داری کی تشریح حاشیہ میں یوں ہے :-

الداری العطار منسوب	داری عطر فروش ہے، دارین کی طرف منسوب
الی دارین وهی فرضة بالبحرین	ہے جو بحرین کی بہت بڑی بندرگاہ ہے، وہاں
یحمل الیها المسک من الهند[۱]	پر ہندوستان سے مشک لایا جاتا ہے،

ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے :-

لها فارة ذفراء کل عشیة کما فتق الکافور بالمسک فاتقه

اس کے لیے ہر شام نافۂ مشک کی خوشبو ہوتی ہے، جیسے کسی نے کافور اور مشک ملا کر خوشبو اڑائی ہو

نیز نابغہ شیبانی نے کہا ہے :-

---

[۱] دیوان نابغہ بنی شیبان ص ۳

شیبت بکافور وماء قرنفل — وباء موهبة یسمو ملامها

وہ کافور، لونگ کے پانی اور شیریں پانی میں ملائی گئی ہے اور ڈھکن کے اوپر سے بہہ رہی ہے

کأن مدامة ورضاب مسك — وکافورا ذکیا لم یغش

وہ گویا شراب اور مشک محلول، اور تیز خوشبو کا کافور ہے جس میں ملاوٹ نہیں کی گئی ہے۔

زنجبیل | زنجبیل ہندی زنجا بیر کا معرب ہے جس کے معنی سونٹھ کے ہیں، اسے عرب خشک اور تر دونوں طرح سے استعمال کرتے تھے، اور اس کی خوشبو ان کے یہاں بہت مرغوب و مشہور تھی، لسان العرب میں ہے:-

والعرب تصف الزنجبیل — عرب سونٹھ کی خوشبو کی تعریف کرتے ہیں

بالطیب وهو مستطاب عندهم — اور وہ ان کے یہاں بہت ہی مرغوب

جدا — اور پسندیدہ ہے،

اعشیٰ کا یہ قول گذر چکا ہے:-

کأن القرنفل والزنجبیل باتا بفیها واریا مشورا

اس کے لعاب دہن کی لطافت و نکہت کا حال یہ ہے کہ جیسے اس کے منہ کے اندر شہد کے ساتھ لونگ اور سونٹھ نے مشک داری میں رات گذاری ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا ہے:-

وزنجبیل عاتق مطیب[1]

سونٹھ ملی ہوئی پرانی خوشگوار شراب

قرنفل | قرنفل (لونگ) کو عرب قرنفول بھی کہتے ہیں، یہ کرن پھول کا معرب ہے، عربی ادبیات

---

[1] لسان العرب ج ۱۱ ص ۳۱۳

میں اس کا ذکر کثرت سے آیا ہے۔ لسان العرب میں ہے:۔

وقد کثر فی کلامھم واشعارھم — اس کا تذکرہ کلام عرب میں کثرت سے آیا ہے

چنانچہ ایک شاعر نے کہا:۔

و بابی ثغرک ذالک المعسول — کأن فی أنیابہ القرنفول

میں اس شیریں دہن پر قربان جاؤں، جس کے دانتوں میں گویا لونگ ہے جس کی خوشبو پھیل رہی ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:۔

وخودۃ أناۃ کالمھاۃ عطبول — کأن فی انیابھا القرنفول[1]

وہ نیل گاؤ کی طرح سیاہ آنکھوں والی نازنین جس کے دانتوں میں گویا لونگ خوشبو لیے ہوئے ہے۔

امرء القیس نے کہا ہے:۔

اذا قامتا تضوع المسک منھما — نسیم الصبا جاءت بریا القرنفل

جب وہ دونوں کھڑی ہوتی ہیں تو ان سے مشک کی خوشبو پھیلتی ہے گویا نسیم صبح لونگ کی خوشبو لائی ہے۔

نابغہ شیبانی نے کہا ہے:۔

من الخفرات خلت رضابھا — سلافۃ قرقف شیبت بمسک

باحیا دوشیزاؤں کے لعاب دہن ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ لونگ کی شراب ہے جس میں مشک ملا ہوا ہے۔

فلفل | فلفل پپالا یا پپالا (مرچ) کا معرب ہے، عربی میں اس سے صیغے بھی بنائے گئے اور مفلفل اس چیز کو کہتے ہیں جس میں فلفل کی خوشبو ملائی گئی ہو، لسان العرب میں ہے:۔

---

[1] لسان العرب ج ۲ ص ۵۵۱

وقد اکثر مجیئہ فی کلامھم[۵]   اس کا تذکرہ کلام عرب میں کثرت سے آیا ہے

چنانچہ امرؤالقیس نے کہا ہے :-

کأن مکاکی الجواء غدیۃ   صبحن سلافاً من رحیق مفلفل

مقام جواء کی مرغابیاں ایسی حواس باختہ تھیں گویا ان کو مرچ ملی ہوئی بہترین صباحی پلائی گئی ہے،

ساج ساج (ساگوان) ہندوستان کی بہترین عمارتی لکڑی ہے، جو قدیم زمانہ سے عرب میں استعمال ہوتی تھی، اور بڑی مقدار میں یہاں سے جاتی تھی، جس سے دروازے، کواڑ، ستون اور چھت وغیرہ بنانے میں کام لیا جاتا تھا، عام طور سے ہندوستان سے اس کی بلیاں عرب جاتی تھیں، جن کو حسب ضرورت کاٹ لیا جاتا تھا، اس سالم بلی کو عرب ساجہ کہتے تھے، یہ لکڑی عام طور سے کوکن کے علاقہ سے بھیجی جاتی تھی،

نابغہ شیبانی نے کہا ہے :-

وقبۃ لا تکاد الطیر تبلغھا   اعلی محاریبھا بالساج مسقوف[۶]

اس قبہ کی بلندی کو پرندے بھی نہیں پہنچ سکتے، اس کی سب سے اونچی محراب ساگوان کی چھت بنی ہے۔

احادیث میں ساج کا ذکر آیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بنا ہوا سامان استعمال فرمایا ہے،

قسط قسط کا لفظ ہندی کُٹھ کا معرب ہے، اسے کُست اور کُسط بھی کہتے ہیں، یہ ہندوستان کی مشہور دوا ہے، جو عرب میں بہت مشہور تھی، اور مختلف بیماریوں میں استعمال کی جاتی تھی،

مبشر بن ابی حازم نے تجارتی کشتی کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے :-

---

[۵] لسان العرب ج ۴ ص ۵۳۲ [۶] دیوان نابغہ بنی شیبان ص ۵۳

فقد اوقرن من قسط و مندل ومن مسک اجم ومن سلاح

یہ کشتیاں بھاری مقداریں قسط، عود، مشک اور اسلحہ لائیں۔

احادیث میں قسط ہندی کے بڑے فضائل و فوائد آئے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے استعمال کی تاکید فرمائی ہے۔

داذی | داذی ہندی لفظ تاڑی کا معرب ہے، اگرچہ تاڑی عرب میں بھی ہوتی تھی لیکن ابن خردادبہ کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی ہند سے بھی تاڑی عرب میں جاتی تھی، ایک شاعر نے اس کا ذکر یوں کیا ہے:-

شربنا من الداذی کأننا ملوک لنا بر العراقین والبحر

ہم نے یوں تاڑی پی کر نشہ میں بادشاہ بن گئے اور عراق (عرب و عراق عجم) اور سمندر ہمارے قلمرو میں آ گئے۔

اسود بن کریمہ نے کہا ہے:-

قد حسا الداذی صرفاً

اس نے خالص تاڑی خوب سیر ہو کر پی

ہند و عرب کے تجارتی تعلقات پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ مگر ہمارے موضوع کے سلسلے میں اس وقت اتنا ہی کافی ہے، بلکہ زائد ہے۔

آثارِ علمیہ و ادبیہ

مکاتیب مولانا مناظر احسن گیلانیؒ

بنام

مولانا سید سلیمان ندویؒ

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے نام ہندوستان و بیرون ہند کے بہت سے علماء و مشاہیر کے خطوط کا بڑا ذخیرہ دارالمصنفین میں محفوظ ہے، یہ خطوط مختلف النوع معلومات و مسائل پر مشتمل ہیں، ان کا مجموعہ شائع کرنے کا خیال ہے، مگر ابھی اس میں عرصہ لگے گا، اسلیے افادہ اور دلچسپی کے لیے معارف میں بھی ان کی اشاعت مناسب معلوم ہوئی، اور اس کا آغاز مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے خطوط سے کیا جاتا ہے۔ "م"

۱۰ رمضان المبارک ۱۳۵۵ھ

بارہ بجے شب، حیدر آباد دکن

سیدی و سید المسلمین حیاکم اللہ و ابقاکم السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

مضمون کے روانہ کرنے کے بعد انتظارِ جواب کے یہ دن مجھ پر سخت گذرے، دل دھڑک رہا تھا کہ خدا جانے آپ پسند بھی فرماتے ہیں یا نہیں، زیادہ تر اپنی اسی دیوانگی سے اندیشہ تھا جس کی

مذہب تعبیر آپ حضرات وجد و تحسین سے فرمایا کرتے ہیں، مشاغل مکروہہ کی کثرت میں اتنا بھی جو بن پڑا وہ محض خدا کا فضل تھا، جواب میں جوں جوں تاخیر ہوتی جاتی تھی، گمان ظن بلکہ سوء ظن کی شکل اختیار کرتا چلا جاتا تھا کہ پرسوں گرامی نامہ نے بحمداللہ اضطراب کو سکون سے بدل دیا، اب اس کی پروا نہیں ہے کہ دنیا پسند کرے گی یا نہیں، آپ حضرات کی توثیق میرے لیے کافی ہے، مجھے اس کا بھی ڈر تھا کہ شاید آپ کے ما فی الضمیر کے سمجھنے میں تو مجھ سے کوتاہی نہیں ہوئی ہے، جہاں تک گرامی نامہ سے میں سمجھا ہوں، شاید ایسا نہیں ہوا ہے،

ایک اور بات کا بھی کھٹکا تھا یعنی جھونک میں کوئی ایسی صورت تو نکل نہیں آئی کہ بجائے واقعی تعریف کے اطراء، اور غلو کا میں مرتکب ہو گیا، میں سچ عرض کرتا ہوں کہ قلم کو میں نے سنبھال کر چلایا ہے، جو کچھ لکھا ہے، وہ میرے دل کے واقعی جذبات ہیں، ریائی گفتگو نہیں ہے، بہرحال اب جو کچھ بن پڑا وہ پیش کر دیا، آپ کے حقوق مجھ پر بہت زیادہ ہیں، بقول آپ ہی کے کہ "الندوہ" کی راہ سے اپنی طالب العلمی کے زمانہ میں بہت کچھ شعوری وغیر شعوری طور پر استفادہ کرتا رہا ہوں، اور میں اپنے لیے اس میں فخر محسوس کرتا ہوں کہ آپ مجھے اپنے مستفیدین میں شمار فرمائیں، شاید ان حقوق کا کوئی حصہ اس ذریعہ سے ادا ہو گیا، اور واقعہ تو یہی ہے کہ مادح خورشید مداح خود است

مورضعیف کو اچھا موقعہ ملا کہ سلیمان کے تخت کے ساتھ لٹک کر اسے بھی ایک گونہ بلندی میسر آئی، حسب الحکم ایک اجمالی فہرست کتاب کی مرتب کر کے بھیج رہا ہوں، میرے پاس مسودہ نہیں ہے، وہی مبیضہ تھا اور وہی مسودہ، جوڑ کس طرح لے گا، اب اس وقت میں اس کا اندازہ نہیں کر سکتا، بہرحال کسی طرح اس کو کھپا دیجئے، ضرورت اس کی واقعی شدید تھی، میرا خیال ادھر نہیں گیا تھا۔

ایک ضروری بات یہ عرض کرنی ہے کہ اگر بہار مدرسہ بورڈ کا جلسہ ممکن الوقوع ہو تو

یہ آپ کے اختیار کی بات ہے، کہ دسمبر میں مجھے ۱۲ دنوں کی تعطیل جو ملتی ہے، اس کی مدت ۱۵ بڑھا دیجئے، میرا مطلب یہ ہے کہ دیوبند میں بھی اسی زمانہ کے قریب مجلس شوریٰ کا اجلاس ہے، اگر آپ ۸ دسمبر کو جلسہ کی تاریخ مقرر فرمائیں تو میں دیوبند ہوتا ہوا پٹنہ، اور پٹنہ سے گھر چلا جاؤں گا، دیوبند بھی تاریخ کے بدلنے کے لیے لکھ رہا ہوں، وہاں ۲۸، ۲۹ نومبر کو جلسہ ہے، لیکن ۳۰ نومبر کو ہمارے کالج کی جدید عمارت کا افتتاح خود اعلیٰ حضرت خلد اللہ ملکہ فرمانے والے ہیں، بحیثیت صدر شعبۂ دینیات ہونے کے ایسے موقعہ پر اپنے غائب ہونے کو مناسب خیال نہیں کرتا، ۳۰ نومبر کو یہاں سے فارغ ہو کر میں ۳ دسمبر تک دیوبند پہنچ سکتا ہوں، اور ۳، ۴، ۵ تک وہاں ۷ کو پٹنہ ۸ دسمبر سے میرا کالج ۱۲ دن کے لیے بند ہو رہا ہے۔ یہ ہے پروگرام، اس میں میرا مالی نفع بھی ہے، اور ایک ہفتہ گھر میں رہنے کے لیے بھی انشاء اللہ تعالیٰ مل جائے گا، میں دیوبند بھی لکھ رہا ہوں کہ تاریخ بدل دیجئے، نجم الہدیٰ سلمہٗ نے لکھا ہے کہ تاریخ کا تعین آپ کے اختیار میں ہے۔ فقط

مناظر احسن گیلانیؔ

ہاں صاحب یہ ندوہ کے قیام کا کیا افسانہ ہے، اخباروں میں بڑے دھوم دھام سے اعلان ہوا، حیدرآباد کے اخباروں میں براہ راست ڈاکٹر صاحب کا فرمودہ چھپا، لیکن سن رہے ہیں کہ واقعہ اس میں بہت کم ہے، آخر مطلب کیا تھا؟

۳ اکتوبر ۳۹ء

سیدی و سید الہند[1] السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

لیجئے جناب "اما ھذا فقد قضی ما علیہ" حق تعالیٰ کا ہزار شکر ہے کہ ایفاء عہد کی اس نے توفیق آسان کی، مضمون بھیج رہا ہوں، میں نے اپنا کام کر دیا، اب آپ کو پسند آئے یا نہ آئے۔

---

[1] آخر شیخ جب ہیں تو سید کیوں نہ ہوں،

اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اتنی محنت زندگی میں کسی مضمون کے لکھنے میں مجھے اٹھانی نہ پڑی تھی، آپ کو کیا معلوم کہ حیدرآباد میں کن لایعنی مشاغل میں زندگی بسر ہوتی ہے، کہاں دارالمصنفین کی بامعنی اور پاکیزہ زندگی اور کہاں دکن کی لایعنیاں، خیر، جو کچھ ہوسکا وہ یہی تھا، خدا کرے کہ آپ پسند فرمائیں، تو میری محنت ٹھکانے لگے، اس سے زیادہ کچھ مطلوب نہیں، بیضہ کسی کاتب سے چاہا کہ تیار کرا کے بھیجوں لیکن اس نے پندرہ دن کی مدت چاہی، آپ کے انتظار کی تکلیف کا خیال کر کے اسی کٹے پھٹے حال میں بھیج دیتا ہوں، دارالمصنفین کے کاتب ماشاء اللہ ان سے زیادہ "جنیات" پڑھنے کے عادی ہوں گے۔

پٹنہ کا تیر نشانہ پر بیٹھ کر پھر غلط ہوگیا، میاں نجم الہدیٰ نے پہلے تار تیار رہنے کا دیا۔ پھر، راکتوبر کو طلبی کا دعوت نامہ آپ کے حوالہ سے آیا، لیکن اسی دن شام کو "پوس پونڈ" کا تار بھی مل گیا، "الیأس احد الراحتین" کے لطف سے لذت اندوز ہوا، مضمون کو پڑھنے کے بعد ضرور مطلع فرمائیں کہ مجھے سب سے زیادہ اسی کا انتظار رہے گا۔ طویل تو ہوگیا ہے لیکن اس میں میرے قصد کو دخل ہے، ورنہ النبی الخاتم کا مصنف اختصار پر بھی قادر ہے، بحمداللہ۔ لیکن پیچ کی راہ سے محروم، کتاب میں بعض غلطیاں تھیں، جن میں غلط نامہ نے بعض کی تصحیح کر دی، ایک جگہ حذف کے ساتھ "غلیل" کی حرمت کا جو دعویٰ آپ نے کیا ہے، سمجھ میں نہیں آیا، "النصح" کا ترجمہ اخلاص سے فرمایا گیا ہے، لیکن میرے اساتذہ ہمیشہ "بہی خواہی" و "خیر اندیشی" اس کا ترجمہ مجھے بتاتے رہے ہیں کہ لغوی معنی "سیدنا" سے زیادہ مطابق ہے۔ النصح للّٰہ ولرسولہ وللمومنین کا مطلب اور زیادہ دلچسپ تھا، میں نے ان باتوں سے تعرض نہیں کیا، حسن و قبح کی بحث میں فٹ نوٹ میں معتزلہ کے نقطۂ نظر کی طرف ہلکا سا اشارہ ہے۔ اور یہ عرض کرتا ہوں کہ یہی دو تین باتیں ایسی ہیں جن پر دل میں کھٹکا پیدا ہوا، ورنہ ان کے سوا میں نے

جو کچھ لکھا ہے، سخن سازی نہیں، بلکہ حقیقت طرازی ہے، جو دل میں تھا قلم پر آیا ہے اور کوئی نئی بات نہیں ہے، مولوی عبد الباری دل شکستہ تو پہلے ہی سے تھے، دست شکستہ ہو کر اور ......

فقط

مناظر احسن گیلانی

۲۰ راکتوبر ۱۹۳۹ء

حیدر آباد دکن، سیتا پھل منڈی

مضمون کو قصداً چند حصوں میں تقسیم کردیا ہے، بالکل ناپسند ہو تو صرف پہلا صفحہ کچھ پسند ہو تو صرف بعضہ اور کل پسند ہو، تو کل، ناپسند یدہ حصہ کو واپس فرما دیجئے گا۔ آخر محنت صرف ہوئی ہے۔

۲۹ راکتوبر ۱۹۴۱ء
حیدر آباد دکن

سیدی المحترم۔ مدظلکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

واللہ اعلم آجکل آپ کہاں ہیں، رمضان کا غالباً عشرہ رواں تھا جب آپ کا ایک سفارشی گرامی نامہ ملا تھا، چونکہ واقعات کا علم نہیں تھا، چاہا کہ تحقیق کے بعد آپ کو جواب دوں، ان دنوں بُعد مسافت اور پٹرول کے راشن کی وجہ سے آمد ورفت میں بڑی دشواری ہو گئی ہے اس لیے اس مسئلہ کی تحقیق میں تاخیر ہوئی ہے، جہاں تک میں نے متعدد ذرائع سے دریافت کیا زنانہ کالج میں بالفعل کسی تقرر صب جائداد کا پتہ نہ چلا، اور نہ کوئی مجلس تقررات اس کے لیے مقرر ہوئی ہے جس کا نقیب رکن ہو، مولانا خلیل عرب صاحب کی صاحبزادی صاحبہ سے تعارف گذشتہ سال ہی نواب محمد یار جنگ بہادر کے توسط سے حاصل ہو چکا ہے، دیر تک مجھ سے گفتگو ہو چکی ہے، ان کے اسناد بھی میں نے دیکھے ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستانی عورتوں میں

اس بچی کی جیسی قابلیت عربی و اسلامی علوم میں کسی دوسری عورت میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے، ان کا خیال مجھے اسی زمانہ سے ہے، پھر آپ کے حکم کے بعد تو اور تقویت ہوگئی، بھوپال سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن ڈمرانوی نے بھی سفارش کی تھی۔ خود مولانا خلیل عرب کا گرامی نامہ بھی آیا تھا، انشاء اللہ تعالیٰ میرے بس میں جو کچھ ہوگا کوئی دقیقہ ان کی اعانت کا اٹھا نہ رکھا جائے گا۔

رمضان ہی میں بعض مقامی اخباروں نے آپ کی آمد آمد کی خبر شائع کی، ہم لوگوں کو تعجب ہوا، متعدد احباب خصوصاً امجد صاحب دریافت کرنے آئے لیکن بجز لاعلمی کے اور کیا جواب دیسکتا تھا، واللہ اعلم کیا واقعہ ہے؟ مولانا عبدالباری بیچارے ان دنوں سخت بیمار ہیں، رخصت لیکر گھر جانا چاہتے تھے لیکن عین روانگی کے دن دورا پڑا، گر گئے، نسبتاً اب اچھے ہیں، اگرچہ کالج نہیں جارہے ہیں، ہاں صاحب مشہور تو یہ ہوگیا کہ بالآخر آپ نے بھی ایک دیوبندی کے ہاتھ میں ہاتھ دے ہی دیا، کیا یہ صحیح ہے، خدا کرے صحیح ہو، آپ کی عین وقت پر امداد سے شعبۂ دینیات بحمداللہ اس انقلابی طوفان سے بچ گیا، گو اس میں حیدری صاحب کی روانگی کو بھی دخل ہے، ہندوؤں سے مرعوبیت اس بیچارے کو اس حرکت پر آمادہ کر رہی تھی، نواب مہدی یار جنگ بہادر سے میری گفتگو ہو چکی ہے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس خرخشہ کے ختم کر دینے کا انھوں نے تہیہ کیا ہے، شروانی صاحب نے بھی اس مسئلہ میں بڑی دلچسپی لی، جدید صدر اعظم بہادر نواب چھتاری سے آپکے تعلقات تو سنتے ہیں بہت وسیع ہیں، مجھ سے تو ملاقات بھی نہ تھی، اسی لیے ملا بھی نہ تھا، رمضانی دعوت میں ایک دفعہ مدعو ہوا، آٹھ دس مہمان تھے، اس دن گفتگو کا موقع ملا تھا، لیکن برنی صاحب نے سب کے حقوق تکلم غصب کر لیے پھر کوئی صورت اجتماع کی ایسی نہ ملی کہ کھل کر بات ہو، آپ کا ذکر سیاسی کتاب کے سلسلہ میں آیا تھا، وہ کئی بار آپ کو "شاہ سلیمان صاحب" کے لفظ سے یاد کر رہے تھے، غالباً ملاءِ اعلیٰ میں جس کی شاہی کا فیصلہ ہو چکا ہے، ملاء ادنیٰ پر اسی کی تجلی پڑی ہے۔

لیکن جیسا کہ عرض کیا، برنی نے ساری گفتگو کرکری کردی، آجکل مولوی عبد القدیر بدؔاؤنی کا ان کے
یہاں بہت زور ہے، ہر ڈنر و دعوت میں سنا گیا ہے کہ مدعو ہوتے ہیں۔

ایک اور ضروری مسئلہ میں آپ کی اعانت کا محتاج ہوں، قصہ یہ ہے کہ اسی طالب العلم
نے جس نے طبی وسی کا مقالہ لکھا تھا، اب ایم اے میں کامیاب ہوجانے کے بعد چونکہ یہاں کی امیر شاہی
کے گھرانے کا لڑکا ہے، اس لیے نوکری سے بے پروا ہوکر پی، ایچ، ڈی کی تیاری میں لگ گیا ہو

"جنوبی ہند میں علم حدیث"

اس کے تحقیقاتی مقالہ کا عنوان ہے، نگرانی میری ہے، کئی دن سے چاہ رہا تھا کہ اس موضوع
کے متوقعہ مواد کی نشاندہی میں آپ سے اعانت حاصل کروں، یعنی چاہتا ہوں کہ (۱) آپ کے جو
مضامین مختلف اوقات میں ہندوستان میں علم حدیث کے متعلق شائع ہوئے ہیں ان کا پتہ دیجئے، اپنے
کسی شاگرد سے معارف کے ان پرچوں کو نکلوا کر میرے نام وی پی کرا دیجئے (۲) دوسری بات
یہ ہے کہ خود ذرا فرصت سے چند سطروں میں اُن کتابوں کی نشاندہی فرمائیں جن سے اس لڑکے
کو مدد مل سکتی ہے معبر کی تاریخ، ابن بطوطہ، اخبار الاخیار، یاد ایام، دعوت اسلام سے بالفعل اجزا
کا انتخاب کر رہا ہے، جنوبی ہند میں اگر سی، پی اور گجرات کو بھی شامل کر لیا جائے تو اس میں کچھ حرج
تو نہ ہوگا، عام طور پر پرانی کتابوں میں سورت بمبئی، احمد آباد کو جنوبی ہند ہی میں خیال کرتے تھے،
اسی طرح مانڈو، برہانپور کی اسلامی ریاستیں بھی جنوبی ہند ہی کی ریاستیں غالباً سمجھی جاتی ہیں،

"رحمت عالم" کے نسخوں کا انجام؟ میرا عجیب حال ہے، یوں تو حیدر آباد کی پبلک جس قدر
مجھ سے دلچسپی رکھتی تھی وہ بہت کچھ زبان بندی کی وجہ سے ختم ہوچکی ہے، لیکن سکندر آباد میں ہفتہ ہر
خطبہ مع الترجمہ ہوتا ہے، عید کی نماز بھی میں ہی پڑھاتا ہوں، اس سال بھی تقریباً آٹھ نو ہزار
کا مجمع تھا، لیکن واہ رے میں جیسں نسخے رحمت عالم کا بیچنا کوہ کندن بن گیا، سکندر آباد میں

"نوجوانان سکندرآباد" کی ایک مشہور جمعیت ہے جو آپ سے بھی خط و کتابت و عقیدت رکھتی ہے، اس کے سکریٹری کے حوالہ آج سے آٹھ دس مہینہ پہلے کیا تھا، ہر ہفتہ تقاضا کرتا ہوں مختلف جوابات پارہا ہوں، غالب قرینہ ہے کہ جس طرح دوسری انجمن والوں کا جو پیشہ ہے، اسی عام پیشہ کے تحت ان سعادت مند نوجوانوں نے مجھ بڈھے احمق کو احمق بنایا، اب دس پندرہ دن اور انتظار کرکے ان کی نوجوانی پر آنسو بہاتے ہوئے ندوہ اس رقم کو خود ہی بھیج دوں گا، کمال یہ ہوگا کہ میرے پاس اس کا ایک نسخہ بھی باقی نہ رہا، خیر قوم کے ان عاشقوں سے یہ کوئی نیا تجربہ نہیں ہوا ہے، مستکبرین ہوں یا مستضعفین اب تک برائے اکل کے سوا ان انجمنی و قومیاتی تشکلوں کا اور کوئی نتیجہ نظر نہ آیا، ان لھم د لما یعبدون۔

جب آپ اپنے حدیث کے مضامین کے پرچے معارف کے تلاش کرائیں تو اسی کے ساتھ اگر ممکن ہو تو معارف میں خاکسار نے مولانا برکات احمد رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جو مضمون لکھا تھا، اور آپ کی سیرت والے مضمون کے پرچوں کو بھی جدا لیجئے، ان ہی پرچوں کے ساتھ ان پرچوں کو بھی وی پی کرا دیجئے، ہاں مرتضیٰ زبیدی پر بھی شاید معارف ہی میں کچھ لکھا تھا، اور داؤد مرحوم کی ایک کتاب کے متعلق بھی معارف میں خاکسار کا ایک مضمون شائع ہوا تھا، میں چاہتا ہوں کہ ان سب کو منگوا کر ایک جلد میں جمع کرا دوں، میرے سارے مضامین بکھرے ہوئے، کسی کا ایک ورق بھی موجود نہیں، اور موجود رہنے کے لیے وہ ہیں بھی نہیں، "فیذھب جفاءً"

مناظر احسن گیلانی

۲۵ راپریل ۱۹۴۳ء

سیدی الامام دمتم فی ظل اللہ الملک المقام، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

قسمت کے تہی دستوں کے لیے، رہبران کامل کی راہنمائیاں پہلی دفعہ لاسود ثابت نہیں ہوتی ہیں،

آپ نے چاہا تھا کہ بھوپال مجھے بلائیں، میں نے بھی حاضری کا ارادہ کر لیا تھا، مارچ سے گفتگو ہو رہی تھی، لیکن مارچ والی تاریخ حکومت نے ٹالدی، اپریل کا مہینہ مقرر ہوا، حیدرآباد میں منتظر رہا کہ اب مراسلہ ملے گا، بہ یک کرشمہ دو کار ہو گا، لیکن نہ کام ہی نکل سکا، نہ کرشمہ ہی کا ظہور ہوا۔ جب نربدا کو عبور کرکے میں گنگا کے کنارے پٹنہ میں پڑا تھا، تب حکومت بھوپال کا تار پلٹنے کا ملا، ۲۰ر تاریخ اپریل کی میرے لڑکے عزیزی محی الدین سلمہٗ کی برات کی رخصتی کی تاریخ تھی، اب تک شادی کے متعلق ایک تنکا بھی خریدا نہ گیا تھا، پٹنہ سیدھے حیدرآباد سے اسی لیے اترا تھا، مکارم سلمہٗ گیلانی سے آگئے تھے، میں خریداری میں مشغول ہو چکا تھا، مشغولیت نہ ہوتی تو جیسے میرا سارا کام مکارم سلمہٗ کے اختیار تمیزی کے سپرد ہے، یہ کام بھی وہی کر لیتے لیکن اب بہت سی چیزوں سے میری ذاتی دلچسپی بھی پیدا ہو چکی تھی کسی کی رائے نہ ہوئی کہ ایسی حالت میں پھر جنوبی ہند پلٹ جاؤں وہی تار دیا جو آپ کے سامنے پہنچا ہو گا، بھوپال میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا، اور نہ وہاں کے لوگوں سے میرا کوئی تعلق تھا، اس دفعہ ایک اچھی صورت آپ کے ذریعہ سے نکل آئی تھی، لیکن مشیت الٰہی غالب آئی، بہرحال آپ کی کرمفرمائیوں کا شکر تو بگردنِ ما، اب جب مجھے نفع نہ پہنچا اس کا الزام خود مجھ پر عائد ہوتا ہے، اس کے پوچھنے کی تو ضرورت نہیں کہ غالب خستہ کے بغیر کام ظاہر کیسے رک سکتا ہے۔

معلوم نہیں اب کی موسم گرما حسب دستور دسنہ تشریف آوری ہوگی یا نہ ہوگی، اور ہوگی تو کب ہوگی ہمارے یہاں کی تقریب بجائے ۲۰ر اپریل کے بعض دوسری تقریبوں کی وجہ سے اب ۱۶ر مئی مقرر ہوئی ہے، میں اپنی قسمت میں کاش اس بلندی کو محسوس کرتا کہ آپ کی شرکت کا امکان اس تقریب میں کسی طریقہ سے پیدا ہو جاتا، لیکن بلندی ہو یا پستی قسمت کے دونوں پہلو خود صاحب قسمت کے لیے مجہول ہیں۔

بحمداللہ علم کی دولت کے ساتھ معرفت وعمل کی نعمت بھی آخر میں آپ کے لیے مقدر تھی،
آستانۂ تھانہ بھون کی حاضری کا حال مولانا عبدالباری صاحب سے معلوم ہوتا رہتا تھا،
هنیئا لکم ثم هنیئا لکم، الصادقین کی معیت آپ کو مبارک ہو، انعمت علیھم کے صراط کی ہدایت
اصل ہدایت ہے، غضب اور ضلالت سے نجات کی واحد راہ بھی ہے، "حسن اولٰئک رفیقا" کی سند کے
ساتھ "الرفیق الاعلیٰ" کی مجلس انس کی شرکت ہر قسم کی مجلسوں سے گذرنے کے بعد انشاءاللہ رسوخ تام
کی بشارت وضمانت کی حامل ہے،

عجب راہ نہ یہاں محاسدہ ہے، نہ مباغضہ، نہ منافسہ، نہ مقابلہ، بلکہ ہر ایک دوسرے
کے لیے داعی، گو مدت ہوئی اس راہ سے دور ہو چکا ہوں، لیکن ابتک وہ حلاوتیں دل ناکام
کو یاد ہیں، جو کسی زمانہ میں میسر آئی تھیں، آپ لوگوں کی انقلابی زندگی خیر کی طلب اور میرا انقلاب
شر کی طرف باعث عبرت ہے، مولانا عبدالباری تو اپنے اہل وعیال کے ساتھ غالباً تھانہ بھون
روانہ ہو چکے ہوں گے، وہ خانقاہ امدادیہ میں براج رہے ہیں، اور میں گیلانی میں بہاری شادیوں
کی ظلمتوں میں مبتلا ہوں، بظاہر زندگی کے آخری دنوں میں ان کروہ مشاغل کے ساتھ ابتلاء میرے
لیے سخت ابتلاء ہے، کہ العبرۃ بالخواتیم' ہو سکتا ہے، آپ جیسے "الصالحین" کی محبت وعقیدت
میرے حسن عاقبت کی وجہ بنجائے۔ فقط والسلام

مناظر احسن گیلانی۔

آخر میں پھر اسی تمنائے شرکت تقریب کا اظہار کر کے اس عریضہ کو ختم کرتا ہوں، خدا کرے
دستہ آنے کا پروگرام اومنی سے پہلے ہو، ورنہ اعظم گڈھ سے ظاہر ہے کہ اس کی توقع
کیا ہو سکتی ہے،

۳ فروری ۱۹۴۳ء

جوار الجامعۃ العثمانیہ

سیدی الامام بشریٰ لکم وطوبیٰ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ایں قالب فرسودہ گرازکوی تو دور است

القلب علی بابک لیلاً ونہاراً

کچھ عجیب حال ہے، جب آپ کی زیارت موجب اجر و ثواب بنی تو جسے ثواب و اجر کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہی اس سعادت سے محروم ہے، آپ کہاں سے کہاں پہنچے اور پہنچائے گئے اور ہم جرسِ کارواں کی صرف آواز ہی سنتے رہے، مولانا عبدالباری صاحب سے والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا کی جو تفسیر آپ کے ساتھ ہو رہی ہے، اس کی خبریں سنتا رہتا ہوں، کتنی مسرتیں ان خبروں میں اپنے لیے پاتا ہوں، آپ کو اس کا شاید اندازہ کیا ہو گا، خبر ملی تھی کہ آستانۂ حکیم الامۃ مدظلہ العالی سے سند خلافت بھی حاصل ہو چکی ہے، معارف کے شذرات میں جو کچھ جس قلم سے شائع ہوا ہے، اب اس کی عبدیت اور بندگی میں کون شک کرسکتا ہے، بندے نے بندے کے بندے ہونے کی توثیق کی، میرے نزدیک تو خلافت کا حاصل ترجمہ یہی ہے، جب سب کچھ نگاہوں سے ہٹ جائے اور

از خدا خواہم دو از غیر نخواہم بخدا

کہ نیم بندۂ غیر و نہ خدائے دگر است

اسی ایک حقیقت واقعیہ کا تحقق تام بس سب کچھ صرف یہی ہے، ایاک نعبد وایاک نستعین کے مقام پر سرفرازی نصیب ہوئی، انشاء اللہ فردوس میں اس کے نزل کی تیاری ہے، ایسی مہمان نوازی کہ لا یبغون عنھا حولا، اس لیے کہ لوکان البحر مدادا لکلمات ربی لنفد البحر الآیۃ

طلب لامحدود کے لیے مطلوب کو بھی لامحدود ہی ہونا چاہیے، بلکہ مطلوب کی لامحدودیت ہی نے تو اس طلب کو پیدا کیا جس کی "ہلوعیت" کسی نقطہ پر ختم نہیں ہوتی کسی راہ میں ہو، خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنھوں نے اپنی فطرت کے اس جذبہ کو اسی راہ پر لگا دیا جس کے لیے پیدا کرنے والے نے اسے پیدا کیا تھا، کہ آدمی نے اس ہلوعیت کو خود نہیں پیدا کیا، ورنہ خُلق ہی کے فاعل کو مجہول کیوں رکھا جاتا۔

دیکھیے قدم بوسی کی تمنا کب پوری ہوتی ہے، دسنہ حاضر ہوا تھا، لیکن سے ملاقات نہ ہوسکی لیکن مکان کے چاروں طرف پروفیسر سعید رضا صاحب اور ان کے بھائی حفیظ صاحب کی معیت میں گھوم آیا، کمرے بند تھے، طواف سے زیادہ موقع نہ مل سکا، ایک برات میں گیا تھا۔ اور حالات کیا عرض کروں ؎

ہمیں نازِ ما ند سکین حسن را

ازاں روز ترسم کہ ایں ہم نہ ماند

واللہ اعلم، نسل انسانی کی دیوار کس کروٹ گرنے والی ہے، خیر ہم تو بہت جی چکے، اتنا کہ حساب سے عہدہ برآ ہونا صرف فضل ہی پر محول ہے، اب تو سامنے زیادہ یہی حال رہتا ہے،

عنقریب ست کہ از اثرے باقی نیست

شیشہ بشکست، دمی ریختہ و ساقی نیست

اس وقت مولانا عبد الباری صاحب کے مشورے سے یہ عریضہ خدمت والا میں روانہ کر رہا ہوں، مولانا عبد الحیٰ مرحوم کی "کتاب الہند"[1] کا حال آپ سے زیادہ دوسرا کون جانتا ہے، خیال یہ آیا ہے کہ مجلس تصنیف و تالیف کی زیر نگرانی مولانا محمود حسن ٹونکی کی معجم المصنفین کی ترتیب و تدوین کا جو کام تھا وہ ختم ہو چکا ہے، اس میں گنجایش کافی ہے، نواب مہدی یار جنگ بہادر

[1] نزہۃ الخواطر کے نام سے اس کتاب کی ... جلد میں طبع ہو چکی ہیں اور ... [illegible]

کی خدمت میں ایک "محضر" پیش کیا جائے، جس کا مسودہ آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ مقصد یہ ہے کہ آپ چند توثیقی کلمات ثبت فرما کر اسے نواب صدر یار جنگ بہادر کے پاس علی گڑھ بھیجدیں، نواب صاحب کو میں بھی لکھ رہا ہوں، آپ بھی لکھیے، کہ وہ بھی اس پر دستخط فرمائیں، یہ مناسب نہ ہو تو الگ ایک خط نواب مہدی یار جنگ کو اس سلسلہ میں لکھیں، اس کے بعد حیدرآباد کے چند ممتاز دستخطوں کے بعد ارادہ ہے کہ نواب صاحب کی خدمت میں ہم لوگ لیجا کر پیش کریں، بڑی علمی خدمت انجام پا جائے گی، اگر حکومت آصفیہ کی طرف سے اس کی اشاعت کا نظم ہو جائے۔ فقط

نیازمند

مناظر احسن گیلانی

مولوی عبد الباری صاحب سلام فرماتے ہیں۔

ادبیات

قرطبہ سے ولنیشیا تک

از جناب جگناتھ صاحب آزاد

جگناتھ صاحب کی طبیعت میں مسلمانوں کا کلچر اتنا رچا اور بسا ہوا ہے کہ انکی شاعری سے بھی وقتاً فوقتاً اس کی تراوش ہوتی رہتی ہے، اور ان کی متعدد نظمیں مسلمانوں کے جذبات وخیالات کا نمونہ ہیں، یہ نظم بھی اسی قبیل کی ہے، ابھی وہ یورپ گئے تھے، اس سفر میں انھوں نے اپنی جذبات کے ماتحت اسلامی تہذیب کے قدیم تاریخی مدفن اندلس مرحوم کو بھی نگاہ عبرت سے دیکھا، یہ نظم اسی تاثر کا نتیجہ ہے۔ "م"

اندلس کی سرزمیں اتماشائے رنگ و بو — کل تو مرے خیال میں تھی آج روبرو

پوشیدہ خاک میں تو فضا میں نہاں کہیں — تیرا جمال پردہ بہ پردہ ہے، تو بہ تو

ہسپانیہ ہے آج اگر سرزمین گل

اس سرزمین گل کا گل سرسبد ہے تو

آخر یہ کیا طلب ہے کہ دل میں لیے ہوئے — میں پھر رہا ہوں شہر بہ شہر اور کو بہ کو

میری نگاہ میں حرم قرطبہ ہے آج — کل تھے مری نظر میں طلیطلہ[1] کے کاخ و کو

راہِ وفا میں کون کسی کا رفیق ہے

ہمراہِ دل ہے آج فقط دل کی آرزو

---

[1] آج اس شہر کو ٹلیڈو (Toledo) کہتے ہیں، مسلمانوں کے دور حکومت میں یہ شہر اسپین کا دار الحکومت تھا۔

کیوں ہیں خموش قصرِ سلاطین[1] کے بام و در ۔۔۔ اے دل کہاں یہ لے کے مجھے آ گیا ہے تو

اک نبضِ ادب کا بیاں[2] کیا پتہ چلے ۔۔۔ آساں نہیں بیاں تو خود اپنی جستجو

سنسان میکدوں میں مری تشنگی کی خیر

اب وہ شراب ہے نہ وہ ساقی نہ وہ سبو

مسجد[3] کے زیر سایہ خرابات دیکھ کر ۔۔۔ مانا کہ سرد ہو ہی گئی شمع آرزو

تیرے جہاں میں آ کے مگر اے ویلنشیا[4] ۔۔۔ جیسے کہ جم گیا ہو رگوں میں مری لہو

رقصاں بشر کی روح جہاں تھی وہاں ہے آج

رقصاں فقط برہنگیٔ جسم چار سو

رفتارِ وقت! دیکھ رہا ہوں ترا طلسم ۔۔۔ طوفاں سمٹ کے آج فقط رہ گیا ہے جو

ڈھونڈے سے بھی نہ اسکا مجھے مل سکا سراغ ۔۔۔ تہذیب[5] وہ کہ جو تھی زمانے کی آبرو

میخانۂ حیات کا عالم کہوں تو کیا

رند آج کم طلب ہیں تو ساقی تہی کدو

---

[1] اشارہ ہے غرناطہ کے شاہی محلات کی جانب "الحمراء" کا نام تو آج ساری دنیا میں مشہور ہے، لیکن اس کے علاوہ اور بھی محل ایسے ہیں جو آج بالکل گمنام ہیں اور آٹھ صدیاں پہلے کی عظمت کا بخوبی پتہ دے رہے ہیں [2] مرسیہ غرناطہ سے کوئی تین سو میل مشرق میں ساحل بحر سے قریب ایک بارونق شہر ہے۔ یہ شہر شیخ محی الدین ابن عربی کا مولد ہے لیکن اس وقت وہاں کوئی ایسی یادگار نہیں جو اس تاریخی مقام کی نشاندہی کر سکے [3] میں نہیں کہہ سکتا کہ جب علامہ اقبالؒ نے مسجد کی زیارت کی تھی، تو کیا صورت حال تھی لیکن میں جب وہاں پہنچا تو مسجد کے سامنے بھی ایک میخانہ تھا اور پشت پر بھی [4] اسپین کے دو شہروں میں سے ایک شہر جہاں کی عورتوں کا رقص یورپ بھر میں مشہور ہے، دوسرا شہر بارسلونا ہے جو ویلنشیا سے مارسیلز آتے ہوئے، راستہ میں ملتا ہے [5] یعنی اسپین کی اسلامی تہذیب،

غزل

از

جناب حبیب احمد صاحب صدیقی

شکستِ سوختہ جانوں کو راس آئی ہے
ہر ایک بات میں عذرِ شکستہ پائی ہے

کبھی حدیثِ وفا جو زباں پہ آئی ہے
تو دوستوں نے جبینوں نظر چرائی ہے

کسی کی یاد کبھی اس طرح بھی آئی ہے
کہ جیسے بادِ بہاری پیام لائی ہے

اذیت اس سے بڑی اور کوئی کیا ہوگی
دلِ غیور ہے اور شرم نارسائی ہے

انھیں سنائی تو ہم اپنی داستاں ہم نے
ملا کے غیرتِ دل خاک میں سنائی ہے

بیاں جو وصف کیے دوستی کے سب تسلیم
یہ پوچھتے ہیں کبھی تم نے آزمائی ہے

کسے خبر ہے گذرتی ہے اس پہ کیا جس نے
خیال و خواب کی دنیا الگ بنائی ہے

غلط ہے شکوۂ بے التفاتیِ احباب
حجاب اصل میں اپنی ہی بے نوائی ہے

خرد سے مسلکِ تخریب سیکھنے والو
کبھی کبھی تو محبت بھی کام آئی ہے

ہزار حیف کہ وہ بھی ہیں تنگ دل جن کی
نظر میں وسعتِ کون و مکاں سمائی ہے

جلی ہے پہلے بھی بجھ بجھ کے اپنی شمعِ امید
نہیں ہے غم جو زمانے نے پھر بجھائی ہے

متاعِ زیست گنوانے کا غم نہیں زیبا
فراخ حوصلگی سے اگر گنوائی ہے

از جناب محمد حنیف خاں صاحب

دل حزیں عرض مدعا کی سبیل کوئی بہم نہیں ہے
زباں بھی قاصر تو غم نہیں تھا نگاہ میں بھی تو دم نہیں ہے

ابھی ہیں کتنے ہی ایسے جلوے جو ہیں نگاہِ خرد سے مخفی
ابھی ہیں کتنی ہی شاہراہیں جہاں نشانِ قدم نہیں ہے

جہاں تجلیٔ حسن ہوگی نقوشِ سجدہ وہیں ملیں گے
جبیں کا ذوقِ فتادگی کچھ اسیر دیر و حرم نہیں ہے

غم و مسرت کا ربط باہم یہ راز فطرت بتا رہا ہے
جو دل نہ لذت کشِ ستم ہو وہ مستحقِ کرم نہیں ہے

دل حقیقت شناس ہی کچھ یہ راز ہستی سمجھ سکے گا
سکونِ منزل کی جستجو کچھ سکونِ منزل سے کم نہیں ہے

غلط کہ اغیار کو تمھاری عنایتوں کا شرف ہو حاصل
اگر یہ ہو بھی تو کوئی شکوہ مجھے خدا کی قسم نہیں ہے

اگر ہے ذوقِ طلب میسر تو ذرہ ذرہ ہے طور ساماں
نظر میں وسعت اگر ہے پیدا کہاں بہا ارم نہیں ہے

مطبوعاتِ جدیدہ

مضامین سلیم } از مولوی سید وحید الدین سلیم مرحوم، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی،
تین جلدیں } متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ہر سہ جلد
بالترتیب ۲۲۴، ۲۱۴، ۲۰۸، قیمت بالترتیب للعہ، للعہ، للعہ، پتہ:- کل پاکستان انجمن
ترقی اردو، روڈ کراچی

مولوی وحید الدین سلیم مرحوم ان اصحاب قلم میں تھے جن کی علمی، ادبی اور لسانی خدمات ہمیشہ زندہ رہیں گی، انھوں نے مختلف النوع مسائل و مباحث پر سینکڑوں مضامین لکھے، انکا ایک مجموعہ عرصہ ہوا "افادات سلیم" کے نام سے چھپ چکا ہے، لیکن وہ بہت ناقص تھا، اس لیے ان کے ہم وطن شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے جو خود بھی صاحب ذوق اہل قلم ہیں، اور اس سے پہلے وحید الدین مرحوم کی نظموں کا مجموعہ "افکار سلیم" مرتب کر چکے ہیں، اب ان کے مرحوم رسالۂ "معارف" اور "مسلم گزٹ" وغیرہ سے ان کے تمام مضامین تلاش کر کے ان کا مکمل مجموعہ شائع کیا ہے، یہ مجموعہ تین جلدوں میں ہے۔ ان کے مضامین کی مجموعی تعداد ۹۰ ہے۔ ان میں علمی، ادبی، تنقیدی، لسانی تاریخی، سیاسی اور اخلاقی ہر نوع کے مختصر اور طویل مفید اور محققانہ مضامین ہیں، تیسری جلد کے مضامین نسبۃً مختصر اور بعض عربی اخبارات و رسائل سے ماخوذ ہیں، شروع میں مولوی وحید الدین مرحوم پر بابائے اردو مولوی عبد الحق صاحب مرحوم کا ایک مضمون ہے جو انھوں نے مرحوم کی وفات کے بعد لکھا تھا، اس سے ان کے حالات و خصوصیات پر روشنی پڑتی ہے، یہ مجموعہ ہر

صاحب ذوق کے پڑھنے کے لائق ہے، انجمن ترقی اردو پاکستان نے اسے شائع کرکے ایک مفید علمی و ادبی خدمت انجام دی ہے،

قاموس القرآن۔ مرتبہ مولانا قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی، تقطیع خورد صفحات ...۸ مجلد مع گرد پوش، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد لعہ، غیر مجلد ۱۲ پتہ:- مکتبہ علمیہ، دفتر الحرم، قاضی منزل، قاضی واڑہ میرٹھ۔

یہ مولانا قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی کی مشہور کتاب "قاموس القرآن" کا دوسرا اڈیشن ہے، اس کے پہلے اڈیشن پر معارف میں مفصل ریویو ہو چکا ہے، اس نئے اڈیشن میں مصنف کو نظر ثانی اور اضافہ کا موقع نہیں مل سکا لیکن اس کی ظاہری نفاست و طباعت پہلے اڈیشن سے بہتر ہے، یہ لغت کلام مجید کے مطالعہ کرنے والوں کے لیے خصوصیت کے ساتھ بہت مفید اور کارآمد ہے،

عقد الجید۔ ترجمہ مولانا ساجد الرحمن صاحب صدیقی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۰۲ مع رنگین گرد پوش، قیمت ؎ پتہ محمد سعید اینڈ سنز، قرآن محل مقابل مولوی مسافر خانہ کراچی

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور رسالہ عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید کا اردو ترجمہ سلک مروارید کے نام سے مدتوں پہلے ہو چکا تھا، لیکن اس کی زبان قدیم تھی، اس لیے اردو خواں اصحاب کی سہولت کے لیے یہ نیا ترجمہ مع اصل کتاب کے صاف اور سلیس زبان میں شائع کیا گیا ہے، دو چار مقامات پر مختصر حاشیے بھی ہیں، ایسے حاشیوں کی اور بھی ضرورت تھی، اس سے اردو دانوں کے لیے کتاب کے مطالعہ میں اور بھی سہولت پیدا ہو جاتی۔

اشک و تبسم۔ از جناب موج رام پوری، تقطیع خورد، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر،

صفحات ۱۴۴، مجلد مع گردپوش، قیمت سے درج، پتہ: دبستان پبلشرز دیلا بک ومطور، رام پور اسٹیٹ۔

یہ ایک جوان سال اور خوش فکر شاعر جناب سنتوش کمار سکسینہ سورج رام پوری کی غزلوں، نظموں اور قطعات کا مجموعہ ہے، ان کی زندگی حوادثِ روزگار کا شکار رہی ہے، اس لیے ان کے کلام میں جذباتِ غم کی شدت ہے، شاعر کا دل ملک وقوم کے درد ومحبت سے بھی آشنا ہے، اس لیے آزادی کے بعد کی ملک کی اخلاقی پستی، غریبوں کی بیکسی اور فسادات کی تباہی وبربادی پر انھوں نے اشکباری کی ہے، اس مجموعہ میں چند نعتیں بھی ہیں، وہ ایک کایستھ خاندان کے چشم وچراغ ہیں، اور رامپور ان کا وطن ہے، اس لیے ان میں اردو زبان وادب کا ستھرا ذوق ہے، جو ان کے کلام میں پوری طرح نمایاں ہے، لیکن ابھی نوجوان ہیں، اور ان کے مشقِ سخن کی عمر بھی زیادہ نہیں، اس لیے کلام میں پختگی کی کمی ہے جو مشق ومارست سے جاتی رہے گی،

اسلامی پیغام کے اولین علمبردار - مترجم جناب محمد اسلم صاحب سیف فیروزپوری، صفحات ۴۰، کاغذ معمولی، کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۵۰ر، پتہ: مکتبہ سعدیہ، فیض آباد براستہ تلمبہ ضلع ملتان۔

یہ رسالہ مشہور مصری عالم محب الدین خطیب کے ایک عربی مقالہ کا ترجمہ ہے، جو حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور فارسی تصنیف "تحفہ اثنا عشریہ" کی عربی تلخیص "المنحۃ الالٰہیہ" کے آخر میں شائع ہوا ہے، فاضل مقالہ نگار نے اس میں صحابہ کرام کو واقعات سے "رحماء بینہم" کا نمونہ ثابت کیا ہے، اور ان کے باہمی اخلاص وارتباط خصوصاً خلفاء ثلاثہ اور حضرت علیؓ کے مابین خوشگوار اور پاکیزہ تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے مشاجراتِ صحابہ کی حقیقت اور ان اسباب ومحرکات کی نشاندہی کی ہے جنھوں نے صحابہ کے اختلافات کو غلط اور بدنما رنگ دیدیا ہے، مقالہ اپنے موضوع پر جامع اور ترجمہ بھی غنیمت ہے،

انتخاب اردو اور اردو کا نصاب ۔ شائع کردہ دی یونیورسٹی آف بمبئی، کاغذ اچھا

ٹائپ، قیمت فی جلد ہے

اردو نظم و نثر کا یہ انتخاب اور نصاب بمبئی یونیورسٹی کی طرف سے انٹرمیجیٹ کے آرٹس، سائنس اور کامرس کے طالب علموں کے لیے مرتب کیا گیا ہے، حصۂ نظم میں غزلیں نظمیں، قطعات، رباعیات، قصائد اور مراثی تمام اصناف سخن کا انتخاب ہے۔ انتخاب کا تعلق زیادہ تر ذوق سے ہے، اس لیے ضروری نہیں کہ ایک انتخاب ہر حیثیت سے مکمل کہا جا سکے، لیکن یہ انتخاب خوش مذاقی اور سلیقہ سے کیا گیا ہے، اور مجموعی حیثیت سے اچھا ہے۔

خدا ہے ۔ از جناب مولوی سید حامد علی صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت

اچھی، صفحات ۴۰ قیمت ۲۵ نئے پیسے، پتہ ادارہ شہادت حق (وقف) بریلی (یو، پی)

اس مختصر رسالہ میں علمی و عقلی دلائل سے خدا کے وجود کو ثابت کیا گیا ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ خدا کے انکار کے بعد کائنات کی کوئی توجیہ ہی نہیں ہو سکتی، اس موضوع پر اردو جو مضامین اور رسالے لکھے گئے ہیں، ان سب میں یہ رسالہ امتیازی حیثیت رکھتا ہے، اور اس قابل ہے کہ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے طلبہ میں اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے،

الجامعۃ الاسلامیہ ۔ از جناب ہلال عثمانی صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۲، قیمت تحریر نہیں، ناشر کتب خانہ محمودیہ، دیوبند (یو پی)

اس رسالہ میں ہلال عثمانی صاحب نے جو دارالعلوم دیوبند کی جانب سے مدینہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، مدینہ یونیورسٹی کا اجمالی تعارف کرایا ہے، یہ یونیورسٹی ابھی نئی ہے اس لیے اس کے حالات سے عام طور سے ناواقفیت ہے، اس لحاظ سے یہ رسالہ مفید ہے۔

"ض"

جلد ۹۱ ماہ ذیقعدہ ۱۳۸۲ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۶۳ء عدد ۳

مضامین

مقالات

آثار علمیہ و ادبیہ

ادبیات

شذرات

سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد کی موت ہندوستان کا ایک بڑا قومی حادثہ ہے، وہ اپنے قومی و ملکی خدمات کے لحاظ سے صف اول کے لیڈروں میں تھے، ہندوستان کی جنگ آزادی میں انکے بڑے کارنامے ہیں، چمپارن کی مشہور ستیہ گرہ کے گویا ہیرو تھے، وہ گاندھی جی کے خاص تربیت یافتہ اور ان کے معتمد علیہ تھے، اس لیے ان میں ان کی بہت سی اخلاقی خوبیاں موجود تھیں جو آخر تک قائم رہیں، ہندوستان کی آزادی کے بعد کانگریس کے بہت سے لیڈروں کے خیالات اور کردار میں جو تبدیلی ہوگئی ہے، ان سے ان کا دامن محفوظ تھا، وہ کانگریس کے پرانے اصولوں پر برابر قائم رہے، اور اپنے جلیل القدر عہدے کی ذمہ داریوں کو بھی بڑی خوبی کے ساتھ نباہا، طبعاً بڑے شریف اور منکسر المزاج تھے، اور قومی و ملکی معاملات میں ان کا دل بہت وسیع تھا، اس لیے کسی طبقہ کو بھی ان سے کوئی شکایت نہیں پیدا ہوئی، وہ پرانے کایستھ تھے اس لیے اردو اور فارسی سے بہت اچھی واقفیت رکھتے تھے، اور بہت شستہ اردو بولتے اور لکھتے تھے، اور ان میں قدیم مشترک تہذیب کی بہت سی خوبیاں موجود تھیں، اس لیے ان کی موت مختلف حیثیتوں سے بڑا قومی سانحہ ہے، اور ان کا نام ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ہم نے گذشتہ معارف میں جامعہ ملیہ کو اردو یونیورسٹی بنانے کی جو تجویز پیش کی تھی، اردو پریس نے اس کی پرزور تائید کی متعدد اہم اخبارات نے معارف کے شذرات تائیدی نوٹ کے ساتھ نقل کیے، قومی آواز لکھنؤ نے نقل کیا، اس کی تائید سب سے اہم ہے، مولوی حیات اللہ صاحب انصاری اردو کے سابق تحریک کے محاذ

مقالات

دبستانُ المذاہب کا مصنّف

از جناب پروفیسر حافظ غلام مرتضیٰ صاحب ایم اے الہ آباد یونیورسٹی

[یہ مقالہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں تیسری آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس منعقدہ ۲۹ر، ۳۰ر دسمبر ۱۹۶۲ء کے اجلاس میں پڑھا گیا تھا اور اب پہلی مرتبہ قارئین معارف کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے]

قرون وسطیٰ کے ہندوستانی ادب میں دبستان المذاہب کا وہی مقام ہے جو صدر اول کے کلامی ادب میں امام عبد الکریم شہرستانی کی کتاب الملل والنحل کا ہے، بلکہ غالباً اس سے زیادہ، کیونکہ امام شہرستانی کی الملل والنحل، امام عبد القاہر بغدادی کی الفرق بین الفرق کا تفصیلی تکملہ ہے، جو تاریخ فرق سے زیادہ تنقید ومناظرہ کی کتاب ہے، دوسرے اس کتاب میں اکثر ان فرقوں کا حال مندرج ہے جو مصنف کے زمانہ سے بہت پہلے ختم ہو چکے تھے، اس لیے اس کے مطالعہ سے خود مصنف کے عہد کے مذہبی رجحانات کا پتہ لگانے میں کوئی مدد نہیں ملتی، اس کے برخلاف دبستان المذاہب کے مصنف نے صرف مختلف ادیان ومذاہب کی تعلیمات ہی کے نقل کرنے پر اکتفا کی ہے اور ان پر کسی قسم کا تبصرہ کرنے میں حد درجہ احتیاط برتی ہے، چنانچہ وہ مقدمہ میں لکھتا ہے:

"چون نامہ موسوم بہ دبستان کہ از دانش و کنش و کیش پیشین باستانی گروہ گروہ گفتار دہ گروہ از پار

[illegible] زبان بی عصبیت پرست دشمنی گزیدہ بی کم و کاست [illegible]

واثبات وابطال گزارده آمد" (دبستان المذاہب مطبوعہ بمبئی ۱۲۹۲ھ ص ۲)

اسی طرح تعلیم نخست در معرفت عقائد پارسیاں کے خاتمہ پر لکھتا ہے :-

" این مرت تفصیل عقائد پارسیان کہ در آغاز نامہ نوید گزارش آن داده بود، دریں بیان

اصلا سخنے کہ جز از کتاب این گروه و زبان این فرقہ شنیده شد نبود و نیاورد زیرا کہ بایستی

باشد کہ دشمن از مخاصمت بر ایشان بندد " (ایضاً ص ۱۰۵)

اس کے ساتھ یہ کتاب سولہویں صدی عیسوی کے ہندوستان کے مذہبی رجحانات اور فکری

تحریکات کا بڑا قابل اعتماد ماخذ ہے، بدایونی نے بھی اپنے عہد کے الحاد و بیدینی کا نقشہ کھینچا ہے،

مگر ان کا بیان محض ایک متاثر شخص کی شکوہ طرازی کی حیثیت رکھتا ہے، مثلاً جلد دوم میں لکھتے ہیں :-

" بہ بحثے چند از ہندوان و مسلمانان ہند دمزاج قدح صریح بر نبوت می کردند"

(منتخب التواریخ جلد دوم ص ۲۱۵)

اسی طرح اسی جلد میں دین الٰہی کے پیرووں کا شکوہ ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

" در ہر رکنے از ارکان دین و ہر عقیدہ از عقائد اسلامیہ چہ از اصول و چہ فروع مثلاً

نبوت و کلام و رویت و تکلیف و تکوین و حشر شبہات گوناگوں بہ تمسخر و استہزا آوردہ"

(ایضاً ص ۳۰۷)

خود ملا صاحب کو اپنے مذہبی تعصب اور دینی تصلب کا احساس تھا، چنانچہ جلد سوم کے

خاتمہ پر فرمایا ہے :-

" آفرین و نفرین من ہمہ بدستور شرع مبین و مدح و ذم بتقریب تعصب در دین است"

(جلد سوم ص ۳۹۱)

جو کچھ بدایونی نے لکھا ہے صاحب دبستان المذاہب نے بھی اس کی حرف بحرف تائید کی ہے

کہ واقعات کے ایک غیر جانبدار تماشائی کی حیثیت سے اور یہی غیر جانبداری اس کتاب کی تاریخی افادیت کی ضامن ہے۔

لیکن یہ بات بھی انتہائی افسوسناک ہے کہ جس مصنف نے اس عظیم تاریخی خدمت کو انجام دیا خود تاریخ نے اس کی کوئی خدمت نہیں کی حتیٰ کہ اس کا نام بھی بھلا دیا، اور اس کے زندگی بھر کے سرمایہ کو دوسروں کے نام منسوب کر دیا، عرصہ تک یہ کتاب محسن فانی کی تصنیف سمجھی جاتی رہی، حالانکہ اصل مصنف میر ذوالفقار علی الحسینی الاردستانی المتخلص بہ موبد ہے۔ اس غلط فہمی کا باعث غالباً یہ ہوا کہ اس کتاب کے دو قلمی نسخوں میں (جن میں سے ایک بمبئی میں ملا فیروز کی ملکیت میں تھا اور دوسرا شاہان اودھ کے کتب خانے میں) حمد و نعت کے بعد حسب ذیل رباعی

عالم چو کتابیست پُر از دانش و داد　　　صحاف قضا و جلد او بد و معاد
شیرازہ شریعت و مذاہب اوراق　　　امت ہمہ شاگرد و پیمبر استاد

سے قبل یہ الفاظ درج ہیں: "محسن فانی گوید" چنانچہ اس کتاب کے انگریزی ترجمہ کا مقدمہ نگار انتھونی ٹرائر (Anthony Troyer) اپنے مقدمہ میں لکھتا ہے:-

As the two copies mentioned (the one found in Bombay, the other in Lucknow) contain the same words, they can hardly be taken for an accidental addition of the copyist. (مقدمہ انگریزی ترجمہ ص ۱۳)

دونوں نسخوں میں (جو ایک بمبئی اور دوسرا لکھنؤ میں ہے) الفاظ ایک ہی ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ اس کو ایک کاتب نے اتفاقی طور سے اضافہ نہیں کیا ہے (مقدمہ انگریزی ترجمہ ص ۱۱-۱۲)

حالانکہ [illegible] اس حوالے سے خالی ہیں، لیکن اگر بالفرض ایسا ہو بھی تو اس سے [illegible]

فیصلہ نہیں ہوسکتا، تو خود مصنف نے کتاب میں اکثر شاہیر شعراء ماضی و حال کے اشعار دیے ہیں کہیں انکے نام کی تصریح کے ساتھ اور کہیں بغیر تصریح کے۔ بہرحال اگر وہ رباعی محسن فانی ہی کی ہے تو اس کے نام کی تصریح سے اس کتاب کا محسن فانی کی تصنیف ہونا کسی طرح ثابت نہیں ہوتا، جبکہ شواہد اس کے خلاف ہیں، خارجی شواہد کے علاوہ داخلی قرائن سے بھی اس انتساب کی تردید ہوتی ہے۔

مستشرقین جن کا عام رجحان اس جانب ہے کہ دبستان المذاہب محسن فانی کی تصنیف ہے، ان کے سامنے ایک دشواری بھی تھی، وہ یہ کہ خود کتاب کے اندر موبد سروش کے تذکرہ میں ایک روایت محسن فانی سے نقل کی گئی ہے:-

"از محمد محسن نام فاضلے شنیدہ شد کہ گفت من از وسی صد وشصت دلیل اثبات واجب شنیدم چوں خواستم بتحریر آدرم میسر نگشت" (دبستان المذاہب ص ۳۴)

ظاہر ہے اگر کتاب کا مصنف خود محسن فانی ہوتا تو اس روایت کو محسن فانی سے سننے کے کیا معنی؟ بہرحال اس دشواری اور تعارض کو رفع کرنے کے لیے مستشرقین نے ایک ضعیف مفروضہ قائم کیا اور وہ مفروضہ یہ ہے کہ اس ایک زمانہ میں محسن نام اور فانی تخلص رکھنے والے ایک سے زیادہ فضلاء تھے، جن میں سے ایک دبستان المذاہب کا مصنف تھا، چنانچہ مذکورۃ الصدر مستشرق لکھتا ہے:-

Nor can it be considered strange to admit that the name of Mohsin fani was borne by more than one individual. (مقدمہ انگریزی کا ترجمہ ص ۱۷

اس کا اعتراف کرنا تعجب انگیز نہیں بتایا جاسکتا ہے کہ محسن فانی کا نام ایک سے زیادہ افراد کا تھا (مقدمہ انگریزی ترجمہ ص ۱۷)

اس میں شبہ نہیں کہ دنیا میں اتفاقات ہوا کرتے ہیں لیکن وہ قانون سے زیادہ شندوذ تا در

کی حیثیت رکھتے ہیں، اور گو ایک اتفاق کو تسلیم کیا جاسکتا ہے، مگر جب ایک اتفاق کے ساتھ دوسرا اتفاق بھی ضم ہو جاتا ہے تو پھر اسے تاریخ سے زیادہ افسانہ طرازی کا موضوع بننے لائق خیال ہو جاتا ہے، اور اتفاقات کی کثرت ان کے انکار کی مؤید ہو جاتی ہے، بہرحال یہ مفروضہ ناقابل تسلیم ہے کہ محسن نام اور فانی تخلص کے ایک سے زیادہ فضلا، دبستان المذاہب کے زمانۂ تصنیف میں موجود تھے، تاہم اسے اگر ایک مفروضہ کی حیثیت سے وقعت دی بھی جائے تو مشکل یہ ہے کہ اس عہد کے جتنے تذکرے اور تاریخیں ہیں وہ صرف ایک ہی محسن فانی کا ذکر کرتے ہیں اور ان کی بیان کردہ تفاصیل تقریباً ایک ہی ہیں، آئندہ سطور اس کے باور کرنے کے لیے کافی ہوں گی کہ اس زمانہ میں محسن فانی ایک ہی فاضل جلیل کا نام تھا، اور وہ یقیناً دبستان المذاہب کا مصنف نہیں تھا، میرے اس خیال کی دو وجہیں ہیں:-

۱- خارجی شواہد: محسن فانی کا تذکرہ لچھمی نرائن شفیق نے گل رعنا میں بڑی تفصیل سے کیا ہے اور ان کی زندگی اور فضل و کمال کے حالات بڑی عقیدتمندی اور تفصیل سے بیان کیے ہیں، وہ لکھتا ہے کہ محسن فانی ایک عالم فاضل اور معزز شاعر تھے، اور ملا یعقوب صرفی کشمیری کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے، علوم و فنون کی تکمیل کے بعد دلی شاہجہاں کے دربار میں پہنچے، شاہجہاں نے ان کے علمی کمالات کی بنا پر انھیں الہ آباد کا صدر مقرر کیا، یہاں پہنچ کر انھوں نے شیخ محب اللہ الہ آبادی کے ہاتھ پر بیعت کی، ملا محسن ایک عرصہ تک اسی عہدے پر فائز رہے، یہاں تک کہ شاہ جہاں نے بلخ پر چڑھائی کر کے اس پر قبضہ کرلیا، نذر محمد خاں والی بلخ تو فرار ہوگیا، لیکن اس کی ساری جائداد جس میں ایک کتب خانہ بھی تھا شاہجہاں کے ہاتھ آئی، اتفاق سے اس کتب خانہ میں محسن فانی کا ایک دیوان ملا جس میں ایک مدحیہ قصیدہ نذر محمد خاں کی شان میں تھا، اس چیز نے شاہجہاں کے آتش غضب کو بھڑکا دیا، اس نے محسن فانی کو ملازمت سے برطرف کر دیا، لیکن گزر اوقات کے لیے ایک معقول وظیفہ مقرر کردیا، اس کے بعد وہ اپنے وطن کشمیر واپس چلے گئے، اور بقیہ زندگی وہیں عزت و احترام کے ساتھ گزاری، کشمیر

کے اعیان دار یہ حتیٰ کہ صوبیدار بھی ان سے ملاقات کے لیے ان کے در دولت پر حاضری دیتے تھے، وہ خود اپنے مکان پر درس دیا کرتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ پہلے کسی مشہور مصنف کی چند عبارتوں کو پڑھ کر سناتے تھے، اس کے بعد اس کی اخلاقی اور فلسفیانہ تشریح کرتے تھے۔ ان کی درسگاہ سے کئی باکمال فضلاء نکلے جن میں طاہر غنی اور حاجی اسلم سالم خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

قدرت اللہ گوپاموی نے اپنے تذکرہ نتائج الافکار میں تقریباً یہی حالات بیان کیے ہیں:۔

"گنجینۂ فنون نکتہ دانی شیخ محمد محسن فانی کہ از اعیان کشمیر است و در فضل وکمال بے نظیر تحصیل علوم وفنون از ملا یعقوب صرفی کشمیری نمود وطریق اصناف نظم بخوش تلاشی می پیمود۔ دیگر بہر ذاتی وصفاتی مستعد بارگاہ شاہجہاں گشتہ بخدمت صدارت صوبہ الہ آباد چہرہ اعتبار افروخت وبحسن خلق وسجیہ مرضیہ در ان دیار مرجع خاص وعام گردید وخرقۂ خلافت از مولانا شیخ محب اللہ الہ آبادی پوشید۔ آخر بہ جہتے از منصب وخدمت بپایۂ عزل در آمدہ و از مراحم پادشاہی بتقرر سالانہ معقول کامیاب شدہ بکشمیر رفت ودر انجا بہ نہایت عزت و احترام بسر می برد۔ حاکم صوبہ اکابر شہر بملاقاتش می رفتند۔ اوقات گرامی پیوستہ بشغل درس وتدریس مامور میداشت واز علو تدریس او اکثرے از اہل کمال مثل ملا محمد طاہر غنی وحاجی اسلم سالم علم شہرت برافراختند" (تذکرہ نتائج الافکار ص ۵۸۱ - ۵۸۲)

اسی طرح مسٹر طامس ولیم بیل رقمطراز ہیں:۔

شیخ محمد محسن فانی از اکابر کشمیر و عالمے فاضل وصاحب جاہ وپاکیزہ روزگار وخوش صحبت بود، چندے در صوبہ الہ آباد خدمت صدارت داشت وصاحبقران ثانی توجہ تمام بحالش مرعی میفرمود، ہرگاہ فتح بلخ بدست سلطان مرادبخش اتفاق افتاد ندر محمد خان کہ تخت نشین آنجا بود بگریخت واموال وے ضبط شد، در کتب خانہ اش دیوان شیخ محسن

خشتی بہ مرح خان مذکور یافتہ ۔ سلطان سوزاد نظر پادشاہ افتادہ بہ منصب شد و از دو حیث صدارت معزول گردید المسالیانہ فراخور حالش مقرر گشت . بعد از ان تا آخر عمر در کشمیر بتیار بہ امور دیں و دنیا و دو اشتغال داشتہ ۔ دیوانے ترتیب دادہ مثنویہا خوب گفتہ ۔" (مفتاح التواریخ ص ۲۷۰)

لیکن ان تذکرہ نگاروں میں سے کسی نے بھی محسن فانی کو دبستان المذاہب کا مصنف نہیں بتایا ۔

دبستان المذاہب کوئی معمولی تصنیف نہیں ، اس کی بڑی اہمیت ہے ، نہ صرف آج بلکہ خود شفیق کے زمانے میں بھی تھی ، کیونکہ آج تو ہم عہد اکبری کے مذہبی و فکری رجحانات کے لیے بدایونی کی منتخب التواریخ کو بھی اپنا ماخذ بنا لیتے ہیں ، لیکن اس زمانہ میں یہ کام صرف دبستان المذاہب سے لیا جاتا تھا ، اس لیے اس کتاب کے ترک ذکر کو کسی اتفاق پر محمول نہیں کیا جا سکتا ، اگر دبستان المذاہب محسن فانی کی تصنیف ہوتی تو یقیناً شفیق گل رعنا میں اسکا ذکر کرتے یا کم از کم دوسرے تذکرہ نگاروں کے یہاں اسکی تصریح ملتی ۔

ب ۔ داخلی قرائن : محسن فانی کی زندگی کے جو حالات تاریخ و تراجم کی کتابوں میں ملتے ہیں وہ کسی صورت سے ان حالات کے ساتھ منطبق نہیں ہوتے ، جو خود مصنف دبستان نے اپنے بارے میں اس کتاب میں لکھے ہیں ۔ اس کی پوری تفصیل باعث تطویل ہوگی ، اس لیے صرف چند واقعات کا تقابلی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے ،

۱ ۔ مصنف دبستان لکھتا ہے کہ وہ سنہ ۱۰۳۳ھ میں صغر سنی کے عالم میں اپنے اعزا و احباب کے ہمراہ بنارس میں گسائیں چترروپ کی خدمت میں پہنچا تھا :۔

"گر د آورندہ نامہ بسال ہزار و سی و سہ ہجری یکی از چند دوستان و خویشان بسوئے دار الخلافہ اکبر آباد آمدہ در صغر سنی بود ۔ مو بہ مو نہاد کہ شمۂ از اوصاف جبیدہ او گذارندہ در آغوش خویش گرفتہ و چترروپ بود ۔" (دبستان المذاہب ص ۱۴۲)

یعنی سنہ ۱۰۳۳ھ میں وہ اتنا کمسن تھا کہ اس کا ایک سرپرست اسے گود میں لے کر چترروپ برہمن کے

پاس لے گیا، غالباً اسی بنا پر مستشرقین آس کا سال ولادت ۱۰۲۵ھ کے قریب قرار دیتے ہیں، لیکن تذکرہ
نگاروں کی دی ہوئی تفصیلات سے پتہ چلتا ہے کہ محسن فانی کم از کم ۱۰۰۳ھ میں سن شعور کو پہنچ چکے تھے۔
کیونکہ وہ ملا یعقوب صرفی کشمیری کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے، اور ملا موصوف کی وفات حسب تصریح
بدایونی ۱۰۰۳ھ میں واقع ہوئی۔

۲۔ مصنف دبستان نے گسائیں ترلوچن کے اوصاف و کمالات کے ذیل میں ظفر خاں صوبیدار
کشمیر کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

"احسن اللہ خاں مخاطب بہ ظفر خاں ابن خواجہ ابوالحسن تربتی کہ حاکم کشمیر بود بتوسط محرمانِ
حرم خودش کہ با گسائیں کمال ربط داشتند آشنا شد۔ التماس نمود کہ بر تبتیان فیروزی یابد
ترلوچن گفت تسخیر تبت توان کرد اگر بموجب فرمودہ عمل نمائی ظفر خاں پذیرفت۔ عہد و
پیمان را از جانبین استوار کردند۔ ترلوچن فرمود جمعے از لولیان را تعین کن کہ پیوستہ از من
جدا نشوند چہ در کیش من با لولی آمیزش ستودہ تر از زنان دیگر است لاجرم ایشان را
دیوکنیان گویند یعنی دختر فرشتگان۔ و از شراب و مسکرات دیگر بزم ما تہی نباشد و گوسفند
نخست برائے ما کشند حوائج و مصالح اطعمہ آمادہ باشد۔ ظفر خاں بدانچہ گسائیں فرمود
عمل نمود۔ چون بہ تبت لشکر کشید فیروز گشت و مظفر باز آمد۔ انجام میان گوسائیں و ظفر خان
پائے رنجش بہ میان آمد۔ گوسائیں از دست ظفر خان برون رفت۔ مقارن بدین ظفر خان
بنا بر نزاع سنی و شیعہ کشمیر سبک شد۔ چون معزولش کردند بہ کابل رفت محمد طاہر نامی
از خویشانش در بیت الخلاء چند خنجر جان فرسا بدو زد۔ و تا مدتہا بدان بیمار بود و ہم دران
زودی منصب و جاگیرش تغیر یافتہ۔ بسا ہنگام در لاہور بے منصب بود۔ نامہ نگار در ہزار و
پنجاہ و پنج ترلوچن را در گجرات من اعمال پنجاب دید گفت از رنجش من آن ہمہ آسیب

لیڈروں میں ہیں، انہوں نے اس راہ میں ان کی بڑی خدمات ہیں، مگر ابھی انجمن ترقی اردو ہند کی رائے نہیں معلوم ہوسکی جس کا سب سے زیادہ مستحق تھا، یہ تحریک تو درحقیقت اسی کی جانب سے ہونی چاہیے تھی، لیکن اگر کسی سبب سے نہیں ہوسکی تو تائید کی توقع تو اس سے بہرحال ہے[1]، جامعہ والوں کا ردعمل بھی نہیں معلوم ہوا، اس میں شبہ نہیں کہ اس سلسلہ میں بعض دشواریاں بھی ہیں، مگر کوئی ایسی دشواری نہیں ہے جس پر قابو نہ حاصل کیا جاسکے۔

اس تجویز کے سلسلہ میں یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ آئندہ چل کر ہندوستان کی تمام اہم زبانوں کی یونیورسٹیاں قائم ہو جائیں گی، گو اردو کا وطن قریب قریب سارا ہندوستان ہے، دہلی، اترپردیش اور بہار اس کے خاص مرکز ہیں، لیکن یہ اس کی بدقسمتی ہے کہ اس کا کہیں ٹھکانا نہیں جہاں اس کو وہی سہولتیں حاصل ہوں جو دوسری زبانوں کو حاصل ہیں، اس کو وہی صوبے پناہ دے سکتے تھے، دہلی اور اترپردیش، اترپردیش کا حال ظاہر ہے، لے دے کے ایک دہلی رہ جاتا ہے، جو مرکز ہونے کی وجہ سے اردو دشمن صوبائی حکومتوں کی دسترس سے باہر ہے، اس لیے اگر اس کو یہاں بھی پناہ نہ ملی تو اس کا ٹھکانا کہاں ہوگا۔

جامعہ پر کئی حیثیتوں سے اس کی ذمہ داری ہوتی ہے، ایک تو وہ اردو کے سب سے قدیم اور اہم مرکز اور ہندوستان کے پایۂ تخت میں ہے، دوسرے اس کو اردو کے ساتھ ہمیشہ سے ایک خاص خصوصیت رہی ہے، ان سب سے بڑھ کر اس کے پاس ہر قسم کے ذرائع ہیں، اور بظاہر جس راہ میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں ہے، اور اگر کوئی رکاوٹ ہو تو اس کو ظاہر کرنا چاہیے، ہمارے خیال میں اردو یونیورسٹی کے قیام کا اس سے بہتر موقع نہیں مل سکتا، دیکھنا یہ ہے کہ جامعہ اس معاملہ میں کہاں تک ہمت سے پوری اترتی ہے، جامعہ کے اردو یونیورسٹی بن جانے سے پہلے ہی اردو کے تحفظ و بقا کا کچھ نہ کچھ سامان ضرور ہو جائے گا، اور خود جامعہ کا نام اردو کی تاریخ میں ہمیشہ کے لیے زندہ ہو جائے گا۔

---

[1] کاپی چھپنے کے بعد انجمن کی رائے بھی معلوم ہوگئی جو معارف کی تائید میں ہے۔

دوسرے عام یونیورسٹیوں کی طرح اس کے محض ایک یونیورسٹی بنجانے سے اس کا امتیازی وصف کیاں باقی
رہے گا یہ بھی شبہ ہے کہ دلی میں ایک یونیورسٹی کی موجودگی میں دوسری یونیورسٹی کہاں تک چل سکے گی
اس لیے اس حیثیت سے بھی اس مسئلہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد یہاں کی عمومی تعلیم میں ضرور ترقی ہوگئی ہے، مگر عام شکایت یہ ہے کہ علمی اور تعلیمی معیار بہت گرگیا ہے جس کا ثبوت ہر شعبہ میں ملتا ہے، آجکل کے گریجویٹ پرانے میٹرک کے مقابلہ میں بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتے، اور اپنی مادری زبان تک کی دو چار سطریں صحیح نہیں لکھ سکتے، ان کے عام معلومات کا جو حال ہے وہ پبلک سروس کمیشن کے سوالات کے جوابات سے معلوم ہوتا رہتا ہے طلبہ کی تربیت اور اخلاقی حالت کے ثبوت کے لیے ان کے آئے دن کے ہنگامے کافی ہیں، پہلے یونیورسٹیاں علم و فن کے ایسے اساطین کو اعزازی ڈگریاں دیتی تھیں، جن کی ذات پر خود ڈگریوں کو فخر ہوتا تھا، اور اب وہ بھی سرکاری خطابات کی طرح وزراء، عمال حکومت اور دوسرے اصحاب جاہ و اقتدار کی دنیاوی وجاہت کی سند اور ان کی خوشنودی کے حصول کا ذریعہ بن گئی ہیں،

یہی حال ہندوستان کی سب سے بڑی علمی مجلس ساہتیہ اکیڈمی کے انعامات کا ہے، اس انعام کا مقصد تو یہ ہے کہ جس کتاب کو انعام دیا جائے وہ اپنے موضوع پر سند کا حکم رکھتی ہو، دوسری زبانوں کا تو حال معلوم نہیں، مگر اردو کی ایسی کتابوں کو بھی انعام ملے ہیں جو کسی حیثیت سے بھی اس کی مستحق نہیں تھیں، اس کے اسباب جو بھی ہوں لیکن اس سے ساہتیہ اکیڈمی کا معیار گرتا ہے، اس علمی و تعلیمی انحطاط کا نتیجہ یہ ہے کہ غلامی کے دور کی تعلیم میں ہندوستان میں ہر علم و فن کے جیسے جیسے ماہرین اور اصحاب کمال پیدا ہوئے، اب ان کی قطعی امید نہیں۔

بظفرخان رسید۔ (دبستان المذاہب ص ۱۵۱)

مفتاح التواریخ میں لکھا ہے کہ اسی ظفرخاں اور محسن فانی کے درمیان ایک طوائف کے بارے میں بدمزگی پیدا ہوگئی تھی جس نے دونوں جانب سے تلخ نوائی کی شکل اختیار کرلی، وہ طوائف محسن فانی کی منظور نظر تھی، ظفرخاں نے اپنے جاہ و مال کے ذریعہ اس کو اپنی جانب مائل کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن اس کو کامیابی نہیں ہوئی

"گویند شیخ را با یکے از لولیہائے کشمیر کہ بچی نام داشت و در غایت رعنائی و نہایت حسن و جمال بود دلبستگی تمام بود۔ اتفاقاً بہ دراں ایام ظفرخان ناظم صوبہ کشمیر نیز باوے تعلق خاطر پیدا کرد و ہر چند او را بنقد و جنس فریب داد خاطرش بجانب خود مائل نیافت۔ آخر غزلے در ہجو بچی و شیخ محسن گفتہ شہرت داد۔" (مفتاح التواریخ ص ۲۷۵)

لیکن دبستان المذاہب کا مصنف جس گروہ سے تعلق رکھتا تھا، ان کے یہاں اس قسم کی آلودگی ممنوع تھی، صاحب دبستان خواہ آذر ہوشنگی ہو یا نہ ہو صرف اس فرقہ سے متاثر ہی رہا ہو، وہ کم از کم عورت کے معاملے میں اس گروہ کا تبع تھا، لہذا وہ محسن فانی نہیں ہو سکتا۔

۳۔ مصنف دبستان نے اپنی زندگی کے اہم واقعات کا بقید سنین دبستان المذاہب میں حوالہ دیا ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ۱۰۴۰ھ سے ۱۰۵۰ھ تک کشمیر اور لاہور میں تھا، ۱۰۵۳ھ میں لاہور سے کابل ہوتا ہوا مشہد پہنچتا ہے۔ ۱۰۵۴ھ میں وہاں سے واپس ہو کر پھر ملتان آیا، اس کے بعد مختلف اضلاع اور دیگر اقطاع ہند میں سیر و سیاحت کرتا ہے لیکن پوری کتاب میں کہیں بھی اس نے الہ آباد میں قیام پذیر ہونے کا ذکر نہیں کیا، البتہ ہندوؤں کی تیرتھ کے سلسلے میں ایک موقع پر الہ آباد کا ذکر ضرور کیا ہے:

"و تیرتھ جلی نزد گواہ رواگویند مثلاً پریاگ کہ اکنوں مشہور بہ الہ آباد است شہاب الدین پور است۔" (دبستان ص ۱۵۴)

اس لیے اگر اس کا مصنف محسن فانی ہوتا تو ناممکن تھا کہ اس موقع پر اپنے منصب صدارت کے زمانے میں الہ آباد میں اپنے قیام کا ذکر کیے بغیر گذر جاتے۔ بالخصوص جب کہ اسی شہر میں اپنے پیر و مرشد شیخ محب اللہ الہ آبادی کے ہاتھوں خرقۂ خلافت زیب تن کیا تھا۔

۴۔ محسن فانی کے تذکرے سے جس کے اقتباسات اوپر پیش کیے گئے، پتہ چلتا ہے کہ بلخ کی تسخیر کے بعد جب محسن فانی منصب صدارت سے معزول کر دیے گئے تو اپنے وطن کشمیر واپس لوٹ گئے، اس کے بعد زندگی کے آخری لمحے تک کشمیر سے باہر قدم نہیں نکالا اور چونکہ بلخ کی تسخیر حسب تصریح عبد الحمید لاہوری مصنف بادشاہ نامہ سنہ ۱۰۵۶ھ میں عمل میں آئی، اس لیے اسی سال محسن فانی کشمیر واپس گئے ہوں گے، لیکن دبستان المذاہب کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ مصنف دبستان سنہ ۱۰۵۶ھ سے قبل کشمیر ترک کر چکا تھا، سنہ ۱۰۵۵ھ میں وہ حیدر آباد اور سورت میں نظر آتا ہے، اس کے بعد سنہ ۱۰۵۹ھ اور سنہ ۱۰۶۳ھ میں وہ صوبہ اڑیسہ کے شہر سریکاکل میں ملتا ہے، اسلیے دبستان المذاہب محسن فانی کی تصنیف نہیں ہو سکتی،

غرض خارجی شواہد اور داخلی قرائن کے پیش نظر اس بات میں کوئی شک نہیں رہتا کہ دبستان المذاہب محسن فانی کی تصنیف نہیں ہے۔ اس کے برخلاف ایجابی طور پر ثابت ہے کہ یہ کتاب میر ذوالفقار علی الحسینی الاردستانی کی تصنیف ہے۔ چنانچہ مسٹر ارسکائن (Erskine) نے بمبئی میں ملا فیروز پارسی کے کتب خانہ میں اس کتاب کا جو قلمی نسخہ دیکھا تھا اس میں چودھویں باب کے خاتمہ میں حاشیہ پر ایک عبارت تھی جس میں میر ذوالفقار علی الحسینی کا تذکرہ تھا۔ ملا فیروز کی رائے تھی کہ یہی ذوالفقار علی دبستان المذاہب کا مصنف ہے لیکن فاضل مستشرق اس شہادت سے مطمئن نہیں ہوا، چنانچہ اس نے لکھا:-

On so slight an authority, I would not willingly set up on an unknown author as the compiler of that work (مقدمہ ترجمہ انگریزی ص ۱۰)

اس کمزور شہادت پر یقین کرنے کے لیے میں تیار نہیں ہوں کہ اسکا مصنف کوئی نامعلوم مصنف ہے۔

ظاہر ہے کہ محض ایک حاشیہ کی عبارت پر اعتماد کر کے ایک مجہول الحال شخص کیجانب کسی کتاب کا انتساب صحیح نہیں ہو سکتا جب تک کسی اور ذریعہ سے اس کی تصدیق نہ ہو جائے، اس لیے اس نے ملا فیروز کی رائے سے اتفاق نہیں کیا، اس کے بعد برٹش میوزیم کے فارسی مخطوطات کے فہرست نگار ڈاکٹر ریو کے سامنے پانچ قلمی نسخے تھے، جن میں سے ایک ناقص تھا، دوسرے میں اس کتاب کو شیخ محسن فانی کشمیری کی تصنیف بتایا گیا تھا، تیسرے اور چوتھے نسخوں میں یہ عبارت تھی :-

"دبستان من تصنیف محمد دین نامہ نگار "

لیکن پانچویں نسخے میں اسے "میرزا ذو الفقار علی الحسینی المتخلص بہ موبد شاہ" کی تصنیف قرار دیا گیا تھا، اسلیے اگرچہ ڈاکٹر ریو نے اس سلسلے میں کوئی قطعی رائے نہیں دی ہے لیکن ملا فیروز والے نسخے کے حاشیہ کی عبارت پر اعتماد کرتے ہوئے موخر الذکر نام یعنی ذو الفقار علی الحسینی ہی کو ترجیح دی، چنانچہ وہ لکھتا ہے :-

The same name appeared as stated by Erskine, in marginal note of a copy belonging To Malla Feruz of Bombay. (فہرست فارسی مخطوطات برٹش میوزیم جلد اول ص ۱۴۳)

اس نسخے کے نام کا ذکر ولیم ارسکن نے اپنی حواشی میں کیا ہے، جو بمبئی کے ملا فیروز کا ہے۔

حالانکہ اگر مسٹر ارسکائن اور ڈاکٹر ریو، مستند کتب تواریخ و تراجم کی ورق گردانی کرتے تو انھیں ایسے ماخذ بھی مل جاتے جو ایک حاشیہ (marginal note) سے زیادہ وقیع اور مستند ہیں، مثلاً مآثر الامراء[1] مصنفہ شاہنواز خاں جو اگرچہ مغل دربار کے امراء کی تذکرہ ہے، پھر بھی اس میں عہد اکبری کے سرکاری الحاد

---

[1] شاہنواز خاں نے اسے ۱۱۵۵ھ میں لکھنا شروع کیا تھا جیسا کہ مقدمہ میں لکھتے ہیں :-

"تا آنکہ اندیشہ گل قصیدہ دیو بجمی ردیف در سنہ ۱۱۵۵ھ یکہزار و یک صد و پنجاہ و پنج عزلت

دامن در دامن رنگ داد کہ بظاہر آلبتن ہزاراں تشویش و خلش توہم می شد لیکن دل بچیزے دادن

(باقی حاشیہ ص ۱۶۷ پر)

تعین بانی) کی تفصیل اسی دبستان المذاہب کے حوالے سے مرقوم ہے۔

مآثر الامراء کوئی معمولی تصنیف نہیں ہے، اس کی بڑی اہمیت ہے، کیونکہ مصنف نے اس کی تالیف کے وقت بہت سے قابل وثوق اور مستند مصادر کو پیش نظر رکھا تھا اور بعض سنی سنائی روایتوں کو نقل کرنے سے احتیاط برتی تھی، جیسا کہ اس کی تمہید میں لکھا ہے:-

"اگرچہ دریں وقت کتابے موسوم بہ ذخیرۃ الخوانین تصنیف شیخ معروف عکبری متضمن احوال امراء بنظر رسید و اکثر مطالب آن ضمیمۂ این نسخہ گردید لیکن چون بنائے آن بر اخبار سماعی مخالف تحقیق اہل این فن بود و ماخذ این نسخہ کتب معتبرہ ثقات است رجحانے بدیہی و مزیتے ظاہر بر آن متحقق و ثابت گشت" (مآثر الامراء جلد اول ص ۸)

۱۱۷۱ھ میں مصنف کی شہادت کے بعد اس کا گھر بار لوٹ لیا گیا اور اسی ہنگامہ میں اس کا مسودہ بھی ضائع ہو گیا تھا، میر غلام علی آزاد بلگرامی کو اس بے نظیر کارنامہ کے ضائع ہونے کا بڑا افسوس تھا، چنانچہ وہ ایک عرصہ تک اس کی تلاش میں سرگرداں رہے، بالآخر کامل ایک سال کے بعد اس کے اجزاء دستیاب ہوئے تو انھوں نے اس پر نظر ثانی کر کے اس کو پھر سے مرتب کیا، چنانچہ خود آزاد بلگرامی رقمطراز ہیں:-

"بعد یک سال کامل از شہادت مصنف علیہ الرحمہ سررشتۂ تفحص بجائے رسید و اوراق گم گشتہ

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶۸) آسودگی و آسایش بود، این فرصت غیر متصور و فراغ نامترقب را مغتنم پنداشتہ" (مآثر الامراء ج ۱ ص)

اور ۱۱۹۶ھ سے قبل اس کام سے فارغ ہو گئے تھے، چنانچہ مولانا آزاد بلگرامی فرماتے ہیں:

"مدت پنج سال اوقات بریں منوال گذرانید"

اس شہادت کے بعد ان حضرات کی رائے کا کوئی وزن باقی نہیں رہتا جن کا دعویٰ ہے کہ مآثر الامراء دبستان المذاہب کے ایک سو بیس برس بعد لکھی گئی۔

"چہرہ پیدائی وانمود، طرفہ شگفتگی بہم رسید وعجب انشراحے دست داد، فی الفور بتسوید پیشین بتہذیب و تبییض ایں مسودۂ بہ شکست و اوراق پریشاں راشیرازۂ جمعیت بربست" (مآثر الامرا جلد اول، ص۱۴)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا آزاد بلگرامی جیسے محقق کی نظروں میں اس بلند پایہ تصنیف کی کس قدر وقعت تھی، اور انھوں نے کتنی دیدہ ریزی کرکے اس گوہر شب چراغ کو گردشِ زمانہ کے ہاتھوں ضائع ہونے سے بچایا۔

خوش قسمتی سے شاہنواز خاں نے دبستان المذاہب کا مصنف میرزو ذوالفقار علی اردستانی کو بتایا ہے، چنانچہ دین الٰہی کے بارے میں لکھا ہے:-

"و برخے احکام و مسائل ایں مذہب ذوالفقار اردستانی موبد تخلص در دبستان خود (کہ حاوی اکثر اعتقادات فرق ہنود و مجوس و مذاہب مروجہ اہل اسلام است) آوردہ" (مآثر الامرا، جلد دوم ص ۳۹۲)

یہاں یہ شک پیدا کیا جاسکتا ہے (جس طرح محسن فانی کے بارے میں کہا گیا کہ اس نام کے ایک سے زیادہ شخص رہے ہوں گے) شاید دبستان المذاہب نام کی ایک سے زیادہ کتابیں رہی ہوں گی، جن میں سے ایک ذوالفقار اردستانی کی رہی ہوگی جو ممکن ہے محسن فانی کی دبستان المذاہب سے مختلف ہو، مگر یہ شک بے بنیاد ہے، کیونکہ شاہنواز خاں نے اکثر اسی کے حوالے سے دین الٰہی کے بارے میں بعض واقعات نقل کیے ہیں جو تقابلی مطالعہ کے بعد حرف بحرف موجودہ دبستان المذاہب کی تصریحات کے مطابق ثابت ہوتے ہیں، مثلاً مآثر الامرا جلد دوم صفحہ ۵۰۳ پر لکھا ہے:-

"در دبستان موبدی مذکور است کہ سلطان خواجہ از الٰہیان بودیعنی بآئینے اکبر شاہی نسبت درست داشت، بہ ایں مذہب الٰہی دین موسوم شاید گردیدہ بود، ہنگام سفر واپسیں بپادشاہ وصیت نمود کہ مرا بے رعایت مردم دفن فرمایند، لاجرم بدستور او در قبر با چراغے درآوردہ شبکہ محاذات نیر اعظم

گذاشتند کہ فر ا د را می ماتم است۔"

یہ مضمون موجودہ دبستان المذاہب (مطبوعہ بمبئی ۱۲۹۲ھ) میں صفحہ ۲۹۰ پر مذکور ہے :-

"چون سلطان خواجہ کہ از الہیان بود در وقت تن گذاشتن گفت مرا حضرت بآئین دیو مردم دفن نفرا یند لاجرم او را در قبر با چراغ خاص و شبکہ مقابل حضرت نیر اکبر گذاشتند کہ فروغ او پاک کنندہ گناہان است۔"

نیز مآثر الامراء جلد دوم صفحہ ۳۸۹ پر مرقوم ہے :-

"در دبستان گفتہ کہ از مرزا شاہ محمد مخاطب بہ غزنین خان پسر شاہ بیگ خان خان دوران شنیدم کہ می گفت من از مرزا عزیز کوکہ پرسیدم کہ چہ میگوئید در حرف زدن عرش آشیانی جواب داد کہ والدہ می گفت حق است۔"

اور یہی موجودہ دبستان المذاہب صفحہ ۲۵۴ پر مذکور ہے :-

"از مرزا شاہ محمد مخاطب بہ غزنین خان خلف شاہ بیگ خان دوران خطاب ارغون نژاد در ہزار و پنجاہ و سہ در لاہور نامہ نگار شنید کہ گفت کہ از نواب عزیز کوکہ مخاطب بہ خان اعظم پرسیدم کہ چہ می فرمایند در حرف زدن حضرت عرش آشیانی مسیح وار با والدہ آنحضرت جواب داد کہ والدہ می گفت حق است۔"

اسی طرح مآثر الامراء جلد دوم صفحہ ۳۹۰ پر لکھا ہے :-

"در دبستان آوردہ کہ در سنہ (۹۹۰ھ) ہزارم الہیان بعرش آشیانی گفتند کہ ہزار سال ہجری تمام شد۔"

اور موجودہ دبستان المذاہب میں صفحہ ۲۶۷ پر مرقوم ہے :-

"گفتند ہزار سال کہ آغاز آن زمان بعثت و مدت بقاے این دین بود تمام شد۔"

مآثر الامراء کا مطبوعہ ایڈیشن جن نسخوں کی مدد سے مرتب ہوا تھا ان میں سے ایک نسخہ میں بجائے

ذوالفقار اردستانی کے" ذوالفقار آذرساسانی" لکھا تھا، مگر اس کے مرتبین مولوی عبدالرحیم و مولوی مرزا اشرف علی سابق مدرسین مدرسہ عالیہ کلکتہ جن کی تصحیح سے یہ کتاب شائع ہوئی تھی، انھوں نے ذوالفقار اردستانی والے نسخہ ہی کو ترجیح دی، اس لیے کہ آذرساسانی یا خاندانی نسبت ہوسکتی ہے یا مذہبی۔ پہلا احتمال ساقط ہے، اس لیے کہ ملا فیروز کے کتب خانے میں دبستان کا جو نسخہ ملا تھا اس کے حاشیہ پر صرف مرزا ذوالفقار علی الحسینی لکھا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف دبستان سادات حسینی میں سے تھا، اسکے بعد اس کے ایرانی النسل اور آذرساسانی ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، اور دوسرا احتمال بھی ساقط ہے، اس لیے کہ اولاً مجوسیوں کے فرق پانزدگانہ میں سے کوئی فرقہ آذرساسانی نہیں تھا، ثانیاً مصنف دبستان آذرکیوان اور اس کے مریدوں سے متاثر اور ان کا معتقد تھا، لہذا زیادہ سے زیادہ آذرکیوانی یا صحیح اصطلاح میں آذرہوشنگی ہوسکتا ہے، آذرساسانی نہیں

غرض نسلی و خاندانی طور پر وہ سادات حسینی میں سے تھا جس کے آباء و اجداد اردستان ایران سے آکر پٹنہ میں آباد ہوگئے تھے، اور یہیں پارسیوں کے حلقۂ عقیدت میں اس کی ابتدائی تربیت ہوئی اور جب اس کے اعزہ و اقارب اور یہ پارسی جماعت پٹنہ سے اکبرآباد منتقل ہوئی تو ان کے ساتھ مصنف دبستان (میر ذوالفقار علی اردستانی) بھی پٹنہ چھوڑنے پر مجبور ہوا، ۱۰۳۳ھ میں یہ لوگ بنارس پہنچے یہاں موبد ہوشیار جو میر ذوالفقار علی کی تربیت میں خاص طور پر دلچسپی رکھتا تھا، اسے گود میں لیکر زودیہ نام ایک برہمن مرتاض کے پاس لے گیا جس نے اسے دعائے خیر دی، اور اپنے ایک شاگرد بشن من کو اس کی ہندوانہ تعلیم و تربیت پر مامور کیا،

بہرحال مرزا ذوالفقار علی کی ابتدائی تعلیم و تربیت پارسیوں بالخصوص آذرکیوانیوں کے ہاں ہوئی، اس کے بعد اس نے ہندوانہ ماحول میں تعلیم پائی، چنانچہ خود لکھتا ہے :-

چو سال بروز نگار رنا پدید از نامہ نگار را از پارسیاں جدا نکند ہم انجمن ہمتاں صنم و

بت قبلگان پرستند و وثن ساخت لاجرم عقائد این دقیق آموزگروہ عبداللہ پارسیان

گذارده می آید۔" (دبستان ص ۱۰۷)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا ذوالفقار علی کو پارسی مذہب اور ہندو مذہب کے متعلق بڑی گہری معلومات تھیں، اور چونکہ اس نے آذرکیوانی حلقہ میں تربیت پائی تھی، اس لیے تعصب و تحزب کی وہ شدت جو اہل مذاہب میں ہوتی ہے اسے چھو بھی نہیں گئی تھی، اور چونکہ اس کا مربی موبد ہوشیار آذرکیوانی مسلک رکھتا تھا، اس لیے اس کو اس مسلک کے ساتھ بڑی عقیدت تھی لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے آبائی مذہب اسلام کو چھوڑا نہیں تھا،

میرے اس خیال کی تین وجہیں ہیں :-

اولاً یہ کہ آذرکیوانی حلقہ میں تبدیلی مذہب کی کوئی اہمیت نہیں، کیونکہ انکے حلقہ میں پارسیوں کے علاوہ ہندو مسلمان اور عیسائی و یہودی بھی تھے، چنانچہ مصنف دبستان نے اس مسلک کے مذہبی تعصب کے بارے میں لکھا ہے :-

"پس جمعے کہ در مذاہب غیریہ دانیان یعنی غیر آبادیان بودہ اند و شاگردان کیوان سلوک کردہ کامیاب شناسائی آمدہ اند بر شمردہ می آیند، ہرچند ایں گروہ ہم بیش از انند کہ تواں نگاشت و لے تنے چند سترگ باز نمودہ شوند۔" (دبستان ص ۳۹)

ان میں سے محمد علی شیرازی (جو میر فتح اللہ شیرازی کا ہمدرس رہا تھا) محمد سعید اصفہانی (جو خود مصنف دبستان کی طرح سادات حسینی میں سے تھا) عاشور بیگ قرانلو اور محمود بیگ تیمن مسلمان ہیں، موسیٰ و ہارون یہودیوں میں (جن کے بارے میں لکھا ہے "بدانشمندی کیش خود اختصاص داشتند") انتون بشوبہ وادرج عیسائیوں میں (جن کے متعلق لکھا ہے "در کیش نصاریٰ می پوئید") اور بنارس کے دانشمند برہمنوں میں سے رام بھٹ اور اسی طرح رام چند رکھتری ہندوؤں میں سے اس گروہ

کے مرید و عقیدت مند تھے، اس لیے خود مصنف دبستان کے لیے آذر کیوانی حلقہ سے عقیدت استوار کرنے میں اس کا مذہب مانع نہیں ہو سکتا تھا۔

ثانیاً: جس انداز میں اس نے حمد و نعت بالخصوص نعت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم لکھی ہے، اس سے اس کے مسلمان ہونے میں کوئی شک ہی نہیں رہتا اور اسے کسی طرح بھی اس بات پر محمول نہیں کیا جا سکتا کہ یہ دیباچہ روشِ عام کے مطابق لکھا گیا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی طور پر "درود نامحدود" بھیج کر گزر جاتا، مگر اس نے ایسا نہیں کیا، جن اجرامِ فلکی کو وہ بار بار مختلف فرقوں کے ذکر میں مختلف مذاہب کے پیرووں کا معبود بتاتا ہے اور جن کی پرستش کو وہ مختلف اقوام کی سعادت و فیروز بختی کی دلیل نقل کرتا ہے، ان ہی ثوابت و سیاروں کو وہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا خادم اور مرؤس بتاتا ہے، چنانچہ لکھتا ہے:۔

"درود نامحدود بر والا موجود خورشید سوار سپہر شہود کیوان بندہ بہرام پیشکار برجیس اختر ناہید پرستار اورنگ پیرائے کشورستان دین و دیہیم خدائے وار الملک یقین" (دبستان ص ۳)

یہ عبارت ایک عقیدت مند مسلمان ہی کے قلم سے نکل سکتی ہے، کسی ایسے پارسی کے قلم سے نہیں نکل سکتی جس کا عقیدہ ہے کہ اجرامِ فلکیہ انسان سے افضل اور اس کے واجب التعظیم مخدوم ہیں، مثلاً ستارہ زحل کے بارے میں ان کا خیال تھا:۔

"شہنشاہ و بزرگان و پرستاران وسائر یزدانیاں چوں بکیوان کدہ می رفتند با جامہائے سیاہ و کبود سخن بہ تواضع می کردند و بہ آہستگی سر در پیش افگندہ" (دبستان ص ۱۳)

لیکن یہی کیوان پیغمبرِ اسلام کا غلام ہے جیسا کہ "کیوان بندہ" ترکیب سے ظاہر ہے۔

ثالثاً: مصنف دبستان اپنی سیر و سیاحت کے دوران مشہد مقدس کی زیارت کے لیے گیا تھا، جیسا کہ وہ عقیدہ صادقیہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"محمد تقی نام مردے بود در مشہد مقدس در ہزار و پنجاہ و سہ با مستقا رفتند و حبہ از اتحاد و گفت بر مسلم واجب است کہ مسیلمہ را معجز صادق و پیغمبر دانند و گرنہ مسلم مسلم نیست۔" (دبستان ص ۳۷۱)

بلاد ایران میں سے صرف مشہد مقدس کی تخصیص سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ شیعی مسلمان تھا کیونکہ اگر وہ مجوسی ہوتا تو اسے یزد جانا چاہیے تھا یا پھر شیراز جو اس کے سرپرست موبد ہوشیار کے پیر و مرشد آذر کیوان کا مولد و منشا تھا۔

ادبی کتابوں کا سٹ

شعر العجم	اول	[illegible]	شعر الہند	اول	[illegible]
"	دوم	[illegible]	"	دوم	[illegible]
"	سوم	[illegible]	گل رعنا		[illegible]
"	چہارم	[illegible]	انتخابات شبلی		[illegible]
"	پنجم	[illegible]	اقبال کامل		[illegible]
کلیات شبلی	اردو	[illegible]	بزم تیموریہ		[illegible]
مکاتیب شبلی	اول	[illegible]	بزم مملوکیہ		[illegible]
"	دوم	[illegible]			

پورے سٹ کے خریدار کو ۱۵ فی صدی کمیشن

۱۰۰ سے ۵۰۰ روپے تک ۲۰ " "

۵۰۰ سے ۱۰۰۰ تک ۲۵ " "

۱۰۰۰ سے اوپر تک ۳۰ " "

"منیجر"

کیا حسابِ تقویم کی رو سے سنہ ہجری کے دن اور تاریخ

کا

تعین ہو سکتا ہے؟

از جناب مولانا محمد عبد الرشید صاحب نعمانی

(۲)

اس امر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہ باطنیہ فرقہ نے جو تشیع اہل بیت کا مدعی ہے، البیرونی نے قاعدۂ مذکور کو عمل میں لاکر ایک حساب پیش کیا ہے، جس کے بارے میں اس فرقہ کا دعوی ہے کہ وہ اسرار نبوت میں سے ہے، حالانکہ یہ سارا حساب اسی قاعدہ پر مبنی ہے، صاف صاف اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ رویت ہلال کے بارے میں اثبات یا نفی میں کوئی قطعی اور حتمی حکم لگانا اہل فن کی استطاعت سے خارج ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے:-

ووجدت بعض رؤسائهم	اور میں نے اس جماعت کے ایک سربرآوردہ
يضيف الجدول المجرد الذی	شخص کو دیکھا کہ اس نے مجرد اس گوشوارے کو
وضعه حبش فی زیجه لتصحيح	لیکر جو حبش نے اپنی زیچ میں اس غرض سے
مقاديره المستعمل فی حساب	مرتب کیا تھا کہ کواکب حساب میں جو تاریخ
ذلک الکواکب........................	مستعمل ہوتی ہے اس کی تصحیح کیجائے ....
واتفق منشأ لقوم موضع کتاب	اپنی قوم کے قدم بقدم چلتے ہوئے ایک کتاب
علی مذهبهم فی ابتداء الهلال	تصنیف کی جس میں رویت ہلال کے متعلق

بالرؤية وسيهم وغيرهم باستغناء
اليهود والنصارى عن طلب الهلال
للصيام وأوائل الشهور بما عندهم
من الجداول واشتغال المسلمين
بالمتشابه من الاحوال ولو جاوز
موضع الجداول المجرد من زيج
حبش حتى انتهى الى اعمال اصحاب
الهيئة في رؤية الهلال ووقف
على كيفياتها وعلى حقائق ما عليه
اليهود والنصارى لعلم ان الذي
ذهب اليه اهل الكتاب هو الشبيه
بينها وعسى الواقف على ما قدمنا
يحقق ذلك

کرنے والوں پر طعن وتشنیع کی، ان کو برا بھلا کہا
اور بتایا کہ یہود ونصاریٰ کو تو اپنے
روزوں کے لیے مہینوں کی ابتدا تاریخ
معلوم کرنے کے لیے رویت ہلال کی ضرورت
نہیں پڑتی کیونکہ ان کے پاس اس کے گوشوارے
موجود ہیں، اور اہل اسلام مشتبہ حالات
میں پڑے ہوئے ہیں لیکن اگر یہ شخص حبش کی
زیج میں اس مجرد جدول کے مقام سے آگے
بڑھ کر ذرا اس مقام تک آتا کہ جہاں رویت
ہلال کے بارے میں اصحاب ہیئت کے اعمال
کا ذکر ہے اور ان اعمال کی کیفیات پر
اور ان حقائق پر مطلع ہوتا جن پر یہود ونصاریٰ
کا عمل ہے تو اسے پتہ چلتا کہ یہود ونصاریٰ
جس طرف گئے ہیں مشتبہ دراصل وہی ہے اور
امید ہے کہ جو شخص سابق میں ہماری بیان کردہ
تفصیلات سے واقف ہوگا وہ ہماری اس بات
کی تصدیق کرے گا۔

على ان علماء الهيئة مجمعون
ان المعاد في المغ وصنعتي في اواخر

اس کے علاوہ علمائے ہیئت اس بات پر متفق
ہیں کہ جو مقداریں اعمال رویت ہلال کے

اعلان رویة الهلال او ابدادله	اور آخر میں فرمایا گیا ہیں وہ دیکھ ابلاغیہ
یوقف علیها الا بالتجربة والنظر	جن پر صرف تجربے سے واقفیت حاصل کی گئی ہے
احوال هندسیة یتفاوت ازجدیما	حالانکہ دیکھنے میں علم ہندسہ کے اعتبار سے
المحسوس بالبصر فی العظم	ایسے حالات پیش آتے رہتے ہیں کہ جن کی بناء پر
والصغر وفی الاحوال الفلکیة	جو چیز آنکھوں سے محسوس ہوتی ہے اس میں
ما اذا تاملها متأمل منصف	بڑائی اور چھوٹائی کے لحاظ سے فرق ہوتا رہتا
لم یستطع بت الحکم علی وجوب	ہے، نیز فلکی حالات میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے
رویة الهلال او امتناعها	جس کی بناء پر اگر کوئی غور کرنے والا منصف مزاج
وخاصة حین یقع قریبا من نهایة	غور و تامل سے کام لے تو رویت ہلال کے
ذلك البعد المفروض	بارے میں نفی یا اثبات میں کوئی حتمی حکم نہیں
	لگا سکتا، خاص طور پر جبکہ چاند اس بعد مفروض
(ص ۱۹۷ - ۱۹۸)	کی انتہا کے قریب ہو۔

ملاحظہ فرمائیے، یہ ہے بیرونی کی تصریح کہ کوئی صاحب فن جو انصاف سے بہرہ ور ہو اور غور و تامل سے پوری طرح کام لیتا ہو، وہ ہرگز یہ نہیں کرسکتا کہ رویت ہلال کے متعلق نفی یا اثبات میں کوئی قطعی یا حتمی حکم لگا دے"۔ بیرونی نے یہ دعویٰ علم و فضل کی روشنی میں کیا ہے، جن کے وجوہ و دلائل کی تفصیل ابھی آپ کی نظر سے گذر چکی ہے، آج ریاضی کا فن بڑی ترقی کر گیا ہے، تاہم ابھی تک بیرونی کے اس دعوے کی علمی تردید نہیں کی جا سکی، چنانچہ اب تک رویت ہلال کی کوئی ایسی صحیح تقویم دنیا کے سامنے مرتب ہو کر نہیں آئی کہ جس میں غلطی کا احتمال نہ ہو۔

ہمارا محکمۂ موسمیات جس طرح آئے دن یہاں کے موسم اور باد و باران کے متعلق پہلے سے اعلان

اعلان کر دیتا ہے اسی طرح رویتِ ہلال کے بارے میں بھی اس کی پیشین گوئیاں باقاعدہ چھپتی رہتی ہیں[1]، لیکن وہ جس محتاط انداز میں اعلان کرتا ہے وہ خود جزم و یقین کی نفی کے لیے کافی ہے، مثلاً ۱۹۷۲ء میں عید اور بقرعید کے چاند کے متعلق ہمارے محکمۂ موسمیات نے جو پیشین گوئی کی تھی، وہ ناظرین کی معلومات کے لیے روزنامہ جنگ کراچی کے الفاظ میں درج ذیل ہے:-

عید کا چاند ۱۶ر مارچ کو نظر آئیگا

"کراچی ۱۴ر مارچ (اسٹاف رپورٹر) پاکستان کے محکمۂ موسمیات نے اعلان کیا ہے کہ پورے ملک میں خاص کر مغربی پاکستان میں چاند ۱۶ر مارچ ۱۹۷۲ء کو نظر آنے کے قوی امکانات ہیں۔" (روزنامہ جنگ کراچی ۱۶ر مارچ ۱۹۷۲ء ص ۶ کالم ۱)

ذی الحجہ کا ہلال ۱۵ر یا ۱۶ر مئی کو نظر آئیگا

"کراچی ۱۰ر مئی (اسٹاف رپورٹر) ایک سرکاری ہینڈ آؤٹ میں کہا گیا ہے کہ ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ کا ہلال ۱۶ر مئی کو نظر آئیگا، تاہم ۱۵ر مئی ۱۹۶۱ء کو بھی اس کے نظر آنے کا کچھ امکان ہے جبکہ ڈھاکہ (۶ بجکر ۵ منٹ مشرقی پاکستان اسٹینڈرڈ ٹائم) اور راولپنڈی (۷ بجکر ۲ منٹ مغربی پاکستان اسٹینڈرڈ ٹائم) میں مغرب کے وقت یہ علی الترتیب ۱۲ منٹ، ۱۵ منٹ اور ۱۰ منٹ افق سے اوپر ہوگا۔"

---

[1] ان پیشین گوئیوں کی صحت و عدمِ صحت کے بارے میں ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، چونکہ ملک اس سے واقف ہے، بلکہ ساری دنیا کا عالمی ریکارڈ آپ کو بتا دے گا کہ ہر جگہ کے محکمۂ موسمیات کی پیشین گوئیوں کا اوسط فی صد کیا رہتا ہے، آپ خود بھی زحمت فرمائیں تو ہر سال محکمۂ موسمیات کی پیشین گوئیوں کا جائزہ لیکر فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان کی صحت کا اوسط فی صد کیا رہتا ہے۔

"دوسری کو یہ ہلال اس صورت میں نظر آ سکتا ہے جب غروب کے وقت افق کے
قریب ہو، سورج غروب ہونے کے مقام سے بائیں جانب تقریباً ۵ ڈگری پر دیکھنے کے امکانات
بہت اچھے ہیں۔" (روزنامہ جنگ کراچی مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۶۱ء ص ۷ کالم ۱)

ظاہر ہے موجودہ دور میں اگر علم و فن کی روشنی میں رویتِ ہلال کے بارے میں آسانی کوئی صحیح فیصلہ
حتمی اور قطعی صورت میں کیا جا سکتا تھا تو ہمارا "محکمۂ موسمیات" ہلال ذی الحجہ کے متعلق یہ تذبذبات
کیوں کرتا اور ہلال عید کی پیشین گوئی کرتے وقت "قوی امکانات" کے الفاظ کیوں استعمال کرتا،
جو جزم و یقین کے منافی ہیں۔ معلوم ہوا بات وہی ہے جو بیرونی کہتا ہے کہ "جو شخص منصف مزاج
اور محمود تامل سے کام لے وہ کبھی رویتِ ہلال کے بارے میں قطعی اور حتمی حکم نہیں لگائے گا۔" چنانچہ
ہلال عید کے بارے میں رویت کے "قوی امکانات" کا جو حشر ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔ روزنامہ انجام
کراچی کا اسٹاف رپورٹر ۱۸ مارچ ۱۹۶۱ء کے کوائف بیان کرتا ہوا لکھتا ہے:-

"محکمۂ موسمیات نے آج بھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ کل شام عید کا چاند نظر آ گیا تھا اس لیے
آج عید تھی۔ محکمہ کے بیان کے مطابق عید کا چاند دیکھنے کے لیے شہر کے مختلف علاقوں میں
رصدگاہیں قائم کی گئی تھیں، ہاؤسنگ سوسائٹی کی رصدگاہ سے اطلاع ملی تھی کہ وہاں
دوربینوں سے چاند نظر آ گیا ہے۔" (روزنامہ انجام کراچی، عید ایڈیشن ۱۹ مارچ ۱۹۶۱ء ص ۱ کالم ۲)

یہ ہے "قوی امکانات" کے بارے میں خود محکمۂ موسمیات کی شہادت کہ شہر کے مختلف علاقوں کی
رصدگاہوں میں صرف ایک ہاؤسنگ سوسائٹی کی رصدگاہ سے چاند نظر آیا اور وہ بھی دوربین کی مدد سے،
حالانکہ حکمِ شرعی سے قطع نظر خود علمِ ہیئت میں بھی آغازِ ماہِ قمری کے لیے رویتِ ہلال میں طبعی رویت کا
اعتبار ہے نہ رویتِ ادراکی کا، یعنی اس رویت کا اعتبار ہے جو قدرتی طور پر آنکھوں سے محسوس ہو نہ کہ
اس رویت کا جو غیر طبعی طور پر آلاتِ رصدیہ کی مدد سے حاصل ہو۔ چنانچہ زیچ بہادر خانی کے "باب پنجم

در رویت ہلال" میں مرقوم ہے:-

مراد از رویت طبعی است نہ ارادی کہ	رویت ہلال سے مراد طبعی رویت ہے
بتوسط منظارہائے جدیدہ بہ بیند چہ در یں	نہ کہ رویت ارادی کہ اعلیٰ قسم کی دوربینوں
حالت ہلال قبل از آنکہ بحد رویت	کے ذریعہ ہلال کو دیکھا جائے کیونکہ اس
رسیدہ باشد دیدہ می شود	حالت میں تو ہلال کو اس کے حد رویت
(ص ۷۵ طبع بنارس ۱۳۳۸ھ)	پر پہنچنے سے قبل بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

عجیب بات ہے کہ ہمارے محکمۂ موسمیات کو اس مرتبہ نہ جانے کیوں اس غیر طبعی رویت کی صحت پر بڑا اصرار رہا، حالانکہ پیشین گوئی کے الفاظ میں جزم و یقین کا شائبہ تک نہ تھا، علماء اور عوام تو ظاہر ہے کہ محکمۂ موسمیات کے اس اعلان کو کس طرح صحیح تسلیم کر سکتے تھے جبکہ مطلع صاف ہونے کے باوجود رویت عامہ نہیں ہوئی اور جم غفیر کو چاند نظر نہیں آیا، لطف یہ ہے کہ خود ارباب فن نے بھی محکمۂ موسمیات کے بیان کو صحیح باور نہیں کیا، چنانچہ روزنامہ انجام کراچی کی حسب ذیل خبر ملاحظہ ہو:-

عید کے چاند کے متعلق محکمۂ موسمیات کو پنجاب یونیورسٹی کی رصدگاہ کا چیلنج

"لاہور، ۲۰ مارچ (پ، پ) پنجاب یونیورسٹی کی رصدگاہ نے آج" محکمۂ موسمیات کے ڈائرکٹر کے اس دعوے کو چیلنج کیا ہے کہ چاند اگر ۱عشاریہ ۷ یا ۱عشاریہ ۸ دن کا ہو تو مطلع کی عام حالت میں اسے آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے، ایک انٹرویو میں رصدگاہ کے حکام نے بتایا ہے کہ جمعہ کی شام کو محض آنکھ سے چاند کا دیکھنا بہت مشکل تھا، کہا جاتا ہے کہ جمعہ کی شام کو کراچی میں ۸۰ منٹ تک چاند دیکھا گیا، لیکن یہ بیان بھی بالکل غلط ہے اس لیے کہ نیا چاند کبھی بھی اتنی زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتا، نہ ہی اتنا روشن ہو سکتا ہے کہ اسے انسانی آنکھ دیکھ سکے۔" (روزنامہ انجام کراچی، مورخہ ۲۲ مارچ ۱۹۶۱ء ص ۱ کالم ۴)

یہ ہے اہلِ ہیئت و اصحاب نجوم کی اس درماندگی کی روداد جو انھیں قمری صرف ایک حالت یعنی رویت ہلال کے انضباط میں پیش آتی ہے[1]، اور ظاہر ہے کہ جب رویت ہلال کا صحیح انضباط

---

[1] یہ واضح رہے کہ ہماری بحث اس سلسلہ میں جو کچھ ہے وہ خالص فنی نقطہ نگاہ سے ہے، یعنی اب تک علم ہیئت و ریاضی میں اتنی ترقی نہیں ہو سکی ہے کہ رویتِ ہلال کی کوئی صحیح تقویم بن سکے، اس لیے کسی خود ساختہ فرضی اصطلاحی تقویم کی بناء پر مورخینِ اسلام کے بیان کردہ دنوں کی صحت سے انکار کرنا بہت بڑی جسارت ہے، رہا شرعی حیثیت سے آغازِ ماہ و سال کا مسئلہ تو شریعتِ مطہرہ نے ثبوت ہلال کا دارومدار یا رویت پر رکھا ہے یا شہادت پر، لیکن منجمین و موقتین کے حساب و کتاب کا اس بارے میں اعتبار ہی نہیں کیا ہے، اس لیے علمی اصطلاح میں ہم اس کو "الغاء" کہیں گے نہ کہ ابطال، الغاء اور ابطال میں بڑا فرق ہے، "الغاء" کہتے ہیں کسی چیز کے کالعدم قرار دینے کو، اور "ابطال" کے معنی ہیں اس کی تکذیب کرنا اور اس کو غلط بتانا، اس لیے خوب سمجھ لیجئے کہ شرع نے ہلال کے باب میں اہل ہیئت کے فیصلہ کا الغاء کیا ہے یعنی اس کو کالعدم قرار دیا ہے اس لیے ان کے کسی اعلان سے شرعاً مہینہ کے ثبوت یا عدم ثبوت پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوگا، لیکن ان کے حساب و کتاب کا ابطال نہیں کیا ہے یعنی نہ اس کی تکذیب کی ہے، اور نہ اس کو غلط بتایا ہے، اس لیے اگر بالفرض کل علم ہیئت اتنی ترقی کر جائے کہ رویت ہلال کی صحیح تقویم بن جائے اور جو پیشین گوئی بھی اس بارے میں کیجائے وہ حرف بحرف صحیح نکلے تب بھی اس حکم شرعی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، کیونکہ شریعت کا موضوع ریاضی یا ہیئت کے کسی نظریہ کی تصدیق یا تکذیب نہیں، اہل علم جانتے ہیں کہ متعدد امور کا شریعت نے الغاء کیا ہے، لیکن ان کا ابطال نہیں کیا ہے، مثلاً اندھیری رات میں جبکہ سمت قبلہ مشتبہ ہو ایک شخص بغیر تحری کیے اور اپنی اٹکل کو کام میں لائے جانب قبلہ نماز ادا کرتا ہے تو شرعاً اس کی یہ نماز (اگرچہ وہ واقعہ میں جانب قبلہ ہی ادا کی گئی ہے) کالعدم ہے، کیونکہ شریعت نے ایسے موقع پر یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنی سوجھ بوجھ سے کام لیکر پہلے قبلہ کا رخ متعین کر لے اور جس طرف اس کا

ان کے بس میں نہیں تو پھر وہ اپنی تقویم کا حساب رویت ہلال پر کس طرح رکھ سکتے تھے، نا چار ان کو حقیقی قمری ماہ و سال کی بجائے تقویم کا حساب اپنے فرض کردہ اصطلاحی قمری ماہ و سال سے

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۹) دل گواہی دے کہ ادھر قبلہ ہے اسی سمت نماز ادا کرے اور اس صورت میں اگر سمت قبلہ کی تعیین میں اس سے خطا بھی ہو تب بھی اس کی نماز صحیح ہے، لیکن بغیر سوچے سمجھے اگر قبلہ کی بالکل صحیح سمت میں بھی اس نے نماز ادا کی تو وہ ناقابل اعتبار ہے، اسی طرح سب جانتے ہیں کہ خود خلیفہ یا قاضی اگر کسی شخص کو اپنے سامنے زنا یا چوری یا کسی جرم کا ارتکاب کرتے دیکھے تو محض اپنے ذاتی علم کی بنا پر (جب تک اس شخص کے خلاف ثبوت جرم کی پوری شہادت فراہم نہ ہو) اس پر حد جاری نہیں کر سکتا، لیکن صرف شہادت کے پیش ہونے کی صورت میں (گو امیر یا قاضی کو ارتکاب جرم کا سرے سے کچھ علم نہ ہو) حد کا جاری کرنا اس پر فرض ہے، حالانکہ اکثر حالات میں مشاہدہ سے علم قطعی حاصل ہوتا ہے، اور شہادت سے علم ظنی، ان دونوں مسئلوں سے بخوبی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ "الغاء" و "ابطال" میں کتنا بین فرق ہے، پہلی صورت میں شریعت نے قبلہ کی صحیح سمت میں جو نماز بغیر تحری ادا کی جائے اس کا الغاء کیا ہے، یعنی اس کو کالعدم قرار دیا ہے، مگر قبلہ کی طرف پڑھنے کا ابطال نہیں کیا، یعنی یہ نہیں کہا کہ اس نے جانب قبلہ نماز ادا نہیں کی، اسی طرح دوسری صورت میں قاضی یا امیر کے مشاہدہ کا ابطال نہیں کیا کہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا غلط دیکھا، بلکہ اس کا الغاء کیا ہے کہ یہ مشاہدہ اجرائے حدود کے باب میں کالعدم ہے،

ہماری اس تقریر سے وہ شبہ بھی رفع ہو گیا جو مصر کے مشہور صحافی سید رشید رضا کو رویت ہلال کے مسئلہ میں پیش آیا ہے، ان کے شبہ کی بنیاد دو چیزوں پر ہے، ایک یہ کہ شہادت سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ ظنی ہے اور حساب سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ قطعی ہے، اس لیے مطلع صاف نہ ہونے کی صورت میں جب شہادت پر اعتبار کر لیا جاتا ہے تو پھر تقویم پر کیوں نہیں کیا جا سکتا، جب کہ تقویم کی بنا

کرنا پڑا جس کی بنا پر ان کی تقویم کے حساب میں اور ماہ ہلال حقیقی کے حساب میں ایک دو دن کا فرق ہوجانا روزمرہ کی بات ہے، چنانچہ عصر حاضر کے مشہور موقت سید محمد بن محمد بن عبد اللہ اپنی مشہور کتاب مجموعۃ الیواقیت العصریۃ میں لکھتے ہیں:۔

ثم اعلم ایضاً انہ قد یوافق	پھر تمھیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ کبھی مہینہ
اول الشھر بالحساب اولہ	کی پہلی تاریخ جو حساب کی رو سے ہوتی ہے
بالھلال، وقد یتقدم الحساب	وہی ہلال کے اعتبار سے بھی ہوتی ہے اور
عن الھلال وقد تتوالی اربعۃ	کبھی حساب میں مہینہ ہلال سے پہلے ہی
اشھر ثلاثون ثلاثون یوما	شروع ہوجاتا ہے، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹۰) علم ریاضی پر ہے، اس میں اولاً تو یہی دعویٰ غلط ہے کہ ریاضی کے اصول پر ہلال کی کوئی تقویم بن سکتی ہے، اور اگر بالفرض بن بھی جائے تو اس کی بنا پر حکم شریعت میں ترمیم نہیں کیجا سکتی، جبکہ شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام نے سرے سے موقتین کے حساب و کتاب کو کالعدم قرار دیدیا ہے، ہم نے یہاں وہ مثال بھی پیش کر دی ہے جہاں شرع میں علم ظنی کا اعتبار ہے، اور علم قطعی کو کالعدم قرار دیا ہے، غور فرمائیے اگر قاضی یا امیر مملکت کو اپنے ذاتی علم و مشاہدہ کی بنا پر اقامت حدود کا حق دیدیا جاتا تو پھر اسکی کیا ذمہ داری تھی کہ کل کو قاضی صاحب یا امیر مملکت جس سے خفا ہوتے اس کو محض اپنے علم و مشاہدہ کی بنا پر سنگسار نہ کرا دیتے، ایک بیچارہ لاکھ چلاتا اور سر پیٹتا کہ میں بالکل بے قصور ہوں مگر قاضی صاحب یہ کہکر اس کا خاتمہ کر دیتے کہ میں نے تو خود تجھے اس فعل شنیع کا ارتکاب کرتے دیکھا ہے، اسی طرح جب شریعت مقدسہ نے عام مسلمانوں کو صیام و افطار کا حق رویت ہلال کی بنا پر دیا ہے تو پھر کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ بغیر ہلال کو دیکھے یا اس کی رویت کی شہادت گذرے محض اپنے حساب و کتاب کی بنا پر اس حق کو ان سے چھین لے اور اپنے اعلان کے مطابق انھیں صیام و افطار پر مجبور کرے۔

فثلاثة اشهر تسعة وعشرون	ہلال کے لحاظ سے مسلسل چار ماہ تیس تیس
يوما بالهلال ولا يتوالى اكثر	دن کے اور تین ماہ انتیس انتیس دن کے
من ذالك	ہو جاتے ہیں، مگر تسلسل اس سے زیادہ نہیں ہوتا۔
واما بالحساب فانما شهر	لیکن حساب کے اعتبار سے ہمیشہ ایک ماہ
ثلاثون وشهر تسعة و	تیس کا ہوتا ہے اور دوسرا انتیس کا اور
عشرون لا يتغير (ص ۱۹۴ طبع مصر ۱۳۲۹ھ)	اس میں تبدیلی نہیں ہوتی۔

اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ تقویم کا حساب اصطلاحی ماہ و سال پر مبنی ہے، اور مسلمانوں کا حساب حقیقی ماہ و سال پر، اس لیے ہر دن اور ہر تاریخ میں ان دونوں کا مطابق ہونا ضروری نہیں ہے، اس لیے اختلاف کی صورت میں بجائے اس کے کہ تقویم سے مورخین کے بیان کردہ دنوں اور تاریخوں کو جانچا جائے، علم و دانش کا تقاضا یہ ہے کہ خود مورخین کے بیان کردہ دنوں اور تاریخوں سے تقویم کو درست کر لیا جائے، کیونکہ مورخین اسلام نے اپنی تصانیف میں ہر دن کی وہی تاریخ لکھی ہے جو رویتِ ہلال کے لحاظ سے اس روز ان کے یہاں تھی، اور یہی تاریخ حقیقی تاریخ ہے، اور اسی کا شرع میں بہ نص قرآنی اعتبار ہے۔

اسلامی ہند کے نصف اول میں علوم عقلیہ کا رواج

از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے

(۳)

۱۰- ماوراء النہر سے بھی عجیب تر حالات ایران میں رونما ہو رہے تھے جو ہندوستان میں حکمت و معقولات کے ساتھ اعتناء کے لیے محرک قوی بن گئے۔

دسویں صدی کے آغاز میں ایران میں صفوی حکومت قائم ہوئی، یہ ایک قسم کی "قومی ریاست" (National State) تھی۔ اس لیے رجعت پسند احیائی "(Revivalist)" تحریکوں کو پھر سے سر اٹھانے کا موقع ملا، یہ مذہبی انقلابی تحریکیں تھیں، اور انھوں نے سابق کی اسلام دشمن تحریکوں کی طرح اپنی تنظیم فلسفیانہ بنیادوں پر رکھی تھی، ان میں دو تحریکیں زیادہ اہم تھیں، مسلمانوں میں فرقۂ نقطویہ اور پارسیوں میں فرقۂ آذر کیوانیہ۔

۱- نقطوی تحریک کا بانی محمود پسیخوانی تھا، جو شروع میں حروفی فرقے کے بانی فضل اللہ کا متبع تھا مگر بعد میں اس نے ایک نئی تحریک کی بنیاد ڈالی جس کا نام "نقطویت" ہے، کیونکہ بقول صاحب دبستان المذاہب

"شخص واحد نقطہ گوید و خاک را می خواہد عناصر دیگر بزعم او از خاک موجود اند......

و خاک را بیرون از عنصر ندانند و واجب و مبدء اول نقطۂ خاک را شمرد"

محمود پسیخوانی بھی پچھلے ملاحدہ کی طرح خود کو شرح نبوت کا بلکہ الوہیت کا مظہر سمجھتا تھا، چنانچہ صاحب دبستان المذاہب کی تصریح کے مطابق اس کے متبعین کہتے تھے: "چون جسم کامل ترشد از آں محمود سر بر زد و بنعت مقلما محمود اخیر آں ست"

ان ہفوات و اباطیل سے تو سلاطین کو زیادہ مطلب نہیں تھا مگر اس کے ادعائے مہدویت سے انھیں خطرہ ہونے لگا کیونکہ

"محمود خود را شخص واحد نامد و میگا [illegible] اوجبوا دو گوید که دین محمد منسوخ شد اکنون دین این است"

چونکہ سابق کی ملحدانہ احیائی تحریکوں کی طرح نقطوی تحریک بھی ایران کے قومی مزاج کے لیے بڑی خوشگوار تھی، اس لیے اس کے پیرووں کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھنے لگی، شاہ طہماسپ اور سلطان محمد خدا بندہ نے اس کی اصلاح کی کوشش کی مگر زیادہ کامیابی نہ ہوئی، البتہ شاہ عباس صفوی نے بڑی سختی سے مواخذہ شروع کیا اور ۱۰۰۲ھ میں بیشمار نقطوی قتل کر دیے گئے،

ان میں میر سید احمد کاشی بھی تھا، اس کے کاغذات میں جو رسالے ملے ان سے معلوم ہوا کہ:۔

"نقطوی حکماء کے مذہب کے مطابق عالم کو قدیم مانتے ہیں اور حشر اجساد اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتے، ان کے نزدیک اعمال کے اچھے یا برے ہونے کے نتیجے میں جو دنیوی عافیت یا ذلت ملتی ہے، وہی بہشت و دوزخ ہے"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نقطویوں نے بھی اپنی آئیڈیالوجی فلسفہ کی تعلیم پر استوار کی تھی،

شاہ عباس کی دار وگیر سے نقطویوں کے لیے ایران میں رہنا ناممکن ہو گیا، اور وہ یا تو تقیہ کرنے پر مجبور ہوئے جیسا کہ صاحب دبستان المذاہب نے لکھا ہے،

"و پیروان او در ربع مسکون متفرق اند و در ممالک ایران زمین بسیار اند اما خود را آشکارا نیارند ساخت چہ علیین آشنائی شاہ عباس جمعے کثیر از آنہا را کشت"

یا بھاگ کر ہندوستان چلے آئے، جہاں اکبر اس قسم کی بدعات کا دل وجان سے قدردان تھا، بدایونی کا خیال ہے کہ ایران سے آنے والے شعراء کی اکثریت الحاد پسند تھی:

"تمامی شعراء عصر کلہم وعلیہم صغیرہم وکبیرہم مگر سہ چہار نفر از قدماء عمر جو رتی حیدری مشرب اند"

ان میں غزالی اور قاسم کاہی سرآمد ملاحدہ روزگار تھے، بدایونی آگے چل کر لکھتا ہے:۔

"اما این ہر دو مقتدا و پیشواے بیہودہ اند کہ وراثت خباثت را باتباع و اشیاع خویش بقدر مناسبت و استعداد ذاتی و فیض صحبت گزشتہ تقسیم کردند"

ان ملاحدہ میں محمد شریف آملی، حیاتی کاشی، تشبیہی، صوفی، مازندرانی، عباد اللہ کاشی، عبد الغنی یزدی (اعدم کی) بسیخوانی تھے۔ شریف آملی سے اکبر کو اپنی الحادپسندی میں بڑی تقویت حاصل ہوئی، کیونکہ اس نے اکبر کو وقت کے "صاحب الزماں" کا مصداق ثابت کرنے کی بھی کوشش کی تھی، اور بقول بدایونی ۹۹۰ھ میں دنیاپرست علماء نے اس بات کی تائید میں دلائل تراشنا شروع کیے کہ "جنگ ہفتاد و دوملت" میں فیصلہ کرنے والا صرف اکبر ہی ہے اور شریف آملی نے محمود بسیخوانی کے رسالوں سے شواہد پیش کیے کہ ۹۹۰ھ میں "صاحب دین حق" کا ظہور یقینی ہے، اور اس کا مصداق صرف اکبر کی ذات ہے،

غرض یہ الحاد پسند شعراء خواہ بسیخوانی ہوں جیسے شریف آملی وغیرہ یا وارستہ مزاج قیود مذہبی سے آزاد جیسے قاسم کاہی وغیرہ علوم حکمیہ میں یدطولیٰ رکھتے تھے، مثلاً قاسم کاہی کے متعلق بدایونی لکھتا ہے:۔

"از علم تفسیر و ہیئت وکلام و تصوف او را بہرۂ تمام بود" یا تشبیہی کاشی کے متعلق لکھتا ہے:

"دعوت الحادی نماید و مردم را بکیش بسیخوانیاں میخواند و شیخ ابوالفضل خود را مجتہد دانا مذہ" اس تفلسف پسندی سے شعرائے ہندوستان بھی متاثر ہوئے، چنانچہ فیضی کہتا ہے:۔

امروز نہ شاعرم حکیم دانندۂ حادث و قدیم

اس کا اثر معاشرہ کے ذوق و مزاج پر پڑنا ناگزیر تھا، اس لیے فطری طور پر اس ملک کے علمی حلقوں میں فلسفہ و حکمت سے اعتنا بڑھنے لگا۔

ب ۔ دوسری تحریک پارسیوں میں آذرکیوانیوں کی تھی، اس کا بانی آذرکیوان ایران قدیم کے ایک نجیب الطرفین خاندان سے تعلق رکھتا تھا، ایرانیوں کا خیال تھا کہ ان کے یہاں قدیم زمانہ سے فلسفہ و حکمت کا چرچا رہا ہے، اس لیے جب کبھی ایران میں کوئی احیائی تحریک اٹھی تو اس نے اس مزعومہ "ایرانی حکمت" (حکمت مشارقہ) کے احیاء کی بھی کوشش کی، کیونکہ یونانی فلسفہ کی کورانہ تقلید

ذہنی غلامی کے مترادف تھی، چنانچہ تیسری صدی میں ابوبکر بن زکریا الرازی نے حسب تصریح امام رازی و میر سید شریف "حرنانیت" کو دوبارہ زندہ کیا جو قدیم ایرانی "زرادشتیت" کی ایک شکل تھی، پانچویں صدی کے آغاز میں شیخ بوعلی سینا نے اس مزعومہ ایرانی حکمت کو "الحکمۃ المشرقیہ" کے نام سے مدون کیا، مگر بدقسمتی سے سنہ ۴۲۵ھ میں یہ کتاب ضائع ہوگئی چھٹی صدی کے آخر میں شہاب الدین سہروردی مقتول نے بزعم خود ایران قدیم کے اس فلسفی ورثہ کو "حکمۃ الاشراق" میں مدون کیا، چنانچہ علامہ قطب الدین شیرازی نے "شرح حکمۃ الاشراق" کے مقدمہ میں لکھا ہے:-

حکمۃ الاشراق ای حکمۃ الموسسۃ علی الاشراق الذی ھی الکشف او حکمۃ المشارقۃ الذین ھم اھل فارس ایضاً وھو یرجع الی الاول لان حکمتھم کشفیۃ ... وکان اعتماد الفارسیین فی الحکمۃ علی الذوق والکشف	حکمت الاشراق یعنی ایسی حکمت جس کی بنیاد اشراق پر رکھی گئی، اشراق کے معنی کشف یا حکمت مشارقہ کے ہیں، یہ لوگ اہل فارس میں سے تھے، اس لیے اس حکمت کا مرجع بھی اول حکمت کی جانب ہے، کیونکہ انکی حکمت کشفی ہے، اور حکمت میں فارسیوں کا اعتماد ذوق اور کشف پر تھا،

خود سہروردی اس "طریق اشراق" کو حکمائے ایران کی خصوصیت بتاتا تھا، چنانچہ "حکمۃ الاشراق" کے مقدمہ میں لکھتا ہے:-

وعلی ھذا ینبنی قاعدۃ الاشراق فی النور والظلمۃ التی کانت طریقۃ حکماء الفارس مثل جاماسف و ...	اور اسی پر نور وظلمت کا اشراق کا قاعدہ مبنی ہے، جو فارس کے حکماء، جاماسب، فرشاد و بوزرجمہر اور ان کے پیشروؤں کا

وفرشاد شور، دبور، جمھے طریقہ تھا،

ومن قبلھم

بعد میں بھی اس مزعومہ ایرانی حکمت کے ساتھ ایرانیت پسندوں کا اعتنا برقرار رہا مگر پھر سہروردی جیسا کوئی عبقری پیدا نہیں ہوا، متاخرین نے صرف اس کے شرح و تحشیہ ہی پر اکتفا کیا، ان میں سب سے اہم قطب الدین شیرازی کی "شرح حکمۃ الاشراق" تھی، نویں صدی میں محقق دوانی اکثر شرح حکمۃ الاشراق کا درس دیا کرتے تھے، انھوں نے سہروردی کی "ہیاکل النور" کی شرح بھی لکھی تھی، بعد میں شرح حکمۃ الاشراق پر جو حواشی لکھے گئے ان میں سب سے اہم ملا صدرا کا حاشیہ تھا۔

بہرحال اس "حکمت اشراق" کی بنیاد کشف و ذوق پر تھی، جو نتیجہ ہوتا تھا مجاہدہ و ریاضت کا، اور اس کا ثمرہ بتایا جاتا تھا کہ انسان حسب خواہش بدن عنصری چھوڑنے پر قادر ہو جاتا ہے، چنانچہ خود سہروردی نے اپنے مزعوم امام حکیم افلاطن الہٰی کے بارے میں لکھا ہے :-

"وذوات الاصنام من الانوار القاهرة شاهدها المجردون بانسلاخهم عن هیاکلهم مرارا كثيرة ..... وحكى افلاطن عن نفسه انه خلع الظلمات وشاهدها۔"

اور یہی وطیرہ آذر کیوان نے اختیار کیا، صاحب دبستان المذاہب نے اس کے ریاضت و مجاہدہ کے بارے میں لکھا ہے :-

"آذر کیوان بازلی تائید و یزدانی نیرو از پنجسالگی بکم خوری و شب بیداری پرداخت ..... بست وہشت سال در خم نشست، ہشتاد و پنجسال با عنصری پیکر بود، دست از ریاضت باز نداشت؟"

اس کے کشف و کرامات کے بارے میں مشہور تھا کہ جب اس نے حکمائے یونان و ایران

کی تعلیمات پر مطلع ہونا چاہا تو انھوں نے خود خواب میں آکر اپنا سارا علمی سرمایہ اس کے سپرد کر دیا،
اس لیے اس کا نام ذوالعلوم پڑ گیا۔ "انخلاع جسد عنصری" کی کرامت کے بارے میں اس کے
شاگرد فرزانہ بہرام نے لکھا ہے:۔

"کیوان می فرمود پیوند روان من با جسم تن چون نسبت بدن بہ پیراہن است کہ ہر گاہ بخواہم
از وی گسلم و چون می خواہم بہ وی پیوندم۔"

اسی طرح اس کے متبعین کے بارے میں ناقابل قیاس کشف و کرامات کی داستانیں مشہور
تھیں، صاحب دبستان المذاہب نے لکھا ہے:۔

"گویند قوت انقطاع این گروہ از عنصری بدن بمرتبۂ بود کہ ہر گاہ خواستند سے ازیں
جدا می شدندے و جمیع علوم مشہورہ و غریبہ را از ملاء اعلیٰ فرا گرفتندے۔"

اور یہ سب افسانے شیخ بو علی سینا کی "الاشارات والتنبیہات" کے آخری انماط کی تعبیر تھے، بہرحال
یہ لوگ محض زردشتی نہ تھے، بلکہ فلسفہ و حکمت کے بھی عالم و ماہر تھے، فرزانہ بہرام (آذر کیوان کا جانشین)
محقق دوانی کے شاگرد رشید خواجہ جمال الدین محمود کا شاگرد تھا، اس کی فلسفہ دانی کے بارے
میں صاحب دبستان المذاہب نے لکھا ہے:۔

"و او مردے بود مراتب منطقیات و طبیعیات و ریاضیات و الٰہیات از پارسی و پہلوی
و تازی آنچہ نقل افتادہ کما وجب بسند صحیح فرا گرفتہ و نیکو خواندہ و از منقولات و معقولات
بر ہمہ دانا، در حکمت دانستنی و کردنی فرزانہ رسا و فیلسوفے کامل بود۔"

لیکن اس تحریک کو ایران میں کامیابی نہیں ہوئی اور شاہ عباس نے نقطویوں پر جو سختی
کی تھی اسے دیکھنے کے بعد مجوسیت کے احیاء کے سارے خواب کافور ہو گئے، اس لیے آذر کیوان
اور اس کے تلامذہ ایران سے مایوس ہو گئے، مگر جب ان لوگوں کے علم و فضل اور کشف و کرامات

کے قصے اکبر تک پہنچے تو اس نے بڑے اشتیاق سے آذر کیوان کو ایران سے بلایا، مگر اس نے آنے میں دیر کی، وہ اس وقت ہندوستان پہنچا جب اکبر کا انتقال ہو چکا تھا، اس کے شاگردوں میں فرزانہ بہرام خورداد، فرزانہ فرشید، موبد ہشیار، موبد سروش، فرزانہ بہرام کوچک وغیرہ مشہور ہیں، موخر الذکر کے بارے میں صاحب دبستان المذاہب نے لکھا ہے:۔

"مردے بود با خدا آرمیدہ و از خلق رمیدہ بجمیع علوم عقلی و نقلی عالم و بزبان تازی و پارسی و ہندی و فرنگی ماہر و تصانیف شیخ اشراق شہاب الدین مقتول کہ در حکمت اشراق واقع شدہ بپارسی معروف تازی آمیز ترجمہ کردہ"

ان دل خوش کن تصوں نے دیگر مذاہب کے پیرووں کو بھی آذر کیوانیوں کا گرویدہ بنا دیا، ان میں سے محمد علی شیرازی، محمد سعید اصفہانی، عاشور بیگ، محمود بیگ تین مسلمان تھے، رام بھٹ اور رامچند رکھتری ہندو تھے، صاحب دبستان المذاہب نے ابو القاسم قندرسکی کو بھی آذر کیوانیوں کا خوشہ چیں لکھا ہے، تعجب ہے کہ وہ شیخ بہاء الدین عاملی جیسے متورع و متشرع عالم کو بھی آذر کیوانیوں کے ارادت مندوں میں بتاتا ہے:۔

"شیخ بہاء الدین محمد عاملی کہ از مجتہدین مردم امامیہ است ..... خود راپژوہندہ کیوان می گرفت و جویائے شاگردان وز العلوم می بود"

غرض صفوی انقلاب کی قوم پرستی نے ایرانی احیائیت پسندوں میں قدیم مذاہب کے نام پر عجیب بیراہ روی پیدا کر دی تھی، چنانچہ اس وقت پارسیوں میں راسخ العقیدہ زردشتیوں (سیاسیاں) کے علاوہ چودہ اور فرقے تھے، جن میں سے ایک "آذر ہوشنگیوں" کا تھا، جو گویا پارسی مذہب کے صوفی تھے، اور باقی میں سے بیشتر قدیم فلسفیانہ مسالک کے پیرو تھے، ہمہ اوستی فرقے نے "جمشاسپیاں" کا نام اختیار کر لیا تھا، اور سوفسطائیوں نے "سمرادیاں" کا جن کے مختلف مذاہب تھے،

آخری درجہ فرومندیہ کا تھا، جو باری تعالیٰ کو بھی موہوم سمجھتا تھا، نعوذ باللہ منہا۔ "خدائیان" گویا صابئیت کا دوسرا نام تھا، "زادیان" قدیم (Mithraism) کا احیا تھا، یہ آفتاب کی پرستش کرتے تھے، قدیم یونانی فکر کا منتہائے مقصود کائنات کے مبدء اولین کی تلاش تھا، تامیس پانی کو، انکسمینس ہوا کو اور ایرا قلیطس آگ کو جوہر اولین بتاتے تھے، جن سے کائنات وجود میں آئی ہے، لیکن کسی نے خاک کو مبدء اولین نہیں کہا تھا، مگر اس وقت مجوسیوں میں چاروں عناصر کے پرستار موجود تھے، "شیدابیان" (خاک پرست)، "الدریان" (آب پرست)، "پیکریان" (آتش پرست)، "میلانیان" (ہوا پرست) اصحاب الطبائع "شید رنگیان" تھے، اور ہیولی پرست "آخشیان"۔ مزدک کے پیرووں نے بھی اپنے مذہب کا احیا کرنا چاہا، مگر یہ لوگ مسلمانوں کے لباس میں رہتے تھے،

مگر ان تمام تحریکوں کو ایران میں ناکامی ہوئی، شاہ عباس صفوی کا خوف ہی ایسا غالب تھا اس لیے یہ لوگ ہندوستان چلے آئے، اور عہد اکبری کے تفلسف زدہ اور اسلام بیزار دربار نے ان کی ہر طرح ہمت افزائی کی، اکبر کی نام نہاد وسیع المشربی نے دو شکلیں اختیار کیں: اسلام بیزاری اور فلسفہ پسندی، پہلی شکل کی توضیح ہمارے موضوع سے خارج ہے، دوسری شکل کے بارے میں صاحب دبستان المذاہب نے لکھا ہے:۔

"حکم شد کہ اہیمین از علوم غیر نجوم و حساب وطب و فلسفہ نخوانند و عمر گرامی صرف آنچہ معقول نیست صرف نہ کنند۔"

اگرچہ یہ حکم ناطق صرف خوشامدی درباریوں (اہیمین) کے لیے تھا، مگر اس کا اثر معاشرہ پر پڑنا بھی ناگزیر تھا،

"و شنیدن مناظرۂ علما، و میان مردم بالطبع خواندن تفسیر و فقہ برطرف شد و نجوم و حکمت و حساب و تصوف و شعر و تاریخ مقرر گشت۔"

فیضی کا ایک بڑا شاندار کتب خانہ تھا مگر اسکی وفات پر یہ شاہی خزانہ میں داخل کیا گیا تو علوم شرعیہ کی کتابوں کو ادنیٰ درجہ میں رکھا گیا، بدایونی نے لکھا ہے:۔

" در وقت گزرانیدن کتب از نظر طومار را سہ قسم ساختند اعلیٰ نظم و طب نجوم و موسیقی را قرار دادند و اوسط حکمت و تصوف و ہیئت و ہندسہ و ادنیٰ تفسیر و حدیث و فقہ وسائر شرعیات "

الحاد پسند شعراء کے علاوہ حکمت و معقولات کے فضلا بھی قدر دانی کی تلاش میں ایران سے ہندوستان آئے، ان میں ابوالفتح گیلانی، حکیم ہمام، قاضی محمد یزدی، میر مرتضیٰ شریفی زیادہ مشہور ہیں، امیر فتح اللہ شیرازی دکن سے گجرات ہوتے ہوئے آئے۔ ان کے علاوہ اور علما و دیگر اقطاع ہند میں تشریف لائے، جیسے شیخ حسین بغدادی، میرک عبدالباقی، مولانا عبدالخالق گیلانی نیز مولانا نجم الدین تستری۔

۱۱۔ گیارھویں صدی کے ایرانی فضلا میں شیخ بہاء الدین عاملی اور میر باقر داماد مشہور ہیں، شیخ بہاء الدین عاملی شیعی دینیات کے فاضل اجل ہونے کے علاوہ ریاضی و ہیئت میں بھی دستگاہ کامل رکھتے تھے، فن حساب میں "خلاصۃ الحساب" اور ہیئت میں "تشریح الافلاک" ان کی تصانیف میں بہت زیادہ مشہور ہوئے، اور ان دونوں کتابوں کو قدرت نے غیر معمولی مقبولیت بخشی، یہ دونوں رسالے ہندوستان میں داخل درس ہوئے، اور اکثر علما نے ان کے ساتھ شرح و تحشیہ کے ساتھ اعتنا کیا۔

مگر زیادہ شہرت میر باقر داماد کو ہوئی، وہ فلسفہ میں سرآمد فضلائے روزگار تھے، کلام میں "صراط مستقیم" اور فلسفہ میں "الافق المبین" ان کی مشہور تصانیف ہیں، ان کے علاوہ انھوں نے اور بھی کتابیں فلسفہ میں لکھیں جیسے "قبسات" وغیرہ۔

ہندوستان کے بہت سے فضلا میر باقر داماد سے پڑھ کر آئے تھے، وہ تو ان کے عقیدتمند

تھے ہی، لیکن یہاں جو ان کے ہم پیشہ حریف تھے، وہ بھی ان کے علم و فضل اور دین و دیانت کے معترف تھے، قرون وسطیٰ کے ہندوستان کا واحد فلسفی ملا محمود جونپوری کو سمجھا جاتا ہے، مگر جب وہ میر باقر داماد کا ذکر کرتے ہیں تو "الحاذق البائغ الفائق السمیدع بطول الباع وعلو الکعب فی معظم اصول الفلسفة" کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں، اور ان کی فلسفیانہ فکر کی تفصیل "توغله فی سیاحة ارض الحقیقة وتورطه فی سیاحة یم الحکمة وولوجه فی اعماق ثری الملك باقدام الانظار الغائرة وعروجه عن اطباق سماء الملکوت بقوادم افکاره السافرة" کے عنوان سے بیان کرتے ہیں،

۱ - میر باقر داماد اپنے وقت کے عبقری اعظم تھے، انھوں نے فلسفۂ حاضر الوقت کی ثروت میں نئے نئے نظریات و تصورات کا اضافہ کیا، ان میں سب سے اہم "حدوث دہری" کا مسئلہ ہے، فلاسفہ کی تقلید میں وہ حدوث زمان کے منکر تھے، لیکن تعلیمات اسلامی کا تقاضا تھا کہ وہ "حدوث عالم" کی تائید کریں، اور فلاسفہ کے "حدوث ذاتی" پر (جو قدم عالم کا دوسرا نام ہے) قناعت نہ کریں، اس لیے انھوں نے قدم زمان اور حدوث عالم کے مابین مفاہمت کی کوشش کی، وہ ہر چند کہ امام رازی سے ناراض ہیں کہ انھوں نے فلاسفہ کی "زمان دہر" اور سرمد کی تدقیق کو "تہویلات خال عن التحصیل" سے تعبیر کیا ہے، پھر بھی ان کی ملی و خاندانی غیرت خود کو "قدم عالم" کے عقیدے کے ساتھ راضی نہیں کر سکی۔ اس لیے انھوں نے "حدوث دہری" کا نظریہ تراشا۔ ملا محمود جونپوری نے "شمس بازغہ" میں لکھا ہے:-

> واعلم ان بعض خیرة اللاحقین بالمهرة السابقین مع توغله فی سیاحة ارض الحقیقة وتورطه فی سیاحة یم الحکمة وولوجه فی اعماق ثری الملك باقدام الانظار الغائرة وعروجه عن اطبا

سماء الملکوت بقوادم افکارہ السافرۃ اذ نبض عرقہ الہاشمی

لحمایۃ دمار نظاھر من الدین والذب عن حمی ما علیہ الجمہور

من الملیین من حدوث العالم بقضہ و قضیضہ کلاحدوثا ذاتیاً

فقط من جہۃ لحاظ الذات فحسب بل حدوثا احسن من ذلک مصداقا

لسلب الوجود اصلا فی الاعیان قبل صدق الایجاب لم ترخصہ

بصیرتہ النقادۃ وقریحتہ الوقادۃ ان یقول بالحدوث الزمانی للزمان

..... ابتدع القول بالحدوث الدھری والقبلیۃ الدھریۃ

وقنّن فی ذالک القوانین الدقیقۃ ودون الصحف الانیقۃ"

ہندوستان کے علمی حلقوں میں بھی اس مسئلہ کا رد و قبول دونوں ہی طرح استقبال کیا گیا، ان کے شاگرد اور عقیدت مند اس نئے انکشاف کو سراہتے تھے، مگر مخالفوں میں بھی صف اول کے علما تھے، ان کے دو گروہ تھے، تفلسف پسند حضرات جن کے گل سرسبد ملا محمود جونپوری تھے، جو حدوث دہری کے منکر اور قدیم ابن سینائی قدیم زمانی کے قائل تھے، تا آنکہ بارہویں صدی میں ملا امان اللہ بنارسی نے دونوں فاضلوں (میر باقر داماد اور ملا محمود جونپوری) کے مابین محاکمہ کیا۔

"نظریہ حدوث دہری" کے منکرین کی دوسری جماعت متکلمین کی بھی تھی، وہ "قدم زمان" کے ساتھ "معیت دہریہ" کا بھی انکار کرتے تھے۔ اس جماعت کے سرگروہ خاتم المتکلمین مولانا فضل حق خیرآبادی تھے جنھوں نے میر باقر داماد کے "الافق المبین" پر حاشیہ لکھا ہے۔ ان کے مکتب فکر نے وجود زمان کے ابطال پر اپنی توجہ خصوصیت سے مرکوز کر دی تھی، اور ان کے اس اعتناء مفرط کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر کار مولانا عبدالحق خیرآبادی کو اعتراف کرنا پڑا،

"نعم وجود الزمان شبیہ ان یکون اضعف انحاء الوجود وبالجملۃ

ان اسیما ینفی وجودہ نفی وجودہ علی سبیل التحصیل کان ذالک

حقاً لانہ لیس لہ البتۃ وجود کذالک فی الاعیان"

ب - اس وقت ایران میں شاہ عباس صفوی کی سخت گیری کے باوجود فلسفہ کی نشأۃ ثانیہ ہو رہی تھی، اور پھر فارابی اور ابن سینا کی عظمت و احترام کی طرف طبیعتیں مائل تھیں، امام غزالی نے "تہافت الفلاسفہ" میں فارابی و ابن سینا کی بالواسطہ تکفیر کی تھی، اور حسب ذیل عقائد کو کافرانہ بتایا تھا: قدم عالم، باری تعالیٰ کے علم بجزئیات حادثہ کا انکار اور معاد جسمانی کا انکار۔ اس لیے فلسفہ کے نشأۃ ثانیہ کے ساتھ ایران میں ان مسائل کی طرف رجحان بڑھ رہا تھا، اور لوگ امام غزالی کی عظمت فکر کے باوجود ان کے اس تکفیری موقف کے ساتھ اتفاق کرنے سے قاصر پاتے تھے،

گیارہویں صدی کے وسط میں یہ ماحول تھا کہ ۱۰۵۶ھ میں شاہجہاں نے جان سپار خاں کو سفیر بنا کر ایران بھیجا، اس سفارتی وفد کے عملہ میں محمد فاروق مشرف اور محب علی واقعہ نویس تھے، ان دونوں کو اپنی معقولات دانی کا غرہ تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ خلیفہ سلطان سے جو اعلم علمائے عراق تھے، الجھ پڑے، خلیفہ سلطان نے وقت کی اس اہم بحث کے سلسلے میں پوچھا کہ امام غزالی نے جو مسائل ثلثہ میں فارابی و ابن سینا کی تکفیر کی ہے، اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے، محمد فاروق اور محب علی کوئی شافی جواب نہ دے سکے، چنانچہ وزیر سعد اللہ خاں نے علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کے نام جو مکتوب بھیجا تھا، اس میں لکھا ہے:-

از افراد وقائع ایران زمین بسامع حقائق مجامع رسید کہ افادت پناہ افاضت دستگاہ خلیفہ سلطان وزیر دانش درعراق کہ اعلم العلمائے آں دیار است از محمد فاروق مشرف و محب علی واقعہ نویس کہ بامارت مآب جان سپار خاں سفیر شدہ اند، پس از

دعواے ایشان بفضل وکمال پرسیدہ باشد کہ امام غزالی در مسئلہ قدم عالم و نفی علم واجب تعالیٰ شانہ عما یقول الظالمون فی حق انفسہم والجاہلون باللہ جل امرکبا بجزئیات مادیہ حادثہ و نفی حشر اجساد تکفیر ابونصر فارابی و شیخ ابوعلی سینا نمودہ و جمعے تاویل کلام حکماء کردہ اند ایں مراتب را تقریر باید کرد، مدعیان دروغ چوں شمع کشتہ بے فروغ ماندند"

بہرحال جب شاہجہاں کو اس کی اطلاع ملی تو بڑا صدمہ ہوا، اور اس کے ایماء سے وزیر سعد اللہ خاں نے علامہ عبد الحکیم سیالکوٹی سے موضوع زیر بحث پر ایک سیر حاصل بحث لکھنے کی درخواست کی، چنانچہ سعد اللہ خاں نے اپنے محولہ بالا مکتوب میں آگے چل کر لکھا ہے :-

" لہذا کمترین مریداں حکم شد کہ بآں فضائل وکمالات دستگاہ سطرے چند برنگارد و برگزارد کہ آں افادت وافاضت مرتبہ را دریں مسائل مختصرے جامع وموجزے مفید کہ مستجمع کلمات حکماء وتاویلات علماء وجہ تکفیر اسلامیین واقوال ملیین ومباحث ومناظرات وشکوک و شبہات وازالات وازاحات واسولہ واجوبہ وغایت تدقیقات ونہایت تحقیقات واصل کلام در ہر باب واساس سخن در ہر جواب وانچہ براں ظفر یافتہ باشند وبرہان کہ بداں فائز شدہ باشند واحاطہ مسائل متعلقہ بایں مطلب علمی از حضوری حصولی وبودن علم عین عالم عین معلوم باعتراف تعلق بجزئیات بروجہ کلی است یا جزئی وتحریر آنکہ جزئیت وکلیت مفہوم تابع مدرک است یا تابع مدرک ویا واجب جزئی ہست یا نہ۔ وبیان آنکہ ادراک تعلق است واحساسے نیست وشمول علم بغیبات ومشخصات از زمان وغیر آں وبقاء علم بمعلوم با تبدل زمان وحضور زمان بجمیع اجزاء من ازل الآزال الی ابد الآباد ومع کونہ غیر قارة چنانکہ باشد نوشتہ در حضرت خلافت درعرض دہ پانزدہ روز باید فرستاد کہ بایراں فرستادہ شود وآنچناں باید بود کہ قابل فرستادن باشد ولائق اضافہ بآں فضائل دستگاہ

وحدود گاہ ازاں مار گویند در تاریخ نامہ ہا نوشتہ شود"

اس استدعا کے نتیجے میں علامہ عبدالحکیم سیالکوٹیؒ نے اپنا مشہور رسالہ "الدرالثمینہ" تصنیف کیا، اس کے دیباچے میں فرماتے ہیں :-

"یقول العبد المسکین عبد الحکیم ابن شمس الدین ھذہ قواعد عالیۃ وفوائد غالیۃ نظمتھا القلوب ھادیۃ وآذان واعیۃ بامر الملک العلام ..... ابو المظفر شہاب الدین محمد شاہ جہاں صاحب القران الثانی ..... اللھم کما فضلتہ بالسلطنۃ الکبریٰ فی الدنیا متعہ بالسعادۃ العظمیٰ فی العقبیٰ"۔

یہ رسالہ حسب درخواست سعد اللہ خاں وزیر تین مباحث پر مشتمل ہے: علم باری، حشر جسمانی و روحانی اور قدم و حدوث عالم، لیکن ان میں زیادہ اہم علم باری کا مسئلہ ہے۔ اور رسالہ کا بیشتر حصہ اسی پر مشتمل ہے، اس میں تین بحثیں ہیں جیسا کہ علامہ نے لکھا ہے :-

"القول فی علمہ تعالیٰ وفیہ ابحاث: الاول فی اثباتہ ..... البحث الثانی فی ان علمہ ما ھو وکیف ھو ..... البحث الثالث فی عموم علمہ تعالیٰ"

اس کے بعد "علم باری" کا مسئلہ علمی حلقوں میں گرمی محفل کا سامان بن گیا، اکثر علمائے نامدار نے اس پر طبع آزمائی کی، اسی رجحان سے متاثر ہو کر ملا محب اللہ بہاری نے سلّم میں لکھا "سبحانہ ما اعظم شانہ لا یحد ولا یتصور" اور اس طرح یہ مسئلہ شراح "سلم العلوم" کی کاوش و تحقیق کا موضوع بن گیا، ہر شارح اور محشی نے دل کھول کر اس کی داد تحقیق دی، بعد میں بعض علماء نے اس موضوع (مسئلہ علم باری نیز مسئلہ علم) پر مستقل رسائل لکھے، اس قسم کے کچھ رسالے اسٹیٹ لائبریری رامپور میں محفوظ ہیں۔

مگر یہ سب کچھ ایران کی علمی بحثوں اور وہاں کے علمی رجحانات کا تسلسل تھا، جو ہندوستانی فکر میں اس طور سے منعکس ہو رہا تھا۔

ج۔ جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانہ میں بھی علمائے ایران ہندوستان آتے رہے۔ ان میں شیخ ابوتراب شیرازی، سید تقی الدین شیرازی، شیخ جلال الدین شیرازی، شیخ تقی الدین تستری، سلطان حسین یزدی، ملا فرخ ہروی، مولانا کمال الدین نیشاپوری، حکیم محمد معصوم تستری، میر محمد ہاشم گیلانی، ملا رشد شیرازی زیادہ مشہور ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ براہ راست دربار شاہی میں آکر ملازم ہوئے، بعض گجرات رہ گئے، بعض دکن چلے گئے،

ان میں سے اکثر فضلاء سے علمائے ہند کے مناظرے بھی رہے، ملا شفیعا اور علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کا مناظرہ مشہور ہے۔ امام الدین الریاضی نے لکھا ہے:

"آوردہ اند کہ پادشاہ شاہجہاں ایشاں را از سیالکوٹ برائے مناظرہ ملا شفیعا کہ تازہ از ولایت آمدہ بود و خطاب دانشمند خاں یافتہ بود طلبید۔ ایشاں آمدند و اجلاس علماء و فضلاء حکم شد۔ چوں نوبت سخن بمولوی عبدالحکیم رسید و با دانشمند خاں مباحثہ واقع شد بر مراد ایاک نعبد و ایاک نستعین گفتگو بطول کشید و بالآخر درستی قول مولوی و راستی سخن ایشاں بر بادشاہ و سائر امراء و علمائے عالی شان در ظہور انجامید۔"

د۔ شاہجہاں کی سیاسی فتوحات کے نتیجے میں بلخ بھی سلطنت مغلیہ میں شامل ہوگیا اور یہاں کے علماء بھی ہندوستان پہنچے۔ ان میں سب سے مشہور مولانا عوض وجیہ بلخی تھے۔ ایک مرتبہ لاہور تشریف لائے، اور علامہ عبدالحکیم کے درس میں بھی گئے مگر سپاہیانہ وضع میں تھے، اسلئے کوئی پہچان نہ سکا۔ اثنائے درس میں علامہ کی تقریر پر جو ایرادات کرنا شروع کیے تو علامہ سے جواب دیتے نہ بنا، کچھ دن بعد سعد اللہ خاں سے ملاقات ہوئی اور یہ قصہ سنایا، سعد اللہ خاں سمجھ گئے کہ وہ مولانا عوض وجیہ تھے، جب علامہ کو معلوم ہوا تو کمال حسرت فرمانے لگے

" از آمدنش اگر خبر داشتمے، در رہ گذرش گل و سمن کاشتمے"

۱۲۔ اس مختصر جائزے میں ایران کے ان شعراء سے تعرض کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، جو قدردانی کی تلاش میں ہندوستان آئے۔ مغل عہد تو ان نووارد ایرانی شعراء کے ورود کیلئے مشہور ہے۔

مگر یہ سلسلہ مغل عہد کے پہلے ہی شروع ہو گیا تھا، آخری زمانہ میں شیخ علی حزیں تشریف لائے، مگر ہمارے یہاں بدقسمتی سے وہ شاعر کی حیثیت سے متعارف ہیں، اور ہم ان کے کمال کی اس سے زیادہ داد نہ دے سکے کہ

صید از حرم کشد خم جعد بلند تو　　　فریاد از تطاولِ مشکیں کمند تو

ان کی فکر کا زائیدہ تھا، حالانکہ وہ شاعر سے زیادہ عالم اور معقولی تھے، چنانچہ انھوں نے اپنے تذکرہ میں مندرجۂ ذیل کتابیں اپنی تصانیف بتائی ہیں، جو فلسفہ و حکمت کی مطولات سے متعلق ہیں: شرح رسالہ کلمۃ التصوف شیخ اشراق، رسالہ ابطال تناسخ برائے طبیعیین، رسالہ کنہ المرام در قضا و قدر، حاشیہ بر الٰہیات شفا، حاشیہ بر امور عامہ شرح تجرید، حواشی بر شرح حکمت اشراق، حاشیہ بر شرح ہیاکل النور، رسالہ تجرد نفس، رسالہ لوامع مشرقہ در تحقیق معنی واحد و وحدت، رسالہ موسومہ توفیق در توافق حکمۃ و شریعہ، رسالہ توجیہ کلام قدما و حکمائے مجوس در مبدا عالم

یہ مختصر تذکرہ ہے، ہند و ایران کے علمی و ثقافتی روابط کا جس کا آغاز صدر اسلام سے ہوتا ہے اور خاتمہ شیخ علی حزیں کی آمد پر۔ یہ ایک ہی ثقافت کے دو علمبردار ملکوں کا اختلاط تھا، جسے ایران میں وقتاً فوقتاً کسی نئے عبقری کا ظہور زیادہ نمایاں کر دیتا تھا، بہر حال یہ ایک حقیقت ہے، مگر جب ہم متکلف "انڈو ایرانین کلچرل ریلیشنز" کی تجدید کرتے ہیں، تو اپنی ادعائی تحقیق و کاوش کی نمایش کے لیے خواہی نخواہی اس درخشندہ و تابندہ حقیقت پر تکلفات کے پردے ڈالنے کی کوشش کیا کرتے ہیں، مگر ہمارا یہ تکلف آخر کار مضحکہ خیز ہی ثابت ہوتا ہے۔

برکلے اور اس کا فلسفہ

مشہور فلاسفر برکلے کے حالاتِ زندگی اور اس کے فلسفہ کی تشریح، اردو میں فلسفۂ جدیدہ کی پہلی کتاب ہے:- قیمت:- عہ

منیجر

ابو عثمان جاحظ

از

جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی

جاحظ ایک فلسفی اور آزاد مشرب انسان تھا، مذہبی عقائد و خیالات میں بھی وہ غیر محتاط تھا، لیکن عربی زبان و ادب کا مشہور صاحب طرز ادیب، نامور انشاء پرداز، فلسفہ و کلام کا امام اور بہت سی کتابوں کا مصنف ہے۔ اس کی تصنیفات ادب و انشاء کا شاہکار اور عربی زبان و ادب میں لازوال شہرت رکھتی ہیں، اس لحاظ سے اس کی شخصیت بڑی اہم ہے، مورخین اور اس کے معاصر مصنفین نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے، مگر اردو میں ابھی تک جاحظ کے حالات نہیں لکھے گئے ہیں، تلاش و تفحص کے بعد جو معلومات فراہم ہوئے ہیں، انھیں اس مضمون میں پیش کیا جاتا ہے۔

نام و نسب | اس کا نام عمرو، باپ کا بحر اور دادا کا محبوب تھا، ابو عثمان کنیت، جاحظ لقب اور کنانی لیثی، معتزلی اور بصری وغیرہ نسبتیں ہیں۔[1]

جاحظ لقب کا سبب یہ ہے کہ اس کی آنکھیں نکلی اور ابھری ہوئی تھیں، عربی زبان میں ایسے شخص کو جاحظ العینین کہا جاتا ہے، اس لیے جاحظ لقب پڑ گیا، اسی مناسبت سے اسے حدقی بھی کہا جاتا ہے۔[2]

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ حکایت بیان کیجاتی ہے، وہ ایک مرتبہ اپنے کسی دوست سے ملنے کے لیے اس کے گھر گیا اور اندر داخل ہونے کی اجازت چاہی، ایک عجمی لڑکا باہر آیا،

---

[1] تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۱۰۸، بغیۃ الوعاۃ فی طبقات النحاۃ و اللغویین ص ۳۹۵ و تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۲۱۲ [2] ابن خلکان ج ۲ ص ۱۰۸ و البدایہ و النہایہ ج ۱۱ ص ۱۹

اندر پوچھا آپ کون ہیں؟ اس نے جواب دیا میں جاحظ ہوں، لڑکے نے اندر جا کر کہا، جاحد دروازے پر کھڑا ہے، صاحب خانہ نے کہا پھر جا کر ٹھیک ٹھیک پوچھو، دوبارہ جاحظ نے کہا میں حدقی ہوں، لڑکے نے اندر جا کر کہا اس کا نام حلقی ہے، جاحظ نے دونوں بار لڑکے کی گفتگو سن لی تھی، جب اس نے حلقی کہا تو وہ زور سے چلایا، "ردنا الی الاول" یعنی جاحظ کے بجائے جاحد تو میں اپنا نام سن لینا گوارا کر سکتا ہوں مگر حدقی کے بجائے حلقی سننا کبھی پسند نہیں کر سکتا، صاحب خانہ یہ چیخ پکار سنکر جاحظ کو پہچان گیا اور خود آکر اسے اندر لوا گیا اور عذر و معذرت کی۔[1]

وطن | بصرہ قدیم زمانہ سے عراق (عرب) کا مشہور و متمدن شہر ہے، اور اس کی مردم خیز سرزمین سے بڑے بڑے اہل کمال پیدا ہوئے ہیں، جاحظ جیسے ماہر ادیب و انشاپرداز کا مولد و منشا ہونے کا فخر بھی اسی مردم خیز خطہ کو حاصل ہے۔

پیدائش | جاحظ کے سنہ ولادت کے متعلق اگرچہ اصحاب تذکرہ و طبقات نے کوئی واضح تصریح نہیں کی ہے، لیکن جاحظ کا خود بیان ہے کہ وہ ابو نواس سے عمر میں تقریباً ایک سال بڑا ہے، اسکی پیدائش سنہ ۱۵۰ھ کے شروع میں اور ابو نواس کی اسی سال کے آخر میں ہوئی تھی،[2] مگر احمد امین نے جاحظ کے اس بیان سے کہ

واشد ما علی ست وتسعون عاما[3] — میرے لیے سب سے زیادہ شاق بات یہ ہے کہ میں ۹۶ سال کا بوڑھا ہو گیا ہوں،

اس کا سنہ پیدائش ۱۵۹ھ بتایا ہے، کیونکہ عام تذکرہ نگاروں کے بیان کے بموجب اس کی وفات ۲۵۵ھ میں ہوئی تھی،

خاندان | جاحظ خاندانی اعتبار سے کوئی ممتاز شخص نہ تھا، اس کی نسبت کنانی علمی اور حقیقی نہ تھی،

---

[1] معجم الادباء ج ۶ ص ۶۲ [2] ایضاً ص ۵۶ [3] مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۱۶۴ و دیگر کتب۔

بلکہ ابو القلمس عمرو بن قلع کنانی کا غلام تھا، اور اس کا دادا اونٹوں کی چرواہی کرتا تھا، اس نے خود بھی اونٹ چرائے تھے۔[1] اور سیحان میں روٹی اور مچھلیاں بیچا تھا، ڈاکٹر احمد فرید رفاعی لکھتے ہیں:

ولم تکن اسرتہ برفیعۃ الحسب	اس کا خاندان معزز اور بلند مرتبہ نہ تھا
ولا سامیۃ المکانۃ بل علی	بلکہ عمرو بن قلع کنانی کا خدمت گذار
النقیض کانت خدما و خولا	اور غلام تھا...... کہا جاتا ہے کہ اسکا
لمولاھم ابی القلمس عمرو بن	دادا فزارہ اونٹوں کا گلہ بان تھا،
قلع الکنانی.. وقیل ان	اور وہ خود سیحان میں روٹی اور
فزارۃ احد الجاحظ کان جمالا	مچھلی بیچا کرتا تھا،
وان الجاحظ نفسہ کان	
یبیع الخبز والسمک بسیحان[2]	

لیکن علم و فضل کو خاندانی شرافت و نجابت سے کوئی تعلق نہیں، تاریخ اسلام کی بیشمار مایہ ناز شخصیتیں مملوک اور غلام زادہ تھیں، جاحظ کا فضل و کمال اور شہرت و ناموری بھی اسکی فطری استعداد و قابلیت، ذہانت و طباعی اور شوق و محنت کا نتیجہ ہے۔

اساتذہ و شیوخ: تذکرہ و تراجم کی کتابوں میں جاحظ کے چند ہی اساتذہ کا نام ملتا ہے، لیکن وہ سب اپنے فن میں یکتا تھے، اور ان کی عظمت خود مستقل مضمون کی متقاضی ہے، اس لیے اس مضمون میں صرف ان کے ناموں کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

جاحظ فلسفہ و کلام کا استاد ہے، اور اس فن کی تحصیل اس نے عقلی علم کلام کے بانی اول اور مشہور متکلم ابو الہذیل العلاف کے نامور شاگرد اور جانشین ابو اسحٰق ابراہیم بن سیار النظام المعروف[3]

---

[1] نزہۃ الالبا ص ۲۵۴ [2] عصر المامون ج اول ص ۴۰۴ [3] الغزالی ص ۹۲

بالنظام (المتوفی ۲۴۵ھ) سے کی تھی، نظام کی عظمت واہمیت کا اندازہ لگانے کیلئے یہ بات کافی ہو کہ وہ علاف کا شاگرد اور جاحظ کا استاد تھا، مولانا شبلی فرماتے ہیں :-

"نظام کے فضل وکمال کی بلند پائگی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جاحظ جیسا بے نظیر فاضل اسی نظام کا شاگرد اور خانہ زاد غلام تھا۔"[۱]

جاحظ لغت وادب کا بھی بڑا ادا شناس بلکہ امام ادب تھا، ان فنون میں اس کو ابو عبیدہ معمر بن مثنی (متوفی ۲۰۹ھ) ابو سعید عبد الملک بن قریب اصمعی متوفی ۲۱۶ھ اور ابو زید سعید بن اوس انصاری متوفی (۲۱۵ھ) جیسے ائمہ اور اساطین فن سے نسبت تلمذ حاصل ہے، ابو الحسن سعید بن مسعدہ اخفش (متوفی ۲۱۶ھ) جیسے فاضل اور امام نحو سے علم نحو میں اکتساب فیض کیا تھا،

علم حدیث میں گو جاحظ کا کوئی مقام نہیں، تاہم یزید بن ہارون، سری بن عبدویہ، قاضی ابو یوسف اور حجاج بن محمد بن حماد بن سلمہ سے اس نے روایتیں کی ہیں،[۲] صاحب شذرات نے ایک اور استاد ثمامہ بن اشرس کا بھی ذکر کیا ہے،[۳] عربی زبان وادب اور فصاحت وبلاغت سیکھنے کے لیے وہ خالص بدوی عربوں کے پاس جاتا اور براہ راست ان سے اسے سیکھتا تھا،[۴]

تلامذہ | مورخین اور اصحاب طبقات نے جاحظ سے استفادہ کرنے والوں کے محض چند ہی نام گنائے ہیں اور وہ یہ ہیں :-

یموت بن مزرع جو اس کا بھانجا تھا، ابوبکر عبد اللہ بن ابی داؤد سجستانی، محمد بن عبد اللہ بن ابی الدنیا اور محمد بن یزید نحوی وغیرہ نے اس سے روایت کی ہے،[۵]

لیکن جاحظ سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد اتنی کم نہیں ہوسکتی، یہ صرف اس سے حدیثیں

۱۔ الکلام حصہ اول ص ۴۹ ۲۔ کتاب الانساب سمعانی ص ۱۱۸ ۳۔ شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۲۱
۴۔ معجم الادباء ج ۶ ص ۵۶ ۵۔ کتاب الانساب سمعانی ص ۱۱۸ و ۱۱۹

روایت کرنے والے رواۃ کا نام ہے، لغت، ادب اور کلام میں اس سے استفادہ کرنے والے ان کے علاوہ ہیں، خود مورخین اور اصحاب سیر کا بیان ہے کہ جاحظ کے درس میں شریک ہونے والوں کا ایک جم غفیر رہتا تھا۔

سفر و سیاحت | تحصیل علم کے لیے جاحظ کے سفر و سیاحت کی تصریح نہیں ملتی لیکن اس کی کتابوں میں مختلف قوموں اور ملکوں کے معاشرت، تہذیب اور تمدن وغیرہ کے متعلق جو معلومات ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے یا تو متعدد ملکوں کے سفر کیے ہوں گے یا دوسرے ذرائع سے ان کے متعلق واقفیت اور آگاہی حاصل کی ہوگی، لیکن سرمن رای، دمشق، بغداد اور انطاکیہ[1] وغیرہ جانے اور وہاں کے اہل علم و فضل سے استفادہ کرنے کا ذکر ملتا ہے، اور بغداد میں تو اس نے مدتوں قیام کیا تھا، خطیب بغدادی تحریر فرماتے ہیں:۔

وقدم بغداد فاقام بها مدة[2] — جاحظ بغداد آیا اور وہاں ایک عرصہ تک قیام کیا۔

علم کا ذوق اور اسکی حرص | جاحظ کو علم و فن سے خاص مناسبت تھی، اس کا تمام وقت کتابوں کے مطالعہ میں صرف ہوتا تھا، وہ اپنے اعتزال و انحراف اور بدعقیدگی کی بنا پر جس الزام اور ملامت کا بھی مستحق سمجھا جائے، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی جیسی علمی حرص کی مثالیں کم ہیں، اس کی معاشی پریشانیاں بھی طلب علم کی راہ میں حائل نہ ہو سکیں، ڈاکٹر احمد امین لکھتے ہیں:۔

"عباسی عہد کے نوجوانوں میں جاحظ کی طرح شاید ہی کسی نے علم کا اکتساب کیا ہو، وہ معاشی پریشانیوں میں مبتلا تھا، کہا جاتا ہے کہ سیحان میں لوگوں نے اسے روٹی اور مچھلی فروخت کرکے گذر اوقات کرتے ہوئے دیکھا تھا، لیکن اس اثنا میں بھی وہ ہر طبقہ و خیال کے علماء سے ملتا اور ان سے استفادہ کرتا رہا[3]۔"

---

[1] ضحی الاسلام ج ۱ اول ص ۴۰۴ [2] تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۲۱۲ [3] ضحی الاسلام ج ۱ اول ص ۴۰۴

اور مشہور ادیب و انشاء پرداز ابو العباس مبرد بیان کرتا ہے کہ "میں نے تین اشخاص جاحظ، فتح بن خاقان اور اسمٰعیل بن اسحاق قاضی سے زیادہ علم کا شائق اور حریص نہیں دیکھا، جاحظ کا یہ حال تھا کہ اس کے ہاتھ میں کیسی ہی کتاب آجاتی اسے اول سے آخر تک پڑھ ڈالتا،[1]

ابو ہفان بیان کرتے ہیں کہ جاحظ سے زیادہ علم اور مطالعہ کتب کا شائق نہ میری آنکھوں نے دیکھا نہ میرے کانوں نے سنا، اسے جب کوئی کتاب مل جاتی تو اس کو پڑھ کر دم لیتا تھا، یہانتک کہ وراقوں کی دکانوں کو کرایہ پر لیتا اور مطالعہ کتب کے لیے ان ہی میں رات گذارتا تھا،[2]

عربی زبان و ادب اونٹ چرانے والے بدوؤں اور عربوں کے پاس جاکر ان سے بالمشافہ سیکھتا[3] مطالعہ اور کتب بینی کی ایسی چاٹ پڑگئی تھی کہ آخر عمر میں جب قوت جواب دے چکی تھی اور ضعف پیری حد سے بڑھ گیا تھا، اس وقت بھی کتابوں کا مطالعہ حسب معمول جاری تھا، اس کی موت کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ کتابوں کا ڈھیر اس کے اوپر گر پڑا تھا،[4] ابو الفداء کا بیان ہے

وقد روی ان موته کان بوقوع مجلدات علیه وکان من عادته ان یصفها قائمة کالحائط محیطة به وهو جالس الیها وکان علیلاً فسقطت علیه فقتلته[5]	بیان کیا گیا ہے کہ جاحظ کی موت اس کے اوپر کتابوں کے ڈھیر کے گر جانے سے ہوئی تھی، اسکا معمول تھا کہ وہ دیوار کی طرح اپنے ارد گرد کتابوں کو کھڑی کر دیتا تھا اور ان کے بیچ میں خود بیٹھتا ایک مرتبہ بیماری کی حالت میں اسی طرح بیٹھا تھا کتابیں اس کے اوپر

صاحب اعلام تحریر فرماتے ہیں:-

---

[1] الفہرست لابن ندیم ص ۱۶۹ و امالی حصہ اول ص ۳۰، [2] معجم الادباء ج ۶ ص ۵۶ [3] ایضاً [4] شذرات الذہب ج ۲ ص ۲۲ [5] تاریخ ابو الفداء ج ۲ ص ۴۴

ومات والكتاب على صدره[۱] اسکی موت اس حال میں ہوئی کہ کتاب اسکے سینہ پر تھی،

ذہانت وطباعی علم کے ذوق وطلب کے ساتھ وہ ذہانت وطباعی میں بھی ممتاز تھا، اور اس کا حافظہ نہایت قوی تھا، یاقوت حموی کا بیان ہے:-

وكان الجاحظ من الذكاء وسرعة	جاحظ کی ذکاوت وذہانت اور قوت
الخاطر والحفظ بحيث شاع	حفظ اتنی مشہور ہے کہ وہ محتاج
ذكره وعلا قدره واستغنى	توصیف نہیں،
عن الوصف[۲]	

جاحظ کے فضل وکمال کا اعتراف تمام مورخین اور اصحاب طبقات اس کے علمی کمالات کے معترف ہیں، علامہ سمعانی کا بیان ہے:-

وكان فصيحا تدل كتبه على	جاحظ فصیح تھا، اسکی کتابیں اسکی فصاحت
فصاحته وملاحة عبارته[۳]	اور اس کے حسن تحریر کا ثبوت ہیں،

ابو البرکات انباری لکھتے ہیں،

فانه كان عالما بالادب فصيحا	وہ ادب کا عالم، فصیح وبلیغ، مختلف فنون
بليغا مصنفا فى فنون العلم	میں صاحب تصنیف اور معتزلہ کے ائمہ
وكان من ائمة المعتزلة[۴]	میں تھا،

علامہ ابن کثیر جاحظ کے اعتزال اور بدعقیدگی کی مذمت اور تردید کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

وكان ماهرا بارعا فاضلا قد اتقن	لیکن وہ ماہر وفاضل اور متعدد علوم میں
علوما كثيرة وصنف كتبا جمة	کامل تھا، اس نے بیشمار کتابیں لکھیں

---

[۱] اعلام ج ۲ ص ۹۰ ۲ [۲] معجم الادباء ج ۶ ص ۷۵ [۳] کتاب الانساب ص ۱۱۹ [۴] نزہۃ الالبا فی طبقات الادباء ص ۲۵۴

تدل على قوة ذهنه وجودة قريحته[۱] — جس سے ان کی ذہانت اور جودت طبع کا ثبوت ملتا ہے۔

ابوبکر احمد بن علی کا بیان ہے :-

كان ابو عثمان الجاحظ من اصحاب النظام وكان واسع العلم بالكلام كثير التبحر فيه شديد الضبط لحدوده ومن اعلم الناس به وبغيره من علوم الدين والدنيا[۲]

ابو عثمان نظام کا شاگرد، علم کلام کا ماہر و متبحر، اس کے حدود کا ضابطہ، اور دوسرے علوم کا بہت بڑا عالم تھا۔

یاقوت حموی لکھتا ہے :-

والجاحظ عظيم القدر في المعتزلة وغير المعتزلة من العلماء الذين يعرفون الرجال ويميزون الامور[۳]

معتزلہ وغیر معتزلہ دونوں کے نزدیک جاحظ عظیم المرتبت ہے، وہ ان علماء فن میں سے جو رجال کے ماہر اور معاملات و مسائل کی پرکھ رکھتے ہیں۔

ابن خلکان اور یافعی نے اس کو العالم المشہور (مشہور عالم) اور صاحب التصانیف المفیدہ فی فنون عدیدہ (متعدد فنون میں عمدہ اور مفید تصنیفات والا) کے اوصاف سے یاد کیا ہے۔[۴]

صاحب شذرات فرماتے ہیں :-

كان بحرا من بحور العلم[۵] — وہ علم کے سمندروں میں سے ایک سمندر تھا۔

صاحب اعلام لکھتے ہیں :-

۱؎ البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۱۹ ۲؎ معجم الادباء ج ۶ ص ۷۵ ۳؎ ۴؎ تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۱۰۰ و مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۱۹۲ ۵؎ شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۲۱

كبير ائمة الادب و رئيس الفرقة	جاحظ ادب و عربیت کا امام کبیر اور معتزلہ
الجاحظية من المعتزلة[1]	کے فرقہ جاحظیہ کا رئیس تھا،

ابوحیان، ابن مقسم کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ابو ہفان کی مجلس میں جاحظ کا تذکرہ ہو رہا تھا، ایک شخص نے ان سے کہا وہ آپ کا ہم پایہ اور ہمسر بنتا ہے، آپ اس کی ہجو کیوں نہیں کرتے، ابو ہفان نے کہا کیا مجھے بھی فریب دیا جا سکتا ہے قسم ہے خدائے ذوالجلال کی کہ اگر جاحظ ایک رسالہ میری ناک کے متعلق بھی تحریر کر دے تو چین تک اس کی شہرت ہو جائیگی، لیکن اگر میں اس کے بارہ میں ہزار اشعار بھی کہوں تو ایک شعر کا بھی ایک ہزار برس میں کوئی چرچا نہ ہوگا[2]

ثابت بن قرہ صابی کا بیان ہے کہ مجھے ملت اسلامیہ کے صرف تین اشخاص پر رشک آتا ہے

عقم النساء فلا يلدن شبيهه ان النساء بمثله عقم

عورتیں بانجھ ہو گئیں اسلیے اس جیسا آدمی نہیں جن سکیں اور واقعی اس جیسا آدمی جننے سے عورتیں بانجھ ہی ہیں۔

لوگوں نے پوچھا یہ تین اشخاص کون ہیں؟ اس نے کہا عمر بن خطاب ...... حسن بصری[3] ..... اور جاحظ جو مسلمانوں کا خطیب و انشاء پرداز، متکلمین کا شیخ، جدل و مناظرہ میں نظام کا مثیل و ہم پایہ، جد و ہزل دونوں میں یکتا اور ادب و عربیت کا امام ہے، اس کی کتابیں شگفتہ و شاداب چمن اور رسالے برگ و بار آور شاخیں ہیں، خلفاء و امراء کا ندیم و ممدوح، علماء کا ماخذ و مرجع، خواص کا معتمد، عوام کا محبوب، زبان و قلم، نظم و نثر، علم و ادب، ذہانت و فراست، فہم و تدبر اور حزم و تدبیر سب میں جامع تھا، اس نے طویل عمر پائی اور اس کی حکمت و دانش کی عام شہرت ہوئی،

---

[1] اعلام ج ۵ ص ۲۹، [2] معجم الادباء ج ۶ ص ۱، [3] اصل ماخذ میں حضرت عمر بن خطاب اور حسن بصری کی خصوصیات بھی درج تھیں لیکن انھیں طوالت کے خوف سے قلم انداز کر دیا گیا،

لوگوں نے اس کے نقش قدم کا تبع کیا اور اس کی طرف نسبت کو فخر سمجھا، اور اسے علم و
خطابت کا زبردست ملکہ عطا ہوا تھا۔[1]

جامعیت و کمال | جاحظ اقلیم علم و فن کا شہنشاہ اور اس کی شخصیت گوناگوں اور متنوع کمالا
جامع ہے۔ اس نے ہر موضوع اور ہر فن میں طبع آزمائی کی ہے، شعر و ادب، انشاء و بلاغت، نحو
فلسفہ و کلام اور تاریخ و جغرافیہ وغیرہ مختلف علوم پر اس نے کتابیں لکھی ہیں، علامہ ابن خلکان
لکھتے ہیں :-

صاحب التصانیف فی کل فن[2]   جاحظ کی ہر فن میں تصنیفات ہیں

احمد امین اس کی جامعیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"جاحظ نے تقریباً ہر موضوع سے تعرض اور اعتنا کیا ہے، مدرسین و معلمین سے لیکر بنی ہاشم،
چوروں سے لیکر بھیڑیوں، صفات الٰہی سے لیکر رقص و سرود اور مغنیات، قاضیوں اور
والیوں سے لیکر امہات الاولاد اور امامت و خلافت سے لیکر جوروں تک کونسا موضوع ہے
جو اس کے احاطۂ تحریر میں نہ آیا ہو، اس لیے اگر جاحظ کی تصنیفات کو جو اگرچہ نظم و ترتیب
سے عاری ہیں، ان کی جامعیت اور تنوع کے اعتبار سے دائرۃ المعارف اور
انسائیکلو پیڈیا کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔"[3]

وہ علم و فن کے عروج و کمال کے زمانہ میں پیدا ہوا تھا، اس وقت عباسی خلفاء کی علم پر
اور ادب نوازی کی وجہ سے مختلف قوموں اور ملکوں کے علوم و فنون سے عربی زبان مالا مال
تھی، اسلیے جاحظ کو عربی تہذیب و تمدن کے علاوہ ایرانی، ہندوستانی اور یونانی وغیرہ کی تہذ
و ثقافت سے بھی واقف ہونے کا موقع ملا، اور اس نے ارسطو، ابن مقفع اور دوسرے علما

---

[1] معجم الادباء ج ۶ ص ۷۰، [2] تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۱۰۰، [3] ضحی الاسلام ج اول ص

کی تصنیفات کی بدولت نہ صرف مختلف قوموں کے معاشرت و تمدن، ان کی خصوصیات، آب و ہوا قدرتی حالات اور جغرافیائی کیفیات سے واقفیت حاصل کی، بلکہ مختلف فرقوں اور مذاہب کا بھی اس نے مطالعہ کیا، اور اس کی کتابوں میں آنویت، زردشتیت، دہریت، ہندویت، یہودیت، نصرانیت اور اسلام سب کا ذکر موجود ہے،

بعض علوم میں امتیاز جاحظ کو اگرچہ مختلف علوم و فنون میں کمال حاصل تھا لیکن نحو، لغت، ادبیت، انشاء اور کلام کا امام اور ان فنون میں یگانہ و یکتا تھا، متقدمین اور متاخرین میں بہت کم لوگ ان میں اس کے ہم پایہ تھے اسی لیے مورخین اور اصحاب سیر اسے اللغوی، النحوی، کبیر ائمۃ الادب، المتکلم المشہور اور احد شیوخ المعتزلہ وغیرہ کے لقب سے یاد کرتے ہیں، احمد فرید رفاعی لکھتے ہیں :-

و غلب علیہ امران اثنان؛	دو چیزوں سے اس کو خاص شغف تھا، ایک
الکلام علی طریقۃ المعتزلۃ و	طریقہ معتزلہ کے مطابق بحث و نظر، دوسرے
الادب منہ وجاہا بالفلسفۃ والفکاھۃ[1]	فلسفہ و ظرافت آمیز ادب

ابو الفضل بن عمید کا بیان ہے :-

"تین علوم میں سب لوگ تین اشخاص کے محتاج ہیں، فقہ میں امام ابو حنیفہؒ کے، کلام میں ابو الہذیل کے اور فصاحت و بلاغت اور ادب و عربیت میں ابو عثمان جاحظ کے"[2]

جاحظ اور روایت حدیث جاحظ کسی زمانہ میں بھی عالم دین کی حیثیت سے معروف و مشہور نہ تھا، بلکہ بد عقیدگی کے لیے مشہور ہے، چنانچہ علماء اسے ثقہ و معتبر نہیں سمجھتے تھے، لیکن اس کو دوسرے علوم و فنون کی طرح علم و روایت حدیث کا بھی شوق تھا، خطیب نے تاریخ بغداد میں اس کے حوالے سے چند روایتیں نقل کی ہیں اور وہ یہ ہیں :-

---

[1] عصر المامون ج اول ص ۳۷۴ [2] معجم الادباء ج ۶ ص ۵۴،

هذا اقيمت الصلوٰة فلا صلوٰة الا المكتوبة، انه النبی صلی الله علیه وسلم صلی علی لمنفسة من كل ماسقط من الخوان فوزت اولادا كانوا صباحا[1]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگرچہ اس کے بعض فاسد خیالات گمراہی پر مبنی ہیں، تاہم اسے مذہب سے تعلق تھا، اور اس نے متعدد مذہبی مسائل نظم قرآن، اثبات نبوت اور فقہ و افتا وغیرہ پر کتابیں لکھی ہیں،

شعر و سخن جاحظ شعر و سخن کا بھی بلند مذاق رکھتا تھا اور خود بھی شعر کہتا تھا، حماز وغیرہ کی ہجویں اسکے اشعار ملتے ہیں، وہ موقع بموقع اپنی کتابوں میں اشعار نقل کرتا ہے انھیں بطور استشہاد پیش کرتا ہے، شعر و سخن کے محاسن اور خصوصیات پر دوسرے ادیبوں سے مباحثہ اور مذاکرہ بھی کرتا تھا، مبرد کا بیان ہے کہ جاحظ نے ایک روز مجھ سے پوچھا کہ تم کو اسمٰعیل بن قاسم کے اس شعر کے ایسا کوئی شعر یاد ہے:

ولا خير فيمن لا يوطن نفسه   على نائبات الدهر حين تنوب

جو شخص حوادث روزگار کو انگیز کرنے کا خوگر نہیں اس میں کوئی خوبی نہیں،

میں نے کہا ہاں کثیر کا شعر اسی مفہوم میں ہے:

فقلت لها يا عز كل مصيبة   اذا وطنت يوما لها النفس ذلت[2]

میں نے کہا اے عزہ ہر درد و الم کا جب آدمی خوگر ہو جاتا ہے تو وہ آسان ہو جاتا ہے۔

یموت بن مزرع کا بیان ہے کہ میں نے اپنے ماموں جاحظ سے سنا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ ابونواس کے ان شعروں سے بہتر اشعار ان کی نظر سے نہیں گذرے، پھر انھوں نے آٹھ شعر پڑھے، جس کا مطلع یہ تھا:-

ودار ندامى عطلوها وادلجوا   بها اثر منهم جديد ودارس

اس کا بیان ہے کہ میں نے ابوشعیب قلال کے سامنے یہ اشعار پڑھے، تو انھوں نے کہا او حثا

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۲۱۲ [2] امالی ج اول

اگر ان میں کرید کیجائے تو ان کا کھوکھلا پن ظاہر ہوجائے گا، میں نے کہا افسوس آپ کو گھڑے اور ٹھیکریوں کا فرق نہیں معلوم[1]

حکمت و دانائی جاحظ ایک حکیم و دانا انسان بھی تھا اور اکثر بڑی سنجیدگی اور حکمت کی باتیں بھی کرتا تھا، اس کے بہت سے حکیمانہ مقولے اس کی کتابوں میں ملتے ہیں مبرد کا بیان ہے کہ جاحظ نے کہا کہ:-

احذر من تامن فانک	جس سے تم کو اطمینان ہو اس سے چوکنے رہو کیونکہ
حذر ممن تخاف[2]	جس سے تمھیں خوف ہوتا ہے اس سے تو ہوشیار رہتے ہی ہو

ایک مرتبہ اس نے کہا کہ جب کسی سے یہ بات سنو کہ "ماترک الاول للآخر شیئاً" یعنی متقدمین نے متاخرین کے لیے کوئی چیز باقی نہیں چھوڑی، تو سمجھ لو کہ وہ کام کرنا اور کامیاب نہیں ہونا چاہتا[3]،

یموت بن مزرع جاحظ سے روایت کرتے ہیں کہ آدمی کی سخاوت اسی وقت تک قابل تعریف ہے جب تک وہ اسراف اور تبذیر کی حد کو نہ پہنچے، شجاعت اسی حد تک پسندیدہ ہے کہ وہ ہوج نہ بنجائے، احتیاط اتنے ہی ہونی چاہئے کہ اس کو جبن (بزدلی) نہ کہا جا سکے، آدمی جری ہو مگر شوخ اور بے شرم نہ ہونا چاہیے، باتونی ہو مگر بکواس نہ کرتا ہو، باوقار اور خاموش ہو، مگر بات کرنے میں عاجز و درماندہ نہ ہو، حلیم ہو مگر بردباری ذلت کی حد تک نہ پہنچے، انتقام لے مگر ظالم نہ بنجائے، سنجیدہ ہو مگر بلید نہ بن جائے، ناقد و مبصر ہو لیکن کسی چیز کے پرکھنے میں خطاکار نہ ہو، پھر جاحظ نے کہا ان ساری باتوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مختصر مگر جامع اور بلیغ فقرہ میں کس خوبی کے ساتھ سمیٹ دیا ہے کہ "خیر الامور اوساطہا"، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کو جوامع الکلم، فصل الخطاب اور اظہار بیان کا علم عطا کیا گیا تھا[4]۔

اگر جاحظ کے اقوال کا استقصا کیا جائے تو دانائی اور حکمت کی بہت سی باتیں ملیں گی، ابو الفضل کا بیان ہے "کتب الجاحظ تعلم العقل اولاً والادب ثانیاً" جاحظ کی کتابوں سے پہلے دانشمندی و عقل پھر علم و ادب کی باتیں آتی ہیں۔

(باقی)

---

[1] کتاب الاذکیاء ج ۱ ص ۳۰۹ [2] معجم الادباء ج ۱۶ ص ۱۰۰ [3] ایضاً ص ۱۰۰ [4] ایضاً ص ۱۰۴

آثارِ علمیہ و ادبیہ

مکاتیب مولانا مناظر احسن گیلانیؒ

بنام

مولانا سید سلیمان ندویؒ

۳ مارچ ۱۹۴۳ء
حیدرآباد دکن
(جوار الجامعۃ العثمانیہ)

سیدی الکریم! زادکم اللہ عرفاناً و قرباً، السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

یقیناً ہم زمینیوں کے حدود سے آپ بہت بلند ہو چکے ہیں، یونہی بلندی کیا کم تھی، اور اب تو ماشاء اللہ حکیم الامت مدظلہ العالی کی نیابت و خلافت کی دولت سے سرفراز ہیں، اور عمر عزیز کے چہل سال کے بعد مولانا تھانوی کی ع رندکے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔ عمر بن عبدالعزیزؒ کا واقعہ یاد آیا، خلافت کے زمانہ میں لباس کی قیمت چند درم سے آگے نہ بڑھی، پوچھنے والے نے ولید اور عبدالملک کی گدی پر بیٹھنے والے سے پوچھا، مشہور جواب ہے کہ تمنا کی، مدینہ کی ولایت کی پوری ہوئی، فاطمہ بنت عبدالملک سے شادی کی پوری ہوئی، خلافت کی پوری ہوئی، اب جنت کی تمنا کی باری ہے، صرف اس کا سامان ہے، آپ نے بھی وہی کیا، اور خوب کیا، لمثل ھذا فلیعمل العاملون۔ بارک اللہ فیکم و علیکم۔

لیکن عریضۂ نیاز کے ساتھ اتنی بے اعتنائی کرنے کے باوجود جواب سے محروم رکھا گیا،

رسید کی خبر بھی غیر کے ہاتھوں پہنچائی گئی، اور یہ دار المصنفین کی رکنیت کا کیا قصہ ہے، بجٹ کے ملنے سے پہلے اس کا علم بھی کسی ذریعہ سے نہ ہوا، سمجھ میں نہ آیا کس خصوصیت کو میرے اس انتخاب میں دخل ہے، نظرِ عنایت نگاہِ کرم کے سوا اور کس چیز کا تصور کروں، حسب الحکم دستخط کر کے واپس بھیج رہا ہوں،

محضر نامہ کو شروانی صاحب کے پاس آپ نے روانہ نہیں فرمایا، ان کا خط آیا تھا کہ انتظار ہے، مگر آیا نہیں، نہ بھیجا ہو تو اب بھیج دیجئے، جہاں تک عجلت ممکن ہو کرنا چاہیے کہ ع

آفتہاست در تاخیر طالب را زیاں دارد - اور کیا عرض کروں، جی رہا ہوں، آپ کو اور مولانا عبد الباری کو دیکھتا ہوں، تو یہ شعر یاد آتا ہے" یاران تیز گام نے محمل کو جا لیا + ہم..... (الخ)

اور کیا عرض کروں، مولانا عبد الباری کا حال حدود رشک سے بھی آگے نکل گیا، اب میرے نزدیک تو وہ اچھے خاصے صاحب دل بزرگ ہیں، کثر اللہ امثالھم -

دیکھئے دار المصنفین مجھے اپنی رکنیت کے بعد بھی اپنے اندر آنے کی اجازت دیتا ہے یا نہیں، اب تک تو ع تو برون در چہ کردی کہ درون خانہ آئی کے ساتھ ہی ڈانٹ بتاتا رہا ہے۔ موازنہ دیکھ کر بحمد اللہ طبیعت خوش ہو گئی لیکن یہ دار المصنفین کا قومی اجتماعی خزانہ ہے، ہمارے احباب میں تو ایسے متعدد حضرات ہیں جن کے شخصی وفائن اس سے اضعافاً مضاعفۃ بڑھے ہوئے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ یہ کیسے ہوتا ہے، ساری زندگی اس تمنا میں کٹ گئی لیکن اللہ میاں نے اس تجربہ کا موقعہ نہ دیا، میں نے کبھی عرض کیا تھا کہ معاشیاتی مسائل کے متعلق کچھ چیزیں جمع ہو گئی ہیں، پہلے معارف میں بھیجنے کا خیال تھا، لیکن بعد کو دل سے اتر گیا، مسودہ کو ڈال دیا تھا، حال میں کالج کے مجلۂ علمیہ میں مضمون نہیں تھا، بھرتی کے لیے اسی کے ایک باب کو دے دیا تھا، میں نے آپ کے پاس بھجوایا تھا، ملا ہوگا، چند چیزیں ادھر خاص تیار ہوئیں،

لیکن ایسے وقت میں کہ ع چوں دورِ خسرو آمد می در سبو نماند + کاغذ و طباعت کی دشواریاں ایسی ہیں کہ اشاعت تقریباً ناممکن ہے۔ فقط

نیاز مند: مناظر احسن گیلانی

مولانا مسعود علی صاحب کی خدمت میں سلام عرض فرما دیجئے اور مبارکباد، مکرمی صاحب کا ایک کارڈ میرے قرآنی جنون کے متعلق آیا تھا، جواب تیار کر رہا ہوں، انشاء اللہ بھیجوں گا۔

۱۵ مارچ ۱۹۴۳ء
حیدرآباد دکن
جوار الجامعۃ العثمانیہ

سیدی الامام دمتم بالعافیۃ والسلام

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

"الحمد للہ الذی اسبغ علیکم نعمہ ظاہرۃ وباطنۃ" لیجئے ایک ہی سال میں حق تعالیٰ نے ظاہری و باطنی نعمتوں سے سرفراز فرمایا، ہندوستان کے دونوں علمی مرکزوں کو اتفاق کرنا پڑا کہ جن نیک نیت بزرگوں نے جس نصب العین کو پیش نظر رکھکر ندوۃ العلماء کے دارالعلوم کی بنیاد رکھی تھی بالآخر وہ اسی نتیجہ تک اپنے خریجوں کو پہنچا کر رہا۔ آن وا حدمیں دیوبند اور علی گڈھ دونوں نے اس کی تصدیق کی، آپ کو بھی مبارکباد دیتا ہوں، اور ان پاک جانوں کے نام سے فاتحہ خیر پڑھتا ہوں، جن پر بدگمانیاں کی گئیں لیکن بالآخر وہی سامنے آیا جو دور اندیشوں کے اس مقدس گروہ نے سوچا تھا، دین کی بھی توثیق ہوگئی، اور علم کی بھی، خدا کرے ندوہ اپنے نتائج کو آیندہ بھی اسی مثال کا تابع رکھے، وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

آپ کا گرامی رجسٹرڈ مل گیا، تاخیر کی وجہ سے دل میں وسوسے ضرور پیدا ہوئے لیکن بحمد اللہ وہ وسوسے ہی تھے، مگر آپ نے خاکسار کے معروضہ کو شاید زیادہ توجہ سے نہیں پڑھا،

یا جواب چونکہ دیر میں دینے بیٹھے، اس لیے فقیر نے جو کچھ عرض کیا تھا، اس کا خیال نہ رہا، آپ کی خدمت میں درخواست جو بھیجی تھی اس کا مطلب تھا خود اپنے دستخط سے اسے مزین فرماکر نواب صدریار جنگ بہادر کے پاس حبیب گنج بھیج دیجئے، لیکن آپ نے بجائے دستخط کرنے کے ایک مستقل سفارش نامہ ارقام فرماکر واپس فرما دیا، نواب مہدی یار جنگ بہادر کی خدمت میں آپ کے اس سفارش نامہ کے ساتھ اس درخواست کو خاکسار نے مولانا عبدالباری کی معیت میں پیش کیا، ان کی رائے بھی یہی ہوئی کہ آپ حضرت کے دستخط کے ساتھ یہ درخواست اگر پیش ہوگی تو کارروائی میں سہولت ہوگی، فرمایئے کیا دوبارہ خدمت عالی میں اسے بھیجوں، یا کوئی مصلحت مانع ہے، اگر ایسا ہے تو وہی ارقام فرمایئے، جہاں تک میں خیال کرتا ہوں، آپ کو کچھ خیال ہی نہ رہا، ورنہ بجائے ایک مستقل سفارش نامہ کے چند الفاظ کے ساتھ درخواست ہی دستخط کا ثبت کرنا سہل تھا، شاید جذب کا کچھ اثر ہو، خیر جو کچھ ہوا حق کی مرضی سے ہوا، خیر ہی ہوا، بچوں کی تقریب سے انشاء اللہ فراغت ہو چکی ہوگی، فبارک اللہ لکم ولہم، بالرفاہ والبنین،

واللہ جعل لکم من انفسکم ازواجا وجعل لکم من ازواجکم بنین وحفدۃ ورزقکم من الطیبات -

معلوم نہیں دسنہ میں کب تک قیام رہے گا، اپریل میں میرا کالج بھی انشاء اللہ بند ہوگا، اگر آپ حسب دستور گرمیوں میں گھر ہی رہے تو قدمبوسی کی سعادت انشاء اللہ حاصل ہوگی، آپ نے تو دیو بندیت کے امتیاز پر بھی قبضہ کرلیا، اب ہم غریبوں کے پاس کیا رہ گیا، بجز اسکے

توشاد گشتہ بغزاں دہی ومن بغلامی

خیال آتا ہے اور اس کو آنا چاہیے، لیکن حافظ کان میں کہتے ہیں

توبہ تقصیر خود افتادی ازیں در محروم / از کرمی نالی و فریاد چرا می داری
اے دلِ خام، ثمرے ازیں قصہ بدا / کارِ ناکردہ، چہ امید عطا می داری

اور سچ تو یہ ہے، جیسا کہ میرے چھوٹے بھائی مظہر سلمہٗ نے کہا کہ "سید صاحب تو ہمیشہ سے وہی تھے جس کی تصدیق مولانا تھانوی (متع اللہ المسلمین بطول بقائہٗ) نے فرمائی، وہ تو باہر سے زبردستی کچھ دن کے لیے وہ بنے رہے جو وہ نہیں تھے"،

علی گڑھ کے امتیاز سے تھانہ بھون کے امتیاز کا دل پر زیادہ اثر اور وزن ہے، لیکن بعض روایتوں میں پڑھا ہے، "فاروق" کا خطاب فاروق اعظمؓ کو یہودیوں سے ملا تھا، غالباً ابن سعد میں ہے، اس سے تسلی ہوئی، آخر علی گڑھ کا گروہ کیا یہودیوں سے بھی زیادہ ہم سے دور ہے،

الداعی لفلاحکم وصلاحکم

خاکسار مناظر احسن گیلانی

لیجئے یہ بھول ہی گیا، خاکسار کے ہرزہ سرائیوں کی جو مجلہ علمیہ میں شائع ہوئی ہے، آپ نے تعریف فرمائی ہے، معارف کے قابل ان کو سمجھتا تو کیا پہلے نہ بھیجتا، مگر جب زنگی کو کافور آپ قرار ہی دیتے ہیں، تو اشاعت کے لیے پوچھنے کی حاجت ہے؟ اس کے دوسرے اجزاء چند متفرق رسالوں میں بانٹ دیے گئے ہیں، شائع ہونے کے بعد خدمتِ گرامی میں حاضر ہوں گے۔

۳ر اگست ۱۹۴۳ء
حیدرآباد دکن
جوار الجامعۃ العثمانیہ

سیدی المحترم ادام اللہ مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

خدا جانے آپ کہاں ہیں، دلی کی گلیوں میں آپ کو ڈھونڈھا، اس لیے ڈھونڈھتا تھا

کہ حل کر دوں گا۔ اس یتیمی پر، جو باپ کے مرنے کے بعد پھر دہرا گئی، مفتی صاحب[1] سے معلوم ہوا کہ آپ کو بھوپال میں روک لیا گیا۔ دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ میں شریک ہونے کے لیے دیوبند گیا تھا کیا معلوم تھا کہ دیوبند کی مجلس ماتم میں شریک ہونا میرے لیے مقدر ہو چکا ہے۔ راستہ میں معلوم ہوا تھا کہ آپ بھی بھوپال آئے ہوئے ہیں، غالباً دلی میں۔ بہرحال آپ کو وہ غم مبارک ہو، جو انشاء اللہ سرمایۂ صد نشاط سرور ہے۔ بڑے بلند اختر آپ نکلے۔ وقت سے پہلے جاگے۔ ٹھیک جس وقت مجلس شوریٰ کا اجلاس شروع ہوا، دار العلوم میں جماعت دیوبند کے اس ستون اعظم کے انہدام کی خبر مدرسہ پہنچی، جو بحمد اللہ انہدام نہیں تعمیر ہے لیکن دنیا والوں کے لحاظ سے انہدام ہی سمجھا گیا، حیدر آباد جب واپس ہوا تو مولانا عبد الباری صاحب کو بہت متاثر پایا، تقریباً نیم جنونی حالت میں، مبارک ہے یہ جنون، خدا ہی جانتا ہے آپ کس حالت میں ہونگے، خواجہ[2] بچارے تو مجذوب ہی تھے، سنا ہے کہ کئی دن تک اپنے آپ میں واپس نہ ہوئے معلوم نہیں اب کیا حال ہے۔

اس وقت یہ عریضہ ایک خاص وجہ سے بھی لکھ رہا ہوں، دیوبند سے واپسی کے بعد معارف ملا، دیکھکر میں نے سر پکڑ لیا کہ ادارہ معارف نے میرے اس مضمون کو جو دار العلوم میں شائع ہوا تھا، معارف میں شائع کر دیا، مخمل میں ٹاٹ کا بخیہ، اور اس پر طرہ یہ ہے کہ دار العلوم والوں نے ایک تو میرے مسودہ ہی کو شائع کر دیا تھا جس کی نظر ثانی بھی نہ ہو سکی تھی، پھر اپنی طرف سے اس مسودہ کے منہ کالا کرنے میں دار العلوم کے کاتب و مصحح نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا، کاش اشاعت سے پہلے فقیر کو مطلع فرما دیا جاتا، کم از کم تنبیہ کر دیتا کہ ذرا سنبھل کر پروف اور کاپی کے دیکھنے والے صاحب دیکھیں گے، لیکن غفلت میں انھوں نے بھی لاپروائی سے کام لیا ہے، کہ مضمون نگار کو جتنی تکلیف اور جتنا احساس اپنے مضمون کے اغلاط کا ہوتا ہے، پڑھنے والوں کو

---

[1] حضرت مولانا مفتی [illegible] کی وفات کی طرف اشارہ ہے [2] خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب مسترشد و مجاز حضرت تھانوی رح

اس کی چنداں پروا نہیں ہوتی، لیکن اغلاط کی بھی حد ہوتی ہے، حد یہ ہے کہ فٹ نوٹ کس مقام کا تھا، لیکن ہند سہ کہاں پڑا، سخت تکلیف محسوس ہوئی، علاج غلط نامہ کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا، وہی بنا کر بھیج رہا ہوں، اگر مناسب خیال فرمایا جائے تو آیندہ نمبر میں اس غلط نامہ کو شائع کر دیا جائے، جو الگ اسی کے ساتھ منسلک ہے، اور کیا عرض کروں، دیوبند سے مولانا شبیر احمد صاحب کا تعلق بالکلیہ جدا ہو گیا، آیندہ دیکھئے کیا ہوتا ہے، ندوہ کا حال نہ معلوم اب کیا ہے، شروانی صاحب سے ملنے علی گڈھ گیا تھا، میرے ساتھ ہی وہ بھی لکھنؤ روانہ ہو گئے تھے، فرماتے تھے کہ آپ بھی لکھنؤ آئیں گے، الجھا ہوا ندوہ سلجھایا جائے گا،

دار العلوم کے شائع شدہ مقالہ کے بقیہ حصے اگر معارف میں آیندہ شائع ہوں تو کسی ناقد بصیر سے اس کی تصحیح کرا لیجئے، آزادی کے ساتھ وہ تصحیح کر سکتے ہیں، میں تو اس مضمون کو معارف کے لائق خیال بھی نہیں کرتا تھا، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ حیدرآباد میں، دلی میں جہاں کسی سے ملاقات ہوئی، اکثروں کو دیکھا کہ وہ اس کے مداح تھے، واللہ اعلم کیا بات ہے، یہ سچ عرض کرتا ہوں، میرے نزدیک تو اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے، لیکن جب لوگوں نے پسند کیا ہے، تو خیال ہے کہ اس کے آیندہ حصص جو بالکل ناکمل حالت میں پڑے ہوئے ہیں انھیں درست اور مکمل کرکے خدمت والا میں بھیجدوں گا،

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق دار العلوم دیوبند میں عند التعزیت جو ارتجالی تقریر خاکسار نے کی تھی، صدق میں شائد نظر سے گذرے، مولانا مسعود علی ندوی کی خدمت میں سلام فرما دیجئے، تعزیت کے ساتھ انھیں اس مبارک و مسعود حزن و غم کی تہنیت دیتا ہوں، ہر ایک کا مقدر اتنا اونچا نہیں ہے جسے یہ غم نصیب ہو ایسے کتنے ہیں؟ مولانا شاہ معین الدین صاحب کی خدمت میں بھی سلام عرض ہے۔

نیاز مند مناظر احسن گیلانی

[illegible]
[illegible]
جامعہ عثمانیہ

سیدنا الامام ! دمتم بالهناء والعیش المدام

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مدت ہوئی ایک عریضہ خدمت والا میں روانہ کرچکا ہوں، معلوم نہ تھا کہ نصیب دشمناں ادھر آپ پھر کچھ بیمار ہوئے، چند دن ہوئے اپنی طویل رخصت سے واپس ہوکر مولانا حبیب الباری صاحب حیدرآباد پہنچے ہیں تب معلوم ہوا کہ ادھر آپ کی طبیعت پھر کچھ بگڑ گئی تھی۔ بلا تصنع عرض کرتا ہوں کہ چل چلاؤ کے اس حال میں مسلمانان ہند کے اندر جن چند نفوس کے دم کو غنیمت خیال کرتا ہوں ان میں آپ تو شاید سب سے زیادہ اہمیت آپ ہی کے وجود گرامی کو حاصل ہوگئی ہے، دست بدعا ہوں کہ آپ صحت عاجلہ سے متمتع ہوچکے ہوں گے۔ اس وقت اس عریضہ کے لکھنے کی وجہ ایک تو آپ کی عیادت ہے۔ اور دوسری فوری وجہ معارف کا مضمون "حیات شبلی" کا نمونہ ہے جزاکم اللہ پڑھنے کے بعد بے ساختہ "لما ھذا فقد قضی ما علیہ" کا جملہ زبان پر جاری ہوگیا اپنے استاد کا حق آپ نے ادا کردیا، اور واقعی مولانا شبلی مرحوم کا جو حق تھا، اسی کو آپ نے ادا کیا ہے۔ اغراق وغلو، افراط وتفریط سے پاک، اس قسم کی سوانح عمری خصوصاً اس جدید عہد میں شاید ہی کسی کی مرتب ہوئی ہو۔ بلاشبہ مولانا شبلی قدیم وجدید علمی طبقہ کے درمیان ایک برزخی وجود کا مقام حاصل کیے ہوئے ہیں، لیکن افسوس کہ مضمون بہت جلد ختم ہوگیا، خدا جانے آگے کا کیا قصہ ہے۔ متعدد بار جامعہ عثمانیہ کے کتب خانے سے یہ لکھا چکا ہوں کہ دارالمصنفین کی ہر کتاب شائع ہونے کے ساتھ بھیجی جایا کرے، لیکن نہ حیات شبلی ہی آئی ہے اور نہ تاریخ ترکی، ضابطہ کی شکل میں اگر منگواتا ہوں تو مراسلہ بازی کا ایک طویل سلسلہ چھڑ جائے گا، کیا یہ ممکن ہے کہ سردست حیات شبلی کے دو نسخے میرے نام بھیج دیے جائیں، دونوں کی قیمت کتب خانے سے وصول کرکے ادا کردوں گا۔

میں کتب خانے کے نام ہی سے منگواتا، مگر اس میں جھگڑے دفتری پیدا ہو جائیں گے، بڑی مہربانی ہوگی اگر اس عریضے کے ملنے کے ساتھ ہی ان دونوں نسخوں کے بھجوانے کا بصیغہ اشد ضروری، دفتر کو حکم دیدیجئے، تاریخ ترکی تو ضابطہ کی شکل میں منگوا لیجائے گی، بے چینی حیات شبلی کے دیکھنے کی ہے، چند قطرات نے پیاس بھڑکا دی، خصوصاً فہرست نے تو کھلبلی سی باطن میں مچا دی ہے، جب تک پوری کتاب پڑھ نہ لونگا، چین نہیں آئے گا،

ہاں! صاحب مولانا شبلی مرحوم کے متعلق میرا ایک انفرادی نقطۂ نظر تھا، لیکن

در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

یعنی باوجود سب کچھ ہو جانے کے ابتدا میں بھی وہ ملا ہی تھے، بیچ میں بھی ملا ہی رہے، اور مرتے مرتے بھی ملاگیری کا کام انجام دیتے ہوئے، کسی حال میں ملائیت کے دائرہ سے نہ نکل سکے، ثبوت میں اسی چیز کو پیش کرتا تھا، جس کا ذکر سوانح میں کیا گیا ہے، کہ مقلدیت و غیرمقلدیت، شیعہ و سنی، رد آریہ، رد عیسائیت ساری زندگی ان کی ان ہی ملایانہ شغلوں میں گذری، اگرچہ دنیا انھیں مورخ، شاعر، لیڈر، تعلیمی ماہر وغیرہ وغیرہ سمجھتی رہی، اور میں ملائیت کے ساتھ کمال وفاداری کی دلیل اسے خیال کرتا ہوں، انھوں نے ملاؤں ہی سے سیکھا تھا، جو کچھ سیکھا تھا، ان ہی سے پڑھا تھا جو کچھ پڑھا تھا، اسی لیے ساری زندگی ان ہی کے آستانوں پر لباس بدل بدل کر گھومتے رہے، کسی موقع پر آپنے ان کی تحریر کے یہ الفاظ کہ "میں عقیدۃً بھی حنفی ہی ہوں اور عملاً بھی"، ان کی زندگی کی یہ آخری تحریر جسے کسی نمایش پر محمول نہیں کیا جا سکتا اور بھی ملائیت پر ان کے مہر لگا دیتی ہے، بہر حال جس طریقے سے آپکے قلم نے اس کو پیش کیا ہے، دل حکم کرتا ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ آخرت میں بھی وہ کامیاب رہیں گے، مجھ پر تو ان مقالات کے پڑھنے سے جتنی اب تک پڑھ چکا ہوں، یہی اثر پڑا ہے کہ کان رجلاً یحب اللہ و رسولہ اور اتقیہ کی ای [illegible] کا مصرف یہی ہے،

کفر کافر را و دین دیندار را ــ ذرۂ درد دل عطار را

خادمہ مناظر احسن گیلانی

[illegible] اگست [illegible]
دارالجامعۃ العثمانیہ
حیدرآباد دکن

مخدوم و محترم سیدی و سید المسلمین دمتم بالسناء والعافیۃ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

من غیر ترقب آپ کا لفافہ پرسوں ملا، پڑھکر مسرت ہوئی کہ بخیر و عافیت آپ دیسنہ سے اعظم گڈھ تشریف لے آئے ، اس کا افسوس ہوا کہ شاہ معین الدین صاحب فرلش ہیں ، جو ابکے نہ ملنے سے تردد ضرور ہوا تھا شکر ہے کہ "شیخین" کی باتیں آپنے بھی پسند فرمائیں ، ابھی ہاں کاغذ کی وجہ سے بڑی کھلبلی مچ گئی ، آپ لوگوں کا تو سارا کاروبار اسی کاغذ کی ناؤ پر جاری ہے ، خدا کرے کوئی صورت استثنا کی دار المصنفین کے متعلق نکل آئے ، اگرچہ تقریر میں نے حال میں صاحب حیدری کی اس مسئلہ کے متعلق پڑھی اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حکومت بھی کچھ مجبور سی نظر آتی ہے ، امید بہت کم ہے ، لیکن ماشاء اللہ آپ حضرات اثر والے لوگ ہیں ، کوئی صورت خدا کرے نکل آئے ، مثلاً بطائف انشاء اللہ کوئی مخلص نکالیں گے ،

حسب ارشاد میں نے رضوی کے معاملہ کی تحقیق اسی دن کرائی یعنی مولانا فضل حق صاحب جو اس سے کافی واقفیت رکھتے ہیں ، ان کو رضوی کے پاس بھیجا ، آج مولانا نے یہ خبر مجھے سنائی ہے کہ براہ راست ان سے وہ ملا اور کہا کہ آج ہی اس نے آپ کی خدمت میں خط بھی بھیجا ہے اور روپیہ بھی حسب الوعدہ اس نے بیان کیا کہ آج بذریعہ بیمہ روانہ کر چکا ہے ، یا روانہ کرے گا ، ایسی صورت میں بجز انتظار کے اور کیا کر سکتا ہوں ، مولانا فضل حق صاحب سے میں نے کہا ہے کہ رضوی کو براہ راست مجھ سے ملنے کے لیے کہیے وعدہ تو آنے کا کیا ہے ، اس سلسلہ میں بس یہی کارروائی کی گئی ہے ، خدا کرے جو کچھ اس نے کہا ہے وہی کیا بھی ہو ،

آپکے دفتر میں "الدین القیم" اور تعلیم و تربیت والی دونوں کتابیں پہنچ گئیں ، دیکھیں آپ حضرات کی خدمت کیا ہوتی ہے ، معاشی مضامین کے متعلق آپ نے پہلے بھی لکھا ہے اور اب بھی کہ یہ کروں میں اپنا حال کیا عرض کروں ، جسے آپ نے قلم کا شباب لکھا ہے وہ میری خستگی کی ایک حالت ہے ، ایک وجہ

[illegible]

جب لکھنے بیٹھا تو لکھتا چلا گیا، اب پھر اس پر نظر ثانی، حک و اصلاح میرے لیے مشکل ہے، آپ کے یہاں
فن تصنیف کے طلبہ کی ایک تعداد تو ہمیشہ رہتی ہے، کیا ان ہی حضرات میں کسی کو آمادہ فرما سکتے ہیں،
کہ خرافات کو حذف کر کے کارآمد اجزاء کا انتخاب کر لیں، بہرحال آجکل تو چند دوسرے مشغلوں میں
تدوین فقہ پر ایک مضمون لکھا تھا، دوبارہ اس کو مرتب کر کے لکھنے لگا، تو اس نے بھی کتاب ہی کی شکل اختیار
کر لی ہے، ابتدائی سو صفحات اس کے جامعہ عثمانیہ کے تحقیقاتی مجلہ میں ایک سال ہوا چھپنے کے لیے
دیا تھا، مضمون چھپ تو گیا ہے، لیکن دس پانچ صفحہ ایک صاحب کے مضمون کا باقی ہے، سرکاری کام ہے
کب نکلتا ہے، ایک کاپی اس کی اسی ہفتہ میں انشاء اللہ تعالیٰ خدمتِ والا میں حاضر ہوگی، اور بھی
چند کام جاری ہیں، شاید وقت پورا ہو رہا ہے، جو کچھ اس عرصہ میں نکلا تھا، لکھوایا جا رہا ہے، امیدوار دعا
و توجہ ہوں، مولانا عبد الباری کی حالت دن بدن بہت زیادہ قابل رشک بنتی جا رہی ہے، میں تو
ان میں ہر دن ارتقاء کی کیفیت پا رہا ہوں، وہ بڑی روح اور بڑے نفس کے آدمی ہیں،

معلوم نہیں اب ندوہ کی کیا حالت ہے، مولانا عبد الحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب کے
متعلق آپ یہاں موجود ہی تھے، جب کارروائی ہوئی تھی، مہینوں گذر گئے، لیکن جس حال میں چھوڑ کر
ہم لوگ گئے تھے، آنے کے بعد معلوم ہوا کہ ابھی وہیں ہے، یعنی مسودہ کے منگوانے کی کارروائی تک نہ ہو سکی،
اب مجھ سے پتہ دریافت کیا گیا ہے، دیکھئے کب کشتی کنارے لگتی ہے، فقط

نیاز مند مناظر احسن گیلانی

مولانا مسعود علی صاحب کی خدمت میں بہت بہت سلام عرض ہو، ان کے حکیمانہ ظرافت آمیز فقرے بہت یاد
آتے ہیں، ولهم ايدي دائمة على مسئلة! لکا فذ جاد کا لے دے کے یہی ایک اڈہ رہ گیا تھا، لیجئے اس پر بھی نفس لگ گیا،
"تبلغیہ" ہی پر اب عمل کیا جائیگا، ورنہ صورت ہی کیا باقی رہی، مولانا عبد الباری بڑے خوش ہیں، مصحفی جیسے کی بات تو
مولانا مسعود علی کیلئے بھی ہونی چاہیے، لیکن کاش وسعت اور کوئی ہوتی، بہرحال "کامندی ناؤ" کے ملاحوں کے سستانے کا بھی تو
وقت آگیا، اس طوفان میں اپنی کشتی "ساحل تک بخیر و سلامتی کون پہنچاتا ہے"!

ادبیات

تمنائے حضوری

از

زائر حرم جناب حمید صدیقی لکھنوی

اک تشنۂ دیدار پہ ہو جائے کرم اور — اک بار بلا لیجئے اے شاہِ امم اور

کچھ اس لیے رکھتے ہیں وہ محروم کرم اور — ہو جائے دل اپنا ابھی شائستۂ غم اور

میں ایک تمنا ہے پیارے شاہِ امم اور — وہ خلدِ نظر، ایک نظر دیکھ لیں ہم اور

جب تک کہ سرکار کے قدموں میں لگی تھی — آنکھوں سے لگائیں وہی پیوندِ قدم اور

حسرت ہی نہیں کچھ دلِ دیدار طلب کی — طیبہ کے سوا شوقِ نظر اور کی قسم اور

وہ سلطنتِ بادیہ سر دیر کو نیچ — اے راہبرِ کوئے حرم چند قدم اور

کعبے کی ہے کیا بات، مگر کوئے نبی میں — ہے بات ہی کچھ دیدۂ حیراں کی قسم اور

ہاں پاسِ ادب اے شرفِ اندوزِ زیارت — ہٹ کر درِ اقدس سے ذرا چند قدم اور

جمعہ بھی ہوگی گناہوں پہ ندامت — ہوں گے اسی نسبت سے وہ مائل بکرم اور

یوں بھی کرمِ خاص کے قابل نہ تھے لیکن — مایوس کیے دیتے ہیں دنیا کے ستم اور

اب عافیت بھی ہے تیرے تقیں [illegible] — ہم ہجر کے ماروں کو جدا ایک [illegible]

تھی تمنا کہیں پہنچے یہ [illegible] تک — اور اب تمنا ہے [illegible]

پہنچائے صبا جا کے حضور شہ کونین — اک آخری پیغام یہ ازمن دلگیر اور
مل جائے پھر اک بار ہمیں اذن حضوری — حاضر ہوں سلامی کو در پاک پہ ہم اور

مشتاق ہیں کچھ اور حمیت اہل محبت
ہو نغمہ زن اے بلبل بستانِ حرم اور

غزل

از جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری

ہستی کے کم و کیف سے بیگانہ بنا دے — اے چشم فسوں گر مجھے دیوانہ بنا دے
اے ساقیٔ میخانہ تری بات تو جب ہے — بے بادہ و ساغر مجھے مستانہ بنا دے
دیوانہ میں ہو جاؤں تو کر ہوش کی تدبیر — جب ہوش میں آ جاؤں تو دیوانہ بنا دے
تو شمع ہے جس بزم کی اے نورِ مجسم — قسمت مجھے اس بزم کا پروانہ بنا دے
عنوان کوئی ہو کہ نہ ہو پھر بھی یہ دنیا — چاہے تو حقیقت کو بھی افسانہ بنا دے
میرے لیے دشوار ہے تکمیل جنوں کی — تیرے لیے آسان ہے کہ دیوانہ بنا دے

مدت سے تمنا ہے اسی پھول کی جوہر
گلشن کو نگاہوں میں جو ویرانہ بنا دے

غزل

پروفیسر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشا (ناگپور)

یہ کمالِ شوق ہے اپنا کہ ہے جا دوئے دوست — ہم نے ہر ذرہ میں دیکھا ہے جمالِ روئے دوست

اتحادِ باہمی کا یہ بھی اک اعجاز ہے — اب نفس میں بھی اکثر آتی ہے خوشبوئے دوست

جان و دل میں کھلنے لگتی ہیں مقدس کلیاں — یاد آ جاتا ہے جس دم سایۂ گیسوئے دوست

تو ملا تو سرمۂ چشمِ بصیرت مل گیا!! — آ تجھے آنکھوں میں رکھ لوں اے غبارِ کوئے دوست

آرزوئے زیست کا کیا جانیے کیا حشر ہو — بے قراری شیوۂ دل، بے نیازی خوئے دوست

لوگ کیوں دیر و حرم کے چکروں میں پڑ گئے — دو قدم تو کوچۂ دل سے تھی راہِ کوئے دوست

نشاؔ، ان کی ذات ہوتی ہے چمن اندر چمن

پالیا ہے جن سد استوں نے رازِ بوئے دوست

نفیرِ عشق

از

جناب حکیم نیر واسطی لاہور

یہ نظم حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر کہی گئی تھی

بشنو از من چوں شکایت می کنم — از نفیرِ نے حکایت می کنم

نالۂ دل گیرِ نے جانم بسوخت — کینۂ پندارِ ایمانم بسوخت

صبر از دل رفت و دل بشکست و رفت — رخت سوئے شہرِ دلبر بست و رفت

گل ز باغ حسن او چیدن گرفت — در دیارِ عشق رقصیدن گرفت

خاکِ راہ جادۂ رومیؔ شدم — مست جامِ بادۂ رومیؔ شدم

ہوش رفت از جامِ پیمانِ الست — نالۂ گم شدہ نیستانِ الست

[illegible] در جگر سوزِ نہاں آوردہ ام

[illegible] تو خیمہ در مکاں آوردہ ام

مطبوعات جدیدہ

سرچشمۂ قرآن ۔ از ابو الفدا محمد عبد القادر، صفحات ۳۴۴، کتابت و طباعت بہتر، پتہ حیدر اینڈ سنس، کتب فروش، چارکمان، حیدر آباد دکن

مشہور عیسائی مستشرق ڈاکٹر ٹسڈل نے سورس آف اسلام کے نام سے ۲۵-۳۰ برس پہلے ایک کتاب لکھی تھی جسکا اردو ترجمہ ۱۹۲۵ء میں نگار کے ایک خاص نمبر میں ماخذ القرآن کے نام سے شائع ہوا تھا، اس کتاب میں مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نعوذ باللہ قرآن مجید منزل من اللہ کتاب نہیں ہے، بلکہ اس کی تعلیمات وقصص سب سابقہ کتب سماوی اور جاہلی رسوم سے ماخوذ ہیں، ڈاکٹر ٹسڈل نے قرآن، اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی نیا اعتراض نہیں کیا ہے، بلکہ انہی اعتراضات کو مرتب طور پر ایک نئے انداز میں دہرایا ہے جن کو متعدد مستشرقین اس سے پہلے پیش کر چکے ہیں، اور جن میں سے ایک ایک کا جواب علمائے اسلام دے چکے ہیں، خود معارف میں بھی اس موضوع پر متعدد مضامین نکل چکے ہیں، مگر یہ اعتراضات کسی نہ کسی انداز میں دہرائے جاتے رہتے ہیں، اس لیے ضرورت تھی کہ ایک جگہ مرتب و مکمل طور پر ان تمام اعتراضات کا جواب دیدیا جائے، تاکہ پڑھنے والے کو آسانی ہو، اسی کمی کو ابو الفدا نے سرچشمۂ قرآن کے ذریعہ پورا کیا ہے، ابو الفدا صاحب نے نہایت دیانتداری سے ڈاکٹر ٹسڈل کے ایک ایک اعتراض کو نقل کیا ہے، اور اس کا بہت ہی محققانہ اور عالمانہ جواب دیا ہے، کہیں انھوں نے مناظرانہ اور معاندانہ رنگ نہیں آنے دیا ہے، کتاب کے مطالعہ سے معرفت

معترضات کی سطحیت معلوم ہوتی ہے، بلکہ اس سے معلومات میں اضافہ اور قلب کو تسکین بھی ہوتی ہے۔

آثار لاہور ۔ از سید ہاشمی فرید آبادی، صفحات ۱۷۹، کتابت و طباعت متوسط،

ناشر ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور، قیمت للعہ

شہر لاہور اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے ہر زمانہ میں علماء، صلحاء اور شعراء و سلاطین کا مرکز توجہ رہا ہے، اس کی خاک میں نہ جانے کتنے گنجہائے گراں مایہ مدفون ہیں، یہ اپنی تاریخی اور علمی خصوصیت کے لحاظ سے دلی سے کم نہیں ہے، مگر افسوس ہے کہ اس کی قدیم تاریخ پر بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے، سید ہاشمی صاحب فرید آبادی جو اپنی تاریخ دانی کے لیے سارے ہندوستان میں مشہور ہیں اس کتاب کے ذریعہ اس کی قدیم تاریخ سے اہل علم کو باخبر کرنے کی کوشش کی ہے، اس کتاب کے دو حصے ہیں، پہلا حصہ ارباب سیف و سیاست کے حالات اور کارناموں پر مشتمل ہے، اور دوسرے حصہ میں صاحبان علم و فضل کا تذکرہ ہے، پہلے حصہ میں اسلامی عہد کی ابتدا سے مغلوں کے زوال تک کے سیاسی حالات کا ذکر ہے، اور دوسرے حصہ میں متعدد شعراء، علماء اور فضلاء کے علمی و عملی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے، خاص طور پر کشف المحجوب اور صاحب کشف المحجوب شیخ علی ہجویری کے بارے میں کافی تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے، کتاب کے مفید ہونے کے لیے ہاشمی صاحب کا نام خود ضمانت ہے۔

بابائے اردو مولوی عبد الحق مرحوم ۔ از عبد اللطیف اعظمی، صفحات ۲۰۴

کتابت و طباعت متوسط، ناشر ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ، قیمت للعہ

ڈاکٹر عبد الحق مرحوم کی شخصیت علم و عمل دونوں کا مجموعہ تھی، ایک طرف وہ بالغ نظر نقاد، محقق اور صاحب طرز انشا پرداز تھے، دوسری طرف ایک مجذوب مجاہد کی طرح نصف صدی تک اردو کی بقا اور اس کا جائز حق دلانے کے لیے جد و جہد میں سرگرداں رہے، انکی علمی و ادبی

صلاحیتوں کا شاہکار ان کی محققانہ تصانیف، ان کے گرانقدر مقدمے اور متوازن اعلیٰ تبصرے ہیں، اور ان کے عملی کارناموں کا مظہر انجمن ترقی اردو ہند و پاک اور اردو کالج ہے، غرض ان کے علمی و عملی کارنامے اتنے زیادہ ہیں کہ ان پر ایک مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے، اور اس کی ابتدا عبد اللطیف صاحب اعظمی نے اس مجموعہ سے کر دی ہے، ہندوستان کے متعدد مشہور اصحاب قلم نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے اوصاف و کمالات پر ان کی زندگی میں اور مرنے کے بعد جو مضامین لکھے، ان سب کو عبد اللطیف صاحب نے اس مجموعہ میں بڑے سلیقہ سے جمع کر دیا ہے، اور خود بھی ایک مختصر اور جامع مضمون لکھا ہے، جس سے ان کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی پڑ جاتی ہے، کتاب ہر کتب خانہ میں رکھنے اور بار بار مطالعہ کے لائق ہے۔

گاندھی اور نہرو کی راہ - از ڈاکٹر سید عابد حسین، صفحات ۲۰۰، کتابت و طباعت عمدہ

ناشر انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، قیمت صہ

گاندھی جی نئے ہندوستان کے معمار ہیں، وہ ہندوستان کی آزادی کی لڑائی کی ۲۵-۳۰ برس تک رہنمائی کرتے رہے، اور انھوں نے یہ لڑائی اپنی زندگی میں جیت بھی لی، مگر گاندھی جی کی جد و جہد کا محور محض ہندوستان کی سیاسی آزادی تک محدود نہیں تھا، بلکہ وہ نئے ہندوستان کے سماج کا ایک نیا نقشہ اور مذہب و اخلاق کے تحفظ و بقا کا ایک مشن بھی رکھتے تھے، چنانچہ جب ان کو محسوس ہوا کہ ان کے ساتھ کام کرنے والوں کی اکثریت انکی سیاسی سرگرمیوں میں تو ان کا ہاتھ بٹاتی ہے، مگر ان کے مذہبی و اخلاقی تصورات اور سماجی نصب العین اور اخلاقی سیاسی خیالات کو اپنانے سے جی چراتی ہے تو کانگریس کی رہنمائی کے ساتھ انھوں نے آشرم میں رہکر اپنا زیادہ وقت ایسے کارکنوں کی تربیت اور ایسی تصانیف پر صرف کرنا شروع کیا جو انکے اخلاقی فلسفۂ زندگی کو سیاسی و سماجی زندگی میں داخل کر سکیں،

گاندھی جی کی سحر کن شخصیت سے متاثر ہو کر جن ممتاز لوگوں نے ہندوستان کی سیاسی آزادی میں گاندھی جی کا ساتھ دیا ان میں ایک جواہر لال نہرو بھی ہیں، جواہر لال اپنی افتاد طبیعت، مغربی مزاج و فکر

کے لحاظ سے گاندھی جی سے بہت مختلف ہیں مگر اس کے باوجود گاندھی جی ہمیشہ ان کو اپنا سیاسی وارث سمجھتے رہے، ڈاکٹر عابد حسین صاحب جو ان دونوں شخصیتوں سے عقیدت و محبت رکھتے ہیں اور ان کی تمام تصانیف کا غائر مطالعہ کیا ہے، اور ان میں سے بعض کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے، انھوں نے اس کتاب کے ذریعہ دونوں کے فلسفۂ زندگی اور سیاسی نصب العین اور ایک فلاحی ریاست کے تصورات پر بڑے شگفتہ انداز میں تفصیل سے بحث کی ہے اور ان دونوں نے نئے ہندوستان کے لیے جو معاشی و سماجی نصب العین کا خاکہ پیش کیا ہے اس کے نقطۂ اتحاد و اختلاف کو واضح کرنے اور ان میں تطبیق دینے کی کوشش کی ہے، شروع میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نائب صدر جمہوریہ ہند کے قلم سے پیش لفظ ہے جس سے کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

رگِ جاں

از ڈاکٹر خورشید الاسلام صفحات ۱۱۲، ٹائپ عمدہ، ناشر انجمن ترقی اردو علی گڑھ، قیمت ۶ روپے

ڈاکٹر خورشید الاسلام ایک اچھے نقاد بھی ہیں اور بالغ نظر شاعر بھی، ان کی تنقیدی صلاحیتوں کا علم تو ان کی نثر کے ذریعہ برابر ہوتا رہا، مگر ان کی شاعرانہ خوبیوں سے کم لوگ واقف تھے۔ رگِ جاں ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے، جو اہلِ ذوق کے ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے، اس مجموعہ میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی، اور ان کی تمام ہی نظمیں اور غزلیں متانت، سنجیدگی اور شاعرانہ خوبیوں کا اعلیٰ نمونہ ہیں، خاص طور پر ان کے کلام میں معنویت کے ساتھ تشبیہ و استعارات کے استعمال اور الفاظ کے انتخاب میں قدیم و جدید کا بڑا خوشگوار توازن نظر آتا ہے، امید ہے کہ ان کی تنقیدی تحریروں کی طرح ان کی شاعرانہ کلام بھی ذوق و شوق سے پڑھا جائے گا۔

م ۔ ع

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس، اعظم گڈھ

مقام اشاعت	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	ماہانہ
نام پرنٹر	صدیق احمد
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	"
قومیت	....
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام اڈیٹر	شاہ معین الدین احمد ندوی
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام و پتہ مالک رسالہ	"

میں صدیق احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں میرے علم میں صحیح ہیں۔

صدیق احمد

جلد ۹۱ - ماہ ذیقعدہ ۱۳۸۲ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۶۳ء - عدد ۴

مضامین

مقالات

آثار علمیہ و ادبیہ

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ پاکستان کے نامور فاضل مولوی محمد شفیع صاحب سابق پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور نے انتقال کیا، ان کی وفات علمی دنیا کا بڑا حادثہ ہے، وہ ہند و پاک کے نامور فضلاء و محققین میں تھے، انگریزی کے ساتھ عربی و فارسی کے بھی ماہر تھے، ان کا علمی پایہ بہت بلند تھا، ان کے علمی و تحقیقی کارنامے بڑے متنوع ہیں، بہت سے فاضلانہ علمی مقالات کے علاوہ انھوں نے عربی و فارسی کی متعدد اہم اور نادر کتابوں کو تصحیح و تحشیہ کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا، اپنی پرنسپلی کے زمانہ میں علمی حیثیت سے اورنٹیل کالج میگزین کا معیار بہت بلند اور اپنے تلامذہ میں سنجیدہ علمی تلاش و تحقیق کا ایک عام ذوق پیدا کر دیا تھا، چنانچہ لاہور کے موجودہ فضلاء اور محققین میں بیشتر انہی کے تربیت یافتہ ہیں، ادھر چند سال سے لاہور یونیورسٹی میں اردو انسائیکلوپیڈیا کی تالیف و اشاعت کا کام ان کی نگرانی میں شروع ہوا تھا، اور اس کے بعض اجزاء شائع بھی ہوئے لیکن ابھی یہ کام ابتدائی منزل میں ہے، اس قحط الرجال کے زمانہ میں علمی ذوق و طلب میں ان کی ذات علمائے سلف کا نمونہ تھی، اللہ تعالیٰ اس شیدائے علم کو رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے۔

مولانا محمد علی مرحوم کی حیثیتیں اور ان کے کارنامے بڑے گوناگوں ہیں، وہ جنگ آزادی کے ان سالاروں میں ہیں جنھوں نے ہندوستان میں آزادی کی روح پھونکی، اس راہ میں انکی قربانیاں اور ان کے خاص وطنی و ملکی خدمات کانگریس کے کسی بڑے سے بڑے لیڈر سے کم نہیں ہیں، اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سب سے پہلے انھی نے کانگریس میں جان ڈالی تھی، مسلمانوں کے تو خاص قائد و رہنما تھے، ان کے زمانہ میں مسلمانوں کا کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جس میں ان کا

نمایاں حصہ لیا ہو بلکہ ہر محاذ میں انہی کی شرکت سے جان پڑتی تھی، خلافت کی تحریک کے زمانے میں تو انہی کا
حصہ تھا، ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۱ء تک ان کی زندگی ایک جہاد مسلسل تھی، اور تقریباً چوتھائی صدی تک وہ ہندوستان کی سیا
ست پر چھائے رہے، ان کے دور میں مسلمانوں میں سب سے زیادہ نمایاں شخصیت انہی کی تھی لیکن یہ بڑے افسوس کا
مقام ہے کہ ہندوستان نے بہت جلد اپنے اس محسن اعظم کو بھلا دیا، اور ان کا نام بھی کسی موقع پر نہیں آنے پاتا، اس سے
زیادہ افسوس مسلمانوں کی بے حسی پر ہے کہ وہ بھی اس "مرد مومن" کو بھولتے جاتے ہیں۔

ان حالات میں یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوئی کہ لاہور میں "محمد علی اکیڈمی" کے نام سے ایک ادارہ قائم ہو رہا ہے،
مولانا محمد علی مرحوم پر ابھی بہت کم کام ہوا ہے، انکی وفات کے بعد مولوی رئیس احمد صاحب جعفری نے انکی ایک سوانح عمری
لکھی تھی، جو اسی زمانہ میں جامعہ ملیہ سے شائع ہوئی تھی، مگر وہ مصنف کی تصنیفی زندگی کا ابتدائی دور تھا، اس لیے ناقص
تھی، گو کچھ نہ ہونے کے مقابلہ میں غنیمت تھی، اس کے بعد محمد سرور صاحب نے مولانا مرحوم کے قلم کے ہمدرد کے مضامین
کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا، جو ۱۹۳۸ء میں جامعہ ہی سے شائع ہوا تھا، ابھی گذشتہ سال انھوں نے ایک
کتاب "مولانا محمد علی بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز" لکھی ہے جو لاہور سے شائع ہوئی ہے، اس میں خود مولانا محمد علی
مرحوم کی تحریروں اور مضامین کی روشنی میں انکی شخصیت اور ان کے کارناموں کو دکھایا گیا ہے، اس لیے اسکی
حیثیت گویا خود نوشت سوانح کی ہے، اور اس حیثیت سے وہ بڑی قابل قدر ہے[1]، لیکن مولانا محمد علی مرحوم
کی شخصیت اتنی جلیل القدر، اور ان کے کارنامے اتنے گوناگوں ہیں کہ ان چند کتابوں سے ان کا حق ادا نہیں
ہوتا، اور ان پر مستقل کام کرنے کی ضرورت ہے، توقع ہے کہ یہ اکیڈمی اس فرض کو پوری طرح انجام دیگی،
اور مولانا محمد علی مرحوم کے مداح، علم و قلم کے قدرداں اور متوسلین اس کام میں مدد کریں گے۔

پاکستان میں مذہب کے ایک حلقہ میں مذہب اور روحانیت کا احساس پیدا ہو چلا ہے، اس کے

---

[1] اس سلسلہ کی دوسری اہم کتاب مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کی "محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق" ہے [illegible]

یہ بے چینی کا ایک سبب تو یہ ہے کہ مغربی قوموں کے مادی تصورِ حیات اور انکی مادی تہذیب کی پیدا کی ہوئی بے چینی و بے اطمینانی، بے قید آزادی کے تلخ نتائج، قومی سربلندی اور سیاسی برتری کے جنون نے قوموں میں باہمی رقابت اور کشمکش پیدا کر دی ہے جس نے ان کو نہ صرف قلبی سکون اور روحانی طمانیت بلکہ دنیاوی امن و سکون سے بھی محروم کر دیا ہے، اس لیے اب انکی زبانوں پر مذہب اور روحانیت کا نام آنے لگا ہے،

دوسرا سبب یہ ہے کہ کمیونزم سیاسی قوت اور مادی ترقی کے ہر میدان میں اتنا آگے بڑھ گئی ہے کہ مغربی قوموں کے لیے خطرہ بن گئی ہے۔ گو انکی تہذیب بھی خالص مادی ہے لیکن اس کی بنیاد الحاد و بے دینی پر نہیں ہے، اور انکے یہاں کم از کم خدا اور مذہب کا نام اور اس کا کچھ نہ کچھ اثر باقی ہے، اس کے مقابلہ میں کمیونزم کی بنیاد تمام تر مادہ پرستی، ناخدا شناسی اور الحاد و دہریت پر ہے، اس لیے اس کے مقابلہ کے لیے مادی وسائل کے ساتھ مذہب کے نام پر بھی اپیل کیجا رہی ہے، اور مختلف مذہبی تدبیریں اختیار کی جا رہی ہیں، لیکن ان . . . امراض کا یہ علاج نہیں ہے، یہ ساری خرابیاں، مادی تصورِ حیات اور مادی تہذیب کی پیدا کردہ ہیں، جب تک اس تصور میں تبدیلی نہ ہوگی اور عمل میں اس کا اثر ظاہر نہ ہوگا، اس وقت تک محض مذہب کے نام اور اخلاقی وعظ سے کوئی روحانی و اخلاقی انقلاب نہیں پیدا ہو سکتا، اور مغربی قومیں مادی تہذیب میں اس قدر غرق ہیں کہ کسی آسمانی تنبیہ کے بغیر اس سے ان کا نکلنا بہت مشکل ہے، اور یہ تنبیہ ایٹمی جنگ کی شکل میں ہوگی، اس کے بعد جو نسل باقی رہ جائیگی، اس میں شاید مذہب اور روحانیت کا حقیقی احساس پیدا ہو،

گذشتہ مارچ ۱۹۶۳ء کو ہمارے رفیق کار سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب نے دلی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں "ہندوستان کے فارسی لٹریچر میں حب وطن" کے عنوان سے انگریزی میں ایک توسیعی لکچر دیا جو بہت پسند کیا گیا، اس قسم کے لکچر علمی حیثیت کے علاوہ ثقافتی تعلقات کے نقطۂ نظر سے بھی مفید ہیں۔

مقالات

اسلامی ہند کے نصف اوّل میں علوم عقلیہ کا رواج

از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے، ایل ایل بی، رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی (اتر پردیش)

یہ مضمون گو مستقل ہے، لیکن ایک حیثیت سے گذشتہ مضمون کی کڑی ہے، اس لیے اس کو اسی سلسلہ میں شائع کرنا مناسب معلوم ہوا، "م"

(۱) نویں صدی سے پہلے معقولات کی گرم بازاری | ہندوستان میں قرونِ وسطیٰ کا آغاز ساتویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے، جب کہ عرب فاتحین اس ملک میں پہلی مرتبہ داخل ہوئے، اور خاتمہ ۱۸۵۷ء میں سمجھنا چاہیے، جب کہ برطانوی استعمار نے مغل سلطنت کے کھنڈروں پر انگریزی حکومت قائم کی، اس طویل مدت کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے:-

۱۔ عرب حکومت: [illegible] سے [illegible] تک

۲۔ ترک و افغان حکومت: ۶۰۲ھ سے ۹۳۲ھ تک

۳۔ مغل حکومت: ۱۵۲۶ء سے ۱۸۵۷ء تک

ذیل میں صرف پہلے دور کی علمی سرگرمیوں کا ایک مختصر تذکرہ پیش کیا جا رہا ہے:

(۱) عرب حکومت

عرب حکومت کو تین ذیلی ادوار میں مزید تقسیم کیا جا سکتا ہے

۲۔ عرب فاتحین کی آمد اور سرحدی جھڑپیں ۱۵ھ - ۹۲ھ

حسب تصریح البلاذری ۱۵ھ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عثمان بن ابی العاص کو بحرین اور عمان کا گورنر بنا کر بھیجا۔ انھوں نے عمان پہنچکر ایک بحری مہم بمبئی کے قدیم بندرگاہ تھانہ کی طرف روانہ کی۔ کچھ دن بعد ایک اور مہم بھڑوچ اور دوسری دیبل کی طرف بھیجی گئی۔ یہ سب مہمیں کامیاب رہیں لیکن حضرت عمرؓ دور دراز علاقوں کی فتوحات کو پسند نہیں فرماتے تھے، اس لیے کچھ عرصہ کے لیے سندھ کی جانب سے ہندوستان پر حملہ کا خیال ختم ہو گیا۔[۱]

مگر اسی عرصہ میں ایران کی عظیم الشان سلطنت عربوں کے قبضہ میں آگئی، اور قلمرو خلافت کی سرحدیں برصغیر کی شمالی مغربی حدود سے متصل ہو گئیں، اس طرح سرحدی جھڑپوں کا ہونا ناگزیر ہو گیا۔ چنانچہ سنہ ۴۴ھ میں مہلب بن ابی صفرہ بلوچستان فتح کرتے ہوئے لاہور اور ملتان تک پہنچ گئے۔[۲]

اس کے بعد بھی سرحدی آویزشوں کا سلسلہ باقی رہا۔ مگر ان کی نوعیت ہنگامی یورشوں کی سی تھی کیونکہ اموی خلفاء بھی دور دراز علاقوں پر قبضہ کرکے قلمرو خلافت میں شامل کرنا نہیں چاہتے تھے، یہ صورت حال ۹۲ھ تک باقی رہی۔

اس وقت تک تو عربوں کو ہندوستان میں قدم جمانے کا موقع ملا تھا، لہٰذا وہ سندھ کے علوم و حکمت سے واقف ہوئے تھے، اس لیے اس ذیلی دور میں کسی علمی کاوش کی تلاش بیکار ہے۔ اگرچہ سندھ کے لوگ موالی کے زمرے میں قلمرو خلافت پہنچنے لگے اور جلد ہی علم و فضل کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکنے لگے، ان میں سب سے اہم عمرو بن عبید ہے جس کا دادا سندی الاصل تھا اور کابل کے جنگی قیدیوں کے زمرے میں عراق پہنچا تھا، مسعودی لکھتا ہے :-

وھو عمرو بن عبید بن باب	مولیٰ بنی تمیم وکان جدہ

(وہ عمرو بن عبید بن باب ہیں جو بنی تمیم کے مولیٰ تھے، جن کا دادا باب سندی گرفتار ہو کر)

---

[۱] فتوح البلدان ص ۴۳۰ [۲] ایضاً ص ۴۳۲ [illegible]

باب ... [illegible] ... ہندستان کے علمی تہذیبی

السنۃ۔ وکان شیخ المعتزلۃ و | تھا عمرو بن عبید معتزلہ کے پیشوا
مقدمھا ولہ خطب ورسائل[1] | تھے۔ اس نے بہت خطبے اور رسالے لکھے۔

عمرو بن عبید معتزلی علم کلام کے بانی واصل بن عطا کا دست راست اور معتزلہ کے فرقہ عمریہ کا بانی تھا۔ اس طرح علم کلام کی بنیاد ایک سندی الاصل فاضل کی رہین منت ہے۔

ب۔ عرب نوآبادی ([illegible]) | امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد عرب و ہند کے درمیان ایک اعصابی جنگ چل پڑی جس نے سنہ ۹۳ھ میں ایک فیصلہ کن لڑائی کی شکل اختیار کر لی، ہوا یہ کہ دیول کے میدوں نے ایک جہاز کو لوٹ لیا جس میں کچھ عرب خواتین بھی سوار تھیں، حجاج نے سندھ کے حکمراں راجہ داہر سے قیدی خواتین کی واپسی کی درخواست کی، مگر راجہ نے ایک ٹالنے والا جواب دیا، مجبور ہو کر اس نے خلیفہ سے لڑائی کی اجازت لی اور اپنے بھتیجے محمد بن قاسم کی قیادت میں ایک لشکر روانہ کیا جس نے سنہ ۹۳ھ میں سندھ کو اور دو سال بعد ملتان کو فتح کر لیا۔ مگر اتنے میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کا انتقال ہو گیا اور نئے خلیفہ نے محمد بن قاسم کو معزول کر دیا، اس کے جانشین زیادہ قابل نہ تھے، اس طرح عربوں کی فتوحات کا سلسلہ رک گیا، البتہ برصغیر کا شمالی مغربی حصہ ان کے قبضہ میں آ گیا۔

سنہ [illegible] تک سندھ اور ملتان کا ایک ہی والی ہوتا تھا، اس کے بعد ملتان کا علاقہ سندھ کی ولایت سے علیحدہ ہو گیا جہاں سنہ [illegible] تک بنو منبہ کی حکومت رہی۔

سنہ [illegible] میں بنو امیہ کی خلافت کے زوال پر عباسی خلافت قائم ہوئی اور سندھ بھی نئی خلافت کا ایک صوبہ بن گیا [illegible] ... [illegible] نے ... کی شکل

[1] [illegible] ... [illegible] ...

اقتدار کمزور ہو گیا تو خود متوکل نے ایک مقامی امیر عمر بن عبدالعزیز الہباری کو
۲۴۰ھ میں سندھ کا نیم خود مختار حاکم تسلیم کر لیا۔

عرب اپنے ساتھ اپنا دین اور کلچر بھی لائے تھے، اور ملک نے بڑی تیزی سے نئے ثقافتی
رنگ کو قبول کیا چنانچہ جن لوگوں نے اسلامی علوم کی ترقی میں حصہ لیا ہے ان کی صف اول میں
سندھیوں کا نام نمایاں نظر آتا ہے، جیسے حدیث میں ابو معشر نجیح، فقہ میں امام اوزاعی[1]، کلام
میں عمرو بن عبید[2]، شاعری میں ابو عطاء السندی،

لیکن سرزمین ہند کے یہ ستارے باہر ہی جا کر چمکے اور سندھ کے اندر نو وارد فضلا ہی کا تذکرہ
ملتا ہے، جیسے قاضی موسیٰ بن یعقوب الثقفی جنہیں محمد بن قاسم نے قاضی القضاۃ مقرر کیا تھا، دوسرا نام ربیع
ابن صبیح کا ہے[3] جو بعض علماء کے نزدیک عربی ادب کے پہلے مصنف ہیں، وہ بھی سندھ ہی میں دفن ہیں،
جہاں تک فلسفہ و حکمت کا تعلق ہے، ابھی بغداد میں اس کی تشکیل ہو رہی تھی، اور اس کے لیے
یونان اور دیگر قدیم ممالک کے علمی سرمایہ کو عربی میں منتقل کیا جا رہا تھا، اس میں ہندستان کے علمی ادب
کا بھی خاص حصہ ہے،

چنانچہ ۱۵۴ھ (یا بقول البیرونی ۱۵۶ھ[4]) میں ہندوستان کا ایک علمی وفد منصور
کے دربار میں پہنچا، اور دیگر علمی تحائف کے ساتھ "برہم سدھانت" کا ایک نسخہ بھی اس کی خدمت
میں پیش کیا، منصور نے منجمین دربار میں سے محمد بن ابراہیم الفزاری اور یعقوب بن طارق کو اسے
عربی میں منتقل کرنے کا حکم دیا[5]، اسی ترجمہ پر جو عرصہ تک "السند ہند" کے نام سے موسوم رہا، عربی علم ہیئت
کی بنیاد رکھی گئی، مامون الرشید کے عہد میں محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے "المجسطی" اور "زیج شہریار"

---

[1] تذکرۃ المصنفین جلد اول ص ۱۴۱ [2] مروج الذہب برحاشیہ کامل ابن اثیر جلد [illegible] ص [illegible]
[3] [illegible] [4] کتاب الہند ص ۲۰۸ [5] طبقات الامم قاضی صاعد [illegible]

کی مدد سے اس پر نظر ثانی کر کے اپنی "زیج الخوارزمی" مرتب کی جو عرصہ تک مسلم ہیئت دانوں کا معمول بہ رہی۔[1] خوارزمی کے علاوہ اور ہیئت دانوں نے بھی السند ہند کے ساتھ اعتنا کیا۔ جیسے حبش الحاسب، عبد اللہ بن اماجور، حسن بن الصباح، حسین بن محمد الآدمی، فضل بن حاتم التبریزی، محمد بن اسحاق السرخسی، البیرونی، ابن السمح، ابن الصفار وغیرہ۔

اس کے ساتھ ہندوستانی علم الحساب (حساب الہند) بھی عربوں میں پہنچا اور اس کے ضمن میں مسلمان ریاضی داں "طریق ترقیم اعداد (الارقام الہندیہ) سے واقف ہوئے جو بعد میں یورپ پہنچکر "Arab Numerals" کے نام سے موسوم ہوا۔

اسی طرح ہندوستانی اطبا نے جاکر دارالخلافہ میں ہندوستانی طب کا نام بلند کیا، منکہ نے ہارون الرشید کے لاعلاج مرض کو اچھا کیا۔[2] اور صالح بن بہلہ نے اس کے چچا زاد بھائی ابراہیم کو جو بظاہر مر چکا تھا، تندرست کیا۔[3] منکہ اور ابن دہن نے آیور ویدک کی بہت سی کتابوں کے عربی میں ترجمے کیے، جن کی تفصیل ابن الندیم نے الفہرست میں دی ہے۔[4] مسلمان اطبا نے ان تراجم سے بہت زیادہ استفادہ کیا، چنانچہ علی بن ابن الطبری جس نے متوکل کے عہد میں اپنی مشہور کتاب "فردوس الحکمۃ" کو لکھا تھا، اس کے آخری باب میں ہندو طب کا خلاصہ بیان کیا ہے، اسی طرح اس کے شاگرد ابوبکر زکریا الرازی نے بقول ابن ابی اصیبعہ "کتاب الحاوی" میں اکثر ہندوستانی اطبا کی تصانیف سے استفادہ کیا ہے۔[5]

ہندوستانی فلسفہ نے بھی علم کلام اور علم بنا و اسلامی فلسفہ کو متاثر کیا۔ "اعادۂ نظر کا انکار" (Empedocles sone) (ہمہ شکریں) سے اسلامی فکر میں پہنچا۔[6] "جزو لایتجزیٰ"

۱؎ ... باب ... ۲؎ ... عیون الانباء فی طبقات الاطباء ابن ابی اصیبعہ جلد ثانی ص ۳۳

۳؎ ایضاً ص ... ۴؎ الفہرست ابن الندیم ص ... ۵؎ ابن ابی اصیبعہ جلد ثانی ص ۳۳ ۶؎ شرح المواقف

قدیم ساحلی شہر تھا جسے محمد بن قاسم نے ۹۲ھ میں فتح کیا تھا، یہاں کے اہل علم میں سے مندرجہ ذیل حضرات کا تذکرہ تاریخ و تراجم کی کتابوں نے محفوظ رکھا ہے: ابو جعفر محمد بن ابراہیم الدیبلی، ابو العباس احمد بن محمد بن عبد اللہ ابن سعید الدیبلی، ابراہیم بن محمد بن ابراہیم الدیبلی، ابو القاسم شعیب بن محمد بن احمد بن شعیب بن بزیع بن سوار (ابن قطان) الدیبلی، علی بن موسیٰ الدیبلی، خلف بن محمد الموازی الدیبلی، ابو العباس محمد بن محمد بن حبیبہ الرشید الدیبلی۔

دوسرا مشہور شہر منصورہ تھا جس کی بنیاد محمد بن قاسم کے بیٹے عمر بن محمد بن قاسم نے ۱۲۰ھ کے قریب ڈالی تھی، مشاہیر اہل علم میں قاضی ابو محمد منصوری کے علاوہ اور بھی حضرات تھے، جیسے ابو محمد عبد اللہ ابن جعفر بن مرۃ المنصوری المقری وغیرہ،

لیکن سوائے قاضی ابو محمد منصوری کے ان بزرگوں نے سندھ سے باہر جا کر اپنی علمی سرگرمیوں کو جاری رکھا، خود سندھ کی ثقافتی رونق دار الخلافہ سے آئے ہوئے فضلا ہی کی رہین منت ہے، ان میں دو خاندان زیادہ مشہور رہے، قاضی محمد بن ابی الشوارب کا خاندان اور دوسرا شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے اسلاف، موخر الذکر بعد کو ملتان میں منتقل ہو گیا تھا۔

بظاہر سندھ میں وہ مذہبی بحران تھا جس کے ازالے کے لیے علم کلام کی ضرورت پڑتی (اگرچہ خفیہ طور پر اسماعیلی دعاۃ کی کوششوں سے فلسفہ و حکمت کی گرم بازاری ہو رہی تھی) پھر بھی علم کلام کی ترقی سے اس ملک کا نام وابستہ ہے، عمرو بن عبید جو معتزلی علم کلام کے قدیم موسسین میں سے ہے، بقول مسعودی سندی الاصل ہی تھا، بعد کے متکلمین میں سمعانی اور یاقوت نے ابو نصر فتح بن عبد اللہ السندی کا ذکر کیا ہے[1]، مگر عمرو بن عبید ہو یا ابو نصر فتح بن عبد اللہ باہر ہی جا کر چمکے، خود سندھ میں سوائے اس عراقی عالم کے جنھوں نے راجہ مہروک بن رائق کے لیے تعلیمات اسلام پر کتاب لکھی تھی، کسی متکلمانہ سرگرمیوں کا پتہ نہیں چلتا۔

---

[1] کتاب الانساب السمعانی ورق ۳۰۳

لیکن جہاں تک علوم فلسفیہ کا تعلق ہے یہ باور کرنے کے وجوہ ہیں کہ سندھ اور بالخصوص ملتان میں خفیہ طور پر ان علوم کی بڑی تیزی سے اشاعت ہورہی تھی، چوتھی صدی کی ابتدا سے اسماعیلی دعاۃ عالم اسلام میں انقلاب کے لیے زمین ہموار کرتے پھر رہے تھے، غالباً ہندوستان میں بھی وہ اسی زمانہ میں آئے، چنانچہ مسعودی کے بارے میں جو یہاں ۳۰۳ھ میں آیا تھا بعض لوگوں کا یہی خیال ہے۔ آل بویہ کے برسر اقتدار آنے پر ان کی دعوتی سرگرمیاں بہت بڑھ گئیں،[1] مگر معز الدولہ کے آخری عہد میں یہ کم ہوگئیں، اور عضد الدولہ کے زمانہ میں تو بہت ہی کم ہوگئیں،[2] لیکن اس کے مرنے پر عزیز باللہ فاطمی نے ان دعوتی سرگرمیوں کو از سر نو تیز کر دیا، اس کے نتیجے میں ایک اسماعیلی داعی کے ۳۷۲ھ میں سندھ آنے کا تذکرہ ملتا ہے، جس کا نام ہیثم تھا، سندھ تو ابھی تیار نہ تھا، البتہ ملتان کی فضا انقلاب کے لیے ہموار ہوچکی تھی، لہذا عزیز باللہ نے جلم بن شیبان کو یہاں بھیجا، جس نے ملتان میں بنو سامہ کی سنی حکومت کو ختم کرکے اسماعیلی حکومت قائم کی، اسی نے ملتان کے قدیم بت کو توڑا اور اسماعیلی مذہب کی شدت سے تبلیغ کی، چنانچہ البیرونی کتاب الہند میں لکھتا ہے:-

فلما استولت القرامطة	پس جب قرامطہ ملتان پر قابض ہوگئے
علی الملتان کسر جلم بن شیبان	تو جلم بن شیبان نے اس (قدیم)
المتغلب ذلك الصنم وقتل	بت کو توڑ ڈالا اور اس کے پجاریوں
سدنته[3]	کو قتل کر دیا

جلم کے بعد شیخ حمید تخت نشین ہوا، اُدھر سامانی سلطنت کے کھنڈروں پر غزنوی سلطنت قائم ہوچکی تھی (تفصیل آگے آرہی ہے) سامانی حکومت کے انحلال میں بڑا ہاتھ اسماعیلی دعاۃ کی سازشوں کا تھا، اس لیے سبکتگین کو خراسان میں ان کے خلاف پیچ کرنا کی

---

[1] الفہرست لابن الندیم ص ۲۶۸ [2] الفرق بین الفرق ص ۲۷۰ [3] کتاب الہند للبیرونی ص ۵۶

کوشش کرنا پڑی، منہاج سراج نے لکھا ہے:

"در عہد او کارہاے بزرگ برآمد و مادۂ فساد باطنیہ از خطۂ ملتان قلع کرد"[1]

لہٰذا حزم و احتیاط کا تقاضا تھا کہ وہ مشرقی سرحد سے بھی غافل نہ ہو۔ یہاں قرامطہ اپنی دسیسہ کاری میں مشغول تھے، پہلے ۳۷۶ھ میں سبکتگین نے ملتان پر حملہ کیا، مگر شیخ حمید نے صلح کر لی، سبکتگین کے بعد اس کا جانشین محمود ہوا، اس کے عہد میں شیخ حمید کے پوتے داؤد نے الحاد و بددینی [جو اسلام بیزاری اور فلسفہ نوازی کا نام تھا] کی نشر و اشاعت میں جد و جہد شروع کی، اس لیے محمود کو اس کے خلاف تادیبی کارروائی کرنا پڑی، چنانچہ معاصر مورخ عتبی لکھتا ہے:-

قد کان بلغ السلطان یمین الدولة
وامین الملة حال والی الملتان
ابی الفتوح فی خبث نحلته ودخل
دخلته وقبح اعتقاده وقبح الحاده ودعائه
الی مثل رأیه اهل بلاده فانف
للدین.... حتی افتتحها عنوة.....
...والزمهم عشرین الف الف
درهم[2]

سلطان یمین الدولہ امین الملۃ (محمود غزنوی)
کو ملتان کے والی ابو الفتوح داؤد کی
بدمذہبی، بددینی، بداعتقادی اور بدترین
الحاد کی اطلاع پہنچی تھی، وہ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ
رعایا کو بھی اس بددینی اور الحاد کی طرف
دعوت دیتا ہے تو سلطان غیرت دینی سے
مجبور ہوا، یہاں تک کہ اس نے ملتان کو بزورِ
شمشیر فتح کیا، اور یہاں کے لوگوں پر دو کروڑ
درہم تاوان عائد کیا۔

داؤد نے یہ صلح دب کر کی تھی، اس لیے خفیہ طور پر اپنی ملحدانہ سرگرمیوں میں مصروف رہا، مجبوراً ۴۰۱ھ میں محمود نے ملتان پر حملہ کر کے اسے تہس نہس کر ڈالا، فرشتہ لکھتا ہے:-

---

[1] طبقات ناصری ص ۔ [2] تاریخ یمینی عتبی ص ۲۷۱ - ۲۷۲

"در ہمیں سال سلطان دیگر بار از غزنین بملتان آمد و آنجا بجبر و قہر مفتوح ساختہ
بسیارے از قرامطہ و ملاحدہ را کشت و بعضے را دست و پا بریدہ و داؤد بن نصر را زندہ
بدست آوردہ ہمراہ خود بغزنین بردہ در قلعۂ غور محبوس ساخت تا در آنجا بمرد"[1]

یہاں سے خاسر و خائب ہو کر اسماعیلیوں نے منصورہ و سندھ پر قبضہ کر لیا، ۴۱۶ھ
میں جب محمود سومنات فتح کر کے جا رہا تھا تو منصورہ کے اسماعیلیوں کی شہ سے جاٹوں نے
اسے بری طرح پریشان کیا، اس لیے اس نے اگلے سال منصورہ پر حملہ کر کے اسے تباہ و برباد
کر دیا، ابن الاثیر ۴۱۶ھ کے واقعات میں لکھتا ہے:-

وقصد المنصورة وكان	سلطان محمود نے منصورہ پر فوجکشی کی
صاحبها قد ارتد عن الاسلام	کیونکہ وہاں کا والی اسلام سے مرتد ہو گیا
..... فاحاط به وبمن	(قرمطی ہو گیا تھا) سلطان نے اسے اور
معه فقتلوا اكثرهم	اس کی فوج کو گھیر لیا اور بہت لوگوں کو
فرحل الى غزنة[2]	قتل کیا، اس کے بعد غزنی کو روانہ ہوا،

غرض باطنی (اسماعیلی) دعاۃ نے سندھ اور ملتان میں اتنا شدید پروپگنڈا کیا کہ تین سو سال کی
بنو منبہ کی اور ڈیڑھ سو سال کی ہباریوں کی حکومت کو اکھاڑ پھینکا، ظاہر ہے یہ محض بیرونی
فوجی امداد کے سہارے ناممکن تھا، اس کے لیے اسماعیلیوں نے عرصہ تک مقامی آبادی میں
اپنی مذہبی دعوت پھیلائی ہوگی، جنکی اکثریت مریدین کے درجہ کی رہی ہوگی، مگر ایک معتدبہ
جماعت ترقی کر کے "داعی" کے درجہ تک پہنچی ہوگی، لیکن مریدین یا دعاۃ دونوں کی تعلیم و تربیت
میں باطنیوں کے یہاں علم نفسی بنیادی حیثیت رکھتے تھے، کیونکہ باطنیت کا مقصد ہی

---

[1] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۲۰ [2] کامل ابن الاثیر جلد ۹ ص ۱۱۰

اسلام کے بجائے فلسفہ کی تعلیمات کی اشاعت تھا، اس کی تفصیل سابق میں مذکور ہو چکی ہے، [معارف فروری ۱۹۶۳ء ص ۱۰۷-۱۰۹) اور بقول مقریزی باطنی دعوت کی آخری منزل میں تو مطولات فلسفہ کے پڑھنے کے علاوہ یہ تعلیم بھی دیجاتی تھی کہ فلاسفہ انبیاء سے افضل ہیں (نعوذ باللہ)

احاله على ما تقرر في كتب الفلاسفة من علم الطبيعيات وما بعد الطبيعيات والعلم الالهي وغير ذلك من اقسام العلوم الفلسفية وان الفلاسفة انبياء الحكمة الخاصة[1]

داعی لوگ مدعو کو ان باتوں پر آمادہ کرتے جو فلاسفہ کی کتابوں میں طبیعیات و الہیات و مابعد الطبیعیات کے سلسلے میں ثابت ہیں، نیز علوم فلسفہ کی دوسری اقسام میں، اور اس بات پر کہ فلاسفہ ہی حکمت خالصہ کے پیغمبر ہیں،

یہ وہی الحاد و بے دینی ہے، جس کی طرف عتبی نے "فی خبث نحلته ودخل دخلته وهن اعتقاده و قبح الحاده" کے الفاظ میں اور ابن الاثیر نے "وقد ارتد عن الاسلام" سے اشارہ کیا ہے، بہرحال ان تبلیغی سرگرمیوں کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ اس تحریک کے سرگرم کارکن فلسفہ کے افاضل بنجائیں، جیسا کہ خراسان میں ابن سینا وغیرہ اسی اسماعیلیت میں توغل کی بنا پر فلسفہ و حکمت میں سرآمد روزگار بن گئے تھے۔ حافظ ابن تیمیہ نے خود شیخ بوعلی سینا سے نقل کیا ہے:-

ان ابن سينا اخبر عن نفسه ان اهل بيته اباه واخاه كانوا من هؤلاء الملاحدة وانه

ابن سینا نے اپنے متعلق خبر دی ہے کہ اس کے گھر والے یعنی اس کا باپ اور بھائی انہیں بے دین ملحدوں (قرامطہ اسماعیلی)

---

[1] خطط مقریزی جلد ثانی ص ۲۳۳

انما اشتغل بالفلسفة بسبب ذالك[1] — سے تعلق رکھتے تھے، اور یہ کہ وہ صرف اسی وجہ سے فلسفہ میں مشغول ہوا،

اس لیے یہ باور کرنے کے قوی وجوہ ہیں کہ ملتان وسندھ جہاں ایک عرصہ سے باطنی دعاۃ اپنے مخصوص مناہج فکر پر لوگوں کی تربیت کر رہے تھے، فلسفہ وحکمت کا بڑا گہوارہ ہوں گے اگرچہ تاریخ نے اس ترویج واشاعت کی تفصیل محفوظ نہیں رکھی، جو بالکل فطری تھا، اس لیے کہ خفیہ انقلابی تحریکوں کی تفاصیل کہیں محفوظ نہیں رکھی جاتیں، صرف معاصرین کے مجمل حوالوں اور قرائن کی مدد سے ان کی تاریخی تفصیلات کی بازتشکیل کی جاتی ہے،

غرض باطنی دعاۃ کی ایک صدی کی جدمسلسل نے اس عہد کے "اسلامی ہند" کے مزاج میں باطنیت کے ساتھ تفلسف کو بھی راسخ کر دیا تھا کیونکہ یہ علاقہ نویں صدی تک معقولات کی تعلیم کا گڑھ بنا رہا، یہیں (ملتان) سے مولانا عبد اللہ تلبنی اور عزیز اللہ ملتانی نے دہلی پہنچکر معقولات کی گرم بازاری کو مزید رونق دی۔

---

[1] الرد علی المنطقیین لابن تیمیہ ص ۱۴۳

آزاد بلگرامی

تصحیح و استدراک

(از)

از جناب عبد الرزاق صاحب قریشی انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی

معارف کے تین شماروں (جنوری تا مارچ ۱۹۶۲ء) میں ہم نے میر غلام علی آزاد بلگرامی کے حالات زندگی، جہاں تک ہماری دسترس میں تھے، پیش کرنے کی کوشش کی تھی، مضمون کی اشاعت کے بعد اس میں کچھ غلطیاں نظر آئیں اور کچھ نیا مواد ملا، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غلطیوں کی تصحیح کر دی جائے اور جو نیا مواد ملا ہے وہ بھی پیش کر دیا جائے تاکہ مضمون کسی حد تک مکمل ہو جائے،

۱۔ ۱۱۶۸ھ/۱۷۵۴ء تک کے حالات زندگی تحریر کرنے کے بعد ہم نے لکھا تھا کہ اس کے بعد کی تفصیل ہمارے پاس نہیں، ممکن ہے کہ کہولت سن کی وجہ سے آزاد نے سیر و سیاحت کا سلسلہ ختم کر دیا ہو[1] لیکن آزاد کی عربی مثنوی مظہر البرکات[2] کا جو نسخہ کتب خانۂ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ہے، اس کے آخر میں کسی نے آزاد کے کچھ حالات (عربی میں) لکھے ہیں، ان سے مندرجۂ ذیل مزید معلومات حاصل ہوتی ہیں:-

---

[1] معارف، فروری ۱۹۶۲ء ص ۱۲۵ [2] مظہر البرکات پر مولوی فضل الرحمن صاحب ندوی (شعبۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کا ایک بسیط اور اچھا مضمون مجلۂ علوم اسلامیہ (علی گڑھ)، جلد نمبر ۲ میں شائع ہوا ہے۔

آزاد ۳ ربیع الآخر ۱۱۸۶ھ (۴ جولائی ۱۷۷۲ء) کو قصبۂ پرلی کے قصد سے، جو اورنگ آباد سے چار منزل کی مسافت پر واقع ہے، نکلے اور ۲۰ ربیع الآخر (۲۳ جولائی) کو وہاں پہنچے۔ کچھ دن قصبۂ پرلی میں قیام کرنے کے بعد ۲۷ جمادی الثانیہ (۲۶ ستمبر) کو وہ حیدرآباد کے لیے نکلے اور ۲۳ رجب کو وہاں پہنچے۔ مرآۃ الجمال (جس کا ذکر ہم ان کی تصانیف کے سلسلے میں کر آئے ہیں) یہیں تصنیف ہوئی۔ آزاد نے اس کی ایک مختصر سی شرح بھی لکھی۔ عربی کا تیسرا دیوان بھی انھوں نے یہیں مرتب کیا۔

دو سال اور چند دن کے قیام کے بعد وہ حیدرآباد سے ۱۰ رجب ۱۱۸۸ھ (۱۹ ستمبر ۱۷۷۴ء) کو نکلے اور آخر رجب میں اورنگ آباد پہنچے۔ ان کے پوتے سید امیر حیدر (بن سید نور الحسن) ان کے بلاوے پر بلگرام سے اورنگ آباد آئے۔ پوتے نے دادا پر زور ڈالا کہ وہ فارسی شعرا کے انداز پر ردیف وار دیوان (عربی) مرتب کر دیں۔ انھوں نے عزیز پوتے کی بات مان لی اور محرم ۱۱۹۰ھ (فروری ۱۷۷۶ء) میں اس کام کا آغاز کیا اور چند ہی مہینوں میں اس کو پورا کر لیا۔ اس دیوان میں چند غیر مردف قصائد بھی شامل ہیں، جن میں سے بعض دیوان کی ترتیب سے پہلے کے کہے ہوئے ہیں اور بعض بعد کے۔

یہ مردف دیوان آزاد کا چوتھا دیوان ہے۔ ۱۱۹۱ھ (۱۷۷۷ء) میں انھوں نے دیوان مستزاد ترتیب دیا۔ یہ ان کا پانچواں دیوان ہے۔ اس کا نام انھوں نے لانظیر رکھا۔ لانظیر سے اس کا سال تصنیف نکلتا ہے۔ ۱۱۹۲ھ (۱۷۷۸ء) میں انھوں نے چھٹا دیوان مرتب کیا۔ اس میں ترجیع بند ہیں۔ آزاد سے پہلے عربی میں ترجیع بند نہیں ملتی۔ ۱۱۹۳ھ (۱۷۷۹ء) میں انھوں نے ساتویں دیوان کی ترتیب شروع کی اور محرم ۱۱۹۴ھ (۱۷۸۰ء) میں اسے پورا کیا۔ انھوں نے ساتویں دیوان کو السبعۃ السیارہ کا نام دیا۔ اسی سال انھوں نے مثنوی مظہر البرکات کا پہلا دفتر نظم کیا۔ اس بحر (خفیف) میں عربی میں ابتک کسی نے مثنوی نہیں لکھی تھی۔ اسی سال کے آخر میں (ذی الحجہ کے آخری عشرہ میں) آزاد اورنگ آباد سے نکلے اور ۱۰ محرم ۱۱۹۵ھ (۲۷ دسمبر ۱۷۸۰ء) کو حیدرآباد پہنچے۔

حیدرآباد کے دوران قیام میں انھوں نے مظہر البرکات کا تیسرا دفتر نظم کیا، ۲۲ جمادی الاولیٰ (۱۰ اپریل) کو وہ حیدرآباد سے روانہ ہو کر ۸ جمادی الثانیہ (۲۸ مئی) کو اورنگ آباد واپس آئے، اور مظہر البرکات کا تیسرا اور چوتھا دفتر نظم کیا، چوتھا دفتر شعبان میں پورا ہوا، آزاد اس مثنوی کو سات دفتروں میں مکمل کرنا چاہتے تھے لیکن چوتھے دفتر کے بعد انھوں نے اپنا ارادہ بدل دیا، مگر ان کے پوتے سید امیر حیدر نے ان سے اصرار کیا کہ وہ اپنے سابق ارادہ اور خواہش کے مطابق باقی تین دفتر بھی نظم کر دیں، چنانچہ انھوں نے ۱۱۹۶ھ (۱۷۸۲ء) میں باقی تین دفتر بھی نظم کر دیے، اسی سال انھوں نے شفاء العلیل فی اصطلاحات کلام ابی الطیب المتنبی بھی تالیف کی،

۲۔ صمصام الدولہ شاہ نواز خاں کی مآثر الامراء کے سلسلہ میں ہم نے لکھا تھا کہ شاہ نواز خاں کی وفات کے بعد آزاد نے اسے مرتب و مکمل کیا،[1] انھوں نے نہ صرف مآثر الامراء کو مرتب و مکمل کیا، بلکہ شاہنواز خاں کی دوسری تین کتابوں (بہارستان سخن،[2] موائد الفواد،[3] منشآت شاہ نواز خاں) پر بھی نظر ثانی کی، اس کے علاوہ عبد الحیٔ خاں (فرزند شاہ نواز خاں) کی تصنیفات پر بھی نظر ثانی کی،[4]

۳۔ شفاء العلیل فی اصطلاحات کلام ابی الطیب المتنبی: اس کے متعلق ہم نے نواب صدیق حسن خاں کی تصنیف اتحاف النبلاء المتقین کے حوالہ سے لکھا تھا کہ اس میں متنبی کے کلام کی مخصوص اصطلاحات کی شرح ہے،[5] لیکن مولانا عبد الحیٔ لکھتے ہیں کہ اس کتاب میں آزاد نے متنبی کے کلام پر اعتراضات کیے ہیں،[6] اور یہی صحیح ہے،

۴۔ مرآۃ الجمال: اس کتاب کو ہم نے غلطی سے آزاد کی فارسی کتابوں میں شمار کیا تھا لیکن یہ حقیقت میں عربی میں ہے، مظہر البرکات (نسخۂ کتب خانہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) کے خاتمہ پر جو

---

[1] معارف، فروری ۱۹۶۲ء ص ۱۲۰۔ [2] فارسی شعراء کا تذکرہ ہے۔ [3] علم کلام میں ہے۔ [4] شاہ نواز خاں، بہارستان سخن قلمی، تصنیفہ سنٹرل لائبریری، مقدمہ از مشن لال آفلینہ ق ۴ ب۔ [5] معارف فروری ۱۹۶۲ء۔ [6] مولانا عبد الحیٔ، نزہۃ الخواطر (حیدرآباد ۱۹۵۵ء) ج ۶ ص ۲۰۲

نوٹ ہے، اس میں لکھا ہے کہ

"وہاں (حیدرآباد) کے دوران قیام میں عربی میں ایک عمدہ قصیدہ ۱۰۵ اشعار پر مشتمل نظم کیا جس میں معشوق کا سراپا کھینچا اور اس کا نام مرآۃ الجمال رکھا۔"

مولانا عبدالحی نے بھی لکھا ہے کہ :

"ان کی تصانیف میں ایک کتاب مرآۃ الجمال ہے، جو قصیدۂ نونیہ ہے۔ اس میں معشوق کے اعضا کی سر سے قدم تک تعریف ہے۔ یہ قصیدہ ۱۰۵ اشعار پر مشتمل ہے۔ خود آزاد نے اپنے ساتویں دیوان کے مقدمہ میں اس کے متعلق لکھا ہے کہ یہ قصیدۂ نونیہ ہے جس میں معشوق کے اعضا کی سر سے قدم تک تعریف ہے۔"[1]

مولانا عبدالحی کے اس واضح بیان کے بعد اس میں کوئی شک و شبہ نہیں رہ جاتا کہ مرآۃ الجمال عربی میں ہے اور ۱۰۵ اشعار پر مشتمل ہے۔

۵۔ "مثنوی سراپای معشوق" یا مرآۃ الجمال (فارسی) : پروفیسر اسٹوری نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ

"مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کتب خانہ (سبحان اللہ سکشن)[2] میں ایک مخطوطہ مثنوی سراپا معشوق ہے، غالباً یہ مثنوی اور مرآۃ الجمال (عربی) ایک ہی چیز ہے۔"[3]

اوپر ہم لکھ آئے ہیں کہ مرآۃ الجمال عربی میں ہے اور ۱۰۵ اشعار پر مشتمل ہے۔ "مثنوی سراپا معشوق" بمبئی یونیورسٹی لائبریری کے لائبریرین ڈاکٹر مارشل کے توسط سے ہم نے علی گڑھ سے منگوا کر دیکھی۔ یہ فارسی میں ہے اور اس میں ۱۲۰۰ اشعار ہیں۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی لائبریری

---

[1] مولانا عبدالحی، نزہۃ الخواطر، جلد ۶، ص ۲۰۲ [2] ایک نسخہ ذخیرۂ احسن میں بھی ہے اور اورینٹل کالج میگزین، لاہور
[illegible] ، ص ۸۶۲

کے کٹیلاگ نے اس کا نام "مثنوی سراپای معشوق" محض قیاساً رکھ دیا ہے[1]، ورنہ خود آزاد نے اس کا نام مرآۃ الجمال رکھا ہے۔ کتاب کے خاتمہ پر انھوں نے کتاب کی نوعیت، نام، تاریخ تصنیف وغیرہ کے متعلق چند اشعار کہے ہیں، ایک شعر میں لکھتے ہیں:-

جمال خوبرویاں دام کردم   کہ مرآۃ الجمالش نام کردم

اس کے فوراً بعد کا شعر ہے:-

چہ رنگیں مصرعش تاریخ سال است   بہار حسن مرآۃ الجمال است
(۱۱۳۹ھ (۱۷۲۶ء))

اس تاریخ سے پھر ایک نئی بات پیدا ہوتی ہے، تذکرۂ ید بیضا کے سلسلہ میں ہم نے لکھا تھا کہ یہ آزاد کی پہلی تصنیف ہے، لیکن اب مرآۃ الجمال (فارسی) کو ان کی پہلی تالیف ماننا پڑے گا، کیونکہ ید بیضا کا سال تصنیف ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء ہے، مرآۃ الجمال کی تالیف کے وقت آزاد کی عمر ۲۴ برس تھی، مرآۃ الجمال آزاد کی کوئی مستقل تصنیف نہیں بلکہ مختلف شعراء کے اشعار کا مجموعہ ہے، اس کا موضوع محبوب کا سراپا ہے، یعنی محبوب کے اعضا سے متعلق مختلف شعراء کے اشعار کو اکٹھا کیا گیا ہے، کہیں کہیں ربط قائم کرنے کے لیے خود آزاد نے اپنے اشعار کا اضافہ کیا ہے، اسی طرح بعض اشعار کی "تفسیر" کے طور پر انھوں نے اپنے اشعار شامل کیے ہیں، سرخیاں سب شعر میں ہیں، اور آزاد ہی کے قلم سے ہیں، ذیل میں ہم چند اشعار نقل کرتے ہیں جو آزاد نے خاتمۂ کتاب پر نوعیت کتاب سے متعلق کہے ہیں، انھیں پڑھ کر کتاب کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

بحمد اللہ کہ انجام سخن شد   قلم در راہ دیگر گام زن شد
الا ای زمرۂ معنی پرستاں   زجام انتخاب شعر مستاں
مرا کز اہل معنی التماس است   زالطاف شما این التماس است

---

[1] ذخیرۂ حسن کے مرتب نے بھی اس کا نام سراپای معشوق دیا ہے (اور شبلی کالج میگزین [illegible]

که این اشعار ما من در زمانی	چو گل وا چیدم از هر بوستانی
ز هر گلشن گلی آمد بدستم	بنامیزد عجب گلدسته بستم
ز چندین مثنوی های دل آویز	زدم این انتخاب بهجت انگیز
پی ربط سخن در جمع اشتات	در آوردم ز خود هم چند ابیات
بتکلیف ضرورت وقت تحریر	به بعض ابیات دادم نوع تغییر
بهر دی هر ورق از شعر رنگین	فگندم طرح از بتخانهٔ چین
برنگ آمیزی این نقش پرکار	گرفتم رنگ از لعل لب یار
ز موی کاکل ناهید خامه	ز بادام سیاه جور آمه
مداد تازه از سرمهٔ پاک	دوات آسور از مژگان چاک
ورق از صفحهٔ رخسار گلرنگ	زدم نقش جبین تصویر رنگ
جمال خوبرویان رام کردم	که مرآة الجمالش نام کردم
چه رنگین مصرعش تاریخ سال است	بهار حسن مرآة الجمال است

جن جن شعرا کی مثنویوں سے اشعار لیے گئے ہیں ان کے نام بھی آزاد نے بتا دیے ہیں، مثلاً

نظامی مقتدای نکته سنجان	امام و پیشوای نکته سنجان
امیر خسرو ملک معانی	باقلیم سخن صاحبقرانی
چکید از نظم سیراب زلالی	زلال تازهٔ شیرین مقالی

ان کے علاوہ مندرجۂ ذیل شعراء کے اشعار بھی انتخاب میں لیے گئے ہیں:-

عطار، جامی، ہاتفی، [illegible]، موجی، ناظم، عرفی، کلیم، قدسی، قدسی، اشرف، میر نعمت اللہ، [illegible]، غنیمت، رضا، میاں محمد جلیل بلگرامی۔

عبدالجلیل بلگرامی، آزاد کے نانا بھی تھے اور استاد بھی، آزاد نے پہلے تو بلگرام میں ان سے حدیث کی سند لی، پھر جب وہ شاہ جہاں آباد جانے لگے تو آزاد بھی ان کے ساتھ گئے، اور تین سال وہاں رہ کر مزید کسب فیض کیا، اس لیے آزاد نے ان کا ذکر نہایت عقیدت و احترام سے کیا ہے، انھوں نے اپنے نانا اور استاد کی بارہ اشعار میں مدح کی ہے، مثلاً

دگر عبد الجلیلِ بلگرامی — بہار گلشنِ رنگیں کلامی

گرامی گوہر درج سیادت — درخشاں نیر برجِ سعادت

آخر میں ان سے اپنے کسب فیض کا اظہار اس طرح کیا ہے:

منم گلچینِ گلزار کلامش — کمیں شاگرد و فرزند و غلامش

از او ہر گونہ علم آموختم من — بنور او چراغ افروختم من

چمن شد سینۂ من از سحابش — مین شد خاطرِ من ز آفتابش

من از شکر خدا رطب اللسانم — کہ بخشیدہ دو فخر اندر جہانم

یکی فرزندیٔ او فیضِ تخمیر — کہ قلب من از او گردید اکسیر

دگر جدم امیر المومنین است — علی مرتضیٰ سلطانِ دین است

کتاب کا خاتمہ ان اشعار پر ہوتا ہے:-

کسی کز سیر این گلشن شود شاد — مراہم از توجہ آورد یاد

کریمان را بود فضل و کرم خو — دعا ء خیر احسانست نیکو

۶- حیات جلیل مصنفہ مولوی سید مقبول احمد صمدنی کے حوالہ سے ہم نے لکھا تھا کہ آزاد کی زندگی کے تقریباً ۴۰ سال دکن میں گذرے، اس طویل مدت میں بہت سے واقعات و حادثات پیش آئے لیکن وہ بلگرام نہ گئے، خود مصنف کے الفاظ یہ ہیں:-

"آزاد نے اپنی عمر کا بڑا حصہ (اڑتالیس سال) دکن میں گزارا، شفیق ماموں اور استاد (میر سید محمد) کے مرنے، نوجوان اکلوتے بیٹے (میر نور الحسن) کے غرق آب ہونے، خالہ زاد اور عزیز ترازجان بھائی (محمد یوسف) کی وفات اور پیارے سے پیارے رشتہ داروں کی مفارقت دائمی اختیار کرنے کی خبریں آتی رہیں، مگر یہ دکن میں کچھ ایسے پاؤں توڑ کر بیٹھے کہ اٹھنا اور ہٹنا گوارا نہ کیا...... اپنے بھتیجے (غلام امام صادق کے بیٹے) میر اولاد محمد ذکا اور اپنے پوتے امیر حیدر کو اپنے پاس دکن میں بلا لیا، اور وہیں ان کی تربیت و پرداخت عالمانہ اور امیرانہ طریقہ پر کی، اپنی صحبت گرامی کے فیض اور علوم عالیہ سے بہرہ وافر دے کر وطن کو رخصت کر دیا، یہ لوگ یہاں آکر پھولے پھلے، مگر آزاد کو اپنی طرف کھینچنے میں ناکام رہے۔"[1]

معلوم نہیں مولوی مقبول احمد کا ماخذ کیا ہے، ہمارے سامنے مولانا شبلی کی ایک تحریر ہے جس سے مندرجۂ بالا بیان کی تردید ہوتی ہے، مآثر الامراء کے سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں کہ

"صمصام الدولہ شاہ نواز خاں...... نے ایک کتاب خاص اس موضوع پر لکھنی چاہی کہ بابر کے زمانہ سے اخیر عہد تک دولت تیموریہ میں جس قدر عہدہ داران سلطنت گذرے ہیں سب کے حالات قلم بند کیے جائیں، چنانچہ مآثر الامراء کے نام سے اس کتاب کی تدوین و ترتیب شروع کی، پورے پانچ برس اس کام میں صرف ہوئے، اگرچہ امیر ممدوح کا علمی پایہ خود اس قدر بلند تھا جو ایسی تصنیف سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کافی تھا، تاہم امارت کی راحت پسندی سے حسب دلخواہ سامان نہ ہو سکا، امیر موصوف اس نکتہ سے غافل نہ تھے، انھوں نے اس موقع پر آزاد کو یاد کیا، یہ اس وقت اپنے

---

[1] مقالات شبلی حصہ ششم (طبع اول ۱۹۳۲ء) حصہ دوم ص ۱۴۸ تا ۱۵۱

وطن بلگرام میں تھے، وہیں قاصد بھیجا، اور سفر کے لیے ہر طرح کے سامان مہیا کیے، میں نے حیدر آباد میں خود آزاد کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط دیکھا ہے، جس میں وہ ایک دوست کو لکھتے ہیں کہ نواب صمصام الدولہ نے مآثر الامرا کا مسودہ بھیجا ہے، کتاب اچھی ہے لیکن چونکہ ترتیب کے لحاظ سے سخت اصلاح کی محتاج ہے، میں نے نواب موصوف کو لکھا کہ یہ کام اتنی دور سے انجام نہیں پا سکتا، نواب نے میرے لیے پالکی کی ڈاک کا انتظام کر دیا ہے، دو مہینے میں اورنگ آباد پہنچوں گا اور مسودہ کو درست کر دوں گا"[1]

مولوی مقبول احمد نے اپنے بیان کی تائید میں کوئی ثبوت پیش نہیں کیا ہے، ان کے برعکس مولانا شبلی نے ایک ایسا ثبوت پیش کیا ہے، جس کی صداقت و وزن سے انکار نہیں ہو سکتا، اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں ۱۱۷۱ھ/۱۷۵۸ء میں قتل ہوئے، اس لیے یہ قطعی ہے کہ مذکورۂ بالا خط ۱۱۷۱ھ/۱۷۵۸ء سے پہلے کا ہے، اور اگر آزاد اپنے پروگرام کے مطابق اورنگ آباد پہنچے تو ۱۱۷۱ھ/۱۷۵۸ء سے پہلے پہنچے، ۱۱۶۸ھ/۱۷۵۴ء میں آزاد کے اکلوتے صاحبزادہ نور الحسن ایک تالاب میں غسل کرتے وقت غرق ہو گئے[2]، بہت ممکن ہے کہ اس حادثۂ دلدوز کی خبر پاکر آزاد بلگرام گئے ہوں اور دو تین سال (۱۱۷۱ھ/۱۷۵۸ء تک) وہیں رہ گئے ہوں۔

۷۔ ہم نے آزاد کا ایک شعر خزانۂ عامرہ سے اس طرح نقل کیا تھا،

حبابم، مشت من از گوہری منت نمی آمد نباشد عیب گر خود را بدریا آشنا کردم[3]

مولانا غلام رسول مہر (لاہور) نے معارف (اپریل ۱۹۶۲ء) میں لکھا ہے کہ یہ شعر اگرچہ مطبوعہ خزانۂ عامرہ میں اسی طرح چھپا ہے لیکن یہ صحیح نہیں، مولانا کا اعتراض بجا ہے، ہمارے خیال میں یہ شعر یوں ہونا چاہیے :-

---

[1] مولانا شبلی، مقالات شبلی حصہ پنجم (اعظم گڑھ، طبع دوم) ص ۱۲۳ [2] مولوی مقبول احمد، حیات جلیل حصہ دوم ص ۱۲۷، حاشیہ [3] معارف، مارچ ۱۹۶۲ء ص ۱۹۲

جاہم بہشت من از نگہ ہر منت تھی آمد نباشد عیب گر خود را بدریا آشنا کردم

مولانا مہر کا خیال ہے کہ یہ شعر اس طرح ہونا چاہیے:

"جابم بہشت من از منت گوہر تہی آمد نباشد عیب گر خود را بدریا آشنا کردم

۸- ہم نے لکھا تھا کہ نواب نظام الدولہ ناصر جنگ سے آزاد کے بڑے گہرے تعلقات تھے، نواب ان کا بہت احترام کرتے تھے[۱]، دائرۂ معارف اسلامیہ (اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام) میں آزاد پر جو مضمون ہے، اس میں مندرجہ ذیل بیان ملتا ہے:

"ناصر جنگ جب ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء میں اپنے باپ کے جانشین اور صوبہ دار دکن مقرر ہوئے تو اپنے استاد (آزاد) کا بے حد ادب ملحوظ رکھتے تھے، اور آپ کو بطور جاگیر "تنغا" موضع ہرسول[۲] اورنگ آباد عطا کیا تھا"[۳]

نواب سید محمد خاں صلابت جنگ بھی آزاد کے قدر دانوں میں تھے، چنانچہ مذکورۂ بالا بیان میں یہ بھی تحریر ہے کہ

"نواب سید محمد خاں صلابت جنگ نے آپ کی خدمات اور خیر خواہی ملک و رعایا کے صلے میں صدارت کل کی خدمت اور "سراج المحدثین" و "رئیس العلماء" کا خطاب عطا فرمایا تھا۔ (اصل منشور بسالت جنگ دیوان شریف خاں مورخہ ۱۱۷۳ھ کتب خانۂ سید علی اصغر بلگرامی نبیرۂ آزاد رحیم آباد، دکن میں ہے)"[۴]

اسی طرح نواب نظام علی خاں، اسد جنگ بہادر، آصف ثانی بھی ان کی عزت کرتے تھے، صاحب محبوب الزمن نے مآثر آصفی کے حوالے سے مندرجہ ذیل واقعہ کا ذکر کیا ہے:

---

[۱] معارف، مارچ ۱۹۶۲ء ص ۲۰۴ [۲] اورنگ آباد سے تیس میل کے فاصلہ پر گنگا کے کنارے پر واقع ہو، ڈسٹرکٹ گزیٹیر (اورنگ آباد) کا مرتب لکھتا ہے کہ اس کی شاندار عمارتیں کھنڈر ... وغیرہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ بستی کبھی بڑی اچھی حالت میں تھی (ص ۷۰۶) [۳] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (۱ جلد ۱۹۶۲ء) ج ۱ ص ... [۴] ایضاً

"جب حضرت آزاد بتقریب سیر بایجب طلب بعض احباب حیدرآباد تشریف لائے اور شاہ علی بنڈہ پر قریب دروازہ علی آباد لب سڑک پر فروکش ہوئے، قائم الدولہ نے آپ کی تشریف آوری سے خبر دی، آپ نے فرمایا کہاں فروکش ہوئے ہیں؟ وہ ہمارے مہمان ہیں، ان کو ہمارے عزیز پر اتارنا چاہیے، قائم الدولہ نے فرمایا کہ علی آباد کے دروازہ کے قریب فروکش ہیں، فرمایا آج ہم اس راہ سے تفریحاً جائیں گے، محل فرودگاہ کے قریب سواری پہنچے تو ہم کو مطلع کرنا، آپ حسب قرارداد سہ پہر کو ہاتھی پر سوار دروازہ کے قریب پہنچے، نقیب نے عرض کیا، حضور یہ آزاد کا فرودگاہ ہے، آپ ہاتھی سے اتر رہے تھے کہ حضرت آزاد حاضر ہوئے، نذر دکھلائی حضور خیر و عافیت دریافت کرکے روانہ ہو گئے، سیر سے واجعت کرکے آئے تو قائم الدولہ کو حکم دیا کہ حضرت کے لیے ایک ہزار روپیہ مزد قدم و شست سرمہیج دیجئے، فوراً حکم کی تعمیل ہوئی، حضرت آزاد نے عطیۂ حضور کو منظور فرمایا اور شکریہ ادا کیا، دوسرے روز آپ حضور سے ملے، حضور آپ کی ملاقات سے بہت مسرور ہوئے، پوچھا، آپ کب تک یہاں رہیں گے؟ آپ نے فرمایا، چند روز، حکم صادر ہوا کہ آپ ہمارے مہمان ہیں، ہر روز صبح و شام آپ کے لیے خاص ہمارے خاصہ سے احضر طعام بھیجتے رہیں، جب تک آپ رہے خاصہ کے طعام سے سرفراز رہے"[1]

۹- مچھمی نرائن شفیق کے حوالہ سے ہم نے لکھا تھا کہ آزاد نے احمد شاہ ابدالی کی فتح جنگ پانی پت سے چھ سال پہلے ایک قطعہ اس انداز سے کہا تھا گویا یہ واقعہ عالم رویا میں متعین ہو چکا تھا[2]، لیکن خود آزاد نے خزانۂ عامرہ میں چھ ماہ لکھا ہے۔ آزاد کے الفاظ یہ ہیں:

"از نوادر اتفاقات این کہ فقیر در ماہ محرم سنہ اربع و سبعین و مائۃ والف شش ماہ پیش از وقوع محاربہ بر سبیل تفاؤل غزلی نظم کردم"[3]

[1] علیٰ بخاری خاں ملکاپوری، محبوب الزمن ج اول ص ۹۰۰ [2] معارف، مارچ ۱۹۹۲ء ص ۲۰۶ [3] آزاد بلگرامی خزانۂ عامرہ (کانپور ۱۸۷۱ء) ص ۱۰۹

اس غلطی کی طرف بھی مولانا مہر ہی نے اشارہ کیا تھا۔

۱۰۔ مذکورہ بالا غزل کے تیسرے شعر کے دو لفظ پڑھے نہیں جا سکے تھے، اگرچہ اس کی تصحیح مولانا مہر نے اپنے استدراک میں (معارف اپریل ۱۹۶۲ء) کر دی تھی، پھر بھی ہم اسے یہاں صحیح شکل میں نقل کر دینا مناسب سمجھتے ہیں:-

شکر خدا کہ کلک تصحیح ملک زدود   نقش غلط کہ صفحۂ ایام را گرفت

۱۱۔ پٹنہ یونیورسٹی لائبریری (پٹنہ) کے مخطوطات کی فہرست میں ایک کتاب طبقات سلاطین ہے، جسے آزاد بلگرامی کی تصنیف بتایا گیا ہے، جناب ڈاکٹر افضال امام صاحب (لائبریرین) نے ہماری درخواست پر اس کے دیباچہ اور خاتمہ کی نقل ہمیں عنایت فرمائی۔ دیباچہ کی عبارت سے کتاب کا ایک ہلکا سا اندازہ ہو جاتا ہے۔

مخطوطہ کا پہلا ورق غائب ہے، دوسرا ورق اس طرح شروع ہوتا ہے۔

اِنّ اللہ و ملٰئکتہٗ ....

اس کتاب کا سبب تالیف خود آزاد کی زبان سے سننا زیادہ مناسب ہوگا، وہ کہتے ہیں کہ

"اکنون آنکہ چوں استنباط غرائب حالات و استخراج نوادر اتفاقات کہ فی الحقیقت غرض اصلی از تدوین فن تاریخ و سیر و علۃ غائی اصحاب خبرت و ارباب خبران ست بہ (ہر) کس بسہولت میسر نیست چہ بعد از طی صحائف کتب مبسوط احیاناً این نوع واقعۂ حیرت افزا و پس از مطالعۂ مطولات گاہ گاہ خاطر از امثال این احوال غریب تا آں مخطوطہ می شود لاجرم چناں بخاطر خدۂ بی مقدار ساقط از درجۂ اعتبار مجدد این رسم عجز الآثار فقیر میر غلام علی آزاد ...... تافت کہ این دو رموز از لجۂ صفائی معتبر داین جواہر آبدار از معادن مؤلفات ایسبہ اخبار برچیدہ نثار بارگاہ سازد ......

برای مزید انجلای متبحران بدین احوال و مستحضران فواید اقوال مخفی نماند که چون
درین صحیفہ ایراد سوانح و قضایای که فی الجمله غرابتی داشته باشد ملتزم است
و اکثر آن وقائع منسوب بسلاطین ایام و معرفت ایشان را دخلی تمام در ایضاح
مرام بدان وسیله تذکار طبقات سلاطین و زمان تسلط هر یک علی وجه الایجاز از
مساعدت وقت مترقب است، اما چون اظهار کیفیت ظهور هر خاندان و موجبات
زوال دولت و استیصال آن دودمان با آنکه دخلی تمام در انتظام کلام و توضیح مقام
داشت سررشتهٔ مقصود را از دست می برد و حرف معمول از صفحهٔ مسئول می سترد
بالضرورة صرف عنان بگران از آن وادی نموده مناسب چنان دید که سطری
از آن حالات بیا فزاید فوایدی که بقدر مناسبتی بسیاق سخن داشته باشد در حواشی این
جریده مرقوم گرداند، از آن جمله هر حاشیه که بواسطهٔ ارتباط کلام در سلک تحریر منتظم
می گردد آن را رابطه دانند بنا بر ازدیاد و انتباه و واقع اشتباه سمت تسطیر یابد
ضابطه بالجمله چون تتمیم این حالات و توجیه این مقالات بالحاق روابط و الصاق
ضوابط (؟) منوط و مربوط است لهذا ایمای به تسطیر آن سطور و اظهار اهتمامی
بتحریر آن زبور واقع شد۔"

کتاب کے خاتمہ پر مندرجۂ ذیل شعر درج ہے:-

پی تاریخ اتمامش فکر کردم خرد گفتا کہ ہست این نکتہ جامع
(سنہ ۱۱۴۰)

یہ نسخہ ۱۴۶ اوراق پر مشتمل ہے اور ۲ محرم ۱۱۹۷ھ کو اس کی کتابت کی تکمیل ہوئی ہے۔

آخر میں دو تین جزوی غلطیوں کی تصحیح کر دینا بھی نامناسب نہ ہوگا۔

(۱) ہم نے لکھا تھا کہ نظام الملک سوادِ بھوپال میں مرہٹوں سے نبرد آزمائی میں مصروف تھے،

کہ نادر شاہ کی آمد کی خبر مشہور ہوئی اور انھوں نے مرہٹوں سے صلح کرلی اور دکن کا رخ کیا،[1] نظام الملک نے دکن کا رخ نہیں کیا بلکہ وہ دہلی گئے،

(ب) مآثر الامراء کے سلسلہ میں ہم نے لکھا تھا کہ صمصام الدولہ شاہنواز خاں ۱۱۷۱ھ میں ایک معرکہ میں کام آئے[2] یہ صحیح نہیں، انھیں ایک غلط فہمی کی بنا پر فرانسیسیوں نے نہایت بے دردی سے قتل کردیا تھا، اسی لیے ان کے نام کے ساتھ اکثر شہید لکھا جاتا ہے۔

(ج) گریہ نامہ کے سلسلہ میں ہم نے لکھا تھا کہ سید وجاہت حسین کا خیال ہے کہ یہ نظم "پند و نصیحت کا کام کرتی ہے"[3] مضمون کے چھپنے کے بعد ہمیں گریہ نامہ کا ایک مطبوعہ نسخہ ملا، یہ دراصل نثر میں ہے، لیکن مذکورۂ بالا غلطی کے ذمہ دار سید وجاہت حسین نہیں ہیں، ہم نے غلطی سے "نظم" کا لفظ لکھ دیا، ورنہ انھوں نے انگریزی میں لفظ (Piece) استعمال کیا ہے۔

---

[1] معارف، جنوری ۱۹۶۲ء ص ۱۱، [2] معارف فروری ۱۹۶۲ء ص ۱۲۰، [3] ایضاً ص ۱۳۲

بزم تیموریہ

بابر ایک بیمثل اہل قلم تھا، ہمایوں نے شعر و شاعری کے علاوہ ہیئت و نجوم کی بھی انجمن آرائی کی، اکبر کا عہد علوم و فنون کی روشنی سے جگمگا اٹھا، جہانگیر نے ادب و انشا کو چمکایا، شاہجہاں نے شعراء اور فضلاء کو سیم و زر میں تلوایا، عالمگیر نے معارف پروری اور انشا پردازی کے اعلیٰ نمونے پیش کیے، اس خانوادہ کے آخری بادشاہوں نے بھی اپنے اسلاف کی روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کی، بہادر شاہ ظفر نے عروس سخن کے گیسو سنوارے، تیموری شہزادوں اور شہزادیوں نے بھی علم و ادب کی محفلیں سجائیں، دربار تیموری کے امراء، شعراء اور فضلاء نے شاہد مرہستی کی رنگینی کی دلت رکھے، ان سب کی تفصیل اس کتاب میں ملاحظہ فرمایئے۔

(مرتبہ صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ایم اے)۔ ۴۴۰ صفحے۔ قیمت ــــــ

مینیجر

دیوانِ اویس بیگ فطرت

از جناب ڈاکٹر سید امیر حسن صاحب عابدی لکچرار فارسی دہلی یونیورسٹی

تذکرہ نویسوں نے کوشش کی ہے کہ زیادہ سے زیادہ شعرا کا تعارف کرائیں، اور بہت سے شعرا کا نام صرف ان تذکروں کی وجہ سے محفوظ ہو گیا ہے، چنانچہ ان چند اشعار کے علاوہ جو ان تذکروں میں نقل کر دیے گئے ہیں، نہ ان کے کسی دیوان کا پتہ چلتا ہے نہ کلیات کا، اس کے مقابلہ میں بعض ایسے شعرا بھی ہیں جن کے دیوان اور کلیات موجود ہیں، مگر خود ان کے حالات کسی تذکرہ سے معلوم نہیں ہوتے، فطرت بھی انھیں بدقسمت یا خوش قسمت شعرا میں ہے جن کو تذکرہ نویسوں نے بھلانے کی کوشش کی، مگر اس کا نام اس کے دیوان کے ایک قلمی نسخہ کی وجہ سے جو انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ہے (نمبر ۱۵۶۰) ہمیشہ کے لیے باقی رہے گا،

ایک اور مشہور شاعر میر معز فطرت[1] بھی گذرے ہیں اور بعض لوگوں نے ان دونوں کو ایک میں ملا دیا ہے، جو غلط ہے، خود اس قلمی نسخے کے شروع میں کسی نے غلطی سے یہ لکھ دیا ہے "دیوانِ معز فطرت" مگر یہ درست نہیں ہے،

اس فطرت کے متعلق جو معلومات بھی حاصل ہوتے ہیں، وہ صرف اس کے دیوان سے معلوم ہوتے ہیں، اس شاعر کا نام اویس بیگ اور تخلص فطرت ہے، فطرت ۱۰۰۰ھ مطابق ۹۱-۱۵۹۰ء

[1] میر معز الدین محمد موسوی متخلص بہ فطرت و موسوی، ولادت: ۱۰۵۰ھ مطابق ۱۶۴۰ء وفات ۱۱۰۱ھ مطابق ۹۰-۱۶۸۹ء، ص ۵۲ ورق ۱۱ الف

میں پیدا ہوا، وہ اصلاً کاشان کا رہنے والا تھا، اور اپنا وطن چھوڑنے پر شروع میں اس کو بڑی تکلیف ہوئی تھی، جس کا اظہار اس شعر سے ہوتا ہے،

نیست صبرم ز وطن چند جدائی فطرت سوختم سوختم از حسرت کاشان رفتم

مگر جب بعد میں شیراز میں مستقل مقیم ہوگیا تو کاشان کو بھول بیٹھا:

فطرت از بادہ گلگوں نتواں کند طمع کار سختیست ز شیراز بکاشان رفتن

اور غالباً وہیں سے ہندوستان آیا تھا:

آخر از شیراز فطرت چشم بر دوزم کند گلشن فردوس و سیر کوچہ باغ از دست رفت

انڈیا آفس لائبریری کی فہرست میں ہے کہ فطرت شاہ عباس کبیر کے درباریوں میں سے ہوگا، اور اس کے بعد ہندوستان گیا ہوگا، اس لیے کہ اس نے شاہ عباس [1]، بیجاپور کے بادشاہ عادل شاہ [2] اور جہانگیر [3] کے وفات کی تاریخیں کہی ہیں،

معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۲۳ھ مطابق ۱۶۱۴ء میں جب کہ فطرت صرف سولہ برس کا تھا، اسکی شاعری میں اچھی خاصی شہرت حاصل ہوگئی تھی، چنانچہ خود اس نے اور میر حیدر نے اس شہرت کی تاریخ کہی ہے،

غالباً ۱۰۳۸ھ مطابق ۲۹-۱۶۲۸ء میں یا اس سے کچھ پہلے وہ ہندوستان کے سفر پر چلا تھا، اور ایران سے فطرت دکن پہنچا، اور وہاں اس نے فوج میں نوکری کی، چنانچہ اس نے اپنے شبخوں مارنے کی تاریخ کی ہے، اور اپنے کو عادل شاہ کا غلام بتایا ہے،

غلام خسرو ہند یم بعد ازیں فطرت خریدہ است چو یوسف شہ دکن ما را

---

[1] ۹۹۵ھ - ۱۰۳۸ھ مطابق ۱۵۸۶ء - ۱۶۲۹ء [2] ابراہیم عادل شاہ ثانی ۹۸۸ھ - ۱۰۳۶ھ مطابق ۱۵۸۰ء - ۱۶۲۶ء [3] ۱۰۱۴ھ مطابق ۱۶۰۵ء - ۱۰۳۶ھ مطابق ۱۶۲۶ء

[illegible] مطابق [illegible] میں وہ ایک گھر لے گیا تھا جس کی تاریخ اس نے کہی ہے، بیجاپور کے علاوہ وہ برہانپور میں بھی رہا تھا، اور وہاں اس کے پاس ایسا بوسیدہ مکان تھا کہ برسات کے موسم میں اس میں رہنا مشکل ہو گیا،

آمد برسات و سخت تر می گردیم　　　　در جستن خانہ دربدر می گردیم

در آب و گل خرابۂ برہانپور　　　　سرگشتہ چو چرخ کوزہ گری گردیم

غالباً دکن سے کشمیر کے ارادہ سے وہ شمال ہند کی طرف آیا تھا:

میکنم عزم سفر تا چند فطرت در دکن　　　　صبحدم فیض ہوا تکلیف کشمیرم کند

مگر اس کا کوئی اور ثبوت نہیں ملتا،

شمال ہند میں غالباً وہ جہانگیر کی وفات کے بعد آیا ہے، اس لیے اس کو دربار جہانگیر تک پہنچنے کا موقع نہ ملا ہوگا، لیکن اس نے جہانگیر کو "شاہ سخن رس" کہکر یاد کیا ہے اور اس طرح انکا ذکر کیا ہے جیسے اس کو اس کا ذاتی تجربہ تھا:-

یارب مباد عہد جہانگیر را زوال　　　　فطرت بدہر شاہ سخن رس غنیمت است

فطرت کو ہند اور ہندوؤں سے بڑی محبت تھی:-

من ز ذاں ہند و پسر خود ترک ایمان میکنم　　　　کافر ای زاہد ببیں در حلقۂ زنار کیست

دلبستہ ام بصحبت شکر لبان ہند　　　　طوطی صفت گرفتہ ز ہندوستان روم

اس کے باوجود اس کو اپنے وطن کی یاد برابر ستاتی رہی،

فطرت از یاری طالع پر و بالی خواہم　　　　چند در ہند دلم یاد کند ایران را

فطرت افتادہ بہند است ز پرواز غلط　　　　عجب است اینکہ بایران ز دکن باز آید

فطرت بہند ماندہ ام از عیش می نصیب　　　　یاد بخاری و ہوس برف می کنم

فطرت کا سال وفات معلوم نہ ہو سکا، مگر اس کے آخری قطعۂ تاریخ سے ۱۰۵۹ھ (۱۶۴۹ء)
نکلتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا انتقال اس کے بعد ہی اور اس کے لگ بھگ ہوا ہوگا،
فطرت کے بھائی محمد بیگ، کریم بیگ، حمزہ بیگ اور ہاشم بیگ تھے، اس کے ایک لڑکے
کا نام سنجر بیگ تھا، جو ۱۰۴۶ھ (۳۷-۱۶۳۶ء) میں ایران سے آیا تھا، اور دوسرا علی بیگ
سنجر بیگ کے لڑکے اور فطرت کے پوتے کا نام نصر بیگ تھا،

فطرت ایک قانع اور بلند نظر انسان تھا:

نظر بمال کسی نیست زانکہ چون خاتم | پر است دیدہ سیرم گر م تہی ست شکم
اگر حاسد ترا بد گفت فطرت | ببند از شکوۂ دشمن زبان را

وہ ہجو سے حتی الامکان پرہیز کرتا تھا، مذہبی آدمی تھا، مگر وسیع المشرب انسان تھا،
چنانچہ کہتا ہے:

باسلام و کفرم چہ فطرت چہ کار | مرا مشرب خوش بہ از مذہب ست
فطرت زبسکہ ہست بہر مشرب آشنا | با شیخ توبہ کرد و بمستان شراب خورد

فطرت کو اپنے کلام پر بھی ناز تھا.

فطرت چو من پیروی طبع تو داریم | زان روی کہ طرز سخن تازہ چنین ست
با تو فطرت نحو نیم ز دل لاف زنیم | آنکہ شاگرد تو شد دعوی استادی ہست
فطرت آن معنی طراز من کہ اقبال بلند | می کند دیدہ نور آفتاب از احترام

شعر وہی ہے جو دل پر اثر انداز ہو،

شعر ہی باید ز معنی تا بخا بر دل زند | ہر کہ میگفت فطرت حساب شد اشہد
خیالات و مضامین کے ساتھ حسن و لطافت بھی ضروری ہے،

از مشو گرت دیدہ تحسین باشد | باید معنی ز لفظ رنگین باشد
در لفظ تلاش کن کہ معشوق خوب | حیف است کہ در لباس چرکین باشد

دیوان فطرت میں ۴۴۲ اشعار کے قصیدے، ۱۲۵۹ ابیات کی مثنویات، ۵ شعر کے ترکیب بند، ۳۲۵۵ اشعار کی غزلیں، ۵۷۹ اشعار کے قطعے اور چار سو رباعیاں ہیں، کل اشعار کی مجموعی تعداد ۶۵۰۸ ہے۔

قصیدے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علی مرتضیٰ، امام حسین، امام موسیٰ کاظم علیہم السلام وغیرہ کی مدح میں ہیں، ایک قصیدہ کے چند شعر نمونۃً نقل کیے جاتے ہیں :-

دیدہ در عشق در فشاں کردم | سینہ از داغ بوستاں کردم
نالہ ہر گہ شد آشنای لبم | رخنہ در سقف آسماں کردم
از ضمیرش چو یاد آوردم | در عرق مہر را نہاں کردم
ہر بیاباں کہ طی شد از شادی | خاک در چشم آسماں کردم

ان قصیدوں میں کسی بادشاہ یا امیر کی مدح وستایش نہیں ملتی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فطرت درباری شاعر نہ تھا۔

فطرت نے دو مثنویاں کہی ہیں، ایک مثنوی کا نام "خواب وخیال" ہے، جو اس بیت سے شروع ہوتی ہے :

الٰہی نالہ ام را تازگی بخش | صفیرم را بلند آوازگی بخش

اس مثنوی میں چھوٹی چھوٹی حکایتیں اور تشبیہیں ہیں اور جیسا کہ خود عنوان سے ظاہر ہے، زیادہ تر خواب وخیال کی باتیں بیان کی گئی ہیں، اس کے اشعار کی تعداد ۱۱۵۶ ہے۔
پہلے ایک حسین معشوقہ کا ذکر ہے جو عالم خواب میں شاعر کے پاس آتی تھی :-

زعنبر قطعہا بر گل فشاندہ | گلی در سایۂ سنبل نشاندہ
گل عارض چراغ شام زلفش | دل صد آرزو در دام زلفش
ہمہ تن نازکش را بار بودی | گرش از برگ گل شلوار بودی

اس کے بعد ایک قمری کا ذکر ہے، جو قفس میں رہتے رہتے باغ کو بالکل بھول گئی تھی۔

تیسرا قصیدہ یعقوب لیث نامی چور کا ہے:

حریفی کو بہر جا بود راہش | زبادہ نشأ دزدیدی نگاہش
اگر کردی بسوی باغ آہنگ | زبرگ سبز بردی چون خزان رنگ
نگاہش را بگردون گر بدی راہ | ربودی روشنی از عارض ماہ

جب بادشاہ نے اس سے چوری کا سبب پوچھا تو اس نے کہا:

کہ دوشس از مفلسی و بینوائی | بہر در رفتم از بہر گدائی
ندیدم محرمی از کشور خود؟ | کسی نکشود بر رویم در جود

اس کے بعد ایک اور عالم خواب کا ذکر ہے:

نظر بر روی گل غلطیدہ می رفت | نگہ از ہر طرف گلچیدہ می رفت

جس میں ایک برہنہ حسینہ پتھر پر بیٹھی ہوئی دکھائی دی:۔

برہنہ بر سر سنگی نشستہ | پرند از برگ گل بر خویش بستہ

وہ شاعر کی طرف مائل ہوئی:۔

بیا یا ہم بکام دل بجوشیم | بر غم چشم بد ساغر بنوشیم

گردوں کو ایک زخمی شیر نے ہلاک کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

پانچواں قصیدہ ایک بڈھے کا ہے جسے عالم خواب میں ایک جوان دکھائی دیا:۔

قمریا دُگرو دو ن ستبوئی خرابات آشنا بیگانہ خوئی
زمستی با می و مطرب بجنگی گلوی شیشہ از دستش بتنگی

اس بڈھے نے اسے دولت دیکر اس سے جوانی خرید لی۔ اس کے بعد اس درویش کا قصہ ہے جو شیطان کے دھوکہ دینے سے بادشاہ بن گیا تھا۔ اس میں شاعر نے یہ عقیدہ ظاہر کیا ہے کہ خداوند عالم حسب استعداد لوگوں کو فقیر اور بادشاہ بناتا رہتا ہے۔

خدا آنرا کہ درویش آفریدہ یقینش در خور شاہی ندیدہ

چھٹی تمثیل میں حضرت موسیٰؑ کے ایک بڈھے شرابی کی تنگدستی کو دیکھکر دعا کرنے اور اسکے دولت مند ہونے کے بعد شرابخواری اور قتل و خون کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد کی تمثیل میں یہ بیان کیا ہے کہ شیطان نے ایک دیوار پر تھوڑا سا شہد لگا دیا۔ اس میں چیونٹیاں آکر بھر گئیں۔ ان کو دیکھکر ایک حسین بچے کا کبوتر جھپٹا۔ اس کو ایک ترک کے باز نے حملہ کرکے ختم کر دیا۔ اس پر اس بچہ نے باز کو مار ڈالا۔ اور پھر ترک نے بچہ کو قتل کر دیا، اس بچہ کے قتل کی وجہ سے لوگ جمع ہو گئے اور سب نے مل کر اس ترک کو قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد ایک بادشاہ کا قصہ ہے جو مست ہو کر سو گیا۔ اور بیماری میں منت مانی کہ اگر اچھا ہو جائے گا تو درویشوں کی سی زندگی بسر کرے گا۔ اور اپنی دولت کو عزیزوں میں تقسیم کر دے گا۔

اس کے بعد مامون کا قصہ ہے کہ اس نے خواب میں دیکھا کہ اس کی ماں اس سے کہہ رہی ہے کہ اس نے ایک تھیلی اشرفی دیکر بہلول نامی معمار سے اپنا محل بنوایا تھا۔ لیکن جب مامون نے اس سے اپنا محل تعمیر کرنے کی خواہش کی تو اس نے دو تھیلی اشرفی کا مطالبہ کیا۔ مامون نے اس کا سبب پوچھا تو بہلول نے کہا کہ اسکی ماں نے بغیر دیکھے ایک تھیلی اشرفی دی تھی لیکن مامون کو دیکھنے کے بعد دوگنی اجرت دینی پڑے گی۔

آخر میں شاعر نے ذرہ ہند و عاشق و معشوق کا قصہ بیان کیا ہے، جن کو دریا میں ڈوب کر وصال نصیب ہوا۔

فطرت نے دو ترکیب بند کہے ہیں، جن میں سے ایک میں کسی نامعلوم آدمی کی مدح اور دوسرے میں امام قلی خاں حاکم شیراز کی ستایش کی گئی ہے،

اس دیوان میں غزلیات کا حصہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے:۔

چناں مجنوں برد بیتاب ہر دم نام لیلی را	کہ نشنیدست پنداری بجز حرف تسلی را

فطرت ایک متوسط درجہ کا شاعر ہے، اس کے اشعار عام طور سے نہ بہت بلند ہوتے ہیں نہ پست، یہ ضرور ہے کہ ہزاروں شعروں میں بہت سے ایسے اشعار مل جاتے ہیں جو روانی، سلاست اور تغزل میں بے نظیر ہوتے ہیں،

فریاد کہ نگذاشت اجل با غم عشقم	من بودم و درد تو و دارا کہ خبر کرد
پوشید رخِ خویش ز پوشیدہ نگاہم	او خود نشد آگاہ حیا را کہ خبر کرد
ندانم از دل آسودہ ام دیگر چہ می خواہد	زبان زلف او با من سخن پیچیدہ می گوید
درین گلشن بہ مدد عیش ہر کس قسمتی دارد	کہ بلبل مدعا نالیدہ گل خندیدہ می گوید
حرفی ز رنجش تو نمی گفت از حسد	قاصد اگر بلذت دشنام می رسد
ہمتی تا فکنم طرح بہاری ز سر شک	رشک فرمای گلستان قفسی می خواہم
ہمہ آں دم کہ با زلف پریشاں بستم	طمع از خویش بریدم نظر از جاں بستم

ان منتخب اشعار کے مقابلہ میں بہت سے اشعار لفظ و معنی کے لحاظ سے بہت معمولی درجہ کے ہیں، اور ان میں تعقید، پیچیدگی اور مضمون آفرینی زیادہ پائی جاتی ہے، مثلاً

چنان [illegible] ہنگامہ گل را	چو باد سیر گل کردم گرفتم چشم بلبل را

بنوعی خلک چنان گریم ، غمش فطرت   کہ سبزہ ودیبا شبنم است ہرزہ مرا

فطرت نے بہت سے قطعے کہے ہیں ، جن میں سے کچھ بہت چھوٹی چھوٹی چیزوں کے متعلق بھی ہیں ، ان قطعوں میں اس نے اپنے بھائی محمد بیگ المولود ۱۰۲۳ھ ، کریم بیگ المولود ۱۰۲۳ھ اپنے لڑکے سنجر بیگ المولود ۱۰۲۵ھ ، علی بیگ المولود ۱۰۴۵ھ ، اپنے پوتے نصر بیگ المولود ۱۰۴۴ھ ابن سنجر بیگ ، اپنے بھائی کے لڑکے مختار بیگ المولود ۱۰۳۴ھ ابن حمزہ بیگ ، اپنے خالو کے لڑکے خواجہ میرک المولود ۱۰۴۹ھ ، اور ان کے علاوہ اس نے باقر المولود ۱۰۲۷ھ ، یوسف ، مرزا معصام الدولہ المولود ۱۰۳۹ھ ، آقا رضا کی کنیز سے پیدا ہوئے بچے میر معصوم المولود ۱۰۴۰ھ کسی اخوند کے غلام بچے المولود ۱۰۴۱ھ ، عبد اللہ قطب شاہ کے لڑکے المولود ۱۰۳۲ھ ، مرزا قاسم پسر مرزا ایرج المولود ۱۰۴۴ھ ، مرزا تراب المولود ۱۰۴۵ھ پسر مرزا ایرج المولود ۱۰۴۵ھ میر یحییٰ ، کسی بادشاہ زادی المولود ۱۰۴۰ھ محمد محسن المولود ۱۰۵۰ھ ، محمد صادق المولود ۱۰۳۵ھ احمد بیگ ، پسر سید مرزا المولود ۱۰۴۶ھ ، پسر مرزا احمد المولود ۱۰۵۶ھ ، مرتضیٰ بیگ المولود ۱۰۵۶ھ پسر مرزا بہرام ، سلیمان بیگ المولود ۱۰۵۷ھ . قزلباش خاں المولود ۱۰۵۸ھ ، محمد کے بیٹے اور ڈھڈوان مرزا مقیم المولود ۱۰۵۹ھ اور مرزا تراب المولود ۱۰۵۹ھ کی ولادت ، اور اپنے بھائی محمد بیگ المتوفی ۱۰۴۵ھ حمزہ بیگ المتوفی ۱۰۳۳ھ ، ہاشم بیگ ، اپنے والد المتوفی ۱۰۴۰ھ ، میر معصوم المتوفی ۱۰۳۲ھ میر ابو البقا المتوفی ۱۰۲۳ھ ، کسی برخوردار المتوفی ۱۰۲۹ھ ، خواجہ میرک المتوفی ۱۰۳۳ھ ، شاہ عباس ، مرتضیٰ خاں المتوفی ۱۰۳۹ھ ، میر محمد تقی الجو المتوفی ۱۰۳۹ھ روزبہان شیرازی المتوفی ۱۰۳۱ھ احمد بیگ المتوفی ۱۰۴۲ھ ، میر کاظم المتوفی ۱۰۴۳ھ ، خان زماں المتوفی ۱۰۴۶ھ ، فضلی بیگ المتوفی ۱۰۵۰ھ ، نواب آصف خاں المتوفی ۱۰۵۰ھ ، جہانگیر بادشاہ ، بیلوان علی دوغا المتوفی ۱۰۵۱ھ ، مرزا خان المتوفی ۱۰۵۴ھ اور خان دوران المتوفی ۱۰۵۵ھ کی تاریخیں کہی ہیں ،

ولادت و وفات کی تاریخوں کے علاوہ نصرت کے شاہ عباس کی شراب سے توبہ ۱۰۲۲ھ،
ان کی فتح ۱۰۲۳ھ، بہادر خاں کے قندھار کے محل ۱۰۲۳ھ، مرزا انتقام کے بھیجے ہوئے دیوان
۱۰۲۷ھ، طالب قہوچی کی دوستی ۱۰۲۵ھ، امام قلی خاں کی جنگ، ہرمز میں بنائی ہوئی توپ
۱۰۳۱ھ اور مرصع صراحی ۱۰۳۲ھ، صفی قلی سلطان کے گھر ۱۰۳۳ھ، شاہ جہاں کے جلوس
ملک جلال الدین حاکم سیستان کی عمارت ۱۰۳۳ھ، مرتضیٰ خاں کی عمارت ۱۰۳۳ھ، ملک
سیستان سے گھوڑا خریدنے ۱۰۳۸ھ، عادل شاہ کے بیجاپور میں نہر لانے ۱۰۳۹ھ، اعتماد خاں
کے عزم جنگ ۱۰۳۹ھ، کسی کی کدخدائی ۱۰۴۰ھ، مصطفیٰ خاں کی عمارت ۱۰۴۰ھ، پرینڈہ
قلعہ کی فتح، عادل شاہ اور قطب شاہ کے رشتہ ۱۰۴۰ھ، آنکے بیجاپور کے گھر ۱۰۴۱ھ، گھر کے دروازہ ۱۰۴۲ھ
میر فصیح کے گولکنڈہ میں نئے عہدہ ۱۰۴۲ھ، قلعہ دولتاباد کی فتح ۱۰۴۳ھ، خان زمان کے
ہاتھوں قلعہ جنید کی فتح ۱۰۴۶ھ، سنجر بیگ کے ہند آنے ۱۰۴۶ھ، اورنگزیب کی کدخدائی،
قلعہ بگلانہ کی فتح ۱۰۴۸ھ، اورنگ زیب کے دولتخانہ کی عمارت ۱۰۴۹ھ، اپنی بنائی ہوئی
مسجد ۱۰۴۹ھ، اپنے ولی نعمت کے ہند آنے ۱۰۵۰ھ، رشید کے حمام ۱۰۵۱ھ، عباس ثانی
کے جلوس، اورنگ زیب کی مسجد ۱۰۵۲ھ، کسی باغ ۱۰۳۵ھ، چیچک سے صحت ۱۰۳۵ھ
کسی حمام ۱۰۳۶ھ، کسی گھر ۱۰۳۹ھ، ایک ہشت در عمارت ۱۰۳۹ھ، نئے کلانتر کے
تقرر اور پرانے کی معزولی ۱۰۳۶ھ، محمد بیگ پسر سودک سلطان کی سنت ۱۰۳۶ھ
ایک گبر کے اپنے ہاتھوں مسلمان ہونے ۱۰۳۶ھ، شاہ صفی کے جلوس، ایک مغل کے پیر
ٹوٹنے، کئی کدخدائیوں، شاہ محمد نازن کے منصب پانے ۱۰۴۳ھ، اپنے لشکر دکن پر
شبخون مارنے ۱۰۴۴ھ، اورنگ زیب کے شکار کھیلنے ۱۰۴۷ھ، رشید خاں کے حمام
۱۰۵۰ھ، اپنے بیٹے علی بیگ کی سنت ۱۰۵۵ھ، اپنے باغ گلاب ۱۰۵۶ھ اور ایک

پانی کے ٹھنکے ۱۴۰ء ۱۲۸۳ھ کی جسے کسی نے بھیجا تھا، تاریخیں کہی ہیں، ان کے علاوہ مختلف قطعات مختلف واقعات سے متعلق ہیں، فطرت کی رباعیاں زیادہ تر اخلاقی اور معمولی درجہ کی ہیں، ایک رباعی میں دلاک کا ذکر کیا گیا ہے:

دلاک ندانستہ وفا داری را　　آئین وفا و رسم دلداری را
تیغش دو ہزار زخم بر من زدہ است　　آموختہ از چرخ ستمگاری را

ایک رباعی میں خان زماں کے خلعت پانے کا ذکر ہے، اور ایک میں برسات میں اپنے ٹپکتے ہوئے گھر کی تصویر کشی کی ہے۔

اقبال کامل

ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ و شاعری پر اگرچہ بکثرت مضامین، رسالے اور کتابیں لکھی گئیں، لیکن ان سے ان کی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایاں نہ ہو سکی، یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، اس میں ان کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ ان کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل لکھی گئی ہے، اور سوانح حیات کے بعد پہلے ان کی اردو شاعری پر، پھر فارسی شاعری پر ان کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مفصل تبصرہ کیا گیا ہے، اور ان کے کلام کی تمام ادبی خوبیاں دکھائی گئی ہیں، پھر ان کی شاعری کے اہم موضوعوں یعنی فلسفہ، خودی، فلسفہ بیخودی، نظریہ ملیت، تعلیم، سیاست، صنف لطیف (یعنی عورت) فنون لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے۔　(زیر طبع)

(مرتبہ مولانا عبد السلام ندوی مرحوم)

ضخامت ۴۰۰ صفحے　　قیمت [illegible] روپے

منیجر

ابو عثمان جاحظ

از جناب مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دار المصنفین

(۲)

لطافت و ظرافت | جاحظ بڑا ظریف اور خوش طبع تھا، اکثر ظرافت اور دلچسپی کی باتیں کیا کرتا تھا اور اپنی ذہانت و طباعی سے عام باتوں میں بھی لطف و ندرت پیدا کر دیتا تھا، اس لیے اس کی کتابیں اور تحریریں دلآویزی اور دلکشی کا مرقع ہوتی ہیں، کبھی کبھی وہ سنجیدگی اور متانت کی باتیں بھی مذاق کے رنگ میں کرنے لگتا، اور سادہ پانی کو پرکیف شراب بنا دیتا[۱]، اس کا ادنیٰ کرشمہ تھا، حکمت و دانش کی باتیں کرتے کرتے ایسی دلچسپ باتیں شروع کر دیتا ہے کہ بیساختہ ہنسی آجاتی ہے، جس سے موضوع کی خشکی فرحت و انبساط میں بدل جاتی ہے،

مسعودی لکھتا ہے کہ جاحظ کو پڑھنے والے کی اکتاہٹ اور سننے والے کی بیزاری کا احساس ہوتا ہے تو وہ سنجیدگی کی باتیں چھوڑ کر مذاق اور حکمت و تدبر کے بجائے انوکھی اور دلچسپ باتیں کرنے لگتا ہے[۱]، احمد فرید رفاعی لکھتے ہیں کہ ادب اور لطافت و ظرافت میں اس کی متعدد کتابیں ہیں، اور یہ اس کا کمال ہے کہ وہ دین کا امام بھی سمجھا جاتا ہے[۲] اور ایک ماہر داستان گو بھی[۳]، وہ اپنی خوش طبعی اور شیریں کلامی سے لوگوں کا دل موہ لیتا تھا، اور اس کی بدولت امراء و سلاطین سے بیش بہا ہدیے و عطیے حاصل کرتا تھا، اور اپنے کو مشکلات و خطرات سے بھی بچا لیا کرتا تھا،[۴]

---

۱ تاریخ مسعودی برحاشیہ الکامل ابن اثیر ج ۸ ص ۲۲۹ ۔ ۲ یہ بات محل نظر ہے، جاحظ ایک امام اہل علم دین کی حیثیت سے کسی زمانہ میں بھی مشہور نہیں ہوا، البتہ اس سے زیادہ اس کا شمار اکابر ادب و اعتزال میں ہوتا ہے۔ ۳ معجم الادباء ج ۶ ص ۷۵ ۔ ۴ ایضاً ص ۷۹

اس کی خوش مذاقی اور خوش طبعی کے بہت سے واقعات ہیں چند نمونۃً نقل کیے جاتے ہیں،

ابو محمد حسن بن عمرو بجیرمی کا بیان ہے کہ جب میں اندلس میں مقیم تھا تو وہاں جاحظ کے ایک شاگرد کا مجھے پتہ چلا میں نے اس سے مل کر پوچھا کہ جاحظ تو یہاں کبھی نہیں آیا، پھر کس طرح تم اس کے شاگرد ہو گئے؟ اس نے بتایا کہ مشرق کے جو طالبین علم جاحظ سے مل کر ہمارے یہاں بادشاہوں کے پاس آتے تھے، ان کے ذریعہ ہمیں اس کی کتاب التربیع والتدویر اور پھر کتاب البیان والتبیین ملیں یہ دونوں کتابیں بہت خوب ہیں، مصنف کا کمال ان سے نمایاں تھا، اس لیے میں اس کی تلاش میں بغداد، سرمن رای اور بصرہ گیا، بصرہ پہنچکر اس کے گھر گیا تو بیس طالب علموں کو اس کے پاس بیٹھے دیکھا، جن کے ابھی داڑھیاں بھی نہیں نکلی تھیں، پہلے تو مجھ پر ہیبت طاری ہوئی اور میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا، ان میں ابو عثمان کون ہے؟ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلایا اور پوچھا کہاں سے آرہے ہو، میں نے کہا اندلس سے، اس نے کہا اچھا احمقوں کے وطن سے، پھر نام دریافت کیا، میں نے اپنا نام سلام بتایا، اس نے کہا یہ تو قراد کے کتے کا نام ہے، پھر باپ کا نام پوچھا، میں نے کہا یزید، اس نے کہا ٹھیک ہے، پھر کنیت پوچھی، میں نے ابو خلف بتائی، اس نے کہا یہ زبیدہ کے بندر کی کنیت ہے، اپنے آنے کا مطلب بتاؤ، میں نے عرض کیا علم کے شوق و جستجو میں آیا ہوں، جاحظ نے کہا، واپس جاؤ اس میں کامیابی نہ ہوگی، میں نے کہا آپ نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا، مجھ میں چار خصوصیتیں پائی جاتی ہیں (۱) بعد وطن (۲) سفر کی مشقت و زحمت (۳) نوجوانی کی غفلت اور (۴) نو واردوں کی طرح خوف و دہشت کا غلبہ،

جاحظ نے کہا تم نے میرے پاس ۲۰ طالب علم دیکھے، میرے سوا ان میں سے کسی کی بھی مسیں ابھی نہیں بھیگی ہیں، ایسی حالت میں کیا تم مجھے پہچان نہیں سکتے تھے، اس کے بعد ۲۰ سال تک

میں وہاں مقیم ہوں گا[1]۔

سوادہ بن ابو شراعہ کا بیان ہے کہ جب میں جاحظ کے پاس مقیم تھا تو اس نے مجھے ایک معمولی بوسیدہ کاغذ پر معمولی قلم سے لکھتا اور قریب قریب لکھتے دیکھا تو کہا شاید تمھیں اپنے ورثہ سے محبت نہیں ہے، میں نے پوچھا وہ کیسے؟ اس نے جواب دیا اس لیے کہ تم ان کے لیے اچھا سرمایہ نہیں جمع کر رہے ہو[2]۔

علی بن قاسم ادیب کا بیان ہے کہ میرے ایک دوست نے جاحظ سے اسکی حالت دریافت کی، اس نے کہا تم نے اس سوال میں کئی باتیں دریافت کی ہیں، ہر ایک کا جواب سنو! میری حالت یہ ہے کہ وزیر میری رائے اور مشورے سے فیصلہ کرتا ہے، خلیفہ انعام واکرام میں مجھے ترجیح دیتا ہے، میں عمدہ اور فربہ طیور کا گوشت کھاتا ہوں، نرم و نازک لباس پہنتا ہوں، اور طبرستانی ملائم فرش پر بیٹھتا ہوں، اور بہترین تکیہ سے ٹیک لگاتا ہوں، یہ حالت اس وقت تک رہے گی جب تک اللہ تعالیٰ میرے لیے آسائش نہ مہیا کردے، میرے دوست نے سوال کیا کیا یہ عیش و فراغت کی حالت نہیں ہے؟ اس نے جواب دیا نہیں، میری خواہش یہ ہے کہ مجھے خلافت ملے، اور محمد بن عبد الملک میرے حکم کی تعمیل کرے اور میری خدمت میں حاضر رہے، جب ایسا ہو جائے گا تب آسائش اور فراغت نصیب ہوگی[3]۔

ابو العیناء بیان کرتے ہیں کہ جاحظ محمد بن عبد الملک زیات کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا جب فالودے کا دور آیا تو محمد نے بطور تفنن جاحظ کے سامنے اس کا ہلکا اور رقیق پیالہ رکھوایا، جاحظ نے فوراً اس کو پی لیا، ابن زیات نے کہا تمہارا دل سب سے پہلے چھوٹ گیا، جاحظ نے کہا اس لیے کہ اس میں [illegible] اور بس پانی تھا[4]۔

[illegible] تاریخ بغداد [illegible] ۲۱۹، ۲۱۸
[illegible] معجم الادباء [illegible]

جاحظ اپنی طلاقت لسانی اور چرب زبانی سے بھی بڑی لطیف اور نازک خیال کی باتیں کرتا، اور خود بھی محظوظ ہوتا اور دوسروں کو بھی محظوظ کرتا۔

اس کی کتابوں میں بھی مزاح اور ظرافت کی بڑی چاشنی ہے اور اس کے بڑے دلچسپ واقعات ہیں، وہ کہتا ہے کہ ایک مرتبہ اس نے بنی حزام کے ایک آدمی سے پوچھا تمہیں یہ پسند ہے کہ لوگ تم کو بخیل کہیں، اس نے جواب دیا، اللہ تعالیٰ مجھ سے یہ نام زائل نہ کرے، جس شخص کو بخیل کہا جاتا ہے وہ مالدار ہوتا ہے، اگر مجھے مالدار تسلیم کر لیا جائے تو پھر جو چاہے نام دیا جائے، مجھے اسکی پروا نہیں۔ میں نے کہا کہ سخی بھی تو مالدار ہی کو کہتے ہیں، اور سخاوت کا لفظ تعریف و توصیف پر مشتمل ہے، اور بخل میں مذمت پائی جاتی ہے، حزامی نے کہا ان دونوں لفظوں میں فرق ہے، بخیل مالدار ہونے کے ساتھ محتاط اور صاحب حزم و تدبر بھی ہوتا ہے، گو وہ مذموم سمجھا جاتا ہے، اور سخاوت نام ہے مال کی ضیاع و بربادی کا، گو اسے محمود وصف مانا جاتا ہے، درحقیقت مال نفع بخش چیز ہے، اس سے صاحب مال کا اعزاز و اکرام ہوتا ہے، گو اس کی تعریف و توصیف کھوکھلی ہوتی ہے، اور مذاق و تمسخر سے زیادہ اس کی اہمیت نہیں ہوتی، اور جس کی تعریف کیجاتی ہے، اس پر اضمحلال اور افسردگی طاری ہو جاتی ہے اور اس کی حرکت و نشاط ختم ہو جاتا ہے۔ (کتاب البخلاء)

اس طرح کے اور بھی واقعات ملتے ہیں جس سے اسکی ظریفانہ طبیعت کا پتہ چلتا ہے۔

عقیدہ و مذہب | جاحظ نہ صرف معتزلی بلکہ فرقہ معتزلہ کے سرخیل علاف کے مشہور و مایہ ناز شاگرد نظام کا خانہ زاد غلام و شاگرد، معتزلہ کا امام و ترجمان اور ان کے ایک فرقہ کا بانی بھی تھا، جو اس کی نسبت سے جاحظیہ کہلاتا تھا، اس نے اپنی تحریروں میں معتزلہ کی پوری تائید و حمایت کی ہے۔ اور چونکہ قدرت نے اس کو زور بیان اور قوت استدلال عطا کیا تھا، اس لیے اس کی کتابوں سے مذہب اعتزال کو بڑی تقویت حاصل ہوئی، مگر اعتزال کی وجہ سے خود اس کے عقائد ...

تھے، اس کی جانب مختلف بدعتیں اور گمراہیاں منسوب کی جاتی ہیں، اور اس کے عقیدہ میں بڑا فساد بتایا جاتا ہے[1]، اس کے ضبط و ثقاہت میں بھی کلام کیا گیا ہے، علامہ ابن کثیرؒ نے اسے سیئی المخبر بتایا ہے[2]، ثعلب کا بیان ہے کہ وہ ثقہ اور قابل اعتبار نہیں[3]، ابو العباس احمد بن یحییٰ کی مجلس میں جاحظ کا ذکر چھڑا تو انھوں نے کہا کہ اس کا تذکرہ نہ کرو، وہ غیر ثقہ اور ناقابل اعتبار ہے[4]، ازہری کا قول ہے کہ وہ ثقہ اور معتبر لوگوں کی طرف غلط چیزیں منسوب کرتا ہے[5]۔ اس کی طلاقت لسانی، قادر الکلامی اور مختلف علوم و فنون میں مہارت و جامعیت کے باوجود اہل علم نے اس کی مذمت کی ہے، اور اس کی صداقت میں کلام کیا ہے[6]۔ عبد القاہر بغدادی نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے:

ولو عرفوا جهالاته وضلالاته	اگر لوگ اس کی گمراہ کن جہالتوں سے
لاستغفروا الله تعالیٰ من	واقف ہو جائیں تو اسے انسان کہنے سے
تسمیتهم ایاه انسانا فضلا عن	بھی خدا کی پناہ مانگنے لگیں، چہ جائے کہ
ان ینسبوا الیه احسانا[7]	اس کی طرف کسی فضل و احسان کو منسوب کریں۔

ان بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ معتزلہ اور جاحظ کے متعلق دیندار علماء کے خیالات کس قدر سخت تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ معتزلہ کے تمام عقائد باطل ہیں اور نہ جاحظ کا عقیدہ اس قدر گمراہ کن ہے۔۔۔۔ اس کے خاص خاص عقائد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حسب ذیل ہیں:

(۱) تمام معارف طبعی حقیقۃً آدمی کے افعال ہیں جو اس سے طبعاً اور غیر اختیاری طور پر صادر ہوتے ہیں، اس لیے اس کی جانب منسوب ہوتے ہیں، آدمی کا کسب و عمل صرف ارادہ ہے اور

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۱۹ [2] ایضاً [3] شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۲۱ [4] حاشیہ کتاب [illegible] ص ۲۰۱ [5] ایضاً [6] ایضاً
[7] الفرق بین الفرق ص ۱۰۳

اسی سے افعال واجب ہوتے ہیں جاحظ کے نزدیک کسی شخص کا اللہ تعالیٰ کی معرفت سے محروم ہونا ناممکن ہے، اس کے خیال میں کفار بربنائے عناد اور جان بوجھ کر کفر وانکار اختیار کرتے ہیں ان کی عصبیت اور اپنے مذہب سے شدید لگاؤ انہیں معرفت حق سے باز اور اپنے مذہب کے خلاف کوئی بات قبول کرنے پر آمادہ نہیں کرتی۔

(۲) حدوث کے بعد اجسام کا معدوم ہو جانا محال ہے کیونکہ ان کا تعلق جواہر سے ہے اور جواہر فنا نہیں ہوتے، البتہ اعراض میں تغیر و تبدل ہوتا ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ لوگوں کو دوزخ میں نہیں ڈالے گا، بلکہ جہنم کی خاصیت اور طبیعت ہی ایسی ہے کہ وہ اہل نار کو اپنی جانب کھینچ لے گی، اس لیے وہ خود بخود اس میں چلے جائیں گے[1]۔

ان کے علاوہ بعض اور فاسد خیالات بھی اس کی طرف منسوب کیے گئے ہیں، جو فلاسفہ اور یونانی حکماء کے افکار سے ماخوذ ہیں، اور جن کے گمراہ کن و باطل ہونے میں کوئی شبہ نہیں، عبدالقاہر بغدادی وغیرہ نے ان کا رد لکھا ہے لیکن خیاط معتزلی نے اپنی کتاب الانتصار والرد علی ابن الراوندی میں جاحظ کا دفاع کرتے ہوئے ایسے خیالات میں سے بعض کی نسبت کو اس کی جانب غلط قرار دیا ہے، اور ان کو سراسر کذب و افترا بتایا ہے، کیونکہ نہ اس کی کتابوں سے ان کی کوئی تائید ہوتی ہے اور نہ اس کے اصحاب نے ان کی روایت کی ہے، اور نہ اس کے ہم مذہب اور ہم مذاق لوگوں نے اس کا یہ مذہب بتایا ہے، اس کے برعکس جن لوگوں کو رد تشبیہ، جبر و اخبار، اثبات رسالت اور نظم قرآن وغیرہ کے متعلق اس کی کتابیں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس کے اسلامی خدمات سے واقف ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان خدمات کو ضائع نہیں کرے گا[2]۔

یہ تو تسلیم ہے کہ معتزلہ اور جاحظ کے بعض عقائد و اقوال غلط اور گمراہ کن ہیں لیکن اس بارہ میں

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الملل والنحل شہرستانی بر حاشیہ الملل والنحل ابن حزم ج ۱ ص [illegible] الفرق بین الفرق ص ۱۶۰، ۱۶۱۔ [2] کتاب الانتصار والرد علی ابن الراوندی ص ۱۲ و ۲۲

جس حد تک کہ لیکن وہ بھی [illegible]

جاحظ کا حلیہ | جاحظ نہایت بدشکل اور اپنی بدصورتی کے لیے مشہور تھا۔ علامہ ابن خلکان بیان کرتے ہیں کہ وہ اپنے فضائل اور کمالات کے باوجود بدشکل اور قبیح المنظر تھا، اور اسے جاحظ کہے جانے کا سبب یہ تھا کہ اس کی دونوں آنکھیں اٹھی اور ابھری ہوئی تھیں، اور اسی بنا پر اسے حدقی بھی کہا جاتا ہے[1]۔ وہ خود بیان کرتا ہے کہ خلیفہ متوکل کو اپنے لڑکوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک استاد کی ضرورت ہوئی، تو اس نے مجھے طلب کیا، میری ہیبتناک اور کریہ صورت دیکھکر انعام و اکرام دیکر واپس کر دیا[2]۔

اس کی بدصورتی کے متعلق محاضرات کی کتابوں میں ایک لطیفہ ملتا ہے، کہ ایک مرتبہ ایک عورت جاحظ کو بلا کر ایک مصور کی دکان پر لے گئی، اور اس سے کہا کہ اسی طرح بنا دو، یہ کہکر لوٹ گئی، جاحظ نے مصور سے پوچھا کہ اس کے کہنے کا کیا مقصد تھا، مصور نے کہا کہ اس عورت نے مجھ سے شیطان کی تصویر بنانے کی فرمائش کی تھی، میں نے اس سے کہا کہ میں نے کبھی اس کو دیکھا ہی نہیں، اس کی تصویر کس طرح بنا دوں، اس پر اس نے تم کو لا کر تمہاری صورت دکھا دی،

اخلاق و عادات | جاحظ طبعاً نیک سیرت اور عادات و اخلاق میں بلند تھا، ہر شخص سے حسن سلوک اور نرمی سے پیش آتا تھا، ہمیشہ ہنسی مذاق، لطف و تفریح اور ظرافت و خوش طبعی کی باتیں کرتا تھا، اس کی کتابوں اور اقوال سے بھی اس کی شرافت، رحمدلی اور کریمانہ اخلاق کا ثبوت ملتا ہے، اور اس نے اخلاق و آداب کے موضوع پر کئی کتابیں بھی لکھی ہیں[3]، اس کی رواداری اور بے تعصبی کا یہ حال تھا کہ ہر خیال کے علما، و خلفا، اور ہر طبقہ کے اصحاب علم و فن سے ملتا تھا، اور متعصب اور تنگ نظر لوگوں کی طرح نہ تو کوئی امتیاز برتتا تھا[4] اور نہ غلط قسم کی مذہبی، قومی اور نسلی عصبیتوں میں مبتلا وہ بڑا [illegible] تھا کہ اس کی مجلس بڑی دلچسپ ہوتی تھی، اور وہ نہایت خوش مذاق اور شیریں سخن تھا،

---

[1] [illegible] ابن خلکان [illegible] الادب [illegible]

[2] [illegible] ص ۲۲۲ و ۲۲۳

عام طور سے لوگ اپنی زندگی کے ایسے واقعات نہیں بیان کرتے جن سے ان کی سبکی ہوتی ہو اور اگر دوسرے لوگ اس کے متعلق اس طرح کے واقعات بیان کرتے ہیں تو وہ انھیں سخت ناگوار ہوتا ہے، مگر جاحظ انھیں بھی بلاتکلف بیان کر دیتا تھا، اور اس میں اس کو شرم محسوس نہیں ہوتی تھی،[1]

علالت اور وفات | جاحظ نے طویل عمر پائی، آخر عمر میں اس پر اس قدر ضعف طاری ہو گیا تھا کہ اعضاء و جوارح نے بالکل جواب دیدیا تھا، فالج کا بھی حملہ ہوا تھا، اور آئے دن طرح طرح کے عارضوں اور تکلیفوں میں مبتلا رہتا تھا، اسکے مثانہ میں پتھری ہو گئی تھی، اس زندگی سے وہ تنگ آگیا تھا، شدت درد و الم سے ہر وقت اسکی زبان پر آہ و شیون کے کلمات جاری رہتے تھے، مبرد کا بیان ہے کہ آخر عمر میں جب جاحظ سخت بیمار تھا، میں اس کو دیکھنے کے لیے اس کے گھر گیا، اس نے کہا ایسے شخص کا کیا حال پوچھتے ہو جس کا آدھا جسم اس طرح مفلوج ہو گیا ہے کہ اگر اسے آرے سے چیرا جائے اور قینچیوں سے کاٹ دیا جائے تو بھی اسکو اس کا احساس نہ ہوگا، جسم کے دوسرے نصف حصہ میں اس قدر تکلیف اور درد ہے کہ اگر مکھی بھی اس کے قریب سے گذرتی ہے تو اسکو اذیت محسوس ہونے لگتی ہے،[2] اس حالت میں اکثر یہ اشعار پڑھا کرتا تھا:

اترجو ان تکون وانت شیخ — کما قد کنت ایام الشباب

لقد کذبتک نفسک لیس ثوب — دریس کالجدید من الثیاب[3]

کیا تمھیں عالم پیری میں بھی اس کی توقع ہے کہ تم دور شباب کی طرح (تندرست و توانا) ہو جاؤ گے
ہرگز نہیں، تمھارا نفس تمھیں فریب دیتا ہے، کوئی پرانا کپڑا نئے کپڑے کی طرح نہیں ہو سکتا،

جسم کی سوزش اور حرارت سے پریشان ہو کر نصف جسم پر صندل اور کافور کا لیپ لگاتا تھا اور نصف جسم اس قدر ٹھنڈا تھا کہ اگر کاٹ بھی ڈالا جاتا تو اسے خبر نہ ہوتی۔[4]

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۲ [2] تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۱۱۰ و تاریخ بغداد ج ۱۲ ص [illegible] و ذیل الامالی ص [illegible] [3] ایضاً [4] تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۱۱۰ و مرآۃ الجنان ج ۲ ص [illegible]

اپنے معالج سے شکایت کیا کرتا تھا کہ میرے جسم میں دو عجیب اور متضاد خصوصیات جمع ہوگئی ہیں، اگر کوئی ٹھنڈی چیز کھاتا ہوں تو پیروں میں تکلیف ہوتی ہے اور گرم چیز کھاتا ہوں تو سر میں تکلیف ہو جاتی ہے،[1]

احمد بن عمر بر ذعی متکلم کا بیان ہے کہ میں جاحظ سے ملاقات کے لیے اس کے گھر گیا، اور اندر جانے کی اجازت چاہی تو ایک شخص نے باہر آکر کہا کہ وہ کہہ رہا ہے

ما تصنع بشق مائل ولعاب مائل[2]
تم کو ایک ایسے شخص سے کیا کام اور روا ہے جس کی کمر ٹیڑھی اور منہ سے لعاب جاری ہے،

اسی طرح امیر المومنین متوکل نے اسے بصرہ سے بلانا چاہا تو اس نے کہلایا کہ امیر المومنین ایسے بے کار شخص کو کیا کریں گے جس کی کمر جھک گئی ہے، منہ سے لعاب جاری رہتا ہے، عقل میں فتور آگیا ہے اور رنگ تبدیل ہو چکا ہے،[3]

اسی حالت میں آخر ۲۵۵ھ میں وفات پائی، بعض تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ اس کی وفات اس کے اوپر کچھ کتابوں کے گر جانے کی وجہ سے ہوگئی تھی[4]

(باقی)

---

[1] امالی ج اول ص ۲۰۲، و معجم الادبا ج ۶ ص ۸۰ [2] امالی ج اول ص ۲۰۲، و ابن خلکان ج ۲ ص ۱۱۰ و معجم الادبا ج ۶ ص ۸۰ [3] امالی ج اول ص ۲۰۲ [4] شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۲۲ و تاریخ ابو الفدا ج ۲ ص ۴۷ و اعلام ج ۲ ص ۲۹ ۴

آثارِ علمیہ و ادبیہ

مکاتیب مولانا مناظر احسن گیلانیؒ

بنام

مولانا سید سلیمان ندویؒ

۱۰ر نومبر ۱۹۴۳ء

سیدی الکریم العلامہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

سخت رنج و انتشار کے ساتھ آپ کو یہ خبر دے رہا ہوں کہ ہمارے مولانا عبد الباری صاحب دمہ سے اچھے ہونے کے بعد اچانک بلڈ پریشر کی شکایت میں مبتلا ہوئے۔ میں گلبرگہ شریف خطابت کے سلسلہ میں گیا ہوا تھا۔ واپسی پر معلوم ہوا کہ اسی کے بعد ان کے دل پر چند حملے ہوئے۔ وہی حملے جو بلڈ پریشر والوں پر ہوتے تھے۔ پہلے تو صرف دوران سر ہی کی شکایت محسوس ہوئی، یہی شکایت جو آپ کے سامنے بھی ان کو ہوئی تھی، جس دن گلبرگہ شریف سے میں واپس ہوا، اسی دن مولانا رخصت بیماری لے کر لکھنؤ تشریف لے جا رہے تھے۔ اللہ رحم فرمائے۔

آج آپ کی خدمت میں اپنی کتاب "تدوین فقہ" کا ایک ابتدائی حصہ جو بصورت مقالہ ہمارے یہاں کے رسالہ [illegible] میں چھپا ہے، بھیج رہا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ [illegible] کتابوں کے پڑھنے کی زحمت آپ حضرات بزرگان برداشت کریں گے لیکن [illegible]

دوسرے طرفوں پر ڈال دی جاتی ہے اور اسکے لیے اس نظر سے بھی اسے محروم نہ فرمائیں، آپ کی
رائے اور خیال کا انتظار رہے گا، ماجد میاں کو تو مدت ہوئی پہلے ہی بھیجا تھا لیکن غالباً پسند نہ آیا،
کوئی خاص چیز جواب میں نہ آئی، البتہ مولانا عبدالباری صاحب نے بڑی ہمت افزائی فرمائی، اسی
قسم کی جیسے جناب والا نے "الدین القیم" کے متعلق فرمائی ہے، معارف میں جو نوٹ اس کتاب پر شائع
ہوا ہے، بڑی دیر میں ملا، "معارف" کے سراق آجکل پیدا ہو گئے ہیں، نہ مولانا عبدالباری ہی کو پرچہ ملا،
اور نہ مجھے، صدق میں مجذوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر آپ کے مقالہ کا ذکر چھپا تھا، اسی کے بعد
اس کی تلاش شروع ہوئی، کالج سے بھی کوئی صاحب لے گئے تھے، اب کل انشاء اللہ اسکے
پڑھنے کا موقعہ ملے گا۔

مجھے اس کی آپ سے شکایت رہے گی کہ تعلیم و تربیت والی کتاب کی طرف آپ نے توجہ نہ فرمائی،
مولویوں کی طرف سے وکالت کا حق افسوس ہے کہ اس میں خواہ مخواہ میں نے ادا کیا، مجھے کیا معلوم
تھا کہ اپنے مخالفین کی تو خیر موافقین کی بھی کتابیں یہ نہیں پڑھتے، کتنے قدیم ادہام با طلہ جو عہد جدید
کی پیداوار تھے، ان کا ذکر کیا گیا، لیکن شاید کسی مولوی نے نہیں دیکھا، ایک مولوی صاحب کا
صرف پنجاب سے خط آیا کہ نحو و صرف میں تو نے جن چند مختصر رسالوں کو کافی قرار دیا ہے، یہ کیا
غضب کیا ہے؟ بس اس کے سوا اور کوئی بات کسی نے پوچھی بھی نہیں، ہاں، انگریزی خوانوں
میں سے صرف افضال قادری صاحب مسلم لیگ کے شعبۂ تعلیمی کے سکریٹری ان کا ایک
مفصل خط موافقت میں آیا تھا، بہرحال میری یہ غرض قطعاً نہیں ہے کہ آپ لوگ میری
مداحی فرمائیں، لیکن میرا توقع بجا حق ہے کہ جس طرح آپ لوگوں کی کتابیں میں لفظ بلفظ، حرف
حرف پڑھتا رہا ہوں، آپ بھی کیوں نہیں میری کتابوں کو پڑھیں گے، نہیں نہیں تو کم از کم
فرض تھا مجھ کو اس کا، کہ اتنا میں جانتا ہوں کہ جتنا نفع آپ حضرت کی کتابوں سے

خاکسار کو پہنچا ہے۔ میری کتابوں سے ظاہر ہے بہ نسبت آپ حضرات کو پیدا نہیں ہو سکتی لیکن پڑھنے میں کیا حرج تھا، کیا یہ بھی کوئی گناہ ہے۔

شیخ اکبر کے نظریۂ علم کے مقالہ کا انجام کیا ہوا۔ اسلامی معاشیات کی آخری قسط بھی سیاست میں شائع ہو گئی، لیکن میں اسے اس لیے نہیں بھیج رہا ہوں کہ گذشتہ اقساط ہی کے لیے معارف میں جگہ نہ نکلی تو آئندہ کے لیے کیا نکلے گی۔

اس میں شک نہیں کہ معارف کی بدولت اس مضمون کو لوگوں نے کثرت سے پڑھا۔ مجھے اس پر حیرت ہوئی، اور علم میں اضافہ بھی ہوا، کہ آپ کے پرانے عنایت فرما اپنے حبیب تمنا زبیری مورخ بھوپال اسی مضمون سے متاثر ہو کر مجھ سے ملے، مگر ان کے متعلق میرا جو خیال تھا، وہ برعکس ثابت ہوا۔ میں نے ان کی مشہور شائع کردہ کتاب خطوط شبلی نہیں دیکھی تھی، نام سنا تھا، مجھے وہ دکھائی گئی، خطوط میں تو خیر کچھ نہ تھا، لیکن مولوی عبد الحق صاحب پر تعجب ہوا، افسوس! دل کی تربیت جب تک نہ ہو تو صرف دماغ کو روشن کر کے آدمی نہ خود نفع حاصل کر سکتا ہے نہ پہنچا سکتا ہے۔ زبیری نے ایک پرانا دکھڑا اپنا شروع کیا، آپ پر، شیروانی صاحب پر، اکرام اللہ خاں پر سب پر ان کے دعاوی وائر تھے، ہاں بیچارے شیروانی صاحب پر تو مکاتیب کے شروع میں بھی حملہ کیا گیا ہے۔ مجھے بڑا افسوس ہوا کہ زبردستی مولوی عبد الحق صاحب نے اپنے خیالات کو مولوی شبلی صاحب مرحوم کے الفاظ میں بھر کر ان کے کردار کو داغدار بنانے کی نامبارک کوشش کی ہے، میں اس قصہ سے بالکل ناواقف تھا، زبیری صاحب کے آپ کی حیات شبلی پر بھی بڑے بڑے دعوے ہیں، وہ ملکا رہے تھے کہ میدان میں میں بھی اتر آیا ہوں، بحث کر رہے تھے کہ میرے حوالے سے اس کتاب کے زیر حب واقعات درج کیے گئے ہیں تو اب زندہ وہی مجھ چکی جائے

ہوتا ہے۔ حقائق کا انکشاف کرنے کا جذبہ تھی گفتگو میں تھی، توبہ توبہ، استغفراللہ،
میرا ایک مختصر سا مضمون تجدید مذہبیت کے عنوان سے صدق میں نکلا تھا، آپ نے کاہے کو
پڑھا ہوگا، اس میں مشرقی اور عبدالوحید خاں کے ساتھ ساتھ حماقت یہ ہوئی کہ مودودی صاحب
کی طرف بھی ذرا سخت لہجہ میں، دوسرے بغیر نام کی صراحت سے ہوگیا، مسلسل لعنت و ملامت
کی بارش مجھ پر ہورہی ہے، ان کے معتقدوں میں ہل چل مچی ہوئی ہے، مجھے حاسد قرار دیا جارہا ہے،
خود مودودی صاحب کا بھی گرامی نامہ آیا تھا، جس کا جواب ان کو دیا ہے،

نیازمند

مناظر احسن گیلانی

۱۰ر دسمبر ۱۹۴۲ء

جامعۃ العثمانیہ

حیدرآباد دکن

سیدی وسیدالملۃ ادام اللہ عزکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ سامی کئی دن ہوئے کہ موجب فرحت وانبساط ہوا، گو تھوڑی سی اس کی تکلیف بھی ہوئی
کہ آپ کے قیمتی وقت کو بلاوجہ میں نے گویا ضائع کیا، آپ کی تحریر کا ہر لفظ جو قیمت رکھتا ہے اور اس کے
بعد ان دو طویل اوراق کے خط کو دیکھتا ہوں تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھ جیسے جہول وظلوم،
ذلیل و ذلول کے ساتھ حق تعالیٰ کی نوازش بے سبب کے سوا اور کیا ہے۔

الحمدللہ اس وقت تک حیدرآباد اپنے تمام خصوصیات کے ساتھ اسی حال میں ہے جس حال
میں چھوڑ کر آپ گئے تھے، سامی جناب سے کہنا اس کا مقصد ہے، اور سفر مدراس کے سلسلہ میں حیدرآباد
بھی سرفراز کیا جائے گا، خیر کو خصوصاً دوجن جن یا نئے وطن سے ذکر آیا، بڑی مسرت ہوئی، بلکہ
جناب جیسا مخیر کی وجہ آپ کا بھی تشریف ہوئی، آپ نے دریافت فرمایا تھا کہ ان دونوں میں کون بگر

واقعہ یہ ہے کہ یہی زمانہ ہمارے یہاں تعطیل کا ہے، عام طور پر ان دنوں [illegible] تعطیلوں میں گیلانی حاضر
کی حاضری ضرور دیتا ہے، لیکن اسی سال یہ اتفاقی صورت پیش آگئی ہے کہ سرمائی تعطیل کی مدت کل
۹ دن کی ہے، اسی میں آمد بھی اور اسی میں رفت کی طویل مدت بھی شریک ہے، مسئلہ قابلِ بحث
ہو گیا، میں نے مکارم سلمہٗ کو گیلانی اس حادثہ کی خبر دی تھی، اور لکھ دیا تھا کہ اس سال بھی ٹال جانے کا
ارادہ ہے، لیکن بعض خانگی ضرورتوں کی وجہ سے انتظار تھا، اس کے بعد آخری رائے قائم کروں گا،
مگر میاں مکارم کا آج تک جواب نہیں آیا، مجبوراً طے کر لیا ہے کہ اس سال سرما کا یہ موسم حیدرآباد
ہی میں بسر کروں گا، انشاء اللہ اس صورت میں بہرحال حیدرآباد ہی میں رہوں گا، خواہ جناب والا
کی تشریف آوری آمد میں ہو یا رفت کے وقت، لیکن ایک پھیرا ہونا ضرور چاہیے، اور قیام کے متعلق
کیسے جرأت کروں، آپ کے میزبان جب بنجارہ ہل پر بھی پائے جاتے ہیں تو سیتاپھل منڈی کے فقیر
کے جھونپڑے کو کون پوچھتا ہے، لیکن کلاہ گوشۂ دہقاں تو خود آسمان تک نہیں پہنچ سکتی جو پہنچا سکتا
ہے کاش اسے پہنچانے کا خیال آجائے،

مولانا عبدالباری صاحب کے افاقہ کا حال دوسرے ذرائع سے بھی معلوم ہو رہا ہے، اپنی رخصت
کی توسیع سرمائی تعطیل تک انھوں نے کرا لی ہے، اب نوکری وہ چھوڑیں گے کیا نوکری بیچارے کو خود
چھوڑ رہی ہے، بلکہ یہ مسئلہ موجودہ حالت میں مولوی صاحب کی تشویش کا سبب بنا ہوا ہے، بڑھاپے
میں اہل و عیال والے ہوئے ہیں، جب زیادہ آمدنی کی ضرورت ہوتی ہے، اسی وقت آمدنی کا یکایک
غیر معمولی حد تک کم ہو جانا موجبِ فکر ہی ہو سکتا ہے، کوئی کوشش اس سلسلہ میں انھوں نے ممکنہ
حد تک اٹھا بھی نہ رکھی، لیکن اب تک اوپر کی منظوری نہیں ہوئی ہے، حق تعالیٰ فضل فرمائے،
مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ من حیث المجموعی طور پر مولانا کا دماغ اس واقعہ کے احساس سے [illegible]
بلڈ پریشر کا جدید مرض کی شکل میں ان پر حملہ کرنا بلاوجہ نہیں ہے، دماغ پر کچھ بہت زیادہ [illegible]

اور کیا عرض کروں، الدین القیم پر جناب والا کے ملاحظات مل گئے ہیں، آپ نے صحیح فرمایا "علم کلام" ہم
آپ نے خوب دیکھا، مجھے اس کا افسوس ہے کہ اپنے فطری استعجالی رنگ کے خوف سے پنسل برداشتہ لکھے
اس مسودہ کو اسی اجمال و اختصار کی حالت میں شائع کرنا پڑا، اہل بصیرت تو اندازہ کر لیتے ہیں
لیکن عوام بیچاروں کو اس کا صحیح اندازہ لگانا کہ کن کن مسائل میں نئی راہیں اختیار کی گئی ہیں، ذرا مشکل ہے،
گو بعضوں نے اعتراف کیا ہے کہ تقریباً کتاب کے دو ثلث مسائل ایسے ہیں، جن کے دعاوی تو ٹھیٹ
قرآن و حدیث سے ماخوذ ہیں لیکن استدلال میں کسی کی تقلید نہیں کی گئی ہے، لیکن بات آپ نے
صحیح لکھی کہ متکلمین سے ہٹ کر درحقیقت حضرات صوفیہ کی دلدادگی کا یہ نتیجہ ہے، میرے پیش رو
اس راہ میں شیخ اکبر اور مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ ہیں، کہیں کہیں اپنی اپج بھی ہے، آپ نے
حدیث کنز پر جس کھٹکے کا اظہار فرمایا ہے صحیح ہے، لیکن فقیر نے ملا علی قاری کے اس بیان پر اس مسئلہ
میں بھروسہ کیا ہے کہ "معناہ صحیح" میرے نزدیک بھی واقعہ یہی ہے، موضوعات علی قاری میں ملاحظہ
فرمایا جائے، روایت تو مشکوٰۃ میں بھی موجود ہے، باقی "ولا الضالین" کی تفسیر پر آپ کا یہ اعتراض
کہ نص کے خلاف ہے، اس کا جواب تو اسی مضمون کے ذیل میں دیتا چلا گیا ہوں، غور فرمایا جاتا
تو شاید اس کا اندازہ فرما لیا جاتا کہ بخاری کی اس تفسیر سے غفلت نہیں برتی گئی ہے (ملاحظہ ہو ص۱۲۹)
الدین القیم کے یہ الفاظ کہ یہود مدینہ کو تجربات کے جو مواقع میسر آئے وہ عموماً نصاریٰ کو حاصل نہ تھے،
اس لیے اگر بخاری میں عہد نبوت کے ان دو فرقوں میں سے ایک کو مغضوب علیہم اور دوسرے کو
"الضالین" کے تحت داخل کیا گیا تو ان الفاظ کی یہ ایک اچھی توضیحی مثال ہو سکتی ہے۔

یہ آپ نے خوب لکھا ہے کہ میں مینہ برسا رہا ہوں، سچ عرض کرتا ہوں لکھنے کے لیے فقیر نے
اب تک خود کچھ نہیں لکھا ہے، جو کچھ بھی ہو جاتا ہے، کوئی سر پر سوار ہو کر لکھوا لیتا ہے یا اسی قسم
کی کچھ مجبوریاں پیش آجاتی ہیں، الغرض کام سے [illegible] ادراک سے بڑھتا جاتا ہے کہ اجرت [illegible]

اعتقاد میں حد تک نفس کی لذت اس میں شریک ہو گئی نہیں۔ فقط

نیاز مند مناظر احسن گیلانی

کتاب "تعلیم و تربیت" پر آپ ہی کچھ اختتام فرمائیں گے یا کسی سے لکھوا لیجئے گا، بہرحال مجھے پہلے ہی معلوم ہے کہ

ایسی صنم کا کیا ٹھکانا اپنا مذہب چھوڑ کر   ہم ہوئے کافر تو وہ کافر مسلمان ہو گیا

لیکن آج نہیں تو کل کرنا مسلمانوں کو وہی پڑے گا انشاء اللہ جو آج کہلایا گیا ہو، وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

۲ ذیقعدہ ۱۳۶۲ھ (۱۹۴۳ء)

سیدی و سید المسلمین اطال اللہ بقائکم ومتعنا والمسلمین بطول حیاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ ملفوف گرامی نامہ کئی دن پہلے ہی مل چکا تھا، جواب بھی اس کا لکھ چکا تھا کہ کارڈ بھی ملا، پہلے خط کو منسوخ کرنا پڑا، اس خبر سے گونہ اطمینان ہوا کہ بالفعل کوئی ظاہری تکلیف باقی نہیں رہی ہے، لیکن (۴۸) گھنٹے کھڑے کھڑے گذار دینا میرے لیے تو اسکا تخیل بھی تکلیف کی شکل اختیار کیے ہوئے ہے، جس کسی نے سنا اسے قدرۃً تکلیف پہنچی، کیا عرض کروں، ہم جیسے گنہگاروں اور سیاہ کاروں کے لیے تو یہ امراض و مصائب سب کفارے کی حیثیت رکھتے ہیں، سمجھتا ہوں کہ جن سزاؤں کو جہنم میں بھگتنے والا تھا، شاید ارحم الراحمین کی رحمت شاملہ نے ان ہی کو دنیاوی مصائب و آلام کی شکل میں بدل دیا ہے، لیکن آپ جیسے حضرات کے متعلق کیا سوچوں، بجز اس کے کمال وفاداری کے اظہار کی شکل یہی ہو سکتی تھی، الحمد للہ کہ قلب جب اسی مقام پر ہے جہاں پر اسے رہنا چاہیے تو ڈاکٹروں کے اس کہنے سے کیا ہوتا ہے کہ وہ گھٹ گیا ہے یا بڑھ گیا، حضرت سلطان جی نے ایک لطیفہ نقل کیا ہے کہ کسی وزیر پر بادشاہ کا عتاب ہوا، سب کچھ ضبط کر لیا گیا جو اس کے پاس تھا، کسی نے پوچھا کہ کیسی گذر رہی ہے

فرمائی، واقعہ یہ ہے کہ اب جب میں سوچتا ہوں تو بات اتنی غلط میں نے نہیں کہی تھی۔

آپ کے دوسرے والا نامہ میں یاس کے آثار بہت محسوس ہوئے، لیکن اسی کے ساتھ یہ عجیب بات آپ نے ارقام فرمائی کہ اب تم لوگ اسے سنبھالو، گویا جن لوگوں سے آپ کا خطاب ہے، کچھ زیادہ وقفہ انکی روانگی میں ہے، بچاس سے متجاوز ہو جانے کے بعد زندگی کا انسانی استحقاق میرے نزدیک ختم ہو جاتا ہے، انسانیت کے کامل ترین نمونے نے یہی نمونہ ہمارے لیے چھوڑا ہے، باقی اس کے بعد کیا ہوگا جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی دنیا چلتی ہی رہی، اور دنیا کیا دین کا کام بھی چلتا ہی رہا، تو اب اس کے بعد کوئی ہو، ہم ہوں یا آپ، کسی پر بھی ظاہر ہے کہ دین و دنیا کا کوئی کام موقوف نہیں رہ سکتا۔ خداوند تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ایک بڑے مومن کا دامن آپ کو آخر وقت میں مل گیا، اور مجھے تو سب سے زیادہ مسرت اس کی ہے کہ آپ کا رابطہ بالشیخ محمد اللہ غیر معمولی طور پر محکم و استوار ہے۔ حق تعالیٰ کے آپ محبوب ہیں، آپ ان لوگوں میں ہیں جن کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ یحبھم ویحبونہ، اللہ میاں ہی نے آپ کو پہلے چاہا ہے، اسی لیے تو زندگی کے ہر ہر قدم پر آپکے سامنے آپ کے چاہنے والے نے اسی چیز کو پیش کیا جسے زندگی کے اس مرحلہ پر پیش ہونا چاہیے تھا۔

معاف فرمائیے گا، خدا جانے کیا کیا لکھ گیا، آپ کے آخری خط کے پڑھنے سے دل بہت متاثر ہوا، اسی تاثر نے بے ساختہ قلم کو رواں کر دیا، اور کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں ہے، مولوی حبیب احمد صاحب بھی بیمار ہیں، مجھے تو توقع نہیں کہ دکن آسکیں گے، کاش! نہ آئیں، تو ان کے لیے اچھا ہے، زندگی کے آخری دنوں میں عزت و آبرو کے ساتھ چلا جانا ہی زیادہ مناسب ہے۔ فقط

مناظر احسن گیلانی

ہاں! ایک چیز جسے لکھنے والا تھا، وہی بھول گیا، گیلانی کا ایک ہم سرحد گاؤں اسلامی پرگنوا ہے، شیوخ کی بستی ہے، اسی بستی کے ایک ممتاز کھاتے پیتے خاندان کے ایک نوجوان مولوی

عبدالحنان ایم اے جو آج کل کھڑک پور میں ہیڈ ماسٹر ہیں، انھوں نے لکھا ہے کہ شبلی کالج اعظم گڈھ میں تاریخ کے استاد کی ضرورت ظاہر کی گئی ہے، درخواست انھوں نے بھی دی ہے، آدمی محنتی اور جفاکش اور زیادہ ٹیپ ٹاپ کے نہیں ہیں، اگر آپ کی رائے کو بھی تقرر میں کچھ دخل ہو تو دوسرے امیدواروں کے ساتھ ان کا بھی خیال رکھیے گا، مولانا مسعود علی صاحب کو دل لکھنے پر آمادہ نہ ہوا۔

۲۴ اپریل ۱۹۴۵ء

گیلانی (بہار) ڈاک خانہ برگھا

سیدی ذمتم بالہناء والعافیۃ — السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ عریضہ گیلانی سے لکھ رہا ہوں، اعظم گڈھ کے متعلق تو قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا لیکن لکھنؤ ہوتے ہوئے بہار آنے کا ارادہ جزماً طے شدہ تھا، ٹکٹ بھی مولانا عبدالباری کے ساتھ لکھنؤ کا پندرہ دن پیش تر لے چکا تھا، برتھ بھی ریزرو کرا چکا تھا، خیال اس کا ضرور تھا کہ اگر لکھنؤ میں آپ حضرات سے نیاز حاصل ہونے کا موقعہ مل گیا تب تو خیر، ورنہ ملکاس ارادہ یہ بھی تھا کہ اگر گاڑی میں زیادہ زحمت نہ پیش آئی تو ایک دن دارالمصنفین کا بھی حاصل کروں لیکن اعظم گڈھ تو اعظم گڈھ، لکھنؤ جانا بھی میسر نہ ہوا، ٹکٹ بدلوانا پڑا، اور مولوی عبدالباری صاحب کے چند دن بعد حیدرآباد سے روانہ ہوا، ایک ہفتہ کے قریب پٹنے میں قیام رہا، اور آ کسی نہ کسی طرح ہانپتے کانپتے گیلانی پہنچ گیا ہوں، مسترد ہوکر دکن کی جو ڈاک گیلانی پہنچی ہے، اسی میں دارالمصنفین کا بجٹ بھی تھا، دستخط کرکے اسے واپس کر رہا ہوں،

ادھر حیدرآباد میں مختلف ذرائع سے معلوم ہوتا رہا ہے کہ نواب بھوپال آپ کو اپنے محروسہ کا قاضی القضاۃ اور کسی نئی قائم ہونے والی جامعہ کا امیر بنا کر وہیں قیام کرنے پر مصر ہیں، خیال تھا کہ اس مسئلہ پر بھی لکھنؤ ہی میں شفاہاً گفتگو کا موقعہ ملے گا، میرے نزدیک تو اس میں بظاہر کسی قسم کا حرج نہیں معلوم ہوتا، بھوپال میں رہ کر بھی جہاں تک میں خیال کرتا ہوں، آپ ان خدمات کو انجام دے سکتے ہیں، جنھیں اس وقت اعظم گڈھ

میں انجام دے رہے ہیں، اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی جتنی نگرانی اعظم گڈھ سے اس وقت تک کر رہے ہیں بھوپال سے بھی کر سکتے ہیں، بلکہ اسی کے ساتھ اپنے خاص مقاصد و اغراض کے مطابق آپ تعلیمی مہمات کے حل پر بھی ایک حد تک قادر ہو سکتے ہیں، حیدر آباد میں تو دھوکہ دیا گیا، دارالعلوم کو توڑ کر جامعہ بنانے کا خیال مولانا حمید الدینؒ نے جن عزائم کو پیش نظر رکھ کر فرمایا تھا؛ وہ پورے نہ ہوئے، افسوس کہ دارالعلوم تو ٹوٹ گیا لیکن اسی کے ساتھ مولانا کے عزائم کو بھی بری طرح کی شکست نصیب ہوئی، شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ کے سینے کا بوجھ بنا ہوا ہے، خدا کرے بھوپال میں آپ کو موقعہ اس شکست کی تلافی کا مل جائے، مجھے اس کا افسوس ہے کہ طول کلامی کی وجہ سے میرا مقصد لوگوں پر ظاہر نہ ہو سکا، حالانکہ اس کے سوا اور میں کیا چاہتا ہوں کہ اسلام کے اساسی علوم (قرآن و حدیث و فقہ) کی تعلیم کو لازم قرار دے کر قدیم علوم کی جگہ جدید علوم و فنون کو قبول کر لیا جائے، اور اسلامی علوم کے کسی خاص فن میں کمال پیدا کرنے کے لیے تخصیصی درجے قائم کر دیے جائیں، میرا خیال ہے کہ اس طریقہ سے نصاب کی دوئی کو ختم کر کے مسلمانوں کے لیے ایک ہی تعلیمی نصاب کے قائم کرنے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے، میری یہ بدقسمتی ہے کہ آپ جیسے بزرگوں نے بھی میرے منشا کے سمجھنے یا کم از کم سمجھانے میں تغافل سے کام لیا،

بہر حال بھوپال میں اگر کوئی میدان عمل کا مل سکتا ہے تو اس کو چھوڑنا ممکن ہے کہ مسئولیت کی وجہ بن جائے، حیدر آباد کی سرزمین اس قسم کے اصلاحی کاروبار کے لیے کم از کم جہاں تک میرا تجربہ ہے شور ہے، لیکن علی یاور جنگ اگر آپ کے مشوروں سے مستفید ہونا چاہیں، تو اس سے بھی گریز مناسب نہ ہوگا، ہو سکتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے ساتھ ساتھ کسی جامعہ عربیہ کے قیام کا امکان پیدا ہو جائے۔

پٹنے میں ایک ہفتہ کا قیام صرف سوز اور اندرونی خلش میں گذرا، عجب بے حسی اور مردنی وہاں کی اسلامی آبادی پر چھائی ہوئی ہے، آپ کی تجویز "جامع عظیم آباد" کا خیال سلسل دماغ پر

مسلط رہا، کاش ! کسی مسجد جامع کے قائم کرنے میں وہاں کامیابی ہوجائے، آپ اگر ہمت سے کام لیں تو بات زیادہ دشوار نہیں ہے۔ ان کے پاس جو ایک چھوٹی سی مسجد مسلمانوں کی ہے مغرب کی نماز کئی دفعہ اسی مسجد میں پڑھنے کا موقع ملا، اسی کے سامنے عیسائیوں کا ایک کلیسا بھی سڑک کے دوسری جانب قائم ہے۔ اس کی بلندی، اس کی صفائی، اس کا شاداب وسرسبز باغ اور زمین کی وسعت اور اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کا یہ جھونپڑا، دیر تک باعث تحسر بنا رہا، خیال آ آتا تھا کتنے دن کی بات ہے اسی سرزمین کے ہم بادشاہ تھے۔ "یتبوأ منھا حیث یشاء" کا مقام اس علاقہ میں حاصل تھا، اور آج جنھوں نے زمین کے ایک بڑے قطعہ پر قبضہ کرکے "صلیب خانہ" بنایا ہے، ان کی حیثیت وہی تھی جو آج ہماری یہاں ہے، خالق کے پوجنے والوں کی خالق کی زمین پر یہ بے بسی، اور مخلوق پرستوں کا یہ زور، بظاہر ایک غیر منطقی سی بات نظر آتی تھی، لیکن دل نے کہا کہ خالق پرستی کے مدعی کاش خالق پرست ہوتے تو یہ صورت ہی کیوں پیش آتی۔

آپ کیا اب کی گرمیوں میں دلینہ تشریف لائیں گے، آم کی فصل گیلانی میں تو اچھی ہے۔ میرے باغ میں دسہری کے ایک دو سالہ درخت تھے، پھلوں سے اس کو لدا ہوا پایا، اسی پر قیاس کرکے کہتا ہوں کہ آپ کا باغ جو زیادہ تر دسہری کے درختوں سے عبارت ہے وہ تو "قطوفہا دانیۃ" کا سماں پیش کر رہا ہوگا، اور کیا عرض کروں، بظاہر بدامنی میں کچھ خفت نظر آتی ہے، اگرچہ حال میں بھی ڈکیتی کا ایک واقعہ موضع دیوکلی کے ایک محلے میں پیش آیا ہے، ایک کوئری کسان کے مکان پر ڈاکوؤں نے حملہ کیا اور نقد و زیور لوٹ کر لے گئے، بعض لوگ زخمی بھی ہوئے۔ فقط

نیازمند

مناظر احسن گیلانی

باب التقریظ والانتقاد

جہادِ اعظم کی تیاری

از جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب

مصنفہ حضرت صوفی نذیر احمد صاحب کاشمیری صفحات ۱ + ۹۵ = ۹۶، ناشرین: نذیر احمد، اسلامی کتاب گھر، اردو بازار، دہلی ۶ - (۲) منیجر مکتبہ مسلم، مائسمہ بازار، بگاوکدل، سری نگر کشمیر۔ قیمت ۲/۱ر

یہ عجالۂ نافعہ ملک کے مشہور صوفی مفکر، مصلح حضرت نذیر احمد صاحب کاشمیری مدظلہ العالی کے افکارِ عالیہ کا خلاصہ ہے، جو چار عنوانات کے تحت اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے: (۱) تقویۃ الایمان (۲) تعلیم الاسلام (۳) تذکیر الاحسان (۴) تبیان العمران، رسالہ کے موضوع کو تائٹل پیج ہی پر مصنف علام نے ان الفاظ میں واضح کیا ہے:-

"موجودہ دور نے دو کھلے کھلے امکان نوعِ انسانی کے لیے پیدا کر دیے ہیں: (۱) پوری نوعِ انسانی اپنی ساری نوعی خصوصیات اور امتیازات کو کھوئی ہوئی اور دین بہائم اور دین نباتات کا مظاہرہ کرتی ہوئی دنیا سے نابید ہو جائے یا (۲) ساری بے دینیوں سے تائب ہوتی ہوئی انسانی دینِ واحد کی صراطِ مستقیم پر آجائے۔ میری کوشش پورے شعور و قوت اور پورے احساسِ ذمہ داری سے دوسرے امکان کو عملی حقیقت میں بدلنے کے سلسلے میں رہا ہے، اور موجودہ رسالہ بھی اسی کی ایک کڑی ہے، امتِ مسلمہ اس جہادِ اعظم

کے لیے کیونکر تیار ہو، اس رسالہ کا یہی موضوع ہے۔" اس جہاد اعظم کے لیے مسلمانوں کو تیار کرنے کے لیے حضرت مصنف اپنی زندگی کے ۲۹ سال نذر کر چکے ہیں، اور یہی داعیہ مسلمانوں کے قلوب میں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

زیست ہے امتحاں ترا تو ہے امینِ زندگی
ساری متاعِ جسم و جاں کر ہدیۂ نیاز کر (مصنف)

رسالہ کا لفظ لفظ اخلاص میں ڈوبا ہوا ہے۔ اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ کا محرک شروع سطر سے آخر تک کار فرما نظر آتا ہے۔ حق تعالیٰ مصنف کو اس کا اجر غیر ممنون عطا فرمائے۔

پہلے عنوان "تقویۃ الایمان" میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ اسلام کا تعلق ظاہری اعضاء کے اعمال سے ہے، ور ایمان کا تعلق قلب سے، اگر قلب ظاہری اعمال سے ہم آہنگ نہیں تو یہ ظاہری اعمال محض ظاہرداری اور عاشرے کی ہمنوائی کے سوا کچھ اور نہیں قرار دیے جا سکتے۔ اس سے اصلاح قلب کی دینی اہمیت کا خود اندازہ ہو سکتا ہے، اور خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "جسم انسانی میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، اس کی اصلاح ہو جائے تو سارے جسم کی اصلاح ہو جاتی ہے، اور اگر وہ فاسد ہو جائے تو سارا بدن اسد ہو جاتا ہے، اور وہ گوشت کا ٹکڑا قلب ہے، "الا وھی القلب" گویا دینی اصلاح و فساد کا سارا مدار قلب کی اصلاح و فساد پر ہے۔

ظاہر ہے کہ مصلح بننے سے پہلے آدمی کو صالح ہونا ضروری ہے، اور صالح ہونا قلب کی اصلاح پر منحصر ہے، مصنف نے اختصاراً لیکن جامعیت کے ساتھ قلب کی بڑی بڑی بیماریوں کا ذکر کیا ہے، جو غفلت نی اور دین ہیں، اور ان کے دفع کرنے کے مسلم طریقے پیش کیے ہیں، جو نہایت مفید ہیں، مسلمانوں کو ان عمل کی توفیق رفیق حق تعالیٰ عطا فرمائے۔ اس کے بعد نفس کا تزکیہ ضروری ہے، نفس امارہ بالسوء ہے اسی کے تزکیہ پر قرآن حکیم کی رو سے "فلاح" کا دارومدار ہے: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا۔

"نفس عام حیوانات کی طرح بطن و فرج کے تقاضوں کو بلا روک ٹوک پورا کرنے پر آمادہ رہتا ہے۔ لیکن قلب اس پر حلال و حرام کی پابندیاں عائد کرتا رہتا ہے، لہذا نفس کے حیوانی رجحانات اور قلب کی اخلاقی پابندیوں میں یکرنگی و کیسانی پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک طرف ہم قلب کو ذکر و عبادت قوی کرتے ہیں اور دوسری طرف نفس پر جواز و عدم جواز کی پابندی اور مجاہدات کی قید عائد کرتے جائیں، اور اس کو کمزور کرتے جائیں، تاکہ وہ رضائے الٰہی کا پابند ہو جائے اور ہم صبح و شام کی اندرونی کشمکش سے نجات پاکر سکون و طمانیت کی زندگی بسر کر سکیں، یہی ہے قد افلح من زکّٰھا " کی حقیقت" (ص ۹۰)

تزکیۂ نفس کی اہمیت کے بتلانے کے بعد "نفس کی مرکزی بیماریوں" کی نشاندہی کی گئی ہے، جو (۱) اتباع ہویٰ و (۲) اتباع تمنا ہیں، اس سلسلہ میں صوفیائے کرام نے جس تفصیل سے کام لیا ہے اور نفس کی ایک ایک خامی کی نشاندہی کی ہے، اور اس کا علاج تجویز فرمایا ہے، ہمارے مصنف علام نے اس کا اعادہ ضروری نہیں تصور فرمایا اور صرف مرکزی امراض کی وضاحت پر اکتفا فرمایا، زیادہ تفصیل و تحقیق کے لیے امام غزالی کی کیمیائے سعادت یا احیاء العلوم کا مطالعہ ضروری ہے، بلکہ ناگزیر ہے، اس فن کے امام تو غزالی ہی ہیں!

اس عنوان کے اختتام پر حضرت مصنف نے فرمایا ہے اور بجا فرمایا ہے: "آج انسانی ماحول میں جو ایمان سوز بے چینی عالمگیر انداز اختیار کرتی جا رہی ہے اس کا علاج نہ علم الکلام ہے نہ منطق نہ آبیاری یقین کی بجائے جدلیت سے ممکن ہے، بلکہ اس کا واحد علاج اس سارے سلسلہ کے امکانات کو بند کرتے ہوئے یقین کی ساری بند سوتیں کھول دینی ہیں اور بس۔ یقین انسانی کی یہ سوتیں صرف قلب صالح و مطمئن و قوی ہے اور دوسرے درجہ پر نفس مزکی آتا ہے، پہلے سے اعتصام باللہ پیدا ہوگا اور دوسرے سے اعتصام بحبل اللہ اور استقامت علی الدین پیدا ہونگے، اور صرف ان ہی سے موجودہ دور کے الحاد کا مقابلہ ممکن ہے۔" (ص ۱۴۳)

بات بڑی سچی ہے لیکن حضرت مصنف علام کی توجہ صحبت اور دعا کیں غایت کے حصول کے لیے بڑی ضروری نظر آتی ہیں، ورنہ محض جان لینے اور مان لینے سے نہ قلب ہی کا تصفیہ آسان ہے اور نہ نفس کا تزکیہ؛ ہاں حق تعالیٰ اگر کسی بندہ کے حال پر خود توجہ فرمائیں تو سب کچھ اس کے لیے آسان ہے۔ "ثم تاب اللہ علیھم لیتوبوا" کی رو سے تو حق تعالیٰ ہی کا متوجہ ہونا انسان کے متوجہ ہونے سے پہلے ضروری نظر آتا ہے، لیکن کوشش و کاوش بھی کشش الٰہی کے لیے ضروری ہے، اس سے غفلت نہیں جائز رکھی جا سکتی، اور اس کے لیے مصنف علام کے بتائے ہوئے طریقے چراغ راہ بن سکتے ہیں،

کتاب کا دوسرا حصہ "تعلیم الاسلام" یعنی تجدید دین و ملت ہے، اور نہایت اہم ہے۔ اس میں موجودہ لادینیت کی فضا کے اسباب و علل کی تحلیل کی گئی ہے، ہمارے اصلی کا روگ تو یہ بتلایا گیا ہے کہ خاص و معین فرائض و واجبات دینی کی جگہ رسوم شرکیہ و بدعات سیئہ نے لے رکھی ہیں، جن کا دین و مذہب سے دور کا بھی تعلق نہیں، بلکہ تصور دین ان سے منہدم ہوتا ہے، ان کا ترک کرنا نہایت ضروری ہے، رہی جدید بیماریاں تو وہ انکار خدا سے شروع ہو کر تمام انسانی تعلیم و تربیت کو کھلے فحشا و منکر پر تعمیر کرنے کی حد تک پھیل گئی ہیں اور پھیلائی جا رہی ہیں، ہر دینی ادارہ (مسجد ہو یا خانقاہ) کے مقابل کلچر یا ثقافت کے نام سے ایسے ایسے ادارے قائم کیے جا رہے ہیں جو سارا بچا کھچا وقت لے لیتے ہیں، اور انسان کے لیے اپنی اخلاقی و روحانی زندگی کے سدھار کے واسطے ایک منٹ بھی باقی نہیں چھوڑتے، اس ہمہ گیر لادینیت کی ترویج میں حکومت کو بڑا دخل ہے، قلب کی موت کا یہ سامان خود حکومت فراہم کر رہی ہے، اور انسان محض جسم اور اس کی آسائشوں کا نام رہ گیا ہے، "لذتیت" ہی اخلاقی نظام رہ گیا ہے، ایپکیورس اور ارسٹیوس کے فلسفہ کا زمانہ جدید میں شدت سے احیاء ہوا ہے، معیار حق و باطل صرف یہ رہ گیا ہے کہ جو چیز لذت بخش ہو وہ خیر ہے اور جو الم پیدا کرتی ہے وہ شر ہے، تمام اخلاقی و روحانی اقدار بے معنی ہیں اور دور جاہلیت کی یادگار، مصنف علام کے خیال میں اس عالمگیر طوفان لادینیت کا علاج صرف یہ ہے کہ ملت کے سارے افراد

کی بصیرت ایک معین لائحۂ عمل اختیار کرکے اس طوفان کا مقابلہ کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام کسی ایک فرد کی قوت سے باہر ہے، تاہم وہ دینی اصلاح اور جمہور ملت کی بیداری کے لیے چند ایسے نکات پیش فرماتے ہیں جو صحیح سمت کی طرف رہنمائی کے لیے قدم اول کا کام دے سکیں۔ ان کی رائے میں اصلاح کا اصل نسخہ یہ ہے کہ ہر گھر، محلے اور گاؤں یا قصبہ یا شہر میں دینی احساس رکھنے والا شخص قرآن مجید کا ایک جچا تلا ترجمہ اپنے سامنے رکھ لے اور اپنے وقت کے چوبیس گھنٹوں میں سے کم از کم آدھ گھنٹہ ایسا نکال لے جس میں وہ اپنے اپنے دائرۂ اثر میں یہ ترجمہ بلا کم و کاست سنا دیا کرے، خطابت، بلاغت اور فصاحت سے کام نہ رکھے، بلکہ صاف و واضح طور پر قرآن کا پیام پہنچا دے اور یہ سمجھا دے کہ اس کتاب مبین میں ہمارے لیے کیا کیا ہدایات ہیں، زندگی بسر کرنے کے کیا طور طریقے بتلائے گئے ہیں، سننے والے جان لیں کہ

(۱) ہمیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے،

(۲) مومن میں کن اخلاق کا ہونا ضروری ہے، اور کن اخلاق یا صفات کا نہ ہونا ضروری ہے،

اتنا کام اگر ہو جائے تو ان شاء اللہ پوری ملت کے لیے بہت جلد سعادت کی راہیں کھلنی شروع ہو جائیں گی، اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی مبلغانہ انداز سے لکھی ہوئی سیرت مثلاً رحمۃ للعالمین مولفہ قاضی محمد سلیمان صاحب اور اس کے ساتھ ہی اخلاق نبوی پر پوری روشنی ڈالنے والی کوئی کتاب مثلاً امام بخاریؒ کی ادب المفرد (اردو ترجمہ "کتاب زندگی") کو بھی اسی تربیتی کورس میں شامل کر لیا جائے، ہفتہ بھر میں پانچ دن تو قرآن مجید کا ترجمہ ہوا اور دو دن سیرت و اخلاق نبوی کا درس ہو، یہ بہت ضروری ہے کہ اس سلسلہ کا آغاز اور خاتمہ دعا و الحاح کے ساتھ ہو، اصلاح، دل سوزی اور خیر اندیشی اس ساری سعی کی روح ہو، ایمان باللہ، اخلاق صالحہ اور مسلمہ فرائض و واجبات پر تاکید و اصرار ہو، فقہی نوعیت کے مسائل پر بحثیں کم سے کم ہوں، فقہی مسائل کی تحقیق علماء سے کی جا سکتی ہے، اگر ہم مسلمہ فرائض و واجبات اور صداول کے مسلمہ اخلاق و

ایمان اگر اس کو محدود کرلیں تو سارے اختلافات ختم ہوسکتے ہیں، اور انھیں ختم ہوناہی چاہیئے،

یہ اصلاحی پروگرام پیش کرتے ہوئے ہر قدم پر اول اپنے نفس کا محاسبہ ضروری ہے، دوسرے درجہ پر اپنے مخاطبین کا محاسبہ اور تیسرے درجہ پر سارے ماحول کا اندازہ اور جائزہ لیتے رہنا کہ ان تینوں مواقع پر کس درجہ اصلاح ہوئی ہے، اس چیز کو ایک مرکزی اصول کی حیثیت سے سامنے رکھا جائے،

صوفی صاحب کا یہ پروگرام ہر ہوشمند، دردمند، صاحب فکر کے لیے قابل عمل ہے، اور اس پر عمل کیا جانا ضروری ہے، یہ عوام کی اصلاح کا نہایت مفید و کارگر نسخہ ہے، اس کی افادیت کا اندازہ چند روز اس پر عمل کرنے سے خود محسوس ہونے لگے گا حق تعالیٰ مقلب القلوب ہیں، دعا ہے کہ مسلمانوں کے قلوب کو دین کی طرف پھیردیں، وما ذالك علی اللہ بعزیز۔

پیش نظر کتاب کے آخری حصہ میں مصنف علام نے اسلام کے عمرانی نظام کا ذکر فرمایا ہے، اور "تبیان العمران" اس کا عنوان مقرر کیا ہے، اس میں خدا، رسول اور امت اسلامیہ کا تعارف کرایا گیا ہے، یہ حصہ بھی نہایت مفید ہے اور بیش بہا معلومات کا خزانہ ہے، اگرچہ حق تعالیٰ کی بہت سی صفات ہیں، اور ہر صفت میں ان کو واحد و لاشریک ماننا نہایت ضروری ہے لیکن جس صفت کو ہر قرآنی سورت میں اور ہر عمل صالح کی تمہید کی حیثیت سے صبح سے لیکر شام تک ہمیں بار بار دہرانا پڑتا ہے، وہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے رحمتی وسعت کل شئ، ربنا وسعت کل شی رحمۃً وعلماً۔ جب اس صفت کا ہمارے قلب ونفس پر احاطہ ہوجاتا ہے تو پھر نفرت وحقارت و انتقام جیسے سارے حیوانی جذبات صرف خیراندیشی محض دل سوزی وہمدردی میں مبدل ہوجاتے ہیں، معاشرۂ انسانی کے تعاون و یگانگت کی بنیاد اگر خیراندیشی و دل سوزی نہیں تو وہ ہرگز پائیدار نہیں ہوتی،

رسول کے تعارف کے لیے "وما ارسلناك الا رحمۃ للعالمین" اور "فبما رحمۃ من اللہ لنت لھم ولو کنت فظا غلیظ القلب لانفضوا من حولك" کی دو آیتیں پیش کی گئی ہیں نیز

بالمومنین رؤف رحیم سے بھی استدلال کیا گیا اور بتلایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت سارے عالم کے لیے صرف رحمۃ للعالمین ہے۔ دوسری اور تیسری آیتوں میں مومنین کے ساتھ آپ کا تعلق رحمت ہی کا ظاہر کیا گیا ہے۔ طائف کے سفر میں جو اذیتیں رسول عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچائی گئیں ان کے بعد بھی آپ نے اپنی قوم پر لعنت نہیں کی بلکہ فرمایا کہ مجھے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اور اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون ہی کی دعا زبان مبارک پر جاری ہوئی۔

امت اسلامیہ کا تعارف "اشداء علی الکفار رحماء بینھم"، انما المومنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم واتقوا اللہ لعلکم ترحمون سے کیا گیا ہے۔ مومن کو مومن سے وابستہ کرنے اور ان کو آپس میں بھائی بھائی بنانے والا رشتہ رحمت خاصہ حق ہے۔

مختصر یہ کہ حق تعالیٰ کا بنیادی تعارف رحمٰن، رحیم، ارحم الراحمین اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعارف رحمۃ للعالمین ہے، اور امت مسلمہ کے تمام تعلقات باہمی کے مربوط کرنے کے لیے جس تعارف کو پیش نظر رکھنا ہے وہ کامل ترین رحمت سے قوام پانے والا جذبہ رحمت ہے جس کو اخوت مومنانہ کہا جاتا ہے۔

اس علم و یقین کے بعد مسلمانوں کا فرض ہے کہ مذکورہ صدر چوکھٹے میں اپنی تمام انفرادی و اجتماعی زندگی کو اس طرح سمیٹ لیں کہ ان کی زندگی کا کوئی حصہ اس چوکھٹے سے باہر نہ رہ جائے، اور اگر اس جذبۂ رحمت سے "ذات البین" کا کوئی سوال طے نہ ہو تو اس کو خدا کے سپرد کرتے ہوئے جھگڑے فساد سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے، جامع و مانع دینی امارت کی عدم موجودگی میں ہمارا طریق اصلاح صرف رحماء بینھم ہی تک محدود ہے، تعزیرات کا اجراء صرف امارت کا وظیفہ ہے"۔

"رحمت خداوندی و عدل خداوندی" "دعوت الی اللہ اور امر بالمعروف" وغیرہ عنوانات کے تحت نہایت مفید اور کارآمد مواد پیش کیا گیا ہے، جو ہر تعلیم یافتہ فرد کے غور و فکر کا محتاج ہے۔ صوفی صاحب نے امت کی اصلاح کا جو پروگرام پیش کیا ہے اس سے کسی ذی عقل کو انکار کی

مجال نہیں مگر اتنا کہنے کی جرأت کی جا سکتی ہے کہ صوفی صاحب اب کسی مقام پر اطمینان کا قیام فرمائیں اور اس کام کا آغاز اپنی رہبری و رہنمائی میں شروع فرمادیں، اپنی صحبت و توجہ سے چند افراد کو اس کام کے بنانے اور آگے بڑھانے کے قابل بنادیں تاکہ اس ملت خفتہ کی ساری صلاحیتیں بالقوہ سے بالفعل ہو جائیں اور خارج میں بھی انقلاب پیدا ہو جائے، ایک عرصہ سے صوفی صاحب کے بعض دردمند و ہوشمند احباب انکی خدمت میں یہ مشورہ پیش کرتے رہے ہیں ہمیں امید ہے کہ اب وہ اس کام کی طرف متوجہ ہوں گے۔ ع ہر کہ یکجا ہمہ جا و ہر کہ ہمہ جا ہیچ جا!

پیش نظر مجالہ نامہ کا تیسرا حصہ "تذکیر الاحسان یعنی تحسین اعمال و تطہیر محرکات" کے عنوان سے ۲۳ صفحات پر مشتمل ہے، جو قیمتی مواد اس حصہ میں پیش کیا گیا ہے اس کا تعلق "تصوف" سے ہے اور اس پر مصنف علام نے اپنی دوسری تحریروں میں بھی اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے، انھوں نے شروع ہی سے یہ سعی فرمائی ہے کہ دین کو ایک طرف باطل "باطنیت" اور دوسری طرف باطل "ظاہریت" سے صاف کیا جائے، "محبت" کی ماہیت اور اس سے افراط و تفریط کو چھانٹ کر ایک طرف کر دینا، اسی طرح حقیقت خشیت اور رضا کا حکیمانہ تجزیہ کرنا اور معاشرہ کو ان کی جانب متوجہ کرنا ہمیشہ سے ان کے پیش نظر رہا ہے، ان ہی اہم نکات کو نہایت عمدگی اور وضاحت سے اس حصہ میں پیش کیا گیا ہے، جزاہ اللہ خیر الجزاء۔

محبت کے سلسلہ میں صوفی صاحب تحریر فرماتے ہیں، "چونکہ صوفیہ نے زیادہ تر محبت ہی کو تمام اعمال کا محرک مانا ہے لہذا اس کے باعث کتاب دین کے سارے ابواب اپنی قدرتی ترتیب سے محروم معلوم ہونے لگتے ہیں جس کے باعث باطن دین کی تکمیل کا نصب العین ہی سرے سے مستور ہو کر محض باطنیت بنایا جاتا ہے، یا صرف باطنیت رہ جاتا ہے، جہاں محب محبوب کی ثنویت کو ختم کرتے ہوئے دونوں کا ایک ہونا یا ایک کرنا ہی کمال سمجھا جاتا ہے اور اس طرح دین و آئین

کی ساری حدود کو جلا کر خاکستر کرتے ہوئے "من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی" کا معاملہ کر دیتا ہے .... اور محبت کی اس امتیاز سوزو گری یا درجہ کا نام عشق " رکھا گیا ہے، اور اس حضرت عشق کی خاصیت "ہر چہ جز معشوق باشد جملہ سوخت" ہے، اس کا کام محب و محبوب کی ثنویت کو ختم کرتے ہوئے دونوں کی اتحاد ذاتی کا فتوی دینا ہے۔" (ص ۳۵)

صوفی صاحب کو اس امر سے اختلاف کی گنجایش نہیں کہ بقول حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی: " اتفاق اصحاب طریقت و ارباب حقیقت است کہ اہم مطلوب و اعظم مقصود از خلقت بشر محبت رب العالمین است۔" (سیر الاولیا ص ۵۵۵) چنانچہ حضرت محبوب الٰہی اپنے مریدوں کو تلقین فرمایا کرتے تھے کہ " ہمہ وقت از خدا اے عزوجل محبت حضرت حق می باید خواست وایں دعا بسیار باید خواند: اللھم انی اسئلک حبک وحب من یحبک والعمل الذی یودی الی حبک ــ اللھم اجعل حبک احب الی من نفسی واھلی ومالی وماء البارد الی العطشان۔" (ص ۴۶۵)

حجۃ الاسلام امام غزالی کی تحقیق میں مقامات سلوک میں بلند ترین مقام محبت ہی کا مقام ہے، اس کے سوا جو مقامات ہیں وہ یا تو مقام محبت کے مقدمات ہیں یا اس کے توابع و نتائج:

فان المحبۃ للہ ھی الغایۃ القصوٰی	یعنی اللہ کی محبت تمام مقامات کی غایت
من المقامات والذروۃ العلیا	قصوی اور تمام درجات کی سب سے بلند چوٹی
من الدرجات، فما بعد ادراک	ہے، اور اک محبت الٰہی کے بعد کوئی مقام
المحبۃ مقام الا وھو ثمرۃ من	ہی نہیں الا اس کے کہ اسی مقام محبت کے
ثمارھا وتابع من توابعھا،	ثمرات کا ایک ثمرہ اور اس کے توابعات
کالشوق والانس والرضاء واخواتھا	میں سے ایک تابع یا نتیجہ ہو، جیسے شوق
ولا قبل المحبۃ مقام الا وھو	انس، رضا اور اس جیسے دوسرے مقامات،

مقدمة من مقدماتها كالتوبة والصبر والزهد وغيرها (احیاء العلوم ص ۲۹۴ من الجزء الرابع)

اور نہ محبت سے قبل کوئی مقام ہے، الا اس کے کہ وہ اسی مقدمات میں سے ایک مقدمہ ہو، جیسے توبہ، صبر و زہد وغیرہ۔

اپنے اس دعوی کی تفصیل و تائید میں جو دلائل امام نے پیش کیے ہیں ان کو پڑھکر ہر ذی عقل کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بات نفسیاتی طور پر صحیح کہی گئی ہے۔ مثلاً کسی نفسیات داں کو اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ خشیت یا خوف بھی محبت ہی کا ایک ضروری تابع یا نتیجہ ہے، گو بظاہر کم بیں کی نظر میں اس کی بالکل ضد کیوں نہ نظر آئے، محب جو اپنے محبوب کو اپنی ذات سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہے، وہ اس چیز سے ڈرتا بھی ہے، کہ کہیں اس سے ایسی حرکت سرزد نہ ہو جائے کہ اس کا محبوب اس سے ناراض یا خفا ہو جائے، اور یہی خشیت ہے! آپ محبت و خشیت کو دو علیحدہ علیحدہ صفات قرار دے سکتے ہیں، لیکن امام غزالی کا یہ کہنا صحیح ہے کہ فما بعد ادراك المحبة مقام الا وهو ثمرة من ثمارها وتابع من توابعها۔[1]

صوفی صاحب کا یہ خیال کہ محبت یا عشق کی وجہ سے باطن دین کی تکمیل کا نصب العین سرے سے مستور ہو کر محض باطنیت رہ گیا، سو اس کے متعلق عرض ہے کہ اگر اباحیۃ اور بے شرع صوفیہ نے ایسا کیا ہے اور صوفی صاحب کا روئے سخن ان ہی کی طرف ہے تو ان کی تنبیہ درست ہے، لیکن یہ تو صریح ظلم ہوگا کہ اکابر صوفیائے اسلام کے متعلق ایسا خیال کیا جائے جنھوں نے کبھی شرع کا دامن ایک آن کے لیے بھی نہیں چھوڑا، اور عبد و رب کے فرق کو ایک لحظہ کے لیے بھی نہیں ترک کیا۔

العبد عبد وان ترقی والرب رب وان تنزل

صوفی صاحب کے ایک مبغوض صوفی ملک کا عقیدہ ہے! اکثر سے کثر وجودی مرتبۂ فنا فی اللہ میں بھی عبدیت کا نفس الامر میں منکر نہیں:

"در حصول مرتبہ فنا فی اللہ عبدیت از نفس الامری رود بلکہ او (عبد) بالحاظ تعین خود

وصفات خود نمی باشد پس در نفس الامر عین حق نیست، و عجاب تعین گاہے مرتفع نمی شود از نفس الامر، اگرچہ مرتفع می شود از شہود او، چنانکہ شیخ اکبر قدس سرہ در فصوص الحکم در فص آدمی، نص فرمودند "   (جواہر غیبی ص ۹۰)

چنانچہ شیخ محب اللہ جو ایک کٹر وجودی صوفی ہیں، فص آدمی کی شرح میں لکھتے ہیں :-

"پس ازینجا ظاہر شد کہ تعین اصلاً مرتفع نمی شود از واقع، و عبد گاہے مطلق نمی شود و ممکن واجب نمی شود، پس در فنا تعین از شہود می رود نہ غیر، و بعد نزول ببقا علم و امتیاز میان متعین پیدا آید، اما وجوب و اطلاق صفت ذاتیہ حق ست عبد باں موصوف نمی شود وتقید و افتقار صفت ذاتیہ عبد است از وے مرتفع نہ شود"

اس سے ظاہر ہے کہ غیر اسلامی سالک نے اگر عبد و رب کا فرق مٹا دیا ہے تو یہ ان کے مسلک کا نقص ہے لیکن وجودیہ کے باوا آدم نے بھی مسلمانوں میں اس فرق کو بڑی سختی سے باقی رکھا ہے۔

بڑا تعجب تو یہ ہے کہ ہمارے صوفی صاحب اولیا کے سکر و بیخودی کو بھی باطنیت کا روگ سمجھتے ہیں (ص ۳۷) وہ سکر، جذب و عشق کا قرآن حکیم میں کہیں ذکر نہیں پاتے (ص ۳۸) لہٰذا ان کیفیات کو دماغ کا خلل قرار دیتے ہیں (ص ۳۹)

ادھر سرتاج صوفیا، امام ربانی حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانیؒ اسی سکر و جذب کے سلسلے میں اپنے ایک مکتوب (مکتوب ۔ جلد ثالث) میں نہایت وضاحت اور صفائی کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں:

این فقیر کہ این ہمہ دفاتر در بیان علوم و اسرار این طائفہ علیہ نوشتہ است ظاہراً بخاطر شما قرار یافتہ است کہ از روے صحو محض نوشتہ است بے مزج سکر، حاشا وکلا کہ آں حرام و منکر است و گزاف و سخن باقی است، سخن با ان کہ بصحو خالص متصف اند بیا رانند لاجرم این قسم سخنان با فند و دہاے مردم را از جا برند ؎

فریاد حافظ این ہمہ آخر بہرزہ نیست   ہم قصۂ غریب و حدیث عجیب ہست

تبصرہ نگار جیسا عامی مجدد صاحب کے اس مختصر مگر واضح بیان کو پڑھ کر سکر و جذب اولیا کے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا، زیادہ سے زیادہ وہ یہ کہہ سکتا ہے: فربکم اعلم بمن ھو اھدیٰ سبیلا!

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے اپنی مشہور و معروف کتاب اسماء الاسرار میں لکھا ہے کہ سمجھ بوجھ کے لحاظ سے انسان تین درجے کے ہوتے ہیں۔ متوسّلی، متوسط اور اعلیٰ، یا عوام، خواص اور اخص الخواص، مذہبی تعلیم میں بھی اس فرق کا لحاظ رکھا گیا ہے ۔ کلموا الناس علی قدر عقولھم ۔ مذہب کی اساسی تعلیم توحید ہے، انبیاء علیہم السلام نے توحید کی تعلیم میں بھی لوگوں کی سمجھ بوجھ کا لحاظ رکھا ہے، عوام کی توحید بت پرستی اور ہوا پرستی سے بچنا ہے، خواص پر لازم ہے کہ "خود پرستی" سے بھی پرہیز کریں، اور اخص خواص کا مقام یہ ہے کہ اپنے وجود سے بھی دست بردار ہو جائیں۔

تاکہ با ماست جان ما بہ وجود

یار از ما نمی شود خوشنود

اس لحاظ سے ہمارے مصنف علام کے "تذکیر الاحسان" کے مخاطب عوام و خواص ہیں اور اخص خواص طبقہ کا وجود معدوم ہے۔

"جہادِ اعظم کی تیاری" کے تیسرے حصہ پر ہمارے ان ریمارک سے قطع نظر مصنف علام کا یہ رسالہ اپنے موضوع پر ایک نہایت کامیاب رسالہ ہے، اور آثار تائیدِ الٰہی واللہ یؤید بنصرہ من یشاء اس کے صفحات سے واضح ہیں، اور انوار توفیقات وما توفیقی الا باللہ اس کی عبارت سے لائح ہیں، کاش موجودہ زمانہ کے مسلمان اس کی طرف توجہ کریں، اور اپنی حالت کو درست کریں، مولفی صاحب کا لطف و کرم تو ہمیشہ میرے حال پر رہا ہے، لیکن اس رسالہ کو پڑھ کر میری زبان سے نکلا:-

اُرسلت الیَّ نسخۃٌ کاملۃٌ

تحوی حکمۃً بالغۃً شاملۃٌ

مطبوعات جدیدہ

قرآن اور آسمانی پروازیں۔ مرتبہ معین الدین رہبر فاروقی صاحب، تقطیع خورد کاغذ، کتابت وطباعت اچھی صفحات ۲۱۶، مع گردپوش قیمت سے، پتہ: منیجر مخزن ہندوستانی ادویہ، نیاپل، قریب اسٹیٹ ٹاکیز، حیدرآباد دکن۔

مصنف نے اس کتاب میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کتاب وسنت میں جو پیشین گوئیاں اور غیب کی خبریں پائی جاتی ہیں یا قرآن نے جو باتیں کائنات اور انسان کی حقیقت وماہیت کے متعلق بیان کی ہیں، وہ علم وحکمت کے عین مطابق ہیں، اور موجودہ دور کی تمام سائنسی ترقیاں اور انسانی بلند پروازیاں ان اسلامی حقائق کی تصدیق کرتی ہیں، سائنس کے نظریات اور جدید اکتشافات قرآن کی تعلیمات کے منافی نہیں، بلکہ ان سے مزید بصیرت اور ایمان میں پختگی پیدا ہوتی ہے، اس سے پہلے بھی اس موضوع پر بعض علماء نے رسالے اور کتابیں لکھی ہیں، مگر روز بروز نئے انکشافات ہورہے ہیں، اور خاص طور پر مصنوعی سیارہ اور انسان کے چاند پر پہنچنے کی کوشش نے بعض مزید نئے مسائل پیدا کردیے ہیں، ان سب مسائل پر مصنف نے بحث کی ہے، البتہ ان کا طرز بیان ذرا الجھا ہوا ہے، اس لیے مسائل کے ذہن نشین ہونے میں عام لوگوں کو دقت ہوگی،

گنجینۂ گوہر۔ از جناب شاہد احمد صاحب دہلوی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۷۲، مجلد، قیمت سے، ناشر مکتبہ نیا دور، کراچی

اشخاص کی خاکہ نگاری ایک مستقل فن ہے، اور اردو میں اشخاص کے خاکوں پر بعض دلچسپ کتابیں

موجود ہیں، مذکورۂ بالا کتاب بھی اسی نوعیت کی ہے، اس میں اردو کے مشہور اہل قلم شاہد احمد صاحب دہلوی نے مختلف طبقوں کی سترہ ممتاز شخصیتوں کے قلمی خاکے تحریر کیے ہیں، ان میں ڈپٹی نذیر احمد، میرزا صرعلی، بیخود دہلوی، خواجہ حسن نظامی، مولوی بشیر الدین احمد دہلوی، مولوی عنایت اللہ صاحب دہلوی، مرزا عظیم بیگ چغتائی، جگر مرادآبادی اور جوش ملیح آبادی کے نام قابل ذکر ہیں، مصنف ایک کہنہ مشق ادیب و صاحب قلم ہیں، ان کی زبان دلی کی خالص ٹکسالی ہے، اس لیے ان شخصیتوں کی ایسی کامیاب مصوری کی گئی ہو کہ ان کی ساری خصوصیات نمایاں ہو جاتی ہیں، اور ہر شخصیت ایک جیتا جاگتا پیکر نظر آتی ہے، لطیف ظرافت کی چاشنی نے لطف تحریر کو اور دوبالا کر دیا ہے، اس لیے یہ کتاب ان شخصیتوں کا تذکرہ بھی ہے اور لطف زبان اور انشائے لطیف کا نمونہ بھی، اور ان دونوں حیثیتوں سے اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے۔

خیر کثیر - مترجمہ مولانا عابد الرحمٰن صدیقی کاندہلوی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۴۰۱ مجلد مع رنگین گرد پوش، قیمت: ــــ پتہ: قرآن محل مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی

حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تصوف اور علم اسرار حقایق سے متعلق مشہور و بلند پایہ عربی تصنیف کا اردو ترجمہ عربی متن کے ساتھ شائع کیا گیا ہے، اور شروع میں شاہ صاحب کے علمی و دینی کمالات پر بھی ایک اجمالی نگاہ ڈالی گئی ہے، اصل کتاب کی خصوصیات سے اہل علم واقف ہیں، ترجمہ بھی غنیمت ہے، لیکن توضیحی حاشیے بھی ہوتے تو یہ ترجمہ اردو خوانوں کے لیے اور زیادہ مفید ہوتا۔

اقبال اور انکا عہد - از جناب جگن ناتھ صاحب آزاد، تقطیع خورد کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۲۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت: عـــہ

پتہ:- ادارۂ انیس اردو، الہ آباد ۳

زیر نظر کتاب جناب جگن ناتھ صاحب آزاد کے تین مقالات "شعر اقبال کا ہندوستانی پس منظر" "اقبال کے کلام کا متصوفانہ لب ولہجہ" اور "اقبال اور اس کا عہد" پر مشتمل ہے، یہ مقالے جموں وکشمیر یونیورسٹی کی دعوت پر لکھے گئے تھے، پہلے مقالہ میں اقبال کی اسلام سے غیر معمولی محبت کی بنا پر ان سے ہندوستان کی بے اعتنائی کو غلط قرار دیا گیا ہے، اور ان کو بھی تلسی داس اور ٹیگور کی طرح (جن کو ہندو دھرم سے عشق بے پایاں تھا) ہندوستان کے لیے باعث فخر بتایا گیا ہے، دوسرے میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اقبال کو اسلامی تصوف پر اعتراض نہ تھا، بلکہ وہ عجمی اور غیر اسلامی تصوف کے مخالف تھے، تیسرے مضمون میں اقبال کے فکر اور کلام پر ان کے عہد کے اثرات اور ان کے عہد پر ان کے فکر و کلام کے اثرات دکھائے گئے ہیں، لائق مصنف ایک باذوق، سخن سنج اور کلام اقبال کے عاشقوں میں ہیں، ان کو اسلامی قدروں سے بھی واقفیت ہے، اس لیے اس کتاب میں ان کے حسن ذوق اور نکتہ سنجی کے ساتھ یہ سب حیثیتیں بھی نمایاں ہیں، اور انھوں نے اقبال کی ترجمانی کا پورا حق ادا کیا ہے، اس کتاب سے اقبالیات میں ایک مفید کتاب کا اضافہ ہوا۔

حیاۃ عبداللہ بن مسعود (عربی)۔ از جناب ڈاکٹر محمد احمد صاحب صدیقی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۴۸، مجلد مع گرد پوش قیمت عہ

پتہ: سراج الآفاق واخوانہ ۱۶۶، شاہ گنج، الہ آباد۔

ڈاکٹر محمد احمد صاحب صدیقی پروفیسر عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی نے عربی زبان میں چھوٹے چھوٹے رسالے لکھنے کا جو مفید سلسلہ شروع کیا ہے، اس کی ایک کڑی یہ نیا رسالہ بھی ہے، لیکن ہندوستان کی بڑی شخصیتوں کو عربی ملکوں میں روشناس کرانے کے لیے تو ان کے حالات عربی میں لکھنا مفید اور کارآمد ہے، مگر صحابہ و تابعین اور اس عہد کی تمام دوسری عرب شخصیتوں

کے حالات تو خود عربی کی طبقات و تراجم کی کتابوں میں موجود ہیں، جن کی مدد سے اردو میں ان کے حالات لکھے جاتے ہیں، ایسی حالت میں ان کے حالات عربی میں لکھنے کی کوئی مصلحت سمجھ میں نہیں آتی، سوا اس کے کہ مصنف نے عربی میں ایک رسالہ لکھ دیا۔ "ض"

رہبر حجاج ۔ از مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی۔ تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۶۲ قیمت ۱۲/ ناشر ناظم مکتبہ اعظمی پٹھان ٹولہ مئو ضلع اعظم گڈھ

حج کے موضوع پر بکثرت کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں یہ رسالہ امتیازی حیثیت رکھتا ہے، اس میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے حج کے مسائل بہت اچھے اور آسان انداز سے بیان کیے ہیں، حج وزیارت کے سلسلہ میں بعض غیر شرعی اور مروجہ رسموں پر بھی مولانا نے حرف گیری کی ہے اور اختصار کے باوجود بعض مسائل پر عالمانہ بحث بھی کی ہے، خاص طور پر عصر و مغرب کے بعد طواف کی دو رکعتوں پر بڑی مدلل بحث ہے، رسالہ ہر مسلمان خصوصاً عازمینِ حج کے مطالعہ کے لائق ہے، اور مختصر ہونے کی وجہ سے اس سے فائدہ اٹھانا آسان ہے۔ "م - ح"

زمزمہ ۔ از جناب رشید کوثر فاروقی۔ تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت دیدہ زیب صفحات ۱۶۰ مجلد، قیمت ۳/ پتہ ادارۂ ادبیات عالیہ ۱۳۱ خیالی گنج، لکھنؤ۔

زمزمہ رشید کوثر صاحب فاروقی کے کلام کا مجموعہ ہے، نوجوان شعراء میں وہ خوشگو اور روشناس شاعر ہیں، ان میں شاعری کی صلاحیت کے ساتھ ذہانت اور علمی وفنی استعداد بھی ہے، اس لیے ان کا کلام آج کل کے نوجوانوں کی شعری و ادبی لغزشوں سے پاک اور زبان کی سلاست وصفائی، خیالات کی بلندی و رنگینی اور سوز و دردمندی وغیرہ تغزل کے تمام محاسن سے آراستہ ہے، امید ہے کہ مشق و ممارست کے ساتھ انکی خوبیاں اور نکھرتی جائیگی

کتاب کے شروع میں مصنف کے قلم سے ایک بسوط مقدمہ اور اس کے ناشر افتخار علی صاحب علوی کاکوروی کے قلم سے ایک مختصر تعارف ہے، مقدمہ میں مصنف کے حالات اور ان کے کلام کے پس منظر کے ساتھ شعروادب کے متعلق بھی بعض مفید باتیں ملتی ہیں، مجموعی حیثیت سے زمزمہ اسم بامسمی اور اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے۔　　　" م "

الرای السدید فی نصب المجہار لصلوۃ الجمعۃ والعید } از مولانا عبد القیوم صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۴۸، قیمت عہ، پتہ محمد عبد الجمیل مہتمم دائرہ معارف اسلامیہ لطیفیہ، بالائے قلعۂ علی گڑھ۔

نماز میں آلۂ مکبر الصوت کے استعمال کے بارہ میں علماء کا اختلاف جو خود سائنسدانوں کے اس اختلاف کا نتیجہ ہے کہ اس سے سنی جانے والی آواز متکلم کی اصلی آواز ہے یا نہیں، فاضل مؤلف کی تحقیق میں آلہ کی مدد سے اور بغیر آلہ کے دونوں صورتوں میں متکلم کی اصل آواز نہیں سنائی دیتی، اس لیے ان کے نزدیک جب عام مقتدیوں تک امام کی آواز نہ پہنچنے کا اندیشہ ہو تو اس کا استعمال نہ صرف مباح بلکہ مستحب ہے، اس کے ثبوت میں انھوں نے جو دلائل لکھے ہیں وہ اصحاب افتاء کے لیے قابل غور ہیں، البتہ اس رسالہ کی قیمت زیادہ ہے۔

حکمت استخارہ - از جناب پروفیسر فضل احمد عارف ایم اے، چھوٹی تقطیع کاغذ معمولی، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۷۵ قیمت، ۷۰ نئے پیسے، ناشر مکتبہ رشیدیہ باجوں ضلع ملتان

اس رسالہ میں استخارہ کی حقیقت، اسکی اہمیت شرعی حیثیت، شرطیں مسنون طریقہ، تعداد موافق یا غیر موافق ہونے کی علامتیں، اس میں اور فال میں فرق کس معاملہ میں اسکو کرنا اور کس میں نہ کرنا چاہیے کے متعلق بڑی مناسب و مفید بحث کی گئی ہے، اور آخر میں استخارہ کے متعلق بعض بزرگوں کے طریقے بھی نقل کیے گئے ہیں۔　　　" ض "

جلد ۹۱۔ ماہ ذی الحجہ ۱۳۸۲ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۶۳ء۔ عدد ۵

مضامین

مقالات

آثار علمیہ و ادبیہ

سہ لسانی فارمولا کمیٹی نے اسکی پوری وضاحت کردی تھی کہ اس فارمولے کی رو سے ہندی اور انگریزی کے ساتھ تیسری زبان کوئی "جدید ہندستانی زبان" پڑھائی جانی چاہیے، جو کلاسکل نہ ہونی چاہیے، اور اسکی تعلیم کی مدت کم از کم مسلسل تین سال ہونی چاہیے، اور جہاں اس کا انتظام نہیں ہو وہاں جلد سے جلد انتظام کرنا چاہیے، اس وضاحت سے سنسکرت اور دوسری کلاسکل زبانیں خود بخود خارج ہوگئی تھیں، اس صوبے میں ہندی کے بعد تیسری عام اور مقبول زبان اردو ہے، جو ایک بڑے طبقہ کی مادری زبان بھی ہے، جس سے اسکے مخالفین بھی انکار نہیں کرسکتے، اس لئے عدل و انصاف اور اصول تعلیم دونوں لحاظ سے یہاں تیسری زبان اردو ہونی چاہیے لیکن ہمارے صوبہ کی اردو نواز حکومت اسکو کب گوارا کرسکتی تھی، چنانچہ اس نے اردو کی جگہ سنسکرت کو لانے کے لیے کمیٹی کے مقصد و منشا کے بالکل خلاف "جدید ہندستانی زبان" کے فقرے کو "ہندستانی زبان" سے بدلدیا، اب اس صوبے میں تیسری زبان کی جگہ اردو کے بجائے سنسکرت کی تعلیم ہوگی،

سنسکرت کی قدامت اور اسکی علمی و ادبی اہمیت سے انکار نہیں، لیکن وہ مردہ زبان ہے، اسکے جاننے والے ہزاروں میں مشکل سے دو چار اور اسکے پڑھنے والے اس سے بھی کم نکلیں گے، جس کا وزیر تعلیم صاحب نے بھی اعتراف کیا ہے کہ وہ سنسکرت کی تعلیم چاہتے ہیں اور طلبہ اردو پڑھنا چاہتے ہیں، اسکے علاوہ تعلیم کے ہر مرحلہ میں مختلف شکلوں میں سنسکرت کی تعلیم کا پہلے سے انتظام ہے، ایسی حالت میں اردو جیسی مقبول عام زبان کو چھوڑکر اسکی جگہ سنسکرت کو دلانا نہ صرف صریح زیادتی بلکہ اصول تعلیم اور فارمولا کمیٹی کے منشا و مقصد سب کے خلاف ہے، اگر مرکزی حکومت سہ لسانی فارمولا کو یکساں طریقے سے پورے ہندوستان میں رائج کرنا چاہتی ہے تو اس کو ریاستوں کو اس میں ترمیم کا حق نہ دینا چاہیے ورنہ اسکی رو سے اس صوبے میں اردو کی تعلیم کی جو گنجایش نکلی ہے، اس سے بھی ہمارے صوبہ کی حکومت اس کو محروم کرکے رہے گی،

اس صوبے میں اردو کی تعلیم کی یہ آخری امید نظر آتی تھی، اگر صوبائی حکومت نے اسکو بھی ختم کر دیا جس کی پوری کوشش ہے تو پھر آیندہ اسکی کوئی صورت نظر نہیں آتی، لیکن اگر مرکزی حکومت اس میں مداخلت پسند نہیں کرتی تو خود اردو والوں کو پوری قوت سے تیسری زبان کی جگہ اردو کو دلانے کی کوشش کرنا چاہیے، یہ صریح زیادتی صرف اردو والوں کی بے بسی کا نتیجہ ہے، ورنہ جنوبی ہند والوں کی طرح وہ بھی اپنے مطالبات منوا کر رہتے، ہمیشہ مصلحت اندیشی اور صبر و سکون سے کام نہیں چلتا، کبھی کبھی ہمت و حوصلہ ناگزیر ہو جاتا ہے، اور جمہوری حکومت میں تو حق تلفی اور ظلم و زیادتی کے خلاف جد وجہد کرنا عین جمہوریت کی خدمت ہے، اسلیے نیا تعلیمی سال شروع ہونے سے پہلے اردو والوں کو اس کا حق دلانے میں اپنے تمام وسائل صرف کر دینے چاہئیں، ورنہ اگر ایک سال بھی سنسکرت رائج ہو گئی تو پھر اردو کو رائج کرنا ناممکن ہو جائے گا۔

ہندوستان میں اسلامیات کی تحقیقات کے اداروں کی بڑی کمی ہے، بعض یونیورسٹیوں کے اسلامک اسٹڈیز کے شعبوں کو چھوڑ کر پورے ملک میں دار المصنفین اور ندوۃ المصنفین کے علاوہ اس قسم کا کوئی ادارہ نہیں ہے، اسلامک اسٹڈیز کے شعبوں میں یہ کمی ہے کہ ان میں اسلامیات کا ایک اہم پہلو دینیات کی تحقیقات شامل نہیں ہے، صرف جامعہ عثمانیہ میں تھا، اب معلوم نہیں اس کا کیا حال ہے، ابھی کچھ دن ہوئے ایک ادارہ "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" کے نام سے دار العلوم ندوۃ العلماء میں قائم ہوا ہے، گو ابھی وہ ابتدائی منزل میں ہے، لیکن اس نے تھوڑے دنوں میں کئی مفید کتابیں شائع کی ہیں اور یقین ہے کہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی رہنمائی میں وہ آیندہ ایک مفید ادارہ بن جائیگا۔ ان سب میں دار المصنفین ہی ایسا ادارہ ہے جس کا اپنا کتب خانہ ہے، اپنے مصنفین و اہل قلم ہیں، اپنا پریس ہے، اور اپنا دار الاشاعت ہے، یعنی ایک مکمل ادارے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ سب اس میں موجود ہیں۔

ابھی حال میں حکیم عبد الحمید صاحب دہلوی متولی "وقف ہمدرد دواخانہ دہلی" نے "انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے، اس کا خاکہ ہمارے پاس مشورے کے لیے آیا ہے، اس میں وہ سب کام شامل ہیں جو اسلامیات

لی تحقیقات کے ادارے میں ہونے چاہئیں حکیم صاحب کو امورِ خیر سے بڑی دلچسپی ہے، ان میں علمی خدمت کا بھی جذبہ ہے، ن کے پاس سرمایہ کی بھی کمی نہیں، اس لیے اگر اس ادارہ کو اچھے کارکن مل گئے تو یہ ایک مفید ادارہ بن سکتا ہے، دلی جیسے مرکزی مقام پر ایسے ادارے کی ضرورت بھی تھی، اس لیے ہم اس کا مسرت کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں۔

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے نئے وائس چانسلر مسٹر بدرالدین طیب جی توقع سے زیادہ یونیورسٹی کے لیے مفید ثابت ہو رہے ہیں، چند دنوں کے اندر انھوں نے جو اصلاحات کی ہیں اور آئندہ جو اصلاحات اور علمی و تعلیمی منصوبے انکے پیش نظر ہیں، ان سے نہ صرف یونیورسٹی کا تعلیمی معیار بلند ہو جائیگا بلکہ وہ اسلامیات اور علمی تحقیقات کا بھی بڑا مرکز بنجائیگی، اور پورے ملک میں اس کا علمی و تعلیمی وقار قائم ہو جائیگا، مسلم یونیورسٹی محض شاندار عمارتوں، وسیع سبزہ زاروں، خوشنما کوٹھیوں، خوش لباس طلبہ اور جامہ زیب پروفیسروں کا نام نہیں ہے، بلکہ اسکی اصلی روح علمی و تعلیمی اور اس کی امتیازی خصوصیت اس کی اسلامیت ہے، اور یہ امر قابل اطمینان ہے کہ وائس چانسلر صاحب کی نظر ان سب پہلوؤں کی جانب ہے، وہ اس کی اسلامیت کے اظہار سے گھبراتے نہیں، بلکہ اپنی تقریروں میں برملا اس کا اعلان کرتے ہیں اور اس کو قائم رکھنا چاہتے ہیں، اس لیے توقع ہے کہ گذشتہ چند برسوں میں یونیورسٹی میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں اور وہ جس غلط راستہ پر جا رہی تھی، اس کی پوری اصلاح و تلافی ہو جائیگی اور ملک و وطن اور دین و ملت سے متعلق اپنے فرائض بھی پوری طرح ادا کرے گی۔

گذشتہ مہینہ محمد علی اکیڈمی لاہور کے تعارف میں اس کا ذکر کرنا رہ گیا تھا کہ اس کے بانیوں میں مولانا محمد علی مرحوم کے پہلے سوانح نگار مولوی رئیس احمد صاحب جعفری بھی ہیں، جو ماشاءاللہ اب نامور مصنف اور اہل قلم بن چکے ہیں، اس لیے امید ہے کہ جس کام کی انھوں نے ابتدا کی تھی اس کی تکمیل بھی انہی کے ہاتھوں سے ہوگی۔

مقالات

اسلامی ہند کے نصف اوّل میں علوم عقلیہ کا رواج

از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے، رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی، اتر پردیش

(۲)

(۲) ترک و افغان حکومت

ترک و افغان حکومت کو بھی چند ذیل ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے،

آل سبکتگین (غزنوی خاندان) | غزنوی سلطنت خراسان و ماوراء النہر کی سامانی حکومت کے کھنڈروں پر قائم ہوئی تھی،

۳۵۱ھ میں الپتگین جو عبد الملک بن نوح سامانی کا حاجب کبیر رہ چکا تھا، درباری سازشوں کے نتیجہ میں بغاوت کرنے پر مجبور ہوا، اس نے غزنی پہنچکر وہاں کے سامانی حاکم ابوعلی لوک کو نکال دیا اور ایک مستقل حکومت قائم کی، ۳۵۲ھ میں اس کی وفات پر اس کا بیٹا ابو اسحٰق جانشین ہوا، اگلے سال اس نے بھی وفات پائی، اور اس کا جانشین بلکاتگین ہوا، دو سال بعد وہ بھی راہی ملک عدم ہوا، اور لوگوں نے امیر پری کو غزنی کا بادشاہ منتخب کیا، مگر اس کے ظلم و ستم سے لوگ بہت جلد بددل ہو گئے، اور سابق حاکم ابوعلی لوک نے حملہ کر دیا، مگر سبکتگین نے جو ابو اسحاق کے زمانہ سے اپنی شہامت و شجاعت

کی وجہ سے ہر دلعزیز تھا، اسے شکست فاش دی، اس لیے لوگوں نے امیر پری کے بجائے اسی کو غزنی کے تخت پر بٹھایا[1]

سبکتگین کی ظاہری کمزوری و مسکینی سے دھوکا کھا کر پنجاب کے راجہ جیپال نے ایک لشکر جرار کے ساتھ حملہ کیا، لیکن شکست کھائی اور تاوان جنگ کے وعدہ پر صلح کرکے واپس لوٹا، مگر لاہور آکر وعدہ خلافی کی، اس لیے سبکتگین نے حملہ کرکے اسے شکست فاش دی، اس کی فتوحات کا سلسلہ اور آگے بڑھتا، مگر اسے خراسان کی سیاست میں الجھنا پڑا جہاں فرقہ باطنیہ (اسماعیلیوں) کی دسیسہ کاریوں سے انتشار برپا تھا، اس لیے اس نے اپنی توجہ باطنیہ خراسان کے استیصال پر مرکوز کردی[2]،

۳۸۷ھ میں سبکتگین نے وفات پائی، اور کچھ دن بعد محمود غزنی کے تخت پر بیٹھا، وہ بھی خراسان ہی کی سیاست میں الجھا رہتا، مگر مشرقی سرحد پر ملتان کا قرمطی حکمران داؤد علانیہ الحاد و بیدینی کی اشاعت کررہا تھا، دوسری طرف مغربی سرحد پر خوارزم قرامطہ (اسماعیلیہ) کا گڑھ بنا ہوا تھا، اس طرح وہ دونوں طرف سے خطرے میں گھرا ہوا تھا، اس لیے پہلے اس نے ملتان کی طرف توجہ کی، مگر پنجاب کے ہندو راجاؤں نے جنھیں داؤد نے حلیف بنا لیا تھا، مزاحمت کی، اس پر محمود کو ان سے نپٹنا پڑا، اس کے نتیجہ میں ہندوستان کا شمالی مغربی حصہ غزنوی سلطنت کا مشرقی صوبہ بن گیا، جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے،

۴۰۴ھ میں فاطمی خلیفہ مصر نے پھر مشرق میں باطنی (اسماعیلی یا قرمطی) انقلابی تحریک کی تنظیم کے لیے ایک سفیر روانہ کیا، مگر محمود نے اسے انتہائی بے عزتی کے ساتھ نکلوا دیا[3]، اور دوسری اسماعیلی سازشوں کی نگرانی بھی شروع کردی، ان میں سب سے اہم شیخ بوعلی سینا تھا، جو نام نہاد "اسلامی فلسفہ" کا واضع ہے، وہ خوارزم میں اندر ہی اندر اس تحریک کو منظم کررہا تھا، اس لیے

---

[1] زین الاخبار گردیزی ص ۴۴ [2] طبقات ناصری ص ۸ [3] تاریخ یمینی العتبی ص ۲۹۶

محمود نے ابوالعباس مامون والی خوارزم کو لکھا کہ وہ اپنے دربار کے فضلاء کو غزنی بھیجدے، اس طرح وہ ابن سینا کو غزنی میں نظر بند کرنا چاہتا تھا، البیرونی اور دیگر فضلاء تو خوشی سے غزنی روانہ ہوگئے، مگر ابن سینا نکل بھاگا، اور جرجان پہنچا[۱]، اور جب وہاں بھی محمود کے فرستادوں نے پیچھا نہ چھوڑا تو رے چلا گیا، جو مجد الدولہ بویہی کے زیر حکومت معتزلہ اور قرامطہ کا ایک اور گڑھ تھا[۲]، وہاں سے ہمدان پہنچا اور جتنے دن وہاں رہا فتنہ و فساد ہی کراتا رہا[۳]، آخرکار اصفہان پہنچا جہاں علاء الدولہ کاکو نے اس کی فتنہ پرور اور ہنگامہ آرا سرگرمیوں کی بدل و جان قدر کی، اسی کے یہاں ۴۲۸ھ میں اس نے وفات پائی[۴]،

۴۰۷ھ میں محمود کو خوارزم میں اس لیے مداخلت کا موقع مل گیا کہ درباریوں نے ابوالعباس مامون کو، جو اس کا بہنوئی تھا، قتل کر ڈالا، اس لیے محمود نے خوارزم کو فتح کرکے جن لوگوں پر قرمطی ہونے کا ذرا سا بھی شبہہ تھا، سخت سزائیں دیں، تاریخ روضۃ الصفا میں ہے:۔

"نیالتگین را با قومیکہ در تہییج فتنہ سعی کردہ بودند بفرمود تا بخلق بر کشیدند . . . . . . وجمعے اسیر از امرا بغزنین فرستادہ محبوس گردانید و بعد از چندگاہ ہمہ را بخشیدہ در زمرہ سپاہ مرتجند و روانہ ہند ساختہ[۵]"

ان ہی معتوبین میں ابوریحان البیرونی بھی تھا، جسے وہ اپنے ہمراہ ہندوستان لے گیا، جہاں اس نے سنسکرت زبان اور ہندو علوم میں تبحر حاصل کیا،

۴۱۸ھ میں محمود نے رے کو بھی فتح کر لیا اور بقول ابن الاثیر،

وصلب من اصحابہ (اصحاب مجد الدولہ) الباطنیۃ خلقاً کثیراً ونفی المعتزلۃ الی	اور مجد الدولہ کے متوسلین میں سے باطنیوں کی کثیر تعداد کو پھانسی پر چڑھایا، اور معتزلہ کو خراسان کی طرف جلاوطن کیا، فلسفہ .

---

[۱] چہار مقالہ گب میموریل ایڈیشن ص ۷۷ - ۷۸، [۲] سرگذشت ابن سینا مرتبہ سعید نفیسی ص ۹، [۳] ایضاً ص ۱۰، [۴] ایضاً ص ۱۴، [۵] روضۃ الصفا ج ۴ ص

خراسان واحرق کتب الفلسفۃ	اعتزال اور نجوم کی کتابوں کو جلادیا اور
ومذھب الاعتزال والنجوم و	باقی کتابوں کے سو اُونٹ(غزنی) لے گیا،
اخذ من الکتب ماسوی ذلک	
مائۃ حمل[1]	

محمود نے اس علاقے کی حکومت اپنے بیٹے مسعود کو تفویض کی جس نے یہاں کے انتظام سے فارغ ہوکر اصفہان پر فوج کشی کی، اس جنگ میں علاء الدولہ ابن کاکویہ کی بہن گرفتار ہوکر آئی جس سے علاء الدولہ بہت پریشان ہوا، مگر بوعلی سینا نے حکمت عملی سے کام لیکر مسعود سے کہلا بھیجا کہ یہ شہزادی آپ کی ہم مرتبہ (کفو) ہے، آپ اس سے شادی کرلیں، علاء الدولہ اصفہان آپکے سپرد کردے گا، اس تدبیر سے مسعود نے اس سے شادی کرلی،[2]

۴۲۱ھ میں محمود نے وفات پائی اور کچھ دن بعد مسعود تخت پر بیٹھا، اس نے ابوسہل حمدونی کو عراق میں اپنا نائب مقرر کیا اور علاء الدولہ کو اصفہان کا منشور ولایت بخشا،[3] مگر کچھ دنوں کے بعد اس نے خود مختاری کا دعویٰ کردیا، مسعود نے لکھا کہ اگر وہ اس حرکت سے باز نہ آیا تو اس کی بہن لشکر کے رندوں کے سپرد کردیجائے گی، علاء الدولہ کو پھر تشویش ہوئی، مگر بوعلی سینا کے مشورے سے لکھ بھیجا کہ بیوی تو وہ تمھاری ہی ہے، اس کی بیعزتی کی شرم بھائی سے زیادہ شوہر کو آنی چاہئے، اس پر مسعود نے اسے عزت و احترام کے ساتھ اس کے میکہ بھیجدیا،[4]

ابوسہل حمدونی نے جو مسعود کی جانب سے علاء الدولہ کی تادیب پر مامور تھا، لشکرکشی جاری رکھی اور علاء الدولہ کو ہزیمت پر ہزیمت ہوتی رہی، ان مسلسل جنگوں کا علمی سانحہ یہ تھا کہ سب غارت کے سلسلے میں بوعلی سینا کی بہت سی تصانیف بھی اس کے گھر بار کے ساتھ لٹ گئیں،

---

[1] کامل لابن الاثیر جلد ۹ ص ۱۳۶ [2] تتمہ صوان الحکمۃ للبیہقی [3] روضۃ الصفا جلد چہارم [4] تتمہ صوان الحکمۃ

وکان الشیخ الحکیم ابوعلی بن سینا	اور شیخ حکیم ابوعلی بن سینا علاء الدولہ ابن
وزیر الملک علاء الدولہ فاغار	کاکویہ کا وزیر تھا، لہذا تاش فراش (جو ابوسہل
عسکر تاش فراش علی بیت کتب	کے ساتھیوں میں سے تھا) کے لشکر نے بوعلی سینا
ابی علی ونقلوا اکثر تصانیفہ و	کے کتب خانہ کو بھی لوٹا اور اسکی بہت سی
کتبہ الی خزانۃ کتب غزنۃ و	مصنفات نیز ملوک کتابوں کو غزنی کے کتب خانہ میں
کانت فیہا مجموعۃ [۱]	منتقل کیا گیا جہاں وہ (علاء الدین جہانسوز
	کے حملہ تک) جمع رہیں

لیکن ابن سینا کے حسن تدبیر سے علاء الدولہ نے پیہم شکستوں کے باوجود ہمت نہیں ہاری، یہانتک کہ مسعود کو سلاجقہ نے کمزور کر دیا اور بالآخر علاء الدولہ نے ابوسہل حمدونی کو صوبہ جبال سے بیدخل کر دیا،[۲]

سنہ ۴۳۳ھ میں مسعود سلاجقہ کی شورش دبانے میں ناکام ہونے کے بعد ہندوستان چلا گیا راہ میں نمکحرام غلاموں نے قتل کر دیا، اس کے بعد پہلے اس کا بھائی محمد اور پھر بیٹا مودود تخت نشین ہوئے، مودود کے بھائی مجدود نے جو ہندوستان میں باپ کا نائب السلطنت تھا، علم خود مختاری بلند کیا، اور لشکر فراواں لیکر لاہور پہنچا، مودود نے بھی اس کے تدارک کے لیے ایک لشکر بھیجا، مگر ابھی یہ لشکر پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ مجدود بقرعید کے دوسرے دن اپنے خیمہ میں مردہ پایا گیا، کچھ دن بعد غزنویوں کی کمزوری سے فریب کھا کر ہندوستان کے راجاؤں نے متفق ہو کر لاہور پر حملہ کیا، مگر شکست کھائی،[۳] مودود نے سنہ ۴۴۱ھ میں وفات پائی، اس کے بعد عبدالرشید بن مسعود تخت پر بیٹھا، مگر دو سال بعد اسکے محسن کش غلام طغرل نے اسے شہید کر ڈالا، کچھ دن بعد ارکان دولت نے طغرل کو قتل کر کے فرخ زاد ابن مسعود کو تخت پر بٹھایا، اس کی وفات (سنہ ۴۵۱ھ) کے بعد ابراہیم بن مسعود تخت نشین ہوا، ابراہیم نے

---

[۱] اخبار الدولۃ السلجوقیہ ص ۹ [۲] روضۃ الصفا جلد چہارم [۳] ایضاً

۴۶۹ھ میں اپنے بیٹے ابوالقاسم محمود کو ہندوستان میں اپنا نائب السلطنت بنایا جس کی تہنیت میں مسعود سلمان کا قصیدہ مشہور ہے، اسی زمانہ میں نظام الدین ابونصر ہبۃ اللہ الفارسی نے لاہور میں ایک بہت عمدہ خانقاہ تعمیر کرائی، عوفی نے اس عہد کے ایک اور مشہور فاضل ابوالعلا عطا بن یعقوب الکاتب کا ذکر کیا ہے جو لاہور میں نظر بند تھے، جب سلطان ابراہیم ہندوستان آیا تو انھوں نے اس کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا جس میں اپنے متعلق کہا تھا ؎

بے گنہ ماندہ ہشت سال بہ بند چوں گنہگار در عذاب الیم

ابراہیم نے ۴۹۱ھ میں وفات پائی اور اس کا بیٹا مسعود اس کا جانشین ہوا، جس نے اپنے بیٹے شیرزاد کو اپنے ہندوستانی مقبوضات کا نائب السلطنت بنایا، مسعود کے بعد پہلے ارسلان شاہ اور پھر بہرام شاہ تخت پر بیٹھے، بہرام شاہ کے زمانہ میں غور کا ایک شہزادہ ملک قطب الدین بھائیوں سے ناراض ہو کر غزنی چلا آیا تھا، مگر بہرام شاہ اس سے بدظن ہوگیا، اور اسے خفیہ طور پر مروا ڈالا، اسکے بھائی سلطان سوری نے انتقاماً غزنی پر حملہ کیا، بہرام شاہ ہندوستان چلا گیا، مگر جاڑے کے موسم میں جبکہ غور کا راستہ برف سے بند ہوگیا، تو غزنی لوٹ آیا اور سوری کو شکست دیکر اس کے وزیر کے ساتھ پھانسی پر چڑھا دیا،[1] سوری کے بھائی علاء الدین حسین نے بھائی کے انتقام میں بہرام شاہ پر فوجکشی کرکے شکست دی اور وہ پھر ہندوستان بھاگ گیا، علاء الدین نے غزنی کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا، اسی لیے وہ تاریخ میں "علاء الدین جہانسوز" کے نام سے مشہور ہے، علاء الدین کی واپسی پر بہرام شاہ پھر غزنی واپس آیا جہاں ۵۵۲ھ میں وفات پائی،

بہرام شاہ کے بعد اس کا بیٹا خسرو شاہ تخت نشین ہوا، غوریوں کی کینہ جوئی کی وجہ سے غزنوی سلاطین کی شوکت وحشمت یونہی ختم ہو چکی تھی کہ غزوں کی شورش شروع ہوئی اور ۵۵۵ھ

[1] طبقات ناصری ص ۱۴-۱۱۳

میں غزنی پر ان کا قبضہ ہوگیا[1] خسرو شاہ ہندوستان چلا آیا، جہاں ۵۵۵ھ میں اس نے وفات پائی، اور اس کا بیٹا خسرو ملک اس کا جانشین ہوا لیکن غوریوں کی کینہ پروری نے ہندوستان میں بھی غزنویوں کو چین سے نہ رہنے دیا اور ۵۸۲ھ میں محمد غوری نے لاہور کو فتح کرکے غزنوی خاندان کا خاتمہ کردیا اور بقول منہاج سراج

"خاندان آل ناصر الدین سبکتگین مندرس گشت .. و پادشاہی ایران و تخت ہندوستان و ممالک خراسان بملوک و سلاطین شنسبانیاں رسید[2]"

غزنوی سلطنت سامانی حکومت کے کھنڈروں پر قائم ہوئی تھی جن کی قدر شناسی علم و ادب کے بارے میں ایک چشم دید سیاح مقدسی لکھتا ہے:۔

ومن رسومهم انهم لا یکلفون	سامانی بادشاہوں کا دستور ہے کہ وہ
اهل العلم تقبیل الارض	طبقہ علماء کو زمین بوسی کی تکلیف نہیں
... ویختارون ابداً افقه	دیتے..... اور بخارا میں جو عالم سب سے
من بخارا واعفهم فیرفعونه	زیادہ فقہ داں اور پرہیزگار ہوتا ہے
ویصدرون عن رایه ویقضون	اسے منتخب کرکے اسے بلند مرتبہ دیتے ہیں
حوائجه ویولون الاعمال	اور اسی کے مشورے پر عمل کرتے ہیں
بقوله[3]	اس کی حاجتوں کو پورا کرتے ہیں، اور
	اسی کی سفارش پر عہدے دار مقرر کرتے ہیں،

اس لیے دیگر لوازم سلطنت کے ساتھ غزنویوں نے سامانیوں سے علم و ادب کی سرپرستی بھی ورثہ میں پائی تھی، اس خاندان (غزنویہ) کا واسطۃ العقد محمود غزنوی تھا، جو خود عالم اور علماء نواز تھا

---

[1] طبقات ناصری ص ۲۵ [2] ایضاً ص ۲۱ [3] احسن التقاسیم مقدسی ص ۳۴۸

جواہر مضیئہ میں اسے فقہائے احناف میں شمار کیا گیا ہے اور لکھا ہے :-

السلطان محمود من اعیان الفقہاء	سلطان محمود مشہور فقہا میں سے تھا، فصاحت
وفرید العصر فی الفصاحۃ	وبلاغت میں یکتائے روزگار تھا.... فقہ
والبلاغۃ .... ولہ التصانیف	حدیث میں کئی کتابیں اس کی تصنیف ہیں،
فی الفقہ والحدیث والخطب	اور خطب رسائل کا بھی مصنف ہے، اسکے
والرسائل ولہ شعر جید	اشعار بھی اچھے ہیں..... اسکی تصانیف
......ومن تصانیفہ کتاب	میں سے کتاب التفرید مشہور ہے، جو حنفی فقہ
التفرید علی مذہب ابی حنیفہ	میں ہے اور غزنی کے علاقہ میں متداول
مشہور فی بلاد غزنۃ[1]	ہے۔

ابن اثیر اس کی علمی سرپرستی اور فضلانوازی کے بارے میں لکھتا ہے ؛

کان یمین الدولۃ محمود بن	یمین الدولہ محمود بن سبکتگین عقلمند، دیندار
سبکتگین عاقلاً دیناخیراعندہ	اور نیکوکار تھا، صاحب علم و معرفت تھا.
علم معرفۃ وصنف لہ کثیر	مختلف علوم و فنون میں کثیر التعداد کتابیں
من الکتب فی فنون العلم و	اس کے نام پر تصنیف کی گئیں، دور دراز
قصدہ العلماء من اقطار	شہروں کے علماء اس کے دربار میں آتے تھے.
البلاد وکان یکرمھم[2]	اور وہ عزت و اکرام سے انھیں نوازتا تھا،

۴۰۹ھ میں قنوج کی مہم سے واپسی پر اس نے غزنی میں ایک خوبصورت مسجد اور ایک عظیم الشان مدرسہ بنایا تھا اور اس مدرسہ کے لیے ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا تھا، روضۃ الصفا میں ہے :-

---

[1] جواہر المضیئہ جلد ثانی ص ۱۵۰ [2] کامل ابن اثیر جلد تاسع ص ۳۹

"و مسجد آن مسجد مدرسہ بنیاد نہاد و بنفائس کتب و غرائب نسخ آنرا موشح گردانید"[۱]

لیکن باایں ہمہ معارف پروری علوم عقلیہ کی سرپرستی میں محمود کا کوئی حصہ نہیں ہے، بلکہ وہ ان علوم کا دشمن تھا، اور چونکہ معتزلہ بھی عقلیت کے پرستار تھے، اس لیے وہ ان سے بھی بیزار تھا، یہاں تک کہ اس زمانہ میں عقلیت کے قائلین معتزلی سمجھے جاتے تھے، چنانچہ محمد بن الفضل البلخی نے اس کے نام پر جو کتاب الاعتقاد لکھ کر معنون کی تھی، اس میں لکھا تھا :-

من قال ان العقل افضل من العلم فهو معتزلی[۲]	جو شخص اس بات کا قائل ہو کہ عقل علم سے افضل ہے تو وہ معتزلی ہے۔

بہرحال محمود نے معتزلہ کی بیخکنی میں بھی کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا، فتح رے کے بعد القادر باللہ عباسی کو جو فتحنامہ لکھ کر بھیجا تھا، اس میں حسب تصریح روضۃ الصفا، مذکور تھا :-

"معتزلہ کہ در رے اقامت داشتند ہمہ را کوچانیدہ بخراسان فرستادیم"[۳]

احمد بن یحییٰ المرتضیٰ نے "کتاب منیۃ الامل" (باب ذکر المعتزلہ) میں لکھا ہے کہ نیشاپور کے مشاہیر معتزلہ میں سے تین عالم محمود کے حکم سے جلا وطن کیے گئے :-

و منهم ابو الفتح الاصفهانی	عبد الجبار استرآبادی کے شاگردوں میں سے
...... وورد الكتاب من محمود	ابو الفتح الاصفہانی بھی تھا ....
سلطان زمانه بحمل المعتزلة	بادشاہ وقت محمود کا فرمان آیا کہ معتزلہ
الى حضرته بغزنة فحمل من	کو غزنی دارالسلطنت میں بھیجا جائے،
نيسابور ثلثة نفر هو وابو صادق	چنانچہ نیشاپور سے تین فضلاء ابو الفتح
امام مسجد الجامع وابو الحسن	اصفہانی، ابو صادق امام جامع مسجد

---

[۱] روضۃ الصفا جلد ۴ ص ۴۱ [۲] الجواہر المضیۃ جلد ثانی ص ۱۱۱ [۳] روضۃ الصفا جلد ۴ ص ۴۰

الصابری المعروف بسیبویہ لعلمہ بالنحو فبعث بھم الی قصدار فماتوا ھنالک[1]

اور ابوالحسن الصابری جو علم نحو کے سیبویہ کہلاتے تھے بھیجے گئے، انہیں قصدار بھیجا گیا، جہاں تینوں نے وفات پائی،

قاضی عبدالجبار کے اثر سے رے میں اعتزال کی بڑی گرم بازاری تھی، اور وہاں کے کتب خانہ میں اس مذہب کی بے شمار کتابیں تھیں، مگر محمود نے سب کو جلوا دیا، روضۃ الصفا میں ہے:

"درخانۂ مجدالدولہ کتب بسیار بود، آنچہ مشتمل بود بر سخنان حکما و اہل اعتزال بموجب فرمان سوختہ گشت و باقی را بخراسان بردند"[2]

رہا فلسفہ تو وہ باطنیت و قرمطیت کا شعار تھا، جو محض ایک علمی تحریک نہیں، بلکہ ایک خطرناک انقلابی اور نزاجی تحریک تھی، لہٰذا اس کے استیصال میں اس نے جو کچھ کیا حزم و احتیاط کا عین مقتضا تھا، مگر محمود کی سیاسی فتوحات بالخصوص اس کے ہندوستانی حملوں نے باطنی انقلاب پسندوں کی دسیسہ کاریوں پر پردہ ڈال رکھا ہے، ورنہ یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان پر اس کا حملہ ہوس ملک گیری سے زیادہ حزم و احتیاط کا نتیجہ تھا، وہ قرامطہ کی سازشوں کو بردئے کار آنے سے پہلے ہی ان کا قلع قمع کر دینا چاہتا تھا، یہ اسی حزم و احتیاط کا نتیجہ تھا کہ اس نے فردوسی کی جگہ کا دی کا صلہ نہیں دیا، البیرونی کی قدر و منزلت نہ کی، اور شیخ بو علی سینا اس سے بھاگتا پھرا،

اسی طرح محمود کو نجوم و ہیئت سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی، حالانکہ اس زمانہ میں خراسان سے لے کر مصر و مغرب تک تمام معاصر حکمراں ان فنون کی ترقی میں بیش از بیش کوشاں تھے، محمود کی نجوم سے بے اعتنائی کا اندازہ حسب ذیل حکایت سے ہو سکتا ہے، جو عوفی نے "جامع الحکایات" میں نقل کی ہے:

سلطان محمود بن سبکتگین انار اللہ برہانہ کے دربار میں بیسیوں ایسے مشہور منجم جمع تھے جو اس زمانہ

---

[1] باب ذکر المعتزلہ مرتبہ آرنلڈ ص ۷۰، [2] روضۃ الصفا ج ۴ ص ۷۰

میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے، مگر سلطان کسی معاملے میں ان کی رائے نہ لیتا تھا، ایک مرتبہ کسی منہ لگے مصاحب نے دریافت کیا کہ علم نجوم کے اتنے بڑے بڑے استاد حضور کے پاس جمع ہیں، مگر کبھی آپ ان سے کوئی بات نہیں پوچھتے پھر ان کی موجودگی کا کیا فائدہ؟ سلطان نے جواب دیا:

..... میرے معاملات کی بنیاد دو باتوں پر ہے، خدا پر توکل اور شریعت کا فتویٰ ۔[۱]

اس نجوم بیزاری ہی کا نتیجہ تھا کہ البیرونی کو صحیح پیشین گوئی کرنے پر بجائے انعام دینے کے قید خانہ بھیجدیا، نجوم کے علاوہ ہیئت کو بھی وہ الحاد و بیدینی سمجھتا تھا، چنانچہ یاقوت نے لکھا ہے :-

انہ ورد علیہ رسول من اقصی	ترکستان کی (شمالی) سرحد سے ایک سفیر
بلاد الترک وحدث بین یدیہ	محمود کے دربار میں آیا اور جو کچھ اس نے سمندر
مما شاهد فیما وراء البحر نحو القطب	کے اس جانب قطب جنوبی (قطب شمالی)
الجنوبی من دوس الشمس علیہ	کی طرف دیکھا تھا، محمود کے سامنے بیان
ظاهرة فی کل دورها فوق	کیا کہ سورج چھ مہینے تک، اپنے پورے
الارض بحیث یبطل اللیل	دور میں زمین کے اوپر یدیں طور رہتا ہے،
فسارع علی عادتہ فی التشدد	کہ رات ہوتی ہی نہیں، یہ سنکر محمود نے جیسا کہ
فی الدین الی نسبۃ الرجل الی	تصلب فی الدین کی اسے عادت تھی، اس
الالحاد والقرمطۃ ۔[۲]	قاصد پر الحاد و قرمطیت کا الزام لگایا،

بایں ہمہ اس کا عہد تاریخ اسلام کے عظیم ترین ہیئت داں البیرونی کے ظہور و نبوغ کے لیے مشہور ہے، البیرونی ہندوستان کا باشندہ نہ تھا، اور نہ اس نے یہاں توطن اختیار کیا تھا، وہ یہاں محمود کے ہمراہ آیا جایا کرتا تھا، اسی سیر و سفر کے دوران میں اس نے ہندؤوں کے علوم کی تحصیل یہاں کے

---

[۱] جامع الحکایات، اردو ترجمہ جلد دوم ص ۱۰۷ - ۱۰۸ [۲] معجم الادباء، جلد سادس ص ۳۱۰

پنڈ توں سے کی، اس کے علاوہ ہندوستان کے متعدد شہروں کے عرض البلد دریافت کیے، چنانچہ لکھتا ہے کہ

"میں نے خود قلعہ لاہور کے عرض البلد کی پیمائش کی تو ۳۴° ۱۰ دقیقہ پایا...... دوسرے عرض البلد جو میں نے دریافت کیے وہ یہ ہیں: لمغان ۳۴° ۴۳ دقیقہ، پیشاور ۳۴° ۴۴، ویہند ۳۴° ۳۰، جیلم ۳۳° ۲۰، قلعہ نندنہ ۳۲° ۰۵، سیالکوٹ ۳۲° ۵۸، مندککور ۳۱° ۵۰، ملتان ۲۹° ۴۰" [1]

لیکن البیرونی کے قیام ہندوستان کا مشہور علمی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ۱۰۱۸ء کے قریب سندھ میں سمندر کے نزدیک محیط ارضی کی پیمائش کی جو ہندوستان کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ تھا، اس سے پہلے وہ دہستان میں اس تجربہ کی کوشش کر چکا تھا، مگر کامیابی نہیں ہوئی، چنانچہ قانون مسعودی میں لکھتا ہے۔

وعلى شدة حرصي ان اتولى	مجھے اس (محیط ارضی کی پیمائش) کی تحصیل کا
الاعتبار واختبار له	بیحد شوق تھا، اور میں نے شمالی دہستان میں
فاعاصفصافي شمال دهستان	جو جرجان کا حصہ ہے ایک چورس اور چٹیل
التي بارض جرجان - ثم عجزت	میدان منتخب کیا تھا، مگر وہاں کے تھکا دینے والے
عن المعاونة المتعبة والمعين	بیابانوں نے مجھے عاجز کر دیا، نیز میں اس وجہ سے
الصادق عليه عدلت فيه [2]	ناکام رہا کہ مجھے وہاں کوئی سچا مددگار دستیاب نہ ہو سکا۔

اس ناکام تجربہ کے ذکر کے بعد وہ ہندوستان میں اس کے دوبارہ کرنے اور کامیاب ہونے کا بیان کرتا ہے۔

"جب مجھے سرزمین ہندوستان میں ایک پہاڑ ملا جہاں سے ایک چورس بیابان نظر آتا تھا،

---

[1] کتاب الہند ص ۱۶۳ [2] قانون مسعودی جلد ثانی ص ۵۳

اور یہ بیابان سمندر کی سطح کے مانند مستوی تھا، تو میں نے اس پہاڑ کی چوٹی پر زمین آسمان کے ملنے کی جگہ یعنی دائرہ افق کا قیاس لگایا، اور معلوم کیا کہ وہ خط مشرق و مغرب سے ۳۴ دقیقہ سے ذرا کم ہے، میں نے اسے ۳۴ دقیقہ فرض کیا، اور پھر پہاڑ کی اونچائی دریافت کی، اس کیلیے میں نے ایسے دو مقاموں سے جو اس کے اصل عمود کی سیدھ میں تھے، اس کا ارتفاع ناپا تو ۶۵۲ تہائی ہاتھ[۱] تھا،

اسی طرح کتاب التفہیم میں اموی منجمین کے نہج پر ہندوستان میں محیط ارضی کی دریافت کے تجربے کے اعادے کے سلسلے میں لکھتا ہے :-

وقد اعتبرت اناذلك بارض	میں نے سرزمین ہند پر اس تجربہ کی تصدیق کی تو
الھند فلم یخالف شیٔ یعبابہ	کوئی معتد بہ فرق نہ نکلا۔

بہرحال محیط ارضی کی پیمایش کا یہ پہلا تجربہ تھا جو سرزمین ہند پر کیا گیا، اس سے پہلے دو مرتبہ یہ تجربہ کیا گیا تھا پہلی مرتبہ ایراتوستھنیس نے اسکندریہ میں اور دوسری مرتبہ اموی منجمین نے عراق میں،

محمود کے بعد مسعود تخت نشین ہوا، اس نے بھی باپ کی علم دوستی و ہنر پروری کی روایات کو جاری رکھا، ابن الاثیر لکھتا ہے :

وکان السلطان مسعود شجاعا	سلطان مسعود شجاع، سخی اوصاف حمیدہ
کریما ذافضائل کثیرۃ محبّاً	سے متصف، علماء کو دوست رکھنے والا
للعلماء کثیرالاحسان الیھم	اور ان کے ساتھ نیکی اور احسان کرنے
والتقرب لھم صنفوا لہ التصانیف	والا تھا، علماء نے مختلف علوم و فنون میں
الکثیرۃ فی فنون العلم[۲]	بہت سی تصانیف اسکے نام پر لکھیں۔

لیکن باپ کے برخلاف اس نے علم و حکمت بالخصوص نجوم و ہیئت کی سرپرستی پر خاص توجہ کی، یاقوت لکھتا ہے

---

[۱] قانون مسعودی جلد ثانی ص ۵۳۰ [۲] کامل ابن الاثیر جلد تاسع ص ۱۷۰

اما ابنه السلطان مسعود فقد كان فيه اقبال على علم النجوم ومحبة لحقائق العلوم[1]	لیکن اس کے بیٹے سلطان مسعود کی علم نجوم پر خاص توجہ تھی، اور حقائق علوم سے اس کو محبت تھی،

محمود کو فلسفہ کی کتابوں سے اتنا بغض تھا کہ رے کی فتح کے موقع پر انھیں جلوا دیا تھا، مگر جب ابوسہل حمدونی نے شیخ بو علی سینا کا کتبخانہ لوٹا تو مسعود نے اسے شاہی کتبخانہ میں داخل کرا دیا، ابن الاثیر لکھتا ہے:-

وكان ابو علي سينا في خدمة علاء الدولة فاخذت كتبه وحملت الى غزنة فجعلت في خزائن كتبها[2]	بو علی سینا علاء الدولہ کے دربار میں تھا، لہذا اس کی کتابیں بھی لٹ کر غزنی آئیں جہاں شاہی کتبخانہ میں داخل کی گئیں۔

مسعود ہی کے نام پر البیرونی نے "قانون مسعودی" معنون کی جس کے صلے میں اس نے ہاتھی کے وزن برابر چاندی دینا چاہی، مگر البیرونی کی سیر چشمی نے اسے قبول نہ کیا[3] مسعود کے بعد مودود تخت پر بیٹھا جس کے نام پر اس نے "الجماہر فی الجواہر" اور "کتاب الدستور" معنون کیں،[4]

پانچویں صدی ہجری کے وسط سے لاہور اسلامی ثقافت کا مرکز بن گیا تھا، اور بعد میں تو غزنوی سلاطین (خسرو شاہ اور خسرو ملک) کا دار السلطنت ہی رہا، اس لیے یہاں کا دیوان کتابت غزنی اور دیگر ممالک ایران کے دفاتر کے نمونے پر قائم ہوا تھا، جہاں کُتّاب علوم ادبیہ کے ساتھ علوم دینیہ اور علوم عقلیہ میں بھی دستگاہ رکھتے تھے چنانچہ عبداللہ ابن المقفع جو منصور کے عہد کا کاتب تھا، ارسطاطالیسی منطق کا پہلا مترجم تھا، بویہی خاندان کا وزیر ابن العمید منطق و حکمت اور ریاضی و ہیئت میں سرآمد فضلائے روزگار تھا، انھیں فضلائے نامدار کے اخلاف لاہور کے دیوان کتابت میں عہدہ دار تھے، اس لیے یقیناً یہ بھی فلسفہ و حکمت میں تبحر رکھتے ہونگے، پھر شروع زمانہ کے کُتّاب خراسان سے تعلیم مکمل کر کے آئے ہوں گے مگر بعد میں ان کی تعلیم کا انتظام یہیں ہوا ہوگا۔

---

[1] معجم الادباء جلد سادس ص ۳۱۰ [2] کامل لابن الاثیر جلد ۹ ص ۱۷۷ [3] [4] معجم الادباء سادس ص ۳۰۹ - ۳۱۰

غرض پانچویں صدی کے وسط سے مدارس لاہور کے نصاب میں فلسفہ و ہیئت متداول تھے کیونکہ مسعود سعد سلمان جو لاہور میں پیدا ہوا تھا، اور جس نے یہیں تعلیم پائی تھی، ۴۶۹ھ میں ابو القاسم سیف الدولہ محمود کے نائب امیر ہندوستان بنائے جانے کی تہنیت میں کہتا ہے:۔

منجماں ہمہ گفتند کایں دلیل کند	بحکم زیج بنانی کہست در تقویم
کہ دیر و زود خطیباں کنند بر منبر	بنام سیف دول خطبہائے ہفت اقلیم
بسال پنجہ ایں پیش گفت بو ریحاں	دراں کتاب کہ کردہ است نام او تفہیم
کہ پادشاہے صاحب قراں شود پیدا	چو سال ہجرت بگذشت ۴۶۹ ونے وسین وتجیم

ظاہر ہے "زیج البتانی" اور "کتاب التفہیم" اور ان کے مضامین کا بے تکلف ذکر وہی لوگ کر سکتے ہیں جو نجوم و ہیئت کے طالب علم رہے ہوں، مگر مسعود سعد سلمان نجوم کا ماہر خصوصی نہیں تھا، اس فن سے اتنا ہی ادرک رہا ہوگا جتنا اس زمانہ کے عام طلبہ کو، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عہد میں لاہور کے مدارس کے اندر حکمت و معقولات کا معیار خاصہ بلند تھا، اور خراسان کے اندر ابو العباس اللوکری کے نفس گرم کی تاثیر سے فلسفہ و حکمت کی جو اشاعت ہو رہی تھی اس کا اثر اسلامی ہندوستان تک بھی آگیا تھا، مگر اس عہد کا کوئی علمی تذکرہ نہیں ملتا، البتہ عوفی نے غزنویوں کے آخری زمانہ میں لاہور کے اندر ایک فلسفی کی نشاندہی کی ہے جن کا نام یوسف بن محمد دربندی تھا، "لباب الالباب" میں لکھتا ہے:

تقۃ الدین جمال الفلاسفہ یوسف بن محمد الدربندی: بوفور فضائل مشہور و فنون محامد مذکور .....

در دولت خسرو ملک سالہا دیدہ بود ..... کہ از مزارہائے بزرگ در خطہ لاہور تربت اوست[1]"

یوسف بن محمد کے لقب "جمال الفلاسفہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت لاہور میں اور بھی فلاسفہ تھے جن کے گل سرسبد یوسف بن محمد دربندی تھے۔

(باقی)

---

[1] لباب الالباب عوفی جلد اول ص ۱۰۶

عرب میں آباد ہندوستانیوں کو دعوتِ اسلام

از جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

ہم نے معارف کے گذشتہ نمبروں میں عرب و ہند کے تعلقات کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ قدیم زمانہ سے عرب میں ہندوستان کے لوگ آباد تھے، اور عہد رسالت میں ان کی اچھی خاصی تعداد وہاں کے مختلف علاقوں میں موجود تھی، اس لیے عہد رسالت میں جب اسلام کی دعوت عام ہوئی اور اطراف و جوانب میں پھیلی تو عربوں کی طرح غیر عربوں میں بھی اس کی تبلیغ ہوئی، اور ایرانیوں، رومیوں، حبشیوں کی طرح ہندوستانیوں کو بھی اس نعمت سے حصہ ملا، اور یمن، بحرین اور نجد وغیرہ میں رہنے والے ہندوستانی باشندوں نے بھی اسلام قبول کیا، گو اس کی تصریح و تفصیل کتب تواریخ و سیر اور احادیث میں نہیں ملتی ہے مگر جستہ جستہ واقعات اور اشارات سے اس کی نشاندہی ہوتی ہے، ہندوستانیوں میں کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے دعوتِ اسلام پر لبیک نہیں کہا، بلکہ وہ یہود و نصاریٰ اور مجوس کی طرح اپنے آبائی دین پر قائم رہے، اور ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا گیا جو دوسرے غیر مسلموں کے ساتھ کیا گیا،

یہ موضوع بہت اہم اور دلچسپ ہے، مگر افسوس ہے کہ تلاش و جستجو کے باوجود اس پر بہت کم مواد مل سکا، بہرحال جو کچھ بھی ملا ہے اس پر اکتفا کیا جاتا ہے،

جاہلی عربوں اور ہندوؤں میں مذہبی ہم آہنگی اور ہندوؤں کی عربوں کے معبدوں سے عقیدتمندی

جاہلی عربوں اور ہندوستان میں تجارتی، معاشی اور اقتصادی تعلقات کے علاوہ مذہبی اور اعتقادی

تعلقات بھی تھے، اور دونوں ملکوں میں اس اعتبار سے بھی ہم آہنگی تھی کہ اصنام پرستی، مظاہر پرستی، اور کواکب پرستی دونوں میں عام تھی، عرب کے ہندوستانی اسی اشتراک عقیدہ کی بنا پر عربوں میں بڑی آسانی سے کھپ جاتے تھے، جو ان ہی کی طرح کے عقائد و خیالات کے حامل تھے،

علامہ عبدالکریم شہرستانی نے کتاب الملل والنحل کے مقدمہ میں لکھا ہے:۔

ان العرب والهند يتقاربان	عرب اور ہند دونوں کا مذہب قریب
على مذهب واحد، واكثر	قریب یکساں ہے، ان دونوں میں سے
ميلهم الى تقرير خواص الاشياء	اکثروں کا رجحان اشیاء کے خواص کے
والحكم باحكام الماهيات والحقائق	ثبوت اور ماہیات و حقائق کے احکام
واستعمال الامور الروحانية[1]	پر چلنے اور روحانیات کے استعمال کرنے کی طرف ہے۔

اسی بات کو دوسری جلد میں "آراء العرب فی الجاہلیۃ" کے ماتحت لکھا ہے:۔

قد ذكرنا في صدر الكتاب	ہم نے کتاب کے شروع میں ذکر کیا ہے کہ
ان العرب والهند يتقاربان	عرب اور ہند دونوں کا مذہب قریب
على مذهب واحد واجملنا	قریب یکساں ہے اور وہاں اجمالاً بتایا ہے
القول فيه حيث كانت	کہ دونوں قوموں کا مذہبی میل جول صرف
المقارنة بين الامتين	اشیاء کے خواص اور ماہیات کے احکام کے
مقصورة على اعتبار خواص	اعتبار و حکم تک ہے اور دونوں پر فطرت
الاشياء والحكم باحكام الماهيات	وطبیعت کا غلبہ ہے۔
والغالب عليهم الفطرة والطبع[2]	

[1] کتاب الملل والنحل طبع قدیم مصر ج ۱ ص ۲-۳ [2] ایضاً ج ۲ ص ۱۰۲

ابتدا میں ہند و عرب کی مذہبی نوعیت یہی تھی، مگر بعد میں دونوں قوموں میں بت پرستی اور ہیکل پرستی کا رواج ہوگیا، اور وہ بت پرست قوموں میں شامل ہوگئیں، دنیا کی بت پرست قوموں کے سات بڑے بڑے ہیاکل (بت خانے) تھے، جو سبع سیارہ کے نام سے موسوم تھے، مسعودی نے ان کی تفصیل یہ بیان کی ہے (۱) مکہ میں کعبہ زحل ستارہ کا ہیکل مان لیا گیا تھا (۲) ہیکل اصفہان، یہ مجوس کا آتشکدہ تھا (۳) ہندوستان میں سومنات (۴) بلخ میں نوبہار (۵) صنعاء یمن میں زہرا ستارہ کے نام کا بیت غمدان (۶) فرغانہ میں آفتاب کا ہیکل اور (۷) چین کا ہیکل[1]، شہرستانی نے دنیا کے ان سات بتخانوں کے نام شمار کراتے ہوئے ان کو ہند اور عرب میں مشترک بتایا ہے اور لکھا ہے:

واما بیوت الاصنام التی کانت	عرب اور ہندوستان کے مشہور
للعرب والھند فھی البیوت	بت خانے سات ہیں جو سات ستاروں
السبعة المعروفة المبنیة علی	کے نام پر بنے ہوئے ہیں،
السبع الکواکب	

(۱) بیت فارس، جبل اصفہان پر (۲) بت خانہ ملتان (۳) بت خانہ سومنات، (۴) نوبہار بلخ (۵) بیت غمدان، صنعاء یمن (۶) بت خانہ فرغانہ، اور (۷) مکہ میں کعبہ جس کے متعلق بعد میں یہ غلط طور پر مشہور کیا گیا کہ وہ زحل ستارہ کی مناسبت سے بنایا گیا ہے، حالانکہ نہ اس کے بانی نے اس کو ستاروں کے طوالع پر بنایا تھا، اور نہ اس کا نام بیت زحل رکھا گیا تھا کہ اسے بقا و دوام حاصل ہو، بلکہ کعبہ کو حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے بنایا تھا، مگر عمرو بن لحی نے اپنی تولیت کے زمانہ میں بلقاء (ارض شام) سے پہلی مرتبہ

[1] مروج الذہب ج ۲ ص ۲۳۸ تا ص ۲۴۱ طبع جدید مصر۔

بت لاکر کعبہ میں رکھا اور اس کا رواج ملک شاپور ذی الاکتاف کے زمانہ سے عام ہوا جو زمانۂ اسلام تک جاری رہا، تاآنکہ فتح مکہ میں کعبہ کی تطہیر ہوئی[1]

اس حقیقت کے باوجود بت پرستوں کی ایک جماعت کعبہ کے بارے میں بھی یہی عقیدہ رکھتی تھی کہ وہ زحل ستارے کے نام پر بنایا گیا ہے، اسی لیے اس میں دوام و بقاء کی شان پائی جاتی ہے، مسعودی نے اس جماعت کا خیال نقل کیا ہے:

وقد ذهب قوم الى ان البيت	ایک جماعت کا خیال ہے کہ کعبہ جو ہیکل زحل
الحرام وهو بيت زحل وانما	ہے اور اس لیے وہ مرور ایام کے بعد بھی قائم ہے
طال عندهم بقاء هذا	اور مدت دراز سے ہر زمانہ میں معزز و محترم رہا ہے
البيت على مرور الايام معظم	کیونکہ وہ زحل ستارہ کا ہیکل ہے، اور زحل
فى سائر الاعصار لانه بيت	ہی اس کا متولی و مالک ہے، زحل کے لیے
زحل، وان زحل تولاه،	بقاء و دوام ہے، جو چیز اس کے نام پر ہوگی
ولان زحل من شانه البقاء	اس میں زوال و تغیر نہیں ہوگا، بلکہ
والثبوت، فما كان له فغير	اس کی تعظیم و تکریم ہمیشہ باقی رہے گی،
زائل ولا داثر وعن التعظيم	
غير حائل[2]	

ہندوستان کے ہندو بھی ان ہی بت پرستوں میں تھے، جو کعبہ کو زحل ستارہ کا ہیکل مان کر اس کی تعظیم و تکریم کے قائل تھے، بلکہ وہ عرب کے بعض دوسرے بت خانوں کا بھی احترام کرتے تھے، اور ہندوستان کے لوگوں اور یہاں کی چیزوں کو عرب کے معبدوں سے کسی نہ کسی رنگ میں علاقہ

---

[1] الملل و النحل ج ۲ ص ۱۰۷ و ۱۰۸۔ [2] مروج الذہب ج ۲ ص ۲۳۶ طبع جدید مصر

دیا ہے، چنانچہ سیرت ابن ہشام میں ہے کہ جب عبد المطلب نے چاہ زمزم کو دوبارہ کھودا، تو اس کے اندر سے سونے کے دو ہرن ملے جو قبیلہ بنو جرہم کے تھے،

ووجد فیھا أسیافا قلعیة	نیز اس میں انھوں نے کلہ کی تلواریں
وأدراعاً[1]	اور زرہیں پائیں،

اس سامان کے بارہ میں قریش نے عبد المطلب سے جھگڑا کرکے اپنا استحقاق ظاہر کیا، اور جب قرعہ اندازی ہوئی تو یہ تلواریں اور زرہیں عبد المطلب کے حصہ میں آئیں اور تلواروں سے انھوں نے کعبہ کا دروازہ بنایا۔

یہ اسیاف قلعیہ وہ ہندی تلواریں ہیں جو یہاں کے شہر کلہ میں بنائی جاتی تھیں، مشہور سیاح ابودلف مسعر بن مہلہل ینبوعی کلہ کے متعلق لکھتا ہے:۔

وفیھا قلعة عظیمة فیھا	اس شہر میں بہت بڑا قلعہ ہے، جس میں
معدن الرصاص القلعی	رانگے کی کان ہے، اور یہ صرف اسی قلعہ میں
لا یکون الا فی قلعتھا وفی	ہوتا ہے، اور اسی قلعہ کے اندر قلعی تلواریں
ھذہ القلعة تضرب السیوف	بنائی جاتی ہیں، جو اعلیٰ قسم کی ہندی
القلعیة وھی الھندیة العتیقة[2]	تلواریں ہوتی ہیں،

مشہور شاعر فرزدق نے آل مہلب کی تعریف کے ضمن میں قلعیہ یعنی کلہ کی بنی ہوئی ہندوستانی تلواروں کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:

متقلدی قلعیة وصوارم	ھندیة وقدیمة الآثار

وہ لوگ قلعی تلواریں اور قدیم ہندوستانی شمشیر براں اپنی کمر سے باندھے ہوئے ہیں،

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۴۶ [2] یہ سیاح ۳۳۱ھ میں موجود تھا، اس نے بخارا سے چین تک کا سفر کیا تھا، اسکے سفرنامہ کا اکثر حصہ یاقوت حموی نے معجم البلدان میں چین کے ذکر میں نقل کردیا ہے، ملاحظہ ہو معجم البلدان ج ۵ ص ۴۵۱

اس روایت سے اگرچہ یہ پتہ نہیں چلتا کہ کیا ہندوستانی تلواروں کو یہاں کے لوگوں نے کعبہ کی نذر کیا تھا، یا خود عربوں نے ان کو خرید کر وقتاً کعبہ میں رکھا تھا، مگر اتنا تو معلوم ہوتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کو چاہ زمزم کے اندر ہندوستان کی تلواریں ملیں، اور انھوں نے ان کو کعبہ کے دروازے میں استعمال کیا، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک موجود تھا،

کعبہ سے ہندوستانیوں کی قدیم عقیدت وتعلق کا پتہ بعد کے واقعات سے بھی چلتا ہے، چنانچہ خلیفہ مامون کے زمانہ میں تبت اور سندھ کے علاقہ کا ایک راجہ مسلمان ہوا، اس کے پاس انسانی شکل کا سونے کا ایک مرصع بت اور اس کا تخت تھا، اس نے اسلام قبول کرنے کے بعد ان دونوں گرانقدر چیزوں کو کعبہ کی نذر کر دیا، امام ابوالولید محمد بن عبداللہ ازرقی مکی نے تاریخ مکہ میں اس کا تذکرہ نہایت تفصیل سے کیا ہے[۵]

کعبہ کے علاوہ عرب کے دوسرے معبدوں سے بھی ہندوستانیوں کو عقیدت تھی اور وہ ان سے اپنا تعلق ظاہر کرتے تھے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ابرہہ نے صنعاء میں بیت غمدان کے پہلو میں ایک بہت بڑا ہیکل قلیس کے نام سے بنوایا تھا، تاکہ کعبہ کے حجاج کو مکہ سے ہٹا کر اس معبد کو عربوں کی عبادت گاہ قرار دے، قلیس عرب وعجم میں اپنی شان کا واحد معبد تھا، اس کی تعمیر میں جو پتھر استعمال کیے گئے تھے، وہ مارب کے قصر بلقیس کے تھے، اور سبز، سرخ، زرد اور سیاہ قیمتی پتھر اس طرح جوڑے گئے تھے کہ

وفیھا بین کل ساقین خشب ہر دو ستونوں کے درمیان شیشم کی لکڑی

---

[۵] بحوالہ رجال السند والہند ص ۲۹۹

من ساسم مدور الراس	تھی جس کا سر گول تھا، اور جس کی موٹائی
غلظ الخشبة .... حضن الرجل	آدمی کے دونوں ہاتھ کے گھیر کے برابر تھی،
وکان المدخل منه (الباب)	اور باہری دروازہ سے بتخانے کے اندر
الی بیت فی جوفه طوله	جانے کا راستہ ساگوان کی منقش لکڑی
ثمانون ذراعاً فی اربعین	کا بنا ہوا تھا، جو معلق تھا اور اسکی لمبائی
معلق العمل بالساج المنقوش،	اسی ہاتھ اور چوڑائی ۴۰ ہاتھ تھی، اس میں
ومسامیر الذهب والفضة[1]	سونے اور چاندی کی کیلیں لگی تھیں،

آگے چل کر اس کی بناوٹ اور سجاوٹ کے بارے میں لکھا ہے کہ

ودرج المنبر من خشب الساج	منبر کی سیڑھیاں ساگوان کی لکڑی کی تھیں،
ملبسة ذهبا وفضة، وکان	جن پر سونا اور چاندی منڈھا ہوا تھا
فی القبة أو فی البیت خشبة	اور گنبد میں سونے کی زنجیریں آویزاں تھیں،
ساج منقوشة طولها ستون	اور اسی قبہ میں یا اندرونی حصہ میں ساگوان
ذراعا یقال لها کعیب و خشبة	کی ایک منقش لکڑی تھی جس کا طول ساٹھ ہاتھ
من ساج نحوها فی الطول	تھا، اسے کعیب کہتے تھے، اور اتنی ہی لمبی ایک
یقال لها امرأة کعیب کانوا	دوسری ساگوان کی لکڑی تھی جسے کعیب کی
یتبرکون بهما فی الجاهلیة	بیوی کہتے تھے، عرب کے لوگ دور جاہلیت میں
وکان یقال لکعیب الاحوزی	ان دونوں مورتیوں سے برکت حاصل کرتے
والاحوزی بلسانهم الحر[2]	تھے، اور کعیب کا نام انکے یہاں احوزی تھا[2]

ذکر خبر مخبر صادق ازرقی

[1] اخبار مکہ ازرقی طبع مکہ مکرمہ ج ۱ ص ۱۳۴ [2] ایضاً ص ۵۸

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس معبد کی چوب عمارتی تمامتر ہندوستان کی شیشم اور ساگوان کی تھی، اور اس کے دونوں بت یعنی کیعب اور اس کی بیوی ساگوان کی لکڑی سے تراش کر بنائے گئے تھے، عجب نہیں کہ ہندوستان ہی کے بت تراشوں نے کیعب اور اس کی بیوی کی شکل بنائی ہو، کیونکہ ہندوستان اس فن میں قدیم زمانہ سے شہرت رکھتا ہے، اور عرب کے بت پرست اس میں کوئی خاص مہارت نہیں رکھتے تھے،

عرب اور ہندوستان کے مشہور بت اور بتخانے اور ان کی مشترک باتیں

جس طرح ہندوستان میں کواکب پرستی اور ستاروں کے نام پر بتخانوں کا رواج تھا، اسی طرح عرب کے بہت سے قبائل کواکب پرستی کرتے تھے، اور بت خانے بناتے تھے، چنانچہ قاضی صاعد بن احمد اندلسی نے طبقات الامم میں لکھا ہے کہ یہ قبائل ان ستاروں کی پوجا کرتے تھے، بنو حمیر سورج کی، بنو کنانہ چاند کی، بنو تمیم دبران کی، بنو لخم اور بنو جذام مشتری کی، بنو طے سہیل کی، بنو قیس شعریٰ کی، بنو اسد عطارد کی، قریش میں الحاد و بددینی تھی، جسے انھوں نے اہل حیرہ سے لیا تھا، غرض اسلام کی ابتدا میں پورے عرب میں بت پرستی عام تھی، اور بنو تمیم میں مجوسیت تھی، اس قبیلہ کے مشہور مجوسی زرارہ بن حاجب بن زرارہ، اقرع بن حابس اور ابو اسود تھے،[1]

عربوں کی بت پرستی کی تفصیل یہ ہے کہ ان کے بڑے بڑے بت وُدّ، سواع اور یعوق تھے، دومۃ الجندل میں بنو کلب وُدّ کو پوجتے تھے، بنو ہذیل سواع کو پوجتے تھے، اہل یمن اور بنو مذحج کا بت یغوث تھا، یمن کا قبیلہ بنو ہمدان یعوق کی پرستش کرتا تھا، حمیر کے ذوالکلاع نسر کی پوجا کرتے تھے، طائف کے بنو ثقیف کا بت لات تھا، مکہ میں قریش کا بت عزیٰ تھا، بنو کنانہ اور بنو سلیم کے کچھ لوگ بھی عزیٰ کو پوجتے تھے، مدینہ میں اوس، خزرج اور غطفان کا بت

---

[1] طبقات الامم ص ۷۰ طبع قدیم

بنات تھا، عرب کے بتوں میں ہبل سب سے بڑا بت تھا، اس لیے اس کا مقام کعبہ کی چھت پر تھا، اساف اور نائلہ دو بت صفا اور مروہ پر تھے، اور اس طرح ان کو عمرو بن لحی نے کعبہ کے سامنے نصب کیا تھا۔[1]

ہندوستان اور سندھ کے جن ساحلی مقامات سے عربوں کو قدیم تعلق تھا، اور جہاں کے لوگ عرب میں آتے جاتے تھے، یا وہاں آباد ہوگئے تھے، ان مقامات میں بڑے بڑے بتخانے تھے، اور ان کے بارے میں الگ الگ عقائد و تصورات تھے، ابن ندیم نے کتاب الفہرست میں ہندوستان کے ان ساحلی بت خانوں کے یہ نام دیے ہیں:۔ (۱) مانکیر (منگرور) کا بتخانہ اس میں بیس ہزار بت تھے، اور اس کی عمارت ایک فرسخ کی لمبائی چوڑائی میں تھی، لوگ دور دور سے آکر یہاں قربانی اور نذریں پیش کرتے بلکہ جان تک چڑھاتے تھے، (۲) ملتان کا بت خانہ جو سبعہ ہیاکل میں سے ایک تھا، یہاں ہندوستان بھر سے پجاری آکر قربانیاں، بخور اور نیازیں چڑھاتے تھے (۳) بامیان کا بت خانہ (۴) قمار (راس کماری) کا بتخانہ صنف (ہند اور چین کے درمیانی شہر) کا بت خانہ وغیرہ،[2]

اس سے دونوں ملکوں کی کواکب و اصنام پرستی اور ان میں ہیکلوں کی کثرت کا پتہ چلتا ہے۔

عرب کے عام ہندو صائبہ اور کچھ مجوس شمار کیے جاتے تھے

شہرستانی نے الملل والنحل میں "آراء الہند" کے ماتحت لکھا ہے کہ ہندوستان میں مختلف مذاہب اور بہت سے فرقے اور جماعتیں ہیں، مگر یہاں کے جمہور صائبہ کے مذہب پر ہیں اور کواکب پرستی ان کا مذہب ہے، البتہ ان کے طریقے جدا جدا ہیں،

ہندوستان کے اکثر باشندے صائبہ اور | وا کثرهم على مذهب الصائبة

[1] الملل والنحل شہرستانی ج ۲ ص ۱۰۹ طبع قدیم [2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب الفہرست ص ۴۸۶، ۴۸۵

ومناهجها فمن قائل بالروحانيات	اس کے طریقوں پر ہیں، ان میں بعض روحانیات
ومن قائل بالهياكل، ومن قائل	کے قائل ہیں، بعض ہیکلوں کے قائل ہیں،
بالاصنام، الا انهم مختلفون	اور بعض بتوں کے قائل ہیں، البتہ یہ سب
فی شکل المسالك التی ابتدعوها	اپنے اپنے مذہبی طریقوں اور شکلوں میں
وکیفیة اشکال وضعوها[1]	جن کو انھوں نے ایجاد کیا مختلف ہیں،

علامہ ابن صاعد اندلسیؒ نے بھی جمہور اہل ہند کو صابئہ ہی بتایا ہے، وہ لکھتے ہیں: -

واما الصابئة وهم جمهور الهند	ہندوستان کے جمہور اور اسکی اکثریت عالم
ومعظمها فانها تقول بازل	کی ازلیت کی قائل ہے اور یہ کہ عالم علۃ العلل
العالم، وانه معلول بذات	یعنی ذات باری تعالیٰ سے معلول ہے،
علة العلل التی هی البارى	یہ لوگ کواکب کی تعظیم کرتے ہیں اور اپنے
عز وجل وتعظم الکواکب	تخیل کے مطابق انکی صورتیں بناتے ہیں
وتصور لها صورا تمثلها	اور اپنی فہم کے مطابق ہر ستارہ کی طبیعت
وتتقرب اليها بانواع القرابين	کے مناسب طرح طرح کی قربانیاں دیتے
على حسب ما علموا من طبيعة	ہیں، تاکہ اس کے ذریعہ ان ستاروں سے
کل کوکب منها ليستجلبوا بذلك	قوت حاصل کرکے اس دنیا میں ان کے
قواها، ويصرفوا في العالم السفلى	تاثیرات کو کام میں لائیں، اور ستاروں کی
على اختيارهم تدابيرها، ويسمون	ان مثالی صورتوں میں ہر ایک صورت
کل صورة من هذه الصور بدا[2]	کو بت کہتے ہیں،

---

[1] الملل والنحل ج ۲ ص ۱۱۵ [2] طبقات الامم ص ۱۵

صابیہ کے علاوہ ہندوستان میں ایک اور فرقہ تھا، جو مذہب ثنویہ کی طرف مائل اور ملت ابراہیمی کا قائل تھا، الملل والنحل میں ہے :-

و منھم من یمیل الی مذھب	ہندوستانیوں میں سے بعض مذہب ثنویہ
الثنویۃ و یقول بملۃ	کی طرف مائل ہیں، یہ لوگ حضرت ابراہیم
ابراھیم علیہ السلام[1]	علیہ السلام کے دین کے قائل ہیں،[2]

یہ ثنویت مجوس کا بنیادی عقیدہ ہے، اور نور و ظلمت کے فلسفہ پر اس کا دار و مدار ہے،

ثم الثنویۃ اختصت بالمجوس	ثنویت مجوسیوں کے ساتھ مخصوص ہے
حتی اثبتوا اصلین اثنین	اور وہ دو اصلوں کو قدیم اور مدبر
مدبرین قدیمین یقتسمان	مانتے ہیں جو خیر و شر، نفع و نقصان اور
الخیر والشر والنفع والضر	صلاح و فساد میں منقسم ہیں، ان میں سے
والصلاح والفساد ویسمون	ایک اصل کو نور اور دوسرے اصل
احدھما النور والثانی الظلمۃ و	کو ظلمت کہتے ہیں، اور فارسی میں انکو
بالفارسیۃ یزدان، واھرمن[3]	یزدان اور اہرمن سے یاد کرتے ہیں۔

اس کے بعد شہرستانی نے ہندوستان کے فرقہ ثنویہ یا مجوس کا تذکرہ کیا ہے، نیز مجوسیوں کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ان کی ایک شاخ زرداشتیہ ہے، جس کا خیال ہے کہ ہمارے یہاں بھی انبیاء اور ملوک ہوئے، اور پہلا بادشاہ کیومرث تھا، جسے پورے روئے زمین کی بادشاہت حاصل تھی، اس کا مرکزی مقام اصطخر تھا، اس کے بعد اوشہنج بن فراول بادشاہ ہوا، جس نے ہندوستان جاکر مجوسیت کی تبلیغ کی تھی،

---

[1] الملل والنحل ج ۲ ص ۱۱ [2] یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا، بلکہ "براہمیت" اور "برہمنیت" میں اشتباہ کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ [3] الملل والنحل ج ۱ ص ۱۳۸، ۱۳۷

ونزل الھند وکانت له	یہ بادشاہ ہندوستان گیا اور اپنے
دعوة ثمة[1]	مذہب کی دعوت دی،

ہندوستان کے ان مجوسیوں کے پیشواؤں کو عرب ہرابذ کہتے تھے، یہ ان کے آتشکدہ کے منتظم اور ذمہ دار ہوتے تھے۔ لسان العرب میں ہے:۔

الھربذ بالکسر ی واحد	ہربذ ہرابذہ کا واحد ہے اور ہندوستان
الھرابذة، المجوس، وھم	کے آتشکدہ کے پجاری اور منتظم ہوتے ہیں،
قومة بیت النار التی فی	یہ لفظ فارسی ہے اور معرب کیا گیا ہے
الھند، فارسی معرب	اور ایک قول ہے کہ ہرابذہ ہندستان
وقیل عظماء الھند[2]	کے بڑے لوگوں کو کہتے ہیں۔

ہندوستان کے یہ ثنویہ عربوں میں بہت بعد تک مجوس ہی کے نام سے مشہور تھے، چنانچہ بزرگ بن شہریار ناخدا رامہرمزی نے عجائب الھند میں ابوالزہر برخستی ناخدا کے متعلق لکھا ہے کہ وہ پہلے ہندوستان کے مذہب پر مجوسی تھا، پھر مسلمان ہو گیا۔

کان من عظماء سیراف، وکان	(یہ سیراف کے بڑے لوگوں میں تھا) ہندوستانیوں کے مذہب پر مجوسی تھا
مجوسیا علی دین الھند، وکان	اور اپنی قوم میں بڑا امانتدار مانا جاتا تھا
عندھم امینا یقبلون قوله	لوگ اس کی بات کو مانتے تھے اور اپنا مال
ویستودعونه اموالھم	اور اپنی اولاد اس کے یہاں امانت رکھتے
واولادھم فاسلم وحسن	تھے، بعد میں وہ اسلام لایا اور پکا
اسلامه[3]	مسلمان بن گیا،

---

[1] الملل والنحل ج ۱ ص ۱۰۲ [2] لسان العرب ج ۳ ص ۵۱۰ [3] رجال السند والهند ص ۲۴

ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں موجود ہندوؤں کو زمانۂ اسلام میں فرقۂ صابئہ اور مجوس میں شمار کیا گیا، اور ان کے اسلام نہ قبول کرنے کی صورت میں ان کے ساتھ عہد رسالت اور عہد صحابہ میں وہی معاملہ کیا گیا جو بحرین، عمان، ہجر، خط اور یمن وغیرہ میں آباد عجمیوں اور مجوس و صابئہ کے ساتھ کیا گیا تھا، جیسا کہ معلوم ہوگا۔

عرب کے ہنود اور دعوتِ اسلام جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ ہندوستان کے لوگ عرب میں یوں تو اکثر مقامات میں موجود تھے، اور حضری اور بدوی دونوں قسم کی زندگی بسر کرتے تھے، مگر عرب کے سواحل میں خلیج عربی سے لیکر یمن کے اطراف تک میں خاص طور سے بکثرت تھے، ان میں سے کچھ تو تجارتی کاروبار کرتے تھے، کچھ ایرانیوں کے ماتحت سیاست و حکومت کے کاموں میں دخیل تھے، اور کچھ آزاد زندگی بسر کر کے اپنا ذریعۂ معاش تلاش کرتے تھے۔

عرب کے ان مشرقی اور جنوبی سواحل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر زمانہ میں اسلام کی دعوت عام فرمائی، جہاں اساورہ، ان کی اولاد، ابنائے یمن، سیابجہ اور زط عام طور پر موجود تھے، اس لیے یہاں کے مشرک اور مجوس عربوں کی طرح بہت سے یہ عجمی باشندے بھی اسلام لائے، جن میں ایرانی، ہندی، سندھی اور حبشی وغیرہ سب ہی شامل تھے۔

یمن میں دعوتِ اسلام اور وہاں کے ہندوستانی عرب کے ان عجمیوں میں ہماری تحقیق میں سب سے پہلے یمن کے علاقہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ اسلام عام ہوئی اور یہاں کے عربی باشندوں کی طرح عجمی باشندے بھی مسلمان ہوئے، یمن کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے کہ کسریٰ نوشیرواں کے وقت میں یہاں پر سندھیوں کی بڑی تعداد موجود تھی، ان کی قوت و شوکت کا حال یہ تھا کہ جب حبشیوں نے یمن پر قبضہ کیا تو نوشیرواں نے وہاں کے عرب حاکم سیف بن ذی یزن سے دریافت کیا کہ

الی الاغربۃ الحبشۃ اہد المسند[۱]	کن اجنبی لوگوں نے قبضہ کیا ہو حبشی یا سندھی؟

بعد میں اسی یمن کے ایرانی حاکم حضرت باذان رضی اللہ عنہ سنہ ۶ھ یا سنہ ۷ھ نبوی میں اسلام لائے، سیرت ابن ہشام میں ہے کہ یمن پر کسریٰ کے قبضہ کے بعد پہلا ایرانی حاکم وہرز ہوا، پھر اس کا بیٹا مرزبان، پھر اس کا بیٹا تینجان، پھر اس کے بیٹے[۱] کو کسریٰ نے یمن کی حکومت دی، مگر بعد میں اسے معزول کر کے باذان کو حاکم بنایا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک وہاں کا حاکم رہا، چنانچہ جب کسریٰ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر ہوئی تو اس نے باذان کو لکھا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ مکہ میں قریش کے ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے، لہٰذا تم اس کے پاس جاؤ اور اس دعویٰ سے اس کو باز رکھنے کی کوشش کرو، اگر وہ توبہ کرے تو خیر ورنہ اس کا سر قلم کر کے میرے پاس بھیج دو، باذان نے خود جانے کے بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کسریٰ کا یہ خط بھیج دیا، آپ نے باذان کو جواب میں تحریر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ کسریٰ فلاں مہینے کی فلاں تاریخ کو قتل کر دیا جائیگا، جب باذان کے پاس یہ نامۂ نبوی آیا تو اس نے صورت حال کے انتظار میں اس کو روک رکھا کہ اگر یہ شخص نبی برحق ہوگا تو اس کی بات سچ ہو کر رہے گی، اور ایسا ہی ہوا کہ رسول اللہ نے جس دن کسریٰ کے قتل ہونے کی خبر دی تھی، اسی دن اس کے لڑکے شیرویہ نے اس کا کام تمام کر دیا۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں کسریٰ کے قتل کی تاریخ شب دوشنبہ ۱۰ جمادی الاخریٰ سنہ ۷ھ بتائی ہے۔[۲] باذان یہ معجزہ دیکھکر اپنے ساتھیوں سمیت مسلمان ہوگیا۔

فلما بلغ ذلک باذان بعث باسلامہ	جب باذان کو کسریٰ کے قتل کی خبر پہنچی تو

---

[۱] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۴۳ وکتاب التیجان ص ۳۰۴ و تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۱۶ [۲] فتح الباری ج ۸ ص ۱۰۴

واسلام من معه من الفرس	انھوں نے اپنے اور اپنے ساتھی ایرانیوں
الیٰ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم	کے مسلمان ہونے کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
فقالت الرسل من الفرس لرسول اللّٰہ	کی خدمت میں بھیجدی، اور ان ایرانی
صلی اللّٰہ علیہ وسلم الی من نحن	قاصدوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
یا رسول اللّٰہ قال انتم منا	سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہمارا شمار کن
والینا اھل البیت[۱]	لوگوں میں ہوتا ہے، آپ نے فرمایا تم لوگ ہمارے
	اہل بیت میں شمار کئے جاؤ گے۔

کتاب السیرۃ المحمدیۃ والطریقۃ الاحمدیہ میں ہے کہ جب باذان کے پاس کسریٰ کے مرنے کی خبر آئی تو وہ بیمار تھے۔ ان کے اساورہ نے جمع ہو کر دریافت کیا کہ کسریٰ کے قتل ہو جانے کے بعد اب ہم کس کو اپنا امیر و حاکم بنائیں۔ انھوں نے ان کو اسلام قبول کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا مشورہ دیا۔

فاجتمعت لہ اساورتہ فقال	اساورہ نے ان کے پاس جمع ہو کر کہا کہ
من نومر علینا؟ فقال اتبعوا	اب ہم کس کو اپنا امیر بنائیں تو انھوں نے
ھذا الرجل وادخلوا فی دینہ	مشورہ دیا کہ اس آدمی (رسول اللہ) کی اتباع
واسلموا[۲]	کرو اور انکے دین میں داخل ہو کر مسلمان ہو جاؤ۔

حضرت باذان رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی اساورہ، شاہ ایران کے گماشتے تھے، اگر جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے، شاہان ایران کی فوج میں ہندوستان کے جاٹ اور مید بھی شامل تھے۔ اور ہندوستان کے فوجی سواروں کو بھی اساورہ کہا جاتا تھا جو بڑی تعداد میں ایرانی اساورہ کیسا

[۱] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۶۹ [۲] سیرت محمدیہ فی ذکر کتابہ صلی اللہ علیہ وسلم الی پرویز بن ہرمز بن انوشیروان طبع ہند

عرب میں پائے جاتے تھے، اس لیے حضرت باذانؓ اور دوسرے مسلمان ہونے والے اساورہ کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ایرانی تھے یا ہندوستانی یا دونوں تھے، بعض قرائن سے حضرت باذانؓ کا ہندوستانی ہونا معلوم ہوتا ہے، چنانچہ علامہ ذہبی نے تجرید اسماء الصحابہ میں ان کا ذکر تین نسبتوں سے کیا: (۱) باذان الفارسی (۲) باذان ملک الہند (۳) باذان ملک الیمن، ان تینوں ناموں میں باذان سے مراد یہی حضرت باذانؓ ہیں، جنھوں نے کسریٰ کے قتل ہونے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے اور اساورہ کے اسلام لانے کی خبر بھیجی تھی، ان کے تذکرہ میں ہے کہ

(۱) باذان الفارسی، یمن کے ابناء میں سے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں اسلام لائے، وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اسود عنسی کے قتل میں حصہ لیا، ابن اثیر سے ہے کہ

(۲) باذان ملك الهند، ذكره	باذان ملک الہند کے تذکرہ میں ابن مفرز
ابن مفرز قال لما قتل كسرىٰ	نے لکھا ہے کہ جب کسریٰ قتل کر دیا گیا تو
بعث باذان باسلامه و	انھوں نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے
اسلام من معه الى رسول الله	اسلام کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
صلى الله عليه وسلم حكاه ابن هشام	خدمت میں بھیجی جیسا کہ ابن ہشام کا بیان ہے

(۳) پھر لکھا ہے کہ باذان ملک الیمن کا تذکرہ واقدی نے سبا کے اسلام لانے والوں میں کیا ہے میرا خیال ہے کہ یہ وہی باذان ہیں جنھوں نے اسود عنسی کے قتل میں کام کیا ہے۔[۱]

ان تینوں ناموں میں اس طرح تطبیق دی جا سکتی ہے کہ حضرت باذانؓ تینوں نسبتوں سے

لہ تجرید اسماء الصحابہ ج ۱ ص ۵۴ طبع حیدر آباد۔

تاریخ میں متعارف ہیں، فارسی اس لیے کہلاتے ہیں کہ فارس کے رہنے والے تھے، کامل ابن اثیر
سے[1] معلوم ہوتا ہے کہ حضرت باذانؓ کا خاندان خراسان کے شہر مرو الروز کا تھا، چنانچہ عہد عثمانی میں
۳۱ھ میں جب حضرت احنف بن قیسؓ نے خراسان کو فتح کر کے مرو الروز پر فوج کشی کی تو
وہاں کے ایرانی حاکم نے جو حضرت باذانؓ کا قرابتدار تھا، صلح کر لی، اور اس قرابت کو صلح
کے لیے بہانہ بنایا۔

وکان مرزبانها من اقارب	مرو الروز کا حاکم باذان صاحب یمن
باذان صاحب الیمن فکتب	کے رشتہ داروں میں سے تھا، اس نے
الی الاحنف انه دعانی الی	احنف کو لکھا کہ میری صلح کا باعث
الی الصلح اسلام باذان فصالحه	باذان کا مسلمان ہو جانا ہے، چنانچہ
علی ستمائة الف۔	اس نے حضرت احنف سے چھ لاکھ سالانہ پر صلح کر لی

اس تصریح سے حضرت باذانؓ کا فارسی ہونا بالکل واضح ہو جاتا ہے، اور ملک الیمن
ہونا بھی اس لیے صحیح ہے کہ کسریٰ نے تبیجان کے بیٹے کو یمن کی حکومت سے معزول کر کے باذان
کو وہاں کا حاکم بنایا، اور ان کی حکومت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک رہی،
یہاں تک کہ وہ مسلمان ہو گئے،

باقی رہا باذان کا ملک الہند ہونا کہ ان کا خاندان پہلے ہندوستان میں کسی جگہ حکمراں
رہا ہو، اور یہاں کے بے شمار راجوں مہاراجوں کی طرح کسی علاقہ کی حکومت یا کسی مہاراجہ
کی نیابت حاصل رہی ہو، اور بعد میں اس خاندان نے فارس جاکر ایرانی دربار میں اپنی حاکمانہ
صلاحیت کا ثبوت دیا ہو، اور شاہان ایران نے مرو الروز کی مرزبانیت یعنی نیابت عطا کر دی ہو

---

[1] کامل ابن اثیر ج ۳ ص ۱۴۸

جس طرح ہندوستان کے اساورہ ایرانیوں کی فوج اور حکومت میں رہا کرتے تھے، مگر حافظ ابن حجر کے نزدیک حضرت باذانؓ کے ملک الہند ہونے میں کلام ہے، انھوں نے الاصابہ میں لکھا ہو کہ باذان الفارسی اور باذان ملک الیمن دونوں غالباً ایک ہی شخص ہیں اور باذان ملک الہند کے بارے میں خیال ہے کہ اسے ملک الیمن ہونا چاہیے،

قولہ ملک الھند فیہ نظر و الصواب ملک الیمن[1]

ذہبی نے باذان کو جو ملک ہند بتایا ہے اس میں نظر اور کلام ہو اور صحیح ملک یمن ہے،

صاحب سیرۃ محمدیہ نے بھی حافظ ابن حجر کی موافقت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

ولعلہ صحف فی لفظ ملک الھند لعلہ ملک الیمن فکتب کلمۃ الھند مکان الیمن واللہ اعلم

شاید ملک ہند میں سہو ہوگیا ہو اصل شاید ملک یمن ہو، اور یمن کی جگہ ہند لکھ دیا ہو،

حافظ ابن حجر کا خیال مسلم ہو، مگر حافظ ذہبی کے خیال کو بھی اگر صحیح تسلیم کر لینے کی وجہ مل جائے تو یہ ایک حافظ حدیث مورخ اسلام اور امام علم وفن کی طرف غلطی یا تصحیف کی نسبت سے بہتر ہوگا، جو حافظ ابن حجر سے کسی طرح کم درجہ کے نہیں ہیں، ہم نے حضرت باذانؓ کو ملک ہند کہنے کی جو وجہ بیان کی ہو، گو وہ زیادہ قوی نہیں ہے، مگر قابل غور ضرور ہے، اور اس سے حافظ ذہبی کی بات سمجھ میں آسکتی ہے،

اسی علاقۂ یمن کے ایک خالص ہندوستانی بزرگ حضرت بیرزطنؓ ہندی یمنی رضی اللہ عنہ ہیں، یہ ہندوستانی طریقۂ علاج کے ماہر طبیب تھے، انھوں نے بڑی عمر پائی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں اسلام قبول کیا، لیکن آپ سے ملاقات کا ثبوت نہیں ملتا، حافظ ابن حجر نے ان کا تذکرہ الاصابہ کی تیسری فصل میں کیا ہے، جس میں ایسے حضرات کا بیان ہے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانۂ مبارک پایا ہے اور آپ کی حیات طیبہ ہی میں یا اس کے بعد اسلام لائے۔

---

[1] الاصابہ ج ۱ ص ۱۷۹ طبع جدید مصر [2] السیرۃ المحمدیہ فی ذکر کتابہ صلی اللہ علیہ وسلم الی بردیزبن ہرمز بکسریٰ

ان کا تذکرہ اصابہ میں اس طرح ہے کہ شیخ حسن بن محمد شیرازی نے کتاب السوانح میں اپنے شیخ جعفر بن محمد شیرازی کی روایت سے لکھا ہے:۔

بیرزطن الهندی، شیخ کان	بیرزطن ہندی، شاہان ایران کے زمانہ
فی زمن اکاسرة له خبر	میں ایک بوڑھے آدمی تھے، بھنگ کے
مشهور فی حشیش القنب	علاج میں ان کا واقعہ مشہور ہے، اس کو
وانه اول من اظهر هابتلك	ان اطراف میں سب سے پہلے انہی نے رواج
البلاد، واشهر امرها عنه	دیا تھا، اور یمن میں اس کی شہرت انکی وجہ سے
بالیمن، ادرك هذا الشیخ	ہوئی، انھوں نے اسلام کا زمانہ پایا
الاسلام فاسلم[1]	اور اسے قبول کیا،

حضرت بیرزطن ہندی رضی اللہ عنہ وہ پہلے خوش قسمت ہندوستانی ہیں، جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ یا کم از کم آپ کے زمانہ سے قریب تر عہد پایا، اس قربت زمانی کے ساتھ ساتھ قربت مکانی میں بھی پہلے ہندوستانی باشندے ہیں،

حضرت باذان حاکم یمن اور ان کے اساورہ کے اسلام لانے کے بعد جن میں ایرانی، ہندوستانی اور سندھی سب ہی شامل تھے، یمن اور اطراف میں عربوں کی طرح عام عجمی باشندے بھی اسلام لائے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں کے مسلمانوں پر حضرت زبرقان بن بدر رضی اللہ عنہ

---

[1] الاصابہ فی تمیز الصحابہ جلد ا ص ۱۷۸، طبع جدید مصر، میں نے قدیم مصری نسخہ پر اعتماد کرکے جو کلکتہ اور مصر کے مطبوعہ کو سامنے رکھ کر چھپا تھا، رجال السند والہند ص ۵۹ میں ان کا نام بیرزطن ہندی لکھا ہو، مگر اصابہ کے جدید نسخہ میں بیرزطن ہے اور اس کی صحت کے بارے میں درج ہے کہ قوبلت هذه الطبعة علی عدة نسخ بدار الکتب المصریة وعلی جملة نسخ مطبوعة بمصر" اسلئے اب بیرزطن ہی کو صحیح سمجھنا چاہیے۔

کو اپنا عامل مقرر فرمایا، طبری کا بیان ہے :۔

ان رسول اللہ صلی اللہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال
علیہ وسلم توفی، وقد فرق فیھم	اس حال میں ہوا کہ آپ اپنے عمال کو
عمالہ فکان الزبرقان	عربوں میں مقرر فرما چکے تھے، چنانچہ
ابن بدر علی الرباب، و	زبرقان بن بدر کو قبیلہ ارباب پر،
عوف والابناء فیما ذکر	اور عوف کو ابنائے یمن پر مقرر فرمایا تھا
السری[1]	جیسا کہ سری نے ذکر کیا ہے،

(باقی)

رجال السند والہند (عربی)

اس میں ہند و سندھ کے ان قابل ذکر ارباب کمال کا تذکرہ و تعارف ہے جو ان علاقوں میں پیدا ہوئے، یہیں زندگی گذاری یا پھر کسی غیر ملک میں گئے، اور وہاں کی آب و ہوا ایسی دامنگیر ہوئی کہ وہیں پیوند خاک ہو گئے، اسی طرح اس میں ان اہل علم کا بھی ذکر آگیا ہے جو تھے تو ہندی الاصل لیکن پیدا ملک کے باہر ہوئے، اور وہیں ساری زندگی گذار دی، اس میں پہلی صدی سے لیکر ساتویں صدی ہجری تک کے محدثین، فقہاء، متکلمین، مورخین، شعرا و ادباء وغیرہ کے حالات زندگی اور ان کے علمی کارناموں کی تفصیل آگئی ہے۔

۳۲۸ صفحے، قیمت :۔ عہ

منیجر

---

[1] تاریخ طبری ج ۳ ص ۲۰۳

"عہد عتیق" کے ایک واقعہ کی تحقیق

از جناب محمود الحسن صاحب ایم اے، ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

دنیا کی تمام قومیں چاہے وہ زندہ ہوں یا انھیں گردشِ روزگار نے ختم کر دیا ہو، ان کے دور ماقبل تاریخ کو قیاس، مفروضات اور مائتھولوجی سے گہرا ربط رہا ہے، لیکن جدید سائنسی علوم اور اور آلات کی مدد سے ان کے بارے میں جو معلومات مہیا کیے گئے ہیں، بالخصوص اثریات، علم اللسان اور علم الانسان نے مختلف نسلوں، انسانی گروہوں کی قدامت، ان کے محل قیام، مقامی تبدیلیوں اور زمانی تعین کے بارے میں جو دلچسپ معلومات فراہم کیے ہیں وہ تاریخ انسانی کے قدیم ترین گوشوں کو بڑی حد تک روشن کر دیتے ہیں، اس لیے آج کوئی شخص انسانی تاریخ کے قدیم ترین عہد کے بارے میں کوئی باوزن اور معقول بات اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ مذکورۂ بالا علمی تحقیقات سے فائدہ نہ اٹھائے، اس سے استفادہ کیے بغیر اس دور کی روایات وقصص کی بنیاد پر کوئی حتمی نتیجہ نکالنا نہ تو علم ہی کی کوئی خدمت ہے اور نہ ایسے کام کا کوئی تحقیقی وزن ہوتا ہے، جولائی ۱۹۶۲ء کے "فکر و نظر" علی گڈھ میں ایک مضمون بعنوان "عہد عتیق کی تاریخ اور اس کے مصادر" شائع ہوا ہے، اس مضمون میں مقالہ نگار نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ملوک حمیر نے چین و تبت کی تسخیر کی تھی، اور وہاں وہ آباد بھی ہوئے تھے، اس سلسلہ میں انھیں بعض روایتیں بھی مل گئیں ہیں جن سے انھوں نے استدلال کیا ہے،

ان روایتوں میں سے ایک روایت جسے بعض مورخین عرب بڑے شوق سے نقل کرتے آئے

اور جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے، دعبل بن علی الخزاعی کی وہ رباعی ہے جس میں اس نے فخر و مباہات کے طور پر کمیت کے بالمقابل یہ دعوی کیا ہے کہ اس کے قبیلہ کے لوگوں نے چین و تبت کو فتح کیا تھا، لیکن دراصل عرب تاریخ نگاری اسلام کے بعد شروع ہوتی ہے، اسلام سے پہلے وہ اپنے آباؤ و اجداد کے کارنامے حافظہ کے ذریعہ محفوظ رکھتے تھے، گو وہ اس کام میں بہت توجہ اور احتیاط برتتے تھے، پھر بھی قبائلی عصبیت، باہمی تصادم اور فخر و مباہات کا مقابلہ انھیں مبالغہ سے روک نہیں سکتا تھا، چنانچہ شاعر اپنے قبیلہ کی شجاعت و شہامت، فیاضی و سخاوت، غیرت و حمیت کو بڑے شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتا تھا، اس لیے میرا خیال ہے کہ دعبل خزاعی کی بھی یہ رباعی بھی تخیلی استعارہ کے سوا کچھ نہیں، دوسری بات یہ ہے کہ جن مورخین نے اس افسانہ کو بیان کیا ہے وہ بھی اس کے صحیح ہونے پر شک ظاہر کرتے ہیں، اور بعض نے تو کھل کر اس پر تنقید کی ہے، تاریخ طبری جو عہد عتیق کے بارے میں رطب و یابس کا مجموعہ ہے اور جسے ابن اثیر نے اپنی تاریخ الکامل کا ماخذ قرار دیا ہے، وہی اس روایت کا ذریعہ ہے، اس لیے وہ اس کو نقل کرکے گذر جاتا ہے، مگر ابن اثیر اس روایت پر مورخانہ تنقید بھی کرتا ہے، جس سے اسکی ژرف نگہی کا پتہ چلتا ہے، قبل اس کے کہ ابن اثیر کی روایت کو نقل کیا جائے، اصل روایت کو نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

"حارث بن عمر نے تبع کے پاس جو یمن کا بادشاہ تھا، یہ کہلا بھیجا کہ وہ بلاد عجم کی طرف توجہ کرے، چنانچہ وہ روانہ ہوا، سب سے پہلے وہ حیرہ آیا اور اپنے بھتیجے شمر ذوالجناح کو قباذ سے لڑنے کے لیے بھیجا، قباذ نے شکست کھائی اور رے میں پناہ لی، شمر نے وہاں پہنچکر قباذ کو قتل کر دیا، پھر تبع نے شمر کو خراسان کی مہم پر اور اپنے بیٹے حسان کو سغد کی مہم پر روانہ کیا اور کہا تم میں سے جو بھی پہلے چین پہنچے گا وہی اس کا مالک ہوگا، دونوں کے پاس

عظیم الشان لشکر تھے، کہا جاتا ہے کہ ان کی تعداد چھ لاکھ چالیس ہزار تھی، اور اپنے ایک ادھ
بھیجے بیعفر کو روم کی مہم پر روانہ کیا، وہ قسطنطنیہ آیا، یہاں لوگوں نے اطاعت قبول کر کے
خراج ادا کر دیا، پھر وہ رومیہ کی طرف بڑھا، اس کا محاصرہ کیا، مگر فوج میں طاعون
پھیل جانے کی وجہ سے رومی اس پر ٹوٹ پڑے اور سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا،
ان میں سے ایک فرد بھی نہ بچ سکا۔ ادھر شمر ذوالجناح نے سمرقند کا محاصرہ کیا مگر کامیاب
نہیں ہو رہا تھا کہ اسے معلوم ہوا یہاں کا بادشاہ احمق ہے، اور اس کی لڑکی معاملات
حکومت کا دیکھ بھال کرتی ہے، تو اس نے اس کے پاس تحفہ بھیجا، اور کہا میں تم سے
شادی کرنے آیا ہوں، میرے پاس سونے اور چاندی سے بھرے ہوئے تابوت ہیں،
میں اسے تمھاری خدمت میں پیش کروں گا، میرا ارادہ چین کا ہے، اگر میں نے اس کو
فتح کر لیا تو تم میری بیوی ہو گی، اور اگر ہلاک ہو گیا تو یہ مال تمھارا ہو گا، جب یہ پیغام
لڑکی کو ملا تو اس نے قبول کر لیا، اور مال کا مطالبہ کیا، شمر نے چار ہزار تابوت بھیج دئیے،
ہر تابوت میں دو سپاہی تھے، سمرقند کے چار دروازے تھے، ہر دروازہ پر دو ہزار آدمی
متعین تھے، شمر نے اپنے آدمیوں کے لیے یہ علامت مقرر کر دی کہ جب گھنٹی بجائی جائے
تو وہ تابوت سے نکل پڑیں، چنانچہ جب یہ شہر میں داخل ہوئے تو گھنٹی بجی، اور شمر
کے آدمی تابوت سے نکل پڑے، اور دروازے پر قبضہ کر لیا، پھر شمر داخل ہوا،
اس نے لوگوں کو قتل کیا، اور مال و دولت پر قبضہ کرنے کے بعد چین روانہ ہوا،
اور ترکوں کو شکست دے کر چین میں داخل ہوا، وہاں حسان بن تبع سے ملاقات ہوئی
جو تین سال قبل وہاں پہنچ چکا تھا، دونوں نے وہیں قیام کیا اور وہیں مر گئے، ان کے
قیام کا زمانہ اکیس سال بتایا جاتا ہے، یہ بھی ایک روایت ہے کہ دونوں تبع کے

پاس مال و دولت لیکر آئے اور پھر واپس چلے گئے۔"[1]

جس تبع کی جانب یہ عظیم الشان اور حیرت انگیز مہم منسوب کیجاتی ہے، وہ آخری تبع یعنی حسان بن اسعد ابوکرب تھا، دوسری کتابوں میں یہ بھی ملتا ہے کہ "تبع کی قوم خراسان، تبت چین اور سجستان میں آباد ہوئی" (ملاحظہ ہو مروج الذہب بر حاشیہ کامل جلد چہارم ص ۵)

اسی روایت کا ذکر ابن خلدون بھی کرتا ہے "لوگوں کا خیال ہے کہ تبع کی اولاد نے چین فتح کرنے کے بعد حمیر کے قبائل چین میں آباد کیے جو ابتک موجود ہیں" (مقدمۂ ابن خلدون ص ۱۲)

لیکن عرب مورخین نے بھی اس روایت کو بے بنیاد قرار دیا ہے، اپنی تاریخی بصیرت اور تنقیدی فکر کے ذریعہ کمزور ثابت کیا ہے، اس سلسلہ میں ابن اثیر لکھتا ہے :-

"قباذ کو مقام رے میں قتل کرنے اور تبع کے بلاد فارس پر حاکم ہونے کا واقعہ بے بنیاد ہے، میں نے چونکہ اس اصول کی پابندی کی ہے کہ ابوجعفر کی تاریخ سے کوئی بات بھی معنوی طور پر کم نہیں کروں گا، اس لیے اس واقعہ کو بھی نقل کر دیا، ورنہ یہ تذکرہ کے قابل بھی نہیں، اس روایت کے غلط ہونے کے متعدد اسباب ہیں، اس نے لکھا ہے کہ قباذ کو مقام رے میں قتل کر دیا گیا، حالانکہ اہل فارس اس پر متفق ہیں کہ قباذ کی موت کا زمانہ معلوم ہے، اس روایت کے علاوہ یہ کہیں نہیں ملتا کہ وہ قتل کیا گیا ہے، جب قباذ کا انتقال ہوا تو کسریٰ انوشیروان اس کا جانشین ہوا، یہ بھی اظہر من الشمس ہے، اگر حکومت اہل فارس سے منتقل ہوکر ملوک حمیر کے پاس جاتی تو قباذ کے بعد اس کا بیٹا کس طرح جانشین ہوتا اور اس کی حکومت اتنی منضبط ہوتی کہ دیگر اقوام کے بادشاہوں نے اطاعت کا اظہار کیا، بادشاہ روم نے اسے خراج ادا کیا، پھر طبری لکھتا ہے کہ تبع نے اپنے بیٹے حسان کو چین بھیجا اور شمر کو سمرقند، نیز اپنے بھتیجے یعفر کو روم کی مہم پر روانہ کیا جو قسطنطنیہ پر قابض ہوکر روم کی طرف بڑھا اور اس کا محاصرہ

---

[1] تاریخ الکامل لابن اثیر ج اول ص ۱۴۶-۱۴۵

کیا، مگر غور کیجیے کہ یمن کی کیا حیثیت اور حضرموت کی کیا حقیقت تھی کہ ان کے پاس اتنا بڑا لشکر جرار ہوتا جو اندرونی قیام امن کے علاوہ دوسرے کاموں میں استعمال کیا جا سکتا کہ ایک لشکر تبع کی سرکردگی میں برسر جنگ ہے، دوسرا حسان کی سرکردگی میں چین جیسے ملک کے خلاف برد آزما ہو، جسکے پاس جنگجو سپاہیوں کی کثرت ہے، تیسرا لشکر جو ابو بھتیجے کی قیادت میں کسریٰ جیسے عظیم الشان شہنشاہ سے زور آزما ہو اور اس پر قبضہ کرکے اسی لشکر کے ذریعہ سمرقند جیسے وسیع اور عظیم شہر کا محاصرہ کرے، اسی پر اکتفا نہیں بلکہ یعفر کی سرکردگی میں بہت بڑی فوج قسطنطنیہ کی جانب پیش قدمی کرتی ہے، اس پر قبضہ کرکے روم کا محاصرہ کر لیتی ہے، حالانکہ مسلمانوں نے اپنے ممالک کی کثرت وسعت اور تعداد کے باوجود جب قسطنطنیہ یا اسکے پاس پڑوس علاقوں پر قبضہ کرنا چاہا، تو انھیں ناکامی ہوئی، یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ یمن اپنے حدود اربعہ کے اعتبار سے سب سے چھوٹا اسلامی ملک ہے، اسکی فوج بھی مختصر ہے پھر آخر یمن کی فوج کا ایک حصہ تبع کی سرکردگی میں کیسے قسطنطنیہ پر قابض ہو سکتا ہے، اس کو عقل سلیم کبھی بھی تسلیم نہیں کرتی۔"

ابن اثیر نے جو دلائل دیے ہیں وہ بڑا وزن رکھتے ہیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ساتویں صدی کے اس مورخ نے اس واقعہ کے جانچنے میں کتنے گہرے تاریخی شعور سے کام لیا ہے، یہ ظاہر ہے جو لوگ زمانۂ ماقبل تاریخ کے واقعات کو جانچنے بیٹھیں گے تو انھیں بہت سی مشکلات کا سامنا ہوگا، ان کو تجزیہ، تنقید اور معروضی انداز فکر سے مدد لینا پڑے گا، اگر فکر و نظر کے مضمون نگار نے بھی یہ انداز اختیار کیا ہوتا تو وہ بالکل ہی مختلف نتیجے پر پہنچتے، اور ان کو خواہ مخواہ سید سلیمان ندویؒ کی عالمانہ تحقیق سے الجھنے کی ضرورت نہ پیش آتی،

اسی روایت پر مشہور فلسفی مورخ ابن خلدون ایک اور زاویہ سے روشنی ڈالتا ہے، اسکی

بحث کا طریقہ عقل پر مبنی ہے، اس نے محض مورخ ہی نہیں بلکہ ایک جغرافیہ داں کی حیثیت سے بھی اس پر تنقید کی ہے، وہ لکھتا ہے:-

"یہ تمام واقعات صداقت سے بعید ہیں، ان کی بنیاد وہم اور غلطی پر ہے، یہ من گھڑت کہانیوں سے مشابہ ہیں، کیونکہ تبابعہ کا ملک جزیرۂ عرب میں تھا اور اس کا مرکز یمن تھا، اس جزیرہ کو سمندر تین سمتوں سے گھیرے ہوئے ہے، جنوب میں بحر ہند، مشرق میں بحیرۂ فارس بصرہ تک چلا گیا ہے، اور مغرب میں بحر سویس مصری علاقوں تک پھیلا ہوا ہے، جس کا اندازہ نقشہ دیکھنے سے ہوتا ہے، اس لیے یمن سے مغرب کی سمت جانے کے لیے سویس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں، بحر سویس اور بحر شام کا درمیانی فاصلہ دو منزل ہے، یہ بات بالکل ناممکن ہے کہ ایک زبردست بادشاہ اتنے بڑے لشکر جرار کو لیکر اس راستے سے نکل جائے اور وہ سرزمین اس کے قلم رو میں نہ ہو، اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اس سرزمین میں عمالقہ، شام میں کنعانی اور مصر میں قبطی تھے، پھر جب عمالقہ مصر پر قابض اور بنو اسرائیل شام کے حکمراں ہوئے تو عمالقہ نے ان سے جنگ کی ہو، اور اس علاقہ کے کسی چھوٹے قریہ پر بھی وہ قابض ہوئے ہوں، سمندر کے راستہ کو دیکھتے ہیں تو مغرب تک بڑا بُعد دکھائی دیتا ہے، ایک لشکر کے لیے بہت سا زاد سفر اور چارہ درکار ہے، اس لیے اگر وہ اس راستہ سے گئے تو جن غیر ممالک سے گذرے ہوں گے تو ان کی زراعت اور مویشی کو لوٹتے کھسوٹتے گذرے ہوں گے، جو کافی نہیں ہو سکتا، اگر یہ کہا جائے کہ ضروری چیزیں اپنے ملک سے وافر مقدار میں لیکر نکلے ہوں گے تو اسے لادنے کے لیے اتنے جانور کہاں سے ملے، اس لیے سوائے اسکے کوئی اور چارہ نہیں رہ جاتا کہ وہ اپنا تمام سفر اسی زمین سے طے کریں جس پر وہ قابض ہوں

تاکہ ضروریات اور سامان رسد وہاں سے مہیا ہوتا جائے، اور اگر یہ فرض کیا جائے کہ فوج اس ملک کے رہنے والوں سے بغیر چھیڑ چھاڑ کے صلح و آشتی کے ساتھ ضروری سامان لیتی ہوئی نکل گئی تو یہ اور بھی ناممکن اور خلاف عقل ہے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ واقعات بالکل لغو اور موضوع ہیں۔"

آگے چل کر اس واقعہ کے دوسرے حصہ پر بھی اظہار خیال کرتا ہے۔

"رہا بلاد مشرق اور ارض ترک پر حملہ تو اس کا راستہ اگرچہ سویس کے راستہ سے زیادہ وسیع ہے لیکن اس کا فاصلہ بہت ہے، اور فارس و روم کی سلطنتیں اور قومیں درمیان میں حائل ہیں، اور تاریخ میں یہ کہیں نہیں ملتا کہ تبابعہ نے فارس اور روم پر قبضہ کیا ہو، اور جب وہ فارس سے لڑے بھی تو عراق کے حدود میں بحرین وغیرہ کے آس پاس، دجلہ و فرات کے درمیانی علاقوں میں یہ لڑائیاں ذی الاذعار اور کیکاؤس، ابوکرب تبع، گشتاسب اور قباد کے درمیان یا کیانیوں اور ساسانیوں کے بعد ملوک الطوائف اور دیگر تبابعہ میں ہوئیں، کیونکہ ان کی سرحدیں ملتی تھیں لیکن ترک و تبت پر حملہ کرنا محال اور بعید از قیاس ہے، کیونکہ روم و فارس کی قومیں سامنے پڑتی تھیں، اور بُعد مسافت کے علاوہ اس کے لیے بے حد سامان اور زاد سفر درکار تھا، اس بنا پر یہ واقعہ مہمل ہے۔"

اس واقعہ کی تردید میں ابن خلدون کے زور استدلال کے بعد کسی اور دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی، تاہم اس مسئلہ پر ایک اور نقطۂ نظر سے بھی دیکھنا ہے، یہ واقعہ ہے کہ جب ایک ملک سے دوسرے ملک کا کسی قسم کا رابطہ ہوتا ہے تو تاریخ میں ضرور اس کا ذکر ہوتا ہے، اس لیے اس واقعہ کے سلسلہ میں ہمیں چینیوں کی تاریخ سے مدد لینی چاہیے، چین کا ملک قدیم زمانہ سے تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا ہے، ہانگ ہو اور یانگ شی کی (Hwang Ho and Yang-Tse)

وادیوں میں آباد چینی اپنے دور کے ترقی یافتہ فلسفہ کے مالک تھے، ان کی تاریخ بہت پرانی ہے وہ اپنے بادشاہوں کے خاندان کا آغاز Hsia خاندان سے کرتے تھے، ان کے خیال میں یہ پہلا شاہی خاندان ہے۔ اس کے بعد دوسرا خاندان Chang کہلاتا تھا۔ اس خاندان میں چھ صدیوں تک حکومت رہی، یہ دور بارہویں صدی قبل مسیح پر ختم ہو جاتا ہے، پھر ایک اور خاندان Chow اس کا جانشین ہوا، اس کا دور حکومت ۱۱۲۲ء ق م سے شروع ہو کر ۲۵۵ء ق م پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور کے تاریخی مواد کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ چین اس زمانے میں متعدد ریاستوں میں منقسم تھا، ان میں ڈھیلا وفاق تھا، اس دور کے سیاسی حالات کا نقشہ چینی نمائندے لیانگ چی چاؤ نے جس نے ۱۹۱۹ء کی پیرس کانفرنس میں شرکت کی تھی، ان الفاظ میں کھینچا ہے :-

"آٹھویں اور چوتھی صدی ق م کے درمیان یانگ ہو اور ہانگ نسی کی وادیوں میں پانچ چھ ہزار کے لگ بھگ ریاستیں تھیں، ان میں تقریباً دو ایسی ریاستیں تھیں جو غالب تھیں، چین کی سرزمین مسلسل جنگوں کی آماجگاہ تھی، اسے ہم انتشار کا دور کہہ سکتے ہیں۔"[1]

اسی سیاسی انتشار کا تذکرہ دوسرے مورخین بھی کرتے ہیں :-

"اس وقت کے چین کی سیاسی حالت اٹھارہویں صدی کے جرمن وفاق کے مشابہ تھی، کچھ زمانہ گذرنے کے ساتھ چند تحت ریاستیں اتنی طاقتور ہو گئیں کہ ان کے حکمرانوں نے بادشاہ کا لقب اختیار کر لیا، چاؤ خاندان کا پورا دور انھیں ریاستوں کے باہمی تصادم میں گذرا، شروع میں ایک ریاست غلبہ حاصل کرتی، پھر بعد میں اس کی جگہ دوسری ریاست لے لیتی تھی۔"[2]

---

[1] Out Line of history by H.G. Wells P 178

[2] A Sketch of Chinese history by F.L. Hawk P. 21

ایک اور چینی مورخ لکھتا ہے :-

" ابتدائی ساڑھے چار صدیوں کے بعد جو نسبتۃً توسیع پسندی اور امن کا دور ہے دارالسلطنت مشرق کی جانب منتقل کردیا گیا، کیونکہ ۷۷۱ ق م میں شمال مغرب کا دباؤ بڑھتا جارہا تھا، اس کے بعد ریاستوں میں باہمی تصادم کا سلسلہ نظر آتا ہے، مرکزی حکومت کی گرفت جاگیرداروں پر تیزی سے ڈھیلی ہو رہی تھی"۔ [1]

مورخین کے ان بیانات سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ جس دور میں شمر کی فتوحات کا تذکرہ ملتا ہے چین اس زمانہ میں اندرونی انتشار سے گذر رہا تھا، کیونکہ شمر کا زمانہ تین سو سال قبل مسیح کا ہے، چاؤ خاندان ان صدیوں میں اپنی زندگی کے آخری لمحات پورا کررہا تھا، ایسے وقت میں جب ملک زوال اور سیاسی انتشار کا شکار ہو، بیرونی طاقتوں کو حملہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی جس سے ثابت ہوتا ہو کہ ملوک حمیر کے کسی حکمراں نے چین پر حملہ کیا ہو، اگر کسی قوم کا تذکرہ ہے تو وہ تاتاری ہیں، کیونکہ ان کی سرحدیں چین سے ملتی تھیں، ان میں باہم جھڑپیں بھی ہوتی رہتی تھیں، اس کا تذکرہ D.C. Boulger نے اپنی کتاب A short history of China میں اس طرح کیا ہے :-

" چاؤ خاندان کے بانی نے اپنے آپ کو قوم کا محسن ثابت کرنے کے لیے ضروری اصلاحات جاری کیں اور اس کے ایک وارث نے جو Magnificent کی حیثیت سے مشہور ہوا، اپنے خاندان کی حکمرانی کا دائرہ ترکستان کی چند ریاستوں تک وسیع کیا، لیکن بحیثیت مجموعی، چاؤ خاندان کے حکمراں مخصوص امتیاز سے عاری تھے، ان میں ایک بادشاہ آٹھویں صدی ق م کے درمیان اتنا کمزور نکلا کہ اس نے اپنی مملکت کا ایک

---

[1] My country and my People by Lingulong

ٹکڑا اسیانگو انگ کے طاقتور حکمراں کے حوالہ کردیا، تاکہ وہ تاتاریوں کے خلاف سرحد کی حفاظت کرسکے" (ص ۳۷)

اگر ملوک حمیر نے چین پر حملہ کیا ہوتا تو جس طرح تاتار کی یلغار کو چینی تاریخ نے اپنے صفحات میں جگہ دی اسی طرح وہ ملوک حمیر کی اس عظیم الشان فتح کو بھی فراموش نہ کرتی، اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کوئی شمر یرعش ایسا نہیں گذرا جس کے قدموں نے سرزمین چین کو پامال کیا ہو اس لیے یہ روایت سرے سے محض تخیل کا اختراعی کرشمہ ہے، جسے الفاظ کا جامہ پہنا دیا گیا ہے۔

اس افسانہ کی آخری کڑی یہ روایت ہے کہ "تبت کے باشندوں کی زبان حمیری تھی، وہاں کے بادشاہ کا لقب تبع ہوا کرتا تھا" مگر مذکورۂ بالا بحث سے جب اصل روایت کی پوری عمارت پاش پاش ہوگئی تو یہ حصہ خود بخود خلاف واقعہ ہو جاتا ہے، جب تبع نے تبت فتح ہی نہیں کیا تو پھر ان کی زبان کا وہاں وجود ہی کیا معنی رکھتا ہے، تبتیوں کی زبان حمیری اسی وقت ہو سکتی تھی جب ان کی آبادی کا معتد بہ حصہ یمنی قبائل پر مشتمل ہوتا، لیکن ایسا نہیں ہے تبت کے باشندے خالص منگولین نسل سے تعلق رکھتے ہیں، وہ یہاں نامعلوم زمانے سے آباد ہوئے (ملاحظہ ہو چیمبر انسائیکلوپیڈیا، جلد ۱۳ ص ۶۲۲) "تبتی تاتاری نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو نامعلوم زمانے سے ایشیائے وسطی کے پلیٹو میں آباد ہوئے، یہ چین والوں کی بہ نسبت برما، نیپال اور ہندوستان کے سرحدی علاقوں کے باشندوں سے زیادہ ملتے ہیں"، منگولین نسل کی خصوصیات تبتیوں میں بھی پائی جاتی ہیں، ان کے جسم کی ساخت، ان کے اعضاء کی ہیئت اور رنگ سامی نسل کے لوگوں سے مختلف ہے، قوموں کی جسمانی ہیئت میں تبدیلی بہت عرصہ میں ہوتی ہے، مذہب و طرز معاشرت میں تبدیلی تو مختصر عرصہ میں ممکن ہے، لیکن جسمانی بناوٹ میں تبدیلی انفرادی خاندانوں میں مخصوص عمل کے بعد کچھ صدیوں میں تو ہو سکتی ہے لیکن پوری

قوم ایک مختصر زمانے میں نہیں بدل سکتی، اس کے بہت سے ثبوت ہیں کہ تبتی کم از کم ایک ہزار قبل مسیح کسی دوسرے نسلی گروہ سے مخلوط نہیں ہوئے، اس لیے تبت کی زبان حمیری ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں۔

آخری بات یہ رہ جاتی ہے کہ مسعودی نے اپنے دور میں "تبت میں عربی وضع و لباس کے اشخاص پائے ہیں" تو بقول سید صاحبؒ یہ کوئی بعید از قیاس بات نہیں، کیونکہ مسلمان تاجر دنیا کے بیشتر علاقوں میں پھیل گئے تھے، انھوں نے کوہ و بیابان اور سمندر کو اپنی جولانگاہ بنا رکھا تھا، اسی لیے عرب اگر وہاں پائے گئے تو کوئی تعجب کی بات نہیں، صاحب مضمون نے ابن حوقل بغدادی سنہ ۳۶۷ھ کی روایت جو سید صاحبؒ نے ارض القرآن میں لکھی ہے اس کو اپنے موقف کی حمایت میں نقل کیا ہے کہ

"لیکن زمانۂ اسلام کے بعض عرب سیاحوں کے عینی مشاہدات کا کیا جواب ہے" ابن حوقل بغدادی کا بیان ہے کہ اس کے زمانۂ ورود سمرقند تک شہر کے دروازے پر شمر یرعش کا حمیری کتبہ ایک لوہے کی تختی پر کندہ موجود تھا" حالانکہ سید صاحب نے اس کی جو طبا عانہ تاویل کی ہے، وہ غور و فکر کی محتاج ہے، وہ لکھتے ہیں: "اصل میں یہ قدیم ترکی خط الیغوری ہوگا جو حمیری اور حبشی وغیرہ خطوط کے مشابہ ہے، شہرت عام کی بنا پر اس کو ہمارے سیاح نے حمیری سمجھ لیا" (ارض القرآن جلد اول ص ۲۹۳)

ان مباحث سے ناظرین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ چین و تبت کی فتح اور ایک خاص عہد میں تبت کی زبان حمیری ہونے کا دعوی کس قدر کمزور بنیادوں پر ہے، جس کو بقول سید صاحبؒ افسانہائے حمیر کے تحت جگہ ملنی چاہیے، لیکن مقالہ نگار نے اس کا تجزیہ دنیا کی تاریخ سے علٰحدہ کر کے منفرد طور پر کیا ہے، اسی لیے اس کو بعینہ تسلیم کر لیا۔

ابو عثمان جاحظ

از جناب مولوی ضیاء الدین صاحب صلاحی رفیق دار المصنفین

۳

تصنیفات | جاحظ جس درجہ کا صاحب قلم تھا، اسی درجہ کا مصنف بھی تھا، کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے اس کی تصانیف امتیازی حیثیت رکھتی ہیں، مبصرین اور ناقدین نے اس کے بارہ میں بہت عمدہ رائیں ظاہر کی ہیں، ان میں سے کچھ رائیں نقل کیجاتی ہیں،

مشہور مورخ مسعودی اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:-

ولا یعلم احد من الرواۃ	کوئی مصنف اور صاحب قلم جاحظ سے زیادہ
واھل العلم اکثر کتبا منہ....	کثیر التصانیف نہیں،.... ابو الحسن مدائنی
وقد کان ابو الحسن المدائنی	بھی کثیر التصانیف ہیں، لیکن وہ جو کچھ
کثیر الکتب الا ان ابا الحسن	سنتے ہیں صرف اسی کو نقل کرنے پر
المدائنی کان یودی ما سمع	اکتفا کرتے ہیں، جاحظ گو معتزلی ہے
وکتب الجاحظ مع انحرافہ	لیکن اس کی کتابیں ذہنوں کا زنگ
المشھور تجلو صدأ الاذھان	صاف کرتی ہیں، اس کے دلائل نہایت
وتکشف واضح البرھان	واضح ہوتے ہیں، اس نے انھیں بہتر
نظمھا احسن نظم ووصفھا	طور پر مرتب اور عمدہ لفظوں میں ایا

واحسن وصف وكساها من كلامه	مفہوم ادا کیا ہے، اسے جب پڑھنے اور
اجزل لفظ وكان اذا تخوف	سننے والے کی تھکاوٹ اور بے لطفی کا
ملل القارى وسآمة السامع	اندیشہ ہوتا ہے، تو سنجیدگی سے مزاح
خرج من جد الى هزل ومن	اور بلیغ حکمت سے ظرافت کی جانب متوجہ
حكمة بليغة الى نادرة ظريفة	ہو جاتا ہے، اسکی کتابیں نہایت عمدہ
وله كتب حسان[1]	ہیں،

ابو محمد عبداللہ بن حمود زبیدی اندلسی جاحظ کے کلام و ادب کے ایسے عاشق تھے کہ کہا کرتے:

رضيت فى الجنة بكتب الجاحظ	جنت میں اس کی نعمتوں کے بجائے جاحظ
عوضا عن نعيمها[2]	کی کتابیں مجھے زیادہ پسندیدہ ہیں،

علامہ خطیب بغدادی جاحظ کی کتابوں کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

المصنف الحسن الكلام البديع	جاحظ پسندیدہ اسلوب نگارش کا
التصانيف[3]	مالک ہو اسکی تصانیف میں جدت وندرت

علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:۔

وصنف كتبا جمة تدل على قوة ذهنه	اس نے ایسی کتابیں لکھیں جن سے اسکی قوت ذہنی
وجودة تصرفه[4]	اور جودت طبع کا اندازہ ہوتا ہے،

مرزبانی ابوبکر احمد بن علی کی زبانی بیان کرتا ہے

وله كتب كثيرة مشهورة	جاحظ کی بکثرت مشہور اور اہم کتابیں ہیں
جليلة فى نصرة الدين وفى	جو دین کی تائید وحمایت اور مخالفین کے

[1] تاریخ مسعودی برحاشیہ کامل ابن اثیر ج ۹ ص ۲۹۹ [2] طبقات النحاۃ ص ۲۰۰ [3] تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۲۱۲، ۲۱۳
[4] البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۱۹

حكاية مذاهب المخالفين	اقوال کی نقل، آداب و اخلاق اور ہر قسم
والآداب والاخلاق وفي	کے سنجیدہ اور تفریحی موضوع پر مضامین ہیں
ضروب من الجد والهزل	جو لوگوں میں متداول و معروف ہیں،
وقد تداولها الناس وقرؤها	اور وہ ان کی فضیلت کے معترف ہیں،
وعرفوا فضلها واذا تدبر العاقل	اور جب کوئی عقلمند اور صاحب شعور اسکی
المميز امر كتبه علم انه ليس	کتابوں پر غور کرتا ہے تو اسے اندازہ ہوتا
في تلقيح العقول وشحذ الاذهان	ہے کہ عقلوں کو بار آور اور تازہ کرنے، ذہنوں
ومعرفة اصول الكلام وجواهره	کو تیز کرنے، اصول کلام کی معرفت اور اسلام
وايصال خلاف الاسلام	کے خلاف اور مذہب اعتزال کو پہچاننے
ومذاهب الاعتزال الى	میں اسکے جیسی دوسری کتابیں نہیں ہیں،
القلوب كتب تشبهها[1]	

اس کی بعض مشہور تصانیف کا تعارف | کتاب البیان والتبیین: یہ جاحظ کی سب سے اہم اور مشہور کتاب ہے،

اس کی اہمیت کا اندازہ علامہ ابن خلدون کے اس قول سے ہوتا ہے:۔

وسمعنا من شيوخنا في مجالس	ہم نے اپنی تعلیمگاہوں کے اساتذہ کی زبان
التعليم ان اصول هذا الفن	سے سنا ہے کہ علم ادب کے اصول و قواعد کے
واركانه اربعة دواوين وهي	چار دفتر ہیں، ابن قتیبہ کی ادب الکاتب،
ادب الكاتب لابن قتيبة وكتاب	مبرد کی کامل، جاحظ کی کتاب البیان والتبیین
الكامل للمبرد وكتاب البيان	اور ابو علی قالی کی کتاب النوادر، ان کے

[1] معجم الادباء ج ۶ ص ۵۷

عربی	اردو
والتبیین للجاحظ وکتاب النوادر	علاوہ اور جو کتابیں ہیں وہ سب
لابی علی القالی البغدادی، وماسوی	انہی کی نقل و تقلید میں لکھی گئی ہیں
هذه الاربعة فتبع لها و	اور ان کی شاخیں ہیں،
فروع عنها[1]	

ابو علی حسن بن داؤد کا بیان ہے :-

عربی	اردو
نحن اهل البصرة بار بعة کتب	اہل بصرہ کا سرمایۂ ناز اور طغرائے امتیاز
کتاب البیان والتبیین للجاحظ	چار کتابیں ہیں، جاحظ کی کتاب البیان و التبیین
وکتاب الحیوان له وکتاب سیبویه	کتاب الحیوان، سیبویہ کی الکتاب اور
وکتاب العین للخلیل[2]	خلیل کی کتاب العین

مورخ مسعودی لکھتا ہے :-

عربی	اردو
وله کتب حسان منها کتاب البیان	جاحظ کی بہت سی عمدہ تصانیف ہیں
والتبیین وهو اشرفها لانه جمع	ان میں کتاب البیان والتبیین سب سے
فیه بین المنثور والمنظوم وغرر	اعلیٰ و اشرف ہے، کیونکہ وہ نظم و نثر، عمدہ
الاشعار ومستحسن الاخبار و	اشعار، پسندیدہ واقعات، بلیغ خطبوں
بلیغ الخطب لو اقتصر علیه	اور تقریروں پر مشتمل ہے، اگر کوئی شخص صرف اسی
مقتصر لاکتفی به[3]	کتاب پر اکتفا کرے تو یہ اس کے لیے کافی ہے،

دوسرے مورخین و مصنفین کے نزدیک بھی جاحظ کی سب سے اہم اور بلند پایہ تصنیف، اسکی انشاء و ادب کا شاہکار کتاب البیان والتبیین ہے جو اپنی نوعیت کی عربی ادب میں پہلی کتاب ہے،

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۳۳ [2] بحوالہ ذیل طبقات الحنفیہ لابن قطلوبغا ص ۱۲۶

[3] تاریخ مسعودی برحاشیہ کامل ابن اثیر ج ۹ ص ۲۲۹

اس میں اس نے بیان کی اہمیت کا ذکر کیا ہے اور اپنے مطالب و مقصد کو واضح اور ثابت کرنے کے لیے آیات، احادیث، اشعار، امثال، خطبات اور حکم و بصائر پر مشتمل اقوال نقل کیے ہیں، جاحظ کا بیان ہے کہ اس نے ابن ابی داؤد کو یہ کتاب ہدیہ کی تو اس نے ۵ ہزار دینار اسے انعام میں دیئے، البیان والتبیین دو جلدوں میں مصر کے مطبعہ علمیہ سے ۱۳۱۱ھ میں شائع ہوئی ہے، اور اس کے ساتھ مشکل و غریب الفاظ کی شرح حسن آفندی زکھانی کے قلم سے بھی اس میں شامل ہے۔

کتاب الحیوان: یہ جاحظ کی دوسری اہم مشہور اور ضخیم کتاب ہے، اس میں اس نے صرف حیوانوں کے ذکر پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ گوناگوں مسائل و مباحث اور مختلف النوع علمی، ادبی، تاریخی اور اجتماعی امور و نکات اور ان کے متعلق مفید معلومات نقل کیے ہیں، حیوانات کے حال میں ان کے مزاج و طبائع سے بحث کی ہے اور ان سے انسانوں کا تعلق دکھایا ہے، اس کتاب میں بھی آیات و احادیث، توراۃ، انجیل، کلام و امثال عرب، مختلف کتابوں کے معلومات اور انسانوں کے تجربات کو بطور ثبوت پیش کیا ہے، اس موضوع کے انتخاب کا سبب تحریر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"حیوانات میں خدا کی قدرت و حکمت اور ربوبیت کے عجیب و غریب آثار و مظاہر پائے جاتے ہیں، اسکے ثبوت میں قرآن مجید کی متعدد آیتیں موجود ہیں، مثلاً واوحیٰ ربک الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتا و من الشجر و مما یعرشون (نحل) نیز والانعام خلقہا لکم فیہا دفء و منافع و منہا تاکلون (نحل) سورۂ حج میں فرمایا: ان الذین تدعون من دون اللہ لن یخلقوا ذبابا ولو اجتمعوا لہ وان یسلبہم الذباب شیأ لا یستنقذوہ منہ ضعف الطالب والمطلوب ما قدروا اللہ حق قدرہ ان اللہ لقوی عزیز (حج) ایک اور جگہ ہے: افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت

۱؎ معجم الادباء ج ۶ ص ۷۸

اس کے علاوہ قرآن میں بعض سورتوں (بقرہ، انعام، نحل، نمل اور فیل وغیرہ) کے نام بھی حیوانات کے نام پر رکھے ہیں، حضرت علیؓ نے طاؤس اور بعض اور جانوروں کی حسین و جمیل خلقت کو خدا کی قدرت کا واضح مظہر بتایا ہے۔"

جاحظ نے اس کتاب میں عجیب الخلقت حیوانات کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن معتزلی ہونے کی بنا پر وہ عقلیت پسند تھا، اس لیے نہ تو خرافات اور بعید از قیاس باتیں نقل کی ہیں اور نہ زیب داستاں کے لیے محض دلچسپ اور محیر العقول واقعات تحریر کئے ہیں، بلکہ ہر چیز کو عقل و تجربہ کی کسوٹی پر دکھا ہے اور خلاف قیاس اور مستبعد امور کو یا تو رد کر دیا ہے یا مشکوک انداز میں بیان کیا ہے،

عربی زبان میں جاحظ کی کتاب الحیوان سے پہلے اس موضوع پر کوئی اور کتاب نہ تھی، البتہ ارسطو کی کتاب الحیوان جس کا وہ ماہر سمجھا جاتا ہے، سریانی زبان میں تھی، اور جاحظ نے اس سے بڑا استفادہ کیا ہے، اور کئی جگہ اپنی کتاب میں صاحب المنطق یا ارسطو کے نام کی تصریح کے ساتھ اس کی کتاب کے حوالے دیے ہیں، ابن ندیم نے اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔[1]

یہ کتاب اس حیثیت سے بھی بڑی دلچسپ اور جامع ہے کہ اس میں عرب و ہندوستان، ایران اور ہندوستان وغیرہ ہر ملک کے جانوروں کے ذکر کے ساتھ انکی تہذیب و ثقافت کا بھی تذکرہ ہے، اور اس ضمن میں آیات، احادیث، اشعار، ارسطو اور دوسرے عقلاء و اکابر کے آراء اور قصے بھی نقل کیے ہیں، چنانچہ پہلی اور دوسری جلد میں صاحب کلب و صاحب دیک کے مناظرہ کے ضمن میں ایسے مباحث و مسائل آگئے ہیں جن کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ مثلاً امارت و امامت کی بحث، شعر و سخن کا تذکرہ اور شعبیت وغیرہ کے مسائل،

جاحظ کا بیان ہے کہ اس نے محمد بن عبد الملک کو یہ کتاب ہدیہ کی تو اس نے ۵ ہزار دینار انعام دیے۔[2]

---

[1] الفہرست ص ۱۷۵ [2] معجم الادباء ج ۶ ص ۵۶،

محمد آفندی ساسی مغربی تونسی نے ۱۳۲۳ھ اور ۱۳۲۴ھ میں مطبع حمیدیہ مصر اور دار المقدم مصر سے اس کے اجزاء مرتب کرکے شائع کیے ہیں۔[1]

۳۔ کتاب البخلاء یہ بھی جاحظ کی مشہور اور دلچسپ تالیف اور اس کے طرز تحریر اور انشاء پردازی کا عمدہ نمونہ ہے، اس میں اس نے بخیلوں کے واقعات اور بخل کی اہمیت اور ترجیح کے دلائل نقل کیے ہیں، یہ کتاب یورپ اور مصر سے کئی بار شائع ہوچکی ہے۔[2]

۴۔ کتاب التاج واخلاق الملوک: صاحب اعلام نے ان دونوں کو ایک ہی کتاب سمجھا اور ان کا نام التاج فی اخلاق الملوک بتایا ہے،[3] مگر یہ دو کتابیں معلوم ہوتی ہیں، جرجی زیدان کا بھی یہی خیال ہے، اس کا قلمی نسخہ مکتبہ ایا صوفیہ میں موجود ہے،[4] اور یہ دار الکتب المصریہ سے شائع ہوئی ہے۔[5]

۵۔ مجموعہ رسائل: اس میں ۱۱ رسالے ہیں، پہلا حاسد و محسود کے متعلق، دوسرا فتح بن خاقان کے نام اور فوجوں کی خوبیوں کے متعلق، تیسرے میں کالے لوگوں کی گوروں پر فضیلت، چوتھے میں تربیع و تدبیر، پانچویں میں گویائی کی خاموشی پر ترجیح اور چھٹے میں تاجروں اور ان کے پیشہ یعنی تجارت کی خوبی دکھائی گئی ہے، ساتویں رسالہ کا موضوع عشق و محبت اور عورت ہے، آٹھویں میں دکلاء؟ نویں میں استنجاز وعد، دسویں میں مذاہب شیعہ اور گیارہویں میں مغنیوں کا ذکر ہے، یہ رسائل محمد ساسی تاجر کے اہتمام میں مطبع تقدم مصر سے ۱۳۲۴ھ میں[6] اور اس کے تین رسالے تربیع و تدویر، فخر السودان اور رسالہ فتح بن خاقان ۱۹۰۳ء میں لیڈن میں شائع ہوئے ہیں،[7] رسالہ فتح بن خاقان فضائل الاتراک کے نام سے ۱۹۰۸ء میں مصر سے بھی شائع ہوا ہے اور اس کا قلمی نسخہ ایا صوفیہ میں ہے۔[8]

۶۔ الحنین الی الاوطان: یہ بھی جاحظ کی عمدہ تصنیف اور عجیب عجیب باتوں پر مشتمل ہے۔

---

[1] معجم المطبوعات ج اول ص ۶۶۶ [2] ایضاً ص ۶۶۶ و تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج ۲ ص ۱۷۶ [3] الاعلام ج ۲ ص ۷۳۹ [4] تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج ۲ ص ۱۷۶ [5] معجم المطبوعات ج اول ص ۶۶۶ [6] ایضاً [7] تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج ۲ ص ۱۷۶

جاحظ نے اسے محمد بن عبد الملک کو ہدیہ کیا تھا، اور یہ شیخ طاہر الجزائری کی تصحیح کے بعد مطبعۃ المنار سے سنہ ۱۳۲۳ھ میں شائع ہوئی ہے،[۱]

۸۔ سلوۃ الحریف بمناظرۃ الربیع والخریف: یہ دلچسپ رسالہ آستانہ سے ۱۳۰۲ھ میں مرتضیٰ ابو القاسم کی کتاب الشہاب فی الشیب والشباب اور مصر سے ابوبکر بن محمد عارف خو میر کی کتاب مسامرۃ الضیف کے ساتھ شائع ہوا ہے[۲] اور بظاہر اس کا موضوع ربیع و خریف کا مناظرہ معلوم ہوتا ہے،

۹۔ المحاسن والاضداد والعجائب والغرائب: پہلے ۱۸۹۸ء میں لیڈن سے فان فلوتن کے اہتمام میں ان کے فرانسیسی زبان میں مقدمہ کے ساتھ اور ۱۳۲۲ھ میں مطبع عمومیہ مصر اور ۱۳۲۴ھ میں مطبع سعادت مصر سے شائع ہوئی ہے[۳] صاحب معجم المطبوعات کا خیال ہے کہ اس کتاب کا انتساب جاحظ کی جانب ثابت شدہ نہیں ہے،

۱۰۔ الفصول المختارۃ من کتب ابی عثمان: یہ مبرد کی کامل کے حاشیہ پر مطبع تقدم سے ۱۳۲۴ھ میں شائع ہوئی ہے[۴] اور غالباً یہ جاحظ کی کتابوں کے انتخاب پر مشتمل ہے،

۱۱۔ کتاب الاصنام: اس کا ذکر متعدد مصنفین نے کیا ہے، اور جاحظ نے کتاب الحیوان میں اس کے متعلق جو معلومات دیے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے یہ بڑی اہم اور معلومات افزا کتاب ہے، اس میں ہندوستانیوں اور اہل عرب کی بت پرستی کی توجیہ اور ان کے باہمی اختلافات بیان کیے گئے ہیں، اور یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ بت پرستوں کو دوسرے مذاہب والوں سے کیوں نفرت و عداوت ہوتی ہے، اور وہ عام اہل مذاہب کے برخلاف اپنے مذہب سے شدید وابستگی کیوں رکھتے ہیں، اور یہ وثن اور وثن وصنم اور دمیہ (ایک قسم کی مورتی اور بت) وجثہ (جسم یا اسٹیچو) وغیرہ کا فرق بتایا ہے اور بڑے بڑے مقدس لوگوں کی تصویریں بنانے، ان کو عبادتگاہو

---

[۱] معجم المطبوعات اول ص ۶۶۸ [۲] ایضاً و تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج ۲ ص ۱۶۸ و ۱۶۹ [۳] معجم المطبوعات ج اول ص ۶۶۶ و ۶۶۷ [۴] ایضاً ص ۶۶۸

اور مکانوں میں آویزاں کرنے کے اسباب بیان کیے ہیں، اور بت پرستی کی ابتدا اور مختلف مذاہب کی باہمی آویزش اور تفریق وغیرہ کی تفصیل تحریر کی ہے،[1] صاحب معجم المطبوعات نے اس کو غیر مطبوعہ بتایا ہے، اور حاشیہ میں زنکر کی فہرست کی اس رائے کی تردید کی ہے کہ وہ بولاق سے ۱۳۲۵ھ میں شائع ہوئی ہے،[2]

۱۲۔ تنبیۃ الملوک والمکائد = اس کا ذکر یاقوت حموی، صاحب اعلام اور جرجی زیدان نے کیا ہے، اور آخر الذکر نے لکھا ہے کہ اس کا قلمی نسخہ کوپرلی میں موجود ہے۔[3]

۱۳۔ سحر البیان = اس کا قلمی نسخہ کوپرلی میں ہے[4] اور موضوع نام سے ظاہر ہے،

۱۴۔ کتاب العرافۃ والزجر والفراسۃ = اس کا کئی مصنفین نے ذکر کیا ہے، لیکن صرف جرجی زیدان نے اس کے متعلق اس قدر لکھا ہے کہ وہ مکتبہ لیڈن میں موجود ہے، اور اس میں اہل مذاہب کے مذاہب کا ذکر ہے۔[5]

۱۵۔ رسالۃ فی بنی امیہ = اس کا قلمی نسخہ مکتبہ خدیویہ مصر میں ہے[6] اس کا ایک حصہ عصر المامون کے مصنف احمد فرید رفاعی نے نقل کیا ہے۔

۱۶۔ کتاب النبی والمتنبی = یاقوت اور صاحب اعلام نے اس کا یہی نام تحریر کیا ہے، مگر جاحظ نے کتاب الحیوان میں اس کا نام کتاب فرق ما بین النبی والمتنبی لکھا ہے، اس کے متعلق مولانا شبلی لکھتے ہیں:" نبوت کی حقیقت، شرائط، متنبی و غیر متنبی میں حدفاصل کی بحث عہد نبوی و صحابہ میں نہیں پیدا ہوئی لیکن دولت عباسیہ کی ابتدا میں جب فلسفہ نے مذہب کے احاطہ میں قدم رکھا تو یہ بحث زور و شور کے ساتھ پیدا ہوئی، جہانتک ہم کو معلوم ہے سب سے پہلے اس مسئلہ پر جاحظ نے قلم اٹھایا اور ایک مستقل کتاب لکھی، علوم عقلیہ و نقلیہ میں جاحظ کا جو پایہ ہے اس کے لحاظ سے کیا جا سکتا ہے کہ

[1] کتاب الحیوان ج ۱ ص ۳ [2] معجم المطبوعات ج اول ص ۶۹۶ [3] تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج ۲ ص ۱۶۸ [4] ایضاً [5] ایضاً [6] ایضاً

اس نے کیا کچھ لکھا ہوگا، لیکن قدماء کی تمام تصنیفات اس طرح برباد ہوچکی ہیں کہ آج اس خرمن کا ایک دانہ بھی موجود نہیں، ایثار الحق میں جو نویں صدی کے ایک مجتہد علیؔ کی تصنیف ہے اور آجکل مصر میں چھاپی گئی ہے، ایک جگہ صرف اس کتاب کا تذکرہ ہے اور شرح مواقف میں نبوت کے اثبات کے جو چار طریقے لکھے ہیں ان میں سے دوسرے طریقے کی نسبت لکھا ہے کہ "یہ جاحظ کا مذہب ہے اور امام غزالی نے بھی اس کی تحسین کی ہے"[1]

۱۷۔ کتاب الفرق فی اللغۃ = مولانا عبد العزیز صاحب میمن کا بیان ہے اور اسکی تائید تذکرۃ النوادر دائرۂ معارف حیدرآباد سے بھی ہوتی ہے کہ اس کا قلمی نسخہ کتبخانہ جامع القرویین (فارس) میں ہے، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، یہ لغت کی کتاب ہے[2]۔

۱۸۔ کتاب نظم القرآن = اس کے نام سے اسکی اہمیت اور موضوع ظاہر ہے، جاحظ نے کتاب الحیوان میں لکھا ہے کہ اس میں نظم قرآن کے دلائل اور قرآن کی تالیف و ترتیب میں جو عمدہ عجیب اور دلچسپ طریقہ اختیار کیا گیا ہے، اس کی وضاحت کی گئی ہے[3]۔

۱۹۔ کتاب مسائل القرآن = ابن ندیم نے اس کا نام کتاب المسائل فی القرآن بتایا ہے، اور جاحظ نے کتاب الحیوان میں کتاب المسائل سے غالباً اسی کتاب کو مراد لیا ہے[4]۔

۲۰۔ کتاب الزرع والنخل = جاحظ نے اس کا پورا نام کتاب الزرع والنخل والزیتون والاعناب واقسام فصول الصناعات ومراتب التجارات لکھا ہے[5]۔ یاقوت حموی کا بیان ہے کہ جاحظ نے ابراہیم بن عباس صولی کو یہ کتاب ہدیہ کی تو اس نے ۵ ہزار دینار انعام دیے[6]۔

۲۱۔ کتاب فضیلۃ المعتزلہ = یاقوت نے جاحظ کی ایک اور کتاب کا نام کتاب الاعتزال وفضلہ عن الفضیلۃ بتایا ہے، مگر گمان غالب ہے کہ یہ دونوں ایک ہی کتاب کے نام ہیں، اور

---

[1] الکلام حصہ اول ص ۲۳ [2] معارف جلد ۱۴ نمبر ۵ ص ۵۲ و تذکرۃ النوادر ص ۱۰۰ [3] کتاب الحیوان ج ۱ ص ۵ [4] ایضاً [5] ایضاً ص ۴ [6] معجم الادباء ج ۶ ص ۷۶

نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں اس نے اپنے مذہب یعنی اعتزال کی اہمیت اور ترجیح بیان کی ہوگی،

۲۲۔ کتاب الرد علی المشبہ = اسکے نام سے ظاہر ہوتا ہو کہ اس میں فرقہ مشبہہ کا رد و ابطال کیا گیا ہو،

۲۳۔ کتاب الرد علی اصحاب الالہام = اس کا نام خود جاحظ نے کتاب اصحاب الالہام لکھا ہے ممکن ہے کہ یہ کوئی اور مستقل کتاب ہو،

۲۴۔ کتاب فخر القحطانیہ والعدنانیہ = جاحظ نے اس کا پورا نام کتاب القحطانیہ والعدنانیہ فی الرد علی القحطانیہ بتایا ہے[1] اس کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔

۲۵۔ کتاب الاخبار = جاحظ اور یاقوت نے اس کتاب کا ذکر کیا ہے، لیکن یاقوت نے ایک اور مستقل کتاب کا نام کتاب الاخبار و کیف تصح بتایا ہو، لیکن غالباً یہ ایک ہی کتاب ہوگی،

۲۶۔ کتاب الوعید۔ جاحظ نے اسکا یہی نام تحریر کیا ہو، مگر یاقوت نے کتاب الوعد والوعید لکھا ہے،

۲۷۔ کتاب النغرعا والبخار = اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں صحیح النسب و غیر صحیح النسب لوگوں کے متعلق معلومات ہوں گی،

۲۸۔ کتاب العرجان والبرصان = علامہ سیوطی نے اس کا نام کتاب العرجان والبرصان والقرعان لکھا ہے[2] اور نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں لنگڑوں، کوڑھیوں اور گنج سر والوں کا ذکر ہوگا،

۲۹۔ کتاب النساء = یہ یا تو کوئی مستقل تصنیف ہے یا مجموعۂ رسائل کا ساتواں رسالہ "رسالۃ فی العشق والنساء" ہے۔

۳۰۔ کتاب المغنین = غالباً مجموعہ رسائل کا گیارہواں رسالہ طبقات المغنین یہی کتاب ہے، یاقوت نے کتاب المغنین والغناء والصنعۃ کے نام سے جاحظ کی جس کتاب کا ذکر کیا ہے وہ اس کے علاوہ کوئی مستقل کتاب ہوگی۔

---

[1] کتاب الحیوان ج اول ص ۲ [2] طبقات النحاۃ ص ۳۶۵

۳۱۔ کتاب حکایۃ قول اصناف الزیدیہ ۔ جاحظ نے اپنی ایک تصنیف کا نام معارضۃ الزیدیہ وتفضیل الاعتزال علی کل نحلۃ بتایا ہے جو غالباً یہی کتاب ہوگی، موضوع نام سے ظاہر ہے۔

۳۲۔ جوابات کتاب المعرفۃ ۔ جاحظ نے اپنی ایک کتاب کا نام کتاب الجوابات لکھا ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ یہ دونوں ایک ہی کتاب ہیں یا دو۔

۳۳۔ کتاب الرد علی النصاری } یاقوت کے بیان کے بموجب یہ دو کتابیں ہیں لیکن جاحظ نے
کتاب الرد علی الیہود } اپنی ایک کتاب کا نام کتاب علی النصاریٰ والیہود ہی بتایا ہے

۳۴۔ کتاب الفتیا ۔ یہ نام یاقوت نے لکھا ہے۔ اور جاحظ نے القول فی اصول الفتیا والاحکام لکھا غالباً اسی کو مراد لیا ہوگا۔

۳۵۔ کتاب عصام المرید ۔ غالباً یاقوت کو اس سلسلہ میں وہم ہوا ہے، کیونکہ جاحظ نے شاید اسی کتاب کا نام بصیرۃ غنام المرتد وبصیرۃ کل جاحد وملحد لکھا ہے۔

۳۶۔ کتاب الاستبداد، ۳۷۔ کتاب جمہرۃ الملوک } ان کتابوں کا یاقوت اور صاحب اعلام
۳۸۔ کتاب البلدان، ۳۹۔ کتاب المعلمین، ۴۰۔ کتاب الحجاب } نے تذکرہ کیا ہے، لیکن کوئی معلومات
۴۱۔ کتاب صیانۃ الکلام } نہیں دیے ہیں۔

۴۲۔ کتاب العثمانیہ ۔ اس کا یاقوت اور جاحظ نے ذکر کیا ہے۔

اب ان کتابوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جن کا صرف جاحظ نے تذکرہ کیا ہے۔

۴۳۔ موازنۃ ما بین حق الخؤلۃ والعمومۃ ۔ اس کے متعلق کوئی معلومات نہیں دیے ہیں، لیکن نام سے اس کے مطالب کا اندازہ ہوتا ہے۔

۴۴۔ کتاب فضل ما بین الرجال والنساء ۔ اس میں عورتوں اور مردوں کے درمیان فرق ومراتب فضیلت کا ذکر ہے، اور یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ کن مواقع پر عورتوں کا درجہ مردوں سے زیادہ اور کن مواقع

پر کم ہوتا ہے، اور مرد و عورت دونوں میں کس کا حصہ لڑکوں کی تولید میں زیادہ ہوتا ہے، اور ان کے مناسب حال کاموں اور طریقوں کو بتایا ہے اور ان کے حقوق بیان کیے ہیں۔[۱]

۴۵۔ کتاب العرب والموالی: اس میں اہل عرب کی فضیلت و برتری اور ملوک و موالی کے متعلق میں ان کی عظمت و اہمیت کو دکھایا گیا ہے۔[۲]

۴۶۔ کتاب العرب والعجم۔ اس میں اہل عرب کی اہل عجم پر فضیلت بیان کی ہے،[۳]

۴۷۔ کتاب المعادن والقول فی جواہر الارض: اس میں مختلف قسم کی دھاتوں اور معدنیات اور ان کی مصنوعی اور قدرتی و مصنوعی قسموں کا ذکر ہے، اور یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ کس طرح بعض معدنیات بہت جلد تبدیل ہو جاتی ہیں اور بعض دیر میں اور بعض کے رنگوں میں فرق ہو جاتا ہے بعض میں نہیں ہوتا، نیز کیمیا وغیرہ کے متعلق مفید معلومات دیے ہیں،[۴]

۴۸۔ کتاب فرق ما بین ہاشم وعبد شمس: اس کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔

۴۹۔ کتاب فرق ما بین الجن والانس } اسکا موضوع بھی نام سے ظاہر ہے، جاحظ کے بیان کے
فرق ما بین الملائکہ والجن } مطابق اس میں حضرت سلیمانؑ کے دربار کے عفریت نیز الذی کان عندہ علم من الکتاب کا ذکر اور علم کا مطلب و تاویل بھی بتائی گئی ہے،[۵]

۵۰۔ کتاب الافاق والریاضات: جاحظ کا بیان ہے کہ اس میں زرق و نفقہ اور تاجروں اور دوسرے اہل حرفہ کی حصولِ معاش کے لیے سعی و تدبیر کا ذکر ہے،[۶]

۵۱۔ رسائل الہاشمیات: نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان رسالوں میں بنو ہاشم کے متعلق معلومات لکھے گئے ہوں گے، اور جاحظ نے بھی لکھا ہے کہ میں نے اس میں انکی صحیح اور دلکش تصویر کھینچی ہے اور انکی اہمیت و فضیلت کے دلائل بھی بیان کیے ہیں،[۷]

---

[۱] کتاب الحیوان ج اول ص ۲ [۲] ایضاً [۳] ایضاً [۴] ایضاً ص ۳ [۵] ایضاً [۶] ایضاً [۷] ایضاً

۵۲۔کتاب خلق القرآن : اسکے متعلق یقین کے ساتھ تو نہیں کہا جا سکتا مگر نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں معتزلہ کے عقیدہ خلق قرآن کا ذکر ہوگا۔

۵۳۔کتاب الحجۃ فی تثبیت النبوۃ : نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں اثبات رسالت ونبوت کے دلائل بیان کیے گئے ہوں گے، اس سلسلہ کی ایک اور کتاب النبی والمتنبی کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

۵۴۔کتاب العباسیہ : یہ جاحظ کی نہایت اہم تصنیف ہے، اور موضوع نام سے ظاہر ہے۔

۵۵۔الفرق ما بین الحیل المخارق وبین الحقائق الظاہرۃ والاعلام الباہرۃ : اسکے متعلق کوئی معلومات نہیں ملتے ہیں۔

یاقوت نے حسب ذیل کتابوں کے صرف نام لکھے ہیں اور انکے متعلق کوئی معلومات نہیں دیے ہیں، ان میں بعض کا موضوع نام سے ظاہر ہے : کتاب المعرفۃ[۵۶]۔ کتاب مسائل کتاب المعرفۃ[۵۷]۔ کتاب الامامۃ علی مذہب الشیعۃ[۵۸]، کتاب الرد علی العثمانیہ[۵۹]، کتاب امامۃ معاویۃ[۶۰]، کتاب امامۃ بنی العباس[۶۱]، کتاب الفتیان[۶۲]، کتاب القواد[۶۳]، کتاب اللصوص[۶۴]، کتاب ذکر ما بین الزیدیۃ والرافضۃ[۶۵]، کتاب المخاطبات فی التوحید[۶۶]، کتاب تصویب علی فی تحکیم الحکمین[۶۷]، کتاب وجوب الامامۃ[۶۸]، کتاب الشارب والمشروب[۶۹]، کتاب افتخار الشتاء والصیف[۷۰]، کتاب نوادر الحسن[۷۱]، کتاب الفخر ما بین عبد شمس ومخزوم[۷۲]، کتاب الطفیلیین[۷۳]، کتاب المعاد والمعاش[۷۴]، کتاب التسویۃ بین العرب والعجم[۷۵]، کتاب السلطان واخلاق اہلہ[۷۶]، کتاب الدلالۃ علی ان الامامۃ فرض[۷۷]، کتاب الاستطاعۃ وخلق الافعال[۷۸]، کتاب الہدایا منحول[۷۹]، کتاب الاخوان[۸۰]، کتاب الرد علی من الحد فی کتاب اللہ عز وجل[۸۱]، کتاب آی القرآن[۸۲]، کتاب الناشی والمتلاشی[۸۳]، کتاب حانوت عطار[۸۴]، کتاب التمثیل[۸۵]، کتاب فضل العلم[۸۶]، کتاب المزاح والجد[۸۷]، کتاب الصوالجۃ[۸۸]، کتاب ذم الزنا[۸۹]، کتاب التفکر والاعتبار[۹۰]، کتاب الحجر والنبوۃ[۹۱]۔ کتاب آل ابراہیم بن المدبر فی المکاتبۃ[۹۲]، کتاب حالۃ القدرۃ علی الظلم[۹۳]، کتاب امہات الاولاد[۹۴]، کتاب الاخطار والمراتب والصناعات[۹۵]، کتاب وروثۃ العالم[۹۶]، کتاب الرد علی من زعم ان الانسان جزء لا یتجزء[۹۷]، کتاب ابی النجم وجوابہ[۹۸]، کتاب التفاح[۹۹]، کتاب الانس والسلوۃ[۱۰۰]، کتاب الکبر المستحسن والمستقبح[۱۰۱]،

کتاب [۱۰۲] نقض الطیب، کتاب [۱۰۳] الحزم والعزم، کتاب [۱۰۴] عناصر الآداب، کتاب [۱۰۵] تحصین الاموال
کتاب [۱۰۶] الامثال، کتاب [۱۰۷] فضل الفرس، کتاب [۱۰۸] علی المهلاج، کتاب [۱۰۹] الرسالة الی ابی الفرج
بن نجاح فی امتحان عقول الاولیاء، کتاب [۱۱۰] رسالة ابی النجم فی الخراج، کتاب [۱۱۱] رسالة فی القلم
کتاب [۱۱۲] رسالة فی فضل اتخاذ الکتب، کتاب [۱۱۳] رسالة فی العفو والصفح، کتاب [۱۱۴] رسالة فی اثم السکر، کتاب [۱۱۵] رسالة فی
الامل والمامول، کتاب [۱۱۶] رسالة فی الحلیة، کتاب [۱۱۷] رسالة فی ذم الکتاب، کتاب [۱۱۸] رسالة فی مدح الکتاب،
کتاب [۱۱۸] رسالة فی مدح الوراق، کتاب [۱۱۹] رسالة فی ذم الوراق، کتاب [۱۲۰] رسالة فی من یسمی من الشعراء عمرا،
کتاب [۱۲۱] رسالة الیتیمة، کتاب [۱۲۲] رسالة فی فرط جهل یعقوب بن اسحاق الکندی، کتاب [۱۲۳] رسالة فی الکرم
الی ابی الفرج بن نجاح، کتاب [۱۲۴] رسالة فی موت ابی حرب الصفار البصری، کتاب [۱۲۵] رسالة فی المیراث،
کتاب [۱۲۶] فی الاسد والذئب، کتاب [۱۲۷] رسالة فی کتاب الکیمیاء، کتاب [۱۲۸] رسالة فی القضاة والولاة،
کتاب [۱۲۹] الملوک والامم السالفة والباقیة، کتاب [۱۳۰] رسالة فی الرد علی القولیة، کتاب [۱۳۱] العالم والجاهل،
کتاب [۱۳۲] النرد والشطرنج، کتاب [۱۳۳] غش الصناعات، کتاب [۱۳۴] خصومة الحول والعور، کتاب [۱۳۵] ذوی
العاهات، کتاب [۱۳۶] اخلاق الشطار، کتاب [۱۳۷] الملح والطرف وما حرمن النوادر، کتاب [۱۳۸] رسالة فی
کتمان السر، کتاب [۱۳۹] رسالة فی مدح النبیذ، کتاب [۱۴۰] رسالة فی ذم النبیذ،

اس فہرست میں جاحظ کے بعض رسائل کا نام بھی آیا ہے، اس کے بعض رسائل کے نمونے احمد فرید رفاعی نے عصر المامون جلد سوم میں دیے ہیں، جاحظ کے رسالے بھی اس کی اعلیٰ انشا پردازی اور ادب و بلاغت کا مظہر ہیں، چنانچہ احمد فرید لکھتے ہیں:-

وللجاحظ رسائل فی الاستعطاف وشکوی الزمان آیة فی البلاغة [۱]

---

[۱] عصر المامون ج ۱ ص ۴۲۶

حیدرآباد میں قدیم سکوں کا ایک نادر خزانہ

از جناب سید امین الدین حسینی بی اے، حیدرآباد

گو یہ مضمون بہت سرسری اور تشنہ ہے، اس میں یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ سکوں کے اس نادر ذخیرے کا انجام کیا ہوا، وہ کہاں گیا اور بحرفنا میں غرق ہونے کا کیا مطلب ہے، اب اس سے فائدہ اٹھانے کی کوئی شکل باقی ہے یا نہیں، لیکن اس کو محض اس لیے شائع کیا جاتا ہے کہ شاید سکوں کے شائقین اس کا سراغ لگانے کی کوشش کریں،

"م"

حیدرآباد "آندھرا پردیش" میں چادر گھاٹ کے پل کے قریب ایک مکان تھا جس کا نام تھا سویٹ آہرن (Sweet Aaburn)، یہ مکان اگرچہ باہر سے ویران نظر آتا تھا لیکن اندر سجا سجایا ایوان اور اس کے مالک تھے ڈاکٹر پالن شا دکشا دار پوروالا، یہ سابق میں سرکار آصفی کی فوج کے لاشعاعی شعبہ کے عہدہ دار تھے، افسوس کہ چند ہی سال قبل وہ اس جہان سے رخصت ہوگئے، ڈاکٹر صاحب اگرچہ اپنے فن کے اعتبار سے تو ڈاکٹر تھے لیکن ان کی عمر کا پورا حصہ عہد قدیم کے سکوں کی تلاش و تحقیقات اور ان کے جمع ہی کرنے میں گذرا، اور ہر آن انھیں یہ لو لگی رہتی کہ قدیم سکوں کے ذخیرے کے ساتھ ساتھ ہر روز نت نئی تحقیقات میں اضافہ ہوتا رہے، چنانچہ اس شوق و شغف نے ڈاکٹر صاحب کو اچھا خاصا ماہر سکہ جات بنا دیا تھا، انھیں تاریخ سے بھی خاص دلچسپی تھی، اور عرصہ دراز سے قدیم ترین سکوں کی تحریرات حل کرکے تحقیقی مضامین شائع کرتے رہتے تھے، ان سکوں کو وہ بڑے ذوق و شوق سے لوگوں کو دکھاتے تھے، اور گھنٹوں اس میں صرف کرتے تھے، ان سکوں کے تحفظ کا بھی خاص انتظام کیا تھا،

طلائی سکوں کے لیے اچھی قسم کی لکڑی کے چھوٹے چھوٹے خانے بنوائے گئے تھے، جن میں یہ سکے رکھے گئے تھے۔ ہر سکے کے متعلق مختصر طور پر اس کا عہد و سنہ و مقام ٹکسال وغیرہ ضروری معلومات تحریر تھیں۔ ان سکوں کی حفاظت کے لیے انھوں نے دو تنومند اور خونخوار السیشین کتے پالے تھے، جو رات کو سکوں کی حفاظت کرتے تھے۔

راقم حروف کو چند سال قبل بعض خاص سکوں کی تحقیق مطلوب تھی، اسی لئے اس تجسس نے اس تاریخی خزانے کا پتہ لگایا اور ان قیمتی اور نادر سکوں کے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کی تعداد کوئی دس ہزار ہو گی، اس بیش بہا ذخیرے میں قدیم سے قدیم اور قریب قریب ہر بادشاہ، ہر ملک، ہر عہد اور تقریباً ہر نوعیت کے سکے موجود تھے۔ بعض سکے ایسے دکھائی دیے جن کے مطالعہ سے فرشتہ جیسی مستند تصنیف کی تکذیب ہوتی تھی، بعض ایسے نادر تھے کہ شاید دنیا میں اپنی آپ ہی نظیر ہوں اور بعض محض چیستان و معمہ ہی تھے۔

ان سکوں کی مختصر سرگذشت اور اجمالی فہرست یہ ہے:-

قبل مسیح و بعد مسیح کے سکے، رومن، ساسانی، خراسانی، ایرانی، تورانی سکے، حبش کے شہنشاہ ہرقل (ہمعصر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کے عہد کے سکے، خلفائے بنی امیہ و عباسیہ کے دور کے سکے، چین و طایا کے سکے، ہندوستان میں قدیم راجاؤں مثلاً پال اور گپتا وغیرہ کے دور کے سکے، مسلمانوں کے عہد حکومت میں خلجی و تغلق و لودھی وغیرہ کے سکے، گجرات، مالوہ، خاندیس کے حکمرانوں کے سکے، مغل بادشاہوں میں ہمایوں سے لیکر ابوظفر بہادر شاہ تک کے سکے، دکن میں راجگان وجیا نگر بہمنی، بریدی، عادل شاہی، نظام شاہی، قطب شاہی سکے، آصف جاہی سلطنت میں سمستان گدوال، ونپرتی، سکور، بسنتن شاہی و گوبند بخشی کے علاوہ جملہ سلاطین آصفیہ کے سکے، والی میسور حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے سکے۔

ان میں سے اکثر سکوں کی تحریریں اور مقام ٹکسال صاف پڑھا جاتا ہے، یہ سکے مختلف فلزات

اور مختلف شکل وصورت و وزن وقیمت کے تھے، ان سکوں کے نام یہ ہیں:-

درایا، ہون، اشرفی، فنم، بگوڈا، ٹنکہ، لاری، روپیہ، دام، پیسہ وغیرہ،

ان میں سے بعض ایسے سکہ جات بھی تھے جن کی تحقیق اس وقت تک نہیں ہوسکی، مثلاً ایک سکے پر "مدینۃ المعمورہ" اور سنہ جلوس ۵۵ھ کندہ ہے، اسی طرح ایک اور سکے پر جو آصفجاہی دور سے متعلق ہے "فرخندہ بنیاد" لکھا ہے، اور اوپر "امراؤ" کندہ ہے، غالباً امراوتی ہوگا، اسی عہد کے ایک سکہ کے ایک جانب "مہاراج" لکھا ہے، یہ مہاراج اس وقت تک پردۂ راز ہی میں ہیں،

ان کے علاوہ بعض ایسے سکے بھی دکھائی دیے جو بہمنی حکمراں مثلاً محمد شاہی اور فیروز شاہی عہد سے متعلق تھے لیکن بلحاظ سنین فرق پڑتا ہے، بعض سکہ جات تو عجیب وغریب شکل وصورت کے نظر آئے، مثلاً "خنجر نما"، "جسا نما"، اور چینی کے سکے اور "خود" اور کشتی کی شکل کے سکے، اور بعض تو محض چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہی تھے، جن پر کوئی عبارت نہیں تھی، لیکن اب نہ وہ مکان ہی رہا اور نہ ہی وہ مکین، اسی طرح نہ وہ خزانۂ مکنون، بلکہ "کل من علیہا فان" کے قانون قدرت کے مطابق بحر فنا میں غرق ہوگئے،

تاریخ سندھ

اس میں سندھ کا جغرافیہ، مسلمانوں کے حملہ سے پیشتر کے مختصر اور اسلامی فتوحات، خلافت راشدہ کے زمانہ سے لیکر آٹھویں صدی ہجری تک سندھ جن جن حکومتوں کے ماتحت رہا ان کی پوری تاریخ اور ان تمام دوروں کے نظام حکومت، تمدنی و تمدنی حالات اور رفاہ عامہ کے جو کام انجام پائے ان سب کی پوری تفصیل ہے۔ قیمت ۔۔۔ ۔۔۔

"منیجر"

آثارِ علمیہ و ادبیہ

مکاتیب مولانا مناظر احسن گیلانی

بنام

مولانا سید سلیمان ندویؒ

۱۵ رمضان المبارک ۱۳۶۵ھ
جوار الجامعۃ العثمانیہ حیدرآباد دکن

سیدی و سید المسلمین   متعنا اللہ بطول حیاتکم   السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

عریضۂ نیاز بھیجنے کی حد تک تو خاکسار نے بھیجدیا تھا لیکن پہنچ جائیگا، اس کی امید ہڑتالیوں کی وجہ سے نہیں تھی، اور جواب پاکر تو قدیم لفافوں کے الفاظ "بعونہ تعالیٰ" زبان پر جاری ہوئے، مکتوب گرامی پڑھنے کے ساتھ دل سے آواز آئی، آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا "تاللہ لقد اٰثرک اللہ علینا" ایوبیت کے لیے جو عہد مناسب تھا اس میں ایوبیت، اور سلیمان کو بہرحال سلیمانیت کی کیفیتوں سے بھی لذت اندوز ہونا تھا، سو اب اس سے لطف اندوزی فرمایئے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی متناقض آرزو شہادت فی سبیل اللہ والموت فی بلد رسول اللہ باوجود متناقض ہونے کے پوری کی گئی کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے، وہی آپکے ساتھ دیکھ رہا ہوں، جوانی سے زیادہ سہولت بڑھاپے میں عطا کی جائے، دل آدمی کا بھی چاہتا ہے لیکن بڑھاپے میں نوکری سے نکالدیا جاتا ہے آدھی آمدنی اسکی چھین لیجاتی ہے مگر کرنے والا کرنے پر جو آتا ہے تو یہی دکھاتا ہے کہ بڑھاپے میں دونی بلکہ چوگنی آمدنی کر دی گئی، سچ تو یہ ہے کہ حیدرآباد میں وہ سہولتیں اس آؤ بھگت کی توقع نہیں ہوسکتی تھی جنکی امید ہے کہ بھوپال میں آپکو تجربات ہو رہے ہونگے، بھوپال آپ کو بڑا نہیں بنائیگا، بلکہ بھوپال نے آپ سے بڑائی حاصل کی ہے، نتیجہ دونوں باتوں کا ایک کیسے ہوسکتا ہے، اگر مولوی شبیر احمد صاحب نے دعوت عثمانی کو مدرسہ نظامیہ کی نظامت کے متعلق قبول

گویا آپ دیکھ لیں گے کہ ستی محمد حمیدی دعوت تھی یا عثمانی؟ اور سچ تو یہ ہے کہ جس اقتدار کو بھوپال میں اس وقت آپکے لیے حق تعالیٰ نے مہیا فرمایا ہے، مجھے تو امید ہے کہ اس سے کوئی بڑا انقلابی نتیجہ کم از کم مسلمانوں کی تعلیمی زندگی میں ظاہر ہوگا۔ انشاء اللہ کمینیوں کا اسیر بنکر آپ کو وہاں نہیں رکھا جائیگا، اگر میرا حسن ظن صحیح ہے تو پھر آپ ذمہ دار ہوں گے، اگر اس ارتداد کی تحریک کے مقابلہ میں کچھ نہ کر سکے، جسے کانگریسی حکومتیں اپنے اپنے صوبوں میں تعلیم کے نام سے مسلمانوں میں جاری کرنے پر تلی ہوئی ہیں، ایک نہ دو نہیں تین تین ندرے آپکے سپرد کیے گئے ہیں، چاہیے تو "جامعہ اسلامیہ حمیدیہ" کے قالب میں اس کو ڈھال کر دوسرے علاقے کے مسلمانوں کے لیے اس کو نمونہ بنایئے، دینی علوم کو محفوظ رکھتے ہوئے، چھوٹے ہوئے کارتوسوں کی جگہ تازہ بھرے ہوئے کارتوس (یعنی علوم جدیدہ جن کا مذہب سے تعلق ہے، مثلاً فلسفہ، نفسیات، معاشیات، مغربی زبانیں انگلش فرنچ اور ہندوستان کی مقامی ضرورت کے لحاظ سے بھاشا اور سنسکرت) کا جوڑ اسلامی علوم کے ساتھ قائم کیجئے، ہونا تو یہی چاہیے اور شاید کبھی یہ ہو کر رہے گا، لیکن اس خیبر کا فاتح کون ہوگا، علی کے گھرانے سے کسی کو اٹھنا چاہیے،

بہرحال آپنے دعوت دے ہی دی ہے، بھوپال کی زیارت کی سعادت بھی کبھی نصیب نہیں ہوئی ہے، ایک دو سفر حیدر آباد کا ابھی باقی ہے، انشاء اللہ اسی سلسلہ میں حاضری کا موقع میسر آیا، تو شفاہاً بھی ان ہی باتوں کو عرض کروں گا، جنھیں بجز آپکے نہ کسی سے کہہ سکتا ہوں، اور نہ کوئی سن سکتا ہے، میرا خیال ہے کہ اردو عربیب کو بچا لینے کی واحد شکل اب یہی ہے کہ ہر قسم کی تعلیم میں مسلمانوں کے لیے بنام دینیات اسلامی عربی کو لازم کر دیا جائے، اس کے سوا کوئی دوسری صورت اب اس غریب کے بچنے کی نظر نہیں آتی، مولوی عبدالحق ہندوؤں کو تو اردو کیا پڑھائیں گے، بنگال، سندھ، گجرات کے مسلمانوں کو بھی یہ سمجھانا آسان نہیں ہے کہ اردو پڑھنا کسی وجہ سے بھی ان کے لیے ضروری ہے، لیکن عربی کا معاملہ اور ہے، اس کے لزوم کا مطالبہ ہر مسلمان سے کیا جا سکتا ہے، خواہ کہیں کا ہو، ہندوستان بالعموم میں عربی کی تعلیم کا آسان ذریعہ بھی ہوگا کہ اردو اور فارسی سے آشنا بنانے کے بعد عربی میں لوگوں کو لگایا جائے، حیدر آباد میں تو کچھ

ہوسکا، کمیٹیوں نے سب کام خراب کیا، خیال تو کیجیے کہ اس کمیٹی کی بدولت کہ مولانا عبدالحئی مرحوم کی کتاب نزہۃ الخواطر وغیرہ آج چار سال سے کمیٹی کے چکر میں ہے، بمشکل چار سال کی جدوجہد کے بعد پہلی جلد کی طباعت کی اجازت عطا ہوئی ہے، علی میاں بے چارے نے ایک مختصر لیکن جامع تعارفی مقدمہ اس کے شروع میں لکھا تھا، ارباب کمیٹی کی نگاہوں میں وہ نہ جچا، فانا للہ وانا الیہ راجعون، بیچارے کمیٹی سے تنگ آگئے تو منظور ہونے لگے،

رویت ہلال کا ثبوت بالریڈیو کے متعلق آپ نے دریافت فرمایا ہے، شہادت کا لفظ اس موقع پر گو استعمال کرنے والے استعمال کرتے ہیں، لیکن یقبل قول الواحد العدل فی احد عشر موضعا فی تقدیم السلف فی الجرح والتعدیل والترجمہ وفی جودۃ المسلم فیہ ورداءتہ وفی الاخبار بالفلس بعد مدۃ عزل وفی رسول القاضی الی المزکی وفی اثبات العیب وفی شہر رمضان عند الاعتلال الخ جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ عام خبروں پر جن ذرائع سے اعتماد کیا جاتا ہے وہی حال رویت ہلال رمضان کا عند الاعتلال ہے، اس وقت اسی قدر عرض کرتا ہوں، باقی پھر کبھی۔ خاکسار مناظر احسن گیلانی

مولانا عمران خان صاحب کو سلام فرما دیجیے، جو کچھ ان کے متعلق آپ نے رقم فرمایا ہے خاکسار پہلے ہی ان باتوں کو کہہ چکا تھا، منہم الیہ

۲۹ر دسمبر ۱۹۵۵ء
حیدرآباد دکن جوار الجامعۃ العثمانیہ
"حول المسجد الاقصیٰ"

سیدی طال اللہ بقائکم وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بڑے وقت میں آپ کے نامہ سکینت سے دل کو سکون میسر آیا، ہر طرف سے ایسی ناگوار نامناسب خبریں مسلسل آرہی تھیں کہ قریب قریب ہارے میں نے اپنے دل کو گویا یوں سمجھا کہ تو بھی اکیلا تھا، ایک دہر تو اس کی پچھلی زندگی کی آخری منزل پہلے ہی سے تھی، اب کہاں بہار، کہاں دکن، جہاں کا سفر درپیش ہے وہ سامنے جھانک رہا ہے، گویا یوں سمجھا کر رہ گئے کہ شیرازہ کا ہار دل ٹوٹ گیا، لیکن پہلی دفعہ آپ کے نوازش نامہ نے دل کی کچھ ڈھارس بندھائی، اسی کے دوسرے دن ایک خط بھی میاں مکارم کا استنبول سے ملا جس میں قریب قریب اسی

خیال کا اعادہ انھوں نے بھی کیا ہے، دیکھئے حالات آئندہ کن صورتوں کو سامنے لاتے ہیں ۔

ستبدی لک الایام ماکنت جاھلا　　ویاتیک بالاخبار مالم تزود

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بسا اوقات اس جاہلی شعر کو استعمال فرماتے اور کہتے کہ بڑی سچی بات کہہ گیا ہے، میاں ہاشم کے معاملہ میں دوڑ دھوپ کر رہا ہوں قطعی طور پر میرے پاس آنا جانا بند کر دیا ہے لیکن بیچارا مکافات نہیں ہے، خدا کرے ان کی بیوی بچوں کے نام وظیفہ کا اجرا عمل میں آئے، ماجد میاں کے متعلق ہوش صاحب نے صدر اعظم سے جو تحریک کی تھی اس کا نتیجہ نکل آیا، توقع تو دونے اضافے کی تھی لیکن فی الحال پچھتر روپے کے اضافے کا ہوا ہے، میں تو اس کو بھی غنیمت خیال کرتا ہوں، بے چارے مولوی عبد الباری نے ساری زندگی خراب کرکے دکن سے قریب قریب بس اسی مقدار میں نفع اٹھایا، ان کی امداد کلدار کی شکل میں دو سو کی ہوگی گویا سوا دو سو سے زائد ہی سمجھیے، دیکھئے خوش ہوتے ہیں، یا کیا، کل ہی اطلاع بھیجی ہے، مولانا ظفر احمد صاحب کے طویل مقالہ کا تصیر جواب نظر سے گذرا ہوگا، آپ کا طبی مقالہ بڑا پر مغز و معلومات بخش ہے، جزاکم اللہ من خیر الجزاء، اس سے فائدہ ہوا خصوصاً بہار کی تاریخ کے معلومات میں اضافہ ہوا، حسب ارشاد دوسری جلد جس کا ایک زائد نسخہ پڑا ہوا تھا بھیج رہا ہوں، آپ کو اتنی فرصت اس قسم کے خرافات کے پڑھنے کی کہاں مل سکے گی لیکن خواب آوری کے لیے سرہانے رکھ لیجئے، تھوڑا تھوڑا کرکے دیکھ جایئے، تو میرا دل خوش ہوگا، ایک غرض بھی آپ سے کل ہی متعلق ہوگئی لکھدی ہیں میاں مکارم کی بڑی لڑکی کی شادی آپ کے مجھلے ساڑھو مزنوری نثار صاحب کے لڑکے سے ہوئی ہے، افتخار احمد نام ہے، میرے ساتھ بہ تلاش روزگار دکن بھی آئے تھے، ملازم ہوگئے تھے، مگر جیسی ملازمت چاہتے تھے ویسی نہ ملی، آخر چھوڑ کر بہار ہی چلے گئے اور وہاں کد و کاوش کے بعد ایک معقول صورت نکل آئی ہے، ڈیڑھ دو سال سے اسی جگہ پر ہیں، کارخانہ انڈسٹری کے انسپکٹر ہیں، ملا جلا کر غالباً دو سو روپے مل جاتے ہوں گے، کل ان کا خط آیا ہے کہ کچھ لوگ جیسا کہ قاعدہ ہے ریشہ دوانیوں میں لگ گئے ہیں، مجھ سے خواہش کی ہے کہ

ڈاکٹر محمود صاحب (وزیر بہار) کے نام ایک سفارشی خط منگوا کر بھیجدوں، وہ میرے ہی نہیں آپ کے بھی عزیز ہیں، ان کی خالہ بنت ڈاکٹر صدیق مرحوم ہے آخر آپ کی شادی ہوئی تھی، اس لحاظ سے گویا سٹرہ بیٹا آپ کے ہوئے، ممکن ہے اور رشتے بھی ہوں، بہرحال اس وقت تو اس خاکسار کی التجا کا لحاظ فرماتے ہوئے چند کلمۂ خیر لکھ دیجئے، چاہے اس کو براہ راست ان کے نام پٹنہ بھیجدیجئے، پتہ ان کا یہ ہے: گلزار باغ، انیم کوٹھی، افتخار احمد انسپکٹر کانچ اندسٹری، اور یہ مناسب نہ ہو تو میرے پاس روانہ فرما دیجئے، میں افتخار میاں کو بھیجدوں گا، لیکن اس میں طول عمل و طول وقت دونوں ہے، معلوم نہیں ان کی ضرورت کیسی ہے، ایک بڑا دردناک سانحہ یہ ہے کہ میرا بھانجا مولوی عبدالعزیز خان بہادر کا لڑکا جو میاں نجم الہدیٰ کا داماد بھی ہے، اور سب ڈپٹی تھا، دانا پور میں تھا، اسی ہنگامے میں فوج کے ساتھ بھیجا گیا تھا، مسلمانوں کے ساتھ جو مظالم ہوئے تھے ان کو دیکھ کر اس کا قلب الٹ گیا، واقعی مجنون ہوگیا، کل خبر آئی ہے کہ کوٹھے سے اپنے آپ کو گرادیا جس سے وہ زندہ بچ گیا ہے، تعجب ہے، جنون کے ساتھ اب چوٹ کی نئی آفت ہے، اس کے لیے دعا کیجئے۔

مناظر احسن گیلانی

۱۸ر فروری سنہ ۱۹۴۷ء

حیدرآباد دکن

حول المسجد الاقصیٰ۔ جوار الجامعہ

سیدی الکریم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

کل بدحواسی میں کارڈ لکھتے ہوئے ایک ضروری مضمون کا ذکر ہی رہ گیا، اسکی تلافی اس عریضے سے کرتا ہوں، یعنی مولانا عبید حسب صاحب کے متعلق آپ نے جو سفارش فرمائی تھی اس کا جواب بہرحال مجھے دینا چاہئے تھا، اور وہ یہی ہے کہ اس سال تو سارا قصہ ختم ہوچکا ہے، اب تو کل ایک ماہ امتحان میں باقی ہے، کاش مولانا دسمبر وغیرہ میں آپ کیا دلاتے تو یہ کوئی چنداں دشوار امر نہ تھا، اب آئندہ سال ہی کا انتظار کرنا پڑیگا، شاید میں

وعدہ بھی کر لیتا لیکن جہاں تک موجودہ حالات کا اقتضا ہے، اس وقت کے آنے سے پہلے جامعہ مجھے چھوڑ دیگی یا میں اس کو چھوڑ دوں گا، میری مدت ملازمت ستمبر ہی میں ختم ہو رہی ہے، امتحانات کا نظم نومبر میں ہوتا ہے۔ میری طرف سے بھی عذر ان کی خدمت میں پیش فرما دیجئے۔

اسی سلسلہ میں آپ کو بھی مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ اچانک حیدرآباد کے حالات بدل گئے ہیں، اب مسلمانوں کا حیدرآباد کم از کم اس وقت تو وہ نظر نہیں آ رہا ہے، برادرم تقی الدین صاحب اور صدر اعظم موجود میں کشمکش اندرونی طور پر تو شاید شروع ہی سے جاری تھی لیکن ظہور اس کا آخر جنوری میں ہوا، ایک اسکیم مجلس مقننہ کی بنا کر وہ لے گئے تھے جس پر صدر اعظم بہادر نے فرمایا کہ تم بڑی بڑی اسکیمیں صرف بنایا کرتے ہو اور کام کرنے کا مطلق سلیقہ تم میں نہیں ہے، اس پر تقی کو کچھ ناگواری ہوئی جواباً کہا کہ کام تو خاکسار ضرور کرتا ہے، مگر وہ الجھتے ہی رہے، اور آخر میں کہا کہ "آپ گھر بیٹھ جایئے"، جس کے معنی یہی تھے کہ استعفا داخل کیجئے، بیچارے کیا کرتے استعفا داخل کر دیا، اس کے بعد درمیانی لوگ تگ و دو میں مصروف ہوئے، اور پہلے قصہ کچھ ختم سا ہو گیا لیکن بعد کو مخالف پارٹی نے صدر اعظم صاحب کو ابھارا اور ایک طویل مسودہ معافی نامہ کا لکھ کر تقی صاحب کے پاس صدر اعظم صاحب نے بھیجا کہ اس پر دستخط کر کے واپس کرو، انھوں نے اس سے انکار کیا، تب جائزے دیدینے پر ان کو مجبور کیا گیا، اس وقت اخبار پیام کے اڈیٹر جناب قاضی عبدالغفار صاحب پیش پیش ہیں، پندرہ سو روپیہ کی ایک جگہ اطلاعات عامہ کی نظامت پر ان کی بحالی بھی ہو گئی ہے، اور تقی صاحب کی جگہ مقننہ میں ان ہی کو سرکاری طور پر نامزد کر دیا گیا ہے۔ تقی صاحب ہوائی جہاز پر بیٹھ کر مالیر روانہ ہوئے، جہاں مسلمانوں کے جماعت جنگ اس وقت مقیم ہیں۔

مسلمانان حیدرآباد اور حکومت سے کشمکش روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ کس وقت کیا صورت پیش آ جائے، دونوں طرف ضد پر اصرار ہے۔ ان امور کا تذکرہ میں نے

اس لیے بھی کیا کہ مسلم یونیورسٹی کے متعلق آپ کا جو خیال ہے کہ حیدر آباد میں مجھے توسیع مل جائیگی، جہانتک
میرا خیال ہے صحیح نہیں ہے۔ اس کا امکان تو ہے کہ میں کچھ کوشش و پیروی کروں تو سال دو سال کے لیے
اور حیدر آباد میں ٹک جاؤں لیکن یہ قطعی طور پر طے کیے ہوئے ہوں کہ اس معاملہ میں کسی سے کچھ
نہ کہوں گا، خود میرا دل حیدر آباد سے اچاٹ سا ہو گیا ہے، حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں،
اور میں بہ ظاہر ان سیاسی شاطرانہ عیاریوں اور زد و برد میں کسی قسم کا کوئی حصہ بھی نہیں لے سکتا،
مجھ میں اس کا قطعاً کوئی سلیقہ نہیں ہے، تقی صاحب کے متعلق تو معلوم ہوا ہے کہ حیدر آباد کی پبلک
ان کو حکومت کے مقابلہ میں اپنا قائد بنانا چاہتی ہے، بھلا ان جھنجھٹوں سے مجھ عافیت طلب
انسان کو کیا سروکار ؟ نیز سال ڈیڑھ سال کے بعد جو صورت پیش آنے والی ہے، اسی کو ابھی
کیوں اپنے سامنے نہ آنے دوں،

غرض یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی میں اگر آپ کا خیال یہ ہے کہ بہ نسبت گیلانی یا اسی قسم کے
زاویۂ خمول کے کچھ کام میں کر سکتا ہوں تو پھر دیر میں مجھے بھیج دیجئے۔ یا پھر آپ ہی بتائیے کہ قبر میں
اترنے سے پہلے آخر چند سانس جو باقی ہیں اس کو کیسے گذاروں، آپ سے دل کی بات عرض کرتا ہوں
دینی خدمات کا شعور دماغ میں جب سے پیدا ہوا ہے، ذہنی طور پر میرا دماغ ہمیشہ اس پہلو کو سوچتا
رہا ہے کہ ہندوستان کے غیر اقوام تک اسلام کو آگے بڑھانے کی کوئی صورت نکالی جائے،
میرا خیال ہے کہ موجودہ مسلمانوں کو زندہ کرنے کی کوشش کچھ لا حاصل سی کوشش ہے، ہاں! یہ
ممکن ہے کہ کوئی تازہ خون اسلام کی رگوں میں کسی راہ سے اگر آ جائے تو ممکن ہے کہ اسکی حرارت
سے ان پرانے تھکے ہوئے، اکتائے ہوئے مسلمانوں میں زندگی پیدا ہو، مگر براہ راست انکے
جگانے اور جھنجھوڑنے کے کام کو قریب قریب مردوں کو جگانے اور جھنجھوڑنے کے ہم معنی
سمجھ رہا ہوں، جب حکیم الامت کی اسی سال کی حکومت میں یہ سوئے رہے، اور کچھ ان کی سمجھ میں

نہ آیا کہ ان میں کون آیا اور کون کون ان کو چھوڑ کر چلا گیا، تو اب دوسروں سے یہ متاثر ہوں، میری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آتی، یہ خیال تازہ دم فوج کے لانے کا دماغ سے اب بھی نہیں نکلتا، لیکن عمل کی کوئی صورت بھی سمجھ میں نہیں آتی، بہار ہی میں ممکن تھا کہ مہیا ہو جاتے، لیکن اس کا ماحول قطعاً بدل گیا، اب تو اسلام سے یہ صوبہ بہت دور ہو گیا، مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علی گڈھ میں ہندوستان کے مختلف حصوں کے نوجوان جمع ہوتے رہتے ہیں، شاید وہاں کوئی جماعت ایسی مل جائے جو اس راہ میں آگے بڑھنے پر آمادہ ہو، حیدرآباد میں تو قطعاً اس کی صلاحیت نہیں ہے، یہاں کے لوگ قدرتاً یوں ہی سست، کاہل عیش پسند ہیں، اور اس وقت تو یہ بھی بہار ثانی بنتا چلا جا رہا ہے۔

عوض خاکروبی: آپ کا وقت قیمتی ہے، جانتا ہوں کہ اس قسم کے خرافات میں آپ کو مبتلا کرنا بڑے کام سے ہٹا کر چھوٹے کام میں الجھانا ہے، جواب اس عریضہ کا آپ سے سننا چاہتا ہوں، دل کی ایک بات لکھ دی، اس کے لحاظ سے میرے لاحاصل وجود کا کوئی مطلب پیدا ہو سکتا ہو تو اس کا بس خیال کیجیے، اس سے زیادہ اور کچھ کہنا نہیں ہے۔ فقط والسلام

مناظر احسن گیلانی

میں نے کارڈ میں بھی شاید مطلع کیا تھا کہ مسلم یونیورسٹی سے ایک استفساری مراسلہ میرے پاس آیا تھا، اب معلوم ہوا کہ وہ آپ کی تحریک کا نتیجہ تھا، بظاہر آپ کے لکھنے کے بعد مجھ سے پوچھا گیا، جواب میں صرف اس سے مطلع کر دیا ہے کہ ستمبر میں میری مدت ملازمت ختم ہو رہی ہے۔

مکاتیب شبلی

مطبوعات جدیدہ

اسلام اور تعمیر شخصیت : از میاں عبد الرشید صاحب، صفحات ۳۱۲، کتابت و طباعت بہتر، ناشر: ادارۂ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ، لاہور، قیمت ؟

علمائے نفسیات اس بات پر متفق ہیں کہ تعمیر شخصیت کا مسئلہ زندگی کے اہم ترین مسائل میں ہے، اور موجودہ دور کے ماہرین نفسیات اس بات پر بہت زیادہ زور دینے لگے ہیں کہ تعمیر شخصیت کے لیے شعوری کوشش ہونی چاہیے، اس لیے کہ اس کے اثرات غیر معمولی ہوتے ہیں، مگر اب تک ان کے "فکر" کی رسائی یہاں تک نہیں ہو سکی کہ تعمیر شخصیت کی کوشش کن خطوط پر کیجائے، یہ بات بھی ان کے ذہن میں صاف نہیں ہو سکی ہے کہ وراثت اور ماحول کے مضر اثرات سے کس طرح دامن بچایا جا سکتا ہے، اور ان میں سے مفید اور کار آمد عناصر کو کس طرح چھانٹا جا سکتا ہے، یہ سوال بھی اہمیت رکھتا ہے کہ یہ کام انفرادی رائے پر چھوڑ دیا جائے، اور یا اس کے لیے کوئی اجتماعی کوشش کی جائے، اور یہ کوشش ایسی ہو کہ اس سے انسان کے محض جسم کے تقاضے پورے نہ ہوتے ہوں بلکہ اس کی عقل اور روح بھی پروان چڑھے اور متاثر ہو۔

اسلام چونکہ خالق کائنات کا بھیجا ہوا ایک ہمہ گیر نظام زندگی ہے، اس لیے دوسرے مسائل کی طرح تعمیر شخصیت کا بھی جو طریقہ اس نے تجویز کیا ہے اس میں نفسیات کی ان الجھنوں کا حل موجود ہے، اس میں شخصیت کی تعمیر اور انفرادی و اجتماعی کوششوں کے حدود بھی مقرر ہیں، اور جسم کے ساتھ عقل و روح کے تقاضوں کے پورا کرنے کے وسائل بھی موجود ہیں، وہ جسم، عقل اور روح کو نہ تو الگ الگ خانوں میں بانٹنے کا قائل ہے، اور نہ ان میں سے کسی کو نظر انداز

کرنے کا حامی ہے بلکہ وہ ان میں خوشگوار امتزاج پیدا کرتا ہے، اس کتاب کے ذریعہ جناب میاں عبدالرشید صاحب نے انہی مسائل کی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں وضاحت کی ہے، انداز بیان عالمانہ اور فلسفیانہ ہے، کتاب کے مطالعہ سے فکر و نظر کو روشنی ملتی ہے، ادارۂ ثقافت کی یہ کوشش قابل ستایش ہے۔

فاؤسٹ = از مولوی عبدالقیوم خان باقی مرحوم صفحات ۲۴۸، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر انجمن ترقی اردو، ۱۰۰ روڈ، کراچی، پاکستان، قیمت للعہ

فاؤسٹ جرمنی کے مشہور فلسفی شاعر گوئٹے کا مشہور منظوم افسانہ ہے، اس کا ترجمہ دنیا کی بہت سی زبانوں میں ہو چکا ہے، خود اردو میں ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے ۱۹۳۱ء میں اس کا نثور ترجمہ کیا تھا، جو انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع بھی ہو چکا ہے، یہ اسی کا منظوم ترجمہ ہے، جو مولوی عبدالقیوم باقی مرحوم کی کوشش قلم کا نتیجہ ہے، غالباً ترجمہ مولوی عبدالحق مرحوم کی ایما سے ہوا تھا، مگر ان کی زندگی میں اسکی اشاعت کی نوبت نہیں آسکی، مرحوم نے اپنی وفات سے چند دن پہلے انجمن کے کارکنوں کو جو مسودات اشاعت کے لیے حوالہ کیے، ان میں یہ بھی تھا، انجمن ترقی اردو پاکستان کے کارکن قابل ستایش ہیں کہ انھوں نے اس ادبی امانت کو اہل علم تک پہنچانے کی کوشش کی۔

چین کے مسلمان = از گوپال متل، ضخامت ۴۸ صفحات، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر نیشنل اکاڈیمی، انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی، قیمت ۸ر

گوپال متل صاحب روس و چین کے معاشی، ادبی اور داخلی مسائل کے بڑے واقف کار ہیں، اور وہ برابر ان مسائل پر لکھتے رہتے ہیں، یہ رسالہ چین کے مسلمان بھی اسی سلسلہ کی ایک چیز ہے، اس کتابچہ میں چین کے مسلمانوں کے بارے میں بہت سے ٹھوس واقعات جمع کردیے گئے ہیں،

ان کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ چین میں بھی مسلمانوں کے مذہب و اخلاق کے ساتھ وہی معاملہ ہو رہا ہے جو اس سے پہلے روس میں ہو چکا ہے، جس سے ان کا وجود و عدم وجود برابر ہو گیا ہے، دنیا کو روس و کمبوڈیا کی فکر تو لاحق ہے مگر یہ کسی کو فکر نہیں کہ جہاں ایک ہزار برس سے مسلمان رہ رہے تھے وہاں دس برس کے اندر ان کی تعداد ۳ یا ۵ کروڑ سے گھٹ کر ایک کروڑ رہ گئی ہے، یہ کتابچہ نہ صرف مسلمانوں کے بلکہ ہر اس شخص کے پڑھنے کے لائق ہے جسے مذہب و اخلاق سے دلچسپی ہے اور وہ ساتھ ہی کمیونزم کو اس کے لیے سم قاتل نہیں سمجھتا،

انتخاب مکاتیب - از مولانا ہدایت علی جیل پوری مرحوم، ضخامت ۳۲۶، کتابت و طباعت معمولی، ناشر تصوف سوسائٹی، سندھ یونیورسٹی حیدرآباد، قیمت درج نہیں،

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکاتیب علم و عرفان کا خزانہ ہیں، ان کے مطالعہ سے لاکھوں انسانوں کو فائدہ پہنچا، ان کا جتنی بار بھی مطالعہ کیا جائے ان کی افادیت بڑھتی جاتی ہے، اور ان سے ایمان و یقین میں اضافہ ہوتا ہے، ان کے تمام مکاتیب فارسی میں ہیں اور فارسی کا ذوق دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے، پھر بعض اصطلاحات کی وجہ سے خواص تک بھی ان سے پورا فائدہ نہیں اٹھا پاتے، مولانا ہدایت علی رحمۃ اللہ علیہ جو مجدد صاحب کے مکاتیب کا ترجمہ اردو میں کر چکے ہیں انھوں نے اہم مکاتیب کا خلاصہ بھی کر دیا ہے، جسے تصوف سوسائٹی سندھ نے شائع کیا ہے، دوسرے اداروں کے ساتھ ادارۂ الفرقان نے بھی اس سلسلہ میں بہت زیادہ کام کیا ہے، مترجم نے بعض مکاتیب کا خلاصہ اتنا مختصر کر دیا ہے کہ تبرک کے علاوہ ان سے کوئی افادیت باقی نہیں رہ جاتی،

نصیحت نامہ - از مولانا سید بدر عالم صاحب، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۴ قیمت ۸ر، ناشر مکتبہ رشیدیہ مسجد بازار میاں چنوں - ملتان،

یہ نصیحت نامہ مشہور عالم مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی (نزیل مدینہ) کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے،

مولانا عرصہ سے علیل ہیں، رسالہ سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی سے بالکل مایوس ہو چکے ہیں، اس لیے اپنے احباب اور عام مسلمانوں کو نہایت سوز و اخلاص کے ساتھ ذکر الٰہی، اتباع سنت، بدعت سے اجتناب، نماز اور اصلاح معاشرت کے سلسلہ میں بہت سی قیمتی نصیحتیں کی ہیں، خاص طور پر اصلاح معاشرت پر جو کچھ لکھا ہے، وہ ہر مسلمان کے حرز جان بنانے کے لائق ہے،

گلبانگ - از مولوی حسن یحیٰی صاحب عندلیب میرٹھی، کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۲۰۰

پتہ: علمی ادارہ ۵۰ راج گڑھ روڈ، لاہور، قیمت للعہ

یہ جناب عندلیب میرٹھی کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ کی تمام نظمیں سلاست و روانی کے ساتھ ندرت بیان اور تخیل کی پاکیزگی اور بلندی کا نمونہ ہیں، خاص طور پر صبح انقلاب، بغاوت، ایک مسلمان خاتون سے، مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی، اصنام دبستان وغیرہ ان کی شاہکار نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں جوش کی نظموں کا شکوہ اور اقبال کی حکمت و دانائی کی جھلک ملتی ہے، شروع کتاب میں مصنف کے قلم سے ایک پُر معلومات مقدمہ بھی ہے۔ امید ہے کہ ان کا مجموعہ اہل ذوق دلچسپی سے پڑھیں گے۔

ماہ تمام - از جناب قمر مراد آبادی، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۶۸، قیمت ستے ر

پتہ: توقیر بن قمر، قاضی ٹولہ، مراد آباد، پاکستان میں منظر الاسلام کوارٹرز، محمود آباد کالونی، کراچی،

قمر مراد آبادی جگر مراد آبادی کے ہم وطن اور دوست تھے، جگر کی طرح وہ بھی غزل کے شاعر ہیں، ان کی غزلیں لفظی و معنوی خوبیوں کا اچھا مرقع ہیں، الفاظ کی بندش اور ترکیبوں کی چستی کے ساتھ عزم و یقین اور درد و سوز کی کیفیت اور عشق و جنون کی واردات نے ان کی شاعری کو بڑی بلندی اور زندگی عطا کر دی ہے، امید ہے کہ ان کا کلام اہل ذوق میں مقبول ہوگا،

م، ح

جلد ۹۱ - ماہ محرم الحرام ۱۳۸۳ھ مطابق ماہ جون ۱۹۶۳ء - عدد ۶

مضامین

ہندوستان کے تجدد پسند مسلمانوں کا ایک طبقہ اسلامی ملکوں کی تقلید میں ہندوستان کے مسلمانوں کا پرسنل لا میں بھی اپنے حسب منشا تبدیلی چاہتا ہے، اور اس کی تحریک سے اسکی تحقیقات کے لیے حکومت بھی آمادہ ہوگئی ہے لیکن یہ مسئلہ کئی پہلوؤں سے قابل بحث ہے، اولاً مسلمانوں کا پرسنل لا محض انسان کا بنایا ہوا قانون نہیں ہو کہ جب چاہا اس کو بدل دیا بلکہ اس کی بنا قرآن مجید اور احادیث نبوی پر ہے، اس لیے اس میں ان دونوں کے خلاف کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، البتہ ان قوانین کے ان فقہی احکام میں جنکی صریح سند قرآن و حدیث میں نہیں ہے، اور وہ فقہا اور ائمہ کے قیاس اور اجتہاد پر مبنی ہیں، ضرورت زمانہ اور مصلحت عامہ کے مطابق ترمیم کی گنجایش ہے، مثلاً طلاق، خلع، فسخ نکاح، زن و شوہر کے درمیان تفریق اور نان و نفقہ کے مسائل میں بعض فقہی احکام ایسے ہیں جن میں اسلامی حکومت نہ ہونے کی وجہ سے عورتوں کو دشواری پیش آتی ہے، یا اور جو معاملات اس قسم کے ہوں ان میں حالات اور مصلحت کی بنا پر اسلامی اصول و کلیات کی روشنی میں ترمیم کیجا سکتی ہے، بلکہ بعض دشواریوں کا حل ائمہ اربعہ ہی میں سے کسی نہ کسی کے مسلک میں ملجائیگا۔

اس لیے اگر پرسنل لا میں تبدیلی کا یہ منشا ہے کہ ان دشواریوں اور نئے پیدا شدہ مسائل کا حل نکالا جائے تو اس سے کسی کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا، خود علما کو عرصہ سے اس ضرورت کا احساس ہے، اور اسکی تحریک بھی بارہا ہو چکی ہے، مگر مختلف موانع کی بنا پر عمل میں نہ آسکی، لیکن یہ کام حکومت کا نہیں بلکہ علما و مجتہدین کا ہے، وہ ان دشواریوں کا حل نکال کر اس کے مطابق پرسنل لا میں ترمیم کرانے کی کوشش کر سکتے ہیں، لیکن اگر تبدیلی

کا یہ منشا ہے کہ پرسنل لا کو مغربی قوانین کے سانچے میں ڈھالا جائے۔ مثلاً نکاح کی تعداد اور وراثت کے قانون میں جن کے صریحی احکام کلام مجید میں موجود ہیں تبدیلی کی جائے تو اس کی قطعاً گنجائش اور مسلمان اس کو کبھی گوارا نہیں کرسکتے۔

اس بارہ میں تجدد پسند اسلامی ملکوں کی مثال پیش کرنا صحیح نہیں ہے۔ اسلامی قانون کا ماخذ قرآن و حدیث ہے۔ اسلامی ملکوں کا عمل اور ان کی تقلید نہیں، آج اسلامی ملکوں میں سعودی عرب کے سوا کونسا ملک اسلامی قوانین پر عامل ہے، جو ملک جس قدر ترقی یافتہ ہے اسی قدر وہ مغربی خیالات اور مغربی تہذیب میں غرق ہے، اور اپنی ہر چیز کو اسی رنگ میں رنگ دینا چاہتا ہے، بلکہ مغربی قوموں کے مسلمہ عیوب اور برائیوں کو بھی انھوں نے اختیار کر لیا ہے، مصر جو قبۃ الاسلام کہلاتا تھا اور جو مدتوں دنیائے اسلام کی دینی و علمی رہبری کرتا رہا، ترک جو اسلام کے سب سے بڑے محافظ اور اس کی تلوار کہلاتے تھے، یہ دونوں آج "او خویشتن گم است کرا رہبری کند" کے مصداق ہیں، ان کی مغرب زدگی سے ہم سب واقف ہیں، ان کے چھوٹے بھائی پاکستان جس کا قیام ہی اسلام کے نام پر عمل میں آیا ہے اس کی اسلامیت بھی ظاہر ہے، ایسی حالت میں ان کا عمل مسلمانوں کے لیے نمونہ کیسے بن سکتا ہے۔

ایک اور پہلو سے بھی یہ مسئلہ قابل غور ہے، اگر اسلامی حکومتیں کوئی غلط قدم اٹھاتی ہیں تو غلطی کے احساس کے بعد اس کی تلافی بھی کرسکتی ہیں، مصطفیٰ کمال یورپ کی نقل و تقلید میں حد سے بہت آگے بڑھ گئے تھے۔ انھوں نے خالص مذہبی معاملات بلکہ بعض عبادات تک میں پابندی عائد کردی تھی، مگر ان کے بعد جب ترکی حکومت کو اس غلطی کا احساس ہوا تو اس نے یہ پابندی ختم کردی، گو اب بھی ترکی کا قانون اسلامی نہیں ہے اور وہاں یورپ کے بہت سے خرافات رائج ہیں، لیکن کمالی دور کے بعد کی حکومتوں نے

بعض عقیدہ مذہبی اصلاحات بھی کی ہیں لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے، حکومت ان کے اختیار میں نہیں ہے، اس لیے اگر ان سے اس قسم کی کوئی غلطی سرزد ہوگئی تو پھر اسکی تلافی کی کوئی شکل نہ ہوگی، اس لیے ان کو جو قدم بھی اٹھانا ہے بہت سوچ سمجھکر اٹھانا چاہیے، اور پرسنل لا میں تبدیلی کا مسئلہ کسی خاص طبقہ کا نہیں بلکہ پوری مسلمان قوم کا ہے، اور علماء و مجتہدین بھی اس میں اسلامی قوانین کے خلاف کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے، اس لیے حکومت کو ان کے مشورے اور انکی رضامندی کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھانا چاہیے۔

اس ضمن میں ایک اور پہلو کیجانب بھی جو اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، توجہ دلانے کی ضرورت ہے۔ تجدد پسند مسلمانوں کے خیالات سے قطع نظر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض پرانے اور نئے پیدا شدہ مسائل ایسے ہیں جن کی مشکلات کا حل نکالنا ضروری ہے، مسلمانوں کا ایک طبقہ ایمانداری کے ساتھ ان مسائل کا اسلامی حل چاہتا ہے لیکن جب اس میں اس کو مایوسی ہوتی ہے تو پھر وہ دوسری راہیں تلاش کرتا ہے، اس سے تجدد پسندی، مغرب زدگی اور غیر اسلامی و ملحدانہ خیالات کے پھیلنے کا موقع ملتا ہے، ان کے روکنے کی صورت یہی ہے کہ ان مشکلات کا حل، ان کے مطالبات کا جواب اور انکی تشفی کا سامان مہیا کیا جائے، محض غصہ اور بیزاری کے اظہار سے اس سیلاب کو روکنا ناممکن ہے، دراصل یہ کام اسلامی حکومتوں کا تھا لیکن وہ خود مغرب کے طلسم میں گرفتار ہیں، ایک حد تک علما بھی اس کو انجام دے سکتے ہیں، اور بعض جماعتیں اپنے طور پر انجام دے رہی ہیں، لیکن ضرورت متحدہ اجتماعی کوشش کی ہے جس میں ہر مکتب خیال کے مسلمہ علما شریک ہوں، اس کے بغیر یہ کام انجام نہیں پا سکتا، یہ کوئی نیا خیال یا نئی تجویز نہیں ہے، مسلمانوں کو مدتوں سے اس کا احساس ہے، اور خود علماء کی جانب سے بارہا اس کی تحریک ہو چکی ہے، مگر عمل میں نہ آسکی، اور نہ بظاہر ان کے مشاغل اور تحزب سے اس کی امید نظر آتی ہے، اس وقت پرسنل لا کی ترمیم کے سلسلہ میں اس خیال کے اعادہ کی ضرورت پیش آگئی۔

مقالات

خلافتِ فاروقی میں آراضی کی تنظیم و تقسیم

از جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی

(یہ مقالہ فاروق اعظمؓ کانفرنس حیدر آباد میں پڑھا گیا)

ذرائع پیداوار کی صحیح تنظیم و تقسیم ہی پر مملکت کی خوشحالی و فارغ البالی موقوف ہے، اور اس میں آراضی کے مسئلہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے،

اس لیے ہدایت الٰہی نے حسب دستور اس مسئلہ میں بھی مقصد پر زیادہ زور دیا ہے کہ مخلوق کے لیے بسہولت خورد و نوش کا سامان مہیا اور بلا تخصیص مذہب و ملت حسب ضرورت وصلاحیت اس کی تقسیم کا بندوبست ہوتا رہے، اس لیے مفاد عامہ کے پیش نظر اس نے تنظیم و تقسیم کی کوئی خاص صورت متعین نہیں کی ہے بلکہ خلافت کو اختیار دیا ہے کہ وہ حسب حاجت و مصلحت تنظیم و تقسیم کا اس طرح نظام قائم کرے کہ عدل و انصاف کے ساتھ خلق اللہ کو رزق حلال پہنچا کر اپنی ذمہ داری سے سبکدوشی اور اللہ کے روبرو سرخروئی حاصل کر سکے،

اس اہم مقصد کے حصول کے لیے خلافت پر یہ بندش نہیں ہے کہ وہ ذرائع پیداوار کو افراد کے سپرد کرے یا جماعتوں کے، البتہ یہ ضروری ہے کہ ذرائع پیداوار جس کے بھی سپرد کیے جائیں ان کی حیثیت محض امین کی ہو اور اسی وقت تک ان کو اس کے استعمال و انتفاع کا حق حاصل ہو جب تک

وہ حصولِ مقصد میں خلافت کا ہاتھ بٹاتے رہیں اور ایسی فضا پیدا کرنے میں مددگار بنیں جو عام مخلوق کی خوشحالی و ترقی کی ضامن ہو،

یہاں اس امر کی وضاحت غیر ضروری ہو کہ خلافت پوری مملکت کی ذمہ دار اور خدا کی حاکمیت و جلال و جبروت کے آگے جواب دہ ہوتی ہے، جیسا کہ فاروق اعظمؓ نے ایک موقع پر فرمایا تھا:-

لو مات کلب علی شاطئ الفرات	"فرات" کے کنارے اگر کتا بھی بھوک سے
جوعا لکان عمر مسئولا عنہ	مرجائیگا تو قیامت کے دن "عمرؓ" سے
یوم القیمۃ[1]	اس کے متعلق بازپرس ہوگی،

جواب دہی کے اس بنیادی تصور کے پیش نظر خلافت نہ خود سرچشمۂ رزق پر قابض ہوکر من مانی کارروائی کرنے کی مجاز ہے اور نہ ذرائع پیداوار اس انداز میں دوسروں کے پاس رکھ سکتی ہے کہ وہ ذاتی وقار و اقتدار کے لیے کمزوروں کو اپنی غلامی پر مجبور کرسکیں۔

ذیل میں چند وہ صورتیں ذکر کیجاتی ہیں جو مذکورہ مقصد و مفاد عامہ کے پیش نظر خلافت فاروقی میں بروئے کار لائی گئی تھیں اور کسی ایک طریق کی پیروی ضروری نہیں قرار دی گئی تھی،

(۱) عراق و شام فتح ہونے کے بعد آراضی کی تنظیم و تقسیم کے بارے میں مشورہ ہوا مجلس شوریٰ میں دو قسم کی رائے رکھنے والے تھے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ و حضرت بلالؓ وغیرہ کی رائے یہ تھی کہ مفتوحہ زمین فوجیوں میں تقسیم کردیجائے، اور حضرت علیؓ و حضرت عثمانؓ و حضرت معاذ بن جبلؓ وغیرہ کی رائے تھی کہ خلافت کے زیر اہتمام اصل باشندوں کے پاس رہنے دیجائے، فوجیوں میں نہ تقسیم کی جائے۔

چونکہ اس بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل مذکورہ مقصد اور مفاد عامہ کے

---

[1] توفیق الرحمٰن ص ۴۴ بحوالہ اسلام کا زرعی نظام ص ۸۸

پیش نظر مختلف تھا، اس بنا پر دونوں فریق اپنی رائے کی تائید میں آپ کے طرز عمل سے استدلال کرتے تھے۔ ایک فریق کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ طرز عمل تھا جو آپ نے بنو نضیر و بنو قریظہ کی کل زمین اور خیبر کے کچھ حصے کے بارے میں اختیار فرمایا تھا کہ یہ زمینیں آپ نے فوجیوں میں تقسیم کر دی تھیں، اور دوسرے فریق کے سامنے وادی القریٰ اور مکہ کی کل زمین اور خیبر کی بقیہ زمین تھی کہ آپ نے مفاد عامہ کے پیش نظر اصل باشندوں کے پاس رہنے دی تھی، فوجیوں میں تقسیم کی تھی۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل کی بنا پر ہر فریق اپنی جگہ مضبوط اور دلائل میں قوی تھا، اس لیے مجلس میں بڑی گرما گرم بحث ہونے کے باوجود کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو سکا اور حضرت عمرؓ کو دوبارہ مجلس شوریٰ طلب کرنی پڑی جس میں آپ نے حالات کی نزاکت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مجلس شوریٰ کے ممبروں کے علاوہ انصار کے دس معزز آدمیوں کو بھی خصوصی دعوت پر شریک کیا تھا۔

اس اجلاس میں حضرت عمر فاروقؓ نے مجلس کے سامنے چند بنیادی "نکات" پیش کیے اور اپنی مدلل تقریر کے ذریعہ سب کو ان "نکات" میں غور و فکر کی دعوت دی جس کا خلاصہ یہ ہے۔[2] آپ نے حمد و ثنا کے بعد فرمایا:-

"میں نے آپ حضرات کو اس لیے تکلیف دی ہے کہ جس بار امانت کو آپ ہی لوگوں نے میرے سر پر رکھا ہے اس کے اٹھانے میں میری مدد کریں، اس وقت مجلس میں میری پوزیشن خلیفہ

---

[1] فوجیوں میں زمین کی تقسیم و عدم تقسیم کا معاملہ اس دور کی معاشرتی و سماجی مصالح کی بنا پر تھا اس لیے موجودہ دور میں نہ تقسیم کو بنیاد بنا کر ملکیت زمین کی آڑ میں زمینداری و جاگیرداری کا جواز تلاش کیا جا سکتا ہے اور نہ عدم تقسیم سے اسلام کے زرعی نظام کو اشتراکیت کے زرعی نظام میں مدغم کرنے کی گنجائش نکلتی ہے، بلکہ ان دونوں صورتوں سے صرف ان کی اصل روح اور مقصد میں استفادہ کیا جا سکتا ہے تاکہ حالات کے تقاضے کے مناسب زمین کی تنظیم و تقسیم کا نظام قائم ہو سکے۔

[2] پہلے اجلاس کی مفصل کارروائی راقم کی کتاب "اسلام کا زرعی نظام" میں مطالعہ کرنا چاہیے۔

کا نہیں ہے بلکہ آپ میں کے ہر فرد جیسی ہے، ہر فرد کو اپنی رائے پیش کرنے کا بھی پورا اختیار ہے،
ابھی تھوڑی دیر کی بات ہے کہ اس معاملہ میں مشورہ ہو چکا ہے مجلس کے کچھ لوگوں نے میری رائے
کی مخالفت کی ہے اور کچھ نے موافقت کی ہے،

میں یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ آپ لوگ میری مرضی کا اتباع کریں اور حق بات کو چھوڑ دیں بلکہ
میں صرف حق بات کی طرف آپ حضرات کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں جس طرح میرے پاس
اللہ کی کتاب ہے ویسے ہی آپ لوگوں کے پاس بھی ہے، جو ناطق بالحق ہے، اسی کو سامنے رکھ کر
مشورہ دیجئے جو کچھ اس میں موجود ہے اس پر عمل کرنا ہم سب کا فرض ہے ۱؎

حضرت عمر فاروقؓ نے اس موقع پر آیات فے سے استدلال کیا تھا، جن میں بلا تخصیص و ترجیح
مفتوحہ زمین میں سب لوگوں کا حق بیان کیا گیا ہے، فوجیوں کی تخصیص نہیں ہے،

آیات فے یہ ہیں :-

ما افاء اللہ علی رسولہ من اھل	اللہ نے جو فے (مال مفتوحہ) بستی والوں سے
القریٰ فللہ وللرسول ولذی	اپنے رسول کو عطا فرمایا ہے، وہ اللہ و
القربیٰ والیتمیٰ والمساکین و	رسول کے لیے اور اقرباء، یتیم، مسکین
ابن السبیل کی لا یکون دولۃ	اور مسافر کے لیے ہے تاکہ تم میں سے دولتمند
بین الاغنیاء منکم وما اٰتٰکم	کے درمیان ہی سمٹ کر نہ رہ جائے اور
الرسول فخذوہ وما نھٰکم	جو کچھ رسولؐ تمھیں دیں اس کو لے لو اور
عنہ فانتھوا واتقوا اللہ ان اللہ	جس سے وہ منع کریں (نہ دیں) اس کو
شدید العقاب۔ للفقراء	چھوڑ دو، اور اللہ سے ڈرو بیشک اللہ
المھاجرین الذین اخرجوا	کا عذاب سخت ہے، وہ مال ان مفلس

من دیارھم واموالھم یبتغون
فضلا من اللہ ورضوانا وینصرون
اللہ ورسولہ اولئک ھم الصادقون
والذین تبوؤ الدار والایمان
من قبلھم یحبون من ھاجر
الیھم ولا یجدون فی صدورھم
حاجۃ مما اوتوا ویؤثرون
علی انفسھم ولو کان بھم
خصاصۃ ومن یوق شح نفسہ
فاولئک ھم المفلحون والذین
جاءوا من بعدھم یقولون
ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذین
سبقونا بالایمان ولا تجعل
فی قلوبنا غلا للذین آمنوا
ربنا انک رءوف رحیم
(سورہ حشر رکوع ۱)

مہاجروں کے لیے بھی ہے جو اپنے گھروں
اور مالوں سے نکالے ہوئے، اللہ کا فضل
اور اس کی رضامندی ڈھونڈھنے کے لیے اور اللہ
و رسول (دین) کی مدد کرنے کیلئے تمھارے پاس
آئے ہیں وہی لوگ سچے ہیں،
اور ان لوگوں کے لیے بھی ہے جو اس گھر (مدینہ)
میں ایمان کی حالت میں مہاجرین کے پہلے سے
ٹھہرے ہوئے ہیں، وہ لوگ ان مہاجرین سے
محبت کرتے ہیں، انکے آنے سے اور انکی
خاطر تواضع کرنے سے اپنے دلوں میں تنگی نہیں
محسوس کرتے ہیں اور اپنی جانوں پر انکو ترجیح
دیتے ہیں، اگرچہ ان پر فاقہ ہی کی نوبت آجائے،
اور جو لوگ اپنے نفس کو لالچ سے بچالے گئے
وہی مراد پانے والے ہیں، اور ان لوگوں کے لیے
بھی ہے جو انکے بعد یہ کہتے ہوئے آئے کہ اے
ہمارے رب ہمیں بخشدے اور ہمارے ان بھائیوں
کو بخشدے جو ہم سے پہلے ایمان لائے اور ہمارے
دلوں میں مومنوں کی طرف سے کھوٹ نہ رکھ، اے
ہمارے رب آپ ہی نرمی کرنے والے اور مہربان ہیں،

(سورۂ حشر)

حضرت عمر فاروقؓ نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے گذشتہ اجلاس کی کارروائی پر اجمالی روشنی ڈالی اور مقصد کو زیادہ واضح الفاظ میں اس طرح بیان کیا۔

"کیا آپ حضرات نے ان لوگوں کی باتیں نہیں سنیں جو مجھے اس معاملہ میں شک کی نظر سے دیکھتے ہیں، شاید ان کا یہ خیال ہو کہ میں ان کی حق تلفی کرنا چاہتا ہوں، حالانکہ کسی فرد کی بھی حق تلفی کرنا میرے نزدیک صریح ظلم ہے، معاذ اللہ! خدا شاہد ہو کہ میں نے کبھی کسی معاملہ میں ان پر ظلم کیا ہو یا اب ظلم کرنے کا ارادہ ہو، لیکن یہ غور طلب ہے کہ عراق و شام فتح ہونے کے بعد اور کونسی زمین رہ گئی ہے جس کی آمدنی سے خلافت کا انتظام سنبھالا جا سکے گا، یہ تو محض اللہ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے کسریٰ کے اموال، زمین، جائداد اور جفاکش کام کرنے والوں پر ہمیں غلبہ عطا فرمایا ہے،

آپ لوگ خود اس کے شاہد ہیں کہ اموال منقولہ میں نے فوجیوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے خمس (مال غنیمت کا پانچواں حصہ) بھی مناسب محل پر صرف کر دیا گیا ہے، اب صرف زمین (جائداد غیر منقولہ) باقی بچی ہے، اس کے متعلق خیال ہے کہ اس کو اسکے اصلی پرست مالکوں ہی کے پاس رہنے دیا جائے اور زمین پر ٹیکس (خراج) اور مالکوں پر ان کے جان و مال کی حفاظت کا معاوضہ (جزیہ) مقرر کر دیا جائے، تاکہ یہ سب آمدنی اجتماعی مفاد کے کاموں میں خرچ کی جائے اور اس کے ذریعہ فوجیوں کی تنخواہوں اور موجودہ اور بعد کے آنے والے لوگوں کا بندوبست کیا جائے۔

آپ ہی بتائیے! کیا یہ ممالک سرحدوں کی حفاظت کے بغیر بیرونی حملوں سے محفوظ رہ سکیں گے؟ کیا جزیرہ، کوفہ، بصرہ، عراق، شام اور مصر وغیرہ کے بڑے بڑے شہروں میں ان کی حفاظت کے لیے فوجی چھاؤنیوں کی ضرورت نہ ہوگی، اگر زمین تقسیم کر دی جائے

تو فوجیوں کی تنخواہیں، بچے اور دوسرے لوگوں کے وظیفوں کی رقم کہاں سے آئے گی؟"

فاروق اعظم کی اس بصیرت افروز تقریر سے تمام ممبر متاثر ہوئے اور انھوں نے ان الفاظ میں تائید کی:۔

فقالوا جمیعاً الرأی رأیك فنعم ما قلت وما رأیت[1]	سب نے کہا کہ بس آپ ہی کی رائے اس معاملہ میں زیادہ درست ہے۔

حضرت عمرؓ کی تقریر اور شوریٰ کے فیصلہ میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ خلق اللہ کا مفاد اور احساس ذمہ داری ہے۔ دراصل رب العلمین کے سامنے جوابدہی کا حقیقی تصور خلافت کو گوشۂ تنہائی میں بھی حق تلفی سے باز رکھتا ہے، اور ذرائع پیداوار کو اس طرح استعمال کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ اللہ کی مخلوق کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچ سکے، نہ کوئی چیز بیکار رہنے پائے اور نہ ضائع ہو،

حضرت عمرؓ کی رائے اور مجلس شوریٰ کے فیصلہ پر اسلامی عدالت کے قاضی القضاۃ امام ابو یوسف تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

والذی رأی عمر رضی اللہ عنہ من الامتناع من قسمة الارضین بین من افتتحها عند ما عرفه الله ما کان فی کتابه من بیان ذلك توفیقا من الله کان له فیما صنع وفیه کانت الخیرة	حضرت عمرؓ کی یہ رائے کہ آپ نے مجاہدین اور فاتحین کے درمیان زمین تقسیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس کی تائید میں قرآن حکیم سے دلائل پیش کیے، یہ سب محض توفیق الٰہی کا نتیجہ تھا، اور کتاب اللہ پر بصیرت حاصل ہونے کی بنا پر تھا جس حقیقت کو حضرت عمرؓ نے

---

[1] پوری بحث کے لیے ملاحظہ ہو کتاب الاموال ص ۵۸ و ۵۹ و کتاب الخراج لابی یوسف ص ۲۵ و ۲۶ و کتاب الخراج یحییٰ ص ۴۴ و بخاری شریف ج ۲

لجميع المسلمين وفيما رأيت من جمع خراج وقسمته بين المسلمين عموم النفع لجماعتهم لأن هذا لو لم يكن موقوفا على الناس في الأعطيات والأرزاق لم تشحن الثغور ولم تقو الجيوش على السير في الجهاد ولما أمن رجوع أهل الكفر إلى مدنهم إذا خلت من المقاتلة والمرتزقة

(الخراج لابی یوسف ص ۲۷)

پالیا تھا، اسی میں جماعتی لحاظ سے تمام مسلمانوں کی بھلائی تھی لگان کی آمدنی کو ایک جگہ جمع کرکے عام ضروریات پر خرچ کرنا یہ اس سے کہیں زیادہ بہتر تھا کہ زمین کو چند لوگوں میں تقسیم کردیا جاتا اور وہی اس سے فائدہ اٹھاتے رہتے۔ اگر لگان کی آمدنی لوگوں کی تنخواہوں اور وظیفوں کے لیے وقف نہ ہوتی تو سرحدوں کی حفاظت اور فوجیوں کی کفالت کس مال سے کیجاتی اور ظاہر ہے کہ کوئی ملک اس قسم کے انتظامات کے بغیر بیرونی حملوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا ہے۔

(۲) مصر فتح ہونے کے بعد بھی زمین کی تنظیم و تقسیم کے بارے میں مشورہ ہوا تھا، حضرت زبیرؓ بن العوام اور ان کے ہم خیال لوگوں کی رائے تھی کہ زمین فوجیوں میں تقسیم کردیجائے، اور حضرت عمروؓ بن العاص (والی مصر) اور دوسرے لوگوں کی رائے یہ تھی کہ خلافت کے زیر انتظام اصل باشندوں کے پاس زمین رہنے دیجائے، فوجیوں میں تقسیم ہو۔

حضرت زبیرؓ کی تقریر کا خلاصہ ہے:۔

"اس زمین کو اللہ نے ہماری محنت و مشقت سے فتح کرایا ہے، ہم گھوڑ سوار لڑے ہیں ہم نے پیادہ پا جنگ کی ہے، اس طرح ہم نے پورے مصر پر قبضہ پایا ہے، اس میں نہ والی مصر (عمرو بن العاص) کو کچھ اختیار ہے، اور نہ امیر المومنین حضرت عمرؓ کو اختیار ہے، جس طرح اموال منقولہ غازیوں میں تقسیم کیے گئے ہیں، اموال غیر منقولہ بھی انھیں کا حق ہے۔"

حضرت عمروبن العاص کی تقریر کا خلاصہ :۔

"خلافت کے زیر انتظام اہل باشندوں کے پاس زمین رہنے دینے کی تجویز پیش کرنے کے بعد فرمایا کہ جب معاملہ باہمی مشورہ سے نہیں طے ہو رہا ہے تو ایسی اختلافی صورت میں امیرالمومنین سے رائے لینا ضروری ہے، جب تک ان کا کوئی قطعی فیصلہ میرے پاس نہ آجائے گا اس وقت تک کسی قسم کا اقدام نہیں کرسکتا۔"

آخرکار اجلاس میں یہ تجویز پاس ہوگئی کہ مجلس شوریٰ کی پوری کارروائی لکھکر امیرالمومنین کے پاس بھیجی جائے، چنانچہ حضرت عمروبن العاص نے امیرالمومنین کو شوریٰ کی کارروائی لکھ بھیجی اور انھوں نے اس کا جو جواب دیا اس کا مضمون یہ تھا۔

"خط ملا، شوریٰ کی کارروائی معلوم ہوئی، کیا آپ لوگ مسلمانوں کے وظیفوں، غازیوں کی تنخواہوں اور بچوں پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں، فرض کیجئے کہ میں فوجوں میں زمین تقسیم کر دینے کا حکم دیدوں تو بعد کے مسلمانوں کے لیے کیا چیز باقی بچے گی جس کی مدد سے وہ اسلام کی حفاظت کرسکیں گے اور دشمنان اسلام پر غلبہ پاسکیں گے۔

میرے سامنے عام مسلمانوں، کمزوروں، قرضداروں اور بعد کے مجاہدوں کا معاملہ اور ان کا انتظام نہ ہوتا تو میں ضرور زمین تقسیم کرنے کا حکم دیدیتا، ایسی حالت میں ایسا نہیں کرسکتا، اس لیے آپ لوگ زمین چھوڑ دیجئے تاکہ وہ عام مسلمانوں کے لیے وقف ہو جائے اور بعد کے لوگ بے دست و پا ہوکر نہ رہ جائیں۔"[1]

مصر میں فاروق اعظمؓ کی یہ مصلحت بینی اور دوراندیشی عام طور پر پسند کی گئی اور آپ کے فرمان کے مطابق مفاد عامہ کے پیش نظر خلافت کے زیر انتظام زمین اہل باشندوں کے قبضہ میں رہنے دی گئی۔

---

[1] شرح معانی الآثار و طبقات ابن سعد بحوالہ اسلام کا زرعی نظام۔

یہ مثالیں تو اس کی تھیں کہ مفاد عامہ کے پیش نظر خلافت کے زیر انتظام اصل باشندوں کے پاس زمینیں رہنے دی گئی تھیں، اور فوجیوں میں انفرادی طور پر تقسیم نہیں کی گئیں، لیکن خلافت فاروقی میں اس کی مثال بھی موجود ہے کہ خلق اللہ کے مفاد کے پیش نظر لوگوں کو دی ہوئی زمینیں واپس لے لی گئیں، اور شخصی مفاد پر جماعتی مفاد کو مقدم رکھا گیا تھا، چنانچہ:-

(۳) "خالصہ زمین" کا کچھ حصہ فاروق اعظمؓ نے قوم بجیلہ کو دیدیا تھا، دو تین سال تک ان لوگوں کے قبضہ و تصرف میں رہا، پھر جب خلافت نے واپس لینا چاہا تو انھوں نے بلا پس و پیش واپس کر دیا، قیس بن حازم کے بیان کے مطابق واقعہ کی تفصیل یہ ہے:-

"جنگ قادسیہ (جو ایرانیوں سے ہوئی تھی) میں اسلامی فوج میں قوم بجیلہ کے لوگوں کی تعداد چوتھائی تھی، حضرت عمرؓ نے ان لوگوں کو "سواد" کا چوتھائی حصہ دیدیا، دو تین سال تک یہ زمین ان کے قبضہ میں رہی، ایک مرتبہ اس قبیلے کے چند افراد عمارؓ بن یاسر اور جریرؓ وغیرہ کسی ضرورت سے حضرت عمرؓ کے پاس آئے، حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کہ آپ لوگ اس زمین کو عام مفاد کے لیے خلافت کے حوالہ کر دیجئے، اس ارشاد پر ان لوگوں نے بلا تامل زمین خلافت کے حوالہ کر دی، اس کے بعد حضرت عمرؓ نے سرکاری خزانہ سے جریر کو اسی دینار عطا کیے"[1]

اس واقعہ کی خبر قوم بجیلہ کی ایک عورت "ام کرزؓ" کو ہوئی تو اس نے اپنے حصہ کی زمین واپس کرنے میں پس و پیش کیا اور حضرت عمرؓ کے پاس آکر عرض کیا:

یا امیر المومنین ان ابی هلك و	اے امیر المومنین میرے والد کی وفات
سهمه ثابت فی السواد و انی	ہو گئی ہے، "سواد" کی زمین میں ان کا بھی

---

[1] کتاب الخراج ص ۵۴ و ۴۹ و کتاب الاموال ص ۶۱ و ۶۲

له اسلم فقال لها یا ام کرز	حصہ تھا (جو ترکہ میں مجھے ملا ہے) میں اسکو
ان قومک قد صنعوا ما قد علمت	نہ واپس کروں گی، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ
فقالت ان کانوا قد صنعوا	اے ام کرزؓ تیری قوم نے بلا چوں و چرا
ما صنعوا فانی لست اسلم	واپس کردی ہے اور تجھے اس کا اچھی طرح
حتی تحملنی علی ناقة ذلول علیها	علم ہے، اس نے جواب دیا کہ قوم نے جو کچھ
قطیفة حمراء وتملأ کفی ذهبا	کیا ہے مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے،
قال فنفعل عمرؓ ذلک فکانت	میں تو اپنی زمین اس وقت تک نہ واپس
الدینار نحواً من ثمانین	کرونگی جب تک کہ آپ مجھے ایک فرمانبردار
دینارا[1]	اونٹنی نہ دیں جس پر سرخ رنگ کی گرم چادر
	پڑی ہو اور زر و مال سے میرا ہاتھ نہ بھر دیں،
	چنانچہ حضرت عمرؓ نے اسکی یہ خواہش پوری کردی
	اور اسی دینار کے قریب نقد عطا کیے،

اس واقعہ سے جس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ خلافت مفاد عامہ کے پیش نظر جب چاہے زمین واپس لے سکتی ہے، اسی طرح یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ واپسی کی صورت میں ہر شخص کے ذاتی مفاد کا خیال رکھنا ضروری ہے تاکہ اجتماعی مفاد کے ساتھ ذاتی حقوق کی پامالی بھی نہ ہو۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ خلافت کی جانب سے صاحب زمین کو بطور امداد جو کچھ دیا جائے اس کی حیثیت لازمی طور پر معاوضہ کی ہوگی، یا مفاد عامہ کے پیش نظر جب زمین واپس لینے کا سوال ہو تو خلافت کو بلا معاوضہ زمین لینے کا اختیار نہیں ہے، اسی طرح یہ نتیجہ بھی صحیح نہیں ہے کہ خلافت کی جانب سے اس قسم کے جو تصرفات کیے جائیں ان میں

---

[1] کتاب الخراج یحییٰ ص ۴۵ و ۴۶ و کتاب الاموال ص ۲۹۱

صاحب زمین کی رضامندی ضروری ہے۔ ذیل کی تصریحات سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔

ابوعبید کہتے ہیں:۔

جو لوگ مفتوحہ زمین کو اہل باشندوں کے قبضہ میں رہنے دینے کے مسئلہ میں فوجیوں کی رضامندی ضروری سمجھتے ہیں (جیسا کہ امام شافعیؒ کا خیال ہے) ان کے لیے یہ واقعہ کیسے دلیل بن سکتا ہے، جبکہ اس قسم کے واقعہ عراق و شام میں اہل باشندوں کے پاس زمین رہنے دینے کی جب حضرت بلالؓ وغیرہ نے مخالفت کی تھی اور اس کو فوجیوں میں تقسیم کرنے پر اصرار کیا تھا تو حضرت عمرؓ نے ان کے متعلق فرمایا تھا "اللھم اکفنیھم (اے اللہ تو ہی ان کے لیے کافی ہے) اس وقت ان لوگوں کی رضامندی کہاں حاصل کی گئی تھی کہ (جس کی بنا پر کہا جائے کہ مذکورہ واقعہ میں حضرت عمرؓ ام کرزؓ کو راضی کرنا چاہتے تھے اور صاحب زمین کی رضامندی کے بغیر انھیں بے دخل کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔"[1]

ابوبکر جصاص قوم بجیلہ کا واقعہ ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں:۔

"اس میں قوم بجیلہ کی رضامندی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، کیونکہ حضرت عمرؓ نے صاف طور پر کہدیا تھا کہ زمین کو واپس کیے بغیر چارہ نہیں ہے، اور اسی میں لوگوں کی بھلائی ہے، رہا ام کرزؓ کا معاملہ تو اس کو حضرت عمرؓ نے سرکاری خزانہ سے (بطور امداد) رقم دی تھی (لازمی طور سے اس کی حیثیت معاوضہ کی نہ تھی) کیونکہ خلیفہ کو اس کا اختیار تھا کہ زمین واپس لیے بغیر بھی سرکاری خزانہ سے اس عورت کو عطیہ دے سکتا تھا۔"[2]

اس کا حاصل یہ ہے کہ مفاد عامہ کے پیش نظر جب خلافت کسی صاحب زمین کو بے دخل کرنا چاہے تو نہ اس کی رضامندی ضروری ہے اور نہ معاوضہ کی شکل میں مخصوص رقم ادا کرنا لازمی ہے،

---

[1] کتاب الاموال ص ۲۰۲، ۱۳ [2] احکام القرآن ج ۳ ص ۵۳۱، ۵۳۲

البتہ اس شخص کے جائز حقوق کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ خلافت کے تصرف سے وہ پامال نہ ہونے پائیں، خواہ اس کی صورت معاوضہ کی ہو یا امدادی عطیات کی ہو۔

دراصل زمین کے معاملہ میں خلافت کے اختیارات بہ نسبت اموال منقولہ کے زیادہ وسیع ہیں، خلافت راشدہ کے بہت سے تصرفات و واقعات سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے راقم کی کتاب "اسلام کا زرعی نظام" مطالعہ کرنا چاہیے۔

ذیل کی تصریحات سے بھی مذکورہ حقیقت ثابت ہوتی ہے، مثلاً

ایک موقع پر حضرت عمرؓ نے فرمایا

لنا رقاب الارض[1]	زمینیں ہماری (خلافت کی) ہیں۔

حضرت علیؓ نے ایک شخص کے اسلام قبول کرنے کے بعد فرمایا

ان ارضك فلنا[2]	بے شک تیری زمین ہماری (خلافت کی) ہے

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں:۔

ان نواحی دار الاسلام تحت	دار الاسلام کے اطراف (جملہ حصے)
ید امام المسلمین[3]	خلیفۃ المسلمین کے زیر اقتدار ہوتے ہیں،

امام مالکؒ کا ارشاد ہے:۔

تصیر الارض للسلطان[4]	زمینیں قوت حاکمہ (خلافت) کی ہوتی ہیں،

ایک موقع پر علامہ عینیؒ کہتے ہیں:۔

ان حکم الاراضی الی الامام[5]	زمین کا معاملہ خلیفہ (خلافت) کے سپرد ہے

---

[1] کتاب الاموال ص ۲۷۹ [2] احکام القرآن ج ۳ ص ۵۳۲ [3] المبسوط ج ۱ ص ۳۹

[4] المحلی ج ۸ بحوالہ اسلام کا زرعی نظام ص ۱۳۱ [5] عینی ج ۶ ص ۲۹

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:

والارض کلها فی الحقیقة بمنزلة	پوری زمین بمنزلہ مسجد اور سرائے کے ہے
مسجد اور باط جعل وقفاً	جو مسافروں پر وقف ہوتی ہے اور سب لوگ
علی ابناء السبیل وهم شرکاء	اس میں برابر کے شریک ہوتے ہیں، اسی لیے
فیه فیقدم الاسبق فالاسبق	ہر پہلے آنے والے کو پیچھے آنے والوں پر
وحق الملك فی الآدمی کونه	ترجیح ہوتی ہے، زمین پر آدمی کی ملکیت
احق بالانتفاع من غیره	کا صرف یہ مطلب ہے کہ قابض کو بہ نسبت
(حجة اللہ البالغہ ج ۱)	دوسرے کے اس سے زیادہ انتفاع کا حق ہے

ان تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ آراضی کے معاملہ میں خلافت کے اختیارات بہت وسیع ہیں، اور خلیفہ کے لیے مفاد عامہ کے پیش نظر موقوفہ آراضی میں بھی واقف کی مقرر کردہ شرطوں کی مخالفت جائز ہے، چنانچہ آراضی موقوفہ کی بحث میں فقہا نے کہا ہے

ان السلطان یجوز له مخالفة	جب وقف کی اکثر جہات گاؤں اور مزروعہ
الشرط اذا کان غالب جهات	زمینیں ہوں تو خلافت کو اپنی صوابدید کے
الوقف قری ومزارع فلیعمل	مطابق اس کا انتظام کرنا چاہیے، خواہ
بامره وان غایر شرط الوقف	اس میں واقف کی شرطوں کی مخالفت پائی
لان اصلها لبیت المال	جاتی ہو کیونکہ گاؤں اور زمینیں در اصل
(در المختار ج ۱)	بیت المال (خلافت) کی ہوتی ہیں،

زمین کے باب میں اصل اصول وہی ہے جو حضرت شاہ ولی اللہؒ نے فرمایا ہے کہ خلافت الٰہیہ زمین در حقیقت کسی کے قبضہ ہونے کا صرف یہ مطلب ہے کہ قابض کو بحیثیت امین کے اس سے انتفاع کا حق

حاصل ہے۔ اور یہ امانت اسی وقت تک اس کے قبضہ میں رہے گی اور اس سے انتفاع کا حق اسی وقت تک رہے گا جب تک خلق اللہ کے مفاد میں وہ خلافت کا ہاتھ بٹائے اور ایسی فضا پیدا کرنے میں مددگار رہے جو مخلوق کی خوشحالی اور ترقی کی ضامن ہو، لیکن جب اسکی خلاف ورزی یا امانت میں خیانت ہونے لگے تو خلافت کو بے دخل کرنے یا جو مناسب صورت اسکی سمجھ میں آئے اس پر عمل کرنے کا پورا اختیار ہے، جیسا کہ امام ابو یوسف نے ہارون الرشید کو مخاطب کرکے فرمایا ہے :-

واعمل بما ترى انه اصلح للمسلمين — جس میں عام خاص تمام مسلمانوں کی بھلائی ہو
واعم نفعا لخاصتهم وعامتهم — اور ان کیلئے زیادہ نفع بخش ہو، اس میں آپکو
واسلم لك في دينك[1] — پورا اختیار ہے اور وہ آپکے دین کیلئے بھی زیادہ بہتر ہو

خلافت کے اس اختیار میں نہ حقوق ملکیت کا کوئی کھدعندا حائل ہوتا ہے اور نہ محض جذباتی چیزیں رکاوٹ بن سکتی ہیں۔

چونکہ خلافت کے ہر تصرف و فیصلہ میں اشخاص کے ذاتی مفاد کا لحاظ ضروری ہے اس لیے ایسے تمام مواقع میں وہ ذاتی مفاد کا پورا لحاظ رکھتی ہے۔ لیکن ذاتی اور جماعتی مفادات کے ٹکراؤ کی صورت میں وہ جماعتی مفاد کو ترجیح دیتی ہے۔

یہ واضح رہے کہ خلافت کے مذکورۂ بالا وسیع اختیارات اس کی ذمہ داریوں کی بنا پر اس کو حاصل ہیں، دوسری حکومتیں اسی وقت ان سے استدلال کرسکتی ہیں جب وہ بھی خلافت کی جیسی ذمہ داریاں قبول کریں، ہر حکومت اس کی مجاز نہیں ہے۔

---

[1] کتاب الخراج ص ۵۹، ۶۰

اسلامی ہند کے نصف اول میں علوم عقلیہ کا رواج

از

(جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے، ایل ایل بی۔ رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اترپردیش)

(۳)

نویں صدی سے پہلے معقولات کی گرم بازاری

ترک و افغان حکومت

آل شنسب و غوری خاندان | ۵۸۳ھ میں غزنوی خاندان کے خاتمہ کے بعد غوریوں کی حکومت کا باقاعدہ آغاز ہوا، اور ۶۰۲ھ میں محمد غوری کی شہادت کے بعد ہندوستان میں ان کا اقتدار ختم ہوگیا، اگرچہ اس ملک پران کی یورشوں کا سلسلہ ۵۷۱ھ سے شروع ہوچکا تھا، اور شہاب الدین کے بعد غور و غزنی میں کچھ اور عرصے تک اس خاندان کی حکومت رہی، مگر ہندوستان میں غوری سلطنت کا زمانہ یہی انیس سال ہے، کیونکہ اس کے بعد اس ملک میں ایک نئے حکمراں سلسلے (ممالیک یا غلام خاندان) کا آغاز ہوا، سابق حکمرانوں کی طرح غوری فاتحین بھی ہندوستان میں قیام سلطنت کے ارادے سے نہیں آئے تھے، مگر بعد میں حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ شمالی ہندوستان کا بڑا حصہ "فیروزکوہ کی نوآبادی" بن گیا، اسکی بنیادی وجہ غوریوں اور غزنویوں کی خاندانی عداوت تھی، جس کی مختصر کیفیت حسب ذیل ہے۔

غوری جو خود کو افسانوی "ضحاک تازی" کی اولاد بتاتے تھے، تاریخ میں غور کے پہاڑی علاقے کے سردار کی حیثیت سے نمودار ہوئے، پانچویں صدی ہجری کے آغاز میں اس خاندان کا مورث اعلیٰ ملک عزالدین الحسین بن الحسن تھا، اس کے سات بیٹے تھے، بڑے بیٹے ملک فخرالدین مسعود (جو بعد میں بامیان کا بادشاہ ہوا)

اور اس سے چھوٹے ملک قطب الدین محمد کی مائیں ادنیٰ خاندان کی تھیں، اس لیے باپ کے مرنے پر تیسرا بیٹا سوری اس کا جانشین ہوا۔ وہ اس خاندان میں پہلا شخص ہے جس نے سلطان کا لقب اختیار کیا، بادشاہ ہونے کے بعد اس نے باقی چھ بھائیوں کو مختلف اقطاع ملک کی حکومت تقسیم کی، قطب الدین محمد کے حصہ میں ورشان کی ولایت آئی، جہاں اس نے فیروز کوہ کا شہر بسایا، کچھ عرصہ بعد بھائیوں میں شکر رنجی پیدا ہوئی اور ملک قطب الدین محمد روٹھ کر غزنین چلا گیا، یہ بہرام شاہ (۵۱۱ھ - ۵۴۷ھ) کا زمانہ تھا، قطب الدین محمد نے جو حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت سے بھی آراستہ تھا، اپنی جود و سخا سے بہت جلد غزنین میں ہر دلعزیزی حاصل کرلی۔ اس پر حاسدوں نے بہرام شاہ کے کان بھرنا شروع کئے کہ

"بنظر خیانت بحرم پادشاہی می نگرد و اموال بذل می کند تا بر پادشاہی خروج کند"[1]

اس لیے بہرام شاہ نے خفیہ طور پر اسے زہر دلوا دیا، جب یہ خبر غور پہنچی تو سلطان سوری غور کو دوسرے بھائی سلطان بہاء الدین سام (جو غیاث الدین اور شہاب الدین غوری کا باپ تھا) کے سپرد کر کے لشکر جرار کے ساتھ بھائی کا انتقام لینے غزنی پہنچا، بہرام شاہ شکست کھا کر ہندوستان چلا گیا، مگر سردی کے موسم میں جب غور و غزنی کا درمیانی راستہ مسدود ہوگیا تو اہل شہر کے بلاوے پر غزنی واپس آیا، اور سلطان سوری اور اس کے وزیر سید مجد الدین موسوی کو ہرا کر ذلت و خواری کے ساتھ قتل کرا دیا جب سلطان بہاء الدین سام کو اس کی اطلاع ملی تو غور کو تیسرے بھائی علاء الدین حسین کی نگرانی میں دے کر بھائیوں کا بدلہ لینے چلا، مگر راستہ ہی میں وفات پاگیا، اس کے بعد سلطان علاء الدین حسین لشکر جرار لیکر غور سے غزنی پہنچا، دونوں میں گھمسان کی لڑائی ہوئی، بہرام شاہ کو شکست ہوئی، اور علاء الدین نے غزنی کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا، اسی لیے وہ تاریخ میں "سلطان علاء الدین جہاں سوز" کے نام سے مشہور ہے، اسی "جہانسوزی" کے نتیجہ میں غزنی کا مشہور کتب خانہ بھی جس میں بہت سی نادر و نایاب کتابیں تھیں،

---

[1] طبقات ناصری ص ۴۹

جل کر تباہ ہوگیا، انھیں نوادر میں شیخ بوعلی سینا کی "الحکمۃ المشرقیہ" بھی تھی۔

سلطان علاء الدین نے اپنے بھتیجوں ذیعی سلطان بہاء الدین سام کے دونوں بیٹوں غیاث الدین اور معزالدین (شہاب الدین محمد غوری) کو وجیرستان کے قلعہ میں قید کردیا تھا، آخر زمانہ میں اس کا رجحان "اسماعیلیت" کی طرف ہوگیا تھا، اس سے رعایا میں اس کی ہردلعزیزی کو بڑا صدمہ پہنچا، علاء الدین کی وفات پر اس کا بیٹا سلطان سیف الدین کے نام سے تخت نشین ہوا، اس نے باپ کی پالیسی کو بدل دیا اور اسماعیلی دعاۃ (قرامطہ) کی بیخکنی کی اور اس طرح رعایا میں مقبولیت حاصل کی، بقول منہاج سراج،

"وبدین غزو سنت محمد محبت او در دل اہل غور و ممالک جبال راسخ گشت و بجگان نفاق عبودیت برمیان بستند وطوق طواعیت او بر گردن اخلاص نہادند[۱]"

دوسرا کام اس نے یہ کیا کہ دونوں چچازاد بھائیوں غیاث الدین اور شہاب الدین کو قید سے آزاد کردیا، سلطان سیف الدین نے ڈیڑھ سال کی مختصر حکومت کے بعد وفات پائی اور غیاث الدین اس کا جانشین ہوا، غیاث الدین نے شہاب الدین کو تکیناباد [مضافات غزنی] کی حکومت دی، اسکے بعد ۵۶۹ھ میں دونوں بھائیوں نے غزنی پر حملہ کیا جسے غزوں نے ۵۵۵ھ میں خسرو شاہ سے چھین لیا تھا، بڑی گھمسان کی لڑائی کے بعد غوریوں کی فتح ہوئی اور بقول منہاج سراج:

"چوں غزنین فتح شد سلطان غیاث الدین برادر خود سلطان معزالدین را بتخت محمودی بنشاند[۲]"

"تخت محمودی" پر متمکن ہونے کے بعد "ملک محمودی" کی خواہش فطری تھی، اسلیے اگلے سال محمد غوری نے گردیز کو فتح کیا، ۵۷۱ھ میں ملتان کو قرامطہ سے چھینا جو غزنویوں کی کمزوری کی وجہ سے وہاں متمکن ہوگئے تھے، ۵۷۴ھ میں گجرات پر حملہ کیا مگر ناکام رہا، ۵۷۵ھ میں پشاور فتح کیا لیکن جب تک محمود کا خاندان محمودی برسر اقتدار تھا، ملک محمودی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا تھا، اسلیے ۵۸۲ھ میں اس نے لاہور پر جو آخری غزنوی تاجدار خسرو ملک کا مستقر حکومت تھا حملہ کیا

"چوں کار دولت محمودیاں بآخر رسیدہ بود و قواعد دولت آں دودمان واہی شدہ خسرو ملک بر طریق صلح پسر را و یک زنجیر فیل بخدمت سلطان غازی فرستاد[۳]"

---

۱ طبقات ناصری ص ۵۹، ۲ ایضاً ص ۷۰، ۳ ایضاً ص ۱۱۶

اس مرتبہ محمد غوری صلح کرکے لوٹ گیا، اگلے سال دیبول (سندھ) کو فتح کرکے مال غنیمت لیکر لوٹا، ۵۸۱ھ میں پھر لاہور پر حملہ کیا اور ملک کو تاخت و تاراج کرکے لوٹ گیا، لوٹتے وقت سیالکوٹ میں ایک قلعہ بناکر حسین خرمیل کو وہاں متعین کر گیا اسوقت غزنوی خاندان کا ستارہ غروب ہو رہا تھا، اسکے اسباب بھی ایسے ہی پیدا ہوگئے، خسرو ملک نے ہندوستانی لشکر کے ساتھ سیالکوٹ پر چڑھائی کی، مدتوں تک محاصرہ کیے پڑا رہا، آخر ناکام لوٹ گیا، اور محمد غوری کو لاہور پر حملہ کرنے اور غزنویوں کا خاتمہ کرنے کا بہانہ ہاتھ آگیا اور:

"چون دولت محمودیہ بآخر انجامیدہ بود و آفتاب دولت و سلطنت سبکتگین بغروب رسیدہ بود بر قضا پیدا نہ عزل خسرو ملک در قلم تقدیر آوردہ خسرو ملک طاقت مقاومت نداشت، بوجہ صلح پیش آمد تا با سلطان ملاقات کند، بیرون آمد، ماخوذ و محبوس گشت و لوہور سلطان غازی را مسلم شد[1]"

سلطان نے علی کرماخ کو لاہور کا گورنر اور منہاج سراج کے والد سراج الدین کو قاضی لشکر مقرر کیا،

پچھلے حملہ آوروں کی طرح محمد غوری کو کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ ہندوستان میں شوق جہاد پورا کرنے جائیگا، بلکہ وہ صرف خاندانی انتقام کی تشفی کے لیے غزنویوں کو انکے خراسانی مقبوضات کے ساتھ ساتھ ہندوستانی مقبوضات سے بھی بے دخل کرنے آیا تھا، مگر مقامی راجاؤں نے اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھانا چاہا، ہوا یہ کہ سلطان نے نئی مملکت کی سرحد کو مضبوط کرنے کے لیے قلعہ تبرہندہ (یا سرہند) کو فتح کرکے ملک ضیاء الدین تولکی کو وہاں کا نائب بناکر خود غزنی جا رہا تھا کہ پرتھوی راج اور اس کے بھائی کھانڈے راؤ (یا بقول منہاج سراج گوبند رائے[2]) نے جمعیت کثیر کے ساتھ حملہ کر دیا، اور سلطانی فوج کو شکست ہوئی، اس لیے سلطان نے ۵۸۸ھ میں پھر حملہ کیا اور اس شکست کا بدلہ لے لیا، اور اجمیر اور دہلی بھی غوریوں کے قبضہ میں آگئے اور اسلامی حکومت کا مرکز بن گئے، حسن نظامی نے "تاج المآثر" میں لکھا ہے کہ فتح کے بعد اجمیر مساجد و مدارس سے معمور ہوگیا۔

---

[1] طبقات ناصری ص ۱۱۷ [2] ایضاً ص ۱۱۹

"اساس ہو قواعد بتکدہ با نقص و خرابی پذیرفت و معابد و صنام و اوثان بمساجد و مدارس بدل افتاد"[۱]

اس کے بعد سابق حملہ آوروں کی طرح غوریوں کو بھی مقامی راجاؤں کی قوت کا اندازہ ہو گیا، چنانچہ انھوں نے شمالی ہندوستان کو اپنی تاخت و تاراج سے روند ڈالا، اگلے سال محمد غوری کے نائب قطب الدین ایبک نے میرٹھ اور کول کو فتح کر کے دہلی کا باقاعدہ انتظام کیا، سنہ ۵۹۰ھ میں محمد غوری نے قنوج اور بنارس پر حملہ کر کے غنیمت فراواں حاصل کی، اور اس کے حکم سے قطب الدین ایبک نے گجرات اور شمالی ہندوستان کے اکثر حصے فتح کر کے ممالک محروسہ میں شامل کیے

سنہ ۵۹۷ھ میں تکش خاں بادشاہ خوارزم کی وفات پر غیاث الدین اور شہاب الدین نے خراسان پر حملہ کیا اور نیشاپور و سرخس وغیرہ پر قبضہ کر لیا، غیاث الدین تو لوٹ کر ہرات چلا گیا، مگر

"سلطان شہاب الدین بہ نیت تخریب بلاد و قلاع و رباع ملاحدہ متوجہ قہستان شد"[۲]

وہاں پہنچکر اس نے اسماعیلیوں کی بیخ کنی شروع کر دی، ان کے شہروں کو ان سے خالی کر کے از سر نو اسلامی شعار کو قائم کیا، بقول ابن الاثیر

فاقام بها الصلوٰة و شعائر الاسلام[۳]	سلطان نے وہاں نماز اور دیگر شعائر اسلام کو قائم کیا۔

والی قہستان نے غیاث الدین سے [جس کے مزاج میں شہاب الدین کی طرح تشدد نہیں تھا] شکایت کی کہ یہ صلح کی خلاف ورزی ہے، غیاث الدین نے شہاب الدین کے پاس قاصد روانہ کیا جس نے اس کو اسماعیلیوں کو برباد کرنے سے روکا، اس پر سلطان شہاب الدین ناراض ہو کر بجائے غزنی کے ہندوستان روانہ ہو گیا،[۴]

---

[۱] تاج المآثر ۔۔۔ [۲] روضۃ الصفاج ۴ ص ۳۰ و ۔۔۔ [۳،۴] کامل ابن الاثیر جلد دوازدہم ص ۶۵ ۔

۵۹۹ھ میں غیاث الدین کی وفات پر شہاب الدین مستقل بادشاہ ہوا، خوارزم شاہیوں سے جنگ جاری تھی جس میں محمد غوری کا پلہ بھاری تھا، لیکن خوارزم شاہیوں نے کفار خطا سے مدد مانگی مدد سے محمد غوری کو شکست فاش دی، یہانتک کہ دوسرے ملکوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ محمد غوری اس جنگ میں لاپتہ ہوگیا ہے، جس سے تمام ممالک محروسہ میں ابتری پھیل گئی، سلطان کا ایک غلام ایبک بالتر ملتان پہنچا، جہاں ایک فتنہ پرداز زندیق عمر بن ہزان کے اغوا سے علم خود مختاری بلند کیا، ملتان اور لاہور کے درمیان کھوکھروں نے بغاوت کردی، ادھر خراسان کے باطنیوں (اسماعیلیوں) نے سلطان کی اس پریشانی سے فائدہ اٹھانا چاہا، لیکن سلطان نے ہمت اور حسن تدبیر سے کام لیا، ایبک بالتر کی سرکوبی کے لیے ایک لشکر روانہ کیا، جس نے اس کا قلع قمع کرکے اس کو قتل کردیا، اور باطنیہ خراسان کے استیصال کے لیے اپنے نائب محمد بن ابی علی کو لکھا، اس نے قہستان سے چلکر قائن کا جو باطنیوں کا گڑھ تھا، محاصرہ کرلیا،[1] ادھر قطب الدین ایبک کو کھوکھروں کی تادیب کے لیے لکھا، اور خود کفار خطا سے انتقام لینے کی تیاریاں کرنے لگا، وہ ان سے بدلہ لینے جارہا تھا کہ کھوکھروں کی شورش کی پے درپے خبریں آنا شروع ہوگئیں، اور لاہور اور ملتان کے ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ پیدا ہوگیا، اس لیے مجبوراً کفار خطا سے انتقام کا ارادہ ترک کرکے عنان عزیمت ہندوستان کی طرف منعطف کی، ربیع الاول ۶۰۲ھ میں لڑائی ہوئی، کھوکھر بڑی بے جگری سے لڑے، مگر آخر کار شکست کھائی، ان کی تادیب سے فارغ ہوکر سلطان لاہور گیا، جہاں کچھ دن آرام کیا،[2] اب وہ پھر کفار خطا کی جنگ کے ارادے سے چلا، مگر راستے میں دمیک کے مقام پر ایک رات کچھ نامعلوم لوگوں نے خیمہ میں گھس کر اسے شہید کرڈالا،[3] ایک خیال یہ ہے کہ والی قہستان نے جس کے ملک پر سلطان کے حکم سے محمد بن ابی علی محاصرہ ڈالے پڑا تھا، کچھ فدائی سلطان کو شہید کرنے کے لیے بھیجے تھے، دوسرا خیال یہ ہے کہ

---

[1] کامل ابن الاثیر طبع لائڈن ج ۱۲ ص ۷۲-۷۳، [2] ایضاً ص ۸۱-۸۲، [3] ایضاً ص ۸۲

یہ خوارزم شاہیوں کے ایجنٹوں کا کام تھا، جن کے استیصال کے لیے سلطان جا رہا تھا، خوارزمشاہی سلاطین اور امراء و خلفاء کو بھی فدائیوں کے ہاتھوں ختم کرا چکے تھے، ایک افواہ یہ بھی تھی کہ اس سازش میں امام رازی بھی شریک تھے، یا کم از کم ان کو اس سازش کا علم تھا، کیونکہ امام صاحب خوارزم شاہ کے خاص آدمی تھے، اور وہاں (دیبل) سے بھاگ کر خوارزم شاہی کے دربار میں پہنچے تھے[۱]، اس کے علاوہ وہ غالباً اسماعیلیوں کے وظیفہ یاب بھی رہے تھے، (مزید تفصیل آگے آرہی ہے)

شہاب الدین غوری کی وفات کے بعد اس کے ہندوستانی مقبوضات اس کے غلام قطب الدین ایبک کے حصہ میں آئے، جس سے سلاطین ہند کے ایک نئے سلسلہ "غلام خاندان" کا آغاز ہوا۔

غور اور بامیان کا علاقہ قدیم زمانہ میں بدھ مت کے زیر اثر رہ چکا تھا، اور بت پرستی کے ساتھ تشبیہ و تجسیم ان کی طبیعت میں راسخ تھی، اس لیے اسلام لانے کے بعد کرامیت ان میں بہت زیادہ مقبول ہوگئی، غیاث الدین اور شہاب الدین بھی اپنے ہم وطنوں کی طرح اسی مذہب کے پیرو تھے، منہاج سراج نے لکھا ہے:۔

"در اول حال آں ہر دو برادر نور اللہ مرقدہما بہ طریق مذہب کرامیاں بودند بحکم اسلاف و بلاد خود[۲]"

اسی طرح ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ اہل غور کرامی تھے، اور اشاعرہ و شوافع کو خصوصیت سے ناپسند کرتے تھے:۔

"واما الغوریہ فکلھم کرامیۃ وکرھوا[۳]"

لیکن جب خراسان غوریوں کے قبضہ میں آگیا تو غیاث الدین و شہاب الدین نے کرامی

---

[۱] روضۃ الصفا جلد چہارم صفحہ ۰۰ [۲] طبقات ناصری ص ۷۷ [۳] کامل لابن الاثیر جلد ۱۲ ص ۵۹

مذہب چھوڑ دیا، ابن الاثیر نے لکھا ہے:-

وقیل ان غیاث الدین واخاہ	اور کہا جاتا ہے کہ جب غیاث الدین اور
شہاب الدین لما ملکا	اس کا بھائی شہاب الدین خراسان پر
خراسان قیل لھما ان الناس	قابض ہو گئے تو ان سے لوگوں نے کہا کہ
فی جمیع البلاد یزرون علی	اس پورے ملک کے لوگ کرامیہ کو برا
الکرامیۃ ویحتقرونھم والرای	سمجھتے اور حقیر گردانتے ہیں، اس لیے انکا
ان تفارقا مذاھبھم فصارا	مذہب چھوڑ دینا مناسب ہے، چنانچہ
شافعیین[1]	دونوں شافعی ہو گئے،

غیاث الدین کے تبدیل مذہب میں دو شخصوں کو خاص دخل تھا:- ایک فخر الدین مبارکشاہ مروزی جو غوری دربار کا ایک باکمال فاضل، درباری، مورخ اور "ہرات نامہ" کا مصنف تھا، دوسرے امام فخر الدین رازی۔ فخر مبارک نے اپنے ہموطن شیخ وجیہ الدین ابو الفتح محمد بن محمود المروزی کو دربار سلطانی میں باریاب کرایا، ان کی تعلیم و ترغیب سے غیاث الدین نے شافعی مذہب اختیار کر لیا، ابن الاثیر لکھتا ہے:-

فاوصل الی غیاث الدین	شیخ وجیہ الدین ابو الفتح محمد بن محمود مروزی
الشیخ وجیہ الدین ابا الفتح محمد	فقیہ شافعی کو غیاث الدین کے یہاں پہنچا گیا
بن محمود المروزی الفقیہ	انھوں نے اس کو مذہب شافعی سمجھایا
الشافعی فاوضح لہ مذھب	اور اس کے سامنے مذہب کرامیہ کی خرابیاں
الشافعی وبین لہ فساد مذھب	واضح کیں، چنانچہ غیاث الدین نے شافعی مذہب

---

[1] کامل ابن اثیر جلد ۱۰ و ۱۱ صفحہ ۱۰۲ [2] طبقات ناصری ص ۷۷

الکرامیة فصار شافعیاً وبنی المدارس
للشافعیة وبنی بغزنة مسجداً
لھم ایضاً واکثر مراعاتھم فسعی
الکرامیة فی اذی وجیه الدین
فلم یقدرھم اللہ تعالیٰ
علیٰ ذالک[1]

اختیار کر لیا اور یہاں شافعیہ کے لیے مدارس
قائم کیے اور غزنہ میں ایک مسجد تعمیر کی اور
ان کے ساتھ بڑی رعایتیں کیں، اس لیے
کرامیہ نے وجیہ الدین کو تکلیف پہنچانے
کی بڑی کوشش کی مگر اللہ تعالیٰ نے
ان کو اس پر قادر نہیں کیا،

منہاج سراج نے سلطان کے تبدیل مذہب کی مزید تفصیل دی ہے،

"اما سلطان غیاث الدین نور اللہ مرقدہ شبے در خواب دید کہ او با قاضی سعید وجیہ الدین (وجیہ الدین؟) محمد مرورودی طاب ثراہ کہ بر مذہب اصحاب حدیث بود و مقتدائے شغوباں در یک مسجد بودندے ناگاہ امام شافعی رحمہ اللہ در آمد در محراب رفتے و تحریمۂ نماز بستے وسلطان غیاث الدین و قاضی وجیہ الدین ہر دو با امام شافعی رحمہ اللہ اقتدا کردندے، چوں از خواب در آمد سلطان فرمان داد تا بامداد قاضی وجیہ الدین را تذکیر فرمودند، چوں بر بالائے کرسی رفت در اثنائے سخن گفت کہ اے پادشاہ اسلام ایں داعی دوش خوابے دیدہ است وعین خوابے کہ سلطان دیدہ بود باز گفت او ہم مثل آں دیدہ بود کہ سلطان، چنانچہ از کرسی فرود آمد و بخدمت سلطان بالا رفت، سلطان طاب مرقدہ دست مبارک قاضی وحید الدین علیہ الرحمہ بگرفت و مذہب امام شافعی رحمہ اللہ علیہ قبول کرد۔[2]"

اس سے کرامی فرقہ کو بڑی تکلیف ہوئی، اس زمانہ میں ان کے سب سے بڑے مقتدا امام

---

[1] کامل ابن اثیر جلد دہم ص ۱۰۰ [2] طبقات ناصری ص ۷۷ - ۷۸

امام صدرالدین علی ہیصم نیشا پوری تھے، جو غرجستان میں شہر فشین کے مدرسہ کے صدر مدرس تھے، انھوں نے ایک منظوم شکایت نامہ لکھا، یہ قطعہ غیاث الدین کے پاس پہنچا تو وہ بہت ناراض ہوا، اور امام صدرالدین ممالک غور سے ہجرت کرکے نیشا پور چلے گئے، اور ایک سال کے بعد انھوں نے معذرت میں ایک قطعہ لکھ کر سلطان کے پاس بھیجا جس کا مطلع تھا،

جلال حضرتکم غوثنا وانت غیاث ۔ بیمن عهدک تیسیر امرنا المثلثات

اس معذرت پر سلطان نے ان کے لیے خلعت بھیجی اور واپس بلا بھیجا[1]،

اسی زمانہ میں یہ واقعہ ہوا کہ امام فخرالدین رازی جو عرصہ تک اسماعیلیوں کے وظیفہ یاب رہے تھے، (تفصیل آگے آرہی ہے) پہلے بامیان پہنچے، جہاں بہاءالدین سام غوری (جو غیاث الدین و شہاب الدین کے باپ بہاءالدین کے علاوہ ایک اور غوری شہزادہ تھا) کی حکومت تھی، امام رازی نے اس کے نام پر رسالہ بہائیہ تصنیف کیا[2]، بامیان سے وہ سلطان غیاث الدین کے پاس پہنچے، سلطان نے ان کی بہت زیادہ عزت و تکریم کی، اور ہرات میں ان کے واسطے ایک مدرسہ تعمیر کیا، ان کی اس عزت و وجاہت سے کرامی علماء کو جن کی اس نواح میں اکثریت تھی بڑا دکھ ہوا، خود حکمراں خاندان کے اکثر ارکان کرامی تھے، ان میں ملک ضیاء الدین جو سلطان کا چچازاد بھائی اور داماد تھا، پیش پیش تھا، ایک دن مجلس مناظرہ میں امام رازی نے کرامیوں کے پیشوا ابن القدوہ [قاضی مجد الدین عبد المجید ابن عمر] کو بہت برا بھلا کہا، ابن القدوہ نہ صرف کرامیوں ہی میں معزز و محترم تھا بلکہ دربار میں بھی اس کی بڑی عزت تھی، چنانچہ جب خلیفہ الناصر کے یہاں سے ابن الربیع سفارت پر آیا تو غیاث الدین نے ابن القدوہ ہی کو بازرسالت میں بغداد بھیجا تھا[3]، امام رازی کی اس زبان درازی سے لوگ بہت زیادہ برافروختہ ہوئے، ملک ضیاء الدین نے غیاث الدین سے جا کر شکایت کی اور امام رازی پر فلسفہ و زندقہ

---

[1] طبقات ناصری ص ۶۲ [2] ایضاً ص ۱۰۶ [3] ایضاً ص ۷۷

کا الزام لگایا۔

وقام ضیاء الدین فی ھٰذہ	ضیاء الدین نے غیاث الدین سے اس واقعہ
الحادثۃ وشکی الی غیاث الدین	کی شکایت اور امام فخر کی بڑی مذمت
وذم الفخر ونسبہ الی الزندقۃ	کی اور زندقہ اور فلاسفہ کے مذہب کو
ومذھب الفلسفۃ[1]	ان کی جانب منسوب کیا،

سلطان غیاث الدین نے اس شکایت کی پروا نہ کی، دوسرے دن قاضی ابن القدوہ جامع مسجد میں پہنچے اور حمد وثنا کے بعد اتباع سنت اور فلسفہ سے بیزاری پر زور دیا:۔

ایھا الناس انا لا نقول الا ماصح	لوگو ہم صرف وہی کہتے ہیں جو ہمارے نزدیک
عندنا عن رسول اللہ صلی اللہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو،
علیہ وسلم اما علم ارسطاطالیس	اور ارسطا طالیس کے علم، ابن سینا کی
وکفریات ابن سینا وفلسفۃ	کفریات اور فارابی کے فلسفہ کو
الفارابی فلا نعلمھا[2]	ہم نہیں جانتے،

اس کے بعد امام رازی کے رویہ اور بدکلامی کی بڑے رقت آمیز لہجہ میں شکایت کی، اس سے لوگوں میں بڑا ہیجان پیدا ہوگیا، اور قریب تھا کہ یہ فتنہ قتل وخونریزی کی شکل اختیار کرلے کہ سلطان کو اس کی اطلاع ہوگئی، اس نے لوگوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اپنے خواص کو بھیجا اور امام رازی کے نکالدینے کا وعدہ کیا، اور امام رازی کو بھی کہلا بھیجا کہ وہ ہرات سے چلے جائیں، اس حکم پر وہ چلے گئے۔

لیکن ...... سلطان شہاب الدین غوری نے حنفی مذہب اختیار کیا تھا، ابن الاثیر نے لکھا ہے:

وقیل شہاب الدین کان حنفیاً واللہ اعلم[3]	اور کہا جاتا ہے کہ شہاب الدین حنفی تھا،

---

[1] کامل لابن الاثیر جلد دوازدہم ص ۵۹ [2] ص ۵۹ [3] ایضاً ص ۶۰

مگر منہاج سراج نے قلیت کے ساتھ لکھا ہے :-

"اسلطان معز الدین چوں بتخت غزنین نشست و اہل آں شہر و مملکت بر مذہب امام اعظم ابو حنیفہ کوفی رحمہ اللہ بودند او بموافقت ایشان مذہب ابی حنیفہ رحمہ اللہ اختیار کرد"[1]

یہ تبدیل مذہب فقہی سے زیادہ کلامی تھا، اس لیے علوم عقلیہ کی ترویج و اشاعت پر اس کا اثر پڑنا ناگزیر تھا۔ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

علمی سرپرستی مسلمانوں کے لوازم سلطنت میں رہی ہے، اس لیے غوری حکمرانوں نے بھی اس رسم دیرینہ کا اتباع کیا، ابن الاثیر غیاث الدین کے بارے میں لکھتا ہے :-

کان جواداً حسن الاعتقاد	وہ فیاض اور صحیح العقیدہ تھا، خراسان میں
کثیر الصدقات والوقوف	بہت سے صدقات اور اوقات کیے، مسجدیں
بخراسان بنی المساجد والمدارس	اور مدرسے بنائے، جب وہ کسی شہر میں پہنچا
..... وکان اذا وصل الی بلد عم	تھا تو اس کے باشندوں، فقہا اور اہل فضل
احسانہ اہلہ والفقہاء واہل	کے ساتھ عام احسان و سلوک کرتا تھا اور
الفضل .... وکان یراعی کل	علویین اور شعراء وغیرہ میں سے جو بھی
من وصل الی حضرتہ من	اس کے حضور میں پہنچ جاتا تھا اس کے ساتھ
العلویین والشعراء وغیرھم	مراعات کرتا تھا، اس میں بڑی خوبیاں
وکان فیہ فضل غزیر والادب	اور محاسن تھے، حسن خط، بلاغت
مع حسن خطہ و بلاغتہ"[2]	اور ادب سے آراستہ تھا۔

اسی طرح منہاج سراج نے اس کی علم و فضل نوازی کے بارے میں لکھا ہے :-

---

[1] طبقات ناصری ص ۰، [2] کامل لابن الاثیر جلد ۱۲ ص ۰،

"حق تعالیٰ ...... حضرت اورا از افاضل علماء و جماہیر حکماء و مشاہیر بلغاء آراستہ کردہ و درگاہ

با جاہ او جہاں پناہ شدہ مرجع افراد مذکوران دنیا گشتہ، از کل مذاہب متقدایان بر فریق جمع بودند

و شعراء بے نظیر حاضر و طوق کلام نظم و نثرہ سلک خدمت بارگاہ اعلیٰ او منتظم شد"[1]

اسی طرح عوفی غوریوں کے پایہ تخت فیروزکوہ کے بارے میں لکھتا ہے:۔

"حضرت فیروزکوہ محط رحال و مہبط انوار فضل و افضال شد، شعراء عالی قبلہ حاجات آنرا

دانستند و فضلاء سامی مرتبت روے بداں آوردند"

غیاث الدین کے دربار کا سب سے مشہور فاضل فخرالدین مبارک شاہ تھا، جس کے فضل و کمال اور مزاجِ

سلطانی میں دخیل ہونے کا اوپر ذکر آچکا ہے، ابن الاثیر اس کے بارے میں لکھتا ہے:۔

یقول الشعر بالفارسیۃ متفننا فی کثیر من العلوم[2] — فارسی کا شاعر اور بہت سے علوم میں دستگاہ رکھتا تھا

فخرالدین مبارک شاہ نے اپنے مکان میں ایک مہمان خانہ بنایا تھا جس میں شائقین علم کے لیے ایک کتب خانہ

بھی قائم کیا تھا، ابن الاثیر دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

وکان حسن الشعر بالفارسیۃ	فارسی اور عربی میں اچھا شاعر تھا، غیاث الدین کبیر
والعربیۃ ولہ منزلۃ عظیمۃ عند	والی غزنہ وہراۃ وغیرہ کے دربار میں اسکی بڑی
غیاث الدین الکبیر صاحب غزنۃ	قدر و منزلت تھی، غیاث الدین کے مہمانخانہ
وھراۃ وغیرھا وکان لہ دار ضیافۃ	میں کتابوں اور شطرنج کا بھی انتظام تھا،
فیھا کتب وشطرنج فالعلماء یطالعون	علماء کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے اور جاہل
الکتب والجہال یلعبون بالشطرنج[3]	شطرنج سے دل بہلاتے تھے۔

فخر مبارک نے سلاطین غور کی منظوم تاریخ بھی لکھی تھی، جسے اس نے سلطان غیاث الدین کے نام

معنون کیا تھا، منہاج سراج لکھتا ہے،

---

[1] طبقات ناصری ص ۷۷ [2] کامل لابن الاثیر جلد دوازدہم ص ۷۰ [3] ایضاً ص ۹۹

"بہ اکرم ملک الکلام مولانا فخر الدین مبارکشاہ مروروذی طاب مرقدہ نسبت نامہ ایں سلاطین نامدار را در سلک نظم کشیدہ است..... چوں بعضے از کتاب و تاریخ نہ نظم آمد مگر بسبب تغیر زاجے کہ فخر الدین مبارکشاہ را ظاہر شد آں نظم را مہمل گزاشت تا چوں مملکت بشکوہ فرہایوں سلطان غیاث الدنیا والدین محمد سام زیب و جمال گرفت آں تاریخ با لقاب مبارک وزین گشت و تمام شدہ"[1]

اس عہد کے دوسرے فضلاء میں جمال الدین محمد بن نصر اور شرف الدین احمد بن محمد ایزدیار خاص طور پر مشہور تھے شہاب الدین غوری ایک حوصلہ مند فاتح تھا، اور علمی سرپرستی میں بھی دوسرے بھائی سے کم نہ تھا، ابن الاثیر اس کی علم نوازی کے بارے میں لکھتا ہے:۔

حکی عنہ انہ کان یحضر العلماء	بیان کیا جاتا ہے کہ غیاث الدین علماء
فیتکلمون من المسائل الفقهية	کو بلاتا تھا، وہ اس کے سامنے فقہی اور
وغیرھا وکان فخرالدین الرازی	دوسرے مسائل پر بحث کرتے تھے،
یعظ فی دارہ[2]	فخر الدین رازی اسکے گھر میں وعظ کہتے تھے۔

اسی طرح بدایونی نے اس کی علم دوستی کے بارے میں لکھا ہے:۔

"وعلماء و فضلاء و شعراء در زمان او بسیار تربیت یافتند، از اں جملہ امام فخر الدین الرازی رحمہ اللہ کہ لطائف غیاثی و کتب دیگر بنام برادر او سلطان غیاث الدین ابوالفتح تصنیف کردہ و بلشکر سلطان معز الدین محمد سام اقامت داشتہ ہر ہفتہ بوعظ قیام می نمود و سلطان در پائے وعظ او رقت بسیار می کرد..... روزے بر سر منبر با سلطان خطاب کردہ گفت کہ اے سلطان معز الدین بعد از چند گاہ نہ ایں عظمت و شوکت تو می ماند، نہ تملق و نفاق رازی، و ایں قطعہ از و ست

اگر دشمن نسازد با تو اے دوست	ترا باید کہ با دشمن بسازی
وگرنہ چند روزے صبر فرما	نہ او ماند نہ تو نے فخر رازی[3]

(باقی)

[1] طبقات ناصری ص ۲۸۔ ۲۹ [2] کامل لابن الاثیر جلد دوازدہم ص ۸۴ [3] منتخب التواریخ بدایونی ج اول ص ۵۳

ابو عثمان جاحظ

از جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دارالمصنفین

(۴)

جاحظ کے طرز تحریر کی خصوصیات | مسلمانوں کی علمی تاریخ میں جاحظ کی شخصیت بڑی جامع تھی، مختلف علوم میں اس کو عالمانہ بصیرت حاصل تھی، اس نے بہت سے علوم پر مجتہدانہ کتابیں لکھیں، اسلامی تاریخ میں اس کی جیسی جینس شخصیتیں کم گذری ہیں لیکن اس کا امتیازی وصف جس سے اس کی شہرت کو دوام حاصل ہوا، اس کی انشاء پردازی ہے، وہ ایک طرز خاص کا موجد اور اس کا خاتم تھا، اس کے بعد کوئی اس کا ہمسر پیدا نہیں ہوا، آیندہ سطور میں اس کی تحریر اور ادب و انشاء کی خصوصیات پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔

(۱) جاحظ کی انشاپردازی کی اصل خصوصیت تاثیر و بلاغت ہے، دوسری خوبیاں زیادہ تر اسی کا نتیجہ ہیں، ادب و انشاء میں تاثیر حسن اور سلاست، موقع و محل کی رعایت، ایجاز، الفاظ کے حسن انتخاب اور حسن تعبیر سے پیدا ہوتی ہے، جاحظ کی تمام تحریروں میں اس کا التزام ہے، اسلئے اس کی کوئی تحریر بھی دلکشی اور تاثیر سے خالی نہیں ہوتی۔ وہ لکھتا ہے کہ:-

"ادیب اور انشاء پرداز کی زبان میں لطافت اور طریقۂ بیان میں حلاوت ہونی چاہیے، اس کو اصل مقصود و مطلوب کی جانب ہمیشہ توجہ رکھنی چاہیے، تاکہ تیر نشانہ پر لگے، عوام سے بات چیت کرنے کا وہ انداز ہونا چاہیے جو خواص سے بات چیت کرنے کا ہے، اسی طرح خواص کے سامنے عوامی گفتگو نہ کرنا چاہیے۔"

دوسری جگہ کہتا ہے :۔

"سب سے بہتر کلام وہ ہے جو مختصر ہونے کے باوجود زیادہ معانی پر مشتمل ہو، اور ظاہری الفاظ ہی سے اس کا مفہوم سمجھ لیا جائے۔ انشاپرداز میں اگر موزونی طبع ہے اور وہ غرابت، ثقالت اور تکلف و بناوٹ سے پرہیز کرتا ہے اور اس کے الفاظ موثر اور معانی بلند ہیں تو اس کی بات دل پر اسی طرح اثر انداز ہوتی ہے جس طرح پاکیزہ اور شاداب زمین میں بارش کا اثر ہوتا ہے۔ ایسے ہی کلام کو اللہ تعالیٰ تاثیر بخشتا ہے، جاہل تک اسے سمجھ لیتا ہے اور سرکش و جابر قسم کے لوگ بھی اس سے متاثر ہو جاتے ہیں۔"

کتاب الحیوان میں ایک جگہ لکھتا ہے :۔

"ہر قسم کی بات کے لیے اسی کے مناسب الفاظ اور ہر نوع کے مضامین کے لیے اسی نوعیت کا اسلوب بیان ہوتا ہے، سخیف موضوع کے لیے سخیف الفاظ اور ہلکے پھلکے موضوع کے لیے ہلکے پھلکے الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے، کنایہ اور تصریح میں ہر ایک کا الگ موقع ہوتا ہے، اگر ایسا نہ ہو تو کلام سے حظ کی جگہ کرب اور لذت کے بجائے الم حاصل ہوتا ہے۔"

اسی کتاب میں ایک اور جگہ لکھتا ہے :۔

"ہم نے ایسے اشعار نقل کیے ہیں جو ایجاز کی مثال اور حشو و زوائد سے پاک ہیں، میں نے اپنی کتاب میں قرآن مجید کی ایسی آیتیں نقل کی ہیں، جن سے تم ایجاز، حذف اور حشو و زوائد اور استعارات کے درمیان تمیز کر سکتے ہو اور اس کو پڑھنے سے تم ایجاز اور تھوڑے الفاظ کے زیادہ معانی پر مشتمل ہونے کی اہمیت معلوم ہو سکتی ہے، مثلاً قرآن مجید میں جنتیوں کی شراب کی یہ خصوصیت بتائی گئی ہے کہ [لا یصدعون عنها ولا ینزفون] یہ دو لفظ دنیا والوں کی شراب کے تمام عیوب کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں، اسی طرح جنت کے

چیلوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ [لا مقطوعۃ ولا ممنوعۃ] یہ دو الفاظ تمام معانی کو شامل ہیں" (ج ۳ ص ۲۶ - ۲۷)

یہی وہ خوبیاں ہیں جو جاحظ کے کلام کی اثر آفرینی اور دلکشی کا سبب ہیں۔

(۲) جاحظ کے طرز تحریر کی دوسری خصوصیت جدت وندرت ہے، اس کا انداز بیان سب سے نرالا اور انوکھا اور اسلوب تحریر سب سے منفرد ہے۔ اس نے اپنی ذہانت وطباعی اور جدت و اختراع سے ایک ایسا اسلوب تحریر ایجاد کیا جس کی نظیر اس سے پہلے نہیں ملتی، یہ منفرد اور خاص طرز تحریر جاحظ کی شخصیت کی عکاسی بھی کرتا ہے اور اس کو دوسرے انشاء پردازوں سے ممتاز بھی۔ کتاب الحیوان میں ایک جگہ "کتاب" کی خوبیاں اس پیرائے میں بیان کی ہیں جس کو پڑھکر ادب و انشاء کا ہر طالب علم بلا تکلف یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہ دلفریب اور منفرد اسلوب جاحظ ہی کا ہو سکتا ہے۔

(۳) جاحظ کے طرز تحریر کی تیسری خصوصیت استدلال ہے، وہ معتزلی ہونے کی بنا پر عقلیت پسند تھا، اس لیے ہر بات مدلل طریقہ پر کہتا ہے، محض اپنے زور تحریر سے مخاطب کو کسی بات کے تسلیم کرنے پر مجبور نہیں کرتا، بلکہ خود اس کی عقل سے فیصلہ کرنے کی درخواست کرتا ہے، کسی بات کی تائید یا تردید میں معقول ومنقول نظری وعملی دونوں طرح کے دلائل بیان کرتا ہے۔ قرآن مجید کی آیتیں، آنحضورؐ کی حدیثیں، بزرگان دین، ماہرین فن اور حکماء کے اقوال کو ثبوت میں پیش کرتا ہے، اپنی عقل اور تجربات کے علاوہ قوموں کے مزاج وطبیعت، ان کی روایات، اجتماعی وتمدنی زندگی کے واقعات اور دوسرے قرائن سے بھی استدلال کرتا ہے، کتاب الحیوان میں عجیب الخلقت حیوانوں کا ذکر ہے، لیکن خرافات اور بعید از قیاس باتیں نقل کرنے سے پرہیز کیا ہے، ارسطو بھی جسکا وہ بہت احترام کرتا ہے، اس کی تنقید سے نہیں بچ سکا ہے، ایک جگہ اس کی اس رائے سے کہ "نر اور مادہ گنجشک کی عمر طویل ہوتی ہے، اور نر صرف ایک سال زندہ رہتا ہے" اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ارسطو نے اس کی

کوئی صریح دلیل اور قطعی ثبوت نہیں دیا ہے، اس لیے اس کے ماننے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا کنجشک کھیتوں اور مکانوں میں رہتی اور انڈے بچے دیتی ہے لیکن کبھی کسی نے کوئی مردہ گوریا نہیں دیکھی، ارسطو کی رایوں کا اس نے جاہلی اور اسلامی عہد کے شعراء کے اقوال کی روشنی میں جائزہ لیا ہے اور کبھی اس کی اور کبھی ان کی اور کبھی دونوں کی تردید کی ہے، کتاب البیان والتبیین میں اس نے جو کچھ لکھا ہے اس کا مقصد زیادہ تر بیان اور قوت گویائی کی اہمیت ظاہر کرنا ہے، اپنی اس خصوصیت کی جانب کبھی کبھی وہ خود اشارہ بھی کرتا ہے، ایک جگہ لکھتا ہے:-

"میری اس کتاب کے پڑھنے والے کو اندازہ ہوگا کہ میں نے کوئی بات بلا دلیل اور ثبوت نہیں لکھی ہے، اور نہ میرا استدلال کمزور اور بودا ہے، میں کسی چیز کو ثابت کرنے کے لیے دلیل خطابت اور ایسی چیزوں سے شہادت پیش کرتا ہوں جن سے انصاف پسند مخالفین بھی انکار نہیں کر سکتے، اس سے بات بھی زیادہ واضح ہوتی ہے اور لوگوں کو بھی اطمینان و تشفی ہوتی ہے"۔

ایک اور جگہ لکھتا ہے:-

"میں اپنے علم و امکان اور وسعت و طاقت کی حد تک ایسے قطعی ثبوت، صریح دلیلیں اور واضح حقائق و شواہد پیش کروں گا جنکی تردید و انکار کی کوئی جرأت نہ کر سکے گا"۔

(۴) جاحظ کی کتابوں میں بڑا تنوع ہے، اور وہ گوناگوں مسائل مختلف مباحث اور طرح طرح کے معلومات پر مشتمل ہیں، کبھی کبھی وہ اصل موضوع کے ساتھ مختلف قسم کے علمی، ادبی، تاریخی، تنقیدی، تحقیقی اور تمدنی وغیرہ مباحث بھی چھیڑ دیتا ہے اور ان میں بڑی ژرف نگاہی اور دقیقہ رسی سے کام لیتا ہے سلسلۂ بیان میں اگر کوئی غریب اور مشکل لفظ آگیا تو اس کی وضاحت کے لیے قرآن مجید اور کلام عرب سے شواہد پیش کرنے لگتا ہے کسی شخص کا ذکر آگیا تو اس کی خصوصیات کی طرف بھی اشارے کرتا ہے کسی مسئلہ کو سمجھانے کے لیے قوموں اور ملکوں کے خصوصیات اور اشخاص و مذاہب کے حالات بیان کرنے لگتا ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لیے صرف کتاب الحیوان کافی ہے، جو معلومات کی کثرت، مضامین کے تنوع اور مسائل و مذاہب کی وسعت

کے لحاظ سے چھوٹی سی انسائیکلو پیڈیا ہے، اس میں ادب و انشاء، فکر و تحقیق اور علم و فن بھی ہے، حکمت کے ساتھ لطافت و ظرافت کی باتیں بھی ہیں، مشہور تاریخی واقعات، اپنے اور دوسروں کے تجربات، اس عہد کے علمی، ادبی، تاریخی، تمدنی، سیاسی، اجتماعی اور تہذیبی حالات کی عکاسی بھی ہے، دنیا کی مختلف قوموں، مذہبوں اور ملکوں کی خصوصیات بھی ہیں، آیات احادیث، امثال، اقوال، اشعار، ارسطو، جالینوس اور دھریین و طبیعین کے آرا و افکار اور دوسرے ایسے ایسے معلومات و مسائل ہیں جن کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا، اس تنوع کی بنا پر اس کی کتابیں عموماً نظم و ترتیب سے عاری ہیں،

(۵) جاحظ کی تحریروں کا ایک خاص وصف اعتدال و توازن ہے، وہ ایک منصف اور عادل جج کی طرح کسی عصبیت کے بغیر پوری دیانت داری اور انصاف سے کام لیتا ہے، شدید مخالفین کی تردید میں بھی عصبیت کا اظہار نہیں کرتا اور نہ اپنی بات کی پچ کرتا ہے، وہ ہر طبقہ اور مسلک کے لوگوں سے ربط و تعلق رکھتا تھا، اپنی ایک کتاب کے متعلق اس نے خود لکھا ہے:-

"میری خواہش ہے کہ یہ کتاب اعتدال اور انصاف پر مبنی ہو کسی گروہ کی مدح اور دوسرے کی مذمت میں غلو نہ ہونے پائے، کیونکہ جس کتاب میں یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے وہ جھوٹ کا پوٹ اور تکلفات کا مجموعہ ہوتی ہے۔"

(۶) بے مقصد اور بلا ضرورت باتیں نہیں کرتا، اس کی ہر تحریر کسی غرض و غایت پر مبنی ہوتی ہے، اپنی کتابوں میں جو معلومات، آیتیں، حدیثیں، امثال و اقوال لکھے ہیں ان سب میں اپنے مقصود اور غرض و غایت کا خیال رکھا ہے، یہاں تک کہ مزاح اور ظرافت کی باتیں بھی بلا ضرورت نہیں کرتا، کتاب الحیوان میں لکھتا ہے:-

"مزاح اور غیر سنجیدہ باتیں بھی سنجیدگی کا کام دیتی ہیں بشرطیکہ وہ اس مقصد کے لیے لکھی جائیں۔"

کتاب الحیوان میں اس موضوع کے انتخاب اور حیوانات کے ذکر کا مقصد تفصیل سے بیان کیا ہے،

(۷) رطب و یابس کے بجائے عمدہ اور منتخب چیزیں نقل کرتا ہے۔ اشعار وغیرہ کی نقل میں بھی اس کا محافظ رکھتا ہے اور اشعار کی معنویت، ادبیت اور بلاغت وغیرہ کا پورا خیال رکھتا ہے۔

(۸) جاحظ کے یہاں معلومات اور دلچسپ باتوں کی بڑی کثرت ہے، اس کی کچھ مثالیں آگے لکھی جائیں گی۔

(۹) پڑھنے والوں کی دلچسپی اور نشاط کا بڑا خیال رکھتا ہے، ان کی طبیعت کو تازہ رکھنے کے لیے ایک بحث سے دوسری بحث کی جانب متوجہ ہوتا رہتا ہے، اور جب اس کو خیال ہوتا ہے کہ پڑھنے والے سنجیدہ اور اہم موضوع کا تحمل نہیں کر سکتے تو ان کے نشاط و تازگی کے لیے مذاق اور دلچسپی کی باتیں شروع کر دیتا ہے۔ اپنی اس خصوصیت کا اس نے جابجا اظہار کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے:۔

"اس بحث کے لیے کتاب البیان والتبیین مناسب جگہ نہیں، اس کا موزوں مقام کتاب الحیوان ہے، لیکن کچھ ایسے اسباب پیدا ہو گئے، جن کی بنا پر اس موضوع کو صرف اس حد تک چھیڑ دینا پڑا جس حد تک وہ قاری کے نشاط کے لیے مفید ہو سکتا ہے، کیونکہ جب کوئی بحث طوالت اختیار کر لے تو دوسرا موضوع چھیڑ دینے سے دماغ کی تازگی اور نشاط میں اضافہ ہوتا ہے۔"[1]

ایک جگہ لکھا ہے:۔

"اگر موضوع طویل ہو تو مصنف کو قاری کے نشاط اور اس کی طبیعت کے انشراح کے لیے ایک چیز سے دوسری چیز کی جانب اور ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی جانب منتقل ہو جانا چاہیے لیکن موضوع زیر بحث سے یکسر صرف نظر کر لینا مناسب نہیں۔"[2]

---

[1] کتاب البیان والتبیین ج اول ص ۰۰ [2] ایضاً ج ۲ ص ۴ ۱۵

ایک بات کو مختلف مقامات میں بیان کرنے کا سبب یہ بتایا ہے کہ

"ہم نے یہ تمام باتیں ایک ہی جگہ نقل کرنا اس لیے ناپسند کیا کہ اس طریقہ سے پڑھنے اور سننے والے کا نشاط ختم ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے"

سنجیدہ اور پُر مغز باتوں کے سمجھنے کی صلاحیت ہر شخص میں یکساں نہیں ہوتی، زیادہ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو ہلکی پھلکی اور دلچسپ چیزیں ہی پسند ہوتی ہیں، ایسے لوگوں کو سنجیدہ باتیں سمجھانے کے لیے ظرافت کی چاشنی ضروری ہے۔

ایک جگہ لکھتا ہے: "اگر ان ناظرین کو جو یہ کتاب پڑھیں گے حق کی تلخی جد کی سختی، وقار اور سنجیدگی کی مشقت ہی کا خوگر بنایا گیا تو وہ اس کے متحمل نہ ہو سکیں گے، اس کا تحمل وہی لوگ کر سکتے ہیں جو خالص علمی ذوق رکھتے ہوں، اور جنھیں دقیق و سنجیدہ مسائل ہی میں لطف حاصل ہوتا ہو اور ہر بات کو مشقت اور کاوش ہی سے حل کرنے کے عادی ہوتے ہوں"

کتاب الحیوان میں ایک جگہ لکھتا ہے:۔

"تمھارے ذہن کو تیز اور احساس کو جلا بخشنے کے لیے اگر ہم ٹھوس اور سنجیدہ باتوں اور صحیح و مستند دلیلوں سے تمھارے اندر اکتاہٹ پیدا کر دیتے ہیں، تو اس کے ساتھ نشاط و تازگی پیدا کرنے کے لیے ہزل و ظرافت اور عجیب قسم کی چیزیں بھی بیان کرتے ہیں.... کم عقل لوگوں کے واقعات اس لیے بیان کریں گے کہ اس سے تمھارے دماغ کو سکون اور دل کو راحت میسر ہو، اگر تم علمی مذاق رکھتے ہو اور تمھیں غور و فکر، تحقیق و کاوش اور سنجیدہ باتوں ہی سے دلچسپی ہو جب بھی یہ چیز تمھارے لیے مضر نہ ہوگی، میں نے اس کتاب کے ابواب کو قسم قسم کے اشعار اور طرح طرح کی چیزوں سے اس لیے آراستہ کیا ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن ایک پہلو سے دوسرے پہلو کی طرف منتقل ہوتا رہے۔

کیونکہ دلکش نغموں، دلپذیر ترانوں اور عمدہ باجوں سے بھی جب ان کا سلسلہ دیر تک جاری رہتا ہے، طبیعت اکتا جاتی ہے، اسی طرح راحت و آرام کا سلسلہ جب طویل ہو جاتا ہے تو آدمی پر غفلت طاری ہو جاتی ہے، حضرت ابو درداؓ فرماتے ہیں کہ میں ہزل اور باطل سے بھی اپنا دل بہلا لیا کرتا ہوں تاکہ وہ حق سے بیزار نہ ہو جائے۔" (ج ۳ ص ۳۱)

جاحظ کے طرز تحریر کی خصوصیات بیان کرنے کے بعد اب اس کی کتاب سے کچھ اہم اور دلچسپ چیزیں نقل کی جاتی ہیں۔

جاحظ کی سب سے اہم اور مشہور کتاب البیان والتبیین ہے، اس میں اس نے بیان کی اہمیت بہت تفصیل سے اور نہایت دلچسپ انداز میں لکھی ہے۔ اس کے کچھ اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں۔

بیان کی تعریف | معنی مخفی کی کھلی دلالت کا نام بیان ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی تعریف اور اس کی جانب لوگوں کو توجہ دلائی ہے، اور اسی پر عرب کو فخر اور عجم کو ناز ہے، لفظ بیان ہر اس چیز کو شامل ہے جو معنی و مفہوم سے حجاب کو ہٹا کر مافی الضمیر کو واضح کر دے کہ سننے والے کو اس کی حقیقت اور مقصد کا علم ہو جائے، کہنے اور سننے والے کا اصل مقصد سمجھنا اور سمجھانا ہوتا ہے اس لیے جس طریقہ سے بھی تم اپنے مدعا کو سمجھا اور مفہوم کو واضح کر سکو وہی بیان ہے۔ (ج اص ۳۳ و ۳۴)

بیان کے لیے کیا کیا چیزیں ضروری ہیں | بیان کے لیے تمیز، مہارت، مناسب ترتیب، سلاست، وضاحت، الفاظ کی صحیح ادائیگی، اور وزن کی درستگی ضروری ہے، بات چیت میں ملاحت اور شیرینی اتنی ہی ضروری ہے جس قدر اس کی عظمت شان کا خیال ضروری ہے، کیونکہ دلوں کو مائل اور توجہ کو مبذول کرنے اور معنی و مطلب کو دلکش بنانے کا اہم ذریعہ یہی ہے۔ (ج اول ص ۷ و ۸)

بیان کی اہمیت | اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات میں یہ بات بھی گنائی ہے کہ اس نے انسان کو بیان کی تعلیم اور زبان کی صفائی و درستگی عطا کی ہے، قرآن مجید کے متعلق ارشاد ہے کہ وہ لوگوں کے لیے

بیان، وضاحت اور اپنے مطالب، مضامین کی بہترین تفصیل و توضیح، اور افہام و تفہیم اور اثر و نفوذ کا دلکش اسلوب اختیار کرتا ہے، اس کا نام قرآن اور عربی مبین ہے، قریش کے متعلق اپنے پیغمبر کو خبر دی کہ وہ مؤثر بات چیت کرتے ہیں، ان کی عقلیں صحیح اور فہم و شعور پختہ ہے، عربوں کے متعلق بتایا کہ ان میں ہوشیاری اور اصابت رائے اور ان کی زبانوں میں تاثیر ہے، اور وہ بحث و مباحثہ میں سخت جھگڑالو ہیں، اہل عرب کے کلام کے اثر و نفوذ کا یہ حال تھا کہ وہ لوگوں کو مسحور اور مبہوت کر دیتے اور اپنی موثر اور شیریں گفتگو سے ان کا دل موہ لیتے تھے۔۔۔۔۔ اہل عرب گفتگو، موانست اور خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آنے کو مہمان نوازی کا حق اور ضیافت کا کمال سمجھتے تھے، ان کا قول ہے کہ مہمان سے بشاشت کے ساتھ ملنا اور کھانے پر اس سے طویل گفتگو کرنا کمالِ ضیافت ہے، حاتم طائی کا شعر ہے:

سلی الجائع الغرثان یا ام منذر اذا ما اتانی بین ناری و مجزری

هل ابسط وجهی انه اول القری وابذل معروفی له دون منکری

(ترجمہ) ام منذر بھوکے اور پیاسے سے پوچھ لے جب وہ میرے چولہے اور مذبح کے پاس آتا ہے کہ میں اس سے خندہ پیشانی کے ساتھ جو مہمان نوازی کی اولین شرط ہے ملتا اور حسن سلوک کرتا ہوں،

دوسرا شاعر کہتا ہے:۔

لحافی لحاف الضیف والبیت بیته ولم یلهنی عنه غزال مقنع

احدثه ان الحدیث من القری وتعلم نفسی انه سوف یهجع

(ترجمہ) میرا لحاف مہمان کا لحاف اور میرا گھر اس کا گھر ہے۔ مجھے اس کی خدمت و ضیافت سے نقاب پوش محبوبہ بھی باز نہیں رکھ سکتی میں اس سے بات چیت کرتا ہوں کیونکہ یہ بھی مہمان نوازی ہے اور مجھے معلوم ہے کہ مہمان جلد ہی سو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے اپنے پیغمبروں کو ان کی قوم کی زبان سکھا کر ان ہی میں بھیجا

تاکہ وہ ہماری باتیں اچھی طرح ان کے سامنے بیان کر دیں،

حقیقت یہ ہے کہ تمام معاملات کا دارومدار بیان وتبیین اور افہام وتفہیم پر ہے، جو لوگ گفتگو کرنے میں عاجز اور اپنا مطلب بخوبی ظاہر کرنے سے قاصر ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو عورتوں اور بچوں کے مانند قرار دیا ہے جو اپنی بات واضح نہیں کر سکتے۔ (ج اول)

بیان اور گفتگو کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے اس نے گفتگو میں عجز کی مذمت کی ہے، اور بتایا ہے کہ علما کے نزدیک علم کی طرح بیان بصیرت و دیدہ وری اور جہالت کی طرح گفتگو میں عجز عدم بصیرت سے ہے اور پہلی چیز علم کا اور دوسری جہالت کا نتیجہ ہے (ج ۱ ص ۳۴)

البیان والتبیین کے خطبہ ہی میں اس موضوع کو نہایت دلچسپ انداز میں اس طرح شروع کیا ہے:

"اے اللہ ہم تجھ سے زبان درازی اور لغو بیانی سے اسی طرح پناہ مانگتے ہیں جس طرح گفتگو میں عجز اور مفہوم نہ واضح کر سکنے سے پناہ مانگتے ہیں، قدما نے بھی ان دونوں کے شر سے پناہ مانگی ہے اور اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا کی ہے کہ وہ انھیں اس سے محفوظ رکھے، نمر بن تولب کا شعر ہے:

اعذنی رب من حصر وعی ومن نفس اعالجها علاجا

(ترجمہ) پروردگار! مجھے گفتگو میں عاجز و درماندہ رہ جانے اور مریض نفس سے مامون رکھ

ایک اور شاعر کہتا ہے:۔

وما بی من عیی ولا انطق الخنا اذا جمع الاقوام فی الخطب محفل

(ترجمہ) جب لوگ کسی اہم معاملہ کے لیے اکٹھا ہوتے ہیں تو میں گفتگو کرنے میں عاجز نہیں رہتا اور نہ بیہودہ باتیں کرتا ہوں،

حضرت موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے فرعون کے پاس اپنی ہدایات اور پیغام پہنچانے کے لیے معجزات اور دلائل دیکر بھیجا تو انھوں نے اپنی لکنت کی شکایت کی اور دعا مانگی کہ اے اللہ اس کو دور کر دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ لیں، فرعون کے حیلوں حوالوں میں یہ بات خصوصیت کے ساتھ ذکر کی گئی ہے کہ اس نے کہا

کہ میں ایسے ذلیل شخص سے جو اپنی بات بھی واضح نہیں کر سکتا ہے، بہتر نہیں ہوں"۔ حضرت موسیٰؑ اپنے بھائی ہارونؑ کے متعلق کہتے ہیں کہ "وہ مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہیں، اس لیے انھیں میرا مددگار اور موید بنا کر بھیج کیونکہ میرا تو دم گھٹنے لگتا ہے اور میری زبان نہیں چلتی" اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کی دعا قبول کی، قد اوتیت سؤلک یاموسیٰ، (ج اول ص ۷ تا ۹)

گفتگو اور بیان کی اہمیت اور "عی" (حصر) کی مذمت کرتے ہوئے اس نے خاموشی کے مقابلہ میں گویائی کی ترجیح و برتری بیان کی ہے، پہلے اس نے ان معترضین کے جو گویائی پر خاموشی کو ترجیح دیتے ہیں، اعتراضات نقل کیے ہیں، اس کے بعد ان کی تردید اس طرح کی ہے "اس بارہ میں تمام روایتیں اور لوگوں کے اقوال و دلائل بیان کر دیے گئے لیکن اس کے باوجود ہمارا مشورہ یہی ہے کہ اگر تم کو بیان و تبیین سے مناسبت اور دلچسپی اور اپنی بلاغت و خطابت کی تاثیر اور استدلال کا احساس ہے تو اس کی تلاش و جستجو اور خوب سے خوب تر کی تلاش سے باز نہ آؤ اور اس سے ایسی بے توجہی نہ اختیار کرو کہ تمھاری فطری استعداد و صلاحیت ہی مفقود ہو جائے، محض جاہلوں کے بہکانے اور بزدلوں کے خوف دلانے سے اسے ہرگز ترک نہ کرو اور نہ ان روایتوں پر جن کا مقصد و منشا کچھ اور ہے یا گھڑی ہوئی ہیں، اعتماد کرو، ان غلط خبروں اور جھوٹی روایتوں کو تم کس طرح تسلیم کر سکتے ہو، جبکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کو فصل خطاب (دوٹوک بات کرنا) سے نوازا، حضرت سلیمانؑ کو چڑیوں، چیونٹیوں اور جنوں کی زبان سکھائی، اور حضرت شعیبؑ کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ وہ خطیب الانبیاء تھے، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات محفوظ و مدون ہو چکے ہیں جو اپنی بلاغت و تاثیر کے لیے مشہور ہیں، آپ کے خلفاء کے خطبات بھی مرتب اور مدون کیے جا چکے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاعر اور خطیب آپ کے حکم سے آپ کی اور آپ کے اصحاب کی مدافعت کرتے تھے، ثابت بن قیس بن شماس انصاری آپ کے خطیب تھے۔

البتہ طول کلام، تکلف، لغو، بیہودہ اور بلا ضرورت باتوں کے متعلق جو ممانعت ہے وہ درست ہے،
مقصد انسان کو غلو اور تکلف سے بچانا ہے، باقی ماہرین کلام اور اہل بیان جن میں بیان و گویائی کی
ستعداد ہوتی ہے اور جو اس کو اصلاح ذات البین، فتنہ اور لڑائیوں کے انسداد، وعظ و ارشاد
اح اور اسی طرح کے دوسرے مفید اور ضروری امور کے لیے کام میں لاتے ہیں، ان کی باتوں کو کسی
یفی، بیہودہ اور ریا، و نمائش قرار نہیں دیا جا سکتا، اگر اس خیال کو صحیح مان لیا جائے تو صحابہ میں
علیؓ اور ابن عباسؓ اور تابعین میں حسن بصریؒ سے زیادہ کس پر یاوہ گوئی کا الزام عائد ہو سکتا ہے،
مسیبؒ سے کہا گیا کہ بعض صوفی اور زاہد شعر گوئی کو ناپسند کرتے ہیں، انھوں نے فرمایا کہ ان کا زہد
عجمیت زدہ ہے، یہ بات کسی طرح باور نہیں کیجا سکتی کہ قرآن مجید تو بیان و گویائی کی ترغیب
دے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گفتگو میں عجز کی فضیلت بیان فرمائیں، اس سلسلہ میں ایک
ت نظر انداز کر دی گئی ہے، اور وہ یہ کہ نہی کا اطلاق اس چیز پر کیا جاتا ہے جو حد اعتدال
ہ یا مقدار سے کم ہو، پس عی (کلام میں عجز) اور خطل (لغو اور یاوہ گوئی) دونوں مذموم
، اللہ تعالیٰ کا دین افراط و تفریط اور غلو و تقصیر کے درمیان ہے، مگر لوگوں نے ضعیف
، روایتیں نقل کر کے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا ہے، احنف سے ایک شخص نے حیا کی
ی، تو انھوں نے کہا کہ کبھی کبھی وہ انسانی کمزوری کا سبب بھی ہوا کرتی ہے، حالانکہ
سبب نہیں ہوتا، البتہ حیا کی ایک حد ہے، جب وہ اس حد سے متجاوز ہو جائے تو حیا،
یاتی، اسی طرح سخاوت کی ایک حد ہے، جو اس سے متجاوز ہو جانے کے بعد اسراف میں تبدیل
ہے حزم و احتیاط جب حد سے بڑھ جاتے ہیں تو بزدلی کہلاتی ہے، اقتصاد و میانہ روی اپنی
ے آگے بڑھ جائیں تو بخل کہلاتی ہیں، اسی طرح شجاعت حد سے متجاوز ہونے کے بعد تہور

دیا ان روایتوں کا سند جو اس سلسلہ میں بیان کیجاتی ہیں تو ان میں سے اکثر کی سندیں متصل نہیں اور بعض مطلق ہیں، جن کو مدح یا ذم کسی پر بھی محمول نہیں کر سکتے۔ خاموش رہنے کی تاکید صرف اس لیے کی گئی ہے کہ بات کرنے میں عموماً لوگوں سے غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں اور خاموشی میں اس کا احتمال نہیں ہوتا، ورنہ صحیح بات کہنے سے بھی خاموش رہنا باطل اور لغو کہنے کے ہم معنی ہے، خاموشی کی جو اہمیت ہے اس کی ایک حد ہے، اسی طرح گفتگو اور بات چیت کی اہمیت بھی ایک حد رکھتی ہے، لیکن اگر دونوں کا مقابلہ کیا جائے تو عموماً اور زیادہ تر نطق و گویائی کی اہمیت اور فضیلت ہی ظاہر ہوگی،

بات چیت کرنے کے لیے انسان قدرۃً بھی مجبور ہے، کیونکہ قول و عمل کی ضرورت ترکِ عمل اور سکوت سے کہیں زیادہ ہے، خاموشی کو آخر کس طرح مفید اور نفع بخش کہا جا سکتا ہے جبکہ اس کا فائدہ ایک شخص تک محدود ہوتا ہے، اور گویائی کا فائدہ خاص بھی ہے اور عام بھی، جن لوگوں نے خاموشی کی فضیلت کی روایتیں بیان کی ہیں، انھوں نے بھی تو لوگوں کی بات چیت ہی نقل کی ہے، نہ کہ خاموشی اختیار کرنے والوں کی خاموشی، اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام کو کلام اور گویائی دے کر بھیجا ہے، خاموشی دے کر نہیں بھیجا ہے، حقیقت یہ ہے کہ خاموشی جن موقعوں پر پسندیدہ ہے وہ بہت کم ہیں، اور بات چیت عموماً اور اکثر مواقع پر پسندیدہ ہے، طویل خاموشی سے آدمی کی بیان و وضاحت کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے، اور اس کا ذہن بلید، جذبات مردہ اور احساسات فنا ہو جاتے ہیں، اہل عرب اپنے بچوں کو اشعار سکھاتے، اقوال نقل کرنے کا طریقہ بتاتے اور بلند آواز سے بات چیت کرنے اور الفاظ و حرکات کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنے کی تعلیم دیتے تھے، تاکہ مخارج درست اور زبان کھل جائے، اور یہ ظاہر ہے کہ زبان کو جب زیادہ حرکت دیجائیگی تو وہ نرم اور باریک ہو جائے گی، لیکن اگر اسے حرکت نہ دیجائے اور اکثر خاموشی ہی اختیار کیجائے

تو وہ سخت ہو جائے گی، اور یہ زبان ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر عضو کا یہی حال ہوتا ہے جس عضو کو عمل اور حرکت سے باز رکھا جائے گا اس میں اضمحلال اور افسردگی پیدا ہو جائیگی، عبایہ جعفی کہتے تھے کہ اگر بری اور غلط عادت پیدا ہونے کا احتمال نہ ہوتا تو میں اپنے بچوں کو بات چیت میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے کی تاکید کرتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نابغہ جعدی کے متعلق فرمایا "اللہ تعالیٰ تمھارے دانت نہ توڑے" اور کعب بن مالک سے فرمایا، "اللہ تمھاری بات نہ بھولے گا" اور حضرت حسانؓ کو حکم دیا کہ وہ بنو عبد مناف کے مقابلہ میں فخر کرنے والوں کی ہجو کریں، کیونکہ ان کے شعروں کا زخم تلواروں کے زخم سے زیادہ کاری ہوتا تھا،

ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان واتی کے اظہار تکلف، ریا، و نمایش، بلاضرورت بحث و مباحثہ، لغو بیانی، ایک دوسرے پر رشک و حسد کرنے اور تعریف و تنقیص میں غلو کرنے سے تو ضرور منع فرمایا ہے، لیکن جہاں تک نفس بیان کا تعلق ہے، اس سے آپ کیوں منع فرماتے جبکہ سب سے زیادہ واضح خود خدا کا کلام ہے، اور اس نے تفصیل و تبیین کو سراہا ہے۔ (ج اول ص ۱۰۷ تا ۱۰۸)

یہ بحث اگرچہ طویل ہوتی جا رہی ہے لیکن جاحظ نے اس پر ایک مستقل رسالہ تحریر کیا ہے، جس میں نطق و گویائی کی اہمیت سے متعلق بہت مفید معلومات اور بڑی جدت و نکتہ آفرینی کی ہے، اس لیے اس کا کچھ حصہ نقل کیے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا، اس میں وہ لکھتا ہے:-

"تم خدا کا شکر ادا کرنے کے لیے بات چیت کے محتاج ہو، اسی طرح اپنی ضرورتیں بیان کرنے اور اپنا منشا ظاہر کرنے کے لیے بھی تم زبان کو حرکت دینے کے لیے مجبور ہو، خاموشی کے تم جو فضائل

لہ غالباً ان دونوں کی شیریں بیانی دیکھ کر آپ نے ایسا فرمایا ہوگا،

بیان کرتے ہو اس کے لیے بھی تم کو کلام ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے اگر خاموشی ہی بہتر تھی تو انسان کو حیوانوں پر فضیلت نہ ہوتی اور نہ اس میں اور شجر و حجر اور مٹی اور پتھر کی مورتوں میں کوئی فرق ہوتا،

کبھی کبھی ایک بات اور ایک فقرہ نجات و فلاح کا سبب بنتا ہے اور قوم کی اسیری کے بندھنوں کو توڑ دیتا ہے، حضرت ابراہیمؑ نے جب بابل کے لوگوں کے بت توڑ دیے تو انھوں نے پوچھا کیا تمھیں نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے؟ حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا کہ یہ اس بڑے بت کا کام ہے۔ اگر بت بول سکتے ہوں تو ان سے پوچھ لو۔ غور کرو حضرت ابراہیمؑ کی یہ بات کس قدر کارگر ہوئی، اور کتنی آسانی کے ساتھ انھیں دشمنوں سے نجات مل گئی،

بات چیت سے آدمی کے فضل و کمال اور لیاقت و قابلیت کا اظہار ہوتا ہے، حضرت یوسفؑ کی بات چیت ہی سے عزیز مصر کے یہاں ان کو باریابی حاصل ہوئی، اگر وہ خاموش رہتے اور اپنی گفتگو سے اپنی صلاحیت اور طبعی شرافت و پاکیزہ طبیعت اور اچھے اخلاق و کردار کا اظہار نہ فرماتے تو عزیز مصر کی نظر میں ان کی کیا اہمیت ہو سکتی تھی،

گفتگو اور بیان کی اہمیت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح اور تہلیل اور دین و ایمان پر قائم رہنے اور ان سے آگاہ ہونے کا یہی ذریعہ ہے، اور کسی شخص کا ایمان بغیر لسانی اقرار کے معتبر نہیں ہوتا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین سے جہاد اس وقت تک کرتے رہتے تھے، جب تک وہ اپنی زبان سے لا الٰہ الا اللہ کا اقرار نہ کر لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے زبان و بیان ہی کے ذریعہ انسان کو عزت و تکریم بخشی ہے، کلام و گفتگو ہی کی بدولت انسان شکر بجا لاتا ہے اور اس طرح مزید انعامات کا مستحق ہوتا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ اگر کوئی شخص اللہ کا ذکر کرے اور دوسرا اسے سنے تو ذکر کرنے والے کو دس اور سننے والے کو ایک ثواب ملتا ہے، اور اس کی وجہ

یہ ہے کہ ذکر کرنے والا اپنی قوت گویائی سے کام لیتا ہے، اہل عرب کے فضائل اور خصوصیات میں ان کی فصاحت اور حسن کلام بھی ہے، اور اسی لیے افضل الانبیاء ان ہی کے اندر مبعوث ہوئے اور ان کی زبان عربی بنائی گئی اور انھیں عربی قرآن بھی دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے نبوت و رسالت کا منصب جلیل جن لوگوں کو عطا کیا وہ سب کلام و بیان میں ممتاز تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی سارے عرب میں اپنی فصاحت و بلاغت اور حسن بیان کے لیے مشہور تھے، آپ نے خود فرمایا انا افصح العرب۔

اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو مبشر، منذر اور مبلغ بنا کر بھیجا ہے، تاکہ وہ اپنے کلام و بیان اور تبلیغ و دعوت کے ذریعہ اتمام حجت کر دیں، کیا خاموشی سے بھی اتمام حجت ممکن تھا۔"

(مجموعہ رسائل ص ۱۴۰ تا ۱۴۵)

(باقی)

تبع تابعین

جلد اول

علم و عمل اور مذہب و اخلاق میں جس طرح صحابہ کرام کے جانشین اور تربیت یافتہ تابعین عظام تھے اور صحابہ کرام کے بعد انہی کی زندگیاں ملت اسلامیہ کے لیے نمونۂ عمل ہیں، بالکل اسی طرح تابعین کرام کے جانشین اور ان کے فیض یافتہ تبع تابعین تھے، اس کے دو حصے ہیں، پہلے حصہ میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر تلامذہ اور انکے فقہی مسلک کے علمبردار امام ابو یوسف، امام شیبانی، امام زفر کے علاوہ امام اوزاعی، ابن جریج، یحیٰی بن آدم فضیل بن عیاض وغیرہ کے سوانح اور انکے علمی، مذہبی، اخلاقی کارناموں اور مجتہدات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

(مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی) ضخامت صفحے قیمت

منیجر

عرب میں آباد ہندوستانیوں کو دعوت اسلام

از جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

(۲)

نجران میں دعوت اسلام اور وہاں کے ہندستانی

یمن کے مشہور علاقہ نجران میں بھی ہندوستانی موجود تھے، چنانچہ سنہ نبوت میں جب نجران سے بنی حارث بن کعب کا وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے ان کو دیکھتے ہی ان پر ہندوستانی ہونے کا شبہ ظاہر فرمایا اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ:-

من ھٰؤلاء القوم الذی کانھم رجال الھند[1] — یہ کون لوگ ہیں جو ہندوستانی آدمی معلوم ہوتے ہیں۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اطراف وجوانب کے امراء وحکام کو دعوت اسلام کے خطوط روانہ فرمائے تو نجران کے عام باشندوں کے نام بھی ایک دعوت نامہ روانہ فرمایا، امام طبری لکھتے ہیں:-

وکتب النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی اھل نجران الی عربھم وساکنی الارض من غیر العرب — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کے عربوں اور وہاں آباد غیر عرب باشندوں کے پاس خط لکھا، اس پر وہ لوگ اسلام

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۵۹۳ و تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۵۶

فثبتوا فتنفروا وانضموا الی مکان[1] واحد[1] | برقائم رہتے ہوئے اپنی جمعیت لیکر ایک مقام پر رہنے لگے،

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیر عرب باشندگان نجران میں وہاں کے ایرانیوں کی طرح ہندوستان اور سندھ کے باشندے بھی داخل رہے ہوں گے، جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اسلام پر لبیک کہا اور اپنی ایک الگ بستی بنالی تھی،

بحرین اور عمان وغیرہ میں دعوت اسلام اور وہاں کے ہندوستانی | گذشتہ تصریحات سے معلوم ہو چکا ہے کہ عراق کے شہر ابلہ سے لیکر خلیج عربی کے پورے قطوف وسواحل اور سیف میں ہندوستانیوں کی مختلف جماعتیں مختلف ناموں سے پھیلی ہوئی تھیں، اور بحرین وعمان کے تمام علاقے ان سے آباد تھے، جن میں خط، قطیف، آرہ، ہجر، بینونہ، زارہ، جواثا، سابور، دارین، غابہ اور دبا وغیرہ شامل تھے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حیاتِ طیبہ کے آخری حصہ میں عرب کے ان سواحل اور ان کے اطراف کے عوام وخواص کو اسلام کی دعوت کے خطوط روانہ فرمائے، جن میں یہاں کے عربوں کی طرح یہاں کے ہندوستانی باشندے بھی مخاطب تھے،

عمان میں نامۂ مبارک کے جانے کا حال حافظ ابن عبد البر نے استیعاب میں اور حافظ ابن حجر نے اصابہ میں حضرت ابوشداد زماری عمانی رضی اللہ عنہ کے حالات میں ان کی زبانی اس طرح نقل کیا ہے کہ ہمارے پاس عمان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا والا نامہ آیا تو کوئی ایسا آدمی نہ ملا جو اسے پڑھ کر سنا سکے، ہم نے ایک لڑکے کو بلا کر اسے سنا، راوی کا بیان ہے کہ میں نے حضرت ابوشداد سے دریافت کیا کہ اس وقت عمان پر کون حاکم تھا، تو انھوں نے بتایا کہ:۔

---

[1] تاریخ طبری ج ۳ ص ۲۱۱

اسوار من اساورۃ کسریٰ[1] — کسریٰ کے اساورہ میں ایک اسوار حکمران تھا۔

ظاہر ہے کہ عمان کے ایرانی حاکم اسوار کے معین و مددگار دوسرے اساورہ بھی وہاں تھے۔ جیسا کہ عرب کے ایرانی مقبوضات میں ایرانیوں کی حکومت کا طریقہ تھا، معلوم ہو چکا ہے کہ ایران کے اساورہ میں ہندوستان کے جاٹ اور سیابجہ وغیرہ شامل تھے، اس لیے عمان کے یہ جاٹ وغیرہ بھی اس نامۂ مبارک کے مخاطب رہے ہوں گے۔

بحرین کے مشہور مرکزی مقام ہجر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور سے کسریٰ کے خدام و متوسلین کو دعوت اسلام دی اور اس کے لیے مستقل آدمی یا خط بھیجا۔ علامہ بلاذری لکھتے ہیں:۔

بعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجر میں
الی وضائع کسریٰ بھجر فلم یسلموا	کسریٰ کے یرغمالوں کے پاس اسلام کی
فوضع علیھم الجزیۃ دینارًا	دعوت بھیجی، اور جب وہ اسلام نہیں لائے
علی کل رجل منھم[2]	تو ان کے ہر مرد پر ایک دینار سالانہ جزیہ مقرر کر دیا

"وضائع کسریٰ" کون لوگ تھے؟ اور عرب میں ان کی کیا حیثیت تھی؟ اس کے متعلق لسان العرب کا بیان ہے:۔

والوضیعۃ قوم من الجند یوضعون	وضیعہ وہ سپاہی ہیں جو ضلع میں رکھے جاتے
فی کورۃ لا یغزون منھا والوضائع	ہیں اور اس سے باہر جنگ نہیں کرتے اور
والوضیعۃ قوم کان کسریٰ ینقلھم	وضائع ایک جماعت تھی جسے کسریٰ اس کے
من ارضھم فیسکنھم ارضًا اخریٰ	وطن سے منتقل کر کے دوسری جگہ آباد کرتا تھا۔

---

[1] الاستیعاب برحاشیہ اصابہ ج ۴ ص ۱۰۷، و اصابہ ج ۴ ص ۱۰۵ [2] فتوح البلدان ص ۹۲

حتی یصیروا بہا وضیعۃ ابداً	جہاں وہ ہمیشہ اس خدمت کے لیے مقیم
وھم الشحن والمسالح قال الازہری	رہتے، وہ فوج اور سپاہی کا کام دیتے تھے
والوضیعۃ الوضائع الذین	ازہری کا قول ہو کہ وضیعہ وہ لوگ ہیں جنکو
وضعھم کسریٰ فہم شبہ	کسریٰ نے قائم کیا تھا وہ یرغمال کے شائع
الرھائن کان یرتھنھم وینزلھم	تھے جن کو وہ اپنے بعض علاقوں میں
بعض بلادہ[1]	آباد کرتا رہتا تھا۔

وضیعہ اور وضائع کے اس مفہوم میں اگرچہ بظاہر کسریٰ کے نوکر چاکر اور بیکار قسم کے سپاہی شامل ہیں، مگر ان میں ہندوستان کے جاٹوں اور دوسری جماعتوں کا موجود ہونا بھی قرین قیاس ہے، اس لیے وہ بھی دعوت اسلام کے مخاطب رہے ہوں گے

اسی طرح ہجر اور اس کے اطراف کے شہر قطیف اور خط، دارین وغیرہ ہیں ان میں عہد رسالت میں جاٹ اور سیابجہ کی اچھی خاصی آبادی تھی، اور آپ کی وفات کے بعد جب ان اطراف میں ارتداد کی وبا پھوٹی تو حطم بن ضبیعہ مرتدین سے الگ بچے کچھے کفار کی جماعت کو لیکر اور یہاں کے زط اور سیابجہ کو ساتھ ملا کر مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہوا

حتی نزل القطیف وھجر واستغوی	حطم نے قطیف اور ہجر میں آکر مقام خط
الخط ومن فیہا من الزط والسیابجۃ	کے باشندوں کو گمراہ کیا، نیز یہاں کے جاٹ
وبعث الی دارین[2]	اور سیابجہ کو بہکا کر دارین کی طرف بھیجا،

اس سے ظاہر ہے کہ خط کے پورے علاقے کے وہ ہندوستانی بھی مکتوب نبوی کے مخاطب تھے، جنھوں نے حطم بن ضبیعہ کے ساتھ مل کر مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔

---

[1] لسان العرب ج ۸ ص ۳۹۹ [2] تاریخ طبری ج ۳ ص ۲۵۵، ۲۵۶

بحرین پر عہد رسالت میں فارس کی حکومت اور اس کے اطراف وجوانب میں عجمیوں اور ایرانیوں کی بستیاں تھیں، عرب قبائل میں عبدالقیس، بکر بن وائل اور بنو تمیم بدوی زندگی بسر کرتے تھے، چونکہ وہاں ان ہی عربوں کی کثرت تھی، اس لیے ایرانیوں کی طرف سے وہاں کے حکمران عرب ہی مقرر کیے جاتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہاں کے عرب حاکم حضرت منذر بن ساوی رضی اللہ عنہ تھے،

اسی طرح بحرین کا مرکزی شہر ہجر اس وقت بہت آباد تھا، جہاں عربوں کے علاوہ اہل عجم میں سے یہود، نصاریٰ اور مجوس کی بڑی تعداد آباد تھی، عہد رسالت میں یہاں شاہ ایران کی طرف سے حضرت سیبخت مرزبان تھے، ہجر کے باشندوں کے لیے تاریخ میں اہل فرس، اہل عجم اور اہل ارض وغیرہ کے الفاظ آتے ہیں، جن میں مجوس، یہود اور نصاریٰ سب شامل ہیں اور ان ہی میں ہندوستان کے زط، سیابجہ اور اساورہ بھی تھے، جن پر مجوس کا اطلاق ہوتا تھا، کیونکہ عرب میں ہندوستانی باشندوں کو مجوس میں شمار کیا جاتا ہے، اس لیے ان کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی معاملہ کیا ہوگا جو عام مجوس ہجر وغیرہ کے ساتھ فرمایا۔

بلاذریؒ نے فتوح البلدان میں لکھا ہے کہ ۸ھ نبوی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علاء بن عبد اللہ بن عماد حضرمی رضی اللہ عنہ کو بحرین اور اہل ہجر میں اسلام کا داعی بنا کر روانہ فرمایا اور ان کے ذریعہ منذر بن ساوی حاکم بحرین اور سیبخت مرزبان ہجر کو خطوط روانہ کیے جن میں اسلام کی دعوت تھی، اس دعوت پر

فاسلما واسلم معهما جميع	یہ دونوں حاکم اسلام لائے اور انکے ساتھ
العرب هناك وبعض العجم	وہاں کے تمام عرب باشندے اور کچھ عجمی اسلام لائے،
فاما اهل الارض من المجوس	مگر وہاں کے آباد مجوس، یہود اور نصاریٰ

واليهود والنصارى فانهم	نے اسلام نہیں قبول کیا اور حضرت
صالحوا العلاء	علاؓ سے صلح کر لی۔

حضرت علاء حضرمیؓ نے بحرین کے ان غیر مسلموں کے لیے یہ صلح نامہ تحریر فرمایا

بسم الله الرحمن الرحيم	بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اس صلح نامہ کے
هذا ما صالح عليه العلاء	مطابق علاء حضرمی نے اہل بحرین سے
الحضرمي أهل البحرين، صالحهم	صلح کی اور یہ شرط قرار پائی کہ وہ کھجور کے
على ان يكفونا العمل ويقاسمونا	باغات میں خود کام کریں گے اور کھجور میں
الثمر فمن لم يف بهذا فعليه	ہمارا حصہ بھی لگائیں گے جو اس شرط کو
لعنة الله والملائكة والناس	پورا نہیں کرے گا اس پر اللہ کی، فرشتوں
اجمعين	کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہو،
واما جزية الرؤوس فانه	اور جزیہ کا حساب یہ ہے کہ ہر بالغ مرد سے
اخذ بها من كل حالم دينارا	ایک دینار لیا جائے گا۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحرین کے مسلمانوں کے نام یہ مکتوب روانہ فرمایا:

اما بعد: فانكم اذا اقمتم الصلوة	حمد و صلوٰۃ کے بعد اگر تم لوگ نماز قائم کرو گے
وآتيتم الزكوة، ونصحتم لله	اور زکوٰۃ ادا کرو گے اور اللہ و رسول کی
ورسوله وآتيتم عشر النخل	خیر خواہی کرو گے اور کھجوروں کا عشر اور غلہ
ونصف عشر الحب ولم تمجسوا	کا نصف عشر دو گے (اور) اپنی اولاد کو مجوسی
اولادكم فلكم ما اسلمتم	نہیں بناؤ گے تو جس حالت میں مسلمان
عليه غير ان بيت النار	ہوئے ہو اسکے تمام حقوق تم کو حاصل رہیں گے،

لله ورسوله وان ابيتم	البتہ آشتی ہے اللہ و رسول کے تعرف میں ہو
فعليكم الجزية[1]	اور اگر تم ان شرائط کا انکار کروگے تو پھر تم پر جزیہ لازم ہوگا

اس طرح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بحرین میں جنگ و قتال کی نوبت نہیں آئی، بلکہ بہت سے باشندوں نے جن میں عربی قبائل زیادہ تھے، برضا و رغبت اسلام قبول کرلیا، اور کچھ لوگوں نے جن میں زیادہ تر عجم کے مجوسی اور کچھ یہودی تھے، اسلام قبول کرنے کے بجائے حضرت علاء حضرمیؓ سے غلہ اور کھجور کی نصف پیداوار کی تقسیم پر صلح کرلی،

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علاء حضرمیؓ کو بحرین اور ہجر میں ۸ھ نبوی میں روانہ فرمایا تھا، جب آپ نے اطراف و جوانب کے بادشاہوں اور حکمرانوں کے نام اسلام کے دعوت نامے روانہ فرمائے تھے

مقام ہجر کا معاملہ بحرین سے کچھ مختلف رہا، یہاں مجوسیوں کی آبادی زیادہ تھی، جب یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اسلام کی دعوت آئی تو یہاں کے عربوں نے بھی عام طور سے اسلام قبول کرلیا، مگر مجوسیوں اور یہودیوں نے یہاں بھی اسلام کے مقابلہ میں جزیہ دینا قبول کرلیا۔

ودعا اهل هجر فكانوا بين	اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل ہجر
راض وكاره اما العرب	کو اسلام کی دعوت دی جسے کچھ لوگوں نے پسند کیا
فاسلموا، واما المجوس واليهود	اور کچھ نے پسند نہیں کیا، عرب تو مسلمان ہوگئے
فرضوا بالجزية فاخذت	مگر مجوس اور یہود جزیہ ادا کرنے پر راضی ہوگئے
منهم[2]	اور ان سے جزیہ وصول کیا گیا

---

[1] فتوح البلدان ص ۹۰ [2] ایضاً ص ۹۱

بحرین اور ہجر سے جزیہ کی جو پہلی قسط آپ کی خدمت میں آئی تھی اس کی تعداد اسّی ہزار تھی، آپ کی زندگی میں باہر سے اتنی کثیر آمدنی نہ اس سے پہلے ہوئی نہ اس کے بعد۔

عرب میں آباد ہندوؤں کے ساتھ مجوس اور صابئہ جیسا معاملہ کیا گیا | یہ معلوم ہو چکا ہے کہ عرب میں ہندوستان کے بت پرست مجوس اور صابئہ کے زمرے میں یعنی مشابہ اہل کتاب شمار ہوتے تھے۔

اس بنا پر ان میں سے جو لوگ اسلام لائے ان کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے جیسا معاملہ فرمایا اور جو اپنے مذہب پر قائم رہے ان کے ساتھ صابئہ اور مجوس کا معاملہ کیا گیا اور صابئہ کو مجوس میں شمار کر کے مشرکین عرب، اہل کتاب یہود و نصاریٰ اور مجوس کے الگ الگ احکام جاری کیے گئے، چنانچہ مجوس ہجر کو جن میں صابئہ بھی داخل ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مکتوب لکھا جس کا متن یہ ہے:-

كتب رسول الله صلى الله عليه وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجر کے مجوسیوں
الى مجوس هجر يدعوهم	کے نام خط لکھا جس میں آپ نے ان کو اسلام
الى الاسلام فان اسلموا	کی دعوت دی کہ اگر وہ مسلمان ہو جائیں
فلهم مالنا وعليهم ما علينا	تو ان کے وہی حقوق ہیں جو ہمارے ہیں
ومن ابى فعليه الجزية	اور ان پر وہی ذمہ داری ہے جو ہم پر ہے
فى غير اكل لذبائحهم ولا	اور جو اسلام سے انکار کرے اس پر جزیہ ہوگا
نكاح لنسائهم	نہ ان کا ذبیحہ کھایا جائیگا اور نہ ان کی عورتوں
(فتوح البلدان ص ۹۱)	سے نکاح کیا جائیگا۔

اس دعوت پر ہجر کے عرب قبائل اسلام لائے اور یہود اور مجوس نے اپنے مذہب پر رہ کر جزیہ دینا منظور کیا،

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدینؓ کے زمانہ میں بھی صائبہ کو مجوس میں شامل کرکے ان سے بھی جزیہ وصول کیا گیا، امام حسن بصری اور امام حکم بن عتبہ کی تحقیق یہی ہے کہ صائبہ مجوس کے درجہ میں ہیں، امام مجاہد بھی یہی کہتے ہیں کہ فرقہ صائبہ مشرکین کی ایک شاخ ہے جو یہود ونصاریٰ کے بین بین ہے، اور اس کے پاس کتاب نہیں ہے، امام اوزاعی کا قول ہے:۔

کل دین بعد الاسلام سوی	اسلام کے بعد یہودیت اور نصرانیت
الیھودیۃ والنصرانیۃ فھم	کے علاوہ جتنے ادیان ہیں سب
مجوس[1]	مجوسیت ہیں،

ان اقوال وتصریحات کا مطلب یہ ہے کہ مجوس، عرب کے یہود ونصاریٰ اور مشرکین سے الگ ایک مستقل فرقہ ہے، جس میں فرقہ صائبہ بھی شامل ہے اور اسلام اور یہودیت ونصرانیت کے بعد دوسرے تمام اہل مذاہب پر مجوس کا اطلاق ہوتا ہے، اور ان سے اسلام نہ قبول کرنے کی صورت میں جزیہ لیا جاتا ہے، چاہے وہ مشرک وبت پرست ہوں یا آتش پرست اور کواکب پرست ہوں، نہ ان کا ذبیحہ کھایا جا سکتا ہے اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح کیا جا سکتا ہے، اور اہل کتاب یعنی یہود ونصاریٰ کے ساتھ یہ دونوں باتیں جائز ہیں، اور یہی حکم ان ہندوؤں پر بھی جاری ہوا جو بحرین، عمان اور ہجر وغیرہ میں تھے اور ایمان نہیں لائے تھے، ان کو مجوس اور صائبہ میں شمار کرکے ان سے بھی جزیہ وصول کیا گیا، اور ان کا ذبیحہ اور ان کی عورتوں سے نکاح ناجائز قرار پایا،

عرب کے ہندو، مجوس اور صائبہ میں شمار کیے جاتے تھے، جیسا کہ شہرستانی نے لکھا ہے:۔

ومنھم من یمیل الی مذاھب الثنویۃ	ہندوؤں میں سے کچھ مذہب ثنویہ کی طرف مائل تھے،

---

[1] کتاب الاموال ص ۳۳ و ۵۴۹

دوسری جگہ لکھا ہے :۔

ثم التنویۃ اختصت بالمجوس[1]	ثنویت مجوسیوں کے ساتھ خاص ہے،

ایک اور جگہ لکھتے ہیں :۔

واکثرھم علی مذھب الصائبۃ[2]	ہندوستان کے اکثر باشندے صائبہ کے مذہب پر ہیں۔

ابن صاعد اندلسی نے طبقات الامم میں بھی عام ہندوستانیوں کو صائبہ ہی بتایا ہے :

واما الصائبۃ وھم جمھور الھند ومعظمھا[3]	ہندوستان کے جمہور اور بڑی آبادی صائبہ ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے عرب وہند کے تعلقات میں بڑی تفصیل سے اس مسئلہ پر بحث کی ہے اور واقعات و دلائل سے دکھایا ہے کہ ہندوستان کے ہندوؤں کے ساتھ بھی عربوں نے مجوس و صائبہ یعنی شبہ اہل کتاب کا معاملہ کیا، چنانچہ سندھ کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نے یہاں کے ہندوؤں کو شبہ اہل کتاب قرار دیا، اور ان کو وہی حقوق دیے جو عراق و شام کے یہودیوں، عیسائیوں اور پارسیوں کو حاصل تھے، اور ان کے بتخانوں کو ان کی عبادت گاہوں کے مثل قرار دیا، صرف ان کے ہاتھ کا ذبیحہ اور ان کی عورتوں سے نکاح اس سے مستثنیٰ تھا، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو" عرب وہند کے تعلقات باب مذہبی تعلقات،

---

[1] الملل والنحل شہرستانی ج ۲ ص ۱۱۵ [2] ایضاً [3] طبقات الامم ص ۱۵

حجر رشید

ترجمہ ڈاکٹر عبدالجلیل صاحب ڈی، ایم، آر، ڈی انگلینڈ

یہ مضمون بہت خشک ہے، عام ناظرین کو شاید اس سے دلچسپی نہ ہو لیکن جن لوگوں کو قدیم کتبات اور ان کے حل سے ذوق ہے وہ اس کو دلچسپی سے پڑھیں گے۔ ہمارے ایک پرانے رفیق مولانا ابوالجلال صاحب ندوی کو اس کا بڑا ذوق تھا، وہ کبھی کبھی اس قسم کے مضامین لکھا کرتے تھے۔ ان کے بعد پھر اس کی نوبت نہیں آئی۔ (م)

مصری ہیروغلفی تحریریں ہر سمت سے لکھی جا سکتی تھیں، مگر عام طور پر اردو کی طرح دائیں سے بائیں جانب لکھی ہوئی ملتی ہیں، لیکن یورپین مترجمین نے بائیں سے دائیں جانب لکھنے کا طریقہ استعمال کیا ہے، چونکہ ترجمہ انگریزی سے کیا گیا ہے، اس لیے میں نے حروف کی ترتیب انگریزی کی طرح رکھی ہے۔ مثلاً لفظ (قلیوپاطرا) اس طرح لکھا گیا ہے:۔

" ا ر ط 9 پ و ی ل ق "

میں برٹش میوزیم لندن کے ٹرسٹیز کا مشکور ہوں جنھوں نے مجھے اس اہم تاریخی کتابچہ کے ترجمہ کی اجازت دی۔ 'مترجم'

کتبہ کا انکشاف | عجائب خانۂ برطانیہ کا ایک حصہ مصری بتوں کی گیلری کے لیے وقف ہے، اس گیلری کے جنوبی حصہ میں کالی چینی کی شہرۂ آفاق سل نمایاں نظر آتی ہے، یہ سل جو ساری دنیا میں، ایک صدی سے زیادہ سے سنگ رشید کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ جولائی ۱۷۹۹ء

میں دریائے نیل کے دہانے پر ملی تھی، اس دہانے کا ڈراباز و مغربی ڈیلٹے سے بہہ کر سمندر سے
جا ملتا ہے، یہاں ایک شہر "رشید" آباد ہے، اس کے قریب ہی یہ سل دریافت ہوئی
تھی، یورپین اقوام اس مقام کو Rosetta کہتی ہیں،

ایک روایت کے مطابق یہ سل زمین پر پڑی ہوئی ملی تھی، اور دوسرے کے مطابق
ایک پرانی دیوار میں چنی ہوئی تھی، اس زمانے میں اس علاقہ میں فورٹ جولین[1] کی تعمیر کی
تیاریاں ہو رہی تھیں، اور ایک نئے قلعہ کی بنیاد رکھی جانے والی تھی، اسی سلسلہ میں
فرانسیسی سو لجروں کو اس دیوار کے گرانے کا حکم دیا گیا تھا، انجینیرز کے فرنچ افسر بوچرڈ
نے سب سے پہلے اس پتھر کا پتہ لگایا تھا، اس نے اور اس کے ساتھیوں نے دیکھا کہ اس سل پر
تین مختلف رسم الخط میں عبارتیں کندہ ہیں، اس سے قیاس کیا کہ یہ ایک ہی عبارت کے
تین ترجمے ہیں، جو بعد میں صحیح ثابت ہوا، چونکہ اس کتبہ کی آخری تحریر یونانی زبان میں تھی
اس لیے پڑھی جا سکتی تھی، اس کی خبر اس زمانہ میں قاہرہ پہنچی، جب وہاں نیشنل انسٹی ٹیوٹ
نیا نیا قائم ہوا تھا، اس لیے یہ کتبہ وہیں پہنچا دیا گیا، اس کے پہنچتے ہی ان علما کی دلچسپی کا مرکز
بن گیا، جنھیں نپولین معرکۂ مصر کے وقت اپنے ساتھ لے گیا تھا،

تصویری تحریر اور یونانی تحریر کی درمیانی تحریر کو جین جوزف مارسل اور میمی ریچ
نے جلد ہی پہچان لیا کہ یہ تصویری تحریر کا ترجمہ ہے، مگر ان مصری تحریروں کے مطالب
سمجھنے کی طرف کسی نے کوئی دھیان نہیں دیا، نپولین نے آگے چل کر اس کتبہ کی متعدد کاپیاں
بنانے کا حکم دیا تاکہ یورپ کے محققین میں تقسیم کی جا سکیں، اور اس کام کے لیے مارسل اور
گیلانڈ کو پیرس سے قاہرہ لایا گیا، انھوں نے کتبہ کی کاپیاں لیکر یورپ کے شہرۂ آفاق محققین

---

[1] یہ قلعہ نپولین کے نقشۂ مصر میں موجود ہے اور نیل کے دہانے، بائیں یا مغربی جانب واقع ہے،

کے پاس بھیجیں اور سنہ ۱۸۰۱ء میں اس کی دو کاپیاں جنرل دوغا اپنے ساتھ پیرس لے گیا، اور ان کو نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پیرس کے سٹی زن (Citizen Du Theil) ڈوتھیل کے حوالہ کر دیا

سنگ رشید انگلستان میں سنہ ۱۸۰۱ء کے ایام بہار میں مصر پر سر رالف ابرکرامبی کی تاخت کے بعد معاہدہ مراعات خصوصی وجود میں آیا، اس کی رو سے اسی سال اگست میں حجر رشید اور بہت سے اہم آثار قدیمہ کرنل ہچی سن کے سپرد کر دیے گئے، ان میں سے اس نے کچھ تو ایچ، ایم، ایس ایڈمیرل کے پاس اور باقی ایچ، ایم، ایس مدراس کے پاس انگلینڈ روانہ کر دیں لیکن سنگ رشید سال ختم ہونے سے پہلے مصر سے روانہ نہ کیا جا سکا،

ستمبر سنہ ۱۸۰۱ء میں میجر جنرل ٹرنر نے مذکورۂ بالا معاہدہ کی رو سے اس کتبہ کا مطالبہ کیا مگر چونکہ وہ فرانسیسی جنرل کی ذاتی ملکیت تصور کیا جاتا تھا اس لیے فوراً نہ مل سکا، مگر ایک سال بعد میجر ٹرنر کسی نہ کسی طرح اس پر قبضہ کر لیا، اور مارچ سنہ ۱۸۰۲ء کو یہ کتبہ آثار قدیمہ کی سوسائٹی کی عمارت میں محفوظ کر دیا گیا، کئی ماہ بعد یہاں سے کہیں اور منتقل کیا گیا، اور اس کی تحریریں مستشرقین اور یونانی علماء کے مطالعہ کے لیے پیش کی گئیں، اسی سال جولائی میں سوسائٹی کے صدر نے اس کتبہ کے پلاسٹر کے چار سانچے تیار کرا کے آکسفورڈ، کیمبرج، ایڈنبرا اور ڈبلن کی یونیورسٹیوں کے لیے روانہ کیے، کتبہ کی یونانی تحریر کی بہت سی کاپیاں یورپ کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں، لائبریریوں، اکاڈمیوں اور سوسائٹیوں کو ارسال کی گئیں، اور اسی سال کے اختتام پر کتبہ کو آثار قدیمہ کی سوسائٹی کی عمارت سے برٹش میوزیم میں منتقل کر دیا گیا، جہاں اس کو عام لوگوں کی نمائش کے لیے مناسب جگہ پر رکھ دیا گیا۔

کتبہ رشید کی تفصیل | حجر رشید موجودہ حالت میں کالی چینی کے پختہ پتھر سے بنی ہوئی ایک شکستہ سل ہے، جو جگہ جگہ سے جھڑ چکی ہے۔ یہ تین فٹ نو انچ لمبی، دو فٹ ۴ ½ انچ چوڑی اور گیارہ انچ دبیز ہے، اوپر کے داہنے اور بائیں گوشے جھڑ چکے ہیں، اور یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ کتبہ کا کس قدر حصہ ضائع ہو چکا ہے۔ لیکن باقی شدہ تحریر کی لمبائی کو دیکھ کر قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ پتھر اپنی اصلی حالت میں کم از کم بارہ انچ اور لمبا رہا ہوگا، پتھر کا سر غالباً گولائی لیے ہوئے تھا۔ اگر (ٹولمی) بطلیوس کے زمانے کے پتھروں اور ستونوں پر کھدے ہوئے کاموں اور تحریروں سے اندازہ لگایا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ حجر رشید کی پیشانی پر ہورس کے ایڈفو (Horus of EDFU) کی بازو دار صورت ترشی ہوئی تھی، جس میں کالے سانپ کا سر پیچ نکلا ہوا تھا، اور ایک بازو جنوبی مصر کا اور دوسرا شمالی مصر کا تاج پہنے ہوئے تھا،

اس نقش کے نیچے غالباً بادشاہ (فرعون) اور ملکہ کی تصویر رہی ہوگی، اور یہ دونوں خداؤں کی قطار کے سامنے کھڑے رہے ہوں گے، جس کا اندازہ اس کی بعض قدیم نقلوں سے ہوتا ہے۔ فراعنۂ مصر میں سے ایک فرعون کے اعزاز میں یہ کتبہ تیار کیا گیا تھا، اور اس کو عبادت گاہ میں فرعون کے مجسمہ کے بازو میں یادگار کے طور پر رکھا گیا ہوگا،

حجر رشید پر ایک ہی مضمون دو زبانوں قدیم فرعونی اور یونانی میں لکھا ہے

(۱) ہیروغلفی (تصویری تحریر) قدیم فراعنہ کے وقت سے ریاست کے تقریباً تمام کاروبار اور رسمی دستاویز میں استعمال ہوتی تھی،

(۲) عام سادہ تحریر، یہ بھی قدیم مصری تحریر ہے، جو خاندان بطلیوس کے دوران حکومت میں مستعمل تھی، اسے ہیروغلفی تحریر کا اختصار سمجھنا چاہیے۔

(۳) یونانی تحریر عام عبارت میں کندہ ہے۔

ہیروغلفی تحریر چودہ سطروں پر مشتمل ہے۔ جو یونانی متن کی آخری اٹھائیس سطروں کی ہم معنی ہے۔ بطلیموسی تحریر بتیس ۳۲ سطروں پر مشتمل ہے، جس میں سے ابتدائی چودہ سطریں غیر مکمل ہیں، یونانی متن چوّن ۵۴ سطروں پر مشتمل ہے، جن میں سے آخری چھبیس ۲۶ سطریں غیر مکمل ہیں، ۱۸۹۸ء میں ہرما پولس پاروا (Harmopolis Parva) کے ڈیلٹے میں دمن ہور کے مقام پر ہیروغلفی تحریر کا ایک ٹکڑا دریافت ہوا ہے جو اب قاہرہ کے مصری میوزیم میں ہے (نمبر ۵۵۴۷)۔ اس کے علاوہ فائلی (Philae) کے مندر کی ایک دیوار میں شاہی فرمان کی نقل تراشی ہوئی ہے، ان تحریروں کی مدد سے حجر رشید کی ضائع شدہ ہیروغلفی تحریر بڑی حد تک مکمل کر لی گئی ہے۔

کتبہ رشید کے اولین مترجمین | یونانی تحریر کا انگریزی ترجمہ اسٹیفن وسٹن (Stephen Wiston) نے کیا۔ جسے اس نے اپریل ۱۸۰۲ء میں لندن کے قدامت پسندوں کی سوسائٹی کے سامنے پڑھا، فرانسیسی ترجمہ سٹی زن ڈو تھیل (Citizen Du Theil) نے کیا اور یہ اعلان کیا، یہ پتھر اسکندریہ یا اس کے قریب کسی مقام کے کچھ پجاریوں کی طرف سے بطلیموس اپی فینس "(Ptolemy Epiphanes) کی خدمت میں نذرانہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا، سٹی زن امیل ہان (Citizen Ameilhon) کا لاطینی ترجمہ تقریباً اسی وقت پیرس میں ہوا، ڈیماٹک ٹکسٹ (Demotic Text) (قدیم اور عام مصری تحریر) کا اولین مطالعہ ایک سفیر سویڈن اکربلاڈ (Akerblad) اور سلوسٹر ڈی ساسی (Sylvestre de Sacy) نے ۱۸۰۲ء میں کیا، اور آکربلاڈ سادہ تحریر کے اسمائے خواص کو پہچاننے میں کامیاب ہوا، ان اسمائے خاص کے ہم معنی الفاظ یونانی متن میں موجود تھے، اس نے لفظ "مندر" اور لفظ "یونانی" کو بھی پہچانا اور مذکر غائب کے ضمائر کو پہچاننے میں بھی کامیاب ہوا۔

تھامس ینگ مصنف The Undulatory Theory of light نے سب سے
پہلے یہ پتہ چلایا کہ مصری تحریر زیادہ تر صوتی ہوتی ہے۔ اس نے حجر رشید کی ایک کاپی ۱۸۱۴ء میں
حاصل کی تھی، ذوگا (Zoega) ڈی گگنس (De Guignes) اور بعض دوسرے
علماء کو یہ شک ہوا کہ بیضوی حلقوں میں کہیں شاہی نام نہ لکھے ہوں، جس کو بعد میں انھوں نے
ثابت کر دیا۔ ینگ کے انکشافات کتبہ رشید ہی تک محدود نہ تھے، بلکہ قدیم کتبوں کے
حل میں اس کے اور بھی کارنامے ہیں، چنانچہ بطلیموس اور قلیو پطرہ کے ناموں کی تحقیق بھی اسی نے کی۔
قلوپطرہ کے نام کو اس نے گرانیٹ پتھر کی دو زبانی (یونانی اور قدیم مصری) تحریر سے پہچانا، یہ پتھر ۱۸۱۵ء
میں بمقام فائلی (Philae) کھودا گیا تھا۔
یہ بتانا مشکل ہے کہ تھامس ینگ کے انکشافات فرنچ اسکالر جین فرنکوائز جمپولین
(Jean Francois Champollion ۱۷۹۰ء تا ۱۸۳۲ء] کے لیے کہاں تک مددگار
ثابت ہوئے، لیکن ابتدائی محققین سب ایک ہی قسم کے نتائج پر پہنچے۔
۱۸۲۲ء میں جمپولین نے ان حروف کی تصحیح کی جو ینگ نے تیار کیے تھے، اس نے قدیم
مصری تحریر میں آئے ہوئے اکثر رومن شاہی ناموں اور القاب کی ہیروغلفی شکلوں کی صحیح ترجمانی
اور ہیروغلفی تحریر کی ترتیب و تنظیم کی، اور اس کی گرامر اور ترجمہ تیار کیے، ان اصولوں سے
بعد کے مصر کے تمام ماہر آثار قدیمہ نے فائدہ اٹھایا۔
قدیم مصریوں کے عیسائی خلف قبطی (Coptic) کہلاتے ہیں، لفظ قبطی، یونانی لفظ
"ایگوپٹاس" (Aiguptos) "Egypt" کی بگڑی ہوئی شکل ہے، ان قبطیوں نے مقدس
صحیفوں، کلیسا کی عبادتوں اور دیگر متبرک تحریروں کا یونانی زبان سے اپنی ملکی زبان میں ترجمہ
کیا، یہ ترجمے ملی جلی ہوئی یونانی اور مصری زبان میں ہیں، اس مخلوط زبان میں سات حروف

سادہ مصری تحریر کے ہیں، یہی زبان قبطیوں کی زبان یا (Coptic) کہلاتی ہے، گو اس کا خاص کی شناخت سے قدیم طرز تحریر کے پہچاننے کی کنجی مل چکی تھی، مگر اس کو سمجھنے کے لیے قبطی زبان کی امداد ضروری تھی، جو صحیفوں کی صورت میں محفوظ تھی،

چمپولین نے انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں شدت سے محسوس کیا کہ مصری تحریر کی ترجمانی کے لیے قبطی زبان کا جاننا ضروری ہے، چنانچہ اس نے اس زبان میں اتنی استعداد حاصل کرلی کہ وہ بہت سے مصری الفاظ پہچان سکتا تھا، اور ان کو قبطی مترادف الفاظ کے ساتھ پڑھ سکتا تھا، اسی استعداد کی بنا پر وہ کتبۂ رشید کی تحریر کے مطالعہ میں رکنی حروف کی صوتی قدریں دریافت کرسکا اور تصویری تحریر کو صحیح طور سے پڑھنے کا طریقہ معلوم کرسکا،

اخذ مطالب کا طریقہ | وہ طریقہ جس سے مصری تحریر (حروف تہجی) کا بیشتر حصہ سمجھا گیا یہ ہے:-

یہ معلوم کرلیا گیا تھا کہ بیضوی حلقہ ⬭ یا "کارتوج" میں ہمیشہ شاہی نام لکھا ہوتا ہے۔ حجر رشید پر ایک ہی بیضوی حلقہ ہے جو چھ مرتبہ تھوڑے سے تغیر کے ساتھ دہرایا گیا ہے، اس سے ظاہر ہوا کہ اس میں بطلیموس کا نام تحریر ہے، کیونکہ یونانی ترجمہ سے یہ معلوم ہوچکا تھا کہ تحریر کسی بطلیموس سے متعلق ہے، یہ بھی قیاس کیا گیا کہ اگر بیضوی حلقہ میں بطلیموس کا نام ہے تو وہ ہیروغلفی شکلیں جو حلقہ کے اندر ہیں، ان کو آواز پڑھنے سے یونانی حروف کی طرح سنائی دیں گی، اور ان سب کو ملا کر بطلیموس کے نام کی یونانی صورت ہوگی،
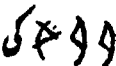
قدیم مصری مستطیل میناروں پر جن کی چوٹی مخروطی ہوتی ہے، الفاظ کھودا کرتے تھے، جنھیں آبلسک (Obelisk) کہتے ہیں، اس قسم کا ایک کتبہ مسٹر بنکس (Mr. Bankes) فائلی کے مقام سے لائے تھے، اس پر صرف دو قسم کی تحریریں ہیں، یونانی اور مصری، یونانی تحریر میں دو شاہی نام بطلیموس اور قلوپطرہ تحریر ہیں، پتھر کی دوسری

لکھی ہوئی تحریریں دو بیضوی حلقے ہیں جو ایک دوسرے کے بہت قریب اور ہیروغلفی تحریر سے پر ہیں، ان کے متعلق یہ خیال کیا گیا کہ وہ بطلیموس اور قلوپطرہ کے مترادف نام ہیں، جب اس بیضوی حلقہ کا کتبۂ رشید کے حلقوں سے موازنہ کیا گیا تو کم وبیش دونوں یکساں نظر آئے، اس سے ظاہر ہوا کہ کتبۂ رشید کے بیضوی حلقوں میں بھی بطلیموس کا نام ہیروغلفی میں تحریر ہے:

بیضوی حلقوں کی شکلیں اس قسم کی ہیں۔

(۱) حجر رشید کے بیضوی حلقہ کی شکل

فائلی سے لائے ہوئے مخروطی پتھر کے حلقے کی شکل :-

(۲)

بیضوی حلقہ نمبر ۲ میں یہ تنہا نشان ان تین نشانوں کی جگہ لے لیتا ہے، یہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ قلوپطرہ کا نام فائلی سے لائے ہوئے پتھر پر موجود ہے، اور اس بیضوی حلقہ کی شکل جس میں قلوپطرہ کا خیال کیا جاتا ہے، یہ ہے:

ان بیضوی حلقوں کی شکلوں کو جنھیں بطلیموس اور قلوپطرہ کا نام تصور کیا گیا تھا اگر ترتیب وار نمبر دیے جائیں تو ان کی شکل یہ بنتی ہے :-

بطلیموس۔ (الف)

قلوپطرہ۔ (ب)

اب ایک نظر میں یہ صاف نظر آتا ہے کہ (الف) میں نمبر ۱ اور (ب) میں نمبر ۵ ہم شکل ہیں، ان کی "جائے وقوع" ناموں میں "پ" کے برابر ٹھہرتی ہے، (الف) میں نمبر ۲

اور (ب) میں نمبر ۲ ہم شکل ہیں، اور اگر پچھلی طرح استدلال کیا جائے تو یہ حرف "ل" کے برابر ٹھہرتے ہیں، چونکہ "ل" قلیو پاطرہ میں حرف نمبر ۲ ہے لہذا نمبر ۱ ق کے برابر ہونا چاہیے۔

قلوپطرہ کے بیضوی حلقہ میں نشان نمبر ۱، ۲، ۵ کے مطالب معلوم ہیں تو اس طرح لکھ سکتے ہیں

(ق ل ... P ...)
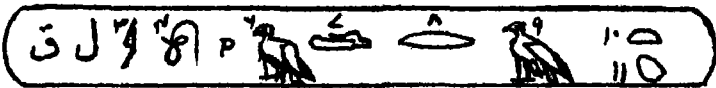
"قلیوپطرہ کو اگر ہم یونانی زبان میں لکھیں تو ل اور پ کے درمیان دو حروف علت آتے ہیں، اس سے ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ = ی اور = و، قلیوپطرہ کے بیضوی حلقوں میں چند ایسے حروف بھی ہیں جن میں نمبر ۷ یعنی کے بجائے واحد ہے، جو (الف) کے نمبر ۲ اور (ب) کے نمبر ۱۰ سے ملتا جلتا ہے، بطلیوس کے نام میں "پ" کے بعد "ظ" آتا ہے جو یونانی قلیوپطرہ میں "ط" لکھا جاتا ہے، اس لیے ہم فرض کر سکتے ہیں اور کا تلفظ درحقیقت ایک ہی طرح کا ہے، اور وہ تلفظ "ط" ہے، قلوپطرہ کو اگر یونانی زبان میں لکھا جائیگا تو قلوپاطرا ہوگا، یعنی اس میں دو الف ہوں گے جو حلقہ میں نمبر ۶ اور نمبر ۹ کی جگہ تبدیل کیے جا سکتے ہیں، اس لیے ہم فرض کر سکتے ہیں کہ = ہے

بیضوی حلقہ "ب" کی تصویری تحریر میں اگر ان نئے ہم معنی حروف کو رکھیں تو ان کو یوں لکھ سکتے ہیں

(ق ل ي و پ ا ط ا)
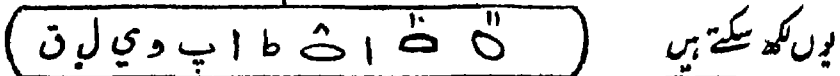
تھامس ینگ نے دیکھا کہ یہ دو نشان کسی مؤنث دیوتا یا ملکہ یا شاہزادی کے نام کے بعد آتے ہیں، اگلے محققین کا خیال تھا کہ یہ نشان جنس مونث کے اختتام پر آتے ہیں۔

صرف نمبر ۸ کے لیے ہمارے پاس کوئی صوتی ہم وزن حرف نہیں ہے۔

مگر اب یہ ظاہر ہو گیا کہ ⊂⊃ = یہ حرف "ر" کو اگر نمبر ۷ کی جگہ حلقہ میں رکھا جائے تو ہم لفظ "قلیوپاطرا" پڑھ سکتے ہیں،

قلیوپطرہ کے حلقہ سے حاصل کیے ہوئے معانی سے بطلیموس کا حلقہ اس طرح لکھا جا سکتا ہے۔

(P T O L ...)
(پ ط و ل ...)

اس سے یہ ظاہر ہو گیا کہ یہ حلقہ بطلیموس کے نام کا ہو گا، مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ اس میں بہت سے ایسے تصویری الفاظ ہیں جو بطلیموس کے نام کا حصہ نہیں ہیں، بطلیموس کے نام کے اور کتبے بھی دریافت ہوئے ہیں، ان میں آسان ترین اس طرح کے ہیں :-

اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ ... شاہی خطابات ہیں، جو کتبۂ رشید کی یونانی تحریر سے مطابقت رکھتے ہیں اور جس کے معنی ہیں "زندہ باد" "محبوب خدا"۔ اب بطلیموس کا نام بزبان یونانی "پطولیموس" (PTOLEMAIOS) لکھا جاتا ہے، جس کا حرف آخر "س" ہے، اس لیے ہم فرض کر سکتے ہیں کہ سادہ ترین بیضوی حلقہ میں دیا ہوا آخری نشان "س" کے برابر ہے، اس کے بعد جو شکلیں مشکوک رہ جاتی ہیں وہ یہ ہیں [... اور ...] بطلیموس کے نام میں ان کی جگہ سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ یقینی حرف "م" ہیں، جس میں "ی" جیسے حرف علت کی صوتی مداخلت بھی ہے، اس قیاس کو جو بعض مقدمات پر مبنی ہے، اولین مترجمین نے دوسرے بیضوی حلقوں کی تصویروں کو پڑھنے میں بھی استعمال کیا ہے، مثلاً

۲- (...) ۱- (...)

نمبر ۱ میں ہم تصویروں کے بجائے حروف لکھ سکتے ہیں مثلاً پ، ی، ل، ا، ط، ر، ا یعنی فی لوطرا (Philotera) جو یونانی نام ہے۔

نمبر ۲ میں بھی شکلیں ہم پہچان سکتے ہیں اور اسے اس طرح لکھ سکتے ہیں۔

(... ط ...)

اس بات کا علم تھا کہ ـــــ بریندیس کے نام میں آتا ہے اور "ن" کا ہم وزن ہے اور "ـــ" یونانی لقب "قیصرس" کا آخری حرف ہے، گویا "ــ" "س" کی آواز ہے، قلیوپطرہ کے نام کے بعض حلقہ ⊂⊃ سے شروع ہوتے ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ اس کی آواز "ق" جیسی ہوگی، اوپر کے حلقہ میں تصویروں کے بجائے مناسب الفاظ رکھنے سے یہ تحریر بنتی ہے

(س د ط ن ◻ س ک ل ا)

جو ظاہر ہے کہ الکزنڈرس یا اسکندر ہے۔ نشان "◻" کا مقام ظاہر کرتا ہے کہ یہ الف یا ی کی آواز کے برابر ہے۔

پہلے ہم نے یہ قیاس کیا تھا کہ یہ تصویریں ــ شاہی خطابات "لافانی" اور "محبوب خدا" وغیرہ کی نمایندگی کرتی ہیں، اب یہ دیکھنا ہے کہ ہمارا یہ قیاس صحیح تھا یا

روایات اور قبطی زبان کے ذریعہ یہ معلوم ہے کہ "زندگی" یا "زندہ" کو قدیم مصری میں "انکھ" یا "انکھ" کہتے ہیں، اور یہ بھی معلوم تھا کہ اس کو اس ☥ نشان سے ظاہر کیا جاتا تھا جو تحریروں میں جابجا آتا ہے، اب یہ فرض کیا گیا کہ ــ کا مطلب "ہمیشگی" ہے، قبطی زبان سے ثابت ہے کہ لفظ ڈجیٹ (DJET) "ہمیشہ" "عمر" "لافانیت" کے لیے قدیم مصری میں مستعمل تھا، اور اس کا علم بھی ہم کو پہلے سے ہے کہ ــ میں دوسرا ⌓ "ط" یا "ٹ" کے برابر ہے، اس لیے ہم فرض کرسکتے ہیں کہ ــ = ڈج۔ تیسری تصویر ــ "تعیینی" یعنی سمت معین کرنے والی ہے، جو بولی نہیں جاتی ہے، پہلے خطاب "ــ ☥" کے معنی "ہمیشہ" یا "دوام" کے ہیں۔ باقی تصویروں "ــ" میں سے ⌓ "پ" اور "ط" کے برابر ہیں، جو بطاہ (خدا) کے نام کے پہلے دو حروف ہیں، لہذا ــ "ح" کے برابر یا اسی قسم کا حرف ہونا چاہیے، اگر ــ ⌓ سے بطاہ کا نام بنتا ہے، تو بعد کے نشان ــ کا مطلب یقیناً "حبیب"

یا "محبوب" ہونا چاہیے، اس موقع پر قبطی زبان نشان ▭ کو مناسب صوتی قدر دینے میں اگلے مترجمین کی مدد گار ثابت ہوئی ہے، کیونکہ محبت کے لیے قبطی لفظ "میر" (MERE) "EPE" ہے، اس لیے ان مترجمین نے یہ فرض کر لیا کہ ▭ = میر ہے۔

جحر رشید کے بطلیموسی حلقہ میں پطاہ کے نام کے بعد 99X کے نشان ہیں جو صاف ظاہر ہے کہ ▭ کے متبادل ہیں، یہ ہم پہلے سے جانتے ہیں کہ 99 = ی ہے، اس لیے X = ▭ اور میر "MER" کا ہم معنی ہونا چاہیے۔

جحر رشید کی تحریر کا مفہوم | جحر رشید کی تحریر اس فرمان کی نقل ہے جو مصر کے پادریوں کی اس جنرل کونسل نے (جو مصر کے شاہنشاہ بطلیموس پنجم، ایپی فینس کی تخت نشینی کے جشن اول کی تقریب میں بمقام ممفس (MEMPHIS) ہوئی تھی) منظور کی تھی، اس نوخیز شاہ کی تاجپوشی اس کی حکومت کے آٹھویں سال ہوئی تھی، اور اس کا پہلا سالانہ جشن تخت نشینی کے نویں سال یعنی ۱۹۶ سنہ ق م کے موسم بہار میں منایا گیا تھا اس فرمان کی اصل یونانی میں تحریر ہے جس سے ہیروغلفی اور سادہ مصری تحریر کے ترجمے تیار کیے گئے تھے،

کتبہ پر یونانی ماہ ژندیکوس (XANDIKOS) (اپریل) کی چار تاریخ درج ہے جو مصری ماہ مِشیر (MESHIR) یا میخر (MEKHIR) کی اٹھارہ تاریخ کے مطابق ہے، یہ مہینہ بطلیموس پنجم ایپی فینس کی دور حکومت کے نویں سال کا تھا جس سنہ میں ایطس بن ایطس (AETUS SON OF AETIS) اسقف اعظم اور پیرہ (RYRRAH) بنت فی لی نس (PHILINUS) ایریا (AREIA) بنت ڈائی اوجینس (DIOGENES) اور آئرن (IRENE) بنت بطلیموس خاص پجارنیں تھیں، کتبہ کی ابتدائی سطریں بطلیموس پنجم کے خطابات

اور اوصاف سے معمور ہیں اور خداؤں کے حضور میں بادشاہ کی عبودیت اور مصریوں اور اپنے ملک کے لیے محبت کا اعلان ہے ۔

کتبہ کی تحریر کے دوسرے حصہ میں پادریوں نے مصریوں پر بطلیموس کے انعامات کا ذکر کیا ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے :-

(۱) مندروں کو پیسے اور غلہ کے تحائف ،

(۲) ان کے لیے اوقاف کے تحائف ،

(۳) ٹیکسوں کی معافی ،

(۴) بادشاہ کے مقروضوں کے قرض کی معافی ،

(۵) ان قیدیوں کی آزادی جو برسوں سے جیل میں بند ہیں ،

(۶) ملاحوں کی بحری بھرتی کرنے والی جماعت کی موقوفی ،

(۷) مذہبی تعلیم حاصل کرنے والے طلباء کی فیسوں میں تخفیف

(۸) مندروں پر شاہی واجب الادا رقموں میں تخفیف ،

(۹) مندروں میں عبادت کی بحالی ،

(۱۰) جلا وطن باغیوں کی معافی اور ان کو مصر واپس آنے اور یہاں رہنے کی اجازت ،

(۱۱) مصر کے دشمنوں کے خلاف بحری و بری فوجوں کا ارسال ،

(۱۲) شہر شیکان (Shekan) [لی کو پولس (Lycopolis)] کا محاصرہ اور فتح ،

(۱۳) پادریوں کے ذمہ تاج کے واجب الادا ٹیکس کی معافی ،

(۱۴) باریک سنی پر ٹیکس میں تخفیف ،

(۱۵) غلہ پیدا کرنے والی زمینوں کے ٹیکس میں تخفیف

(۱۶) ایپس (Apis)، منوس بیل (Mnevis Bull) اور دیگر مقدس جانوروں کے مندروں کی بحالی۔

(۱۷) تباہ شدہ مندروں اور مقدس عمارتوں کی دوبارہ تعمیر اور انکے لیے اوقاف کا انتظام

بطلیموس پنجم کی ان فیاضیوں اور انعامات کی شکرگذاری کے لیے مصر کے پادریوں کی جنرل کونسل نے بطلیموس (مندروں میں ہمیشہ دائم وقائم) کی خدمت میں رسمی تقریبات واعزاز میں اضافہ کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلہ کے ماتحت یہ طے پایا۔

(۱) مصر کے محافظ کی حیثیت سے بطلیموس کے مجسمے بنائے جائیں اور انکو پادریوں اور عوام کی عبادت کے لیے مصر کے ہر مندر میں رکھا جائے۔ (۲) بطلیموس کی سونے کی مورتیں بناکر سونے کے تختوں پر دیوتاؤں کی مورتوں کے قلب میں رکھا جائے اور جلسے جلوس میں ان کے ساتھ نکالا جائے۔ (۳) سونے کے دو تاج بطلیموس کی مورتی کے تخت پر رکھ کر اسے امتیاز بخشا جائے (۴) میسور (Mesore) کی تیسویں تاریخ اور پاؤفی (Paophi) کی سترہویں تاریخ کو بطلیموس کا یوم پیدائش اور یوم تاجپوشی ہمیشہ کے لیے منایا جائے، (۵) ماہ تھاتھ (ThoTh) کے اول پانچ دن تہوار منانے کے لیے مقرر کردیے جائیں، ان دنوں مندروں میں عبادت کیجائے اور لوگ ہار پھول پہنیں،

(۶) پادریوں کے خطابات میں اس نئے خطاب کا اضافہ کیا جائے "منعم ومکرم بطلیموس الٰہی فیض خدا (جو زمین پر نازل ہوا) کے پادری" اس کو بطلیموس کے ہر پادری کی انگوٹھی پر نقش کیا جائے اور تمام رسمی دستاویزمیں انکا اندراج کیا جائے۔

(۷) بطلیموس کے مورتی والے تخت کو ہر شخص مندروں سے مستعار لیکر گھر لیجا سکتا ہے اور جلسے جلوس میں نکال سکتا ہے (۸) اس فرمان کی نقلوں کو خدا کی زبان یعنی ہیروغلفی اور کتابی زبان اور یونانی تحریروں کالی بینی کے پتھر پر کھودا جائیگا، اور اس میں سے ایک کتبہ ہمیشہ دائم وقائم بطلیموس کے مجسمہ کے ساتھ اول دوم اور تیسرے درجہ کے مندروں میں رکھا جائے گا۔

اثارِ علمیہ و ادبیہ

مکاتیب مولینا مناظر احسن گیلانیؒ

بنام

مولانا سید سلیمان ندویؒ

۲۳ جون ۱۹۴۷ء حیدرآباد دکن
جوار الجامعۃ العثمانیہ

سیدی الامام العلامہ دمتم بالھناء والعافیۃ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔ الذین احصروا فی سبیل اللہ کی حالت میں یہ عریضہ خدمت والا میں معارف مئی ۴۷ء کے وفیات کے دیکھنے کے بعد بحالت اضطرار لکھ رہا ہوں، ورنہ لکھنے کی تو بیشمار چیزیں سامنے آگئی تھیں، مگر کیا لکھوں؟ کس لیے لکھوں؟ یہ سوچ کر دل بیٹھ جاتا تھا، وفیات ثلثہ کو پڑھ کر "ندویت صحیحہ قراح" کا عجیب و غریب نتیجہ نظر کے سامنے آیا ایک ہی قلم سے ایک ہی اشاعت میں، ایک اہلحدیث اور ایک طائفہ قبریہ اور ایک برزخی دین رکھنے والے تین تین مختلف الفقاط والجہات اہل علم کے متعلق ہر قسم کی جانبداری سے پاک رہتے ہوئے ہر ایک کے علم اور خدمات کا اعتراف اس ندویت کا عجیب و غریب نمونہ ہے جس کے لیے ندوہ قائم ہوا تھا لیکن شاید یہی پہلا نمونہ ہے اور یہی آخر بھی، ماجد میاں صاحب نے کبھی لکھا تھا کہ سید کے وفیات کو دیکھکر بیساختہ جی چاہتا ہے کہ سب سے ناگوار حقیقت کاش گوارا بنجاتی، اور وفیات سلیمانیہ کے کسی گوشہ میں جگہ ملتی (اوکما قال) مولانا امرتسری اور مولانا بدایونی مرحوم میں سے تو خاکسار بھی ذاتی نیاز رکھتا تھا لیکن دانا پوری صاحب سے شخصی واقفیت نہ تھی، معتبر ذریعہ سے غالباً کان میں یہ بات پڑی ہے کہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کے حلقۂ درس میں بیٹھنے کی سعادت انکو حاصل ہوئی تھی، بس اصل مقصود تو اس عریضہ سے اپنے اس وقتی تاثر کا اظہار تھا،

آپکے ارادہ عدم شرکت سے مطلع ہونے کے بعد خاکسار نے بھی قطعی فیصلہ کراچی نہ جانے کا کر لیا تھا لیکن مولینا عثمانی کی طرف سے تار و خطوط کے تسلسل نے فسخ عزم کو انسب خیال کیا، ان سے تلمذ کی نسبت رکھتے ہوئے دل نے آگے بڑھنے

کی اجازت نہ دی، ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کو ساتھ لیکر حیدرآباد سے اڑے، ابتک بری زمین کا سفر تجربہ ہوا تھا، اب کی علی وجہ البحر اور اس سے بھی زیادہ عجیب منظر "کچھ ران" کے اوپر اڑان کے وقت سامنے آیا، نیچے میلوں دلدلی زمین تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سوئی بھی اس میں اگر گرے تو تحت الثریٰ ہی میں جا کر دم لے، پانچ ساڑھے پانچ گھنٹے میں کراچی کے مطار پر اتار دیا گیا، سولہ دن قیام رہا، باہر سے ان دو دکنی فقیروں کے سوا صرف مفتی شفیع صاحب تشریف لاسکے، اور وہ بھی شاید ہجرت ہی کے ارادہ سے آئے تھے، اہل وعیال کو ساتھ لائے تھے، مکان بھی تلاش کر رہے تھے، مغربی یوپی کے خوفناک حال نے دیوبند سے انکے دل کو اچاٹ کر دیا تھا، اختتام مجلس سے تین چار دن پہلے مولوی احتشام الحق صاحب بھی آگئے تھے۔ آپ کا نہ ہونا دراصل واسطۃ العقد کا فقدان تھا۔ تاہم جب ٹوٹے پھوٹے کچھ لوگ پہنچ ہی گئے تھے، تو کام کا آغاز کر دیا گیا، مقامی طور پر صرف حضرت تھانوی کے بھانجے شاہ جامع مولینا احتشام مجلس میں شریک تھے، ایک صاحب ظفر الانصاری ایم اے ایل ایل بی مجلس کے ناظم تھے، سنا ہے کہ دلی مسلم لیگ کے کوئی سرگرم کارکن تھے، ابتداءً خاکسار کی طرف سے مجلس میں تین سوالات پیش کیے گئے تھے۔ (۱) اسلامی حکومت کے قیام کی غایت (۲) اس مقصد کے حصول کے ذرائع (۳) اسلامی قانون کا سرچشمہ کیا ہوگا؟ قرآن کا حوالہ دیتے ہوئے یہ عرض کیا گیا تھا کہ سیاسی کشمکش کی غایت ہمیں بتائی گئی ہے کہ فتنہ کا ازالہ ہو جائے، قلمرو کے ہر فرد کا وجود دوسرے فرد کے لیے باعث آزمائش قلق و تپش و خطرہ باقی نہ رہے، تفسیروں کے حوالہ سے "فتنہ" کی یہ شرح پیش کی گئی، چونکہ اس مقصد میں صحیح کامیابی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہر فرد کی آئینی زندگی پر پولیس اور فوج کی نگرانی کے سوا اس اللہ کی نگرانی نہ قائم ہو جائے جس کے متعلق جبلۃً یہ احساس پایا جاتا ہے کہ ہر جگہ ہر ایک پر ظاہراً و باطناً نگراں ہے، اس لیے ازالۂ فتنہ کے لیے ضروری ہوگا کہ الدین (آئینی زندگی) کو اللہ کے لیے بنانے کی ممکنہ کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے اور اسی سے یہ ضرورت پیدا ہوتی ہے کہ الدین یا آئین کا مطالبہ بھی اللہ کے لیے خالص کر دیا جائے کہ اسی سے جدا اسکی نگرانی کا احساس بیدار ہو سکتا ہے، پس اصل مقصد قیام حکومت کا یہ ہوا کہ خدا کی بات سب سے اونچی ہو جائے اور مطلوب یہ کلمۃ اللہ سے زیادہ اثر کسی کا باقی نہ رہے بڑی سے بڑی بالا ہونے کی حیثیت حاصل کر لے۔ وھذا ھی غایۃ

قیام الحکومۃ الاسلامیہ۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اقتداری قوت کا حصول اور اسکی تنظیم ضروری ہے لیکن قیادت کی شکل ہماری حکومت میں ایسی نہ ہوگی جس پر مسئولیت کی ذمہ داری عائد نہ ہوتی ہو، از غلام تا بہ امام مسئولیت کی ذمہ داری عام ہوگی، کس کے ہونگے، اسکو حدیث میں عام رکھا گیا ہے، پس ہم بھی عام ہی رہنے دیں یعنی باشندگان ملک کے ہونگے، آیندہ نسلوں کے ہونگے اور سب سے زیادہ اس خالق کے ہونگے جسکی ہر چیز نسل انسانی کو بعینہٖ ہبہ نہیں بلکہ بہ امانت ملی ہے۔ اسی لیے ہماری حکومت کا نام حکومت نہیں "خلافت" ہے، اور اسی سے اسلامی قانون کے سرچشمہ کا سوال حل ہو جاتا ہے، جس نے عرض کیا تھا کہ ساری دنیا کے قوانین کے آئین کی بنیاد بالآخر چند موروثی ورواجی مسلمات پر منتہی ہوتی ہے، لیکن یہ موروثی ورواجی مسلمات مشکوک ہو چکے ہیں اور اسی شک کے ازالہ کیلئے ان موروثی ورواجی مسلمات کا آخری اعادہ الکتاب کی شکل میں کیا گیا ہے جسکی عملی تشریح "السنۃ" سے کی گئی ہے، پس یہی "الکتاب و السنۃ" جو بنی آدم کے موروثی مسلمات کا غیر مشکوک ذخیرہ ہے ہمارے قانون کا سرچشمہ ہوگا، پس مسئولیت اور مسئولیت کے ساتھ "الشوریٰ" حصول مقصد کے بنیادی واساسی ذرائع ہونگے۔ ان امور کے بعد خاکسار نے پیش کیا کہ عصری تقاضوں کا اقتضا ہے کہ ازالۂ "فتنہ" کی بعض شکلوں کو زیادہ نمایاں کیا جائے مثلاً اغاثۃ اللہفان۔ قلمرو کے جس باشندے کی آمدنی اسکی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کیلئے کافی نہ ہوگی ان بنیادی ضرورتوں کی حکومت کفالت کریگی، اشتراکیت میں بنیادی خرابی یہ ہے کہ انفرادی صلاحیتوں کے ابھارنے کے محرکات ہی کو ساکن کر دیا گیا ہے ہم ایسا نہیں کرینگے، بلکہ ہر شخص کو اسکی صلاحیتوں کے مطابق الکتاب کا آزاد موقع فراہم کیا جائیگا، اغاثۃ اللہفان کیساتھ ایفاء العقود ہماری حکومت کا سب سے بڑا امتیازی نشان ہوگا۔

لاحول ولاقوۃ الا باللہ میں مضمون لکھنے بیٹھ گیا حکمت بلقمان آموختن، کہنا یہ چاہتا تھا کہ اسی قسم کی باتوں سے ابتدا ہوئی، مولانا حمید اللہ صاحب سے کہا گیا کہ عصری قالب میں اسلامی دستور کو وہ پہلے لکھیں اور دو تین دن تک جو باتیں ہوئیں انکو اپنی اپنی جگہ کھپائیں، پھر مجلس میں یہی دستور پیش ہوا، بحث و مباحثے کے بعد آخری شکل میں اسکو قلم بند کر کے مجلس کے حوالہ کر کے ہم لوگ چلے آئے، مفتی شفیع صاحب کی عنان گیری سے کافی مدد ملی، باقی حکومت کیا کریگی؟ اسکا اندازہ اسی سے کیجئے کہ آج تک مولانا عثمانی کے لیے کسی مکان تک کا حکومت نے بندوبست نہیں کیا، ہم لوگ ٹھٹھہ بھی تھوڑی دیر کے لیے گئے تھے، شاہجہاں کی بہت بڑی مسجد کس بیکسی کی حالت میں وہاں دیکھی، اور کیا لکھوں۔

(گیلانی)

ؔ۱ طے یہ ہوا ہے کہ اس دستوری مسودہ کی نقل ممتاز علماء ہند و پاک میں گشت کرائی جائے۔

مطبوعات جدیدہ

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ اور اُن کی تعلیمات — از اعجاز الحق صاحب قدوسی، صفحات ۵۹، کتابت وطباعت بہتر، ناشر اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کراچی

قیمت عہ

اعجاز الحق صاحب قدوسی مختلف سلاسل صوفیہ کے کئی قیمتی تذکرے مرتب کر چکے ہیں اور جن پر معارف میں تبصرے بھی ہو چکے ہیں، یہ ضخیم کتاب تنہا شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمہ اللہ کے حالات زندگی اور انکی تعلیمات پر مشتمل ہے جو اس سلسلۃ الذہب کی ایک اہم کڑی ہیں، شیخ عبدالقدوسؒ شیخ الکل حضرت احمد عبدالحق ردولوی رحمہ اللہ کے پوتے شیخ محمدؒ کے اجلہ خلفاء میں تھے، اور ان کے ذریعہ سلسلۂ چشتیہ صابریہ کو ہندوستان میں بڑا فروغ ہوا اور جس کا فیض کئی صدی گذر جانے کے بعد آج بھی باقی ہے، خاص طور پر پچھلی صدی میں حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے نامور خلفاء کی وجہ سے ہندوستان میں اسے ایک نئی زندگی ملی، سلسلۂ چشتیہ صابریہ کی سب سے بڑی خصوصیت عشق ومحبت اور درد وسوز کے ساتھ اتباع سنت کا اہتمام ہے عشق ومحبت کے والہانہ پن اور درد وسوز کے اضطراب کے ساتھ اتباع سنت کا اہتمام جام وسندان باختن سے بھی مشکل کام ہے مگر چشتیہ صابریہ کے بزرگوں اور ان میں بھی خاص طور سے حضرت عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات (بعض اختلافی مسامحات کو چھوڑ کر) اس کا بہترین نمونہ تھی۔

یہ کتاب اصلاً شیخ کے حالات زندگی اور ان کی تعلیمات کی تفصیل کے لیے مرتب کی گئی ہے۔

مگر اس میں آٹھویں صدی کے سلسلۂ چشتیہ صابریہ اور بعض دوسرے مشائخ کی تاریخ بھی آگئی ہے اعجاز الحق صاحب خود اسی خانوادۂ علم و عرفان کے ایک فرد ہیں، اس لیے انھوں نے جو معلومات فراہم کی ہیں وہ سب براہ راست ہیں، انھوں نے یہ تذکرہ گو بڑے حزم و احتیاط کے ساتھ مرتب کیا ہے، اگر سماع وغیرہ کے مسائل پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بہت کچھ محل نظر ہے، اور ان پر اتنا لکھا جا چکا ہے کہ اس کتاب میں ان کی اتنی تفصیل کی ضرورت نہ تھی، کتاب میں جا بجا مصنف نے جو حواشی لکھے ہیں وہ بجائے خود بڑے قیمتی اور معلومات افزا ہیں، اس کتاب کے مطالعہ سے علم و عمل میں اضافہ بھی ہوتا ہے اور فکر و نظر کو بصیرت بھی حاصل ہوتی ہے۔

جزیرۃ العرب - از محمد رابع ندوی، صفحات ۲۲۰، کتابت و طباعت عمدہ۔

ناشر مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ قیمت :- صر

جزیرۃ العرب مسلمانوں کا دینی قبلہ اور ان کے ایمان و عقیدہ کا مرکز ہے، اس لیے اس کے ایک ایک ذرہ سے مسلمانوں کو محبت نہیں بلکہ عشق ہے، مگر افسوس ہے کہ عوام تو عوام خواص بھی ان کے بعض مشہور مقامات کے علاوہ اس کی پوری جغرافیائی تاریخ سے ناواقف ہیں، وہ نجد و تہامہ و یمن کا تذکرہ پڑھتے ہیں، وہ طائف و خیبر و تیما و وادی القریٰ کا ذکر بار بار سنتے ہیں، بدر و احد اور عوالی و قبا کا نام ان کے کانوں میں پڑتا ہے، عربی داں طلبہ اجا و سلمی کے پہاڑوں اور عکاظ و مجنہ کے بازاروں کے شاعروں، مقاصدوں کی روداد پڑھتے ہیں، مگر ان کے جائے وقوع، ان کے سمت اور ان کی طبعی اور تہذیبی خصوصیات سے ناواقف ہوتے ہیں، حالانکہ ایک مسلمان کے لیے دنیا کے جغرافیہ و تاریخ کے مقابلہ میں عرب کے تاریخی جغرافیہ سے واقفیت زیادہ ضروری ہے،

اس ضرورت کے ماتحت یہ کتاب مرتب کی گئی ہے، اس میں جزیرۃ العرب کے جتنے طبعی اور سیاسی ہیں، ان سب کی جغرافیائی تاریخ اجمال کے ساتھ آگئی ہے، البتہ عرب کے مذاہب کے

سلسلہ میں یہودیت، نصرانیت اور صابئیت پر بڑی تشنہ بحث ہے۔ اس پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت تھی، اور ان کے مذہبی و سیاسی مراکز کا نقشہ بھی شامل ہونا چاہیئے تھا، اسی طرح عرب کے بازاروں کے سلسلہ میں المحبر اور دوسری کتابوں سے مزید وضاحت کی ضرورت تھی، ان بازاروں سے نہ صرف عربی شاعری کا بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا بھی بڑا گہرا تعلق تھا، کتاب متوسط پڑھے لکھے لوگوں کے لیے لکھی گئی ہے اور اس لحاظ مفید ہے۔

اردو املا ۔ از غلام رسول صاحب حیدرآباد، صفحات ۹۶، کتابت و طباعت بہتر، پتہ ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد، قیمت ۸

اردو زبان کا رسم خط اعراب سے معرا ہے، اس لیے اس کے تلفظ اور لکھاوٹ میں قدرے دقت پیش آتی ہے، اس لیے اس میں کچھ اصلاحات کی ضرورت ہے، تاکہ اجنبی سے اجنبی آدمی بھی اسے آسانی سے پڑھ لکھ سکے، اس موضوع پر متعدد مضامین لکھے گئے ہیں، انہی میں مولوی غلام رسول صاحب کا مضمون بھی ہے جو پہلے ہماری زبان میں شائع ہوا تھا، اور اب ادارۂ ادبیات نے کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے، اس میں بڑی مفید اصلاحات کی طرف راہنمائی کی گئی ہے۔

قول سدید ۔ از ضیا احمد بدایونی، صفحات ۱۵۰، کتابت و طباعت متوسط، ناشر ایجوکیشنل بک ہاؤس، سول لائن، حامد علی بلڈنگ، علی گڑھ۔

محمود احمد عباسی کی کتاب خلافت معاویہ و یزید کے رد میں ایک درجن سے زیادہ کتابیں لکھی گئیں، لیکن ان میں دو ایک کے علاوہ تمام جذباتی انداز میں لکھی گئی ہیں، اس موضوع پر مولوی ضیاء احمد بدایونی نے بھی قلم اٹھایا ہے، اور اپنے علم و فضل کے مطابق موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ انھوں نے ہر بات معتبر تاریخ و تذکرہ کی کتابوں کے حوالہ سے کہی ہے، اخذ نتائج میں ان سے اختلاف ممکن ہے مگر حوالہ دینے میں کہیں ترمیم و تدلیس سے کام نہیں لیا ہے، محمود عباسی صاحب اگر ان

تحقیقات سے فائدہ اٹھا کر اپنی کتاب پر نظرِ ثانی کر لیتے تو اس کی بنیادیں مستحکم تر ہو جاتیں اور اس سے اختلاف کی گنجائش کم باقی رہ جاتی۔

علماء کا متفقہ فتویٰ پرویز کے بارے میں از مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی، صفحات ۲۰۶، کتابت، طباعت متوسط، پتہ: مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن، کراچی ۵؍

پرویز صاحب نے انکارِ حدیث کا جو فتنہ برپا کر رکھا ہے، اگر وہ محض ایک علمی مسئلہ ہوتا، پھر بھی اس کی فتنہ انگیزی کم نہیں تھی، مگر یہ تو عملی انکار کی تحریک ہے جو ملتِ اسلامیہ کے لیے سخت مہلک ہے، اگر خدانخواستہ سنتِ رسول اور اسوۂ نبویؐ سے ہمارا رشتہ کٹ جائے تو عمل و کردار کا وہ کونسا مرقع ہے جسے ہم دنیا کے سامنے پیش کر سکیں گے، اس لیے امت کے ہر طبقہ اور خیال کے علماء نے متفقہ طور پر مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح پرویز صاحب کو بھی اسلام سے خارج قرار دیا ہے، انھوں نے نہ صرف بعض اسلامی تعلیمات کا بلکہ تمام ضروریاتِ دین تک کا انکار کر دیا ہے، اس کتاب میں ان کے انھیں عقائدِ باطلہ کو جمع کر کے ان کے بارے میں علماء کا فتویٰ حاصل کیا گیا ہے، فتویٰ دینے والوں میں نہ صرف ہندوستان و پاکستان بلکہ تمام اسلامی ممالک کے ممتاز علماء شامل ہیں، لیکن اس زمانہ میں محض اس قسم کے فتووں سے کام نہیں چلتا، اس کی اشاعت کے ساتھ اس کی بھی ضرورت ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی طرح عقلی اور علمی انداز میں ان کی ایک ایک بات کا رد بھی کیا جائے، اور یہ کام ہر حلقہ کے علماء کا ہے، یہ فتویٰ بازی ممکن ہے کہ بعض جدت پسند حضرات کو بری معلوم ہو، مگر اسلام ہندومت وغیرہ کی طرح کوئی ایسا مذہب نہیں ہے کہ آدمی اس سے چمٹا رہے یا نہ رہے مگر وہ اس سے بہرحال چمٹا رہے گا، مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی قابلِ ستائش ہیں کہ اس اقدام کی جرأت کر کے بہت سے مسلمانوں کو اس فتنہ کی آغوش میں جانے سے بچا لیا۔